فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ

اسعد المفاتیح

شرح اردو

مشکوٰۃ المصابیح

جلد اوّل

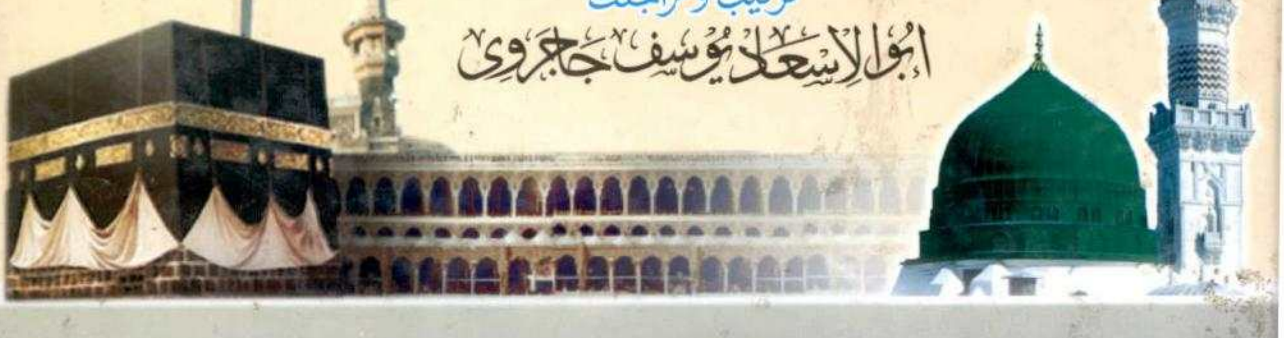
از افادات

اُستاذ العلماء شیخ القرآن والحدیث علامہ

ابو محمد عبد الغنی جاجروی رحمۃ القوی

ترتیب و مراجعت

ابو الاسعد یوسف جاجروی



فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ

اسعاد المفاتیح

شرح اردو

مشکوۃ المصابیح

جلد اول

از افادات

اُستاذ العلماء شیخ القرآن والحدیث علامہ

ابو محمد عبد الغنی جاجروی رحمۃ اللہ القوی

ترتیب و مراجعت

ابو الاسعاد یوسف جاجروی

مکتبۃ الحسن

33 - حق سٹریٹ اُردو بازار لاہور

042-37241355

ضابطہ

نام کتاب ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اسعد المفاتیح شرح اردو مشکوۃ المصابیح (اول)
از افادات ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ علامہ ابو محمد عبدالغنی جاجروی
ترتیب و مراجعت ۔۔۔۔۔۔۔ ابو الاسعادیوسف جاجروی
طبع اول ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ شعبان المظم ۱۴۲۵ھ اکتوبر 2004ء
طبع دوم ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ شعبان المظم ۱۴۳۱ھ اگست 2010ء
کتابت ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ابوالقاسم شبیر احمد فاروقی
باہتمام ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ادارہ تحقیقات علمیہ رحیم یارخان
ناشر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مکتبۃ الحسن 33حق سٹریٹ اردو بازار لاہور042-37241355
تعداد ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ گیارہ سو(۱۱۰۰)

ملنے کے پتے

- ★ لاہور — مکتبہ سید احمد شہیداردو بازار لاہور
- ★ گوجرانوالہ — ادارہ نشر واشاعت نزد مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ
  مکتبہ حقانیہ سونی گیس روڈ گوجرانوالہ
- ★ راولپنڈی — کتب خانہ رشیدیہ راجہ بازار راولپنڈی
  مکتبہ رشیدیہ کمیٹی چوک اقبال مارکیٹ راولپنڈی
  مکتبہ صفدریہ مصریال روڈ المدد پلازہ راولپنڈی
- ★ اسلام آباد — مکتبہ شہید اسلام مرکزی جامع لال مسجد اسلام آباد
  مکتبہ فریدیہ ای سیون اسلام آباد
- ★ چکوال — کشمیر بک ڈپو چکوال
- ★ ساہیوال — مکتبہ سراجیہ نزد غلہ منڈی ساہیوال
- ★ فیصل آباد — مکتبہ القرآن امین پوربازار فیصل آباد
- ★ ملتان — مکتبہ حقانیہ ٹی بی ہسپتال روڈ ملتان
- ★ سرگودھا — مکتبہ سراجیہ سٹلائیٹ چوک سرگودھا۔ اسلامی کتب خانہ پھولوں والی گلی سرگودھا
- ★ پشاور — دارالاخلاص اکیڈمی محلہ جنگی پشاور
- ★ مردان — مکتبۃ الاحرار
- ★ ڈیرہ اسماعیل خان — مکتبۃ الحمید دفترجامعہ خدیجۃ الکبری بالمقابل گرڈ اسٹیشن ڈیرہ اسماعیل خان
- ★ کرک — مکتبہ احیاء العلوم تخت نصرتی ضلع کرک
- ★ بنوں — مکتبۃ الاحسان گرین مارکیٹ چوک بازار بنوں
- ★ کوہاٹ — مکتبۃ المدینہ کمال پلازہ کوہاٹ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انتساب

والدین مکرمین کے نام
جن کی
علمی وعملی تربیت
اور دعائے سحر گاہی
نے مجھ ایسے
کم مایہ کو اس
قابل بنایا کہ
ضیوف الرحمٰن
دینی تلامذہ کی
خدمت میں ایک مفید تالیف پیش کر سکا۔!

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ھَدِیۂ تبریک

یہ ہدیہ اُمّتِ مُسلمہ کے ان خُوش نصیب فرزندوں کی خدمت میں پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں یہ وہ مُبارک ہستیاں ہیں کہ جن کے لیے کائنات کی سب سے بڑی، مبارک و مکرّم و مُستجابُ الدّعوات شخصیت (فداہ ابی و امّی) صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ان الفاظ میں دُعاء کی ہے۔

نَضَّرَ اللہُ عَبدًا سَمِعَ مَقالَتِی فَحَفِظَھا وَ
وَعَاھَا وَاَدّاھا فَرُبَّ حَامِلِ فِقہٍ غیرِ فقیہٍ
ورُبَّ حَامِلِ فِقہٍ اِلٰی مَن ھُوَ اَفقَہُ مِنہُ۔

(مشکوٰۃ شریف)

ترجمہ : اللہ تعالیٰ اس بندے کو تر و تازہ اور خُوش و خُرّم رکھے جس نے میری بات کو سُنا اور سُن کر یاد کر لیا، پھر اس کو محفوظ رکھا اور اس کو آگے پہنچا دیا (ایسے شخص کی یہ خدمت واقعی قابلِ قدر ہے) اس لیے کہ ہوسکتا ہے کہ بعض دین کی بات محفوظ رکھنے والے ایسے ہوں جو خود اس کی زیادہ گہری سمجھ نہ رکھتے ہوں اور ہوسکتا ہے کہ وہ آگے کسی شخص کو یہ بات پہنچا دے جو اُس سے زیادہ فقہی بصیرت رکھنے والا ہو۔

کتنے خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو یہ دعائیں لے رہے ہیں۔
کتنے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کو یہ بشارتِ عظمیٰ دی گئی۔

اللّٰھُمَّ اجعلنَا مِنھُم

اٰمین یَارَبَّ العٰلَمِین

فہرس الجزء الاوّل

مِن

اَسعدِ المفَاتیح — فی حلِّ مَباحثِ — مشکوٰۃِ المصَابیح

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُخنہائے گُفتنی

بگیر ایں ہمہ سرمایۂ بہار از من
کہ گُل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند

اَلحَمدُ للّٰہِ الّذی فَتحَ قلوبُ العلمَآء بمفَاتیحِ الایمان وشرح صدور العُرفاء بمصابیح الایقان وافضل الصلوات واکمل التحیات علیٰ صدر الموجودات وبدر المخلوقات احمد العٰلمین وامجد العالمین مُحمَّد المحمُود فی اقوالہٖ وافعالہٖ المنور مشکاۃ صدرہٖ بانوار جمالہٖ واسرار کمالہٖ وعلیٰ اٰلہٖ واصحابہٖ حملۃ علومہٖ ونقلۃ اٰدابہٖ : اَمّا بعد !

فیقول العبد الضعیف البالغ من الضّعف منتہاہ المذنب الذلیل الراجی عفور بّہٖ ورحمۃ مولاہ المسمّٰی بکنیۃ ابوالاسعاد یوسف الجاجروی منسبًا والحنفی مسلکًا غفراللّٰہ ولوالدیہ ومشایخہٖ واولادہٖ واخوانہٖ واقاربہٖ واحبابہٖ ولمن لہُ حق علیہ ومن رفع یدیہ حذو منکبَیہ لیحسن بالدعاء الصالح الیہ ومن قرأ

علیه بفاتحة الكتاب فصاعدًا - و من استغفر له قائمًا او قاعدًا و یرحم الله عبدًا قال آمینا سواء جهرًا و اخفیٰ - فانه تعالیٰ یعلم السرّ و اخفیٰ -

سنہ ۱۴۰۱ھ راقم الحروف شریک درجہ موقوف علیہ تھا اور جامعہ بدر العلوم کے افادہ بخش دستور کے مطابق حضرت الاستاذ قبلہ والدِ مکرم رحمۃ اللہ علیہ کے درسی افادات قلم بند کر رہا تھا۔ ابتداء میں یہ بات کہیں حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھی کہ اپنی شکستہ تحریر کو منضبط و مرتّب بھی کرنا ہوگا لیکن ایک موہوم سی امید ضرور تھی کہ " کُلُّ امرٍ مَرھونٍ باوقاتِہٖ" کے تحت ضرور اسے زیرِ اشاعت لانا ہے۔ دورہ حدیث سے قبل سال میں حدیث کے مقبول اور جامع منتخب مجموعہ (مشکوٰۃ المصابیح) کا درس ہوتا ہے۔ جس کا مقصد طلباء کو دورہ حدیث کے لیے تیار کرنا اور ان میں دورہ حدیث والے سال بیان ہونے والی فنی مباحث کو اچھی طرح سمجھنے کی استعداد پیدا کرنا ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اس درجہ کو موقوف علیہ کہا جاتا ہے۔ اور اسی مناسبت سے دورہ حدیث کے مباحث نسبۃً کم لبسط و تفصیل کے ساتھ درس مشکوٰۃ شریف کے دوران بھی بیان کیے جاتے ہیں۔

استاذی و والدی المکرّم نوّر اللہ مرقدہما کے درس مشکوٰۃ شریف کا شمار بھی مقبول ترین دروسِ حدیث میں ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہر سال طلباء حدیث کی ایک اچھی خاصی تعداد اپنی علمی پیاس بجھانے کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتی اور اس چشمۂ فیض سے سیراب ہوتی "فَلِلّٰہِ الْحَمْدُ"، دَارُ الفناء سے دَارُ البقاء کی طرف رحلت فرمانے کے بعد دینی چشمہ کے فیض کا انقطاع ایک دینی و علمی انخلاء اور نقصان تھا لیکن صد حمد و ستائش کے لائق وہ ذات بابرکات ہے کہ جس نے اس نا اہل انسان کو محض اپنے فضل و کرم سے یہ توفیق عطا فرمائی کہ وہ ان غیر منضبط اوراق و تحریر کو اپنی ناقص و کم فہم و عقل کے مطابق تسوید و تبویب کے سانچہ میں شائقین علوم نبویہ کے سامنے پیش کر رہا ہے یہ نا اہل انسان اس مقدّس کام میں کہاں تک کامیاب و کامران رہا ہے۔ یہ ناظرین و قارئین مُنتفعین بَاتمکین پر موقوف ہے کہ اپنے عقل سلیم کے مطابق جو فیصلہ فرما دیں لیکن اتنا ضرور ہے

ع شہانِ بے کمر و تاجدارِ بے کلہ اند

نیز مجھے اس کام میں کن مراحل سے گذرنا پڑا اور کیا کچھ سننا پڑا یہاں تک کہ بقول کسی یہ کام صرف شہرت کے لیے ہے مگر میں اس کا کیا جواب دوں بس اتنا ہی کافی ہے کہ یہ معاملہ روزِ حشر پر چھوڑ دیا جائے ۔ ثانیاً اگر شہرت اتنی سستی ہے تو یہ کام ان سے بھی تو لیا جا سکتا ہے لیکن سچ ہے کہ اس دنیا میں نیت باصواب کی ضرورت ہے ۔ اور (مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِيقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ) کائنات کا تمام نظام مشیّتِ ایزدی کے تابع ہے ۔ جو شخص بھی کوئی اچھا کام کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی توفیق ہی اس کے شاملِ حال ہوتی ہے اگرچہ احادیث رسول اللہ ؐ کو ان کے گراں قدر اور بے شمار تحقیقات اور شروحات کی موجودگی میں اس نااہل کی حقیر سی خدمت کی بالکل ضرورت ہی نہیں تھی ۔ مگر اس کا کیا علاج ہے کہ یہ نااہل انسان تو محتاجِ خدمت ہے ۔

ے

حریفاں بادہا خوردند و رفتند
تہی خمخانہا کردند و رفتند

کچھ کتاب "اسعد المفاتیح" کے بارے میں

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسعد المفاتیح کے متعلق چند وضاحتیں پیشِ خدمت کر دی جائیں :-

اولاً : اسعد المفاتیح میں جس متن کو اختیار کیا گیا ہے وہ بہت سے متون کو سامنے رکھ کر تقابل دینے کے بعد جو متن اغلاط سے پاک وصاف تھا اسے منتخب کر کے تحریر کر دیا ہے ۔

ثانیاً : کوشش یہ کی گئی ہے کہ جس حدیث پر بحث ہو اسے مکمل نقل کیا جائے مگر بعض مقام پر طویل المتن ہونے کی وجہ سے کچھ حصّہ کو نقل کر کے بقیہ کو شرح مفردات پر محوّل کر دیا گیا ہے ۔

ثالثاً: کتاب میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ پہلے مفردات کی شرح کی جائے اور بعدہٗ خلاصہ وحاصل الحدیث اور آخر میں فقہی بحث یا جو بحث حدیث پاک میں ہو اس کو بیان کر دیا ہے۔

رابعاً: فقہی وغیر فقہی بحث میں طرز استدلال وطرز بحث یوں ہے کہ اولاً مذاہب بعدہٗ استدلالات اور آخر میں جوابات نقل کر دیے گئے ہیں۔

خامساً: مفہوم حدیث میں جو بات بندہ کو حضرت شیخ سے نہیں مل سکی وہ کتب مطولہ کے مطالعہ سے اخذ کر کے بقول ابو الاسعاد سے بیان کر دی گئی ہے۔ مگر بعض مقامات پر اختلاف کی وجہ سے بھی اپنی بات کو اس قول سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مثلاً باب اثبات عذاب القبر میں بحث ثالث کیفیت عذاب القبر میں حضرت شیخ رح کی تحقیق جو بندہ کو حاصل ہوئی وہ یہ ہے کہ عذاب فقط رُوح کو ہوتا ہے جب کہ ساتھ ساتھ یہ بھی بیان فرمادیا ہے کہ اَحناف حضرات کے ہاں اس مسئلہ میں تفویض وتوقیف ہے۔ جب کہ میرے نزدیک عذاب رُوح مع الجسد عنصری پر ہوتا ہے۔ اس بحث کا تعلق بھی میری ذاتی تحقیق سے ہے نہ کہ حضرتؒ کے فوائد وغیرہ سے "مَنْ شَآءَ فَلْيَأْخُذْ وَمَنْ شَآءَ فَلْيَتْرُكْ۔

سادساً: یہ بات آپ کو بہت کم ہی شروحات میں ملے گی کہ ہر حدیث کو لیا جائے اور اس پر حسبِ توفیق ایزدی بحث کی جائے۔ بفضل اللہ وبرحمۃ اللہ اسعد المفاتیح میں من اوّلہٖ الیٰ آخرہٖ ہر حدیث پر بحث کی گئی ہے۔ اور کسی حدیث کا سقوط آپ کو نہیں ملے گا۔ البتہ مکرر متن سے اجتناب کیا گیا ہے۔

سابعاً: کسی اختلافی مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے افہام وتفہیم کے لیے اس مسئلہ کو ترجمۃ الباب میں علیحدہ شکل کے اندر تحریر کیا گیا ہے تاکہ طائرانہ نظر سے ہی حاصل اختلاف واضح ہو جائے جب کہ یہ طریق کم ہی شروحات میں آپ کو ملے گا۔

ثامناً: شرح مذکور میں جن آیات مقدسہ اور احادیث مبارکہ سے استدلال کیا گیا ہے۔ بقاعدہ اس کا حوالہ دیا گیا ہے تاکہ اصل کی طرف مراجعت کرنے میں آسانی رہے۔

تاسعًا[۹] : اَسعدُ المفاتیح میں جس حدیث پر بحث کی گئی ہے اس کے اختتام پر صحابی رسولؐ مذکور السند کو اسمائے رجال کی شکل میں بیان کر دیا گیا ہے تا نکہ قاری دراوی حدیث میں ربط و علاقہ قائم رہے۔

عاشرًا[۱۰] : حد لقبی کی حد تک تو اس کی وجہ تسمیہ ظاہر ہے البتہ حد اضافی پر نظر کی جائے تو پسرِ عزیز باتمیز المعروف "اَسعد محمُود" کے نام نامی کی طرف تلمیح ہے۔ احقر کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنے جدِّ امجد کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ

مَلحُوظہ

علماء کرام وطلباءِ عظام سے گذارش ہے کہ اَسعدُ المفاتیح میں جہاں بھی عبارت میں سقم (کمزوری) یا کسی مسئلہ میں غلطی محسوس کریں تو اس سے احقر کو ضرور مطلع کریں۔ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ العزیز معقول اغلاط کی درستگی میں کوئی تأمل نہ ہوگا۔ اور آگاہ کرنے والے حضرات کے شکریہ کے ساتھ غلطی کی اصلاح کو ذمہ داری سمجھا جائے گا۔

وَاللّٰہُ عَلٰی مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ دُمْتُمْ سَالِمِيْنَ وَفَارِحِيْنَ
رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَتُبْ
عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ

اَلعَبدُ الاثیم

المدعو بابی الاسعاد صانہ اللہ عن الشر والفساد یوسف جاجروی غفرلہ الکریم

۵ رجب المرجب ۱۴۲۳ھ مورخہ ۵ ستمبر ۲۰۰۲ء خادم التدریس وحال نزیل

بیدر العلوم رحیم یار خان

بَیَانُ مَا یتعلّقُ بالمِشکوٰۃِ

فائدہ

یَقولُ ابوالاِسعادصَانہ اللہ عَن الشَّرِّ والفسَاد بتوفیق ربہ الاٰحادِ ! واضح رہے کہ لفظ مشکوٰۃ المصابیح کی اضافت سے معلوم ہوتاہے کہ یہاں دو کتابیں ہیں ایک مشکوٰۃ ، دوسری مصابیح لہذا ہر ایک کے متعلق علیحدہ حالات کو سپردِقلم کیاجارہاہے۔

نام ونسب

نام محمد (یا محمود) کنیت ابوعبداللہ لقب ولی الدین اور والدکا نام عبداللہ ہے۔ نسبًا عمری ہیں اور خطیب تبریزی سے مشہور ہیں اپنے وقت کے محدث علّام اور فصاحت و بلاغت کے امام تھے۔ حدیث پاک میں آپ کا امتیازی کام یہ مشکوٰۃ شریف ہے۔ نیز آپ کے بلند مقام کا اندازہ اس سے ہوسکتاہے کہ آپ کے جلیل القدر اُستاذ علامہ طیبیؒ نے آپ کا تذکرہ بقیۃ الاٰولیاء ، قطبُ الصّلحاء کے الفاظ سے کیاہے۔

ولادت باسعادت

اکثر محدثین حضراتؒ نے تاریخ ولادت ذکر نہیں فرمائی۔ بعض محدثین حضرات کے نزدیک علامہ خطیب تبریزی کی ولادت ۶۶۰ھ یا بقولِ دیگر ۶۶۵ھ بروز شنبہ بوقتِ طلوع شمس ہوئی۔

علم وفضل اور کمال میں آپ کا مقام

علم وفضل میں آپ کو جو مقام حاصل تھا وہ آپ کی تالیف مشکوٰۃ المصابیح کی مقبولیّت اور نافعیّت سے واضح ہوجاتاہے۔ حضرت مُلّا علی قاریؒ نے مرقاۃ ج۱ ص۲ میں آپ کا تذکرہ ان الفاظ سے فرمایاہے۔

لَمَّا کَانَ کِتَابُ مِشْکوٰۃِ المَصَابِیحِ الَّذِیْ اَلَّفَہٗ	ترجمہ : جب کہ کتاب مشکوٰۃ المصابیح جس کی تالیف کی مولانا بڑے

مَوْلَانَا الْبَحْرُ الْعَلَّامَۃُ وَالْبَحْرُ الْفَهَّامَۃُ مُظْهِرُ الْحَقَائِقِ وَمُوْضِحُ الدَّقَائِقِ الشَّیْخُ التَّقِیُّ النَّقِیُّ الخ ۔	عالم، علامہ اور علم و دانش کے دریا حقائق کے ظاہر کرنے والے اور دقائق کے وضاحت کرنے والے شیخ جو متقی ہیں، پاک صاف ہیں ۔

سببِ تصنیفِ مشکوٰۃ

مصابیح میں حدیث کا مأخذ اور راوی مذکور نہیں تھا اس طرز پر بعض اہلِ علم کو کلام تھا کیونکہ حوالۂ کتاب نہ ہونے کی وجہ سے تلاش ماخذ میں بہت دِقّت ہوتی ہے اور ذکر سند کے بغیر صحتِ حدیث پر پورا اعتماد نہیں ہوتا ۔ علامہ طیبیؒ اور مؤلفؒ نے اس کا احساس کرکے باہم مشورہ کیا اور بالآخر مصابیح کی تکمیل کا کام مؤلفؒ کے سپرد ہوا ۔ چنانچہ آپ نے راوی اور مأخذ کے ساتھ ساتھ فصلِ ثالث کا بھی اضافہ فرمایا اور بہت تتبع اور تلاش کے بعد کئی سالوں میں نہایت محنت کے ساتھ مشکوٰۃ المصابیح مرتب فرمائی اور جن احادیث کا حوالہ نہ مل سکا وہاں بیاض چھوڑ دیا ۔ اس کے بعد محشّین اور شارحین نے اس کو پورا کیا لیکن بعض جگہ اب بھی بیاض باقی ہے ۔

سوال

صاحبِ مصابیح پر علماء کا اعتراض بہ سبب ترک ذکر اسناد کے تھا وہ بات تو اب بھی باقی رہی کیونکہ صاحبِ مشکوٰۃ نے فقط صحابی اور کتاب کا نام ذکر کیا ہے اور تمام سند ذکر نہیں کی ۔

جواب

صاحبِ کتاب کا نام ذکر کر دیا تو گویا پوری سند حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک بیان کر دی کیونکہ خود اس صاحبِ کتاب نے پوری سند ذکر کی ہے ۔

وجہ تسمیہ مشکوٰۃُ المصابیح

مشکوٰۃ کے لغوی معنیٰ ہیں دیوار کے اندر کا وہ طاقچہ جس میں چراغ رکھا ہو ۔ تو مصنفؒ کا مطلب یہ ہے کہ محی السنۃ کی کتاب " المصابیح " مثل چراغ کے ہے اور میری کتاب (مشکوٰۃ) معمولی درجہ کی مثل طاقچہ کے ہے جو چراغ سے کم درجہ رکھتا ہے تو اس میں مصنفؒ نے نہایت درجہ کا ادب اختیار کیا ہے ۔ یا مصابیح سے مراد احادیث

رسول ہیں۔ تو احادیث رسول مظروف ہیں اور میری کتاب ظرف کے درجہ میں ہے جو مظروف سے کم درجہ رکھتی ہے۔

یقول ابوالاسعاد : مصابیح کا لغوی معنیٰ چراغ ہے لیکن اس سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں ہیں اور وہ بمنزلہ چراغ کے ہیں۔ جس طرح چراغ کے ذریعہ ظلمت دور ہوکر اجالا ہوتا ہے اسی طرح حدیثوں کے ذریعہ سے باطنی ظلمت دور ہو کر ایمان کی روشنی پھیلتی ہے لیکن احادیث کے منتشر ہونے اور بلا سند و مخرج کی وجہ سے ان کی روشنی کچھ کم تھی۔ ہر ایک کو ان سے روشنی حاصل کرنا ممکن نہ تھا۔ صاحب مشکوٰۃ نے ان کو سند کے ساتھ باحوالہ یک جا جمع کیا۔ لہٰذا اس کی روشنی و افادیت میں اضافہ ہوگیا تو گویا یہ کتاب احادیث کے لیے بمنزلہ طاق ہوگئی

احادیث مشکوٰۃ کی تعداد

مصابیح میں کل چار ہزار چار سو چونتیس (۴۴۳۴) احادیث تھیں۔ صاحب مشکوٰۃ نے ان میں پندرہ سو گیارہ (۱۵۱۱) احادیث کا اضافہ فرمایا۔ تو اس طرح مشکوٰۃ شریف میں احادیث کی کل تعداد پانچ ہزار ۹ سو پینتالیس (۵۹۴۵) ہوئی۔ مشکوٰۃ شریف میں کل فصول کی تعداد ایک ہزار اڑتیس (۱۰۳۸) ہے۔ اور کل ابواب کی تعداد تین سو ستائیس (۳۲۷) اور کل کتب کی تعداد انتیس (۲۹) ہے۔

وفات حسرت آیات

صاحب مشکوٰۃ کا سالِ وفات باوجود تحقیق معلوم نہ ہوسکا۔ البتہ یہ یقین ہے کہ ۷۳۷ھ کے بعد وفات ہوئی ہے کیونکہ بروز جمعہ ماہ رمضان ۷۳۷ھ میں تو اس تالیف سے فراغت ہوئی ہے۔ جیسا کہ صاحبِ مشکوٰۃ نے آخر کتاب میں تصریح کی ہے۔ بعض حضرات نے اندازہ لگا کر سالِ وفات ۷۴۸ھ ذکر کیا ہے اور صاحب تاریخ حدیث نے ۷۴۰ھ مانا ہے۔

حالات صاحب مصابیح

نام و نسب ۔ حسین نام، کنیت ابو محمد، لقب محی السنۃ، والد کا نام مسعود فراء بغوی سے مشہور ہیں، ابن الفراء بھی کہلاتے ہیں۔

محی السنۃ کے لقب کی وجہ تسمیہ

آپ کے لقب محی السنۃ کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے حدیث پاک کی ایک کتاب شرح السنۃ تالیف فرمائی۔ جب اس کی تالیف سے فارغ ہوئے تو خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔
" اَحْیَاكَ اللّٰہُ كَمَا اَحْیَیْتَ سُنَّتِیْ "، آپ کے اسی ارشاد گرامی کی بناء پر ان کا لقب محی السنۃ مشہور ہو گیا۔

فراء کی وجہ تسمیہ

لغتِ عرب میں فرو پوستین کو کہتے ہیں ان کے آباء و اجداد میں سے کوئی پوستین سی کر فروخت کرتا تھا اس لیے ان کو فراء اور ابن الفراء کہتے ہیں۔ عند البعض آپ کے والد ماجد حضرت مسعود بھی کام کرتے تھے۔

بغوی کی وجہ تسمیہ

اَلْبَغَوِیُّ یہ بغ یا بغشور کی طرف نسبت ہے یہ علاقہ خراسان میں ہرات اور مرو کے درمیان ایک بستی ہے اس کو بغا بھی کہتے ہیں۔ اس کی طرف نسبت کرتے ہوئے آپ کو بغوی کہ دیا جاتا ہے۔ اگر یہ بغشور کی طرف نسبت ہے تو بغشور مرکب امتزاجی ہے، بغ اور شور سے مرکب ہے۔ مرکب امتزاجی کی طرف نسبت کرنے کے دو طریقے ہیں۔

اوّل: یہ کہ پورے مرکب امتزاجی کے آخر میں یاء نسبت لگا دی جائے اس کے مطابق بغشوری ہونا چاہیے تھا۔

دوم: یہ کہ مرکب امتزاجی کے دوسرے جزء کو حذف کر کے یاء نسبت جزء اول میں لگا دی جائے جیسے مَعْدِ یْكَرِب کی طرف نسبت کرتے ہوئے مَعْدِیْ کہ دیا جاتا ہے

اس قسم کی مثالیں کلامِ عرب میں بکثرت ملتی ہیں ۔ یہاں بھی اسی طریقہ کے مطابق لبغشور سے بَغَوِی بن گیا۔

فائدہ یَقُولُ اَبُوالاِسْعَاد : بَغ کے آخر میں یاءِ نسبت لگنے سے بَغِیّ بنتا ہے نہ کہ بَغَوِیّ پھر بَغَوِیّ کیسے بنا؟

جوابِ اوّل یہ ہے کہ لفظ بَغ لفظ دم کے ساتھ ملتا جلتا ہے اور دم اسماءِ محذوفۃ الاعجاز میں سے ہے ۔ اسماءِ محذوفۃ الاعجاز ان اسماء کو کہتے ہیں جن کا آخری حرف حذف ہوچکا ہو۔ اسماءِ محذوفۃ الاعجاز کے بارہ میں ضابطہ یہ ہے کہ جب ان کے آخر میں یاءِ نسبت لگا دی جائے تو وہ گرا ہوا حرف واپس آجاتا ہے ۔ چنانچہ دَم کے آخر میں یاءِ نسبت لگائیں تو دَمَوِیّ بن جائے گا۔ بَغ اگرچہ اسماءِ محذوفۃ الاعجاز میں سے نہیں ہے لیکن چونکہ ان سے ملتا جلتا ہے اس لیے اس کے ساتھ بھی معاملہ کیا گیا اس لیے بَغَوِیّ بن گیا۔

جوابِ دوم اسی طرح کرنے میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اگر بَغِیّ رہنے دیا جاتا تو معنیٰ میں التباس کا خطرہ تھا کیونکہ بَغِیّ کا معنیٰ بدکار ہوتا ہے تو بَغَوِیّ میں اس التباس کا خطرہ نہیں۔

زُہد وورع تمام عمر تصنیف وتالیف اور حدیث وفقہ کے درس میں مشغول رہے ، ہمیشہ باوضو درس دیتے اور زہد وقناعت میں زندگی گزارتے تھے ۔ اِفطار کے وقت خشک روٹی کے ٹکڑے پانی میں تر کر کے کھاتے تھے۔ جب شاگردوں نے اصرار کے ساتھ کہا کہ خشک روٹی کھانے سے دماغ میں خشکی پیدا ہوجائے گی تو بطور نانخورش (سالن) کے روغن زیتون استعمال کرنے لگے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی زوجۂ محترمہ کا انتقال ہوا اور کافی مال چھوڑ کر راہی ملکِ بقار ہوئیں لیکن آپ نے اس کی میراث سے کوئی چیز نہیں لی ۔

گر نہیں دولت تو صدمہ کچھ نہیں
دل غنی رکھتے ہیں شکوہ کچھ نہیں۔

(ازل لکھنوی)

آپ کے تبحّرِ علمی کی شہادتیں

بڑے بڑے اکابر مُحدّثین نے آپ کے بلند مرتبہ کی شہادت دی ہے

مثلاً حافظ ذھبیؒ فرماتے ہیں:

اَلْبَغَوِيُّ الْإِمَامُ الْحَافِظُ بُوْرِكَ لَهٗ فِيْ تَصَانِيْفِهٖ لِقَصْدِهِ الصَّالِحِ فَإِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْعُلَمَاءِ الرَّبَّانِيِّيْنَ كَانَ ذَا الْعِبَدِ وَنُسُكٍ وَقِنَاعَةٍ بِالْيَسِيْرِ: (تذکرۃ الحفاظ صد ۵۴ ج ۴)

ترجمہ: آپ کے نیک عزم کی وجہ سے آپ کی تصانیف میں برکت عطا ہوئی تھی اس لیے کہ عُلماءِ ربّانیین میں سے ہیں۔ آپ عبادت گذار جج کرنے والے اور تھوڑے پر قناعت کرنے والے تھے۔

علّامہ سُبکیؒ فرماتے ہیں:

كَانَ إِمَامًا جَلِيْلًا وَرِعًا زَاهِدًا فَقِيْهًا مُحَدِّثًا مُفَسِّرًا جَامِعًا بَيْنَ الْعِلْمِ وَالْعَمَلِ سَالِكًا سَبِيْلَ السَّلَفِ لَهٗ فِي الْفِقْهِ الْيَدُ الْبَاسِطَةُ:

ترجمہ: آپ جلیلُ القدر امام متقی پرہیز گار، فقیہ، محدّث، مفسّر علم و عمل کے جامع اور سلف کے طریق کے پیروکار تھے۔ آپ کو فقہ میں یدطولیٰ حاصل تھا (فوائد جامعہ صد ۱۹۴ بحوالہ طبقات الکبریٰ للسبکی صد ۲۱۴)

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب مُحدّث دھلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وے جامع است در سہ فن وہریک را بکمال رسانیدہ است محدّث بے نظیر و مفسر بے عدیل وفقیہ شافعی صاحب فقہ است (بستان المحدثین فارسی صد ۱۳۷)

ترجمہ: آپ تین فنون میں جامعیت رکھتے تھے اور ہر ایک کو کمال تک پہنچایا تھا، آپ بے نظیر محدّث اور بے مثال مفسر اور فقہ شافعی کے فقیہ تھے۔

ولادت ووفات

آپ کی ولادت سنہ ۴۳۶ھ میں ہوئی اور وفات راجح قول کے مطابق سنہ ۵۱۶ھ ماہ شوال میں ہوئی اور اپنے استاذ قاضی حسین کے جوار طالقان میں مدفون ہوئے۔

دیباچہ مشکوٰۃ شریف

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ ـــــ ۱

(ترجمہ) تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ ہی کو زیبا ہیں۔ ہم اس کی تعریف کرتے ہیں اور اسی سے مدد کے طالب اور بخشش کے خواستگار ہیں۔

تشریح

خداوندِ قُدّوس کی تعریف جیسی کہ اس کی شان کے مناسب اور لائق ہے کسی بندہ سے ادا نہیں ہوسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ امام الانبیاء فخرِ رسل جناب محمدِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

لَآ اُحْصِیْ ثَنَآءً عَلَیْكَ	ترجمہ: نہیں شمار کرسکتا تیری تعریف کو
اَنْتَ كَمَآ اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِكَ	تو ایسا ہی ہے جیسا کہ تو نے اپنی تعریف کی ہے۔

(مشکوٰۃ شریف ص۸۴ ج ۱ باب السجود وفضلہ)

اس لیے مُصنّف علیہ الرحمۃ خُداوند تعالیٰ سے مدد کا طالب ہے کہ اس کی زبان وبیان کو اتنی طاقت عطا کر کہ جس سے وہ اپنے پروردگار کی حقیقی تعریف وتوصیف کرسکے۔

ثانیاً: اگر بتقاضائے بشریت آنجناب پروردگار کی تعریف وتوصیف میں کچھ کوتاہی ولغزش (جس کا وقوع یقینی ہے) ہوجائے جو شانِ الوہیت کے منافی ہو تو اس سے مصنفؒ بخشش اور معافی کا خواستگار ہے جو نَسْتَغْفِرُہٗ سے مُترشّح ہے۔

سوال: مُصنّفؒ نے اپنی کتاب کو بِسْمِ اللّٰہِ و حَمْدِ اللّٰہِ سے کیوں شروع فرمایا؟

جواب: یہ ہے کہ مُصنّفؒ نے اپنی کتاب کو بِسْمِ اللّٰہِ وحَمْدِ اللّٰہِ سے شروع کرکے تین چیزوں کی اتباع کی ہے۔

اوّلاً: حدیث قولی کی اتباع کی ہے۔ مثلاً حضرت ابُوہریرہؓ کی روایت ہے

قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کُلُّ اَمْرٍ ذِیْ بَالٍ لَایُبْدَأُ بِبِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ فَھُوَ اَقْطَعُ :

ترجمہ : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس مہتم بالشان کام کی ابتدا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے نہ کی گئی ہو وہ بے برکت ہوتا ہے (غایۃ السعایہ ص۴۲ ج۱)

ایک روایت میں بحمد اللہ ہے :۔

وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کُلُّ اَمْرٍ ذِیْ بَالٍ لَایُبْدَأُ فِیْہِ بِالْحَمْدُ لِلّٰہِ فَھُوَ اَقْطَعُ ۔ (مشکوٰۃ شریف ص۲۷۲ ج۲ کتاب النکاح باب اعلان النکاح والخطبۃ)

ترجمہ : سیدنا ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کام کو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کے ساتھ شروع نہ کیا جائے وہ بے برکت اور اَبتر ہوتا ہے۔

ایک روایت میں کُلُّ اَمْرٍ کے بجائے کل کلامٍ کے الفاظ ہیں :۔

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کُلُّ کَلَامٍ لَایُبْدَأُ فِیْہِ بِحَمْدِ اللّٰہِ فَھُوَ اَجْزَمُ (ابوداؤد شریف ص۳۱۲ ج۲ کتابُ الادب بابُ الھَدْیِ فی الکلام)

ترجمہ : حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس اہم اور عظیم الشان کلام کو خدا کی حمد وثناء کے بغیر شروع کیا جائے وہ بے برکت ہوتی ہے

یقول شیخ جاجروی رحمہ القوی : روایات مذکورہ ثلاثہ کے الفاظ مختلف سے تعارض قائم نہ کیا جائے جیسے کہ بعض غیر فن والوں نے تعارض پیدا کیا اور اس کے جوابات دینے کی کوشش کی اور ابتداء کی اقسام نکالیں۔ حقیقی اضافی عرفی کسی کو حقیقی پر محمول کیا اور کسی کو اضافی یا عرفی پر، حالانکہ یہ سب بے جا ابحاث مطوّلہ ہیں کیونکہ فنِ حدیث کے ماہرین کو خوب معلوم ہے کہ یہاں کوئی تعارض نہیں ہے کیونکہ تعارض وہاں ہوتا ہے جہاں حدیثیں دو ہوں اور راوی

حدیث یعنی صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی مختلف ہوں۔ حالانکہ یہاں حدیث اور راوی حدیث ایک ہے الفاظ مختلف ہیں لیکن سب کا مقصد ایک ہے کہ ذکر اللہ سے شروع کیا جائے۔ تو تمامی روایات مُتحد فی المقصود (یعنی ذکر اللہ) ہوئیں خواہ بِسْمِ اللّٰہِ ہو یا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ ہو یہی وجہ ہے کہ بعض طرقِ حدیث میں لَمْ یُبْدَأْ بِذِکْرِ اللّٰہِ کے الفاظ مبارکہ آئے ہیں چنانچہ حافظ عبد القادر رہاوی کی اربعین میں یہ الفاظ آئے ہیں: "کُلُّ اَمْرٍ ذِیْ بَالٍ لَا یُبْدَأُ بِذِکْرِ اللّٰہِ فَھُوَ اَقْطَعُ"۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے یہی بات فتح الباری میں فرمائی ہے کہ بِسْمِ اللّٰہِ حَمْدُ اللّٰہِ وَالصَّلٰوۃُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ کا قدرِ مُشترک ذکرُ اللہ ہے جس کے ضمن میں بھی ہو مامور بہ کی تعمیل ہو جائے گی، لہٰذا تعارض کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ثانیًا: حدیث فعلی کی اتباع کی ہے، حدیث فعلی یہ ہے کہ تواتر سے یہ ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل تھا کہ جب خطوط لکھواتے تھے تو بِسْمِ اللّٰہِ سے شروع کرتے تھے۔ تو مصنفؒ کی کتاب بمنزلے خطوط کے ہے اسی لیے بِسْمِ اللّٰہِ سے شروع کیا۔

ثالثًا: مصنفؒ نے اپنی کتاب کو بِسْمِ اللّٰہِ سے شروع کرکے قرآنِ مقدس مُطہّر منور کی اتباع کی ہے کیونکہ قرآن کریم کی سب سے پہلے آیت اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ نازل ہوئی لہٰذا اس کی اقتداء کی صورت یہی ہوگی کہ فقط بِسْمِ اللّٰہِ سے اِفتتاح کیا جائے!

قولہٗ: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ: ان جملوں کی تشریح بیان کرنے سے قبل ایک خارجی بحث ذہن نشین فرمالیں۔ مقام ہذا پر تین چیزیں بیان کی جاتی ہیں: اوّل حمد دوم مدح سوم شُکر۔ محدثین حضرات نے بحث کی ہے کہ ان تینوں میں فرق ہے یا مُساوی ہیں۔ اس بارے میں دو طائفے ہیں:۔

طائفہ اُولیٰ: ان حضرات کے نزدیک ان تینوں میں کوئی فرق نہیں یہ تمامی قریب المعنیٰ ہیں۔

طائفہ ثانیہ: مُحقّقین حضرات کے نزدیک ان تینوں جملوں میں فرق ہے اور تعریف میں نمایاں ہے۔

تعریف حمد

اَلْحَمْدُ ھُوَ الثَّنَآءُ بِاللِّسَانِ عَلَی الْجَمِیْلِ الْاِخْتِیَارِیْ سَوَآءٌ کَانَ نِعْمَۃً اَوْ غَیْرَھَا: حمد یہ ہے کہ کسی اچھے کام پر

تعریف کی جائے زبان کے ساتھ جو اس کے اختیار میں ہو برابر ہے کہ نعمت ہو یا نہ ہو۔ پھر جمیل دو قسم ہے
اوّل اختیاری : اس کی مثال کوئی عالم ہے قرآن پاک خوب یاد ہے۔
دوم غیر اختیاری : مثلاً حسین بہت ہے کسی کی محبت اس کی دل میں ہے۔
مَوردِ حمد جہاں سے حمدوارد ہوتی ہے وہ خاص زبان ہے کیونکہ تعریف ہمیشہ زبان سے ہوتی ہے اور مصدر بھی کہتے ہیں :
متعلّق حمد یہ عام ہے نعمت ہو یا نہ ہو جیسے کسی کی تعریف کی جائے اس میں کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو۔

تعریف مَدح هُوَالثَّنَاءُ بِاللِّسَانِ عَلَى الْجَمِيلِ الْاِخْتِيَارِيِّ وغیرها : کسی کی اچھے کاموں پر تعریف کی جائے لیکن عام ہے اختیاری ہو یا غیر اختیاری : مثال مَدَحْتُ اللُّؤْلُؤَ عَلٰى صِفَاتِهَا یوں نہیں کہیں گے حَمِدْتُ اللُّؤْلُؤَ عَلٰى صِفَاتِهَا مَدَحْتُ زَيْدًا عَلٰى حُسْنِهَا اَوْعَلٰى عِلْمِهَا وَلَا يُقَالُ حَمِدْتُ زَيْدًا عَلٰى حُسْنِهَا : خُلاصۃ الکلام یہ ہے کہ مدح عام ہے اختیاری اور غیر اختیاری دونوں کو شامل ہے بخلاف حمد کے کہ یہ فقط اختیاری کے لیے ہے۔

تعریفِ شُکر اَلشُّكْرُ فِعْلٌ يُنْبِئُ عَنْ تَعْظِيمِ الْمُنْعِمِ مِنْ حَيْثُ كَوْنِهٖ مُنْعِمًا : شکر ایک فعل ہے جو منعم (انعام دینے والا) کی تعظیم پر خبر دیتا ہے اس حیثیت سے کہ یہ ہمارا منعم ہے۔ پھر شکر کے تین درجات ہیں :۔
اوّل : زبان کے ساتھ اس کی تعریف کی جائے ۔ دوم : یا دل سے کہ دل میں اس کی محبت چھپی ہوئی ہو۔ سوم : ظاہری اعضاء سے ہو کہ ہاتھ پاؤں سے اس کی خدمت کرے۔
ان تینوں درجات کو کسی شاعر نے شعر میں سمو دیا ہے ؎

اَفَادَتْكُمُ النَّعْمَاءُ مِنِّيْ ثَلَاثَةً   يَدِيْ وَلِسَانِيْ وَضَمِيْرُ الْمُحَجَّبَاءُ

مُحجب کہتے ہیں جو بات دل میں چھپی ہو۔ ان درجات سے شکر کا مَورد عام بن جاتا ہے مگر متعلق عام نہیں بلکہ خاص ہے کہ نعمت ہو گی تو شکر بھی ہو گا نعمت نہیں تو شکر بھی نہیں۔
فائدہ اُولیٰ : اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کی الف لام اکثر مُصنّفین استغراق کی بناتے ہیں۔ تو

معنیٰ ہوگا کہ ہر حمد ازل سے لے کر ابد تک ساری کی ساری اللہ پاک کے ساتھ خاص ہیں۔

سوال : آپ نے تو ساری حمدیں اللہ پاک کے ساتھ خاص کر دیں جبکہ مخلوق کی بھی حمدیں ہوتی ہیں جس طرح نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا نام محمد واحمد ہے یعنی تعریف کیا ہوا۔

جواب : تو پھر نحوی حضرات اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ مصنوع کی تعریف گویا صانع کی تعریف ہے مگر اس پر بھی سوال ہوتا ہے۔

سوال : پھر اس طرح ایک مشرک اپنے خود ساختہ معبود (بت وغیرہ) کی جھوٹی تعریف اور عبادتیں کرتا ہے اور وہ بھی یہی کہتا ہے کہ اس کی تعریف گویا اللہ تعالیٰ کی تعریف ہے تو نحوی حضرات اس کا جواب دیتے ہیں کہ الف لام استغراق کی نہیں بلکہ الف لام جنس یا عہد خارجی کی ہے تو معنیٰ ہوگا کہ ہر حمد ازل سے لے کر ابد تک ما فوق الاسباب اللہ پاک کے ساتھ خاص ہے تو ماتحت الاسباب والی حمدیں خارج ہو جائیں گی۔

سوال : اس کی کیا وجہ ہے کہ مصنف علیہ الرحمۃ نے اپنی کتاب کے شروع میں حمد باری کے لیے دو قسم کے جملے لائے ہیں۔ ایک جملہ اسمیہ الحمد للہ اور دوسرا جملہ فعلیہ نحمدہٗ۔

جواب اوّل چونکہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا سلسلہ عمر بھر باقی رہتا ہے اس لحاظ سے جملہ اسمیہ لائے جو دوام پر دلالت کرتا ہے اور اس لحاظ سے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں نوع بنوع ہر گھڑی میں متجدد ہوتی رہتی ہیں۔ جملہ فعلیہ لائے جو تجدد و حدوث پر دال ہے۔

جواب دوم شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ لمعات میں فرماتے ہیں کہ ظاہر یہ ہے کہ الحمد للہ سے اس بات کی خبر دینا مقصود ہے کہ تمام محامد ذاتِ پاک کے ساتھ مخصوص ہیں اور نحمدہٗ سے انشائے حمد مقصود ہے گویا پہلا جملہ صورۃً ومعنیً خبریہ ہے اور دوسرا جملہ صورۃً خبریہ ہے معنیً انشائیہ ہے۔ اس صورت میں تکرار نہ رہیگا۔

جواب سوم یہ ہے کہ جملہ الحمد للہ اوّل پیدائش اور ابتدائے خلق سے انتہائے خلق تک تمام حامدین کی مطلق حمد کو شامل ہے اور جملہ نحمدہٗ میں خاص اپنی طرف سے اظہارِ حمد ہے۔

سوال مقتضیٰ ظاہر اَحْمَدُہٗ بصیغۃ الافراد تھا۔ مصنف علیہ الرحمۃ نے نَحْمَدُہٗ، جمع کہا ہے یہ ہے کہ بظاہر حمد کرنے والے تصنیف کرنے کے وقت تنہا مُصنّف علیہ الرحمۃ ہیں اس کی کیا وجہ ہے۔

جواب اوّل یہ ہے کہ صیغۂ جمع متکلم لاکر عظمت شانِ خداوندی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اس جامع الکمالات پاک ذات کی حمد اتنا بڑا کام ہے کہ اس کی ادائیگی کسی ایک کے اختیار میں نہیں اس لیے جمع کا صیغہ لاکر ہر حامد کو شریک کار کیا ہے خواہ اس کی حمد حالی ہو یا قالی۔

جواب دوم حضرت مُصنّف علیہ الرّحمۃ نے تواضعًا صیغۂ جمع اختیار فرمایا ہے مقصد یہ ہے کہ تنہا میری حمد اس قابل نہیں کہ اسے بارگاہِ ایزدی میں شرفِ قبولیت حاصل ہو اپنی حمد کو انبیاء کرام علیہم السّلام، اولیاءِ عظام اور صالحین مخلصین کی حمد کے ساتھ ملاکر پیش کیا تاکہ ان نفوس قدسیہ کی حمد کے ساتھ میری ناقص حمد بھی قبول ہوجائے۔

مسئلہ : مسئلہ یہ ہے کہ اگر مجلس واحدہ میں کئی چیزوں کا سودا ہوا ہو پھر ان میں سے بعض میں عیب نکل آئے تو اس صورت میں شریعت کا حکم یہ ہے کہ رد کرے تو سب کو کرے رکھے تو سب کو رکھے۔ عیب دار کو رد کردینا اور صحیح سالم کو رکھنا جائز نہیں (کما فی الھدایہ کتاب البیوع)

آمدم برسرِ مطلب : جب حق تعالیٰ نے ضعیف انسان (خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا) کو یہ تعلیم فرمائی ہے تو وہ کریم ذات خود بدرجہ اَولیٰ مخلوط چیزوں میں سے صحیح سالم رکھ کر عیب دار کو رد نہ فرمائیں گے بلکہ صحیح سالم کی برکت سے عیب دار کو بھی قبول فرمالیں گے چنانچہ جماعت کی نماز میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اعلیٰ کی برکت سے ادنیٰ مقبول ہوجائے۔

جواب سوم اپنے اخوان واصحاب پر شفقت اور ہمدردی کی وجہ سے جمع کا صیغہ لائے ہیں تاکہ اس اہم عبادت میں ان کو بھی شریک کرلیا جائے کمالِ ایمان کا مقتضیٰ یہ ہے کہ جو چیز اپنے لیے پسند کی جائے وہی دوسروں کے لیے بھی پسند کی جائے۔ "لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ۔"[1]

[1] بخاری ص۶ ج۱ باب من الایمان ان یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ!

فائدہ ثانیہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ والاجملہ، جملہ اسمیہ معدولہ عن الفعل ہے یعنی اصل میں یہ جملہ فعلیہ تھا فعلیہ سے عدول کرکے جملہ اسمیہ بنایا گیا عبارت یوں تھی حَمِدتُ اللّٰہَ حَمْدًا فعل حذف کرکے حمد پر الف لام داخل کردیا گیا الحمد للّٰہ بن گیا۔

دونوں جملوں میں فرق جملہ فعلیہ دلالت کرتا ہے تجدّد وانقراض پر یعنی ایک چیز آئے وہ ختم ہوجائے، پھر دوسری چیز آئے اس کی مثال بارش کی ہے کہ بارش کی ایک بوند آتی ہے، پھر دوسری آتی ہے۔ جملہ اسمیہ دلالت کرتا ہے دوام واستمرار پر اس کی مثال پرنالے کی ہے جس کو میزاب کہتے ہیں، پرنالے سے پانی لگاتار بہتا رہتا ہے یعنی جملہ اسمیہ ہمیشگی پر دلالت کرتا ہے۔

قولہ وَنَسْتَعِیْنُہٗ : نَسْتَعِیْنُ میں سین طلب کے لیے ہے بمعنٰی طلب المعونۃ عند البعض استعانت فی الحمد مراد ہے مگر عند الجمہور یہ غلط ہے اور یہ تخصیص بلا مخصص ہے اور مُستعان فیہ میں عموم ہے تو اب معنیٰ ہوگا "اَیْ نَسْتَعِیْنُہٗ فِی الْحَاجَاتِ الدُّنْیَوِیَّۃِ وَالدِّیْنِیَّۃِ کُلِّھَا (کما فی المرقات) استعانت کا مُجرّ دعون ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی حمد جیسے امرِ عظیم و دیگر امور میں اپنے عجز وقصور کا اعتراف کرتے ہوئے اس پاک وقادر مطلق ذات سے مدد کے طالب ہیں۔

سوال : یہ ہے کہ مُصنّف علیہ الرحمۃ نے اِیَّاہُ نَسْتَعِیْنُ (ہم اس سے مدد چاہتے ہیں) بعنوان حصر ذکر نہیں فرمایا اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب یہ ہے کہ مقامِ اختصاص کا ادراک وظیفہ خواص ہے ہر کس وناکس کا یہ مقام نہیں کہ دل کی سچائی سے یہ کہہ سکے کہ مشاہدۂ قدرت ہم پر اتنا غالب آچکا ہے کہ ہمارا کسی غیر کی طرف اب التفات ہی نہیں رہا۔ مطلب یہ کہ اعتقاد اس امر کا تو ہر مؤمن کو حاصل ہے لیکن اس کا استحضار صادق وظیفہ خواص ہے۔

قولہ وَنَسْتَغْفِرُہٗ : استغفار کی سین طلب کے لیے ہے بمعنٰی طلب المغفرۃ مطلب اس کا یہ ہے کہ حمد بیان کرنے میں جو تقصیرات ہم سے واقع ہوئی ہیں ہم ان سے معافی

کے طلب گار ہیں۔

فائدہ اُولیٰ مقام ہذا پر دو چیزیں ہیں: اوّل استغفار، دوّم توبہ مُحدّثین حضرات نے ان دونوں میں دو طرح کا فرق بیان کیا ہے۔

فرق اوّل توبہ دو قسم پر ہے اوّل توبہ از حق اللہ اس کے لیے تین شرائط ہیں:۔ ۱ ترک فی الحال ۲ عزم ترک فی الاستقبال ۳ ندامت فی الحال۔

دوّم توبہ از حق العباد: اس کے لیے چار شرائط ہیں تین شرطیں یہی ہیں۔ چوتھی شرط یہ ہے کہ وہ چیز ادا کر دے یا ابراء کرائے جب کہ استغفار میں یہ چیزیں نہیں ہیں فقط طلب معافی ہے۔

فرق دوّم توبہ صرف اپنے لیے کر سکتا ہے غیر کے لیے نہیں بخلاف استغفار کے اپنے لیے بھی کر سکتا ہے غیر کے لیے بھی۔ کقولہٖ تعالیٰ حاکیًا مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا، وفی مقامٍ اٰخر" رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ۔!

فائدہ ثانیہ استغفار دو قسم پر ہے اوّل استغفار مفرد کقول نوح علیہ السلام: اِسْتَغْفِرُوْا رَبَّکُمْ اِنَّہٗ کَانَ غَفَّارًا کقول صالح علیہ السلام لقومہٖ:" لَوْلَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ۔ دوّم: استغفار مقرون بالتوبہ: کقول شُعیب علیہ السلام " اِسْتَغْفِرُوْا رَبَّکُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَیْہِ اِنَّ رَبِّیْ رَحِیْمٌ وَّدُوْدٌ۔ وکقولہٖ تعالیٰ فی قصّۃ سیّدنا ھود علیہ السلام:" اِسْتَغْفِرُوْا رَبَّکُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَیْہِ یُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْکُمْ مِّدْرَارًا۔ پھر مُحدّثین حضرات نے ان دونوں قسموں کا فرق لکھا ہے کہ استغفار مُفرد توبہ کی طرح ہے لیکن جب توبہ و استغفار میں سے ایک کو دوسرے کے ساتھ مُتّصل کیا جاتا ہے تو دونوں میں فرق ہوتا ہے۔

فرق اوّل استغفار طلب وقایہ شر مامضٰی ہے اور توبہ طلب وقایہ شر مایخافہ فی المستقبل من سیئات اعمالہٖ گویا گناہ ماضی کے شر سے طلب وقایہ کو استغفار اور گناہ مُستقبل کے نہ کرنے پر جو عزم ہے اُسے توبہ کہا جائے گا۔

فرقِ دوم : استغفار من باب ازالۃ الضرر ہے اور توبہ جلبِ منفعت کے باب سے ہے

قولہٗ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا	ترجمہ : اور ہم اپنے نفس کی برائیوں اور اپنی بداعمالیوں سے خدا کی پناہ چاہتے ہیں ۔

قولہٗ نَعُوْذُ ۔ نَعُوْذُ مشتق ہے عَوْذٌ سے عَاذَ یَعُوْذُ عَوْذًا اس کا لغت میں معنیٰ ہوتا ہے " اَلْعَوْذُ ھُوَ الْمَنْعُ وَالْاِلْتِجَآءُ یعنی پناہ پکڑنا۔

قولہٗ اَنْفُسَنَا یہ جمع ہے نفس کی ، انسان دو چیزوں سے مرکب ہے یعنی جسم اور روح سے ۔ جسم کا تعلق عالم ناسوت کے ساتھ ہے اور روح کا تعلق عالم ارواح کے ساتھ ہے ان کا اکٹھا ہونا بوجہ تفرقِ عالم کے ممتنع تھا ۔ اللہ پاک نے ایک تیسری چیز پیدا فرمائی جس کا تعلق من وجہ روح کے ساتھ اور من وجہ جسم کے ساتھ ہے اس کا نام نفس ہے ۔ بعنوانِ دیگر جسم مادی چیز ہے اور روح غیر مادی ان کے رابطہ کے لیے نفس کو پیدا کیا۔

خُلاصۃُ الکلام یعنی حمد میں جو غفلات و تقصیرات ہم سے واقع ہوئی ہیں ۔ نیز اس کے علاوہ جن جن اسرافات و سیئات کا ہم شکار رہے ہیں ۔ سب سے معافی کے طالب ہیں۔

سوال مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا میں ظاہر طور پر تکرار معلوم ہوتا ہے کیونکہ اعمال سیئات جمیع نفس کے شرور میں داخل ہیں۔

جواب شُرُوْر سے مراد وہ برائیاں ہیں جو جبلۃً ہوں مثلاً حسد، کبر، بغض، کسل بالفاظ دیگر شرور النفس سے مراد اخلاق رذیلہ باطنی مراد ہیں اور سیئات سے مراد ظاہری برائیاں ہیں جو نتیجہ ہوتی ہیں شُرور کا ۔ مثلاً بغض حسد کی وجہ سے کسی سے لڑنا گالی دینا یہ سیئات میں داخل ہیں

فائدہ : جب شرور النفس سے باطنی برائیاں اور سیئات سے ظاہری برائیاں مراد ہیں تو عبارت کو مکمل کرنے کے لیے مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا سے پہلے لفظ ظُہُوْرِ مضاف کی شکل

میں مقدر ہوگا اصل عبارت یوں بنیگی" وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ظُهُوْرِ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا
اسی طرح مِنْ سَیِّئَاتِ سے پہلے لفظ اَعْمَالِنَا صفت الی الموصوف کی شکل میں مقدر ہوگا
اصل عبارت یوں بنیگی" وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ اَعْمَالِنَا السَّیِّئَاتِ۔

سوال مُصنّف علیہ الرحمۃ نے عبارت میں تمامی صیغوں کو جمع متکلم کی شکل میں کیوں ذکر کیا نَحْمَدُ، نَسْتَعِیْنُہٗ، نَسْتَغْفِرُ، نَعُوْذُ الخ

جواب اوّل: جمع متکلّم کے صیغے ذکر کرکے تمام امّت کو نیک فالی کے طور پر داخل کردیا۔
جواب دوم: کہ جمع متکلم کے صیغے ایک دو کے بجائے جماعت کے لیے بولے جاتے ہیں اور جماعت کی شکل میں دعا اجتماعی شکل اختیار کرلیتی ہے اور اجتماعی دعا جلد قبول ہوتی ہے بہ نسبت انفرادی کے۔

قولہ مَنْ یَّهْدِهِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ	ترجمہ: جس کو اللہ تعالیٰ نے سیدھا راستہ دکھایا اس کو کوئی بھٹکانے والا نہیں ہے۔

خُلاصَۃُ الْکلام مَنْ یَّهْدِهِ اللّٰہُ اَیْ مَنْ یُّرِدِ اللّٰہُ هِدَایَتَہٗ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ مِنَ الشَّیَاطِیْنِ: مطلب یہ ہے کہ ہدایت واضلال انہی کے قبضہ وقدرت میں ہے اس لیے ہم ان سے سوال ودرخواست کرتے ہیں کہ ہمیں ہر قسم کے ضلال سے محفوظ رکھے اور ہدایت سے نوازے رکھے۔

سوال: اہل السنّۃ والجماعۃ کا مسلک ہے کہ اعمال کا خالق اللہ پاک ہے کاسب بندہ ہے حالانکہ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا سے معلوم ہوتا ہے کہ خالق بندہ ہے۔

جواب تو مُصنّف علیہ الرحمۃ نے مَنْ یَّهْدِهِ اللّٰہُ کہکر جواب دیا کہ خالق اللہ تعالیٰ ہے نہ کہ بندہ! جس کی بیّن دلیل یہ ہے کہ ہدایت اس کی قدرت میں ہے جس کو چاہے دے اور جسے چاہے گمراہ کرے۔ یعنی پہلے جملہ میں جبریہ کی تردید تھی

اس میں قدریہ اور معتزلہ کی تردید ہے ۔ خلقِ افعالِ عباد کے مسئلہ کی توضیح ان شاء اللہ تعالیٰ باب الایمان بالقدر میں کی جائے گی ۔

فائدہ : ہدایت مقابل ضلالت ہے ، ہدایت وضلالت ہر دو معنوں میں مستعمل ہے ۔

تقسیمِ ہدایت : ہدایت دو قسم ہے **اوّل** ارارۃ الطریق بمعنیٰ راہ دکھلانا ۔ **دوم :** ایصال الی المطلوب بمعنیٰ منزل تک پہنچانا ۔

تقسیمِ ضلالت : **اوّل :** ارارۃ الطریق برائی کے اسباب پیدا کرنا ۔ **دوم** ایصال الی المطلوب برائی شرک وغیرہ کرانا ۔ یہاں ہدایت وضلالت کا قسم ثانی مراد ہے ۔

سوال یہ کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مقدس کو ھَادِیًا فرمایا اور یہاں فرماتے ہیں فَلَا ھَادِیَ لَہٗ

جواب کہ وہاں ہدایت سے مراد ارارۃ الطریق اور تبلیغ والارہ ہے ایصال الی المطلوب مراد نہیں ۔

قولہ وَمَنْ یُّضْلِلْ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ

ترجمہ : اور جس کو اللہ تعالیٰ نے گمراہ کر دیا اس کو سیدھی راہ دکھانے والا کوئی نہیں ۔

اَیْ یَرُدُّ جَھَالَتُہٗ عَنِ الْوُصُوْلِ اِلَی الْحَقِّ وَالتَّوْحِیْدِ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ مِنَ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ کَمَا فِیْ قَوْلِہٖ تَعَالٰی مَنْ یُّضْلِلِ اللّٰہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ ۔!

فائدہ : اکثر نسخوں میں یُضْلِلْ ہے یعنی بغیر ضمیر کے اور بعض میں یُضْلِلْہُ ضمیر کے ساتھ ہے مگر موجودہ نسخہ میں ضمیر نہیں ہے ۔

سوال : کہ کتاب میں یُضْلِلْ بحذف الضمیر ہے یعنی ضمیر نہیں ہے جو عائد ہو بطرف مَنْ

موصول حالانکہ صلہ اور موصول میں ضمیر کا ہونا ضروری ہے۔

جواب یہاں ضمیر محذوف ہے گویا اصل میں یُضْلِلْہُ علت حذف یہ ہے کہ عِندَ النَّحْوِیِّیْن اگر صلہ کے اندر ضمیر مفعول ہو تو اس کا ذکر و حذف ہر دو جائز است وَلٰکِنْ ذِکْرُہٗ اَصْلٌ وَحَذْفُہٗ فَرْعٌ تو یَّھْدِہٖ میں مذکور ہے اور یُضْلِلْ میں عمل باحد الطریقین جائز ہے۔ اسی طرح ھَادِیَ لَہٗ میں بھی ضمیر بطرف مَنْ ہے تاکہ شرط اور جزا باہم مرتبط شوند۔

قولہٗ وَاَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ

ترجمہ: اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں

تشریح فرمان حبیب کبریا محمد ن المصطفیٰ ہے کہ "کُلُّ خُطْبَةٍ لَيْسَ فِيْهَا تَشَهُّدٌ فَهِيَ كَالْيَدِ الْجَذْمَاءِ: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس خطبہ میں تشہد (یعنی خدا کی حمد و ثنا) نہ ہو وہ بیمار ہاتھ کی طرح ہے (مشکوٰۃ)

فَلِهٰذَا قَالَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ اَشْهَدُ مشتق ہے شہادت سے اور شہادت کا معنیٰ ہوتا ہے مَا كَانَ مِنْ صَمِيْمِ الْقَلْبِ یعنی خالص دل سے شہادت دینا۔

سوال یہ ہے کہ قبل ازیں مُصنّف علیہ الرحمۃ نے تمام صیغے جمع متکلم کے ذکر فرمائے اور یہاں اَشْهَدُ واحد متکلم کا صیغہ لے آئے فلہٰذا توافق ظاہری مفقود ہے

جواب اس میں دو نکتے ہیں اوّل حمد، استعانت، استغفار، تعوّذ، یہ فعل لسانی ہیں یعنی ظاہر سے پتہ چل جاتا ہے کہ فلاں حمد کر رہا ہے بخلاف شہادت کے کہ وہ قلب کا فعل ہے یعنی وہ خالص دل سے ہوتی ہے اور دل کی بات اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا ۔ چونکہ مصنف علیہ الرحمۃ کو اپنی دل کا پتہ تھا کہ میں خالص دل سے گواہی دے سکتا ہوں (دل دیگراں معلوم نیست) اس لیے مصنّف علیہ الرحمۃ نے اپنے دل کی شہادت

نقل کی اکیلا ہونے میں یعنی شہادت فعل قلب ہے اور قلب ایک تھا اس لیے صیغہ بھی واحد متکلم کا نقل کیا۔ اس کی چند مثالیں قرآن مقدس سے ملاحظہ فرمائیں۔

مثالِ اوّل قرآن پاک میں منافقین کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا" قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ " تو اللہ پاک نے ان کی تردید فرمائی کہ" وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ لَكَاذِبُوْنَ " اس لیے کہ ان کی شہادت صرف زبان سے ہے۔

مثالِ دوّم اللہ پاک بروز قیامت انبیاء کرام سے سوال کریں گے" مَاذَا اُجِبْتُمْ ؟ تمہاری امتوں نے تمہیں کیا جواب دیا تھا ؟ تو انبیاء کرام علیہم السلام جواب میں کہیں گے" لَا عِلْمَ لَنَا ہمیں تو ظاہر حال کا علم تھا باطن کا نہیں اور آج کے دن حساب کی مدار قلبی شہادت پر ہے۔ تو معلوم ہوا کہ شہادت فعل قلب ہے

نکتہ علماء صوفیاء کے نزدیک مقام دو قسم پر ہے۔ اوّل مقام فرق، دوّم مقام جمع مقامِ فرق یہ ہے کہ شہادت پر نظر ہو یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا مخلوق پر بھی نظر ہو تو جب مخلوق پر نظر پڑیگی تو اس پر جو انعام ہوں گے وہ بھی نظر آئیں گے اور ان کے برے کاموں پر بھی نظر پڑیگی۔

مقامِ جمع یہ ہے کہ وحدت کے سوا کسی پر نظر نہ ہو یعنی صرف اللہ تعالیٰ پر نظر ہو مخلوق پر نظر نہ ہو تو پہلے افعال اربعہ میں مقامِ فرق کی طرف اشارہ ہے۔ اور اَشْهَدُ میں مقامِ جمع کی طرف اشارہ ہے

ترجمہ : ایسی گواہی جو نجات کا وسیلہ اور بلندی درجات کی ضامن ہو۔	قولہ شَهَادَةً تَكُوْنُ لِلنَّجَاةِ وَسِيْلَةً، وَلِرَفْعِ الدَّرَجَاتِ كَفِيْلَةً

شَهَادَةً موصوف تَكُوْنُ لِلنَّجَاةِ وَسِيْلَةً صفت، موصوف صفت مل کر

مفعول مُطلق ہے اَشْهَدُ فعل کا۔ معنیٰ ہوگا کہ میں توحید باری تعالیٰ کی ایسی شہادت دیتا ہوں جو (۱) نجات کے لیے وسیلہ ہو (۲) جنت میں درجات عالیہ کے حصول کی ضامن ہو۔

یقول شیخ جاجروی رحمہ القوی : شہادت جو نجات کا وسیلہ بن سکتی ہے وہ ہے "اَلشَّهَادَةُ الْخَالِصَةُ مَعَ الْاِسْتِقْلَالِ" تو شہادت خالص سے منافق نکل گیا کیونکہ اس کی شہادت خالص نہیں ہوتی اور مع الاستقلال سے مرتد نکل گیا کیونکہ مرتد شہادت دے کر پھر جاتا ہے اس کے لیے بھی شہادت وسیلہ نجات نہ بنیگی اور اسی کو قرآن مقدس میں یوں بیان کیا گیا ہے "اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا

سوال حدیث پاک میں ہے "لَنْ یُّنْجِیَ اَحَدًا عَمَلُهٗ ــــ وفی مقامٍ اٰخر "لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّةَ بِعَمَلِهٖ ۔ احادیث مذکورہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دخولِ جنت کی مدار اعمال نہیں بلکہ رحمتِ الٰہی ہے۔ جب کہ مُصنّف علیہ الرحمۃ دخولِ جنت کی مدار شہادت کو بنا رہے ہیں۔

جواب اوّل دخول جنت کے اسباب دو قسم پر ہیں۔ اوّل اسباب ظاہری جو عقائد صحیحہ اور اعمال صالحہ ہیں" کما فی قولہٖ تعالیٰ : اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ط

دوم : اسباب حقیقی و مؤثر حقیقی جو فضل ربِ کریم و رحمتِ رحیم ہے تو مصنف علیہ الرحمۃ نے صرف اسباب ظاہری کو بیان فرمایا ہے۔ اور اسباب ظاہرہ میں سے واقعی شہادت ہے۔ جبکہ مؤثر حقیقی رحمتِ رحیم ہے چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سوال کیا یا رسول اللہ! آپ کی ذات بابرکات عالیہ طاہرہ بھی بغیر رحمت باری تعالیٰ کے داخل جنت نہ ہوگی۔ تو جواباً سر مبارک کو جھکا کر فرمایا "حَتّٰی یَتَغَمَّدَنِیْ رَحْمَةُ رَبِّیْ" کہ اللہ کی رحمت جب تک نہ ڈھانپے گی میں بھی جنت میں داخل نہ ہونگا۔

یقول ابوالاسعاد : وَسِیْلَةٌ بروزن فَعِیْلَةٌ بمعنیٰ وہ چیز جو کسی کو دوسرے کے ساتھ محبت و رغبت سے ملا دے (مفردات امام راغب) لیکن یہاں بمعنیٰ سبب ہے۔ اس سے اس بات کی طرف اشارہ فرما دیا کہ اعمال مؤثر فی النجاۃ نہیں ہیں کیونکہ سبب مفضی ہوتا ہے

مؤثر نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ للنجاۃ اور لترفع کی لام سببیہ ہے تعلیلیہ نہیں ہے۔

قولہٗ واشھد ان محمدًا عبدہٗ ورسولہٗ	ترجمہ: اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔

قولہٗ محمد: محمدؐ اور احمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسمائے گرامی ہیں۔ آپؐ کو زمین پر محمدؐ اور آسمانوں پر احمد کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔ توراۃ میں آپ کا نام محمدؐ ہے اور انجیل میں احمد ہے۔ محمدؐ اسم مفعول کا صیغہ ہے بمعنی جس کی تعریف کی جاتی ہے لیکن اصل میں یہ وصف ہے بعد میں وصف سے تبدیل کر کے عَلَم بنادیا تو یہ معدول عن الوصفیۃ الی الاسمیۃ ہے۔

قولہٗ عبدہٗ: عبد اسے کہتے ہیں جو انتہائی بڑائی والے کے سامنے انتہائی تذلل ظاہر کرے۔ عبدیت اور بشریت دو الگ الگ چیزیں ہیں ملائکہ عباد تو ہیں بشر نہیں (ھُمْ عِبَادٌ مُّکْرَمُوْنَ) اردو زبان میں وسعت نہ ہونے کی بناء پر دونوں کا ترجمہ بندہ سے کر دیا جاتا ہے

فائدہ: ہر دور کے اندر بزرگوں کے حق میں دو ٹولے گمراہ ہوئے۔ ایک غالی، دوسرے بے ادب، جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں دو ٹولے تھے ایک غالیوں کا جو نصاریٰ کہلاتے تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بڑھا کر خدا کا بیٹا بنادیا، دوسرا بے ادبوں کا جو یہودی کہلائے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام (و نعوذ باللہ من ہذا القول) ولد الزنا ہیں تو اب لفظ عبد میں غالیوں کی تردید کر دی کہ نبی کریم علیہ السلام علو درجہ ہو کر بھی اللہ کے عبد ہیں۔ آگے لفظ رسولہٗ سے بے ادبوں کی تردید کر دی کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں شاعر و مجنون نہیں پھر عبد کی اضافت (ہ) حق تعالیٰ کی طرف تشریفی ہے کہ حقوق ربوبیت کی ادائیگی میں سب کائنات پر فوقیت لے جانے کی وجہ سے حق تعالیٰ کے سب سے افضل و اخص مقرب و مشرف بندے ہیں۔

سوال کہ صفت رسالت صفت عبدیت سے اعلیٰ ہے مگر ذکر میں عبدیت کو مقدم کیا اور رسالت کو مؤخر کیا یعنی ترتیب ذکری میں تبدیلی کیوں فرمائی اس میں کیا حکمت ہے؟

جواب اوّل قرب ومحبت کے منازل میں سے گو رسالت سب سے اعلیٰ مرتبہ ہے لیکن چونکہ عبد کا اصل موضوع عبدیت ہی ہے اس لیے اس کو مقدم فرمایا۔ عبدیت آپ کے اوصاف میں سے گراں قدر اور اشرف وصف ہے اس لیے آپ کے بہت سے اہم اور اشرف مقامات ومناصب کے تذکرہ کے مواضع میں قرآن پاک نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر خیر عنوان عبد سے فرمایا۔

مثال اوّل معراج کے واقعہ عظیمہ کو ذکر کرتے ہوئے فرمایا :۔
سُبْحٰنَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ (پ۱۵)

مثال دوم تنزیل فرقان کی نعمت کے اظہار کے موقعہ پر فرمایا :۔
تَبَارَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ (پ۱۸)

ایک اور موقعہ پر فرمایا :۔ فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی (پ۲۷)

جواب دوم وصف عبدیت کے ذکر میں یہ نکتہ بھی ہے کہ ختم رسالت ومعراج جیسے مناصب جلیلہ پر فائز ہو جانے سے رسول عبدیت سے نکل نہیں جاتے بلکہ مقامات عالیہ ان کی عبدیت میں اور بھی عروج اور چاشنی پیدا کر دیتے ہیں۔

اَلَّذِیْ بَعَثَہٗ وَطُرُقُ الْاِیْمَانِ قَدْ عَفَتْ اٰثَارُھَا وَخَبَتْ اَنْوَارُھَا وَوَھَنَتْ اَرْکَانُھَا وَجُھِلَ مَکَانُھَا	ترجمہ : جن کو اللہ تعالیٰ نے اس وقت اپنا رسول بنا کر بھیجا۔ جب ایمان کی راہوں کے نشان مٹ چکے تھے اور اس کی روشنیاں بجھ چکی تھیں۔ اور اس کے آثار ہلکے پڑ گئے تھے اور اس کی بتائی ہوئی منزل نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

قولہٗ اَلَّذِیْ بَعَثَہٗ : اَلَّذِیْ اسم موصول ہے بَعَثَہٗ سے لے کر وَجُھِلَ

مکانہا تک اس کا صلہ ہے۔ فَشَیَّدَ اور شَقّٰی اور اوضح اور اظہر اسی فعل صلہ پر مرتب ہیں۔ موصول اپنے صلہ سے مل کر رَسُوْلُہٗ یا مُحَمَّدٌ کی صفت ہے۔

قولہٗ وَطُرُقُ الْاِیْمَانِ قَدْ عَفَتْ اٰثَارُھَا : ایمان کے راہوں کے نشان مٹ چکے تھے۔ اس جملہ کی بحث سے قبل ایک فائدہ ملاحظہ فرماویں :۔

فائدہ :۔ طُرُقُ الْاِیْمَانِ مبتدا اور قَدْ عَفَتْ والاجملہ اس کی خبر ہے۔ اور یہ جملہ حالیہ ہے اور جملہ حالیہ کے ذکر کرنے میں کوئی نہ کوئی نکتہ ہوتا ہے۔

نکتہ : تو اس مقام پر یہ بتانا مقصود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دنیا فانی میں تشریف آوری شدید ترین ضرورت کے موقعہ پر ہوئی۔ اس لیے کہ آپ کی بعثت کے وقت لوگ جہالت وضلالت کی انتہا کو پہنچ چکے تھے۔ کہیں کوئی صحیح قیادت موجود نہ تھی جو گم کردہ راہ افراد کو عقائد باطلہ سے ہٹا کر صحیح منزل تک پہنچا سکے۔ رب ذوالجلال نے اسی حقیقت کو ان لفظوں میں بیان فرمایا ہے :۔

وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ط (پ۴)

دوسرے مقام پر فرمایا :۔

لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ وَالْمُشْرِکِیْنَ مُنْفَکِّیْنَ حَتّٰی تَاْتِیَھُمُ الْبَیِّنَةُ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰہِ یَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَھَّرَةً (پ۳۰ سورۃ البیّنۃ)

طُرُقُ الْاِیْمَانِ کی تشریح

محدثین حضرات نے اس کے دو مطلب بیان کیے ہیں

اوّل : طرق ایمان سے مراد انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کے نائبین علماءِ عظام ہیں اور نشانات مٹ جانے سے مراد یہ ہے کہ ان شخصیات مقدسہ کی تعلیمات اور ہدایات کا سلسلہ تعلیم وتعلّم ختم ہوچکا تھا اور ان کے مقتضٰی کے مطابق عمل کا رواج باقی نہ رہا تھا۔

دوم : طرقِ ایمان سے مراد وہ عقائد واعمال، اخلاق، آداب وریاضیات ہیں جو تکمیلِ انسانیت کا ذریعہ ہیں۔

قولہٗ وَخَبَتْ اَنْوَارُھَا وَوَھَنَتْ اَرْکَانُھَا : اور بجھ چکے تھے انوار ایمان کے، اور کمزور پڑ چکے تھے ارکان ایمان کے۔ ارکان ایمان سے مراد اصول دین ہیں یعنی قیامت رسالت، توحید، حقانیتِ قرآن۔ ان دونوں جملوں کا معنیٰ و مطلب عفت اٰثارھا کے قریب ہے یعنی ان کی تعلیم مقدسہ کو چھوڑ دیا گیا تھا۔

یقول شیخ جاجروی رحمہ القوی : یہ اعتراض بھی نہ ہوگا کہ جب مطلب تینوں جملوں کا ایک ہے تو پھر تکرار کیوں ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ "قَدْ شَاعَتِ التَّرَادُفُ فِی الْخِطَابَاتِ : خطبات میں مترادف الفاظ ذکر ہوجاتے ہیں یہ تفنن فی العبارت ہے۔

قولہ وَجَھِلَ مَکَانُھَا : معنیٰ یہ ہے کہ ان کی بتائی ہوئی منزل نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی۔ محدثین نے یہ معنیٰ بھی مراد لیا ہے کہ جَھِلَ مَکَانُھَا سے مراد یہ ہے کہ ان کے علوم و معارف کی قدر و منزلت سے ناواقفیت و ناشناسائی عام تھی۔ جیسا کہ ہمارے زمانہ میں دینی تعلیم کے ساتھ سلوک روا رکھا جارہا ہے۔

فَشَیَّدَ صَلَوَاتُ اللّٰہِ وَسَلَامُہٗ عَلَیْہِ مِنْ مَعَالِمِھَا مَا عَفٰی وَشَفٰی مِنَ الْعَلِیْلِ فِیْ تَائِیْدِ کَلِمَۃِ التَّوْحِیْدِ مَنْ کَانَ عَلٰی شَفَا

ترجمہ : پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مٹے ہوئے نشانوں کو از سر نو نمایاں کیا اور کلمہ توحید کی تعلیم سے اس بیمار کو شفا پہنچائی جو ہلاکت کے کنارے پہنچ چکا تھا۔

مطلب یہ ہے کہ پوری انسانیت کفر و شرک کی معصیت اور بداعمالیوں کے گناہ میں مبتلا ہوکر روحانی طور پر بیمار ہو چکی تھی اور قریب تھا کہ دوزخ میں چلی جائے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اور ان کو فلاح و نجات کے راستہ پر لگا دیا۔

قولہٗ فَشَیَّدَ : شَیَّدَ تفعیل کا باب ہے اور تَشْیِیْدٌ سے مشتق ہے بمعنی

تقویّت ورفعت، اورضمیر راجع الی النبیؐ اس کا مُجرّد شَادَ شَیْدًا یعنی تقویت دی نبیؐ نے

قولہٗ صَلَوٰتُ اللّٰہِ : یہ جملہ معترضہ ہے محدثین نے بحث کی ہے کہ یہ خبر ہے یا انشاء؟ عند البعض یہ جملہ خبریہ ہے متکلم خبر دے رہا ہے کہ صلوٰۃ وسلام ہوں اس ہستی پر۔ عند البعض یہ جملہ انشائیہ ہے یعنی انشاء ودعائیہ ہے معنٰی ہوگا صلوٰۃ وسلام غداو ند براو باد۔

قولہٗ سَلَامُہٗ : سَلَامُہٗ سے مراد جنسِ سلام ہے از لحاظ جمع تاکہ صلوٰۃ وسلام میں توافق ظاہری رہے ولہذا جنس سلام مرادلیں گے۔

قولہٗ مِنْ مَعَالِمِھَا : جمع معلم بمعنٰی نشانی و آثار اور مِنْ مَعَالِمِھَا بیان ہے مَا کا۔ اور بیان کو کبھی اہتمام کے لیے مقدم کر دیتے ہیں یعنی عفا کا بیان مقدم ہے اور مَا شَیَّدَ کا مفعول ہے۔ مَا موصول عَفَا صلہ معنٰی ہوگا تقویت دی نبیؐ نے علامات اور نشانات ان طرق ایمان کو جو مٹ چکے تھے۔

قولہٗ شَفٰی مِنَ الْعَلِیْلِ : لفظ شفا دومعنوں میں مستعمل ہے:۔

اوّل : شَفٰی صِیْغَۃُ الْمَاضِیْ مِنَ الشِفَا بالکسر : تندرستی دادن وتندرستی یافتن

دوّم : شَفَا بالفتح بمعنی حَرْفُ کُلِّ شَیْئٍ ای طَرْفُہٗ وَجَانِبُہٗ یعنی کنارہ اور مِنَ الْعَلِیْلِ بیان مقدم ہے مَنْ کَانَ عَلٰی شَفَا کا اور عَلِیْل سے مراد روحانی بیماری یعنی شرک نہ کہ جسمانی۔ مصنّف علیہ الرحمۃ دراصل اس آیت مبارک کی طرف اشارہ فرمارہے ہیں

وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا

معنٰی ہوگا کہ شفا دی نبی کریم صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے ان مریضوں کو جو آگ کے گڑھے کے کنارہ پر تھے۔

لیکن حقیقی شفا دینے والا اور بچانے والا اللّٰہ پاک ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام کا شفا دینا درجہ تبلیغ تک ہے۔ اس لیے فرمایا فی تَائِیْدِ کَلِمَۃِ التَّوْحِیْدِ۔

قولہٗ فِیْ تَائِیْدِ کَلِمَۃِ التَّوْحِیْدِ : فی اجلیہ سببیہ ہے تائید بمعنی طاقت مشتق من الید، یعنی نبی کریم صلی اللّٰہ علیہ وسلم کا بچانا تائید وتقویت کلمات توحید کیلئے ہے کہ آپؐ نے تبلیغ فرمائی اور مخلوقات جہنم کے گڑھے میں گرنے سے محفوظ رہی۔

وَاَوْضَحَ سُبُلَ الْهِدَايَةِ
لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّسْلُكَهَا
وَاَظْهَرَ كُنُوْزَ السَّعَادَةِ
لِمَنْ قَصَدَ اَنْ يَّمْلِكَهَا

ترجمہ : اور اس شخص کے لیے ہدایت کے راستہ کو روشن کیا جو اس پر چلنے کا ارادہ کرے اور اس شخص کے لیے نیک بختی کے خزانے ظاہر کیے جو اس کے مالک ہونے کا قصد کرے۔

قولہٗ وَاَوْضَحَ : اَیْ بَیَّنَ وَعَیَّنَ طَرِیْقَ الْاِهْتِدَاءِ اِلَی الْمَطْلُوْبِ
اس کا عطف شفی پر ہے۔

قولہٗ سُبُلَ : جمع سَبِیْل اور لفظ سبیل مذکر مؤنث دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ نیز یَسْلُکُھَا کا ضمیر اسی سبیل کی طرف راجع ہے بمعنی صراط مستقیم۔

قولہٗ وَاَظْهَرَ كُنُوْزَ السَّعَادَةِ : اور ظاہر کیے خزانے نیک بختی کے
خزانے دو قسم پر ہیں اوّل حسّی جیسے مال ومتاع، دولت یہ قلیل بھی ہے حقیر بھی ہے۔ الٹا وبال ہونے کے ساتھ ساتھ آخرت میں مؤاخذہ کا سبب ہے۔ دوم معنوی ؛ ایمان، اسلام، توحید علوم اسلامیہ جیسا کہ حدیث پاک میں لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ کو خزانہ کہا گیا ہے تو مصنفؒ نے سَعَادَةٌ کی قید لگا کر حسّی خزانہ کو خارج کر دیا۔

اس لیے محدّثین حضرات نے لکھا ہے کہ نیک بختی کے خزانے سے مُراد نیک اعمال و عبادات ہیں جو آخرت میں گنج گرانمایہ کا درجہ رکھتے ہیں جو کوئی اس خزانہ کو حاصل کر لیتا ہے تو اس کے بدلہ آخرت کی ابدی سعادت یعنی رضائے مولیٰ اور جنّت کا حقدار ہوتا ہے۔

یقول شیخ جاجروی رحمہ القوی ، ہدایت سے مراد شریعت ہے سعادت سے مراد طریقت ہے۔ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شریعت وطریقت دونوں کے راستوں کو واضح فرما دیا یعنی تلبب وتالیب دونوں کا انتظام فرمایا کسی نے انکار کرکے دائمی بدبختی حاصل کر لی کسی نے قبول کرکے دارین کی خوش نصیبی کمائی۔

قولہٗ لِمَنْ قَصَدَ اَنْ یَّمْلِکَهَا : ظاہر کیئے خزانے نیک بختی کے، اس

شخص کے لیے جو ارادہ کرے کہ میں مالک ہوں ۔ مُلک سے مراد ایسی شئی ہے جو اپنی ملکیت کی طرف پہنچا دے ۔ کما فی قولہ تعالیٰ فی سُورۃ الدھر :۔

وَاِذَا رَأَيْتَ ثَمَّ رَأَيْتَ نَعِيْمًا وَّمُلْكًا كَبِيْرًا ۔!

اَمَّا بَعْدُ فَاِنَّ التَّمَسُّكَ بِهَدْيِهٖ لَا يَسْتَتِبُّ اِلَّا بِالْاِقْتِفَاءِ لِمَا صَدَرَ مِنْ مِشْكٰوتِهٖ وَ الْاِعْتِصَامَ بِحَبْلِ اللّٰهِ لَا يَتِمُّ اِلَّا بِبَيَانِ كَشْفِهٖ :

ترجمہ : حمد وصلوٰۃ کے بعد جاننا چاہیے کہ حضورؐ کی سیرت کا مضبوطی سے حاصل کرنا ناممکن ہے بغیر اتباع کیئے ۔ ان احادیث کے جو آپ کے سینہ سے صادر ہوئیں ۔ اور اللہ کی رسی کا مضبوطی سے تھامنا مکمل نہیں بغیر اس کے واضح بیان کے ۔

قولہ اَمَّا بَعْدُ ۔ امّا بعد سے لے کر ببیان کشفہٖ تک ضرورتِ حدیث کا بیان ہے ۔ یہاں چند فوائد خالی از فائدہ نیست ۔

فائدہ اُولیٰ

لفظ اَمَّا کے اصل کے بارے میں چار قول ہیں :۔

۱ : اَمَّا اصل میں اِنْ مَا تھا نون کو میم سے بدل کر میم کا میم میں ادغام کر دیا اَمَّا بن گیا ۔ ۲ : اَمَّا اصل میں مِنْمَا تھا میم اوّل اور ہمزہ کے درمیان قلب مکان کیا گیا ، پھر میم کا میم میں ادغام کر دیا اَمَّا بن گیا ۔ ۳ : اَمَّا اصل میں مَهْمَا تھا میم اوّل اور ہا کے درمیان قلب مکانی کیا گیا ، پھر میم کا میم میں ادغام کر دیا اور ہا کو ہمزہ سے بدل دیا گیا ۔ ۴ : اَمَّا اپنے اصل پر ہے ۔

فائدہ ثانیہ

اَمَّا تین معانی میں مستعمل ہے ۔ ۱ : اَمَّا بفتح الھمزۃ وتشدید المیم شرط کے لیئے ہے اس کے جواب میں لازمًا فاء آتی ہے مثلاً

اَمَّا زَیْدٌ فَذَاہِبٌ میں ذہاب زید کو کسی بھی شیئ کے موجود ہونے پر معلق کیا گیا ہے اور اس معلق کرنے کا نام ہی شرط ہے ۔ ۲ : اَمَّا تفصیل کے لیے آتا ہے مثلاً :۔

اَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَیَعْلَمُوْنَ اَنَّہُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّھِمْ میں لفظ اَمَّا کے ذریعہ ضرب مثل کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کی تفصیل بیان کرنا مقصود ہے ۔

۳ : تاکید کے لیے بھی آتا ہے مثلاً اَمَّا زَیْدٌ فَذَاہِبٌ اس کے معنیٰ ہیں مَہْمَا یَکُنْ مِّنْ شَیْئٍ فَزَیْدٌ ذَاہِبٌ یعنی جب بھی کوئی چیز موجود ہوگی تو زید کے لیئے ذہاب ثابت ہوگا ، اور یہ بات مسلّم ہے کہ ہر لمحہ کوئی نہ کوئی شیئ موجود ہوتی ہے ۔ جب ایسا ہے تو زید کے لیے یقیناً ذہاب ثابت ہوگا ، اور کسی چیز کا بالیقین ثابت ہونا اس کا نام تاکید ہے ۔ لہٰذا لفظ اَمَّا تاکید کے لیئے ہونا ثابت ہوگیا ۔

قَوْلُہٗ بَعْدُ : بعد ظرف زمان ہے اس کی تین حالتیں ہیں ،

اوّل مضاف الیہ مذکور ہو ۔ دوّم محذوف نسیاً منسیا ہو ۔ سوّم محذوف معنوی ہو ۔ پہلی ہر دو حالتوں میں معرب ہے اور تیسری حالت میں مبنی ہے ۔ یعنی لفظ بعد ایسا ظرف زمان ہے جو مبنی ہونے کے ساتھ منقطع عن الاضافت ہے چنانچہ تقدیر عبارت یوں ہے :۔

بَعْدَ الْحَمْدِ وَالصَّلٰوۃِ ۔!

فائدہ ثالثہ

محدثین حضرات نے بحث کی ہے کہ لفظ اما بعد کا استعمال کس مقصد کے لیے ہوا ہے ؟ چنانچہ جمہور محدثین حضرات کے نزدیک لفظ اما بعد یا بعد دونوں کلمے فصیح ہیں جن کا تعلق صفت اقتضاب سے ہے (اقتضاب بمعنیٰ کاٹنا) اہل معانی اور اہل بیان حضرات کے نزدیک یہ ایک علمی اصطلاح ہے ۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ کبھی ایسی چیز کی طرف انتقال ہوتا ہے جس کو آغازِ کلام سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی اس انتقال کو اقتضاب کہتے ہیں (کما فی المختصر) فصحائے عرب اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبات میں لفظ امّا بعدُ کثیر الاستعمال ہے ، چالیس صحابہ کرام رض کی روایت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا لفظ اَمَّا بَعْدُ استعمال کرنا ثابت ہے (افادہ الرّہاوی فی اربعینہ) اسی وجہ سے فقہاء نے اس کی سنیّت کا قول کیا ہے ۔ شاید مصنّف علیہ الرحمۃ نے بھی اسی خیال سے استعمال کیا ہے ۔ اگر کوئی شخص کہے کہ حدیث پاک سے تو امّا بعدُ

کا استعمال ثابت ہے نہ کہ استعمال لفظ بَعۡدُ پس سُنّت نبویؐ پر عمل نہ ہوا۔ جواب یہ ہے کہ بعد، امّا بعد کے معنیٰ میں ہے۔ اس لیے تحصیل مندوب میں اسی کے قائم مقام ہے۔

فائدہ رابعہ سب سے پہلے اس لفظ کو کس نے استعمال کیا اس میں اختلاف ہے عند البعض نبی کریم علیہ السلام کی عادت مبارکہ تھی کہ جب ایک اسلوب کلام سے دوسرے اُسلوب کی طرف منتقل ہوتے تو اَمّا بعد فرماتے۔

عَنۡ زَیۡدِ بۡنِ اَرۡقَمَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ خَطَبَہُمۡ فَقَالَ اَمَّا بَعۡدُ: ابوداؤد شریف ص۲۳۱ ج۲ کتابُ الادب باب امّا بعد فی الخُطب۔!

حافظ ابن جریر طبری نے امام شعبی اور ابن ابی حاتم اور حافظ دیلمی نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے تخریج کی ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کو جو فصلِ خطاب (فَقَالَ اَکۡفِلۡنِیۡہَا وَعَزَّنِیۡ فِی الۡخِطَابِ (پ۲۳ ص ع) عنایت کیا گیا تھا۔ اس سے مراد امّا بعدُ ہے اس سے معلوم ہوا کہ اس کلمہ کی ابتدا حضرت داؤد علیہ السلام سے ہوئی۔

یقول شیخ جاجروی رحمہ القوی: ان حضرات کے اس قول سے لفظ امّا بعد کی تخصیص ثابت نہیں کی جاسکتی۔ بلکہ ہر وہ لفظ مراد ہوگا جو امّا بعدُ کے معنیٰ کی ادائیگی میں اس کے قائم مقام ہو ورنہ ظاہر ہے کہ اَمّا بعدُ عربی ہے اور حضرت داؤد علیہ السلام عربی نہیں تھے (ھٰذا ھوالظّاھر)

قولہٗ فَاِنَّ التَّمَسُّکَ بِھَدۡیِہٖ : اَیۡ یَمۡشِیۡ بِطَرِیۡقَۃِ عَلَیۡہِ السَّلَامُ بے شک مضبوطی کے ساتھ چلنا — نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر

قولہ لَا یَسۡتَتِبُ — اَیۡ لَا یَسۡتَقِیۡمُ اَیۡ لَا یُعۡتَبَرُ — نہیں معتبر ہو سکتا اس طریقہ پر چلنا۔ قولہٗ اِلَّا بِالۡاِقۡتِفَاءِ — اَیۡ بِالۡاِتِّبَاعِ التَّامِ مگر ساتھ اتباع تامّہ کے

قولہٗ لِمَا صَدَرَ — اَیۡ ظَھَرَ جو ظاہر ہوئی۔

قولہٗ مِنۡ مِّشۡکٰوتِہٖ — اَیۡ صَدۡرِہٖ وَقَلۡبِہٖ اَوۡ فَمِّہٖ وَالۡاَوَّلُ

اَظْهَرُ ـــــ مشکوٰۃ کا معنیٰ ہوتا ہے " کوۃ فی الجدار غیر نافذۃ یعنی مشکوٰۃ اس جالے کو کہتے ہیں جو ایک طرف کھلا ہوا ہو اور دوسری طرف بند ہو۔ یہاں پر مصنفؒ نے حضرت کے سینہ مبارک کو دو وجوہ سے مشکوٰۃ کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔

اوّل ۔ جس طرح جالے میں اشیاء نفیسہ رکھی جاتی ہیں اسی طرح حضرتؐ کے سینہ اور دل مبارک میں بھی مضامین نفیسہ رکھے ہوئے ہیں۔

دوم ۔ جس طرح جالے میں چراغ رکھا جائے تو روشنی سارے کمرہ میں پھیل جاتی ہے اسی طرح آپؐ کے صدر مبارک کے اندر علوم نبوّت کی روشنائی پورے جہان میں نہیں بلکہ پوری انسانیّت کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ کما فی قولہٖ تعالیٰ :۔

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ پ۱۸

قولہٗ وَالْاِعْتِصَامُ بِحَبْلِ اللّٰهِ لَا يَتِمُّ : اور مضبوطی کے ساتھ پکڑنا اللہ پاک کی رسّی کو۔ لَا يَتِمُّ بمعنیٰ ای لَا يَكْمُلُ اور حَبْلِ اللّٰهِ سے مراد قرآن مقدس ہے

قولہٗ بِبَيَانِ كَشْفِهٖ : ساتھ بیان کھلے ہوئے کے ، اس سے مراد سنت نبویہ ہے یعنی خدا کی رسّی ، قرآن کریم پر اعتماد اور عمل جب ہی ممکن ہے کہ اس کی تشریح و توضیح احادیث نبویہ سے ہو اور یہ اضافت بیانیہ ہے کیونکہ بیان ہی کشف ہے۔ کما فی قولہٖ تعالیٰ :۔

لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ ۔! (پ۱۴)

يقول شيخ جاجروى رحمه القوى : مصنف علیہ الرحمۃ نے علمِ حدیث کی ضرورت اور اہمیّت مختصر مگر جاندار لفظوں میں بیان فرمائی ہے کہ علم حدیث ایسا ضروری علم ہے جس کے بغیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو اپنایا نہیں جا سکتا اور ایسا علم ہے کہ جس کے بغیر قرآن مقدس کے مفہوم کو حل نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لیے میں نے اس اہم علم میں تصنیف کے لیے قلم اٹھایا ـــــ

وَكَانَ كِتَابُ الْمَصَابِيْحِ الَّذِيْ صَنَّفَهُ الْاِمَامُ	ترجمہ : اور کتاب مصابیح جو سُنّت زندہ کرنے والے ، بدعت

مُحْيُ السُّنَّةِ قَامِعُ الْبِدْعَةِ اَبُوْمُحَمَّدِنِ الْحُسَيْنُ ابْنُ مَسْعُوْدِ الْفَرَّاءُ الْبَغَوِيُّ رَفَعَ اللّٰهُ دَرَجَتَهٗ اَجْمَعُ كِتَابٍ صُنِّفَ فِيْ بَابِهٖ وَاَضْبَطُ لِشَوَارِدِ الْاَحَادِيْثِ وَاَوَابِدِهَا

اکھاڑنے والے امام ابومحمدؒ حسین ابن مسعود فراء بغوی کی تصنیف ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کا درجہ بلند کرے۔ تمام ان کتب میں جامع ترتھی جو اس بارے میں لکھی گئیں۔ اور جمع فرمایا تھا موصوف نے منتشر اور متفرق احادیث کو۔

قَوْلُهٗ وَكَانَ كِتَابُ الْمَصَابِيْحِ : اور تھی کتاب مصابیح جسے محی السنۃ نے لکھا تھا۔ صاحبِ مصابیح کے حالات ابتدا میں تفصیل سے درج کر دیے گئے ہیں۔ اسی طرح محی السنۃ اور فراء وبغوی کی تشریح آچکی ہے ۔

قَوْلُهٗ قَامِعُ الْبِدْعَةِ ۔ قَامِعٌ کا معنیٰ ہے قلع قمع کرنے والا، کسی چیز کو جڑ سے اکھاڑنے والا، قاطع ۔ کاٹنے والا ۔ مُصنّف علیہ الرحمۃ نے قامع فرمایا نہ کہ قاطع۔ کیونکہ قطع سے پھر بھی دوبارہ بدعت کے پیدا ہونے کا اندیشہ تھا جب کہ قامع سے یہ اندیشہ دور ہو گیا کیونکہ جب درخت کو جڑ سے اکھاڑ دیا جائے تو دوبارہ پیدا نہیں ہوتا۔ بخلاف قطع (اوپر سے کاٹنا) کے کہ آبیاری کرنے سے وہ کٹا ہوا تنا دوبارہ درخت بن سکتا ہے۔ تو علامہ بغویؒ بھی بدعت کو جڑ سے اکھاڑنے والے ہیں۔

قَوْلُهٗ رَفَعَ اللّٰهُ دَرَجَتَهٗ ۔ یہاں سے بیانِ دعا ہے مصنف علیہ الرحمت یہ دعائیہ کلمات ذکر فرما کر قرآن مقدس کی آیۃ مبارکہ کی طرف اشارہ فرمانا چاہتے ہیں۔ كَمَا فِيْ قَوْلِهٖ تَعَالٰى: "يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ" ۔ (پ ۲۸ سورة المجادلہ ع ۲)

يَقُوْلُ اَبُو الْاَسْعَادِ صَانَهُ اللّٰهُ عَنِ الشَّرِّ وَالْفَسَادِ : سچا ایمان اور صحیح علم انسان کو ادب تہذیب سکھلاتے ہیں اور متواضع بناتے ہیں۔ اہلِ ایمان وعرفان

جس قدر کمالات و مراتب میں ترقی کرتے ہیں اُسی قدر وہ جھکتے ہیں اور اپنے کو ہیچ اور ناچیز سمجھتے ہیں، کثرِ نفسی نہیں کسرِ نفس کرتے ہیں "مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰہِ رَفَعَہُ اللّٰہُ" چنانچہ علامہ خطیب نے اسی کمالِ عرفان کو رَفَعَ اللّٰہُ دَرَجَتَہٗ میں بیان فرمایا ہے۔

قولہٗ اَجْمَعُ کِتَابٍ صُنِّفَ فِیْ بَابِہٖ — یہ جملہ خبر ہے کَانَ کِتَابُ الْمَصَابِیْحِ کی یعنی وہ کتاب مصابیح بہت جمع کرنے والی تھی اور کتابوں سے جو اس باب میں بنائی گئی ہیں۔

فائدہ: کسی علمی میدان میں محنت کرنے (یعنی تصنیف کرنے) کے دو طریقے ہوتے ہیں (۱) یہ کہ اس میں ایک مستقل کتاب لکھی جائے (۲) یہ کہ کسی اور کتاب کو دیکھ کر اس میں کچھ اضافات کرکے ایک نئی کتاب کی شکل دیدی جائے۔ صاحبِ مشکوٰۃ فرماتے ہیں کہ میں نے دوسری راہ اختیار کی ہے کہ میں نے اپنی محنت کا میدان امام بغوی کی تصنیفِ لطیف "المصابیح" کو بنایا اس کی جامعیت کے پیشِ نظر اس میں کچھ تغیرات والحاقات اور اضافات کرکے ایک نیا مجموعہ تیار کیا۔

قولہٗ لِشَوَارِدِ وَاَوَابِدِھَا — شَوَارِدُ، شَارِدٌ کی جمع ہے اس کا معنیٰ ہے رمیدن شتر یعنی بھاگنے والا اونٹ: اَوَابِدُ جمع اٰبِدَۃ بمعنیٰ بَھِیْمَۃٌ مُتَوَحِّشَۃٌ یعنی وحشی جانور: یہاں ان لفظوں کو بطور استعارہ استعمال کیا گیا ہے۔ شوارد کی اضافت احادیث کی طرف صفت موصوف والی ہے۔ اصل میں عبارت یوں تھی:۔ الاحادیث الشواردۃ: چنانچہ شوارد سے مراد وہ احادیث ہیں جو اصول کی کتابوں میں نقل تھیں مگر ان کتابوں تک ہر طالب علم کی رسائی مشکل تھی، نیز یہ کام بھی مشکل تھا کہ کس کتاب میں کون سی حدیث ہے گویا وہ احادیث طالبِ حدیث کی نظر سے بھاگی ہوئی یعنی پوشیدہ تھیں اس لیے ان کو شوارد کے لفظ سے تعبیر کیا۔ ایسے ہی اوابد سے مراد وہ احادیث ہیں جن کا معنیٰ و مقصود طالبِ حدیث کے فہم سے مخفی تھے اگر ان کو ضبط نہ کرتا تو بھاگ جاتیں اس لیے یہ مقولہ درست ہے:۔ اَلْعِلْمُ صَیْدٌ وَالْکِتَابَۃُ قَیْدٌ۔

وَلَمَّا سَلَكَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ طَرِيْقَ الْاِخْتِصَارِ وَحَذْفَ الْاَسَانِيْدِ تَكَلَّمَ فِيْهِ بَعْضُ النُّقَّادِ :

ترجمہ : اور جب مصنفؒ نے (نقل حدیث کے وقت) اختصار کے طریقہ کو اختیار کیا اور اسناد کو حذف کر دیا تو اس پر بعض محدثین اور ناقدین نے اعتراض کیا۔

قولہٗ وَلَمَّا سَلَكَ : یہاں سے وجہ تصنیف بیان فرما رہے ہیں سَلَكَ کا معنیٰ ہوتا ہے چلنا، لیکن یہاں مراد اختیار کرنا اور پسند کرنا ہے۔

قولہٗ حَذَفَ الْاَسَانِيْدَ : حذف اسناد سے مراد یہاں ترک ذکر مخرج اور عدم ذکر صحابی ہے کیونکہ مکمل اسناد تو صاحب مشکوٰۃ نے بھی ذکر نہیں کی ہیں۔ یعنی جب حدیث پاک بیان کی جاتی ہے تو حدیث سے پہلے اس صحابی کا نام ذکر کیا جاتا ہے جس نے اس حدیث پاک کو روایت کیا ہے مثلاً : عن ابی ھریرۃؓ... عن فلان بن فلان الخ۔!

قولہٗ تَكَلَّمَ فِيْهِ — جواب لمّا ہے اَیْ طَعَنَ فِیْ بَعْضِ اَحَادِیْثِ كِتَابِهٖ : چونکہ مصنف مصابیح نے اپنی تالیف میں حدیث جمع کرتے وقت اختصار سے کام لیا تھا اور صرف نقل حدیث پر اکتفاء کرتے ہوئے سند کے ذکر کو ترک کر دیا تھا اس لیے محدثین کی جانب سے اعتراض ہوا۔

سوال : ترک ذکر سند پر محدثین حضرات نے کیوں اعتراض کیا جب کہ علامہ خطیب نے تو طوالت سے بچتے ہوئے اختصاراً یہ کام کیا تھا۔

جواب : چونکہ کسی حدیث کی حیثیت کو جاننے اور پہچاننے کے لیے مدار صرف سند ہوتی ہے جب تک سند نہ دیکھ لی جائے کہ یہ حدیث کس راوی نے روایت کی ہے اس وقت تک حدیث کے بارہ میں یہ حکم لگانا کہ صحیح ہے یا حسن ہے یا ضعیف ہے بہت مشکل ہے۔ یعنی حدیث کی معرفت سند پر موقوف ہے جب سند ہی حذف کر دی جائے تو پھر حدیث کی معرفت بطریق اولیٰ ختم ہو جاتی ہے۔ وَلِهٰذَا يَعْتَرِضُ عَلَيْهِ الْمُحَدِّثُوْنَ

قولہٗ اَلنُّقَّادِ ۔ بضمّ النون وتشدید القاف بمعنیٰ پرکھنے والا ۔ یعنی کھوٹے اور کھرے کے درمیان فرق کرنے والا ، لیکن یہاں مراد ای العلماءِ النّاقدین المُمیّزین بین الصّحیحِ والضّعیفِ ۔

وُجوہ الفرقِ بینَ المِشکوٰۃِ والمصَابیح

مصَابیح	مِشکوٰۃ
(۱) صاحبِ مصابیح نے شیخین کی احادیث کے لیے ومن الصّحاح اور غیر شیخین کی احادیث کے لیے ومن الحسّان کا عنوان اختیار کیا ہے۔	(۱) صاحب مشکوٰۃ شیخین کی احادیث کو فصلِ اوّل اور غیر شیخین کی احادیث کو فصلِ ثانی سے تعبیر کرتے ہیں۔
(۲) مصابیح میں ہر باب کی احادیث کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے ۔	(۲) مشکوٰۃ میں ہر باب کی احادیث کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے تیسرا حصّہ فصلِ ثالث والا ہے اور اس تیسرے حصّہ میں مَصابیح سے زائد احادیث مذکور ہیں ۔
(۳) صاحب مصابیح نے خاص متعین کتاب کا حوالہ نہیں دیا اگرچہ ومن الصّحاح سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ روایت شیخین کی ہے لیکن متعین طور پر رواہ البخاری ، رواہ المسلم نہیں لکھا	(۳) مشکوٰۃ میں ہر حدیث کے آخر میں اس کے تخریج کرنے والے کا نام ذکر کیا گیا ہے ۔
(۴) مصابیح میں اصالۃً مرفوع احادیث ذکر کی گئی ہیں اگر موقوف ومقطوع کہیں آئی ہیں تو ضِمناً و تبعًا ۔	(۴) مشکوٰۃ میں اس تکرار کو حذف کرکے جس باب کے ساتھ حدیث پاک کو زیادہ مناسبت تھی اس میں رہنے دیا گیا ۔

مشکوٰۃ	مصابیح
⑤ مشکوٰۃ میں اس تکرار کو حذف کرکے جس باب کے ساتھ حدیث کو زیادہ مناسبت تھی اس میں رہنے دیا گیا۔	⑤ مصابیح میں بعض احادیث مکرر تھیں۔
⑥ مشکوٰۃ میں کسی داعیہ کی بنا پر اس پوری حدیث کو ذکر کیا گیا ہے اور وہ داعیہ مثلاً یا تو یہ ہو سکتا ہے کہ حدیث کا باقی حصہ بھی باب کے مناسب تھا یا مذکور کا سمجھنا اس پر موقوف تھا۔	⑥ مصابیح میں بعض لمبی احادیث کا صرف کچھ حصہ مذکور تھا۔
⑦ صاحب مشکوٰۃ نے تصریح کی کہ یہ روایت صحیحین میں موجود نہیں اور پھر جس نے تخریج کی ہو اس کا نام ذکر کر دیتے ہیں۔	⑦ مصابیح میں بعض احادیث من الصحاح کے تحت مذکور تھیں جس سے بظاہر یہی مفہوم ہوتا تھا کہ یہ صحیحین کی روایت ہے۔
⑧ مشکوٰۃ میں اس حکم کی وجہ بھی ذکر کر دی گئی کہ فلاں نے یہ حکم لگایا ہے یا یہ حکم اس وجہ سے ہے کیونکہ اس سے بات مستند اور پختہ ہو جاتی ہے۔	⑧ مصابیح میں بعض احادیث کے بارے میں ضعیف، غریب وغیرہ کا حکم مذکور تھا۔
⑨ اگر صاحب مشکوٰۃ کو وہ متن کتب اصول میں نہ ملے تو اس حدیث کا جو متن سند وحوالہ سے مل جائے اسے ذکر کر دیتے ہیں نہ ملنے کی صورت میں کہدیتے ہیں "ما وجدت هٰذه الرواية في كتب الاصول : يا وجدت خلافها۔	⑨ مصابیح میں صرف حدیث کا متن مذکور ہوتا ہے۔
⑩ مشکوٰۃ میں ہر حدیث کے شروع	⑩ مصابیح میں متنِ حدیث کے شروع

مشکوٰۃ	مصابیح
میں اس کے راوی صحابی کا نام ذکر ہے اور اس کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے پتہ چل جاتا ہے کہ یہ روایت فقیہ صحابی کی ہے یا غیر فقیہ کی، مقدم الاسلام کی ہے، یا موخر الاسلام کی، احکام کی احادیث میں ان باتوں کا معلوم ہونا ضروری ہوتا ہے۔	میں اس حدیث کے راوی صحابی کا نام ذکر نہیں۔

وَاِنْ كَانَ نَقْلُهٗ وَاِنَّهٗ مِنَ الثِّقَاتِ كَالْاِسْنَادِ لٰكِنْ لَيْسَ مَا فِيْهِ اَعْلَامٌ كَالْاَغْفَالِ فَاسْتَخَرْتُ اللّٰهَ تَعَالٰى وَاسْتَوْفَقْتُ مِنْهُ فَاَوْدَعْتُ كُلَّ حَدِيْثٍ مِنْهُ فِيْ مَقَرِّهٖ فَاَعْلَمْتُ مَا اَغْفَلَهٗ كَمَا رَوَاهُ الْاَئِمَّةُ الْمُتْقِنُوْنَ وَالثِّقَاتُ الرَّاسِخُوْنَ:

ترجمہ: اگرچہ مُصنّفؒ کا نقل فرمادینا ہی اسناد کی مثل ہے کیونکہ وہ معتبر ہیں مگر نشانیوں والا راستہ بے نشان راہ کی طرح نہیں ہوتا اس لیے میں نے اللہ تعالیٰ سے خیر اور توفیق مانگی۔ اور نشان لگائے ہیں نے جس کو علامہ بغویؒ نے مجہول چھوڑ دیا تھا (یعنی بے نشانوں کو نشان دار بنا دیا) پس امانت رکھی میں نے ہر حدیث کو اپنے مقام پر جیسے روایت کرتے تھے راوی ائمۂ ماہر فی العلم اور ثقہ رسوخ علمی رکھنے والے۔

قولہ وَاِنْ كَانَ نَقْلُهٗ وَاِنَّهٗ مِنَ الثِّقَاتِ كَالْاِسْنَادِ — مِنَ الثِّقَاتِ، وَاِنْ كَانَ نَقْلُهٗ كَالْاِسْنَادِ کی علت ہے۔ یعنی مُصنّف علیہ الرحمۃ کا حدیث کو بغیر سند کے نقل کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ سند کے ساتھ نقل کیا ہو کیونکہ وہ نقلِ حدیث کے معاملہ میں ثقہ اور معتمدین محدثین میں شمار ہوتے ہیں۔

قولہٗ لٰكِنْ لَيْسَ مَا فِيْهِ اَعْلَامٌ كَالْاَغْفَالِ ــ اعلام اور اغفان کے ہمزے دونوں فتح کے ساتھ ہیں۔ اعلام کا معنیٰ ہے نشانات یعنی آثَارُ الَّتِيْ يُسْتَدَلُّ بِهَا ــ اور اغفال کا معنیٰ ہے پوشیدہ زمین یعنی اَلْاَرْضُ الْمَجْهُوْلَةُ جس کا راستہ معلوم نہ ہو۔ یہ جملہ دراصل ایک سوال کا جواب ہے۔

سوال یہ ہے کہ جب علامہ خطیبؒ کا سند کے معاملہ میں عدم ذکر اسناد مثل ذکر اسناد کے تھا (کالاسناد) تو پھر علامہ بغوی کو کونسی خرابی ونقص نظر آیا کہ انہوں نے اسناد کو بقاعدہ طور پر بیان فرمایا۔

جواب تو علامہ بغویؒ نے یہ کلمات نکال کر جواب دیا جو کہ ایک تمثیل کی شکل ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک راستہ نشانیوں والا ہے جس سے مسافر کو اپنی منزل پر پہنچنے میں تکلیف نہیں ہوتی اور ایک راستہ بے نشان ہے جس سے مسافر کو اپنی منزل پر پہنچنے میں پریشانی ہوتی ہے تو یہ دونوں برابر نہیں ہوسکتے۔ کما قال اللہ تعالیٰ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ط اس لیے میں نے اسناد کو ذکر کیا۔ سبحان اللہ کیا ادب ہے" فرمایا نشانیوں والا راستہ یعنی (مشکوٰۃ شریف) بے نشان راہ (مصابیح) کی طرح نہیں مصابیح بہت اعلیٰ ہے۔ یہ ہے انکسار نفس: یہ اشارہ ہے تَوَاضُعًا مَعَ الْاِمَامِ وَهَضْمًا لِنَفْسِهٖ عَنْ بُلُوْغِ الْمَرَامِ

قولہٗ فَاسْتَخَرْتُ اللّٰهَ ــــ خیر کی طلب کرنا یعنی استخارہ کرنا۔ کما فی قولہٖ تعالیٰ: وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ ــ اور استخارہ کی فضیلت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے۔ سیدنا انسؓ سے روایت ہے رواہ الطبرانی مرفوعًا " مَا خَابَ مَنِ اسْتَخَارَ وَلَا نَدِمَ مَنِ اسْتَشَارَ " کیونکہ خیر و شر کا معلوم کرنا عبد کے بس کی بات نہیں ــ کما فی قولہٖ تعالیٰ:

عَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ الخ ــ

قولہٗ وَاسْتَوْفَقْتُ ــــ تقدیم فاء علی القاف ای طَلَبْتُ التَّوْفِيْقَ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى ــ یعنی رب ذوالجلال سے اس کام میں

توفیق کا طالب ہوا ۔ کما فی قولہٖ تعالیٰ ؎ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ (پ۱۲)

قولہٗ فَاَوْدَعْتُ ۔ پس امانت رکھی میں نے ۔

سوال : مصنف علیہ الرحمۃ نے اَوْدَعْتُ یعنی امانت کے الفاظ استعمال فرمائے فَوَضَعْتُ کے الفاظ کیوں نہ استعمال کیئے ۔

جواب : اگر فَوَضَعْتُ کے الفاظ نقل فرماتے تو اس میں کمی بیشی یا قطع برید کا احتمال ہوتا جبکہ اَوْدَعْتُ میں یہ احتمال نہیں کیونکہ امانت میں کمی اور زیادتی خیانت تصور ہوتی ہے ۔

خلاصہ : یہ کہ جو حدیث مصابیح میں جس جگہ تھی میں نے بھی مشکوٰۃ میں وہاں ہی بیان کی بلا وجہ تقدیم تاخیر نہیں کی ۔

قولہٗ مَقَرِّہٖ اَیْ فِیْ مَحَلِّہٖ یعنی جس طرح ان اماموں سے منقول تھی ویسے ہی میں نے نقل کی ۔

مِثْلُ اَبِیْ عَبْدِ اللّٰہِ مُحَمَّدِ بْنِ اِسْمَاعِیْلَ الْبُخَارِیْ تا وَاَبِی الْحَسَنِ رَزِیْنَ بْنِ مُعَاوِیَۃَ الْعَبْدَرِیْ وَغَیْرِھِمْ وَقَلِیْلٌ مَّا ھُوَ ؛ اس ساری عبارت میں ماخذ کو نقل کیا گیا ہے ۔ یعنی مصنف علیہ الرحمۃ کا مقصد ان ائمہ کے بیان سے یہ ہے کہ میں نے طریقہ وہی اختیار کیا جو ان کتابوں کے مصنف مثلاً امام بخاری ، امام مسلم وغیرہ نے اختیار کیا تھا ۔

قولہٗ وَاَبِیْ عَبْدِ اللّٰہِ مُحَمَّدِ بْنِ یَزِیْدِ ابْنِ مَاجَۃَ ۔ ابن ماجہ میں ہمزہ وصلی کو رسم خط میں باقی رکھنا ضروری ہے کیونکہ یہ یزید کی صفت نہیں بلکہ یہ ابن یزید سے بدل ہے اس صورت میں ماجہ یزید کا لقب ہے (کما فی القاموس) یا ابن ماجہ کی صفت ثانیہ ہے اس صورت میں ماجہ محمدؒ کی والدہ اور یزید کی زوجہ کا نام ہے اور یہی احتمال راجح ہے (کما فی شرح الاربعین) بہرحال ابن ماجہ یزید کی صفت نہیں ہے ورنہ معنیٰ فاسد ہوگا اور اس کے نظائر اور بھی ہیں مثلاً عبداللہ بن عمرو ابن ام مکتوم ہیں امّ مکتوم عبداللہ کی والدہ اور عمرو کی بیوی ہے اور عبداللہ بن مالک ابن بُحَیْنَہ میں بُحَیْنَہ عبداللہ کی والدہ اور مالک کی بیوی ہیں اسی طرح عبداللہ بن ابی ابن سلول اور محمد بن علی ابن الحنفیہ کو تصور کریں ۔

قولہ وغیرھم ـــ مثلاً ابن حبان، ابن عبد البر، امام نووی، علامہ ابن الجوزی وغیرہم۔

قولہ وقلیل ماھو ـــ یعنی وہ حدیثیں جو مذکورہ ائمہ کے علاوہ کی ہیں وہ تھوڑی ہیں ھو کا مرجع غیرھم ہے۔

سوال بعض کم علم حضرات (مثل غیر مقلدین) اعتراض کرتے ہیں کہ علامہ خطیبؒ نے امام اعظمؒ کا نام نامی اسم گرامی ذکر نہیں کیا۔ اس سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں اوّل یہ کہ امام اعظمؒ صاحبِ مشکوٰۃ کے نزدیک امام نہیں ہیں اگر امام ہوتے تو دیگر ائمہ کی طرح ان کا نام ضرور ذکر فرماتے۔ دوم یہ کہ امام اعظمؒ صاحبِ مشکوٰۃ کے نزدیک ائمہ اتقنہ نہیں ہیں۔ جس طرح کہ باقی حضرات کو صاحبِ مشکوٰۃ نے ائمہ اتقنہ میں شمار کیا ہے۔ کما رواہ الائمۃ المتقنون الخ۔

جوابِ اوّل صاحبِ مشکوٰۃ کا امام صاحب کا نام ذکر نہ کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کے ہاں امام صاحب امام ہی نہیں یعنی امام اعظم کی امامتِ عظمیٰ صاحبِ مشکوٰۃ کے قول پر موقوف نہیں۔

جوابِ دوم صاحبِ مشکوٰۃ کا امام صاحب کا نام نہ ذکر کرنے سے یہ مقصد نہیں کہ ان کے ہاں امام صاحب امام ہی نہیں۔ بلکہ عدم ذکر اس بنا پر ہے کہ صاحبِ مشکوٰۃ کو امام اعظم سے کوئی روایت نہیں ملی، اگر روایت ملتی تو ضرور نام گرامی نقل فرماتے۔

یقول شیخ جاجروی رحمہ القوی ـ اگر بنظرِ عمیق مطالعہ کیا جائے تو صاحبِ مشکوٰۃ امام صاحب کی امامتِ عظمیٰ کے قائل ہی نہیں بلکہ امام کے تقویٰ و زہد و علم و عمل کا بھی قائل ہے۔ صاحبِ مشکوٰۃ نے مشکوٰۃ شریف کے آخر میں ایک رسالہ اسماءِ رجال میں لکھا ہے جس کا نام "اکمال فی اسماء الرجال" ہے۔ اس میں دوسرا باب باندھتے ہیں:۔

اَلْبَابُ الثَّانِیْ فِیْ ذِکْرِ اَئِمَّۃِ اَصْحَابِ الْاُصُوْلِ ـ ص۶۲۴)

امام صاحب کے متعلق فرماتے ہیں:۔

ھُوَ الْاِمَامُ اَبُوْحَنِیْفَۃَ النُّعْمَانُ بْنُ ثَابِتٍ ـ الخ ـ

تو امام ہونے کے قائل ہوئے۔ آگے لکھتے ہیں:۔

وَلَوْ ذَهَبْنَا إِلَى شَرْحِ مَنَاقِبِهِ وَفَضَائِلِهِ لَأَطَلْنَا الْخُطَبَ وَلَمْ نَصِلْ إِلَى الْغَرَضِ فَإِنَّهُ كَانَ عَالِمًا عَامِلًا وَرِعًا زَاهِدًا عَابِدًا إِمَامًا فِي عُلُومِ الشَّرِيعَةِ وَالْغَرَضُ بِإِيرَادِ ذِكْرِهِ فِي هَذَا الْكِتَابِ وَإِنْ لَمْ نُرْوِ عَنْهُ حَدِيثًا فِي الْمِشْكٰوةِ لِلتَّبَرُّكِ بِهِ لِعُلُوِّ مَرْتَبَتِهِ وَوُفُورِ عِلْمِهِ

ترجمہ: اور اگر ہم ان کے مناقب و فضائل کی تشریح کرنے لگیں تو بات لمبی ہو جائے گی اور مقصد یا مقدّسے جاتا رہے گا۔ خلاصہ یہ ہے کہ آپ عالم عامل متقی زاہد، عابد اور علوم شریعت میں امام تھے۔ اس کتاب میں ہم نے ان کا تذکرہ کیا ہے حالانکہ ان کے واسطہ سے کوئی روایت اس کتاب مشکوٰۃ میں نہیں ہے اس کی غرض صرف آپ کی جلالتِ شان اور کثرتِ علوم کے باعث آپ کے نام و ذکر سے تبرک کا حصول ہے۔

وَإِنِّي إِذَا أَنْسَبْتُ الْحَدِيثَ إِلَيْهِمْ كَأَنِّي أَسْنَدْتُ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِأَنَّهُمْ قَدْ فَرَغُوا مِنْهُ وَأَغْنَوْنَا عَنْهُ:

ترجمہ: اور میں نے جب ان بزرگوں کی طرف حدیث منسوب کر دی تو گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی طرف اسناد کر دی کیونکہ ان بزرگوں نے اسناد سے فارغ ہو کر ہم کو بے نیاز کر دیا۔

قَوْلُهُ وَإِنِّي إِذَا أَنْسَبْتُ — دفعیہ سوال مُقدّر ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر مصابیح ناقص کتاب تھی تو مشکوٰۃ بھی ناقص ہے یعنی صاحبِ مصابیح پر یہ اعتراض کیا گیا تھا کہ انہوں نے نقل حدیث کے وقت تمام سند کے ذکر کا

التزام نہیں کیا تو اب بھی وہ بات باقی رہ گئی کیونکہ صاحب مشکوٰۃ نے بھی صرف صحابی اور کتاب کے حوالہ کے ذکر کو کافی جانا تمام سند ذکر نہیں کی۔

جواب تو مصنف علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ جن ائمہ محدثین سے یہ احادیث لی گئی ہیں انہوں نے خود ہی سند کے سلسلہ میں تلاش و جستجو کے بعد اس مرحلہ کو طے کر لیا تھا اور ان حضرات نے اپنی کتابوں میں چونکہ اسناد ذکر کر دی ہیں اس لیے ان کی ذکر کردہ سند کو کافی سمجھتے ہوئے اب ہمیں تمام اسناد ذکر کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔

وَسَرَدْتُّ الْكُتُبَ وَالْاَبْوَابَ كَمَا سَرَدَهَا وَاقْتَفَيْتُ اَثَرَهٗ فِيهَا

ترجمہ: اور میں نے اس کتاب کی ترتیب وہی رکھی جو صاحب مصابیح نے رکھی تھی اور اس سلسلہ میں میں نے ان ہی کے نقش قدم کی پیروی کی ہے۔

اس جملہ کا مقصد یہ ہے کہ جس ترتیب سے صاحب مصابیح نے مسائل کی کتابیں اور ان کتابوں کے باب بیان کیے ہیں میں نے بھی اسی طرح بغیر تقدیم و تاخیر بیان کیے اور کتابوں، بابوں کے وہی عنوان رکھے جو انہوں نے رکھے تھے مثلاً کتاب الطہارت اس میں وضو کا باب پھر غسل کا اور پھر تیمم کا باب ہوگا۔

وَقَسَمْتُ كُلَّ بَابٍ غَالِبًا عَلٰى فُصُوْلٍ ثَلَاثَةٍ اَوَّلُهَا مَا اَخْرَجَهُ الشَّيْخَانِ اَوْ اَحَدُهُمَا وَاكْتَفَيْتُ

ترجمہ: اور میں نے ہر باب کو تین فصلوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلی فصل میں ان حدیثوں کو جمع کیا ہے جن کو شیخین (یعنی بخاری و مسلم) نے روایت کیا ہے یا ان دونوں میں

بِهِمَا وَاِنْ اِشْتَرَكَ فِيْهِ الْغَيْرُ لِعُلُوِّ دَرَجَتِهِمَا فِي الرِّوَايَةِ

سے کسی ایک نے روایت کیا ہے اگرچہ ان حدیثوں میں بعض ایسی بھی ہیں جن کو دوسرے محدثین نے بھی روایت کیا ہے لیکن میں نے اس فصل میں صرف شیخین کے ذکر پر اکتفا کیا ہے کیونکہ شیخین کا درجہ تمام محدثین سے بلند ہے۔

اس عبارت کے مقصد بیان کرنے سے قبل ایک فائدہ ملاحظہ فرمائیں:۔

فائدہ مشکوٰۃ میں متفق علیہ کی اصطلاح اس حدیث کے لیے ہے جو ایک صحابی سے بخاری و مسلم دونوں میں مذکور ہو اگر صحابی کا اختلاف ہو مثلاً بخاری میں تو ایک صحابی سے منقول ہے اور مسلم میں دوسرے صحابی سے تو اس روایت کو متفق علیہ نہیں کہیں گے اگرچہ حدیث ایک ہی ہو۔

اس عبارت میں مصنف علیہ الرحمۃ یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ فن حدیث میں بخاری و مسلم کا درجہ بہت بلند ہے حتیٰ کہ ان کو حدیث شیخین کہا جاتا ہے۔ جیسے فقہ میں امام ابوحنیفہؒ اور امام ابویوسفؒ اور منطق میں علامہ فارابی اور بوعلی سینا کو۔

اس لیے پہلی فصل میں ان بزرگوں کی روایتیں لاؤں گا، اور اگر کسی حدیث کو شیخین کے علاوہ اور محدثین نے نقل کیا ہو تو میں وہ حدیث صرف شیخین ہی کی طرف نسبت کرونگا مثلاً اگر کوئی حدیث بخاری اور ترمذی کی ہے تو میں صرف بخاری کا نام لونگا اور کہونگا رواہ البخاری کیونکہ ان کے ذکر کرتے ہوئے کسی کے ذکر کی ضرورت نہیں۔

سوال: مصنف علیہ الرحمۃ نے عبارت میں غالبًا کی قید کیوں لگائی ہے؟

جواب: غالبًا کی قید لگا کر صاحب کتاب اس طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ اگرچہ بعض بابوں میں دو ہی فصلیں ہونگی مگر یہ بہت کم اکثر تین ہی ہونگی یعنی یہ قانون کُلّی نہیں بلکہ اکثر و غالبیت کے درجہ میں ہے۔

وَثَانِيْهَا مَا اَوْرَدَهُ غَيْرُهُمَا مِنَ الْاَئِمَّةِ الْمَذْكُوْرِيْنَ

ترجمہ : اور دوسری فصل میں وہ احادیث نقل کی ہیں جن کو شیخین یعنی بخاری ومُسلم کے علاوہ دوسرے مذکورہ ائمہ میں سے کسی اور نے روایت کیا ہے۔

دوسرے ائمہ سے مراد ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ وغیرہ ہیں۔ اس جملہ کا مقصد یہ ہے کہ دوسری فصل میں ان ائمہ مذکورین کی احادیث ذکر کی جائینگی۔

وَثَالِثُهَا مَا اشْتَمَلَ عَلٰى مَعْنَى الْبَابِ مِنْ مُلْحِقَاتٍ مُنَاسِبَةٍ مَعَ مُحَافِظَةٍ عَلَى الشَّرِيْطَةِ وَاِنْ كَانَ مَاثُوْرًا عَنِ السَّلَفِ وَالْخَلَفِ

ترجمہ : اور تیسری فصل میں احادیث کے علاوہ صحابہؓ وتابعینؒ کے ان اقوال وآثار کو بھی جمع کیا گیا ہے جو باب کے مناسب اور لائق تھے لیکن آثار وخبر کو شامل کرتے ہوئے شرائطِ حدیث کو مدنظر رکھا گیا ہے۔

صاحبِ کتاب کا مقصد یہ ہے کہ میں نے تیسری فصل بڑھائی ہے اور اس میں یہ التزام کیا کہ حدیث مرفوع ہی لاؤں بلکہ صحابہؓ وتابعینؒ کے ایسے اقوال وافعال اور تقاریر بھی اس فصل میں نقل کروں گا جو باب کے مناسب ہونگی کیونکہ اصطلاح محدثینؒ میں اسے بھی حدیث کہتے ہیں۔
سلف کے معنیٰ گذرے ہوئے لوگ یعنی متقدمین۔ خلف کے معنیٰ پیچھے والے یعنی متاخرین یہاں سلفؒ سے مراد صحابہ کرامؓ ہیں اور خلف سے مراد تابعینؒ ہیں۔ چونکہ صحابہؓ کا درجہ غیر صحابہؒ سے کہیں زیادہ ہے اس لیے ان کا نام پہلے لیا اور تابعین کا بعد میں۔

ثُمَّ اِنَّكَ اِنْ فَقَدْتَ حَدِيْثًا فِي بَابٍ فَذَالِكَ عَنْ تَكْرِيْرٍ اُسْقِطُهُ

ترجمہ: پھر تحقیق اگر کسی باب میں کوئی حدیث نہ پائی جائے تو سمجھا جائے کہ اسے میں نے تکرار کی وجہ سے نقل نہیں کیا۔

یہاں سے علامہ خطیب چند اصول یا ضابطے بیان فرما رہے ہیں:۔

اصولِ اوّل یہ ہے کہ اگر کسی باب میں کوئی حدیث مصابیح میں تو تھی مگر مشکوٰۃ میں نہیں تو اس کی وجہ یہ ہوگی کہ مصابیح میں وہ حدیث دو جگہ آئی تھی میں نے ایک جگہ رکھی اور دوسری جگہ ساقط کردی۔

وَاِنْ وَجَدْتَ اٰخَرَ بَعْضَهٗ مَتْرُوْكًا عَلٰى اِخْتِصَارِهٖ اَوْ مَضْمُوْمًا اِلَيْهِ تَمَامُهٗ فَعَنْ دَاعِیْ اِهْتِمَامٍ اُتْرُكُهٗ وَاُلْحِقُهٗ

ترجمہ: اور اگر پاؤ تم ایک حدیث کہ اس کا بعض حصہ اختصار کی وجہ سے حذف کر دیا گیا ہے یا اس میں بقیہ حصہ اس حدیث کا ملا دیا گیا ہے تو یہ حذف کرنا اور ملانا خاص مقصد کے تحت ہے۔

یہاں سے اصول ثانی بیان فرمارہے ہیں۔

اصولِ دوم جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی حدیث مصابیح میں تو مختصراً مذکور تھی مگر مشکوٰۃ میں پوری طویل یا اس کے برعکس تھی اور مصابیح میں مکمل وطویل تھی مگر میں نے اس کو مختصر کرکے نقل کیا تو اس کی کوئی حکمت اور وجہ ہوگی میں نے بلا وجہ یہ فرق نہ کیا مثلاً ایک طویل حدیث کا ایک جزء باب کے مناسب ہے باقی نہیں تو میں صرف وہ مناسب جزء ہی نقل کروں گا مختصراً اور اگر کسی حدیث کے دو جزء مصابیح کے دو بابوں میں منقول ہوئے

تومیں پوری حدیث ایک باب میں طویل ذکر کرونگا۔

وَاِنْ عَثَرْتَ عَلَى اخْتِلَافٍ فِي الْفَصْلَيْنِ مِنْ ذِكْرِ غَيْرِ الشَّيْخَيْنِ فِي الْأَوَّلِ وَذِكْرِهِمَا فِي الثَّانِي فَاعْلَمْ أَنِّي بَعْدَ تَتَبُّعِي كِتَابَيِ الْجَمْعُ بَيْنَ الصَّحِيحَيْنِ لِلْحُمَيْدِيِّ وَجَامِعُ الْأُصُولِ اعْتَمَدْتُ عَلَى صَحِيحَيِ الشَّيْخَيْنِ وَمَتْنَيْهِمَا

ترجمہ: اور اگر تم دو فصلوں میں کسی اختلاف پر مطلع ہو مثلاً یوں کہ پہلی فصل میں غیر شیخین کی اور دوسری میں شیخین کی حدیث مذکور ہو تو جان لینا یہ اس لیے ہے کہ میں نے حمیدی کی کتاب جمع بین الصحیحین اور کتاب جامع الاصول جو شیخین کی احادیث کی جامع ہیں کے تلاش کے بعد صحیح مسلم و بخاری اور ان کے متنوں پر اعتماد کیا۔

صاحبِ کتاب کا مقصد اصول ثالث کی طرف اشارہ ہے۔

اصولِ سوم

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ صاحبِ مصابیح نے تو یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ فصلِ اوّل میں ان احادیث کو نقل کیا جو شیخین یعنی امام بخاری اور امام مسلم سے ان کی کتاب میں روایت کی گئی ہیں اور فصل ثانی میں ان احادیث کو جمع کیا ہے جو شیخین کے علاوہ دوسرے ائمہ سے مذکور ہیں لیکن مشکوٰۃ میں بعض جگہ ایسا بھی ہے کہ فصل اوّل میں وہ احادیث جن کو صاحبِ مصابیح نے شیخین کی طرف نسبت کرتے ہوئے نقل کیا ہے۔ صاحبِ مشکوٰۃ نے ان کو دوسرے ائمہ کی طرف منسوب کرکے نقل کیا ہے جیسے باب سنن وضو کی فصل اوّل میں یا باب فضائل قرآن میں اسی طرح بعض جگہ فصل ثانی کی احادیث کو شیخین کی طرف منسوب کیا ہے جیسے باب "مایقرأ بعد التکبیر یا باب الموقف وغیرہ میں تو اس ردوبدل اور فرق کے بارہ میں صاحبِ

مشکوٰۃ کہتے ہیں کہ یہ میری غلطی یا سہو کی بنا پر نہیں ہوا بلکہ میں نے کتاب جمع بین الصحیحین اور کتاب جامع الاصول نیز بخاری و مسلم کے اصل نسخوں اور ان کے متنوں میں کافی تلاش و تحقیق کی چنانچہ ان کتابوں میں جن احادیث کو شیخین کی طرف منسوب نہیں کیا گیا ہے۔ اور انہیں صاحب مصابیح نے فصل اول میں شیخین کی طرف منسوب کیا ہے تو میں نے ان احادیث کو مشکوٰۃ میں شیخین کی طرف منسوب کرنے کے بجائے ان کے اصل راوی اور ناقل کی طرف منسوب کیا ہے۔ ایسے ہی جن احادیث کو صاحبِ مصابیح نے شیخین کے علاوہ دوسرے ائمہ کی طرف منسوب کر کے فصل ثانی میں نقل کیا تھا اور وہ احادیث مجھے ان کتب مذکورہ میں شیخین کی طرف منسوب ملیں تو میں نے ان کو شیخین کی طرف منسوب کر دیا اور چونکہ مجھے اپنی تحقیق و جستجو پر اعتماد تھا اس لیے میں نے یہ سوچ کر مصابیح کی نقل کے خلاف ایسا کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ صاحبِ مصابیح سے نقلِ حدیث کے وقت سہو گیا ہو۔

وَاِنْ رَأَيْتَ اخْتِلَافًا فِيْ نَفْسِ الْحَدِيْثِ فَذٰلِكَ مِنْ تَشَعُّبِ طُرُقِ الْاَحَادِيْثِ	ترجمہ: اور اگر اختلاف اصل حدیث میں نظر آئے تو یہ احادیث کی اسناد میں اختلاف کی وجہ سے ہوگا۔

یہاں سے اُصولِ رابع کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

اُصولِ رابع صاحبِ مصابیح نے ایک حدیث روایت کی اور وہی حدیث جب صاحبِ مشکوٰۃ نے نقل کی تو دونوں کے الفاظ میں فرق نکلا یعنی صاحب مصابیح کی روایت کردہ حدیث کے الفاظ کچھ اور ہیں اور صاحبِ مشکوٰۃ کی روایت کردہ حدیث کے الفاظ دوسرے ہیں تو اس بارے میں صاحبِ مشکوٰۃ فرماتے ہیں کہ یہ فرق دراصل سندوں کے اختلاف کی بنا پر ہوا ہے یعنی صاحبِ مصابیح کو وہ روایت جس سند سے پہنچی ہے اس میں وہ الفاظ ہیں جن کو انہوں نے نقل کیا ہے اور مجھے جس سند سے ملی ہے اس میں یہ الفاظ ہیں جو میں نقل کر رہا ہوں۔

وَلَعَلِّیْ مَا اَطَّلَعْتُ عَلٰی تِلْكَ الرِّوَایَةِ الَّتِیْ سَلَكَهَا الشَّیْخُ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ وَقَلِیْلًا مَّا تَجِدُ اَقُوْلُ مَا وَجَدْتُّ هٰذِهِ الرِّوَایَةَ فِیْ كُتُبِ الْاُصُوْلِ اَوْ وَجَدْتُّ خِلَافَهَا فِیْهَا فَاِذَا وَقَفْتَ عَلَیْهِ فَانْسِبِ الْقُصُوْرَ اِلَیَّ لِقِلَّةِ الدِّرَایَةِ لَا اِلٰی جَنَابِ الشَّیْخِ رَفَعَ اللّٰهُ قَدْرَهٗ فِی الدَّارَیْنِ حَاشَا لِلّٰهِ مِنْ ذَالِكَ

ترجمہ: اور شاید میں اس روایت پر خبردار نہ ہوا ہوں جدھر حضرت شیخ گئے تم بہت کم یہ بھی پاؤگے کہ میں کہوں گا کہ میں نے یہ روایت اصول کی کتابوں میں نہ پائی یا ان میں اس کے خلاف پائی توجب تم اس پر مطلع ہو تو یہ میری کم علمی کی بناء پر قصور کو میری طرف منسوب کرنا نہ کہ حضرت شیخ کی طرف اللہ تعالیٰ دونوں جہان میں ان کی عزت بڑھائے اس نسبت سے خدا کی پناہ۔

قولہٗ حَاشَا لِلّٰهِ ـــــ ای تَنْزِیْهًا لَهٗ

قولہٗ مِنْ ذَالِكَ ـــــ ای مِنْ نِسْبَةِ الْقُصُوْرِ اِلَی الشَّیْخِ: یہاں مصنفؒ اصول خامس بیان کر رہے ہیں:۔

اصول خامس۵

یہ ہے کہ اگر ایسا ہو کہ جس روایت کو صاحب مصابیح نے نقل کیا ہے وہ روایت مجھے نہ ملی ہو یا ان کی نقل کردہ روایت اور میری نقل کردہ روایت میں کوئی اختلاف نظر آئے تو اس میں غلطی اور قصور کی نسبت میری ہی جانب کی جائے صاحب مصابیح کو غلطی اور خطا کا مرتکب قرار نہ دیا جائے۔ نیز صاحب مشکوٰۃ کا یہ کہنا کہ غلطی

اور قصور کی نسبت میری جانب کی جائے خلوصِ نیت اور اعترافِ حقیقت کی بنا پر ہے اس میں ریاکاری کا دخل نہیں ہے۔ جیساکہ حَاشَا لِلّٰهِ مِنْ ذَالِكَ سے اشارہ کر دیا ہے۔ اور اصول کی کتابوں سے مراد وہی مذکورہ کتب یعنی بخاری و مسلم ہیں۔

رَحِمَ اللّٰهُ مَنْ اِذَا وَقَفَ عَلٰى ذَالِكَ نَبَّهَنَا عَلَيْهِ وَاَرْشَدَنَا طَرِيْقَ الصَّوَابِ	ترجمہ: خدا کی رحمت ہو اس شخص پر جسے وہ روایت معلوم ہو اور ہمیں مطلع کر کے راہ حق بتائے۔

یہ جملہ دُعائیہ ہے کقول عمر رضی اللہ عنہ "رحم اللہ امرأ اھدٰی اِلَیَّ بعیوبِ نفسی"۔ یعنی اگر کسی شخص کو وہ روایت معلوم ہو جو صاحبِ مصابیح نے نقل کی ہے اور مجھے معلوم نہیں ہوئی۔ تو اس کو چاہیے کہ اگر ہماری زندگی میں اسے معلوم ہو تو ہمیں بتا دے اور مرنے کے بعد ہماری کتاب میں اس کا اضافہ کر دے۔

وَلَمْ اٰلُ جُهْدًا فِى التَّنْقِيْرِ وَالتَّفْتِيْشِ بِقَدْرِ الْوُسْعِ وَالطَّاقَةِ وَنَقَلْتُ ذَالِكَ الْاِخْتِلَافَ كَمَا وَجَدْتُّ	ترجمہ: اور میں نے تحقیق و تدقیق میں کمی نہیں کی اپنی وسعت و طاقت کے مطابق، اور نقل کیا میں نے اختلاف کو جیسے پایا۔

یہ کلمات ایک سوال کا جواب ہیں:۔

سوال: یہ ہے کہ اگر صاحبِ مشکوٰۃ زیادہ تتبع کرتے تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ ان کو وہ روایتیں نہ ملتیں جو صاحبِ مصابیح سے رہ گئیں؟

جواب: تو اس کا جواب خود صاحبِ مشکوٰۃ نے دے دیا کہ جہاں تک

میری رسائی اور ہمت وطاقت تھی میں نے اس سے بڑھ کر تحقیق وتلاش کی اور اپنی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں کی مگر مجھے نہیں ملیں۔

وَمَا اَشَارَ اِلَیْهِ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ مِنْ غَرِیْبٍ اَوْضَعِیْفٍ اَوْ غَیْرِهِمَا بَیَّنْتُ وَجْهَهٗ غَالِبًا وَمَا لَمْ یُشِرْ اِلَیْهِ مِمَّا فِی الْاُصُوْلِ فَقَدْ قَفَّیْتُهٗ فِیْ تَرْكِهٖ اِلَّا فِیْ مَوَاضِعَ لِغَرَضٍ

ترجمہ: اور جن احادیث پر شیخؒ نے ضعیف یا غریب وغیرہ کا حکم لگایا ہے میں نے ان کا سبب بیان کر دیا ہے اور جن احادیث کو اصول کی طرف شیخ نے کوئی اشارہ نہیں کیا تو میں بھی شیخ کی پیروی کرتے ہوئے اسے چھوڑ دیا ہے مگر بعض مقامات پر کسی غرض کی بنا پر میں نے توضیح کر دی ہے۔

قولہٗ: وَمَا اَشَارَ اِلَیْهِ سے صاحب کتاب اصولِ سادس کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں:۔

اصولِ سادس جس کا خلاصہ یہ ہے کہ صاحب مصابیح نے بعض احادیث کے بارہ میں نقل کیا تھا کہ فلاں غریب ہے اور فلاں ضعیف ہے تو صاحب مشکوٰۃ نے مشکوٰۃ میں اس کی توضیح کی ہے اور بتایا ہے کہ یہ حدیث غریب کیوں، یا ضعیف کیوں ہے اور کچھ ایسی احادیث تھیں جن کو صاحب مصابیح نے نہ تو ضعیف وغریب کہا تھا بلکہ انہیں ایسا ہی چھوڑ دیا تھا تو صاحب مشکوٰۃ نے بھی ان کی اتباع کرتے ہوئے ان کی کوئی توضیح نہیں کی بلکہ انہیں جوں کا توں نقل کر دیا۔

قولہٗ: اِلَّا فِیْ مَوَاضِعَ لِغَرَضٍ ــــ یہاں سے اصولِ سابع بیان کر رہے ہیں:

اصولِ سابع: جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بعض مجبوریوں کی وجہ سے کسی غرض کی بنا پر کچھ ایسے مقامات

پر صاحب مشکوٰۃ نے توضیح کر دی ہے جہاں صاحب مصابیح نے سکوت اختیار کیا ہے مثلاً بعض لوگوں نے طعن وکلام کیا کہ فلاں حدیث موضوع ہے یا باطل ہے تو مجبوراً صاحب مشکوٰۃ نے اس الزام کی تردید کرتے ہوئے ان کی تشریح وتوضیح ترمذی شریف وغیرہ کے حوالہ سے کی کہ یہ حدیث صحیح ہے یا حسن ہے کیونکہ علاّمہ ترمذیؒ نے اسے صحیح یا حسن کہا ہے ۔

وَرُبَمَا تَجِدُ مَوَاضِعَ مُهْمَلَةً وَذَالِكَ حَيْثُ لَمْ اَطَّلِعْ عَلٰى رِوَايَةٍ فَتَرَكْتُ الْبَيَاضَ فَاِنْ عَثَرْتَ عَلَيْهِ فَاَلْحِقْهُ بِهٖ اَحْسَنَ اللّٰهُ جَزَاكَ

ترجمہ : بسا اوقات تمہیں ایسے مقام بھی ملیں گے کہ وہاں حدیث کے بعد میں نے کتاب کا حوالہ نہیں دیا کیونکہ باوجود تحقیق وتلاش کے میں راوی کے نام سے واقف نہیں ہو سکا لہٰذا وہ جگہ میں نے چھوڑ دی ہے ۔ پس اگر تمہیں راوی کے نام کا علم ہو تو اس جگہ کا حوالہ دے دینا اس کے لیے اللہ تعالیٰ تمہیں جزائے خیر عطا فرمائیں گے ۔

یہاں سے صاحبِ کتاب آخری اُصول بیان فرما رہے ہیں ۔

اُصولِ ثامن ۸

یعنی مشکوٰۃ شریف میں کہیں حدیث کے بعد تھوڑی سی خالی جگہ پاؤ گے تو اس کی وجہ یہ ہوگی کہ مصابیح میں تو وہ حدیث موجود تھی لیکن مجھے کسی کتاب میں نہ ملی، اور مجھے پورا اعتماد ہے کہ علاّمہ بغویؒ یعنی صاحبِ مصابیح نے کہیں دیکھ کر ہی لکھی ہوگی ۔ اس لیے میں نے مشکوٰۃ میں حدیث تو لکھ دی مگر کتاب کے نام کے لیے جگہ چھوڑ دی تاکہ اگر کسی کو اس پر اطلاع ہو جائے تو وہ یہاں لکھ دے ۔

وَسَمَّيْتُ الْكِتَابَ بِمِشْكٰوةِ الْمَصَابِيْحِ

ترجمہ: اور اس کتاب کا نام میں نے مشکوٰۃ المصابیح رکھا ہے۔

مَصَابِیْحُ، مِصْبَاحُ کی جمع ہے جس کے معنیٰ چراغ کے ہیں اور مشکوٰۃ کے معنیٰ طاقچہ کے ہیں جس طرح طاقچہ میں چراغ رکھا جاتا ہے اسی طرح کتاب مصابیح مشکوٰۃ میں رکھی ہوئی ہے اس کی تشریح بیان ما یتعلّق بالمشکوٰۃ میں تفصیلاً گذر چکی ہے

وَاَسْأَلُ اللّٰهَ التَّوْفِيْقَ وَالْاِعَانَةَ وَالْهِدَايَةَ وَالصِّيَانَةَ وَتَيْسِيْرَ مَا اَقْصُدُهٗ

ترجمہ: اس کتاب کی تصنیف کے لیے میں اللہ تعالیٰ سے نیک توفیق، اس کی مدد اور ہدایت کا طلبگار ہوں اور اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے خطا اور قصور سے حفاظت اور مشکلات کی آسانیوں کے لیے دُعار کرتا ہوں۔

یہاں سے بیانِ دُعا ہے اور دُعار کے دو حصّے ہیں یہ حصّۂ اُولیٰ ہے جس میں توفیقِ ایزدی اور طلبِ ہدایت اور عزائم مستقبلہ کی تکمیل پر امداد مانگی جارہی ہے۔

وَاَنْ يَّنْفَعَنِىْ فِى الْحَيٰوةِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ وَجَمِيْعَ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ حَسْبِىَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ وَلَا حَوْلَ وَلَا

ترجمہ: اور دعار کرتا ہوں کہ ربّ ذوالجلال اس زندگی میں اور مرنے کے بعد مجھے بھی اور ہر مسلمان مرد و عورت کو نفع پہنچائے۔ اور اللہ تعالیٰ میرے لیے کافی اور بہتر

قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ

کارساز ہے اور بُرائی سے بچنے کی طاقت اور نیک کام کرنے کی قوّت اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے جو تمام اُمور پر غالب اور حکمت والا ہے

قولہٗ فِی الحَیَاۃِ وَبَعْدَ الْمَمَات : زندگی میں نفع تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کتاب کے مُطالعہ اور اس سے استفادہ کی توفیق عطا فرمائے اور ان احادیث پر عمل کرنے کی توفیق دے، اور مرنے کے بعد نفع یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کی برکت سے مغفرت وبخشش اور جنّت کی نعمت سے نوازے اور اپنی بے پایاں رحمت کے دروازے کھول دے۔

قولہ حَسْبِیَ اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ : علّامہ خطیب نے کلمہ دُعائیہ جو حَسْبِیَ اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ اختیار کیا ہے احادیثِ نبویّہ سے اس کلمہ کے بے شمار فضائل ثابت ہیں۔ امام بُخاریؒ نے "الاسماء والصّفات" میں حضرت ابن عباسؓ سے اور حافظ عبدالرّزاق وغیرہ نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ جس وقت حضرت ابراہیم علیہ السّلام آگ میں ڈالے گئے تو آپ کا آخری کلمہ حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ تھا۔ ابن مردویہ نے حضرت ابوہریرہؓ سے تخریج کی ہے کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم کسی شدّت میں مُبتلا ہوجاؤ تو حَسْبُنَا اللّٰہُ ونعم الوکیل پڑھا کرو۔" حافظ ابونعیم نے حضرت شدّاد بن اوسؓ سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا "حَسْبِیَ اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ ہر خوف سے امن ہے۔"

غزوہ حمراء الاسد کے مجُاہدین کی قرآن پاک میں جو مدح آئی ہے وہ یہ ہے:۔

اَلَّذِیْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِیْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِیْلُ

ترجمہ: جن کو کہا لوگوں نے کہ مکّہ والے آدمیوں نے جمع کیا ہے سامان تمہارے مُقابلہ کو سو تم ان سے ڈرو، سو اور زیادہ ہوا ان کا ایمان، اور بولے کافی ہے ہم کو اللہ اور کیا خوب کارساز ہے۔

يقول ابوالاسعاد صانه الله عن الشرّ والفساد :

قولهٗ فِی الْحَیَاۃِ وَ بَعْدَ الْمَمَات : کی تشریح شرّاح حضرات کے ہاں وہی ہے جو بیان کر دی ہے لیکن ذرا وضاحت کے ساتھ بندہ عرض گذار ہے :۔

مثلاً خطیبؒ کا مقصد یہ ہے کہ میری زندگی اتنی دراز ہو کہ تصنیف کے بعد پڑھ بھی سکوں اور پڑھا بھی سکوں، اور اس کی برکت سے زندگی ایمان اور تقویٰ میں بسر ہو، مرتے وقت کلمہ نصیب ہو، اور یہ کتاب قبر و حشر میں کام آئے اور میرے بعد بار بار شائع ہوتی رہے مسلمان فائدہ اٹھاتے رہیں اور مجھے اس کا ثواب ملتا رہے۔

الحمدللہ ! مصنّف علیہ الرحمت کی یہ دُعا قبول ہوئی کہ بفضلہٖ تعالیٰ دُنیا کے ہر خطّہ میں جہاں مُسلمان ہیں یہ کتاب موجود ہے۔ ہر جگہ اس کے درس دیے جا رہے ہیں اور مُختلف زبانوں میں اس کی شرحیں کی جا چکی ہیں۔

یہ بندہ گنہگار شرمسار بھی مُصنّف علیہ الرحمت کی دُعا کے ساتھ ہی دُعا کرتا ہے اور انہی کے طفیل قبولیت کا اُمیدوار ہے۔ اللہ تعالیٰ اس حقیر سی محنت کو حقیقتاً مشکوٰۃ المصابیح کے لیے سعادت کی مفاتیح (نیک بختی کی چابیاں) بنائے اور قبول فرما کر میرے لیے کفّارۂ سیّئات اور صدقہ جاریہ بنائے۔ آمین یا ربّ العٰلمین :

وصلّی اللہُ تعالیٰ علیٰ خیرِ خلقِہٖ ونورِ عرشِہٖ سیّدِنا
ومولانا محمّدٍ وّعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ اجمعین

ابوالاسعاد
یُوسف جاجروی
نزیل فی الجامعہ بدر العلوم
۲۵ اپریل ۲۰۰۱ء یکم صفر المظفر ۱۴۲۲ھ
(بعد صلوٰۃ المغرب)

زُبدَةُ الکَلِمَاتِ

فی حدیث

اِنَّمَا الاَعمَالُ بِالنِّیَّاتِ

ہر محدّث و شیخ اپنی وُسعتِ علمی کے مطابق اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے مختلف ناموں سے تعبیر کرتے ہیں احقر نے "زُبدَةُ الکَلِمَاتِ" سے تعبیر کیا ہے۔ حسبُنا اللهُ وَنعمَ الوکیلُ ۔!

بِسمِ اللهِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ

عَن عُمَرَ بنِ الخَطَّابِ رَضِیَ اللهُ عَنهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیهِ وَسَلَّمَ اِنَّمَا الاَعمَالُ

ترجمہ : روایت ہے حضرت عمرؓ بن خطاب سے فرماتے ہیں (راضی ہو اللہ ان پر) فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اعمال نیتوں سے ہیں ہر شخص کے لیے وُہی ہے جو نیّت کرے

بِالنِّيَّاتِ وَاِنَّمَا لِامْرِئٍ مَّا نَوٰى فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَهِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلٰى دُنْيَا يُصِيْبُهَا اَوْ اِمْرَأَةٍ يَتَزَوَّجُهَا فَهِجْرَتُهٗ اِلٰى مَا هَاجَرَ اِلَيْهِ (متفق علیہ)

بس جس کی ہجرت اللہ ورسول کی طرف ہو تو اس کی ہجرت اللہ ورسول کی ہی طرف ہوگی اور جس کی ہجرت دنیا حاصل کرنے یا عورت سے نکاح کرنے کے لیے ہو تو اس کی ہجرت اس کی طرف ہوگی جس کے لیے ہجرت کی۔

اس حدیث کے مُتعلّق پانچ مباحث قابلِ ذکر ہیں :۔

اَلْبَحْثُ الْاَوَّلُ فِیْ ذِکْرِ شَانِ الْوُرُوْدِ لِهٰذَا الْحَدِيْثِ

حدیث مُبارک کا شان ورود

مُحدّثینؒ حضرات نے لکھا ہے کہ حدیث مبارک کا شان ورود ایک عورت کا قصّہ ہے چنانچہ علاّمہ طبرانی نے جیّد سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کی ہے کہ ہم میں سے ایک مرد نے ایک عورت سے خِطبہ (پیغامِ نکاح) کیا اس عورت کی کنیت امّ قیس اور نام اس کا قیلہ (قَیلہ بنت کاہل بفتح قاف کذا فی المغنی علاّمہ عینی) تھا پھر وہ عورت مدینہ کی طرف ہجرت کر گئی اس مرد نے دوبارہ پیغام نکاح بھیجا۔ اس پر امّ قیس نے ہجرت کی شرط لگائی تو اس مرد نے ہجرت اور نکاح کر لیا۔ اس لیے صحابہ کرامؓ اس شخص کو مہاجر امّ قیس کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ اس موقعہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حدیث ارشاد فرمائی تاکہ نیت کی اصلاح ہو جائے۔

سوال : یہ کہ صحابہ کرامؓ کی شان سے اس قسم کی نیّت بعید ہے۔

جواب : یہ ہے کہ ان کی نیت مخلوط تھی جو محض خلافِ اولیٰ ہے نہ کہ حقیقی گناہ!

لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر بھی نکیر فرمائی ۔ تو یہ واقعہ الٹا صحابہ کرامؓ کے کمالِ ایمان اور علوِّ شان کی دلیل ہے کہ خلافِ اولیٰ کو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں برداشت نہ کیا اور اس پر بھی نکیر فرمائی ۔

فائدہ حافظؒ نے طبرانیؒ کی روایت کو علیٰ شرط الشیخین قرار دیا ہے لیکن حافظؒ نے یہ فرمایا ہے کہ اس حدیث میں یعنی مہاجر امِّ قیس والے واقعہ میں ایسی کوئی بات موجود نہیں جس میں یہ پتہ چلے کہ یہ واقعہ اس حدیث کا شانِ وُرُود ہے ۔ مطلب حافظؒ کے کلام کا یہ ہے کہ مہاجر امِّ قیس والا واقعہ سنداً تو بالکل صحیح ہے لیکن اس واقعہ کے کسی لفظ سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ کی وجہ سے حدیث " اِنَّمَا الْاَعْمَالُ " بیان فرمائی تھی ۔

یقول ابوالاسعاد صانہ اللہ عن الشرّ والفساد : ارشاد القاری میں نقل کیا گیا ہے کہ علامہ محمد عابد السندھی نے اپنی کتاب مواہب لطیفہ میں علامہ السیوطیؒ کے رسالہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ زبیر بن بکار نے اپنی کتاب اخبارِ مدینہ میں نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے امِّ قیس کے لیے ہجرت کی تھی اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ بیان کی ہے ۔ اس میں تصریح ہوگئی کہ یہ واقعہ شانِ ورود بنتا ہے حدیث " اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ " کا ۔

البحثُ الثّانی حدیث کا نام مع وجہ تسمیہ

بعض مُحدّثینؒ حضرات نے اس کا نام حدیث المنبر بتایا ہے کیونکہ بقول شارح بخاری مہلبؒ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد الہجرت سب سے پہلے یہ حدیث منبر پر بیان فرمائی تھی ۔ اس حدیث سے ظہورِ وحی ہوا تھا جس طرح غارِ حراء سے وحی کی ابتداء ہوئی ۔ بعض حضرات نے اس حدیث کا نام حدیث النیّۃ بھی رکھا ہے ۔ بنا بریں اس میں نیّت کا ذکر ہے ۔

البحث الثالث فضیلت و اہمیت حدیث

امام ابی داؤد فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی کتاب سنن ابو داؤد پانچ لاکھ احادیث سے منتخب کی ہے اور پھر کتاب سے چار احادیث منتخب کی ہیں جو انسان کے دین کے لیے کافی ہیں۔

① اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ :
② لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يُحِبَّ لِاَخِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ :
③ مِنْ حُسْنِ الْاِسْلَامِ تَرْكُهٗ مَا لَا يَعْنِيْهِ -
④ اَلْحَلَالُ بَيِّنٌ وَالْحَرَامُ بَيِّنٌ -

بعض نے کہا ہے کہ یہ حدیث نصف العلم ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اعمال دو قسم ہیں :۔
اوّل وہ اعمال جن کا تعلق ہمارے قالب سے ہے۔ دوم : وہ اعمال جن کا تعلق قلب سے ہے یہ حدیث ان اعمال کے بارے میں ہے جو قلب سے متعلق ہیں تو گویا یہ نصف العلم ہے بہر حال اکثر محدثین نے اس کے فضائل لکھے ہیں

البحث الرابع فی ذکرِ وجہ التقدیم ہذا الحدیث

صاحب مشکوٰۃ اور صاحبِ مصابیح نے اپنی اپنی کتاب کے مقاصد سے پیشتر مقدمہ میں اس حدیث کو ذکر فرمایا، اس میں تین اشارات ہیں :۔

ا : اس طرف اشارہ کیا کہ تعلیم و تعلّم سے پہلے نیت درست کر لینی چاہیئے ورنہ تمام محنت ضائع ہو جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ سلف صالحین اس حدیث کو اپنی تصنیفات کے شروع میں لانا پسند کرتے تھے تاکہ طالبِ علم و معلّم دونوں اپنی نیت درست کر لیں۔ چنانچہ امام عبدالرحمٰن بن مہدی فرماتے ہیں :۔

مَنْ اَرَادَ اَنْ يُّصَنِّفَ كِتَابًا فَلْيَبْدَأْ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ :

اور علامہ خطابی فرماتے ہیں :۔

كَانَ الْمُتَقَدِّمُوْنَ مِنْ شُيُوْخِنَا يَسْتَحِبُّوْنَ تَقْدِيْمَ حَدِيْثِ الْاَعْمَالِ اَمَامَ كُلِّ شَيْئٍ يَّنْشَاءُ وَيُبْدَأُ مِنْ اُمُوْرِ الدِّيْنِ ۔

۲ : اس طرف اشارہ فرمایا کہ طلب علم کے لیے ہجرت ظاہر یہ کرنی ہوگی اور اپنا وطن چھوڑنا ہوگا اور طلب علم میں جو تکالیف پیش آئیں گی انہیں برداشت کرنا ہوگا ۔

۳ : اس طرف اشارہ فرمایا کہ ہجرت باطنیہ حقیقیہ یعنی ترک معاصی بھی کرنا پڑیگا جیسا کہ حدیث پاک میں ہے : " اَلْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ الْخَطَايَا وَالذُّنُوْبَ (کما فی المشکوٰۃ ص۱۵ ج۱)

البحث الخامس فی اجزاء الحدیث

اس حدیث کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے :۔

۱ : اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ ۔ ۲ : وَاِنَّمَا لِامْرِئٍ مَّا نَوٰى ۔ ۳ : فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ اِلٰى اٰخِرِ الْحَدِيْثِ ۔ ان تینوں حصوں کی الگ الگ تشریح ہوگی :۔

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ

قَوْلُهٗ اِنَّمَا : کلمہ انما بعض کے نزدیک مرکب اور بعض کے نزدیک بسیط ہے جو مرکب کہتے ہیں ان میں سے بعض کے نزدیک یہ اِنَّ اور مَا زائدہ سے مل کر بنا ہے اور بعض کے نزدیک اِنَّ اور مَا کافہ سے مرکب ہے اور بعض کے نزدیک مَا نافیہ ہے ۔ جمہور کے نزدیک یہ کلمہ حصر ہے کیونکہ نفی اور استثناء کی جگہ استعمال ہوتا ہے ۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :۔

اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ اور وَمَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ

اور جیسے اِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِيْنُ اور وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِيْنُ ٥

تعریفِ حصر علامہ عبدالقاہر جرجانی دلائل اعجاز القرآن میں لکھتے ہیں کہ جب متکلم کو اپنی بات پر پورا یقین ہو کہ میری بات سو فی صد صحیح ہے اس میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ اس جگہ پر اِنَّمَا استعمال کیا جاتا ہے، کما قال اللہ تعالیٰ:-
اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ - و فی مقامٍ آخر اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰى اِلَيَّ -
فارسی میں اس کا ترجمہ کرتے ہیں" جز این نیست" اور اردو میں "سوائے اس کے نہیں" کرتے ہیں۔

تقسیمِ حصر حصر دو قسم ہے - ۱) سب چیزوں کی نفی کر کے ایک کے لیے اثبات ہو تو یہ حصر حقیقی ہے - ۲) اور اگر بعض کی نفی کر کے ایک کے لیے اثبات ہو تو یہ حصر اضافی ہے یہاں حصر حقیقی مراد ہے۔

قولہ اَلْاَعْمَالُ : اعمال عمل کی جمع ہے۔ عمل اور فعل میں متعدد فرق بیان کیے جاتے ہیں

فرقِ اوّل عمل کا اطلاق صرف اختیاری کاموں پر ہوتا ہے۔ غیر اختیاری کاموں کو عمل نہیں کہتے جب کہ فعل کا اطلاق عام ہے اختیاری کاموں کو بھی کہہ دیتے ہیں اور غیر اختیاری کام کو بھی شریعت میں چونکہ انسان کو تکلیف اس کی اختیاری حد تک ہی دی جاتی ہے غیر اختیاری کام کا مکلّف نہیں بنایا جاتا۔ اس لیے اِعْمَلُوْا صَالِحًا فرمایا اِفْعَلُوْا صَالِحًا نہیں فرمایا۔

فرقِ دوم : عمل کا ترجمہ ہے ساختن اور فعل کا ترجمہ ہے کردن۔

فرقِ سوم : عمل کے مفہوم میں کچھ دوام واستمرار سمجھ میں آتا ہے بخلاف فعل کے شریعت میں نیک کاموں پر دوام مطلوب ہے اس لیے نیک کاموں کا مطالبہ اِعْمَلُوْا صَالِحًا کے لفظوں سے کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے اختیار کی حد تک ہمیشہ نیک کام کرتے رہو۔

فرقِ چہارم عمل وہ ہے جو سوچ وبچار کے بعد ہو اور فعل عام ہے علم سے ہو یا بغیر علم کے یہی وجہ ہے کہ عمل کو علم کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ بعض نکتہ دانوں نے کہا ہے
قُلِبَ لَفْظُ الْعَمَلِ عَنْ لَفْظِ الْعِلْمِ تَنْبِيْهًا اَنَّهٗ مِنْ مُقْتَضَاءٍ -

قولہ اَلنِّيَّاتِ : نیات نیّت کی جمع ہے نیّت مصدر ہے نوٰی ینوی کا نیت کے نون کے نیچے کسرہ ہے۔ یاء پر دو جہیں جائز ہیں تشدید اور تخفیف مشہور اور فصیح وجہ تشدید یاء ہے تخفیف بھی جائز ہے اصل میں یہ لفظ نِوْيَةٌ تھا بروزن فِعْلَةٌ : مَرْمِيٌّ

کے قاعدہ سے واو کو یاء کیا اور یاء کو یاء میں ادغام کیا نیّت ہو گیا۔ تخفیف یا کی صورت میں اس کی توجیہ یہ ہو گی کہ لام کلمہ کو حذف کر دیا گیا اور اس کے عوض میں تا لگا دی گئی نیت بن گیا۔ بہر کیف یہ لفیف مقرون ہے۔ نیّت کے دو معنی ہیں ؛

اوّل لغوی : لغت کے اندر نیّت بمعنی قصد و ارادہ کے ہے۔

دُوم شرعی : شریعت میں نیّت کہا جاتا ہے "توجّہُ القلبِ نحوَ الفعلِ ابتغاءً لوجہِ اللہ تعالیٰ"۔

نیّت و ارادہ میں فرق

جب نیّت کا لفظ استعمال کیا جائے تو ناوی کی غرض کا ذکر کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے جب ارادہ کا لفظ ذکر کیا جائے تو مرید کی غرض کا ذکر کرنا ضروری نہیں۔ مثلاً جب نیت کا لفظ استعمال کریں گے تو یوں کہیں گے نویتُ کذا لِکذا صرف نویتُ کذا کہہ دینا کافی نہ ہوگا اور جب ارادہ کا لفظ استعمال کریں گے تو اردت کذا کہنا کافی ہے لکذا ساتھ کہنا ضروری نہیں یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر نیت کا اطلاق نہیں ہوتا کیونکہ افعال باری تعالیٰ معلل بالاغراض نہیں۔

مفہوم حدیث

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ کا حاصل مطلب یہ ہے کہ اعمال کے عند اللہ مقبول یا مردود ہونے کا دار و مدار صرف نیات پر ہے اگر اچھی نیت سے عمل کیا جائے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہوگا اور اگر بری نیت سے عمل کیا جائے تو اللہ تعالیٰ کے دربار سے مردود ہوگا اس لیے ہر عمل میں اخلاص اور تصحیح نیت کا اہتمام کرنا چاہیے اس حدیث میں اخلاص فی العمل کی ترغیب دینا مقصود ہے۔

عمل مَشُوب کا حکم

مشوب کہتے ہیں ملاوٹ والا عمل۔ ہر کام کرنے کا کوئی نہ کوئی باعث اور مُحرّک ہوتا ہے اس باعث اور مُحرّک کے اعتبار سے عمل کی تین قسمیں ہیں

اوّل عمل کا باعث اور محرّک صرف اُخروی غرض ہو، اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنا، ثواب، اور جنت لینا۔

دُوم عمل کا باعث صرف دنیوی غرض ہو مثلاً لوگوں کی نظر میں وجاہت حاصل کرنا، یا کوئی اور دنیوی غرض حاصل کرنا۔

سوّم ؛ کسی عمل میں باعثَین یعنی غرض اخروی کے لیے بھی کیا جا رہا ہو اور غرض دنیوی کے لیے بھی

تیسری قسم کو عمل مشوب کہتے ہیں یعنی ملاوٹ والا عمل، اور پہلی دونوں قسموں کو عمل خالص کہتے ہیں پہلی قسم خالص للآخرۃ ہے، دوسری قسم خالص للدنیا ہے۔ لغت کے اعتبار سے ان دونوں صورتوں کو اخلاص کہا جاتا ہے۔ اس لیے کہ ہر ایک میں غرض ایک ہی ہے دوسری جانب کی ملاوٹ نہیں ہے لیکن شریعت میں جب اخلاص کا لفظ بولا جاتا ہے مراد اخلاص العمل للآخرۃ ہوتا ہے اپنے عمل کو دنیوی اغراض سے پاک کرلینا۔

تینوں قسموں کا حکم

پہلی قسم بالاتفاق مقبول ہے اس کا ثواب ملے گا۔ دوسری قسم بالاتفاق مردود ہے اس پر عقاب ہوگا، تیسری قسم یعنی عمل مشوب کے حکم میں تفصیل ہے اور اس کی تین حالتیں ہیں:۔

حالت اوّل: باعثین مساوی ہوں یعنی پچاس فیصد دنیوی غرض ہے اور پچاس فیصد اخروی غرض ہے۔

حالت دوم: باعث دنیوی غالب ہو اور باعث اُخروی مغلوب ہو مثلاً اسّی فی صد دنیوی غرض ہے اور بیس فی صد اخروی غرض ہے۔

حالت سوم: باعث اُخروی غالب ہے پہلی حالت میں نہ ثواب ہے نہ عقاب۔ اکثر علماء کی رائے یہی ہے دونوں غرضیں ایک دوسرے کی مزاحم بن گئی ہیں باقی قسموں کا کیا حکم ہے؟ اس میں تین قول ہیں:۔

قول اوّل اشد

علامہ عزالدین بن عبدالسلام اور علامہ محاسبی اور علامہ صلاح الدین علائی کا مذہب یہ ہے کہ جس عمل میں تھوڑی سی غرض دنیوی بھی مل جائے وہ مردود ہے یہ قول اشد ہے۔

قول دوم اخف

بعض علماء کا قول نقل کیا ہے کہ جس عمل میں تھوڑی سی غرض اخروی بھی مل جائے وہ مقبول ہے۔ یہ قول سب سے نرم و اخف ہے۔

قول سوم اعدل

امام غزالیؒ، علامہ قرطبیؒ اور جمہور علماءؒ کی رائے یہ ہے کہ دوسری اور تیسری قسم نہ مطلقاً مقبول ہے نہ مطلقاً مردود بلکہ اس میں تفصیل ہے وہ یہ ہے کہ جب باعث اُخروی غالب ہو باعث دنیوی مغلوب ہو تو اس پر ثواب مل جائے گا۔

لیکن اتنا ثواب نہیں ملے گا جتنا خالص للآخرۃ ہونے کی صورت میں ملنا چاہیے تھا بلکہ جس قدر دنیوی غرض کی ملاوٹ ہو گئی ہے اس قدر ثواب کم ہو جائے گا جب غرض دنیوی غالب ہو اس پر عقاب ہو گا لیکن اتنا عقاب نہیں ہو گا جتنا خالص لِلدُّنیا ہونے کی صورت میں ہونا تھا بلکہ جس قدر اُخروی غرض مل گئی ہے اتنا عقاب کم ہو جائے گا۔

یہ قول معتدل ہے اِسے عقل و نقل قبول کرتے ہیں۔ کمافی قولہ تعالیٰ :۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ

اس قول میں اس قانون کی پوری رعایت ہے ذرّۂ خیر کو نظرانداز کیا گیا ہے نہ ذرّۂ شرّ کو۔

فائدہ اُولیٰ جس میں ایک غلط فہمی کا ازالہ کیا گیا ہے۔ حدیث کے اس جملہ سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ نیات کی اعمال میں تاثیر ہوتی ہے لیکن یہاں سمجھ لینا ضروری ہے کہ ہر قسم کے عمل میں نیت مؤثر نہیں۔ اعمال کی تین قسمیں ہیں :۔

اوّل طاعات : وہ کام جن کو شریعت نیکی اور ثواب کا کام قرار دیتی ہے۔

دوم مَعاصی : یعنی گناہ کے کام۔

سوم مُباحات : یعنی جائز کام جو فی نفسہٖ نہ طاعت ہیں نہ معصیت ہیں مثلاً اچھا طعام کھانا، اچھا کپڑا پہننا وغیرہ۔ نیت کی تاثیر طاعات اور مباحات میں ہوتی ہے معاصی میں نیت کی کوئی تاثیر نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جس کام کو شریعت نے معصیت اور گناہ کہا ہے وہ بہر صورت گناہ ہے خواہ بری نیت سے ہو یا اچھی نیت سے ہو۔ اگر گناہ کرتے وقت کوئی آدمی اچھی نیت گھڑ لے تو اس سے وہ کام جائز نہیں ہو گا۔ وہ کام اب بھی گناہ رہے گا بلکہ شریعت جس کام کو گناہ کہدے اس کو ثواب سمجھنا یا اس میں اچھی نیت کرنا شریعت مقدسہ کی توہین اور اس کا مقابلہ ہے مثلاً ناچ گانا وغیرہ کرانا معصیت ہے۔ ایک آدمی کہتا ہے کہ میں ناچ اس لیے کراتا ہوں کہ اس بہانے لوگوں کو اکٹھا کر کے وعظ کہدوں نیت اگرچہ اچھی ہے لیکن اس نیت سے ناچ گانا جائز نہیں ہو جائے گا۔ غرضیکہ اچھی نیت سے معصیت جائز نہیں ہو سکتی اس میں نیت کی کوئی تاثیر نہیں۔ طاعات اور مباحات میں نیت کی تاثیر ہے۔

فائدہ ثانیہ : اس میں شک نہیں کہ شیطان ذاتِ انسانی کا عدوّ مُبین ہے اور اِخلاص

میں کھوٹ ملاتا رہتا ہے کما فی زمانِنا۔ بعض لوگ ان شوائب سے ڈر کر نیک کام کرنا ہی چھوڑ دیتے ہیں کہ جب ہم سے شوائب اور ریاء دور نہیں ہوتے اخلاص کامل نہیں آیا تو پھر نیکی کرنے کا کیا فائدہ؟ یہ بہت بڑی شیطانی چال ہے۔ امام غزالیؒ اور دوسرے مشائخین نے اس پر بہت تنبیہات فرمائی ہیں ریاء کے ڈر سے عمل کو چھوڑ دینا شیطان کو کامل درجہ کا خوش کرنا ہے جب انسان نیکی کرتا تھا بغیر اخلاص کامل کے شیطان کو ایک خوشی تھی یعنی ترک اخلاص کی خوشی جب اس نے کام ہی چھوڑ دیا تو اب شیطان کو دو خوشیاں نصیب ہوگئیں۔ ایک ترک عمل کی اور ایک ترک اخلاص کی تو دشمن کو زیادہ خوش کرنا احمقانہ حرکت ہے (کما فی مسئلۃ الصدام والکویت)

متعلّق باء کی بحث اور ایک اختلافی مسئلہ

بِالنِّیَّاتِ میں باء جارہ ہے اور النِّیَّاتِ مجرور یہ ظرف مستقر ہے محل خبر میں ظرف مستقر کا متعلق فعل محذوف ہوتا ہے اور وہ فعل محذوف کبھی عام ہوتا ہے اور کبھی فعل خاص۔ قاعدہ اس کا یہ ہے کہ اگر کسی قرینہ سے کسی فعل خاص کی تعیین ہو جائے تو وہ فعل خاص مقدر نکالنا چاہیے ورنہ فعل عام نکالنا چاہیے۔ مشہور افعال عامّہ چار ہیں۔ اوّل کون، دوم ثبوت، سوم وجود، چہارم حصول۔ یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ بِالنِّیَّاتِ کا متعلق کونسا فعل ہے۔ فعل عام تو اس کا متعلق اس لیے نہیں ہوسکتا کہ افعال عامّہ میں سے کسی فعل کو مقدر ماننے سے بظاہر یہ مطلب بنے گا کہ اعمال کا وجود حسّی بغیر نیت کے نہیں ہوتا اور یہ بات نہیں کیونکہ اعمال کا وجود حسّی تو بغیر نیت کے بھی ہو سکتا ہے لہذا یہاں کوئی فعل خاص مقدر نکالنا پڑے گا۔ اب کونسا فعل خاص نکالنا چاہیے اس میں دو مسلک ہیں اوّل شوافع حضرات نے اس کا متعلق صحت نکالا ہے یعنی اِنَّمَا الْاَعْمَالُ تَصِحُّ بِالنِّیَّاتِ یعنی نیت کے بغیر کوئی عمل صحیح نہیں ہوگا ہر عمل کی صحت نیت پر موقوف ہے دوم احناف حضرات کے نزدیک بِالنِّیَّاتِ کا متعلق صحت نہ نکالا جائے بلکہ اس کا متعلق ثواب نکالا جائے تو حدیث کا معنیٰ یہ ہوگا "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ یُثَابُ عَلَیْهَا بِالنِّیَّاتِ" یعنی عمل کا ثواب نیت ہی سے ملتا ہے باقی صحیح ہونا یا نہ ہونا دوسرے دلائل سے معلوم ہوگا اس

صورت میں کسی تخصیص کی ضرورت نہیں سب کا اتفاق ہے کہ تمام اعمال کا ثواب نیت پر موقوف ہے، وضو کا ثواب بھی بغیر نیت کے نہیں ملتا۔

ایک اختلافی مسئلہ

بِالنِّیَّاتِ کا متعلق صحت نکال کر شوافع حضرات نے ایک اختلافی مسئلہ پر اس حدیث کو حنفیہ حضرات کے خلاف پیش کیا ہے۔ اختلافی مسئلہ یہ ہے کہ وُضو بغیر نیّت کے صحیح ہے یا نہیں؟ حنفیہ کے نزدیک وضو بغیر نیّت کے ہوجاتا ہے اس سے نماز پڑھ سکتے ہیں اگرچہ اس پر ثواب نہ ملے شافعیہ کے نزدیک بغیر نیّت کے وضو صحیح نہیں ہوتا۔

شافعیہ کا الزام

حدیث کا تقاضا یہ ہے کہ ہر عمل کی صحت کے لیے بھی نیّت شرط ہونی چاہیئے اور حنفیہ وضو میں نیّت کو شرط قرار نہیں دیتے۔ لہذا یہ حدیث حنفیہ کے خلاف ہے۔

الزامی جواب

شافعیہ نے کہا ہے کہ اعمال میں سارے عمل داخل ہیں۔ سارے عملوں کا حکم یہ ہے کہ وہ نیت کے بغیر صحیح نہیں، اگر حدیث کا یہی مطلب مراد لیا جائے جو آپ نے لیا ہے کہ سارے عملوں کے صحیح ہونے کے لیے نیّت شرط ہے تو پھر یہ حدیث ہمارے خلاف ہی نہیں ہوگی اعمال کے بہت سے اقسام میں آپ کے بھی خلاف ہوگی کیونکہ اعمال کی بہت سی ایسی قسمیں ہیں جن کے صحیح ہونے کے لیے نیّت کو شرط نہیں قرار دیتے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ امور دینیہ پانچ قسم ہیں۔ ۱) اعتقادات۔ ۲) عبادات۔ ۳) اخلاق و آداب۔ ۴) مُعاملات ۵) عقوبات۔ مُعاملات کی اہم قسمیں پانچ ہیں۔ ۱) مُعاوضات مالیہ۔ ۲) مُناکحات۔ ۳) امانات ۴) خصومات۔ ۵) ترکات۔ ایسے ہی عقوبات شرعیہ یعنی اسلامی سزائیں پانچ ہیں۔ ۱) حد ارتداد ۲) قصاص۔ ۳) حد سرقہ۔ ۴) حد زنا۔ ۵) حد قذف۔

اعمال کی یہ دس قسمیں ایسی ہیں جن کی صحت کے لیے آپ کے نزدیک بھی نیّت شرط نہیں تو اگر وضو کے مسئلہ میں آپ اس کو ہمارے خلاف پیش کرتے ہیں تو یہ مطلب لینے کی صورت میں یہ حدیث آپ کے بھی خلاف ہوگی۔ ماھو جوابکم فھو جوابنا!

تقدیرِ ثواب کے فائدے ــــ (اِنصاف) ــــ تقدیرِ صحّت کے نقصان

۱۔ اگر ثواب کا لفظ مقدر نکالیں تو اس حدیث سے جو مسئلہ نکلتا ہے وہ اجماعی مسئلہ ہوگا کہ عمل کا ثواب نیت کے بغیر نہیں ملتا۔

۲۔ اگر ثواب کا لفظ مقدر نکالیں تو کسی کے ہاں بھی تخصیص کی ضرورت نہیں الاعمال اپنے عموم پر رہے گا

۱: اگر صحت کا لفظ نکالیں تو یہ حدیث خود صحت نکالنے والوں کے بھی خلاف ہوگی اس لیے کہ بہت سے اعمال شافعیہ کے نزدیک بھی ایسے ہیں جو بغیر نیّت کے صحیح ہیں گو اس پر ثواب نہ ملے مثلاً معاملات کے اقسام خمسہ عقوبات خمسہ یا مثلاً کسی کے پاس کسی کی ودلیعت تھی اس نے واپس لوٹا دی۔ لیکن نیت نہیں کی شافعیہ بھی مانتے ہیں کہ رد ودلیعت صحیح ہوگیا راستہ میں تکلیف کی چیز پڑی تھی کسی نے ہٹا دی لیکن نیت کچھ بھی نہیں تھی تو کیا یہ اِمَاتَۃُ الْاَذٰی عَنِ الطَّرِیْقِ صحیح نہیں ہوا۔ وغیرُ ذالک من المسائل۔

۲: اگر صحت کا لفظ مقدر نکالیں تو خود شافعیہ بھی الاعمال کو اپنے عموم پر نہیں رکھ سکتے ان کو تخصیص کرنی پڑیگی کما مرّ۔

یقول ابوالاسعاد: فیض الباری شرح صحیح البخاری میں حضرت انور شاہ صاحبؒ نے ایک لطیف اور ضروری تنبیہ فرمائی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ وضوء وغیرہ کے بارے میں جو مسئلہ اس حدیث کے تحت چھیڑا گیا ہے کہ آیا وضو میں نیّت نہ کریں تو صحیح ہے یا نہیں اس کا چھیڑنا بالکل بے محل اور بے موقعہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ واقعی یہ مسئلہ فقہ میں اختلافی تو ہے لیکن اس حدیث سے اس کا کوئی جوڑ نہیں اس لیے کہ اس حدیث میں یہ بات بتانا مقصود نہیں کہ اگر کسی عمل میں نیّت

نہ کریں تو کیا حکم ہے اس حدیث میں صرف یہ بتانا ہے کہ اچھی نیت کی تو کیا پھل ملے گا اور بری نیت کی تو کیا ہوگا۔ اچھی اور بری نیت کا فرق بتانا مقصود ہے حاصل یہ کہ اس حدیث میں نیت صحیح کا فائدہ اور نیتِ فاسدہ کا نقصان اور نیات کا اعمال کے ساتھ ربط بیان کرنا مقصود ہے۔ عدمِ نیت کی صورت میں عمل کا صحیح ہونا یا نہ ہونا اس حدیث کا موضوع نہیں ہے۔ اس حدیث میں صرف اعمال منویہ سے بحث ہے اعمال غیر منویہ سے تعرض نہیں۔

وسائل (یعنی وسیلہ) اور مقاصد (یعنی اصول) کا فرق

اعمال میں اگر نیت نہ کریں تو احناف کے نزدیک صحیح ہو جاتے ہیں یا نہیں؟ اس کی وضاحت یہ ہے کہ مقاصد کے صحیح ہونے کے لیے نیت شرط ہے جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ۔ وسائل کے صحیح ہونے کے لیے نیت شرط نہیں جیسے وضو بغیر نیت کے صحیح ہو جاتا ہے۔

سوال وسائل اور مقاصد کے مذکورہ فرق پر اشکال ہے کہ تیمم بھی وسائل میں سے ہے اس کے صحیح ہونے کے لیے حنفیہ کے نزدیک بھی نیت شرط ہے۔ مذکورہ اصول کے مطابق اس میں بھی نیت شرط نہیں ہونی چاہیے۔

جوابِ اوّل تیمم کے لغوی معنیٰ قصد کرنے کے ہیں۔ تیمم کی نیت حقیقت لغویہ میں داخل ہے۔ عام طور پر حقائق شرعیہ میں حقیقت لغویہ کا لحاظ ہوتا ہے اس لیے تیمم میں نیت کا اعتبار کیا گیا ہے۔

جوابِ دوم وضوء اور تیمم کے آلہ میں فرق ہے وضوء پانی سے ہوتا ہے جو طہور لطبعہ ہے لیکن تیمم کا آلہ یعنی مٹی اپنی ذات اور طبیعت کے اعتبار سے ملوث ہے۔ شریعت نے خاص حالت میں اس کو طہور بنا دیا ہے۔ حاصل یہ کہ مٹی طہور لطبعہ نہیں بلکہ طہور بالجعل ہے۔ پانی اور مٹی میں فرق ظاہر کرنے کے لیے اور مٹی کی طہوریت میں جعل کا معنیٰ متحقق کرنے کے لیے نیت کو شرط قرار دیا گیا ہے۔ (کما فی فیض الباری)

حدیث نِیَّۃُ الْمُؤْمِنِ خَیْرٌ مِّنْ عَمَلِہٖ کی بحث

اخلاص و عمل مثوب کی مناسبت سے محدثینؒ و شارحینؒ حضرات نے اس پر نِیَّۃُ الْمُؤْمِنِ خَیْرٌ مِّنْ عَمَلِہٖ پر بحث کی ہے۔ امام غزالیؒ نے احیاء علوم الدین میں مستقل موضوع بنا کر اس حدیث پر گفتگو کی ہے۔

حیثیتِ حدیث

اشعۃ اللمعات صـ۲۶ ج ا میں لکھا ہے کہ یہ حدیث اگرچہ ضعیف ہے لیکن موضوع نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ فضائل میں پیش کرنے کے قابل ہے:۔

> در اخبار وارد شدہ کہ نِیَّۃُ الْمُؤْمِنِ خَیْرٌ مِّنْ عَمَلِہٖ و ایں حدیث اگرچہ باصطلاح محدثین موصوف بصحت نیست اما موسوم بوضع نیز نشدہ۔

امام زین الدین عراقیؒ نے احیاء العلوم کی احادیث کی تخریج کی ہے وہ فرماتے ہیں:۔

> رواہ الطبرانی مِنْ حَدِیْث سَهْلِ بن سَعدٍ و من حَدِیْث نواس بن سَمْعَان کلاهُماضَعِیْفٌ

سیّد زُبیدی نے اس حدیث کی تخریج میں مزید حوالے دیے ہیں مثلاً مسند الفردوس للدیلمی میں اس حدیث کو حضرت ابوموسیٰ الاشعریؓ سے نقل کیا ہے۔ امام عسکریؒ نے اپنی کتاب "الامثال" میں اسے پیش کیا ہے۔ ایسے ہی حافظ ابن عساکرؒ نے الامالی میں اسے پیش کیا ہے۔ ان حوالوں کا مقصد یہ ہے کہ اس حدیث کی اکثر سندیں ضعیف ہیں لیکن جب حدیث کی سندیں متعدد ہوجاتی ہیں تو وہ حسن تک پہنچ جاتی ہیں۔ تعداد اسانید کی وجہ سے یہ حدیث مقبول ہے۔

مفہومِ حدیث : اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ مؤمن کا عمل بھی اس کے لیے برکت اور

نفع کا باعث ہے اس کی نیت بھی اس کے لیے نافع ہے لیکن مؤمن کی نیت نافعیت اور قبولیت کے اعتبار سے مؤمن کے عمل سے بڑھ کر ہے۔

وُجوہ خیریتِ نیّت

نیّت کو کس درجہ سے عمل سے خیر اور افضل قرار دیا گیا ہے اس موضوع پر مُحدّثین حضرات نے تفصیلی گفتگو کی ہے یہاں پر چند وُجوہِ خیریت نقل کی جاتی ہیں جو اشعۃ اللمعات ص۳۶ ج ۱ سے مقتبس ہیں۔

اوّل : نیّت اقتران عمل کے بغیر بھی عبادت ہے اور اس پر اجر وثواب مِل جاتا ہے بخلاف عمل جوارح کے کہ ان کا عبادت ہونا، اور ان پر اجر وثواب مرتّب ہونا نیت پر موقوف ہے۔

احادیث سے ثابت ہے کہ اگر کسی عمل حسنہ کی نیّت کی جائے اور کسی وجہ سے آدمی اس کو نہ کر سکا تو بھی حسنہ کاملہ اس کے اعمال نامہ میں لکھی جاتی ہے۔ نیز یہ بھی ثابت ہے کہ جس آدمی کی سوتے وقت نیت یہ تھی کہ تہجد کے لیے اٹھوں گا لیکن آنکھ نہ کھل سکی صبح ہوگئی تو اس کو تہجد کا ثواب مِل جاتا ہے۔

دوم ۔ خیریّت نیت بوجہ اشرفیّت محل ہے، نیّت کا محل قلب ہے اور عمل کا محل جوارح اور اعضاء ہیں۔ ظاہر ہے کہ قلب تمام اعضاء سے اشرف ہے اس لیے کہ یہ محل معرفت باری تعالیٰ ہے، اور معرفتِ حق تمام نعمتوں سے اہم اور اشرف اور عزیز ترین نعمت ہے۔ اس عزیز ترین نعمت کے رکھنے کے لیے عزیز ترین مکان کا انتخاب فرمایا۔ اگر قلب مؤمن سے کوئی اور محل و مکان اشرف ہوتا تو نعمت معرفت الٰہی کے لیے اس کا انتخاب ہوتا۔ جب قلب بندہ مؤمن اشرف اور افضل ہے اعضاء سے، تو نیت جو اس محل و معدن سے برآمد ہوئی۔ لقیناً اس عمل سے اشرف و افضل ہونی چاہیے جو جوارح پر ظاہر ہوتا ہے۔

سوم ۔ نیت پائیدار رہنے والی چیز ہے اور عمل ناپائیدار اور منقطع ہونے والی چیز ہے۔ اہلِ جنّت کا جنّت میں اور اہل کفر کا دوزخ میں دوام وخلود نیّت کی وجہ سے ہے۔ عمل تو بہرکیف منقطع ہو جاتا ہے لیکن نیت میں دوام و استمرار رہتا ہے۔ مرد صالح کی نیت یہ تھی کہ میں کبھی بھی ایمان وطاعت سے نہیں ہٹوں گا۔ ابدالآباد تک یہ میرا شعار لازم رہے گا اس کا انعام یہ ہے کہ اسے ہمیشہ جنت میں رکھا جائے گا۔ اگرچہ عمل طاعت میں دوام نہ ہو سکا۔ کافر کی نیت یہ تھی کہ

میں ہمیشہ اسی راہِ کفر پر رہوں گا جس کی سزا یہ ہے کہ خالد فی النّار ہوگا اس توجیہ سے ایک سوال کا جواب بھی مل جاتا ہے۔

سوال غیر مسلم یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام نے جزاو سزا کا جو ضابطہ بیان کیا ہے وہ انصاف کے منافی ہے کیونکہ کافر نے کفر کا جرم زمانہ محدود میں کیا ہے جب کہ اس کو غیر محدود زمانہ کے لیے دوزخ میں رکھنا ظلم اور بے انصافی ہے۔

جوابِ اوّل اوّلاً یہ سوال ہی غلط ہے اس لیے کہ ان کے اعتراض کی دارومدار یہ ضابطہ ہے کہ جرم اور سزائے جرم کا زمانہ مساوی ہونا ضروری ہے یہ ضابطہ باتفاق عقلائے اقوامِ زمانہ غلط ہے کیا کسی ملک وقوم کا یہ قانون ہے کہ چور اور رہزن نے جتنا وقت چوری اور رہزنی میں صرف کیا تھا۔ اس کو صرف اتنے ہی وقت کی قید بامشقت سزا ملنی چاہیئے۔ یقیناً کوئی عاقل اس کا قائل نہیں ہو سکتا لہذا جس اشکال کی اساس ایسے غلط اور خلافِ معقول نظریہ پر ہو وہ غلط اور خلافِ معقول ہوگا اور اس قابل نہ سمجھا جائے گا کہ جواب دینے کی زحمت کی جائے۔

جوابِ دوّم ثانیاً علی سبیل التنزل اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ جرم اور سزائے جرم میں مساوات زمانی ہونی چاہیے تب بھی یہ اشکال باطل ہے اس لیے کہ کافر کا کفر اگرچہ زمانہ محدود تک تھا لیکن اس کی نیت تو ہمیشہ کفر پر رہنے کی تھی نیت میں خلود اور دوام ہونے کی وجہ سے خلود فی النار کی سزا بالکل معقول امر ہے یہی معاملہ خلودِ اہلِ جنّت کا سمجھا جائے۔

ابیات

چوں نباشد پاک اعمال از ریاء	ہست بے حاصل چوں نقش بوریا
ہر کرا اندر عمل اخلاص نیست	در جہان از بندگانِ خاص نیست
ہر کہ را کار از برائے حق بود	کار او پیوستۂ بارونق بود
پاک گردانی عمل را از ریاء	شمع ایمان ترا باشد ضیاء

وباللہ التوفیق :

وَاِنَّمَا لِامْرِئٍ مَّا نَوٰی

مَا نَوٰی مُبتدا مؤخر ہے اور لِامْرِئٍ خبر مقدم ہے امرئٍ میں کئی لغات ہیں:۔

۱۔ راء کو ہمزہ کی اعرابی حرکت کے تابع رکھا جائے یعنی اگر ہمزہ پر رفع ہے تو راء پر بھی رفع پڑھا جائے قال اللہ تعالیٰ "اِنِ امْرُؤٌ هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ" پ۶ اگر ہمزہ پر نصب ہے تو راء پر بھی نصب پڑھی جائے۔ وقال اللہ تعالیٰ "وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا" (پ۵) اگر ہمزہ پر جر ہو تو راء پر بھی جر پڑھی جائے جیسے مَرَرْتُ بِامْرِئٍ" ایک ادبی لطیفہ بن جاتا ہے۔

۲۔ دوسری لغت یہ ہے کہ راء پر زبر ہی پڑھی جائے خواہ ہمزہ پر کوئی اعراب ہو۔

۳۔ تیسری لغت یہ ہے کہ راء پر پیش ہی پڑھا جائے یہ سب سے ردّی لغت ہے۔ قول اوّل راجح ہے۔

اس جملہ کا مطلب

مطلب اس جملہ کا یہ ہے کہ جزاء این نیت ہر آدمی کو وہی کچھ ملتا ہے جو وہ نیت کرے۔ مَا نَوٰی کے مَا میں عموم ہے جو تعداد نیات کی طرف اشارہ ہے کہ ایک عمل میں متعدد اچھی نیات کرلے تو ثواب ہی ثواب مل جائے گا۔ کما قدمناہ بالتفصیل مثلاً دخول فی المسجد ایک عمل ہے اس پر کئی اچھی نیتیں کر سکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ نماز باجماعت کی نیّت، اللہ کے گھر کی زیارت کی نیت، اور اعتکاف کی نیّت، ذکر اللہ کے لیے خلوت حاصل کرنے کی نیّت وغیرہ۔ غرضیکہ اس طرح کی کئی نیّات ایک ہی عمل میں کی گئیں تو حدیث کے اس جملہ سے سمجھ میں آیا کہ ہر نیّت کا اجر جدا ملے گا کیونکہ دین کا ضابطہ یہی ہے کہ اِنَّمَا لِامْرِئٍ مَّا نَوٰی!

جملتین میں ربط۔

حدیث میں پہلا جملہ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ ہے اور دوسرا جملہ وَاِنَّمَا لِامْرِئٍ

متّا نوی ان دونوں جملوں میں ربط کیا ہے؟ کیونکہ دونوں کا معنیٰ ومفہوم ایک ہے اور یہ تکرار ہے جو فصاحت وبلاغت کے خلاف ہے تو شارحین حضرات نے اس کے مختلف ربط بیان کیے ہیں۔

اوّل : عند البعض دوسرا حصّہ پہلے کی تاکید ہے۔ تاکید کا معنیٰ "ایک ہی بات کو دوبارہ اس کو پختہ کرنے کی غرض سے کہنا" ان حضرات کے نزدیک جو بات پہلے جملہ میں تھی۔ دوسرے میں عنوان بدل کر اسی بات کا اعادہ کر دیا گیا ہے تاکہ بات دل میں جم جائے اور تاکید پر محمول کرنا بھی فصاحت وبلاغت کے خلاف نہیں کیونکہ یہ بات مسلّم ہے کہ اذا تکرّر تقرّر فی القلب۔

دوم : اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ التأسیس اَولیٰ من التاکید کے پیشِ نظر تأسیس ماننا زیادہ بہتر ہے کہ اس سے ایک نیا فائدہ بیان کرنا مقصود ہے۔ جب ہم دوسرے جملہ کو تاکید کے بجائے تأسیس پر محمول کریں گے تو یہ بتانا پڑے گا کہ دوسرے جملہ میں وہ کونسی نئی بات نیا فائدہ ہے جو پہلے میں نہیں تو اس نئے فائدہ کی تعیین میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔

۱۔ علامہ ابوالحسن سندھی مدنی حنفیؒ فرماتے ہیں کہ پہلا جملہ عرفیہ تجربیہ ہے، دوسرا جملہ تشریعیہ ہے مطلب یہ ہے کہ پہلے جملہ میں عرف عام والوں کی ایک تجرباتی بات بتائی گئی ہے۔ اور دوسرے جملہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی شریعت کا ضابطہ بیان کیا ہے جس میں اس عرفی اور تجرباتی بات کی تائید ہے۔ مثلاً حدیث پاک میں ہے لکلِّ شیئٍ زینۃٌ (یہ عرفی بات ہے) وزینۃ القرآن اٰخر سورۃ البقرۃ " یہ ضابطہ شریعت ہے" لکلّ امۃٍ امینٌ وامین ھٰذہ الامّۃ ابوعبیدۃ بن الجراح "۔

۲۔ پہلے جملہ میں صرف اتنا بتایا ہے کہ عمل کے مقبول بننے کے لیے نیّت کا اچھا ہونا ضروری ہے، اور دوسرے جملہ میں یہ بتا دیا کہ اگر کوئی شخص ایک ہی عمل میں کئی نیّات کرلے گا تو کئی عملوں کا ثواب مل جائے گا۔ مثلاً ایک آدمی غریب بھی تھا اور رشتہ دار بھی اس کی مالی امداد کر دی تو مالی امداد کرنے میں دو نیتیں تھیں ایک یہ کہ غریب ہونے کی وجہ سے مدد کرتا ہوں اس پر صدقہ کا ثواب ملے گا۔ دوسری یہ کہ رشتہ دار ہونے کی وجہ سے اس کی مدد کرتا ہوں تو اس پر صلہ رحمی کا ثواب ملے گا۔

سوم : پہلے جملہ میں صرف اتنا بتایا گیا ہے کہ اعمال کے معتبر ہونے کے لیے نیت ضروری ہے یہ مسئلہ اس جملہ میں نہیں ہے کہ آیا نیت کرنے میں ایک آدمی دوسرے کا نائب ہوسکتا ہے یا نہیں؟ دوسرے جملہ میں یہ مسئلہ بتا دیا کہ استنابت فی النیۃ جائز نہیں ہر آدمی کو اپنی ہی نیت کرنی پڑتی ہے۔ مثلاً نماز میں اگر زید کی جگہ عمرو نیت کرلے تو کافی نہیں ہے۔

سوال اس جملہ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص جو نیت کرے گا وہی مرتب ہوگا حالانکہ فقہاء حضرات کے نزدیک اگر کوئی آدمی رمضان میں نفل روزہ کی نیت کرے گا تو نفل واقع نہیں ہوگی بلکہ فرض واقع ہوگا تو یہاں پر مانوی مرتب نہ ہوا؟

جواب اوّل : چونکہ رمضان نفل کا محل نہیں ہے لہذا اس کی نیت لغو ہوجائیگی۔

جواب دوم : یہ ہے کہ فرض کے اندر نفل خود داخل ہے کیونکہ فرض عبادات نافلہ مع شیٔ زائد ہے تو اس صورت میں مانوی مرتب ہوا لیکن مع شیٔ زائد۔

فائدہ آخرت میں اعمال پر جو جزا یا سزا ملے گی وہ عین عمل ہے یا اس عمل کا غیر ہے اس میں علماء کی دو آراء ہیں:

اوّل یہ ہے کہ آخرت میں جو جزا ملے گی وہ عین اعمال ہے۔ اچھے اعمال جنّت کی نعمتوں کی شکل میں ظاہر ہونگے، بُرے اعمال دوزخ کی سزاؤں کی شکل میں ان کے نزدیک جزا عین عمل ہے۔ **دوم** : دوسرے حضرات کے نزدیک آخرت میں جزا سزا عین اعمال نہیں بلکہ ان کا غیر ہیں جو بطور جزا یا سزا اس کو دیے جارہے ہیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے پہلی رائے کو پسند فرمایا ہے۔ اس لیے کہ جملہ میں مضاف مقدر کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ اپنے ظاہر پر رہے گا جبکہ دوسری رائے کے مطابق مضاف مقدر کرنا پڑے گا "وانما لامرئٍ جزاء مانوی" یعنی ہر آدمی کو اسی چیز کی جزا ملے گی جس نے اس کی نیّت کی تھی۔

فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى اللهِ وَرَسُوْلِهٖ فَهِجْرَتُهُ إِلَى اللهِ وَرَسُوْلِهٖ

فَمَنْ كَانَتْ میں فاءِ تفصیلیہ ہے اس جملہ میں پہلے قاعدہ کی مثال بیان فرما رہے ہیں پہلے جملہ میں تین چیزیں تھیں ۔ عملؔ ۔ نیتؔ ۔ ثمرہؔ ۔ تو فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ سے عمل کی طرف اشارہ ہے اور اِلَى اللهِ سے نیت کی طرف اشارہ ہے اور فَهِجْرَتُهُ سے ثمرہ و نتیجہ کی طرف اشارہ ہے ۔

ہجرت کا معنیٰ اور اس کی اقسام

لُغت کے اندر ہجرت کا معنیٰ ہے ترک کرنا اور انتقال من مکانٍ الیٰ مکانٍ کا ہے ۔ اصطلاحِ شریعت میں ہجرت دو قسم ہے :-

① **ہجرت ظاہرہ** : کہ انسان ظاہری طور پر مع اہل و عیال ہجرت کرے ۔ پھر ہجرت ظاہرہ کی دو قسمیں ہیں ۔ اوّل اِنْتِقَالُ مِنْ دَارِ الْكُفْرِ اِلٰى دَارِ السَّلَامِ جیسے فتح مکہ سے قبل ہجرت من مکۃ الی المدینۃ دُوم اَلْاِنْتِقَالُ مِنْ دَارِ الْفَسَادِ اِلٰى دَارِ الْاَمْنِ جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے بعض صحابہ کرامؓ نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی ہے اس لیے کہ مکہ اس وقت دار الفساد تھا گو حبشہ دار الاسلام نہ تھا لیکن صحابہ کرام کے لیے دار الامن ثابت ہوا ۔ یہ دونوں ہجرتیں منسوخ ہوگئیں جیسا کہ حدیث پاک میں ہے :

لا هجرة بعد الفتح ۔

② **ہجرت باطنہ** : ہجرت کا دوسرا قسم ہجرت باطنہ ہے وہ یہ کہ معاصی کو ترک کرکے اطاعت کی طرف آنا ۔ كَمَا قَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ اَلْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ ۔ رواه البخاری مشکوٰۃ ص۱۲ یہی ہجرت حقیقیہ ہے کیونکہ دار الکفر و الفساد میں آزادی سے اطاعت الٰہیہ نہیں ہو سکتی چنانچہ حدیث پاک کے آخری جملہ اَلْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ میں اسی ہجرت باطنہ کا ذکر ہے یعنی مہاجر حقیقی وہ ہے جو ان کاموں کو چھوڑ دے جن سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے ۔

سوال فَمَنْ کَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلَی اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ شرط ہے اور فَهِجْرَتُهٗ اِلَی اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ جزا ہے۔ بظاہر اس کا معنیٰ یہ بنتا ہے کہ جس کی ہجرت اللہ و رسول ﷺ کی طرف ہوگی تو اس کی ہجرت اللہ اور رسول کی طرف ہوگی وہی شرط ہے وہی جزا ہے قاعدہ کی رو سے دونوں میں تغایر ہونا چاہیے تھا۔ مثلاً یوں ہوتا کہ جو اللہ و رسول کی طرف ہجرت کرے تو اس کا حکم یہ ہے یا اسے یہ ملے گا وغیرہ وغیرہ۔ محدثین حضرات نے اس کے مختلف جواب دیے ہیں:۔

جواب اوّل یہ ہے کہ گو لفظاً تغایر نہیں مگر غرضاً تغایر ہے اور تقدیر عبارت یہ ہے:۔ فَمَنْ کَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلَی اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ قَصْدًا وَنِيَّةً فَهِجْرَتُهٗ اِلَی اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثَمْرَةً وَنَتِيْجَةً حاصل یہ کہ قصد و نیت اگر درست ہے تو آخرت میں بھی ثمرہ اور عہدہ ملے گا اور اگر نیت فاسد ہے تو ثمرہ بھی ضرور فاسد ہوگا۔

جواب دوم شرط کی جانب فِی الدُّنْيَا مقدر ہے ایسے ہی جزاء والی جانب فِی الْاٰخِرَةِ کا لفظ محذوف ہے تقدیر عبارت یوں بنے گی فَمَنْ کَانَتْ هِجْرَتُهٗ فِی الدُّنْيَا اِلَی اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَهِجْرَتُهٗ فِی الْاٰخِرَةِ اِلَی اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ تو دنیا اور آخرت میں تغایر صاف ظاہر ہے۔

جواب سوم دل لگی بات وہ ہے جو حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے فرمائی ہے کہ اس قسم کے جملے مبالغہ کے لیے کہے جاتے ہیں" کما فی قولہ تعالیٰ " وَاَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ مَا اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ اور اصحاب دائیں ہاتھ والے ان کے کیا کہنے وہ تو اصحاب دائیں ہاتھ والے ہیں۔ وَکَمَا قَالَ الشَّاعِرُ ع

اَنَا اَبُو النَّجْمِ وَشِعْرِیْ شِعْرِیْ — میں ابوالنجم ہوں میرے اشعار تو میرے اشعار ہی ہیں۔

یعنی ان کے مقابلہ میں دوسروں کے اشعار بیکار ہیں یہاں بھی یہی مفہوم ہے کہ جس شخص کی ہجرت اللہ کیلئے ہوگی اس کے کیا کہنے وہ تو اللہ ہی کے لیے ہے پھر کیوں نہ مقبول ہو وہ تو مقبول ہی ہے۔

سوال اس ضابطہ کی وضاحت کے لیے اور اعمال مثلاً نماز روزہ وغیرہ پیش کیے جا سکتے تھے سب کو چھوڑ کر ہجرت کو ہی کیوں مثال کے طور پیش کیا گیا ہے۔

جواب اوّل : یہ کہ ہجرت بہت اہم اور سب اعمال سے زیادہ شاق اور مشکل ہے جہاد میں

گو جان تک دینی پڑتی ہے لیکن چند منٹ میں بات ایک طرف لگ جاتی ہے لیکن ہجرت میں اپنی جائیداد، مکانات و اموال کے چھوڑنے کا غم، پھر ڈر کر اور بچ کر نکلنا پھر مستقبل کی تشویشات سامنے ہیں تو ہجرت اپنے اندر غموم و ہموم کی ایک طویل فہرست رکھتی ہے اس لیے تمثیل کے لیے اس کو خاص کیا جب اتنا بڑا عمل فساد نیت سے بے کار ہو جاتا ہے تو دوسرے عمل فساد نیت سے بدرجہ اولی بگڑیں گے۔

جواب دوم : خصوصیت شانِ ورود کی وجہ سے ہجرت کی تخصیص کی گئی ہے اس سے مہاجر امِ قیس کی اصلاح مقصود ہے۔

وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى دُنْيَا يُصِيبُهَا أَوْ امْرَأَةٍ يَتَزَوَّجُهَا

قَوْلُهُ دُنْيَا بروزن فُعْلَى مِنَ الدُّنُوِّ سُمِّيَتْ لِدُنُوِّهَا إِلَى الزَّوَالِ فَهِيَ اِسْمٌ لِهٰذَا الْعَالَمِ الْمُتَنَاهِي آخرت سے پہلے کل کائنات کا نام دنیا ہے چونکہ یہ کائنات بہ نسبت آخرت کے ہمارے قریب ہے اس لیے اس کو دنیا کہتے ہیں۔

مفہومِ حدیث : حدیث پاک کے اس جملہ میں یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر کوئی عمل اللہ کی رضا کے لیے نہ کیا جائے بلکہ دنیا کے لیے کیا جائے تو اس پر ثواب نہیں ملے گا۔

سوال : دنیا میں عورت بھی داخل ہے پھر اس کو خصوصیت کے ساتھ الگ ذکر کرنے میں کیا نکتہ ہے؟

جواب اول : چونکہ حدیث پاک کا شانِ ورود ہی ہجرت للمرأۃ کا واقعہ ہے اس لیے خاص طور پر عورت کو ذکر کر دیا گیا۔

جواب دوم : دنیا کے فتنوں میں فتنہ زن سب سے زیادہ اہم اور خطرناک ہے اس لیے مستقلاً علیحدہ ذکر کیا" ولذا قَدَّمَهُنَّ اللّٰهُ تَعَالٰى فِي الذِّكْرِ فِي كِتَابِهِ الْعَزِيْزِ" — زُيِّنَ

لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ (پ۳) حدیث پاک میں ہے " مَا تَرَكْتُ بَعْدِیْ فِتْنَةً اَضَرَّعَلَى الرِّجَالِ مِنَ النِّسَآءِ (مشکوٰۃ شریف ص۲۶۷ ج۲) البتہ نیک عورت اس سے مستثنیٰ ہے جیساکہ دوسری حدیث میں ہے " اَلدُّنْيَا كُلُّهَا مَتَاعٌ وَخَيْرُ مَتَاعِ الدُّنْيَا اَلْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ (مشکوٰۃ شریف ص۲۶۷ ج۲)

جواب سوم ۔ یقول شیخ جاجروی رحمہ القوی ـــــ جب فقرائے مہاجرین ہجرت کرکے مدینہ منوّرہ پہنچ رہے تھے تو انصار مدینہ از راہِ نصرت مہاجرین کو اپنے گھروں اور باغوں، زمینوں میں برابر کا حصّہ دار بنالیا حتٰی کہ اگر کسی انصار کی دو بیویاں تھیں تو ایک کو طلاق دے کر عدّت کے بعد مہاجر بھائی کو دے دیتا تو حضور صلّی اللہ علیہ وسلم نے فقرائے مہاجرین کو خاص طور پر تنبیہ فرمائی کہ دیکھو ہجرت میں خالص اللہ و رسول کی نیّت ہو۔ دنیا یا عورت کے لیے ہجرت کی تو پھر دنیا ہی رہ جائیگی آخرت نہیں ملے گی۔

سوال یہ ہے کہ یہی واقعہ حضرت ابوطلحہ رضؓ کے ساتھ پیش آیا اور انہوں نے بی بی ام سلیم کے ساتھ نکاح کی خاطر اسلام قبول کیا۔ اوّلاً صحابی رسول ہو کر مدارِ اسلام نکاح کو بنا رہے ہیں۔ ثانیاً اللہ کے رسولؐ نے انہیں کچھ نہیں کہا:۔

وَعَنْ اَنَسٍؓ قَالَ تَزَوَّجَ اَبُوطَلْحَةَؓ اُمَّ سُلَيْمٍ فَكَانَ صِدَاقُ مَا بَيْنَهُمَا الْاِسْلَامَ اَسْلَمَتْ اُمُّ سُلَيْمٍ قَبْلَ اَبِي طَلْحَةَؓ فَخَطَبَهَا فَقَالَتْ اِنِّي قَدْ اَسْلَمْتُ فَاِنْ اَسْلَمْتَ نَكَحْتُكَ فَاَسْلَمَ فَاَسْلَمَ (مشکوٰۃ شریف ص۲۷۷ ج۲ باب الصداق)

ترجمہ : حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ابوطلحہؓ نے جب امّ سلیم سے نکاح کیا تو قبولیّتِ اسلام آپس میں مہر قرار پایا۔ امّ سلیمؓ نے ابوطلحہؓ سے پہلے اسلام قبول کر لیا تھا اور پھر جب ابوطلحہؓ نے امّ سلیم کے پاس نکاح کا پیغام بھیجا تو امّ سلیم نے کہا کہ میں نے اسلام قبول کر لیا ہے اگر تم بھی مسلمان ہوجاؤ تو میں تم سے نکاح کرونگی (اور تم سے مہر نہیں لونگی) چنانچہ ابوطلحہؓ نے اسلام قبول کر لیا اور اسلام ہی آپس میں مہر قرار پایا۔

جواب : حضرت ابوطلحہؓ نے جو نکاح کے لیے اسلام قبول کر لیا وہ اس میں نہیں آسکتا کیونکہ ان کے پاس پہلے ہی سے داعیۂ اسلام موجود تھا نکاح صرف ظاہراً ایک وسیلہ تھا۔

فَهِجْرَتُهٗ اِلٰی مَاهَاجَرَاِلَیْهِ

سوال پہلے جملہ کی طرح یہاں بھی جزاءِ شرط والے جملہ کا اعادہ کیوں نہیں کیا گیا یعنی فهجرته الی الله ورسوله کی طرح یہاں بھی کہنا چاہیے تھا فهجرته الی دنیا یصیبها او امرأۃ یتزوجها اس کے بجائے اجمالاً فهجرته الی ما هاجر الیه کہ دیا گیا۔

جواب اوّل یہ کہ دنیا اور عورت اس قابل نہیں کہ بلاضرورت ان کا نام لیا جائے بخلاف اللہ اور رسولؐ سے کہ ان کا نام محبوب اور لذیذ ہے اس لیے استلذاذ کے لیے اس کا تکرار کیا گیا ہے اور دنیا و عورت کا تکرار نہیں کیا گیا تاکہ ان کی حقارت اور مذمت ظاہر ہو۔

خلاصہ یہ کہ یہ بتانا مقصود ہے کہ محبوب و مستحسن چیز کا تکرار مستحسن ہے اور قبیح چیز کا تکرار بغیر ضرورت کے قبیح و مذموم ہے۔

جواب دوم اللہ اور رسولؐ میں مقصد ایک ہی ہو سکتا ہے وہ ہے رضائے الٰہی بخلاف دنیا کے کہ اس کے انواع مختلف ہیں۔ زن، زر، زمین تو ایسا لفظ لائے کہ جو سب انواع کو شامل ہو جائے۔

اسمائے رجال

حالات سیدنا عمرؓ : آپ کا نام شریف عمر کنیت ابو حفص لقب فاروقِ اعظم خطاب امیرالمومنین والد کا نام خطاب : آپ قریشی عدوی ہیں نسب میں کعب ابن لوئی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتے ہیں ۔ آپ کے فضائل بے حد بے شمار ہیں، جلیل القدر صحابی قدیم الاسلام مؤمن ہیں آپ کے ایمان لانے سے مسلمانوں کا چالیس کا عدد پورا ہوا ۔ آپ کے ایمان لانے پر فرشتوں میں مبارک باد کی دھوم مچی اور یہ آیت اتری " یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے بعد ۱۳ھ میں آپ کی بیعت کی گئی آپ کے زمانہ میں اسلام بہت پھیلا اور بہت ممالک فتح ہوئے ۔ تیرہ اسلامی شہروں کی بنیاد اور آبادی آپ کے زمانہ خلافت میں ہوئی جن میں کوفہ اور بصرہ بھی شامل ہیں ۔ آپ کی مُہر پر یہ جملہ نقش تھا (کفیٰ بالموت واعظا یا عمر) قرآن کریم کی بہت سی آیات آپ کی رائے کے مطابق اتریں ۔ دس سال چھ ماہ خلافت کی اور تریسٹھ سال عمر شریف ہوئی ۲۶ ذوالحجہ ۲۳ھ بدھ کے دن مسجد نبوی محراب النبی میں مصلائے مصطفیٰ پر نماز فجر پڑھاتے ہوئے شہید کیے گئے ۔ حضرت مغیرہؓ ابن شعبہ کے یہودی غلام

کِتَابُ الْاِیْمَانِ

سوال ـــ علامہ خطیب اور علامہ بغویؒ نے کتابُ الایمان کو مُقدّم فرمایا اس میں کیا حکمت و فوائد مُضمر ہیں اس کے مُتعدّد جوابات دیے گئے ہیں :۔

جواب اوّل ـــ دین کی دو جُز ہیں ہیں ۱ عقائد ۲ اعمال ۔ عقائد اعمال پر مُقدم ہیں اس لیے کتابُ الایمان کو ذکر کر کے عقائد کی بحث کو مُقدّم کیا ۔

جواب دوم ـــ اِنسان کی وجود والی نعمت کے بعد پہلا درجہ ایمان کا ہے کیونکہ اگر ایمان نہیں تو آدمی بیکار ہے اسی لیے ایمان کو مُقدّم کیا ۔

جواب سوم ـــ مُکلّفین کے لیے ایمان اوّلُ الواجبات ہے سب سے پہلے اِسی کا مطالبہ ہے اس لیے وضع و تصنیف میں یہ اوّلیّت کا حق دار ہے ۔

کِتاب کا لُغوی و اِصطلاحی معنیٰ

کتاب کا لغوی معنیٰ ہے جمع کرنا ۔ یہ مادہ جہاں بھی مستعمل ہوگا اس کے اندر جمع کا معنیٰ ضرور ملحوظ رکھا جائے گا ۔ مثلاً لکھنے کو کتابت کہتے ہیں لکھنے میں جمع النقوش کا مادہ پایا جاتا ہے ۔ لشکر کو عربی میں کتیبہ کہتے ہیں اس لیے اس میں بھی جمع الرّجال ہوتے ہیں ۔

اصطلاح میں کتاب کہتے ہیں مسائل کے ایسے مجموعہ کو جن کے مستقل ہونے کا اعتبار کیا جائے ۔

ابو لؤلؤ فیروز نے خنجر کا وار کیا آپ شہید ہو گئے اور آپ کی شہادت پر در و دیوار سے اسلام کے رونے کی آواز آتی تھی کہ آج سِلام و مسلمین یتیم ہو گئے ۔ حضرت صہیبؓ نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی اور گنبد خضریٰ میں پہلوئے مُصطفیٰ میں دفن ہوئے ۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ ۔!

استقلال سے مراد یہ ہے کہ وہ مجموعہ ماقبل ومابعد پر موقوف نہ ہو۔ اس سے ملتے جلتے دو لفظ اور ہیں جن کو باب اور فصل سے تعبیر کرتے ہیں۔

باب ان مسائل کے مجموعہ کا نام ہے جو نوع میں متحد ہوں اور اس کے نیچے مختلف اصناف ہوں مثلاً باب مواقیت الصلوٰۃ

فصل ان مسائل کے مجموعہ کا نام ہے جو صنف میں متحد ہوں اور اس کے نیچے افراد و جزئیات ہوں مثلاً فصلٌ فی تعجیل الصلوٰۃ : خلاصہ یہ کہ کتاب بمنزلہ جنس کے ہے اور باب بمنزلہ نوع کے ہے اور فصل بمنزلہ صنف کے ہے۔

ایمان کا لُغوی واِصطلاحی معنیٰ

ایمان کا لُغوی معنیٰ ایمان اَمَنْ سے ہے اَمَنْ خوف کی ضد ہے۔ قال اللہ تعالیٰ "وَاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ" اَمَنْ کو باب افعال میں لائے تو ایمان ہوا۔ یہ متعدی بلا واسطہ ہو تو اس کا معنیٰ ہے اَمن والا کر دینا۔ اٰمَنْتُ۔ اور اگر متعدی بالباء ہو تو تصدیق کے معنیٰ میں ہوتا ہے جب کسی کی تصدیق کر دی تو گویا اسے تکذیب سے مأمون اور بے خوف کر دیا۔ اور جب مُتعدّی بالام ہو تو اس کے معنیٰ اذعان وانقیاد کے ہوتے ہیں کما قال اللہ تعالیٰ "وَمَا اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ"۔!

ایمان کی اصطلاحی تعریف ایمان کی اصطلاحی اور شرعی تعریف مختلف الفاظ سے کی گئی مگر سب کا خلاصہ اور مرجع ایک ہے وہ یہ کہ "اَلْاِیْمَانُ هُوَ التَّصْدِیْقُ بِجَمِیْعِ مَا عُلِمَ مَجِیْئُہٗ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم ضَرُوْرَةً" یعنی تمامی ضروریاتِ دین کو سچّا جاننا اور ماننا اور ضروریاتِ دین وہ احکام ہیں جن کا ثبوت حضور علیہ السلام سے قطعاً اور بداہتہً ہو مثلاً پنجگانہ نماز اور حرمتِ خمر وغیرہ۔

سوال اگر ایمان تصدیق کا نام ہے تو کئی لوگ ایسے گذرے ہیں اور موجود ہیں جن کا دل گواہی دیتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سچے نبیؐ ہیں۔ یہود کے بارے میں خود قرآن کریم میں آتا ہے

یَعْرِفُوْنَہٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآئَهُمْ : مگر اس کے باوجود انہیں کافر ہی کہا جاتا ہے اس سے بڑھ کر کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے کھلے لفظوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ مثلاً ہرقل کے بارے میں حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری ص۳۷ ج ۱، اور صحیح بخاری شریف ص۴ ج ۱ میں ایک روایت نقل کی ہے جس میں آتا ہے "

انی لاعلم انہ نبی مرسل ولکنی اخاف الروم علی نفسی ولولا ذالك لاتبعتہ "	ترجمہ : یعنی مجھے یقین ہے کہ وہ نبی اور رسول ہیں اگر مجھے اپنی جان کا ڈر نہ ہوتا تو میں ضرور ان کی اتباع کرتا۔

اور مشکوٰۃ شریف ص۵۲۶ ج ۲ میں یہ الفاظ بھی ہیں" لوکنتُ عِندَہٗ لغسلت عَنْ قَدَمَیْہِ

اس سے بھی زیادہ ابوطالب کے وہ اشعار ہیں جن میں انہوں نے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوتے کہا ہے ؎

(۱) ودَعَوتَنِی وزَعَمتُ انك صَادقٌ — وصدقت فیہ وکنت ثَمَّ امینَا

آپ نے مجھے دعوت (اسلام) دی اور میں آپ کو سچا ہی سمجھتا ہوں۔ اور اس دعوت میں بھی آپ نے سچ کہا اور آپ پہلے ہی امانتدار ہیں

(۲) وَلقد عَلِمتُ بِانّ دینَ محمّدٍ — منْ اَدیان البَرِیَّةِ دِینَا

اور میں جانتا ہوں محمدؐ کا دین — دنیا کے تمام دینوں میں سے بہترین ہے۔

(۳) لَولاَ المَلاَمَة اوحَذارمُسبَّةٍ — لوجدتَنی سَمحًا بِذاك مُبِینًا

اگر لوگوں کی ملامت اور طعن و تشنیع کا خوف نہ ہوتا — تو آپ مجھ کو فراخ دل اور دل کھول کر قبول کرنے والا پاتے۔

اَشعار بالا میں انكَ صَادقٌ اور وَلقد علمتُ وغیرہ کے الفاظ واضح تصدیق ہیں مگر اس کے باوجود اہلُ السنۃ والجماعۃ کا یہی فیصلہ ہے کہ ابوطالب کا انتقال ملّتِ عبد المطلب پر ہوا ہے اور انہیں مؤمن شمار نہیں کیا گیا۔

جواب اوّل

علامہ تفتازانی فرماتے ہیں کہ ان لوگوں کا یہ علم معرفت اور تصدیق وغیرہ سب اضطراری تھا اور تصدیق اضطراری تصوّر ہی کی ایک قسم ہے جبکہ ایمان میں جو تصدیق مطلوب ہے وہ انہیں حاصل نہ تھی یعنی اختیاری نہ تھی تاکہ کرنے پر ثواب اور نہ کرنے پر عقاب ہو۔

جواب دوم اصل بات یہ ہے کہ کسی کا محض زبانی اعتراف کر لینا یا دلائل و شواہد کی کثرت سے غیر اختیاری طور پر دل میں اتر جانا یہ ایمان نہیں ۔ ایمان یہ ہے کہ اپنے ارادہ و اختیار سے اور دل سے نبی سمجھ کر زبان سے اقرار و اطاعت کا التزام کیا جائے اس کی تفصیل مولانا بدرِ عالم نے ترجمان السنۃ ص۲۷۰ ج ا میں لکھ دی ہے " ہرقل اور اس جیسے اور اہل کتاب نے تصدیق ضرور کی ہے اور اقرار بھی کیا ہے ۔لیکن کیا ایک لمحہ کے لیے بھی اپنا قدیم مذہب ترک کر کے دینِ محمدی میں قدم رکھا؟

ابوطالب نے جانثاری کا جو نقشہ پیش کیا ہے بلاشبہ وہ رہتی دنیا تک تاریخ کے صفحات میں زینت رہے گا۔ مگر کیا ایک مرتبہ بھی اس کلمہ کے لیے ان کی زبان متحرک ہوئی جس کے لیے دیر سے رسولِ خدا امر فرما رہے تھے ۔خلاصہ یہ کہ ایمان صرف تصدیق نہیں بلکہ انقیادِ قلبی اور التزامِ طاعت بھی اس کا جزو اہم ہے ۔

یقول ابوالاسعاد : ایمان کا اطلاق احادیث میں چار معانی پر ہوتا ہے جن کے جان لینے سے متعارض احادیث میں تطبیق دینے اور علماء کے اقوال مختلفہ کو جمع کرنے میں سہولت ہوگی ۔

اوّل انقیاد ظاہری کہ صرف زبان سے کلمہ پڑھ لیا خواہ دل میں یقین ہو یا نہ ہو اس کو اس حدیث میں بیان کیا گیا مَنْ قَالَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ عَصَمَ مِنِّیْ دَمَهٗ وَمَالَهٗ

دوم انقیاد ظاہری و باطنی کہ زبان سے اقرار کرنا اور دل سے یقین کرنا اور جوارح سے عمل کرنا اور اسی پر تمام دنیوی و اخروی وعدے مرتّب ہوں گے ۔

سوم صرف انقیاد باطنی اس پر نجات عن الخلود من النار مرتّب ہے ۔

چہارم اطمینان و بشاشت و حلاوت جو مقرّبین کو حاصل ہوتی ہے اسی کو اس آیت میں بیان کیا گیا ہُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِیْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ ای اطمینانًا ۔ یا اَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ ۔ (پ۳ البقرہ)

کفر کی حقیقت اور اس کے اقسام

ایمان کی مناسبت سے کفر کی حقیقت کو بھی سمجھنا ضروری ہے کیونکہ تَتَبَيَّنُ الْاَشْيَاءُ بِاَضْدَادِهَا ۔

کفر کا لغوی معنیٰ ہے اَلسَّتْرُ چھپانا: اس لیے زمین، زراع اور نہر کو کافر کہا جاتا ہے کیونکہ یہ بیج کو چھپا لیتے ہیں۔

اصطلاحِ شریعت میں کفر کا معنیٰ ہے تَکْذِیْبُ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ شَیْئٍ مِّنْ ضَرُوْرِیَّاتِ الدِّیْنِ یعنی ضروریات دین میں سے کسی بات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کرنا۔

حصولِ ایمان کے لیے جمیع ضروریات دین کی تصدیق ضروری ہے اور تحقیق کفر کے لیے کسی ایک امرِ ضروری کا انکار بھی کافی ہے۔ ضروریات دین کی تکذیب کرنے کی صورتیں مختلف ہیں جس صورت سے بھی ماہیتِ تکذیب پائی جائے گی کفر متحقق ہو جائے گا۔ کفر کی چار قسمیں ہیں:

اوّل کفر انکار: یہ کہ دل و زبان سے حق کا انکار کرے جیسے عام کفار کا کفر۔

دوم کفرِ جحود: یہ کہ حق کو دل سے پہچانتا تو ہے مگر زبان سے اقرار نہیں کرتا جیسے کفر ابلیس ویہود وغیرہ۔

سوم کفر عناد: کہ حق پر دل سے یقین رکھتا ہو اور زبان سے اقرار بھی کرتا ہو لیکن قبول نہ کرتا ہو یعنی دوسرے ادیان سے تبرّی نہیں کرتا اور التزامِ طاعت نہیں کرتا جیسے کفر ابوطالب۔

چہارم کفر نفاق: کہ دل میں تکذیب ہے، زبان سے ماننے کا کسی مصلحت کی وجہ سے اقرار ہے۔

اَعمال کا ایمان سے تعلق

ایمان کی مباحث میں سے ایک اہم بحث یہ بھی ہے کہ اعمال کا ایمان سے کیا تعلق ہے اس میں فِرَق اسلامیہ کے تین مذاہب ہیں تمام فرقوں کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں صرف ان فرقوں کا مختصر تعارف کرایا جاتا ہے جن کا نام آئندہ مباحث میں آئے گا۔

اوّل اہل السنۃ والجماعۃ: صحیح اسلامی فرقہ اہل السنۃ والجماعۃ ہے جو کتاب اللہ وسنتِ رسول اللہ ﷺ اور جماعت صحابہؓ کا پیروکار ہے۔ یہ لقب ماخوذ ہے

بلکہ بعینہٖ ترجمہ ہے حدیث پاک کے اس جملہ کا جو فرقہ ناجیہ کے بارہ میں آیا ہے "مَا اَنَا عَلَیْہِ وَاَصْحَابِیْ" یہ وہ مبارک طبقہ ہے جس کے اصول طرق نظریات بالکل قرآن مقدس کے عین مطابق ہیں۔

دوم معتزلہ اس فرقہ کی ابتدا تابعینؒ کے دور سے ہوئی ہے یہ لوگ یونانی فلسفہ سے بہت متاثر تھے اور اسی کو حق و باطل کے درمیان معیار بناتے تھے۔ مشہور یہ ہے کہ ان کا رئیس واصل بن عطا تھا یہ حضرت حسن بصریؒ کی مجلس میں بیٹھا ہوا تھا کہ مجلس میں سوال اٹھا کہ مرتکب کبیرہ مؤمن ہے یا کافر؟ تو حضرت حسن بصریؒ کے جواب دینے سے پہلے بول اٹھا "لیس بمؤمن ولا کافر" تو حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا "اعتزل عنا" ہم سے الگ ہو جاؤ! تب سے ان کا نام معتزلہ پڑ گیا ان لوگوں نے اپنا نام اَصْحَابُ الْعَدْلِ وَالتَّوْحِیْدِ رکھا ہے یہ فرقہ مبتدعین میں شمار ہوتا ہے۔

سوم جبریہ ان کی ابتداء جہم بن صفوان سے ہوئی ہے یہ لوگ بندے کو اپنے تمام افعال میں مجبور محض سمجھتے ہیں۔ نیز رؤیت باری تعالیٰ کی نفی کے قائل ہیں۔ وغیر ذالك من العقائد الواهية۔

چہارم قدریہ اس گروہ کی ابتدا صحابہ کرامؓ کے آخری دور میں ہوئی یہ لوگ افعال عباد کے مسئلہ میں جبریہ کی ضد ہیں بندے کو اپنے افعال کا خود خالق و کاسب مانتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اس میں کوئی دخل نہیں مانتے۔ چونکہ یہ لوگ مسئلہ قدر یعنی تقدیر میں کلام کرتے تھے۔ اس لیے ان کو قدریہ کہا جاتا ہے۔ اس کا بانی ایک نصرانی تھا۔

پنجم خوارج یہ لوگ سیدنا علیؓ اور سیدنا عثمانؓ اور اکثر صحابہ کرامؓ کی تکفیر کیا کرتے تھے اور مرتکب کبیرہ کو کافر اور مخلد فی النار کہتے تھے۔ حضرت علیؓ کے دور خلافت میں ان کے فیصلہ تحکیم پر راضی ہونے کی وجہ سے ان کے مخالف ہو گئے اور اطاعت سے خروج کی وجہ سے خوارج کہلائے۔ حضرت علیؓ کے نام کے ساتھ سوّد اللہ وَجْهَهٗ کہا کرتے تھے۔ اس لیے اہل السنۃ والجماعۃ حضرت علیؓ کے نام کے ساتھ کرّم اللہ وَجْهَهٗ کہتے ہیں۔

ششم مرجیہ یہ لوگ معتزلہ کے برعکس یہ کہتے تھے کہ ایمان کے ہوتے ہوئے کوئی معصیت مضر نہیں ہے نیز اختیار عبد کے منکر تھے۔ الرّجاء کے معنیٰ مؤخر کرنے کے ہیں۔ قال اللہ تعالیٰ "وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ" اَیْ مُؤَخَّرُوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ یہ لوگ بھی اعمال کی حیثیت واقعی سے پیچھے ہٹاتے تھے اس لیے مرجیہ مشہور ہوئے۔

مقامِ بحث اعمال ایمان میں داخل ہیں یا نہیں

اس بارے میں تین مذہب ہیں۔ ہر مذہب کے دلائل نقل کرنے کے ساتھ ان کے جوابات بھی دیے جائیں گے۔

مذہب اوّل معتزلہ اور خوارج کا مذہب یہ ہے کہ اعمال ایمان کا جزو ہیں ان کے بغیر ایمان حاصل نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی شخص نے فرائض اور واجبات کو ترک کیا اور کبائر کا ارتکاب کیا تو معتزلہ اور خوارج دونوں کے نزدیک وہ آدمی مؤمن نہیں رہا۔

مُعتزلہ اور خوارج کے دلائل اور اُن کے جوابات

دلیل اوّل قال اللہ تعالیٰ " وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا " خَالِدًا کے لفظ سے عموم معلوم ہوتا ہے کہ قتل جیسے گناہِ کبیرہ کا ارتکاب کرنے سے وہ ایمان سے نکل کر ہمیشہ کیلئے جہنمی ہو گیا۔

جواب اوّل خلود سے مُراد مکث طویل ہے کہ بہت عرصہ تک جہنم میں رہے گا۔ یا اس سے مراد وہ آدمی ہے جو قتل کو حلال سمجھ کر قتل کرتا ہے تو یہ مرتد ہے اور مرتد کی سزا دائمی جہنم ہے۔

جواب دوم اس آیت مُبارکہ میں نفسِ سزا کا ذکر ہے کہ قاتل کی یہ سزا ہونی چاہیئے لیکن مؤمن ہونے کی وجہ سے یہ سزا نہیں دی گئی۔

دلیل دوم حدیث پاک میں آتا ہے " من ترك الصّلوٰة متعمّدًا فقد كفر" اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تارکِ صلوٰۃ کافر ہے۔

جواب اوّل یہاں کفر سے مراد عمل کعمل الکفر ہے یا اس کا معنیٰ ہے قَارِبُ الْكُفْرِ۔

جواب دوم کفر کے کئی درجہ ہیں ایمان سے خارج ہونا۔ کفر والا کوئی عمل کرنا۔ یہاں دوسرا درجہ مراد ہے۔

دلیل سوم : حدیث پاک میں ہے لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَّا اَمَانَةَ لَهٗ عدم امانت سے عدم ایمان سمجھا جارہا ہے۔

جواب : یہاں ایمان کامل کی نفی ہے نہ کہ نفس ایمان کی۔

مذہب دوم : مرجیہ کا مذہب یہ ہے کہ اعمال کا ایمان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ طاعت ایمان کے لیے ضروری نہیں اور معصیت سے ایمان کو کوئی ضرر نہیں بس صرف تصدیق قلبی ٹھیک ہونی چاہیے۔

دلائل مرجیہ اور اُن کے جوابات

دلیل اول : عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَنْ شَهِدَ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ النَّارَ۔ (مشکوٰۃ شریف ص۱۵ ج ا کتاب الایمان)

دلیل دوم : وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَفَاتِیْحُ الْجَنَّةِ شَهَادَةُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ (مشکوٰۃ شریف ص۱۵ ج ا کتاب الایمان)

دلیل سوم : عَنْ عُثْمَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ مَاتَ وَهُوَ یَعْلَمُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ۔ (مشکوٰۃ شریف بحوالہ مذکورہ)

اس قسم کی وہ تمامی روایات جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شہادتین کا اقرار کرنے کے بعد جنت واجب اور دوزخ حرام ہوجاتی ہے مرجیہ کی دلیل ہے۔

جواب اول : یہ تمامی روایات اس وقت کی ہیں جب کہ ابھی احکام کا نزول ہی نہ ہوا تھا اور اس وقت مدار نجات صرف ایمان ہی تھا۔

جواب دوم : اس قسم کی احادیث اس شخص کے بارہ میں ہیں جس کو اعمال کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی بلکہ وہ ایمان لاتے ہی سپرد خدا ہوگیا یعنی فوت ہوگیا۔

جواب سوم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ تصور ہی نہ ہوسکتا تھا کہ کوئی شخص ایمان لے آئے اور عمل نہ کرے جو شخص کلمہ پڑھتا تھا وہ خود بخود عامل ہو جاتا تھا اس لیے اصل نزاع کی چیز کلمہ کو ذکر کر دیا گیا اور اعمال کو ذکر نہ کیا گیا۔

مذہب سوم اہل السنّۃ والجماعۃ اہل السُنّۃ والجماعۃ اعمال کے بارے میں نہ تو تفریط کا شکار ہوئے کہ انہیں لاشئ محض قرار دیں اور نہ ہی افراط کے مرتکب ہوئے۔

کہ انہیں ان کی حیثیت سے بڑھا کر ایمان کے برابر کر دیں بلکہ راہِ اعتدال پر رہتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ نفس ایمان تو صرف تصدیق ہی کا نام ہے اعمال اس میں داخل نہیں البتہ کامل ایمان اعمال سے مل کر ہی بنتا ہے یعنی اعمال ایمان کے جزو ہیں نہ کہ نفس ایمان اس کو یوں بھی تعبیر کر سکتے ہیں کہ اعمال ایمان کے اجزاءِ مُزیّنہ ہیں یعنی ان کے ہونے سے ایمان مُزیّن وخوبصورت لگتا ہے اور نہ ہونے سے یہ بات نہ ہوگی۔

اہلُ السنّۃ والجماعۃ کے دلائل

اعمال کو جزءِ ایمان کہنے والوں اور مُرتکب کبیرہ کو کافر کہنے والوں کے خلاف

دلیل اوّل قرآن کریم کی بہت سی آیات میں اور احادیث میں ایمان کا محل قلب کو قرار دیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ قلب میں تصدیق ہوتی ہے۔ معلوم ہوا کہ اعمال ایمان کی حقیقت میں داخل نہیں ہیں۔

① قال اللہ تعالیٰ " اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِىْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ (پ ۲۸ المُجادلہ)

(۲) وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِىْ قُلُوْبِكُمْ (پ ۲۶ الحجرات)
(۳) وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِىْ قُلُوْبِكُمْ ______ (پ ۲۶ الحجرات)
(٤) قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ (پ ۶ المآئدہ)
(۵) وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ ______ (پ ۱۴ النحل)

دلیل دوم قرآن میں کئی جگہ اعمال کا ایمان پر عطف کیا گیا ہے مثلاً آیۃ کریمہ " اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا (پ ۱۶) اور عطف مغایرت کو تقاضا کرتا ہے یہ معلوم ہوا کہ اعمال کی حقیقت ایمان کی حقیقت سے الگ ہے۔

سوال : یہ عطف مغایرت کے لیے نہیں بلکہ تخصیص بعد از تعمیم ہے۔

جواب یہ بات درست نہیں اس لیے کہ تخصیص بعد از تعمیم میں معطوف معطوف علیہ سے زیادہ مہتم بالشان ہوتا ہے۔ اور یہاں ظاہر ہے کہ معطوف علیہ افضل ہے معطوف سے کیونکہ ایمان اعمال سے افضل ہے۔

دلیل سوم قرآن حکیم میں ایمان کو اعمالِ صالحہ کے لیے شرط قرار دیا گیا ہے۔ قال اللہ تعالیٰ " فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ (پ ۱۷) اور ظاہر ہے کہ شرط مشروط کا غیر ہوتی ہے۔

دلیل چہارم حدیث جبریل علیہ السلام میں لما الاِیمان کے جواب میں آپ نے ارشاد فرمایا اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ پھر سوال کیا گیا مَا الْاِسْلَامُ تو آپ نے ارشاد فرمایا اَنْ تَشْهَدَ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تو اعمال کو ایمان کے جواب میں ذکر نہ کرنے اور اسلام کے جواب میں ذکر کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ اس میں آپ نے اعمال کا ذکر بھی فرمایا اس سے ثابت ہوا کہ ایمان صرف تصدیقِ قلب کا نام ہے۔

بحث ــ اَلْاِیْمَانُ یَزِیْدُ وَیَنْقُصُ اَمْ لَا

ایمان کی بساطت اور ترکیب پر دوسرا ایک مسئلہ متفرع ہوتا ہے کہ ایمان زیادت و نقصان کو قبول کرتا ہے یا نہیں اس میں مختلف مذہب ہیں۔

اوّل احناف اور متکلّمین کا مذہب یہ ہے کہ اَلْاِیْمَانُ لَا یَزِیْدُ وَلَا یَنْقُصُ یعنی ایمان میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوتی۔ **دوم** محدّثین اشاعرہ اور معتزلہ کا مذہب یہ ہے کہ الایمان یزید وینقص **سوم**: امام مالکؒ فرماتے ہیں "اَلْاِیْمَانُ یَزِیْدُ وَلَا یَنْقُصُ۔

ایمان کی کمی وزیادتی ثابت کرنے والی آیات

آیات قرآنیہ مندرجہ ذیل ہیں:۔

① اَیُّکُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖۤ اِیْمَانًا ② وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْهِمْ اٰیٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِیْمَانًا ③ وَیَزْدَادَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِیْمَانًا، جو حضرات کمی وزیادتی کے قائل نہیں وہ ایسی آیات کے مختلف جوابات دیتے ہیں۔

جواب اوّل ایمان کی دو قسمیں ہیں۔ اوّل منجی، دوم معلّی ایمان منجی سے مراد ایمان کا وہ ضعیف سے ضعیف درجہ ہے جو خلود نار سے مانع ہو۔ اور معلّی سے وہ درجہ مراد ہے جو دخول نار سے مانع ہو تو فرماتے ہیں کہ ایمان منجی میں کمی وزیادتی نہیں ہو سکتی البتہ ایمان معلّی میں ہوتی ہے ممکن ہے امام مالکؒ کا قول اَلْاِیْمَانُ یَزِیْدُ وَلَا یَنْقُصُ بھی ایمان منجی سے متعلق ہو کیونکہ ایمان منجی تو ادنیٰ درجہ ہے اگر اس میں بھی نقص آگیا تو ایمان ہی نہ رہے گا۔

جواب دوم بعض محدّثین حضرات کے نزدیک زیادت فی الکیف مراد ہے کم نہیں یعنی ایمان کا نور بڑھتا ہے جس ایمان پر اصل نجات کی مدار ہے وہ مراد نہیں بلکہ اس میں سب برابر ہیں۔ البتہ فضائل وکمالات کے اعتبار سے فرق مراتب زیادہ ہوتا ہے اور اسی اعتبار سے درجات و مراتب میں زیادت و نقصان ہوتا ہے جیسے تمام انبیاء نفس نبوت میں برابر ہیں مگر فضائل وکمالات کے اعتبار سے فرق مراتب ہوتا ہے۔

اسی کو تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ (پ۳) میں کہا گیا ہے۔

جواب سوم حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایمان کے دو درجے ہیں ایک اجمالی، دوسرا تفصیلی ایمان اجمالی میں کمی زیادتی (کیونکہ یقین میں ذرہ بھی کمی ہوئی تو وہ یقین نہیں رہے گا) نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ یہ اجمالی طور پر جمیع احکام الٰہیہ کو قبول کرنے اور ان پر یقین رکھنے کا نام ہوا اور ظاہر ہے کہ اس میں کمی زیادتی کا کوئی احتمال نہیں کیونکہ یقین میں ذرا بھی کمی ہوئی تو وہ یقین نہ رہے گا۔ اور درجہ تفصیل سے مراد یہ ہے کہ ہر حکم پر جُدا جُدا بالتفصیل ایمان لانا، اس میں کمی و زیادتی ہوتی ہے بایں طور کہ جتنے احکام کا علم ہوتا چلا جائے گا اس کے مطابق ان پر ایمان میں بھی زیادتی ہوتی جائے گی۔ زمانہ نزول وحی میں جب ایک حکم آیا ایک آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرامؓ اس پر ایمان لائے اس کے بعد جب دوسری آیت نازل ہوئی تو اس پر ایمان لائے وھکذا۔

النّسبة بين الايمان والاسلام

اسلام کا لغوی معنیٰ ہے کسی کے سامنے جھکنا، فروتنی اختیار کرنا۔ اس کی بات کو بلا چون وچرا تسلیم کرنا۔ کما فی قولہ تعالیٰ "اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" (پ۱) اصطلاحِ شریعت میں ایمان واسلام کے درمیان کیا نسبت ہے؟ اس میں علماء کے مختلف اقوال ہیں:۔

قول اوّل ان دونوں میں عموم وخصوص مطلق کی نسبت ہے ایمان خاص ہے اسلام عام ہے ایمان کہتے ہیں "اَلتَّسْلِيْمُ بِالْبَاطِنِ" اسلام کا معنیٰ ہے تسلیم کرنا خواہ یہ تسلیم دل سے ہو، خواہ زبان سے ہو خواہ جوارح سے فَكُلُّ اِسْلَامٍ اِيْمَانٌ وَلَا عَكْسَ مرقات ج۱ ص۱۵ اس قول کی دلیل یہ آیت ہے "اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ پ۳ اس آیت میں لفظ اسلام دین پر بولا گیا ہے اور دین تصدیق وعمل دونوں کے مجموعہ کا نام ہے۔

قول دوم: جمہور محدثین امام مالکؒ، امام شافعیؒ، معتزلہ وخوارج کے نزدیک ان میں نسبت

ترادف وتساوی کی ہے اس قول کی دو دلیلیں ہیں :۔

دلیل اوّل قولہ تعالیٰ وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ پ۱۱ یہاں پر ایک گروہ کو مؤمنین ومسلمین کہا گیا ہے۔

دلیل دوم فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ پ۲۷ کیونکہ قوم لوط کی بستی میں بالاتفاق صرف ایک گھرانہ مسلمان تھا جن پر مؤمنین ومسلمین دونوں کا اطلاق کیا گیا۔

قول سوم سید مرتضیٰ زبیدی شارح احیاءُ العلوم کے نزدیک ایمان واسلام میں تغایر فی المفہوم وتلازم فی الوجود ہے۔ یعنی دونوں کا مفہوم تو جدا جدا ہے جیسا کہ اوپر گزرا لیکن ان میں سے ہر ایک کا تحقق دوسرے کو مستلزم ہے۔ کیونکہ ہر ایک دوسرے کے لیے شرط ہے تو ایمان نام ہے انقیاد باطنی بشرط تسلیم ظاہری کا، اور اسلام نام ہے تسلیم ظاہری بشرط انقیاد باطنی کا۔ پس ایمان وہ معتبر ہے جو پھوٹ پھوٹ کر اسلام بنتا جائے، اور اسلام وہ معتبر ہے جو رچ رچ کر ایمان بنتا چلا جائے۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ اور علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ کی رائے یہی ہے اور یہی قول راجح ومختار ہے۔

ایمان مقلّد کا حکم شریعت کا مطالبہ یہ ہے کہ تمام ضروریات دین پر پختہ ایمان ہو چاہے دلیل سے پیدا ہو چاہے تقلید سے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کسی ضرورت کے تحت کسی کے مسلمان ہونے کی تحقیق کی تو صرف توحید ورسالت کے بارے میں اس کا عقیدہ دریافت کیا، یہ تحقیق نہیں کی کہ یہ عقیدہ کسی دلیل کی بنیاد پر رکھتے ہو یا تقلید کی بناء پر۔

وَعَنْ مُعَاوِيَةَ الْحَكَمِ قَالَ اَتَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ائْتِنِيْ بِهَا فَاَتَيْتُهُ بِهَا فَقَالَ لَهَا اَيْنَ اللّٰهُ قَالَتْ فِي السَّمَاءِ قَالَ مَنْ اَنَا قَالَتْ اَنْتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ قَالَ اَعْتِقْهَا فَاِنَّهَا مُؤْمِنَةٌ۔

(مشکوٰۃ شریف ص۲۵۸ ج۲ باب ..... قبل ازیں باب المطلقہ ثلاثاً)

معلوم ہوا کہ مؤمن ہونے کے لیے حصولِ ایمان معتبر ہے، جس طرح بھی ہو بعض اہل السنّۃ والجماعۃ کا مسلک یہ ہے کہ معتبر ایمان مقلد بھی ہے لیکن ترک ونظروفکر اس سے مؤاخذہ ہوگا کہ تم نے حصول دلائل کی کوشش کیوں نہیں کی۔ معتزلہ میں سے بعض مؤمن مقلد کو مؤمن ہی نہیں سمجھتے اور بعض اس کو لیسَ بِمؤمنٍ ولا بکافرٍ کہتے ہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ دلائل سے پختہ ایمان بہتر ہے تقلید محض سے کیونکہ اس میں استقامت زیادہ ہوتی ہے بہ نسبت دوسرے کے۔
قال اللہ تعالیٰ " قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ (پ٢٣)

بحث الاِسْتِثْنَاءُ فِي الْاِيمَانِ

یعنی

اَنَا مُؤْمِنٌ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ کہنے کا حکم

جب کوئی شخص اپنے مؤمن ہونے کی خبر دے تو صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اَنَا مُؤْمِنٌ یا ساتھ ان شاء اللہ بھی ضرور کہنا چاہیے۔ بعض متکلمین فرماتے ہیں کہ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ ضرور کہنا چاہیئے۔ لقولہٖ تعالیٰ " وَلَا تَقُولَنَّ لِشَيْءٍ اِنِّي فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا اِلَّا اَنْ يَشَاءَ اللّٰهُ (پ۱۵)
بعض شوافع حضرات فرماتے ہیں کہ ضروری تو نہیں مگر کہ لینا مستحسن و مستحب ہے اور وہ اس آیت کو استحباب پر محمول کرتے ہیں، امام اوزاعیؒ کے نزدیک تخییر ہے کہنا بھی درست ہے اور نہ کہنا بھی درست ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ان شاء اللہ کہنے کی مختلف وجوہ ہیں۔
اوّل اپنے ایمان میں شک ہو یقین نہ ہو اور تعلیق کے طور پر ان شاء اللہ کہا جائے اس وجہ سے ان شاء اللہ کہنا جائز ہے کیونکہ ایمان ظن و شک کا نہیں بلکہ یقین کا نام ہے۔
دوم تبرّک کے طور پر کہا جائے اس لحاظ سے درست ہے ممانعت کی کوئی وجہ نہیں۔

بحث محل ایمان

محدّثین حضرات میں یہ مسئلہ بھی مختلف فیہ ہے کہ محل ایمان قلب ہے یا دماغ، اس بارے

ہیں دو مسلک ہیں اوّل عند الشوافع محل ایمان قلب انسانی ہے لقولہ تعالیٰ " وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِيْمَانِ - دوم امام اعظمؒ کی طرف منسوب ہے کہ وہ محل ایمان دماغ کو قرار دیتے ہیں۔ لیکن یہ نسبت غیر صحیح ہے کیونکہ قدماء احناف کی کسی کتاب میں اس نسبت والا قول نہیں ملتا۔ بلکہ الٹا اس کے خلاف موجود ہے چنانچہ علامہ مرغینانی صاحب ہدایہ فرماتے ہیں :-

وَيَقُوْمُ الَّذِىْ يُصَلِّىْ عَلَى الرَّجُلِ وَالْمَرْاَةِ بِحِذَاءِ الصَّدْرِ لِاَنَّهٗ مَوْضِعُ الْقَلْبِ وَفِيْهِ نُوْرُ الْاِيْمَانِ ص۱۸۱ ج ا باب الجنائز فصل فی الصلوٰۃ علی المیت)

اس سے معلوم ہوا کہ محل ایمان عند الاحناف قلب ہے ۔

یقول ابو الاسعاد : دراصل ایمان کا معدن تو قلب ہے اور ایمان کے ظہور کی جگہ دماغ ہے جیسا کہ چراغ کی آگ وروشنی کا معدن تو اس جگہ میں ہے کہ جس جگہ روغن وتیل وغیرہ ہے لیکن اس آگ کا ظہور یہاں چراغ سے ہے یہی حال قلب اور دماغ کا ہے کہ اصل مرکز قلب ہے لیکن مقام ظہور دماغ ہے ۔ اسی بناء پر کہا گیا کہ ایمان کا محل دماغ ہے (کما فی فیض الباری)

هٰذه جملٌ مختصرةٌ فی الایمان وقد بقی بعد جنایا فی الزوایا ترکتها مخافة الاطناب : اللّٰهم یسّر لنا امورنا واحفظ اقدامنا واقدامنا مع الرّاحة لقلوبنا وابداننا - !

حدیث جبریل علیہ السّلام

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ بَيْنَمَا نَحْنُ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ يَوْمٍ الخ

شانِ وُرودِ حدیث قرآنِ حکیم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لایعنی اور لاحاصل سوال نہ کرنے کا حکم نازل ہونے کے بعد صحابہ کرامؓ احتیاطاً دین کی باتوں کے متعلق سوال کرنے سے بھی احتراز فرماتے تھے اور ان کو یہ خواہش ہوتی تھی کہ کوئی کٹر بدّو آدمی آکر سوال کرے اور اس کے جوابات ہمیں سُننا نصیب ہو جائیں۔

صحیح مسلم ص۲۹ ج ا میں حضرت ابوہریرہؓ سے یہ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجھ سے (دین کی باتیں) پوچھا کرو۔ لیکن صحابہ کرامؓ غلبۂ حیاً وادباً، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیشِ نظر سوال نہ کرتے۔ چنانچہ ان کی خواہش کی تکمیل کی خاطر جبریل علیہ السّلام انوکھی صورت میں تشریف لائے تاکہ سوال کریں اور معلّمِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلم جواب میں گوہر افشانی فرمائیں اس انداز سے صحابہ کرامؓ کا دامن علمی جواہر پاروں سے بھرپور ہو۔

یہ واقعہ علّامہ توریشتی حنفیؒ کی تحقیق کے مطابق ۱۰ھ میں حجۃ الوداع سے کچھ پہلے پیش آیا۔ شاید اس کا مقصد یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی میں تفصیلی طور پر احکام معلوم ہونے کے بعد اجمالی خاکہ معلوم ہو جائے۔ جس طرح واعظ پانچ گھنٹے تقریر کرنے کے بعد کہتا ہے کہ خلاصہ تقریر یہ ہے تاکہ اگر کسی کو تفصیل محفوظ نہ رہے تو خلاصہ و اجمالی خاکہ معلوم رہے۔ اس واقعہ کے بعد آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم ۱۱ھ میں انتقال فرما گئے۔!

حدیث کا نام اور وجہ تسمیہ

مُحدّثین حضراتؒ نے اس حدیث پاک کے مختلف نام رکھے ہیں چند ناموں کو مع وجہ تسمیہ کے یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔ اوّل حدیث جبریلؑ: کیونکہ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت جبریلؑ کے درمیان سوال وجواب کا واقعہ پیش آیا۔ دوّم: امّ السنۃ سوّم امّ الجوامع چہارم: امّ الحدیث: ان تینوں کی وجہ تسمیہ ایک ہے کہ دین کی مدار فقہ، عقائد، اور تصوف ہے اب اس حدیث میں سلام سے احکام فقہ کی طرف، ایمان سے عقائد کی طرف، اور احسان سلوک وتصوف کی طرف اشارہ ہے۔ اس حیثیت سے یہ تمام احادیث اور جوامع الکلم کی اصل ٹھہری۔ جس طرح جمیع علوم واحکام القرآن کا اجمالی طور پر سورۃ فاتحہ میں مذکور ہونے کی وجہ سے اس کو امّ القرآن اور امّ الکتاب کہا جاتا ہے۔ اب حدیث اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ بمنزلہ بِسْمِ اللّٰہ کے ہے۔ اور حدیثِ جبریلؑ بحیثیت جامعیت کے سورۃ فاتحہ کی طرح ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہی وجہ ہے کہ امام بغویؒ نے اپنی دونوں کتابوں (مصابیح اور شرح السنۃ) کی ابتداء اس حدیث پاک سے کی تاکہ فی الجملہ قرآن پاک کی اتباع ہو۔

قولہٗ بَیْنَمَا۔ بینما اصل میں بَیْنَا تھا جب مَا آخر میں لایا تو بینا ما ہوگیا تو پھر بینا والے الف کو گرا دیا گیا بینما ہوگیا بین ظرف زمان ہے اور ما زائدہ ہے اور اس ظرف کا عامل مفاجات کا معنیٰ ہے جو اذ طَلَعَ کے اذ مفاجاتیہ سے مفہوم ہوتا ہے پھر بین مضاف ہے جملہ نَحْنُ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰہِ کی طرف۔

قولہ نحن عند۔ نحن مبتدا ہے عند حاضرون مقدر سے متعلق ہے جو کہ نحن کی خبر ہے ذات یوم صفت ہے اس کا موصوف محذوف ہے ای ساعۃ ذات یوم

قولہٗ ذات یوم: یہاں پر ایک سوال ہے۔

سوال: ذَاتَ یَوْمٍ کیوں فرمایا صرف یَوْمًا فرما دیتے۔

جواب اوّل: عند البعض ذَاتَ کا کلمہ زائدہ ہے محض تحسین کلام کے لیے لایا گیا ہے۔

جواب دوم: یَوْمٍ دو معنوں میں مستعمل ہے۔ اوّل حقیقی جو صبح صادق سے لے کر غروب

شمس تک ہوتا ہے۔ دوّم مجازی جو مطلق وقت پر بولا جاتا ہے جب کلمہ یوم دو معنوں میں مستعمل ہوا تو احد المعانی میں سے کسی معنیٰ کی تعیین کرنی تھی تو ذات کا کلمہ بول کر اشارہ فرمایا کہ حقیقی معنیٰ مراد ہے نہ کہ مجازی۔ قولہٗ اِذْ طَلَعَ عَلَيْنَا رَجُلٌ (اچانک ایک شخص (ملکٌ فی صورۃ الرجل) ہمارے درمیان رونما ہوا۔

سوال | آمد جبریل علیہ السلام کو طَلَعَ سے تعبیر فرمایا اتیان واقبل سے کیوں نہیں کہا کما فی مسند امام اعظم رحمہ اللہ اذا اَقْبَلَ رَجُلٌ شَابٌّ جَمِيلٌ اَبْيَضُ الخ

جواب اوّل | عرب کا دستور تھا کہ بڑی شخصیت کی آمد کو طلوع سے تعبیر کرتے تھے۔ کما قالت بنَاتُ الانصار:

طَلَعَ البَدْرُ عَلَيْنَا مِنْ ثَنِيَّاتِ الوداعِ وَجَبَ الشُّكرُ عَلَيْنَا مَا دَعیٰ لِلّٰہِ داعٍ

جواب دوّم | متعلّم (جبریل) جنس ملائکہ سے تعلق تھا اور ملائکہ نورانی جسم والے ہیں جیسا کہ مسلم شریف کی روایت ہے " عَنْ عَائِشَةَ رضی اللہ عنہا قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَيْہِ وَسَلَّمَ خُلِقَتِ المَلَائِكَةُ مِنْ نُوْرٍ " اس لیے جبریلؑ کی آمد کو طلوع سے تعبیر فرمایا۔ کما يُقَالُ طَلَعَتِ الشَّمْسُ۔

سوال: جبریل علیہ السلام کو رب ذوالجلال نے اپنی اصلی شکل کے بجائے انسانی شکل میں کیوں بھیجا؟

جواب۔ انسانی شکل میں بھیجنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ افادہ واستفادہ میں سہولت رہے کیونکہ جنس غیر سے افادہ واستفادہ مشکل ہوتا ہے۔

قولہٗ شَدِيدُ بَيَاضِ الثِّيَابِ شَدِيدُ سَوَادِ الشَّعْرِ لَا يُرٰی عَلَيْہِ اَثَرُ السَّفَرِ (کپڑے بہت اجلے اور صاف تھے، بال نہایت صاف تھے اس پر سفر کا کوئی اثر نظر نہ آتا تھا) شَدِيدٌ کی دو ترکیبیں ہیں:۔

اوّل: اگر شَدِيدُ (صیغہ صفت) کو اضافت کے ساتھ پڑھا جائے تو یہ اضافت لفظی ہے جو تعریف کا فائدہ نہیں دیتی اس لیے اس کا رجلٌ کی صفت واقع ہونا درست ہے۔

دوّم: یا شَدِيدٌ کو تنوین کے ساتھ پڑھ کر بیاض کو اس کا فاعل قرار دیا جائے اور هٰكَذَا فِیْ قولہ شَدِيد سَوَادِ الشَّعْر۔

سوال ۔ یہ کہ کون سے بال کالے تھے کیونکہ حدیث پاک میں مُطلق ذکر ہے سواد الشعر۔

جواب ۔ صحیح ابن حبان میں یہی روایت ہے اس میں وضاحت ہے سَوادُ اللحیۃِ (کذا فی المرقات) سَر کا ذکر اس لیے نہیں فرمایا کہ سَر کے بال اکثر ڈھانپے ہوتے ہیں۔

فائدہ شَدِیْدُ بَیَاضِ الثِّیَابِ سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ طالب علمِ الٰہی کے لیے صفائی قلب و بدن اور کپڑوں کی نظافت کا ہمیشہ خیال رکھنا ضروری ہے۔ خصوصًا بزرگوں کی مجلس میں جاتے وقت تاکہ علم کا نور و فیضان اندر سمو سکے۔ اور شَدِیْدُ سَوادِ الشَّعْرِ سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تحصیلِ علم کا اصل زمانہ عنفوان شباب ہی ہے تاکہ تکلیف جھیل کر اپنے مقصد میں فائز المرام ہو سکے۔

سوال ۔ یہ ہے کہ حدیث پاک میں ثیاب کو جمع لایا گیا مگر شَعر کو واحد ذکر کیا ظاہری ترتیب میں تبدیلی کیوں فرمائی۔

جواب ۔ شعر کو واحد لانے کا مقصد یہ ہے کہ اس کے تمام بال سیاہ نہ تھے شاید اس سے اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ طلبِ علم کی مدت آخر دم تک ہے جیسا کہ کہا گیا "حدّہٗ من المھد الی اللحد"۔

قولہ لَا یَعْرِفُہٗ مِنَّا اَحَدٌ (اور ہم میں سے کوئی اس کو پہچانتا نہ تھا) بالوں اور لباس کا انداز بتاتا ہے کہ مدینہ پاک کے شہری ہیں۔ مگر کسی کا ان کی صورت کو نہ پہچاننا مسافر ہونے کی دلیل ہے۔ اب اس مقام پر سوال ہوتا ہے۔

سوال ۔ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ جمع کا صیغہ کیوں استعمال کر رہے ہیں؟ کیا کسی کو بھی خبر نہ تھی؟ ہو سکتا ہے کہ کسی کو معلوم ہو بلکہ یوں کہنا چاہیئے تھا کہ لَا یَعْرِفُہٗ اِنِّیْ۔

جواب اوّل ۔ سیّدنا عمرؓ نے اپنے ظن سے عدمِ معرفت کو سب کی طرف منسوب کر دیا ہے ورنہ حقیقتِ حال اس کے خلاف تھی۔

جواب دوم ۔ ان کی آمد و ہیئت سے متعجب ہو کر حاضرین نے جب ایک دوسرے کو سوالیہ اور متجسس نگاہوں سے دیکھا تو حضرت عمرؓ سمجھ گئے کہ کوئی ان کو نہیں پہچانتا جیسا کہ فتح الباری میں تصریح ہے فنظر القومُ بعضُھم الی بعضٍ فقَالُوْا ما نعرِفُ ھٰذا (ج ۱ ص ۱۱۷)

قَوْلُہٗ حَتّٰی جَلَسَ ــــ **سوال** ــ کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ تھی کہ آپ کی مجلس مبارکہ میں جو آدمی آتا اور سلام نہ پڑھتا تو آپ اس کو واپس ہونے اور سلام پڑھنے کا حکم فرماتے جب کہ اس رجل نے سلام نہیں پڑھا اور آنحضرتؐ نے واپس بھی نہیں کیا۔

جواب یہ ہے کہ اس حدیث پاک میں اختصارًا سلام وجواب کو حذف کر دیا گیا ہے ورنہ اس رجل نے سلام پڑھا اور جواب مُبارک سے مستفیض ہوا۔ حَتّٰی سَلَّمَ فِیْ طَرَفِ الْبِسَاطِ فَقَالَ السَّلَامُ عَلَیْكَ یَا مُحَمَّدُ فَرَدَّ عَلَیْهِ السَّلَامَ۔

(نسائی شریف ص۲۶۵ ج۲ کتاب الایمان وشرائطہ باب صفۃ الایمان والاسلام)

قَوْلُہٗ فَاَسْنَدَ رُكْبَتَیْهِ اِلٰی رُكْبَتَیْهِ۔ (اس نے لگا دیے اور ملا دیے اپنے دونوں زانوں حضرتؐ کے دوزانوں مُبارک کی طرف) رکبتیہ اوّل کی ضمیر ذات رجل کی طرف اور رُکبتیہ ثانی کی ضمیر نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی طرف راجع ہے۔

سوال ــ اس رجل نے یہ ہیئت کیوں اختیار کی یعنی اتنا قرب کیوں اختیار کیا؟

جواب دوزانوں بیٹھنا ادب اور تواضع سے زیادہ قریب ہے اور قریب بیٹھنا۔ انسیّت واُلفت اور شرعت جواب اور مسئول کی خاص توجہ کا موجب ہے اس وجہ سے رجل اجنبی نے یہ ہیئت اختیار کی۔

قَوْلُہٗ وَوَضَعَ كَفَّیْهِ عَلٰی فَخِذَیْهِ۔ اس جملہ میں کَفَّیْهِ کی ضمیر کا مرجع یہ آنے والے رجل یعنی جبریل علیہ السلام ہیں۔ البتہ فَخِذَیْهِ کی ضمیر کے مرجع میں دو احتمال ہیں

احتمال اوّل ۱ کہ یہ بھی کفّیہ کی طرح جبریل علیہ السّلام کی طرف راجع ہے تو ترجمہ یوں ہوگا "کہ انہوں نے اپنی دونوں ہتھیلیاں اپنی دونوں رانوں پر رکھیں" اس طرح سے بیٹھنا ادب کا بیٹھنا ہے، شیخ کے سامنے یہی انداز نشست ہونا چاہیئے اور اس وقت کی آمد سائل ومُتعلم کی حیثیّت سے تھی۔

احتمالِ دوم ۲ جو خود حدیث پاک سے ثابت ہے کہ اس کا مرجع نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم ہیں یعنی انہوں نے اپنی دونوں ہتھیلیاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی رانوں

مُبارک پر رکھیں" حَتّٰی وَضَعَ یَدَہٗ عَلٰی رُکْبَتَیِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ (نسائی شریف ص۲۶۵ ج۲ کتاب الایمان وشرائطہ صفۃ الایمان والاسلام) اس سے ان کا مقصد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی طرف زیادہ متوجہ کرنا تھا کیونکہ سائل مسائل مذکورہ میں زیادہ محتاج ہے اور مجیب کو اپنی طرف متوجہ کر رہا ہے۔

تطبیق بین القولین

بعض مُحدّثین حضرات نے ان دونوں قولوں میں تطبیق دی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اولاً اس رجل نے اپنے رانوں پر ہاتھ رکھا تھا، پھر کچھ بے تکلف ہوگئے اور آگے بڑھتے گئے یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رانوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔

تعمیہ کی کوشش

اس حدیث میں جبریل علیہ السلام کے اپنے ہاتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رانوں پر رکھنے کے علاوہ اور بہت سی باتیں جو بظاہر خلافِ ادب یا عجیب سی معلوم ہوتی ہیں سرزد ہوئیں ان میں کیا حکمت ہے۔ بہت سے مُحدّثین حضرات نے اس پر تفصیلاً گفتگو کی ہے لیکن مختصراً سب سے بہترین تفسیر شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عُثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الملہم ص۱۶۲ ج۱ میں نہایت عمدہ پیرایہ میں واضح فرمائی ہے کہ اس موقع پر حضرت جبریلؑ کا مطمحِ نظر و مقصد تعمیہ کرنا یعنی اپنی شخصیت کو چھپانے کی سعی کرنا اور لوگوں کو حیرت والتباس میں ڈالے رکھنا تھا تاکہ تعلیم رسولؐ کا تو پتہ چلے مگر خود ذات رسول حدِ اخفاء تک مخفی رہے۔ کبھی ایسا انداز اختیار کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نووارد صاحب، غایت درجہ کے تہذیب یافتہ، آدابِ تعلیم وتعلّم سے واقف ہیں کبھی ایسی صورت اختیار کرتے ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ یہ شخص دیہاتی وبدوی اور آدابِ مجلس سے ناواقف ہے۔ اسی طرح کبھی یَارَسُوْلَ اللّٰہِ کہہ کر ندا دیتے ہیں جو عنوان تہذیب ہے اور کبھی یَا مُحَمَّد کہہ کر پکارتے ہیں جو شانِ بدویت ہے۔ بالوں اور لباس کا انداز بتاتا ہے کہ مدینہ پاک کے شہری ہیں کسی کا ان کی صورت کو نہ پہچاننا مُسافر ہونے کی دلیل ہے یعنی تمام اطوار میں تعمیہ اور اخفاء کی پوری کوشش کی گئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اور تو کوئی کیا پہچانتا ان کے اصل شناسا مہبطِ وحی صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس مرتبہ ان کو نہ پہچان سکے۔ سلیمان تیمی کی روایت

کے الفاظ ہیں :۔

فَوَالَّذِی نَفْسِی بِیَدِہٖ مَا شُبِّہَ عَلَیَّ مُنْذُ اَتَانِی قَبْلَ مَرَّتِی هٰذِہٖ وَمَا عَرَفْتُہٗ حَتّٰی وَلّٰی (کذا فی فتح الملھم)

آپ نے فرمایا جبریل علیہ السلام جب سے آنے لگے کبھی ان کا آنا مجھ پر مُشتبہ نہیں ہوا یہ پہلا موقع ہے کہ جبریل علیہ السلام آئے اور مجھ پر مخفی رہے جب وہ چلے گئے تو معلوم ہوا کہ جبریلؑ تھے۔

یقول ابوالاسعاد : ربّ ذُوالجلال والاکرام اس واقعہ کا ظہور فرماکر مسئلہ بیان فرمانا چاہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یقینًا عُلوم الاوّلین والآخرین (بذریعہ وحی) عطاء کیے گئے تھے مگر پھر بھی آپ مخلوق ہیں لہذا مخلوق کا حال یہ ہے کہ اپنی ذات سے کچھ نہیں ہے ہر وقت سب کچھ خالقِ کائنات ہی کے قبضہ میں ہے ۔ اتنے علوم و حقائق آپ کو عطا کیے جانے کے بعد جس وقت خالق چاہے آپ سے بھی محسوسات و مشاہدات کا علم تک اٹھالے اعلیٰ حقائق و معارف کا تو پوچھنا ہی کیا۔ نیز اس سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عالم الغیب نہیں تھے۔

قولہٗ یَا مُحَمَّدُ ۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یا محمدؐ کہہ کر خطاب کیا جو بظاہر مقامِ ادب کے بھی خلاف ہے اور قرآن کریم کے بھی خلاف ہے قرآن پاک میں ہے " لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ کَدُعَآءِ بَعْضِکُمْ بَعْضًا " پ۱۸ النور)

حضرت رسالت مآبؐ کی عظمتِ شان کی رعایت رکھ کر خطاب کیا کرو ، نام لے کر پکارنا ظاہر ہے کہ خلافِ ادب ہے جب کہ یہاں خطاب ہورہا ہے شارحینؒ حضرات نے اس کے مختلف جواب دیئے ہیں :۔

جوابِ اوّل واقعہ مذکورہ آیت مذکورہ (لَا تَجْعَلُوْا الخ) کے نزول سے پہلے کا ہے ۔ مگر یہ جواب صحیح نہیں کیونکہ یہ واقعہ حضرتؐ کی وفات حسرتِ آیات سے ایک مہینہ قبل پیش آیا جب کہ وحی کی بندش صحیح روایت کے مطابق اکیاسی دن پہلے ہوگئی تھی۔

جواب دوم آیۃ مبارکہ میں خطاب انسانوں کو ہے کہ دُعَآءِ بَعْضِکُمْ بَعْضًا میں ملائکہ کرام شامل نہیں ہیں۔ اس لیے جبریل علیہ السلام اس نفی کے مخاطب نہیں۔

جواب سوم یَا مُحَمَّدُ بول کر عَلَمی معنیٰ مراد نہیں بلکہ وصفی معنیٰ مراد ہے۔ محمد دراصل صفت کا صیغہ ہے اس کا معنیٰ ہے انتہائی درجہ کی حمد و ستائش کیا ہوا شخص! آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی دائرہ مخلوق میں سے اس وصف کے مصداق ہیں یہی معنیٰ مراد لے کر خطاب کیا ہے۔

قولہ اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِسْلَامِ قَالَ الْاِسْلَامُ اَنْ تَشْهَدَ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ (اس نے عرض کیا اے محمدؐ! مجھ کو اسلام کی حقیقت سے آگاہ کرو)

اس روایت میں سوال عَنِ الْاِسْلَامِ مقدم ہے اس لیے کہ اسلام ظاہری انقیاد کا نام ہے والظَّاھِرُ عُنْوَانُ الْبَاطِنِ مگر بخاری شریف میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے جس میں سوال عَنِ الْاِیْمَانِ مقدم ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اعمال ظاہری وغیرہ اور تمام طاعات کی قبولیّت ایمان پر موقوف ہے۔

تعریف اسلام اسلام انقیاد ظاہری کا نام ہے لیکن یہ انقیاد تب معتبر ہے جب کہ قلب میں تصدیق بھی ہو یوں سمجھے کہ اسلام مثل بدن کے ہے اور ایمان مثل رُوح کے۔ یہاں پر دو فائدے قابل غور ہیں:۔

فائدہ اوّل مشکوٰۃ شریف کی اس زیر نظر روایت میں سب سے پہلا سوال اسلام کے متعلق ہے اور اس حدیث میں اسلام کی تعریف میں پانچ اُمور ذکر کیے گئے ہیں۔ (۱) شہادت توحید و رسالت (۲) اِقَامَۃُ الصَّلٰوۃِ (۳) ایتاء الزکوٰۃ (۴) صیام رمضان (۵) حج بیتُ اللہ۔ اس کے سوال کے جواب میں مختلف الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ بعض روایات میں زیادہ امور کا ذکر ہے بعض میں کم ہے اس اختلاف کا منشاء اختلاف فی الضبط ہے بعض رُواۃ یوں تفصیل سے روایت کو ضبط کر سکے بعض نے کم اُمور کو ضبط کیا، بعض کو سب یاد رہے بعض کو بعض کا نسیان و ذہول ہو گیا۔

فائدہ دوم اسلام کی تعریف میں مصدر استعمال نہیں کیا گیا اس کی جگہ پر اَنْ ناصبہ مصدریہ اور فعل لایا گیا ہے یعنی اَنْ تَشْهَدَ اَنْ لَآ اِلٰهَ الخ — اور اِقَامَةُ الصَّلٰوةِ کے الفاظ استعمال کرنے کے بجائے وَتُقِيْمُ وَغَيْرِهِمَا کے الفاظ استعمال کیے ہیں اس کی کیا وجوہات ہیں۔

وجہ اوّل یہ ہے کہ اَنْ اور فعل مل کر اگرچہ مصدر ہی کا معنیٰ دیتے ہیں تاہم دونوں میں فرق ہے وہ یہ ہے کہ اَنْ اور فعل زمانہ استقبال پر دلالت کرتے ہیں جبکہ مصدر اس دلالت سے خالی ہے اور یہاں استقبال والا معنیٰ مقصود ہے۔

وجہ دوم مُلّا علی قاریؒ شارح مشکوٰۃ نے یہ توجیہ فرمائی ہے کہ مصدر کے بجائے اَنْ تَشْهَدَ اور اَنْ تُقِيْمَ وغیرہ لاکر اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ صرف علم ومعرفت ان امور کی پیدا کرنا کافی نہیں بلکہ اصل مقصود یہ ہے کہ آپ ان امور کو عمل میں لائیں اور ان کو قوت سے فعلیت کی طرف نکالیں۔

قولہ وَتُقِيْمُ الصَّلٰوةَ : اس مقام پر محدثین حضراتؒ نے اسلامی امور کی تقسیم بیان فرمائی ہے وہ اس طرح ہے کہ اسلامی امور دو حال سے خالی نہیں وہ امور قولی ہونگے یا فعلی یعنی غیر قولی، پھر غیر قولی دو حال سے خالی نہیں فعلی ہوں گے یا ترکی۔ فعلی وہ جن میں کچھ کرنا پڑے۔ ترکی جن میں کچھ چھوڑنا پڑے۔ پھر فعلی تین حال سے خالی نہیں (۱) محض بدن سے تعلق رکھنے والے اعمال (۲) محض مال سے تعلق رکھنے والے اعمال (۳) وہ اعمال جن کا تعلق بدن اور مال دونوں سے ہے۔ اسی طرح اعمال کی کل پانچ قسمیں بن گئیں (۱) قولی اعمال (۲) ترکی اعمال (۳) محض بدنی اعمال (۴) محض مالی اعمال (۵) وہ اعمال جن کا تعلق بدن ومال دونوں سے ہے۔ پہلی قسم میں شہادت ذکر کرکے بتا دیا کہ تمام قولی اعمال پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے مطابق ہونے چاہئیں۔ دوسری قسم میں روزہ کو ذکر کیا کیونکہ روزہ تروک ثلاثہ کا نام ہے۔ تیسری قسم میں نماز کو ذکر کیا۔ چوتھی قسم میں زکوٰۃ کو ذکر کر دیا۔ پانچویں قسم میں حج کو ذکر کر دیا۔ اسی طرح ہر قسم میں سے ایک ایک ذکر کرکے اشارہ فرما دیا کہ تمام انواع اعمال کی اصلاح کرنے سے ہی اسلام کامل ہوتا ہے۔

یقول ابوالاسعاد : عبادات کی سب سے بہترین تقسیم علامہ غزالیؒ نے احیاء العلوم میں بیان فرمائی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اسلام کی تعریف میں چار قسم کی عبادات کو بیان کیا گیا، صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم، حج۔ **حکمت** یہ بیان کی گئی کہ اللہ تعالیٰ کی صفات دو قسم کی ہوتی ہیں :۔ جمالی ۔ جلالی ۔ جمالی کا تقاضا انس ومحبت ہے اور جلالی کا تقاضا غضب وانتقام ہے ۔ اور ان صفات کا ظہور مختلف اشیاء کے توسط سے ہوتا ہے ان میں عبادات بھی ہیں تو صلوٰۃ وزکوٰۃ صفات جلالی کا مظہر ہیں کیونکہ نماز میں ایک مجرم کی طرح کھڑا ہونا پڑتا ہے کہ کسی طرف نظر نہ ہو۔ ہاتھ باندھ کر بغیر حرکت کے نیچے کی طرف نظر کر کے کھڑا ہونا ہوتا ہے گویا ایک مجرم آدمی کسی حاکم کے اجلاس میں کھڑا ہے ۔ اسی طرح زکوٰۃ گویا ایک مجرم کی طرح اپنے مال کا جرمانہ حاکم کو دے رہا ہے ۔ اور صوم و حج صفات جمال کا مظہر ہیں کہ روزہ دار خدا کی محبت کا دعویدار ہے ۔ اس کی محبت سے ہر قسم کی نفسانی خواہش کو چھوڑ دیا۔ اور حج میں تو سارے افعال عاشقوں کے ہیں کہ دیار محبوب کے دیدار کے لیے پراگندہ بال ہو کر کوچہ محبوب میں پریشان حال ہو کر گھومتا رہتا ہے اور محبوب کی دیواروں کو بوس وکنار کرتا ہے پھر آخر میں محبت کے مارے محبوب کے قریب اپنی جان کی قربانی دے کر آجاتا ہے یہ سارے کام صفات جمالی کے مظہر ہیں۔

قولہ وَتَحُجَّ الْبَيْتَ اِنِ اسْتَطَعْتَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا : حج اسلام کے رکنوں میں سے ایک اہم رکن ہے۔

سوال۔ حج کو اِنِ اسْتَطَعْتَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا کے ساتھ کیوں مقید کیا حالانکہ استطاعت تو تمام احکام میں شرط ہے۔

جواب۔ استطاعت کی دو قسمیں ہیں (۱) ممکنہ (۲) میسرہ ، ممکنہ تو تمام احکام کے لیے ضروری ہے لیکن حج کے لیے میسرہ بھی ضروری ہے یعنی خاص استطاعت جو حج کے لیے ضروری ہے اور اس کی تفسیر حدیث صحیح میں زاد اور راحلہ کے ساتھ آئی ہے۔

قولہ قَالَ صَدَقْتَ فَعَجِبْنَا لَهُ يَسْأَلُهُ وَيُصَدِّقُهُ۔

(اس شخص نے یہ سنکر کہا آپ نے سچ فرمایا حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ہمیں تعجب ہوا کہ وہ سوال بھی خود کرتا ہے اور تصدیق بھی کرتا ہے) کسی چیز کا سبب نہ جاننے کی وجہ سے اس کو

دیکھ کر قلب میں جو حالت پیدا ہوتی ہے اس کو تعجب کہتے ہیں یہ سائل وارد اس واقعہ میں ذہی ناموس مُبارک ہیں جو بحیثیت سفیران جوابات کی تمام تفصیلات اللہ رب العزت کی طرف سے لائے ہیں اور وجہ تعجب یہ ہے کہ دو متضاد چیزیں اکٹھی ہو رہی ہیں کیونکہ سوال سے معلوم ہو رہا ہے کہ جاہل ہے اور تصدیق سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم ہے ۔

قولہ فَاَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِیْمَانِ (پھر وہ شخص اے محمد ایمان کسے کہتے ہیں)

حضرت جبریل علیہ السلام کے سوالات میں سے ایک اہم سوال ایمان کی حقیقت پوچھنا ہے ایمان کی اصل حقیقت تو یہ ہے کہ جو باتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قطعی اور بدیہی طور پر ثابت ہیں ان کو دل سے سچا ماننا جس کا حاصل یہ ہے کہ تمام ضروریاتِ دین میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرنا۔ ضروریات کی تشریح آگے آرہی ہے ۔

۱- قولہ اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰہِ : مقام ہذا پر سوال ہوتا ہے۔

سوال — کہ ایمان کی تعریف ایمان سے کی گئی ہے سائل نے پوچھا عَنِ الْاِیْمَان آپ صلی اللہ علیہ وسلم جواب دے رہے ہیں اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰہِ تو یہ تعریف الشیئ بنفسہ ہوئی۔

جواب اوّل — اہتمامِ شان کی وجہ سے لفظ ایمان کو جواب میں لوٹا یا گیا ہے ۔

جواب دوم — یہ ہے کہ مُعرَّف میں الایمان سے ایمان شرعی مراد ہے اور مُعرِّف میں ایمان سے ایمان لُغوی مراد ہے اور وہ اپنے متعلقات سے مل کر ایمان شرعی کی تعریف ہوگئی۔ فلا اشکال علیہ ۔

سوال — جبریل علیہ السلام نے سوال کیا ایمان کے بارے میں اور حضور علیہ السلام نے جواب دیا مؤمن بہ سے، یعنی سوال و جواب میں مطابقت نہیں۔

جواب — یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرائن سے معلوم ہوا کہ جبریل علیہ السلام کا مقصد مؤمن بہ کی تعیین ہے۔ بنا بریں حضور علیہ السلام نے بھی اس کی تعیین فرما دی ۔

ایمان باللہ کی شرح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وجود اور ذات صفاتِ کمالیہ پر ایمان لائے اور ہر قسم کے عیوب و نقائص سے مُنزّہ سمجھے۔

۲۔ قَوْلُہٗ وَمَلٰٓئِكَتِہٖ (اور ملائک پر بھی ایمان لائے) ملائکہ پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے وجود پر ایمان لایا جائے اور ان کی جو صفات قرآن کریم میں مذکور ہیں ان پر ایمان لایا جائے۔ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ، يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (پ۲۸ التحریم)

ملائک کی لُغوی تحقیق

یہ مَلَكٌ کی جمع ہے جو مَلْئَكٌ سے مُخفّف ہے اور مَلْئَكٌ اصل میں مَاْلَكٌ تھا اَلَكَ يَاْلِكُ اُلُوْكَةً باب ضرب بمعنیٰ پیغام رسانی پھر مَاْلَكٌ میں قلب مکانی کرکے لام کو ہمزہ پر مُقدّم کر دیا مَلْئَكٌ ہوگیا پھر تخفیف کے لیے ہمزہ کی حرکت لام کی طرف نقل کرکے ہمزہ کو حذف کر دیا مَلَكٌ ہوگیا اور پھر جمع میں وہ ہمزہ لوٹا دیا گیا ہے۔

ملائکہ کی تعریف

ان کی جامع مانع تعریف یہ ہے کہ اَلْمَلَكُ جِسْمٌ نُوْرَانِیٌّ يَتَشَكَّلُ بِاَشْكَالٍ مُّخْتَلِفَةٍ لَا يُذَكَّرُ وَلَا يُؤَنَّثُ : نورانی کی قید سے ناری اور ترابی نکل گئے، اور تذکیر و تانیث ہونا یہ جنّوں اور انسانوں کی صفت ہے۔

ازالہ شُبہات

ملائکہ کے بارے میں پیدا ہونے والے شُبہات کے جوابات سے پہلے چند اصول ذہن میں رہیں۔

اصول نمبر ۱ : کسی چیز کا ثابت ہونا دلیل پر موقوف ہے دلیل کی دو قسمیں ہیں۔ عقلی۔ نقلی

دلیل عقلی : وہ دلیل ہے جس کے مقدمات عقل تسلیم کرے اس میں خبر کی ضرورت نہ ہو جیسے حساب کے قواعد مثلاً ایک شخص روزانہ ایک روپیہ کمائے تو عقل سے معلوم ہوتا ہے کہ ہفتہ میں وہ آدمی سات روپے کمائے گا۔

دلیل نقلی : وہ دلیل ہے جس کی بنیاد خبر پر ہو دلیل نقلی کا استعمال بہ نسبت عقل کے زیادہ ہے جیسا کہ ظاہر ہے۔

اصول نمبر ۲

مفہوم کی تین قسمیں ہیں : واجب[۱] ، ممتنع[۲] ، ممکن[۳]۔ جس کے وجود کو عقل ضروری سمجھے وہ واجب ہے جیسے اَلْوَاحِدُ نِصْفُ الْاِثْنَيْنِ اور جس کے عدم کو ضروری سمجھے وہ ممتنع ہے جیسے اجتماعِ نقیضین۔ اور جس کی دونوں جانب

برابر ہوں وہ ممکن ہے جیسے کوئی کہے کہ کراچی شہر کا رقبہ کلکتہ کے رقبہ سے زائد ہے اگر مخبرِ صادق ممکن کی خبر دے تو بصورتِ اعتماد عقلاً اس کا قبول کرنا واجب ہے اور عرفاً مسلّم ہے تمام کاروبار اسی پر چل رہے ہیں، عدالت کے فیصلے بھی اسی پر ہو رہے ہیں۔

اصول نمبر ۳ کسی چیز پر موجود ہونے کا حکم لگانا تین طرح سے ہوتا ہے۔ اوّل مشاہدہ زید کو دیکھ کر سمجھتے ہیں کہ موجود ہے۔ دوّم خبر صحیح اس میں شرط یہ ہے کہ اس سے زیادہ صحیح اور یقینی دلیل اس خبر کے خلاف نہ ہو۔ مثلاً کسی نے خبر دی کہ رات کو زید نے تمہیں زخمی کیا ہے لیکن یہ تمہارے مشاہدہ کے خلاف ہے لہذا غلط ہے۔

سوّم استدلال عقلی — دھوپ کو دیکھ کر آفتاب کا حکم لگانا۔

سوال اوّل : اگر ملائکہ دنیا میں موجود ہوتے تو ہمیں دکھلائی دیتے ؟

جواب ملائکہ کا وجود فی ذاتہٖ عقلاً ممکن ہے اور مخبرِ صادق نے قرآن وحدیث میں ان کے وجود کی خبر دی ہے لہذا ماننا واجب ہے جیساکہ اصول ۱ میں گذرا کسی چیز میں موجود ہونے کو اپنے مشاہدہ پر منحصر کرنا غلط ہے جیساکہ اصول ۲ میں گذرا رجنات کے وجود کی دلیل بھی یہی ہے)

سوال دوّم — ملائکہ باوجود لطیف ہونے کے سخت کام کیسے کرتے ہیں کہ ایک چیخ سے قوم ثمود کے کلیجے پھٹ گئے، قوم لوط کی بستی کو الٹ دیا۔

جواب — سائنس کی ایجادات بتاتی ہیں کہ لطافت کو قوت لازم ہے، بجلی سب سے زیادہ لطیف اور سب سے زیادہ طاقتور ہے۔

سوال سوّم — یہ ہے کہ قلیل مدت میں زمین وآسمان میں مسافت کیونکر طے کرتے ہیں۔

جواب — فلاسفہ جدید کی تحقیق یہ ہے کہ تیزیٔ حرکت کی کوئی حد نہیں بجلی ایک منٹ میں زمین کے گرد پانچ سو مرتبہ گھوم سکتی ہے۔

سوال — ایمان بالملائکہ کو ایمان بالرسل پر کیوں مقدم کیا حالانکہ رسولوں کی فضیلت علی الملائکہ مُتّفق علیہ ہے۔

جواب — ایمان بالملائکہ کو ایمان بالرُّسُل پر اس لیے مقدم کیا کہ شریعت کا ثبوت رسالت

رسالت سے ہے اور رسالت ملائکہ پر موقوف ہے تو گویا ملائکہ موقوف ہوئے اور رسول موقوف علیہ ہوئے، تو موقوف ہمیشہ موقوف علیہ سے پہلے ہوتا ہے۔ ہٰکذا فی ہٰذا المقام۔

قولہ وکتبہ ۔۔ متعلقاتِ ایمان میں سے کتب الٰہیہ بھی ہیں حق تعالیٰ مُعلّمین کاملین یعنی انبیاء علیہم السّلام میں سے بعض پر اپنی مقدّس کتابیں اور پاک صُحُف نازل فرمائے جو اللہ کے بندوں کے لیے نصاب ہدایت تھے ان میں سے جن کتب وصحائف کا ثبوت طریق صحیحہ سے ہوگیا ہے ان پر ایمان لانا ضروری ہے۔

کیفیّت ایمان کتب سماویہ دو قسم ہیں اوّل کتب کبیرہ جیسے قرآن مقدس، تورات انجیل، زبور۔ دوم کتب صغیرہ جیسے صُحُف ابراہیم و موسیٰ : اس میں دونوں کتب مراد ہیں۔ کیفیتِ ایمان میں تین درجہ ہیں۔

اوّل اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو جو کتابیں اور صُحُف عطا فرمائے ہیں وہ سب برحق ہیں ان پر ایمان لانا ضروری ہے، **دوم** ؛ سوائے قرآن پاک کے تورات، انجیل، زبور اور دیگر صحائف کے منسوخ ہونے پر یقین رکھنا۔ **سوم** ؛ قرآن مقدس میں قیامت تک کسی قسم کے نسخ وتحریف واقع نہ ہونے پر ایمان رکھنا۔

قولہ ورسلہ ۔۔ تحقیقِ ایمان کے لیے اللہ تعالیٰ کے رسولوں اور پیغمبروں کو بھی ماننا ضروری ہے۔

تعریف رسُول اَلرَّسُوْلُ اِنْسَانٌ بَعَثَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی لِتَبْلِیْغِ الْاَحْکَامِ اِلَی النَّاسِ : مُحدّثین حضرات نے رسول اور نبی میں مختلف فرق بیان کیے ہیں۔

فرق اوّل ؛ نبی صرف انسانوں کے ساتھ خاص ہے جب کہ رسول عام ہے انسانوں اور فرشتوں پر بھی بولا جاتا ہے۔

فرق دوم رسول وہ ہے جو مستقل شریعت کا مالک ہو جبکہ نبی کے لیے مستقل شریعت کا ہونا ضروری نہیں، دوسری شریعت کے تابع بھی رہ سکتا ہے۔ یعنی کُلُّ رسُولٍ نبیٌّ ولاعَکس : مگر اس وجہ فرق پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام

صاحب شریعت مستقلہ نہ تھے لیکن اس کے باوجود قرآن مقدس میں ان کے بارے میں ہے وَكَانَ رَسُولًا نَّبِيًّا ، اس لیے بہترین فرق وہ ہے جو علامہ حافظ ابن تیمیہؒ نے کتاب النبوات میں ذکر کیا ہے کہ نبی وہ ہے کہ جس کو اصلاح ناس کے لیے بھیجا گیا ہو۔ اور رسول وہ ہے (جو بالذات مخالفین کی اصلاح کے لیے بھیجا گیا ہو اور) جس کو دشمنوں کے ساتھ مقابلہ کا حکم بھی ہو خواہ صاحب کتاب ہو یا نہ ہو۔ کذا فی ارشاد القاری ص۶۶ ج۱)

ضرورت رسالت

انسان جسم و روح سے مرکب ہے جیسے جسم کی نشوونما ترقی و تکمیل اور امراض جسمانیہ سے حفاظت کے لیے مختلف علوم و فنون کی ضرورت ہے غلہ پیدا کرنے کے لیے کاشتکار، اوزار بنانے کے لیے لوہار، زیور گھڑنے کے لیے سنار، مکان بنانے کے لیے معمار یہ سب جسم کے خادم ہیں اسی طرح روح کی اصلاح اس کی نشوونمائش ترقی و تکمیل کے لیے بھی مصلح کی ضرورت ہے اسی کو اصطلاح میں نبی کہا جاتا ہے اور اس کی نیابت میں یہ خدمت مجددین و علماء کے سپرد ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ روح و قلب کی اصلاح جسم کی اصلاح سے اہم ہے کیونکہ ہمارے تمام جسمانی قویٰ و اعضاء دل کے تابع ہیں وہی ان سب پر حکمرانی کرتا ہے اس کی درستگی سے پورا نظام زندگی درست ہو سکتا ہے۔ کما فی قولہٖ تعالیٰ ؎

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ (پ۱۱ یونس)

حدیث پاک میں ہے :-

أَلَا وَإِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ (مشکوٰۃ ص۲۴۱)

جس رب العالمین نے جسم کی اصلاح کے لیے اتنا کچھ کیا ہو اس کی شانِ ربوبیت سے بہت بعید ہے کہ وہ روح کی اصلاح کے لیے کچھ نہ کرے۔

قولہ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ — یومُ الآخرۃ سے مراد قیامت کا دن ہے اس لیے کہ یہ آخر ایامِ دنیا ہے قیامت کے دن پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے وقوع پر اور اس میں

واقع ہونے والے واقعات پر یقین رکھا جائے۔

قیامت کا عقلی ثبوت

جیسے عادل بادشاہ ایک دن فرمانبردار رعایا کو انعام واکرام سے نوازتا ہے اور نافرمان کو سزا دیتا ہے تاکہ تقاضا عدل پورا ہو، اسی طرح احکم الحاکمین اور سب سے زیادہ عادل ذات نے دنیا میں قانون بھیجا، انبیاء بھیجے بعض لوگوں نے اطاعت کی، بعض نے نافرمانی کی، گو دنیا میں بھی کبھی سزا وجزا مل جاتی ہے لیکن بہت کم، یہاں نیک وبد سب ملے جلے ہیں بلکہ بعض اوقات بُرے خوش حال اور نیک پریشان حال رہتے ہیں۔ لہذا ضروری ہوا کہ دنیا کی زندگی کے بعد دوسری زندگی ہو، تاکہ ہر ایک کا حساب ہو اور ہر ایک کو اس کے اعمال کا بدلہ ملے۔ اس لیے روز قیامت کا نام بھی یوم الدین رکھا گیا۔ سُورۃ وَالتّین میں اسی استدلال کی طرف اشارہ ہے " فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحَاكِمِيْنَ (پ۳۰) پھر ان پانچ ایمانیات یعنی ایمان مذکورہ بالا ارکان خمسہ کا ذکر قرآن پاک میں مُتعدّد جگہ آیا ہے۔ مثلاً ارشادِ خداوندی ہے:۔

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ (پ۲) وَفِي مَقَامٍ اٰخَرَ: وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا (پ۵)

قَوْلُهٗ وَتُؤْمِنُ بِالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ ــ مطلب یہ ہے کہ جو کچھ دنیا میں ہو رہا ہے خیر یا شر سب کا ایک اندازہ ہے جو اللہ پاک کے ہاں مُقرّر ومُعیّن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدر کا معنیٰ اندازہ ہے کیونکہ اللہ پاک نے ازل کے اندر ہر چیز کا اندازہ لگا دیا۔ اس اندازے کو تقدیر کہتے ہیں قرآن پاک میں ہے " قَدَّرَ فَهَدٰى "۔

سوال

کہ بقیہ جُملوں کا عامل تو ذکر نہیں کیا یعنی مَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ کے ساتھ تو تُؤْمِنُ عامل نہیں لگا یا صرف تقدیر کے مسئلہ میں عامل متعلّق ذکر کیا۔

جوابِ اوّل

کہ تقدیر کا مسئلہ مزلّۃُ الاقدام مسئلہ ہے بہت سے عُلماء اس میں افراط وتفریط کا شکار ہوئے تو بطور تاکید ذکر فرما کر اشارہ فرمایا کہ کچھ ہوش کے ساتھ قدم رکھنے کی ضرورت ہے۔ مزید تفصیل ان شاء اللہ بابُ الایمان بالقدر میں کی جائیگی۔

جوابِ دوّم صاحب مرقات ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ یہ فرق اس طرف اشارہ ہے کہ پہلی چیزوں میں سے کسی چیز کا انکار کرنا کفر کو مستلزم ہے لیکن تقدیر کا انکار کفر کو مستلزم نہیں۔

قولہٗ فَاَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِحْسَانِ — جبریل امینؑ کا تیسرا سوال احسان کے متعلق ہے۔ شارحینِ حدیث نے احسان کی تشریح بڑی اہمیت سے کی ہے واقعی یہ مستحق اہمیت ہے کیونکہ احسان کا مآل تکمیلِ عبادت ہے یہاں بطورِ اختصار احسان کا لغوی و اصطلاحی معنیٰ بیان کیا جاتا ہے۔

احسان کا لغوی معنیٰ احسان باب افعال کا مصدر ہے اس کا مجرّد حسن ہے اس کا استعمال دو طرح سے ہے (۱) کبھی متعدی بنفسہٖ ہوتا ہے کہا جاتا ہے اَحْسَنْتُ شَیْئًا ای اَتْقَنْتُہٗ یعنی میں نے اس چیز کو مضبوط اور حسن و کمال والا کر دیا (۲) کبھی مُتعدّی بغیرہٖ ہوتا ہے کہا جاتا ہے اَحْسَنْتُ اِلٰی فُلَانٍ ای اَوْصَلْتُ اِلَیْہِ النَّفْعَ میں نے اس پر احسان کیا اور اس تک نفع پہنچایا۔ ظاہر ہے کہ یہاں پہلا معنیٰ مراد ہے یعنی عبادت میں پختگیٔ کمال اور حسن پیدا کرنے کا اہتمام کرنا۔

احسان کا اصطلاحی معنیٰ حدیثِ جبریل امینؑ میں احسان کی جن الفاظ میں تعریف کی گئی ہے عُلماء اور مُحدّثینؒ میں زیادہ تر مشہور دو شرحیں ہیں

اوّل حافظ ابن حجرؒ کی شرح شیخ الاسلام حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری صـ۱۲۰ج۱ میں جو شرح کی ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں دو حالتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اوّل مشاہدہ دوّم مراقبہ ارفع حالت مشاہدہ ہے کہ اس طرح عبادت کرے کہ دل کی آنکھوں سے معبودِ پاک کا مشاہدہ کر رہا ہے یہ دھیان اس قدر غالب ہو کہ گویا ظاہری آنکھوں سے اس کو دیکھ کر عبادت کر رہا ہے۔ اس حالت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

کاَنَّکَ تَرَاہُ : دوسرے درجہ کی حالت مقامِ مراقبہ ہے یعنی دل میں یہ استحضار پورے طور پر رہے کہ حق تعالیٰ اس پر مُطّلع ہیں اس کے ہر عمل کو دیکھ رہے ہیں :

فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ ، سے اشارہ ہے کہ یہ دونوں حالتیں اللہ تعالیٰ کی معرفت اور خشیت کا ثمرہ ہیں۔ چنانچہ حضرت عمارہ بن قعقاعؒ کی روایت کے الفاظ اس کے مؤید ہیں :۔
اَنْ تَخْشَى اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ (كذا فى التعليق)

دوم علامہ نوویؒ کی شرح

(مقتبس من شرح المسلم للنوویؒ ص۲۸ ج۱) فرماتے ہیں کہ یہاں دو مرتبے نہیں ہیں بلکہ ایک ہی بات بیان کرنی مقصود ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عبادت میں آداب، خشوع وخضوع کی رعایت اس انداز سے کرو جیسا کہ اپنے معبود کو دیکھ رہے ہو۔ مثال کے طور پر کوئی درباری خادم جب بادشاہ کے سامنے اس کو دیکھ کر اس کی خدمت کر رہا ہو تو خدمت میں جن آداب وتوجہات کا مظاہرہ کرے گا وہ بالکل ظاہر ہے۔ یونہی جب مولیٰ کریم کو دیکھنے کی حالت میں عبادت کرے گا تو عاجزی انتہائی درجہ کمال تک پہنچ جائے گی۔

سوال

سوال یہ پیدا ہوسکتا ہے کہ دنیا میں حق تعالیٰ کو دیکھنا تو خلاف واقع ہے تو پھر یہ تصوّر کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم اس کو دیکھ کر اس کی عبادت کر رہے ہیں۔

جواب

تو اس کا جواب " فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ " میں ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اگرچہ تو اس کو نہیں دیکھ رہا تب بھی احسانی کیفیت عبادت میں ہونی چاہیے اس لیے کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے تو گویا کہ عبادت کا منشاء تمہارا اس کو دیکھنا نہیں بلکہ اس کا تمہیں دیکھنا ہے اور یہ بات بہرصورت اور بہرحال حاصل ہے تقدیر حدیث یوں ہوگی :۔
" فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاسْتَمِرَّ عَلَى إِحْسَانِ الْعِبَادَةِ فَإِنَّهُ يَرَاكَ "

فائدہ اولیٰ

دنیا میں ظاہری آنکھوں سے رویت باری تعالیٰ کا وقوع نہیں ہوگا اس لیے کلمہ تشبیہ کَاَنَّ استعمال کیا گیا ہے۔ مشاہدہ سے مراد ظاہری آنکھوں سے دیکھنا نہیں ہے بلکہ دل کی نگاہ سے دیکھنا اور اس کا یقین کرنا ہے۔

فائدہ ثانیہ

مُشاہدہ ومُراقبہ کے درجات نفس صحت عبادت کے لیے شرط نہیں بلکہ حُسنِ قبولیّت کے لیے شرط ہیں۔ نفسِ صحّت کے لیے جو شرائط ہیں ان کی رعایت ہی کافی ہے۔

قولہ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ ۔ اس عبارت میں کَاَنَّکَ تَرَاہُ مفعول مطلق محذوف کی صفت ہے۔ دراصل عبارت یوں ہے :۔
اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ عِبَادَۃً شَبِیْھَۃً لِعِبَادَتِکَ حِیْنَ تَرَاہ ؛ اسی طریقہ پر فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ میں تقدیر عبارت یوں ہے :۔
فَاِنْ لَّمْ تُعَامِلْ مُعَامَلَتِکَ حِیْنَ تَرَاہ فعَامِلْ مُعَامَلَتِکَ حِیْنَ یَرَاکَ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ ۔ مزید بحث ہوچکی ہے۔

قولہ فَاَخْبِرْنِیْ عَنِ السَّاعَۃِ : یعنی قیامت کے مُتعلق مجھے بتائیے (کہ کب آئے گی) مُطلق وقوع کا سوال نہیں کیونکہ وہ تو قطعی ہے اور یہ پہلے وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ میں آچکا ہے اس سے وقت قیامت مُراد ہے رمُسند اعظم کے الفاظ یوں ہیں مَتٰی ھِیَ کہ قیامت کا وقوع کب ہے بُخاری شریف کے الفاظ ہیں مَتَی السَّاعَۃ کہ قیامت کب ہے۔ سَاعَۃ کے لُغوی معنی ایک گھڑی کے ہیں اور قیامت کو ساعۃ چار وُجوہ سے کہتے ہیں۔
۱ ۔ اس لیے کہ قیامت کا وقوع صرف ایک گھڑی میں اچانک ہوجائے گا کما فی قولہ تعالیٰ " لَا تَاْتِیْکُمْ اِلَّا بَغْتَۃً "۔ (پ۹)
۲ ۔ قیامت کو ساعۃ سُرعت حساب کی وجہ سے کہا جاتا ہے چنانچہ حضرت علیؓ سے یہی منقول ہے
۳ ۔ اس وجہ سے کہ قیامت کا پورا زمانہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایسا ہے جیسا کہ مخلوق کے نزدیک ایک گھڑی ہے۔
۴ ۔ نیک فالی کی وجہ سے قیامت کا دن ایک گھڑی میں گذر جائے گا۔

قولہ مَا الْمَسْئُوْلُ عَنْھَا بِاَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ : جبریل امینؑ نے چوتھا سوال یہ کیا کہ فَاَخْبِرْنِیْ عَنِ السَّاعَۃِ آپ مجھے قیامت (کی تعیین تاریخ) کے متعلق خبر دیجیے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مَا الْمَسْئُوْلُ عَنْھَا بِاَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ ۔ مَا نافیہ ہے اَلْمَسْئُوْلُ اس کا اسم اور اعلم صیغہ اسم تفضیل اس کی خبر ہے۔ اس پر بَا زائدہ ہے اور تاکید نفی کے لیے ہے اَلْمَسْئُوْلُ پر الف لام بمعنی اَلَّذِیْ ہے مسئول میں ضمیر مُستتر ہے جو اس کا نائب فاعل ہے اور موصول کی طرف راجع ہے اور عَنْھَا کی ضمیر ساعۃ کی طرف

راجع ہے ترجمہ یوں ہوگا " وہ شخص جس سے سوال کیا گیا ہے اس قیامت کے بارہ میں سائل سے زیادہ علم رکھنے والا نہیں " نفسِ علم کی نفی نہیں فرمائی بلکہ اعلمیت کی نفی فرمائی ہے اس لیے کہ وجود ساعت کا جزمی علم دونوں کو ہے لیکن کب آئے گی اس کا علم دونوں کو نہیں تعیین وقت کے نہ جاننے میں دونوں برابر ہیں۔

سوال یہ کہ مقتضیٰ ظاہر یہ تھا کہ لَسْتُ بِاَعْلَمَ بِهَا مِنْكَ فرما دیتے یا مطلقًا لَا اَعْلَمُ کہ دیتے کیونکہ یہ تعبیر زیادہ مختصر ہے اور مطلب میں واضح ہے اتنا لمبا جملہ کیوں ذکر فرمایا؟

جواب اس تعبیر سے عدول کر کے تعبیر مذکور فی الحدیث اختیار کرنے سے مقصد تعمیم کرنا ہے کہ کوئی سائل بن جائے کوئی مسئول بن جائے اس کے نہ جاننے میں سب برابر ہیں اس لیے محدّث عبد الحق دہلویؒ اشعۃ اللمعات ص۲۲ ج ا پر اس کا معنیٰ کرتے ہیں:۔

من و تو ہر دو برابریم در ندانستن آں بلکہ ہر سائل و مسئول ہمیں حال دارد کہ آں را جز خداوند تعالیٰ کسے نداند و وے تعالیٰ ہیچ کس را از ملائکہ و رسل برآں اطلاع ندادہ۔

سوال جب جبریل علیہ السّلام کو پہلے سے علم تھا کہ آپ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم کو قیامت، قیامِ قیامت کے وقت کا علم نہیں پھر کیوں پوچھا

جوابِ اوّل: اس لیے پوچھا کہ لوگوں کے سامنے یہ مسئلہ ظاہر ہو جائے اور آئندہ کے لیے سوال کا دروازہ بند ہو جائے۔

جوابِ دوم: اس بات پر تنبیہ کی کہ جس چیز کا علم نہ ہو اس کے متعلق لَا اَدْرِیْ کہنے میں عار نہ کرنی چاہیے۔

سوال بریلوی فرقہ سوال کرتا ہے کہ مان لیا نہ جاننے میں برابر ہیں مگر نفی علم ذاتی کی ہے عطائی کی نہیں ہے۔

جواب جبریل علیہ السّلام نے پانچ سوال کیے سائل بھی ایک مسئول بھی ایک، مجلس بھی ایک۔ پانچ میں سے چار کا جواب دیا مگر ایک کا جواب نہیں دیا۔ ہم پوچھتے ہیں کہ سائل نے جو حضرت صلّی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلّم سے پانچ سوال کیے تھے تو سائل کا مقصد کیا تھا کہ اپنے ذاتی علم سے بتلاؤ یا عطائی علم سے؟ سوال کس علم کا تھا؟ اگر کہو کہ ذاتی علم کا تھا تو ذاتی علم حضور صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم

کو کچھ بھی نہیں دیا گیا تھا۔ نبی کا ہر علم منجانب اللہ ہوتا ہے بہرحال سوال ہوگا تو عطائی علم کا ہوگا۔ تو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چار چیزوں کا علم عطائی تھا وہ بتلا دیا ایک کا عطائی بھی نہیں تھا اس لیے نہیں بتلایا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت محدث عبدالحق دہلویؒ نے معنیٰ کیا ہے:۔

"ووے تعالیٰ ہیچ کس را از ملائکہ ورسل بر آں اطلاع نداده" (اشعۃ اللمعات ص۴۲ ج۱)

سوال بریلوی حضرات کہتے ہیں کہ یہ عقیدہ کا مسئلہ ہے کہ قیامت کا علم کسی کو نہیں اور عقیدہ قطعی چیزوں سے ثابت ہوتا ہے اور یہ خبر واحد ہے اور خبر واحد ظنی ہوتی ہے۔

جواب کہ یہ حدیث متواتر ہے اگر متواتر نہ بھی تسلیم کرو تو خبر مشہور ہے خبر واحد نہیں ہے اور عقیدہ خبر متواتر اور مشہور دونوں سے ثابت ہو سکتا ہے۔

قولہٗ فاخبرنی عن اماراتها ۔ امارات امارة بالفتح کی جمع ہے بمعنیٰ علامت: حضرت روح القدس کا پانچواں سوال یہ ہے کہ مجھے قیامت کی امارات و علامات ہی بتا دیجئے علامات قیامت دو قسم ہیں:۔

اوّل متّصلہ ۔ وہ علامات جو قیامت کے قریب وقوع پذیر ہوں جیسے خروج دجال، نزول عیسیٰ علیہ السلام، خروج دابۃ الارض ان کو علامات کبریٰ بھی کہتے ہیں۔

دوم منفصلہ ۔ جو ان سے پہلے ہوں ان کو علامات صغریٰ بھی کہتے ہیں ان میں آپ کا وجود مسعود بھی داخل ہے اس لیے کہ آپؐ نے فرمایا کہ میرا وجود بھی قیامت کی ایک نشانی ہے اور عن امارا تہا سے علامات صغریٰ مراد ہیں۔

قولہٗ ان تلد الامة ربتها ۔ حضرت روح القدس کے پانچویں سوال کے جواب میں مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے دو نشانیاں بیان فرمائیں

پہلی نشانی یہ بیان فرمائی کہ "ان تلد الامة ربتها جنے گی لونڈی اپنی مالکہ کو۔ ربتها میں روایت تین طرح ہے۔(۱) ربها (۲) ربتها بالتاء (۳) بعلها: یہاں رب سید اور مالک کے معنیٰ میں ہے، خاوند کے معنیٰ میں بھی مستعمل ہے یہاں دوسرا معنیٰ سید و مالک مراد ہے۔ ربتها میں کئی احتمال ہیں:۔

۱۔ یہ کہ یہ تاء اس بنا پر لائی گئی ہے کہ اس کا موصوف نسمہ یا نفس ہے جو مؤنث ہے اس میں نر

ومادہ (سیّد، سیّدہ) دونوں داخل ہیں۔

۲۔ یہ کہ یہ تا، ربّ بمعنیٰ رَبّ العِبَاد ہے اور ر ب بمعنیٰ مالک وسیّد میں فرق کرنے کے لیے ہے۔ اضافت کے بعد اگرچہ رب کا اطلاق غیر اللہ پر جائز ہے تاہم تا، لانے کے بعد التباس کی جڑ کٹ گئی ہے۔

۳۔ تیسرے یہ کہ تا، اپنے اصلی معنیٰ میں ہے اس سے مراد جنی ہوئی بنت ہے جو سیّدہ و مالکہ کی طرح رہے گی اس میں مُبالغہ ہوگا کہ جب مؤنث (بچیوں) کا یہ حال ہوگا تو مذکر (بچے) جو عام طور پر آزاد ہوتے ہیں ان کا کیا حال ہوگا۔ اس علامت کی تشریح شارحین نے مختلف انداز سے بیان کی ہے۔ یہاں صرف وہی دونوں مطلب پیش کرنے پر اکتفا کیا جا رہا ہے جو اسہل و اقرب الی الصواب خیال کیے جاتے ہیں۔

مطلب اوّل یہ جملہ کثرت عُقوقِ والدین سے کنایہ ہے یعنی اولاد ماں باپ پر یوں حکم چلائے گی جیسے مالک مملوک پر چلاتا ہے حتیٰ کہ لڑکی جس کو ماں کے ساتھ ایک خاص محبت ہوتی ہے وہ بھی ماں کو اپنی نوکرانی کے درجہ میں سمجھے گی جیسا کہ آج کل عام طور پر گھروں میں مشاہدہ کیا جا رہا ہے۔ لڑکوں کا حال خود سمجھ لیں۔

مطلب دوم یہ کنایہ ہے انقلابِ دھر اور انعکاسِ احوال سے یعنی بڑے چھوٹے سمجھے جائیں گے اعالی اسافل بن جائیں گے اور اسافل اعالی ہو جائیں گے۔ اصول، فروع، اور فروع، اصول، حاکم، محکوم، محکوم، حاکم۔ حالات میں عجب پلٹا آئے گا، ہر طرف قلب موضوع کی صورتیں نظر آئیں گی۔ اس میں یہ بھی داخل ہے کہ ہر کام نااہلوں کے سپرد ہوگا، اہل لوگ مناصب سے محروم ہوتے رہیں گے۔

صحیح بخاری شریف کتابُ العلم کی حدیث مرفوع میں اسی طرف اشارہ ہے "اِذَا وُسِّدَ الْاَمْرُ اِلٰی غَیْرِ اَھْلِہٖ فَانْتَظِرِ السَّاعَۃَ"، جب کام نااہلوں کے سپرد کیے جانے لگیں تو قیامت کے منتظر رہو اس لیے کہ قیامت تخریب اکبر کا نام ہے۔ قال الحافظ شیرازی: ؎

این چہ شوریست کہ در دورِ قمری می بینم ۔۔۔ پسران را سر بسر خلافتِ پدری می بینم
اسپ تازی شدہ زیر پالاں مجروح ۔۔۔ طوق زریں ہمہ در گردن خری می بینم

یقول ابوالاسعاد : معاشرہ میں جنسی بے راہ روی کا عام ہوجانا مراد ہے۔ یعنی مردوزن انسانی پابندیوں کو توڑ ڈالیں گے اور ان سے ایسے بچے بکثرت پیدا ہوں گے جن کو اپنے والدین کی خبر نہیں ہوگی، پھر وہی بچے بڑے ہوکر لاعلمی میں اپنی انہی ماؤں کو ملازم ونوکرانی بنائیں گے جنہوں نے ان کو جنا تھا تو سمجھ لو کہ قیامت قریب آگئی ہے۔

قَوْلُہٗ وَاِنْ تَرَى الْحُفَاةَ الْعُرَاةَ الْعَالَةَ رُعَاءَ الشَّاءِ يَتَطَاوَلُوْنَ فِي الْبُنْيَانِ : یہاں دوسری نشانی بیان فرمائے ہیں۔ حُفَاۃ : حَافِیْ کی جمع ننگے پاؤں والے یعنی جس کی جوتی نہ ہو۔ العُراۃ : عَارِیْ کی جمع ہے یعنی ننگے بدن والے۔ ان کے بدن کا بعض ایسا حصہ بھی ننگا ہے جس پر کپڑا ہونا چاہیے تھا۔ عالۃ : عَائِل کی جمع ہے یعنی مفلس لوگ۔ رُعَاء : رَاعِیْ کی جمع ہے یعنی بکریوں کے چرواہے۔ مگر بخاری شریف میں ہے رعاۃ الابل البھم کالے اونٹوں کے چرواہے جو سرخ اونٹوں کے مقابلہ میں خسیس سمجھے جاتے ہیں۔ الشاء اسم جنس یا جمع ہے شاۃ کی یعنی بکریوں کے چرانے والے یتطاولون مضارع ہے تطاول سے یعنی فخر کرنا۔ الحفاۃ العُراۃ العالۃ رُعاء الشَّاۃِ : ترٰی مفعول اوّل ہے اور یتطَاولون مفعول ثانی ہے اگر یہ رؤیت قلبیہ ہے اور اگر یہ رؤیت بصریہ ہے تو یہ حال ہوگا۔

الحاصل : یہ کہ بھوکے ننگے بکریوں کے چرانے والے ارذال واسافل جب اونچے اونچے محلوں میں فخر کررہے ہوں گے اور کم ظرفی کی بناء پر اسی کو اپنا مقصود زندگی سمجھ رہے ہوں گے تو سمجھنا کہ قیامت قریب ہے اس کا مآل بھی وہی نکلتا ہے جو پہلے جملہ کا حاصل تھا۔ فَلْیَنْتَظِرِ السَّاعَۃَ -!

یقول ابوالاسعاد : بطور ظرافت طبع جملہ مذکورہ کا بہترین معنیٰ مُحدِّث عبدالحق دہلویؒ نے اشعۃ اللمعات میں فرمایا ہے ص۲۲ج۱ میں فرماتے ہیں :۔

اے مخاطب برہنہ پایان برہنہ تناں فقراء چرانندگان گوسفندان۔

قولہ فَلَبِثْتُ مَلِيًّا بفتح المیم وتشدید الیاء من الملاوۃ ای زمانا طویلا کما فی قولہ تعالیٰ فی قصۃ سیدنا ابراھیم

عَلَيْهِ السَّلَامُ: پ١٦ مریم " يَا إِبْرَاهِيمُ لَئِنْ لَمْ تَنْتَهِ لَأَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِي مَلِيًّا : قاله السيوطی دَهْرًا طَوِيلًا

سوال ابوداؤد شریف ص۲۹۷ ج ۲ کتاب الادب باب فی القدر اور نسائی شریف کی روایت میں اس کی تعیین موجود ہے کہ تین دن کے بعد حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کو فرمایا کہ یہ سائل جبریل امینؑ تھے :۔

قَالَ ثُمَّ انْطَلَقَ فَلَبِثْتُ ثَلَاثًا ثُمَّ قَالَ يَا عُمَرُ هَلْ تَدْرِي مَنِ السَّائِلُ قُلْتُ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ قَالَ فَإِنَّهُ جِبْرِيلُ أَتَاكُمْ يُعَلِّمُكُمْ دِينَكُمْ ؛

اور یہ مخالف ہے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کے کہ آپ نے اسی مجلس میں فرما دیا تھا (کما فی التعلیق)

جواب یہ ہے کہ حضرت جبریل علیہ السّلام کے سوال و جواب کے بعد حضرت عمرؓ اپنے کسی ضروری امر کے لیے مجلس سے چلے گئے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے حاضرین مجلس کے سامنے بتلا دیا کہ یہ جبریل امینؑ تھے۔ پھر تین دن کے بعد حضرت عمرؓ تشریف لائے تو ان سے پھر مستقل طور پر فرمایا :۔

فَإِنَّهُ جِبْرِيلُ أَتَاكُمْ يُعَلِّمُكُمْ دِينَكُمْ فَلَا اخْتِلَافَ وَلَا تَعَارُضَ

قَوْلُهُ اَللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ : اللہ اور اس کے رسول ہی بہتر جانتے ہیں

سوال بعض مبتدعین اس سے استدلال کرتے ہیں کہ علم باری تعالیٰ اور علم رسولؐ دونوں مساوی ہیں تو اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا علم غیب کلی ثابت ہوا۔

جواب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سوال جبریلؑ کی معرفت کے متعلق تھا لہٰذا جواب بھی جبریلؑ کی معرفت ہی کے متعلق ہے۔ تو اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے علم جزئی ثابت ہوا نہ کہ علم کلی۔ نیز اللہ تعالیٰ کا علم غیر متناہی اور رسولؐ کا علم متناہی ہے پھر دونوں کے علم میں مساوات کس طرح ہو سکتی ہے۔

قَوْلُهُ يُعَلِّمُكُمْ دِينَكُمْ ؛ اس سے دین کے قواعد کلیہ مراد ہیں۔

سوال ۔ تعلیم دین کی نسبت جبریل علیہ السلام کی طرف کی گئی ہے حالانکہ حقیقی مُعلِّم تو نبیٔ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم ہیں یُعَلِّمُکُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَۃَ :

جواب اوّل ۔ تعلیم دین کی نسبت جبریل علیہ السّلام کی طرف مجازاً بوجہ سبب ہونے کے کر دی گئی کیونکہ ان کا سوال دین کے سکھلانے کا سبب ہوا تھا اس لیے فرمایا یُعَلِّمُکُمْ دِیْنَکُمْ

جواب دوم ۔ حُسْنُ السّوال نِصفُ العِلم کے اعتبار سے یُعَلِّمُ کی نسبت جبریل علیہ السّلام کی طرف کی ہے جیساکہ مشہور ہے اَلسُّوَالُ نِصْفُ الْعِلْمِ :

یَقُوْلُ شَیْخ جَاجَرْوِیْ رحمہ القوِیّ : نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ان چاروں سوالوں کو دین فرمایا یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ اگر ان میں سے کوئی کسی ایک کو نہیں مانتا تو وہ مؤمن نہیں بلکہ بے دین ہے ۔

قولہٗ اَلصُّمُّ الْبُکْمُ ۔ الصُّمُّ اَیْ عَنْ قَبُوْلِ الْحَقِّ الْبُکْمُ اَیْ عَنِ النَّاطِقِ بِالصِّدْقِ : بعض شراح نے اس کو بے وقوفی سے کنایہ بنایا ہے اور عند البعض کنایہ ہے بے دینی سے یعنی دین سمجھنے اور سننے سے قاصر ہوں گے ۔

سوال | فرقہ بریلویہ ضالّہ مضلّہ کہتا ہے کہ یہ حدیث جس میں نفی علم قیامت ہے منسوخ ہے ۔ لہٰذا منسوخ سے عدمِ علم پر کیسے دلیل پکڑی جاسکتی ہے ؟

جواب اوّل | دعویٰ منسوخیت دو وجوہ سے باطل ہے ۔ اوّلاً : ہر منسوخ کے لیے ناسخ کا ہونا شرط ہے ۔ یہاں کون سی روایت ہے جو ناسخ کا درجہ رکھتی ہے اور جس میں صراحۃً شارع علیہ السّلام کا فرمان ہو کہ مجھے علمِ قیامت کلّی طور پر عطا کیا گیا ہے ۔ ثانیاً قرآن مقدس ان کے دعویٰ منسوخیت کی تردید کرتا ہے جیساکہ شارع علیہ السلام نے بطور استشہاد آیت مبارک تلاوت فرمائی "اِنَّ اللّٰہَ عِنْدَہٗ عِلْمُ السَّاعَۃِ"

جواب دوم | اس میں اتفاق ہے کہ آمد سائل کا واقعہ حجۃ الوداع سے چند دن پہلے وقوع پذیر ہوا اور اس میں بھی اتفاق ہے کہ حجۃ الوداع کے بعد تکمیل دین ہوئی ۔ اور اس کے بعد وحی کا سلسلہ بند ہوا ۔ جب سلسلہ وحی ختم ہو گیا تو نسخ کا قول کرنا کیسے درست ہو سکتا ہے ۔ چنانچہ حضرت عمرؓ ہی کی روایت ہے :۔

اِنَّ رَجُلًا جَآءَ فِیْ اٰخِرِ عُمُرِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ : اس کے متعلق علامہ بدر الدین عینیؒ عمدۃ القاری میں فرماتے ہیں :۔

ھٰذَا یَدُلُّ عَلٰی اَنَّہٗ اِنَّمَا جَآءَ بَعْدَ اِنْزَالِ جَمِیْعِ الْاَحْکَامِ لِتَقْرِیْرِ اُمُوْرِ الدِّیْنِ الخ یعنی دین کے جمیع احکام کی تکمیل کے بعد تشریف لائے ۔ مقصد امور تعلیم کو پختہ کرنا تھا تو اب نسخ کیسے ہو سکتا ہے ۔ کما قالہٗ حافظ ابن حجرؒ :۔

اِنَّمَا جَآءَ بَعْدَ اِنْزَالِ جَمِیْعِ الْاَحْکَامِ :

قَوْلُہٗ فِیْ خَمْسٍ : اس کا مُبتدا محذوف ہے اور تقدیر عبارت یوں ہے کہ "عِلْمُ قِیَامِ السَّاعَۃِ دَاخِلٌ فِیْ خَمْسٍ قَوْلُہٗ ثُمَّ قَرَأَ " اِنَّ اللّٰہَ عِنْدَہٗ عِلْمُ السَّاعَۃِ وَیُنَزِّلُ الْغَیْثَ وَیَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَکْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌۢ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ط (لقمان پ ۲۱)

اِستشہاد بالآیت

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں یہ بھی ہے کہ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مضمون سابق کی تائید و استشہاد کے طور پر سورۃ لقمان کی آخری آیت تلاوت فرمائی ۔ قرأ کی ضمیر کا مرجع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جیساکہ صحیح بخاری شریف صـ۱۲ ج ۱ پر صراحۃً یہ الفاظ ہیں " ثُمَّ تَلَا النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ الخ " اس سے قبل حدیث میں تعیین ساعۃ کے علم کی نفی غیر اللہ سے کی گئی ہے " اِنَّ اللّٰہَ عِنْدَہٗ عِلْمُ السَّاعَۃِ میں اس کی تائید ہے عندہٗ خبر مقدم ہے عِلْمُ السَّاعَۃِ مُبتداء مؤخر ہے جملہ بن کر اِنَّ کی خبر ہے تقدیم خبر اس مقام میں افادۂ حصر کے لیے ہے جیساکہ مفسرین حضرات نے تصریح فرمائی ہے ترجمہ یہ ہوگا کہ یقیناً قیامت کا علم اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے اس سے ثابت ہوا کہ احاطہ علمی صرف حق تعالیٰ کی شان ہے ۔

یقول شیخ جاجروی رحمہ القوی : آیۃ مبارکہ میں پانچ چیزوں کا ذکر فرمایا گیا ہے مگر مقصود حصر نہیں غالباً چونکہ سوال ان ہی پانچ چیزوں کے متعلق تھا اس لیے آیت میں انہی پانچ چیزوں کا ذکر کیا گیا ۔ یعنی اکوان غیبیہ کا علم کلّی و تفصیلی اور محیط اللہ رب العزت کے ساتھ مخصوص ہے اگر کسی کو ان کا کچھ علم ہو جائے تو وہ ایک علم جزئی اور ناتمام ہے جس کو خدا تعم

خدا تعالیٰ کے علم محیط کے ساتھ کوئی نسبت نہیں ۔مثلاً شاہ منصور خلیفہ عباسی نے ملک الموت کو خواب میں دیکھا تو پوچھا کہ میری عمر کتنی ہے تو ملک الموت نے پانچ انگلیوں سے اشارہ کیا۔ معبرین سے اس کی تعبیر پوچھی کسی نے پانچ برس اور کسی نے پانچ ماہ اور کسی نے پانچ دن سے اس کی تعبیر دی۔ لیکن امامِ اعظمؒ نے اس کی تعبیر یہ دی کہ اس اشارہ سے آیت مذکورہ کی طرف اشارہ ہے اِنَّ اللّٰہَ عِنْدَہٗ عِلْمُ السَّاعَۃِ الخ کہ ان پانچ چیزوں کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں۔

یقول ابو الاسعاد صانہ اللہ عن الشر والفساد : حدیث مذکورہ جوکہ ام الاحکام ہے اور اُم السنۃ کا درجہ رکھتی ہے اس سے فوائد کثیرہ کا استنباط ہوتا ہے چند بطور مشت از خروارے پیش خدمت ہیں :۔

فوائدِ مُستنبطہ

① طالب علم کو صاف ستھرا رہنا چاہیے۔ بدلیل لا یُرٰی عَلَیْہِ اَثَرُ السَّفَرِ :

② اپنے استاذ و شیخ کے سامنے باادب بیٹھنا چاہیئے بدلیل ووضع کفیہ :۔

③ جہاں تک ہو سکے شیخ کے قریب بیٹھنے کی کوشش کی جائے بدلیل حتّٰی جَلَسَ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ :

④ سفید لباس سب سے عمدہ ہے بالخصوص دینی طالب علم کے لیے : بدلیل رَجُلٌ شَدِیْدُ البیاض :

⑤ تحصیل علم کا اصلی وقت جوانی کا زمانہ ہے بدلیل شَدِیْدُ سَوَادِ الشَّعْرِ :

⑥ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آخر حیات تک بھی علم غیب کلّی و محیط حاصل نہ تھا : بدلیل :۔ مَا الْمَسْئُوْلُ عَنْھَا بِاَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ :

⑦ ملائکہ پر ایمان لانا فرض ہے : بدلیل اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ :

⑧ عبادات میں صرف صورت پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ ان میں احسانی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی جائے بدلیل : اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ :

⑨ طریقت کوئی الگ چیز نہیں بلکہ یہ شریعت کی روح ہے وغیر ذالک۔

وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بُنِيَ الْاِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ شَهَادَةُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ

ترجمہ : حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسلام کی عمارت پانچ چیزوں پر اٹھائی گئی ہے۔ (۱) اس بات کی گواہی دیناکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے بندے اور رسول ہیں

قولہ خَمْسٌ ۔ خمسٌ عدد مُمیّز کی تمیز محذوف ہے خواہ دعائم ہو : چنانچہ بعض روایات میں صراحۃً یہ لفظ ہے یا خصال یا قواعد مانا جائے سب صحیح ہیں۔ مسلم شریف میں خَمْسَةٌ بالتانیث ہے تو اس وقت اشیاء یا ارکان یا اصول ماننا بہتر ہے لیکن عند المحققین معدود غیر مذکور کی صورت میں عدد کی تذکیر و تانیث میں اختیار ہے۔

فائدہ شَهَادَةُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ الخ معطوف علیہ ہے اور اَقَامُ الصَّلٰوةِ، اِيْتَاءُ الزَّكٰوةِ الحجّ، صَوْمُ رَمَضَانَ یہ لفظ شهادة سے معطوف ہیں۔ اور اس کے چار معطوفات کے اعراب میں تین احتمال ہیں : (۱) خَمْسٍ سے بدل ہونے کی بنا پر ان پر جر ہے۔ (۲) مُبتداء محذوف کی خبر ہونے کی بنا پر ان پر رفع ہے اور وہ مُبتداء محذوف ہی ہے یہ سب مل کر اس کی خبر ہیں، یا ہر ایک کا الگ الگ محذوف ہے۔ اَحَدُهَا شَهَادَةُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ الخ ۔ ثانیها اَقَامُ الصَّلٰوةِ : علیٰ هٰذا القیاس ۔ (۳) سب پر نصب ہے بتقدیر اَعْنِیْ۔

قولہ اَقَامُ الصَّلٰوةِ : اَقَامُ باب افعال کا مصدر ہے اس میں واؤ محذوف کے عوض آخر میں تاء لائی جاتی ہے مگر یہاں طول عبارت کی وجہ سے اس کو حذف کر دیا کیونکہ مضاف الیہ واؤ محذوف کا عوض بننے کے لیے کافی ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ تاء کا حذف تخفیف کی بناء پر ہو۔

مطلب حدیث اس حدیث میں اسلام کو ایک خیمہ کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جو درمیان میں کھڑے ہونے والے ستون (قطب) اور چاروں طرف

چار طنابے پر قائم ہوتا ہے۔ جب تک وہ درمیانہ ستون نہ ہو تو خیمہ قائم ہی نہیں ہو سکتا۔ اور بقیہ چار طنابے اس کے معاون ہیں اگر وہ نہ ہوں تو خیمہ تو ہوگا مگر ناقص ہوگا اور کسی وقت خیمہ گرنے کا اندیشہ ہے، اسی طرح عمارت اسلام ان پانچ چیزوں سے مکمل ہوتی ہے ان میں کلمۂ توحید بمنزلہ مرکز (قطب) کے ہے اگر وہ نہیں تو اسلام کا وجود ہی نہیں رہتا۔ اور بقیہ ارکان بمنزلہ طنابے کے ہیں اگر ان میں سے ایک نہ ہو تو اسلام میں نقصان ہوگا۔

سوال ۔ اسلام کو خیمہ کے ساتھ کیوں تشبیہ دی جارہی ہے ؟

جواب ۔ اس کی دو وجوہ ہیں

وجہ اول اسلام کو خیمہ کے ساتھ اس لیے تشبیہ دی کہ جس طرح انسان خیمہ کے اندر داخل ہونے سے ہر قسم کے داخلی وخارجی دشمنوں کے حملہ سے محفوظ ہوجاتا ہے۔ نیز گرمی وسردی سے بھی محفوظ ہوجاتا ہے اسی طرح انسان جب کامل اسلام کے اندر داخل ہوجاتا ہے تو داخلی دشمن (نفس امارہ) اور خارجی دشمن (شیطان) کے حملہ سے محفوظ ہوجاتا ہے۔ نیز دوزخ کے طبقہ ناریہ اور طبقہ زمہریر سے محفوظ ہوجائے گا۔

وجہ دوم دوسری وجہ یہ ہے کہ کسی چیز کے اجزاء دو قسم کے ہوتے ہیں (۱) یہ کہ جو تقویم کی حیثیت رکھتے ہیں اگر یہ نہ ہوں تو وہ چیز وجود میں نہیں آسکتی۔ (۲) دوسرے وہ جو تکمیل کی حیثیت رکھتے ہیں کہ اگر وہ نہ ہوں تو وہ چیز وجود میں تو آجائیگی مگر ناقص ہوگی۔ تو یہاں کلمۂ توحید اسلام کے اجزاء مقومہ ہیں اور بقیہ اجزائے مکملہ ہیں۔

سوال ۔ یہ ہے کہ شہادت وحدانیت اور شہادت رسالت دو مستقل چیزیں ہیں لہذا بنیادی ارکان اسلام چھ ہوئے نہ کہ پانچ جب کہ حدیث پاک میں خمسٍ ہے۔

جواب ۔ شہادت وحدانیت بغیر شہادت رسالت معتبر نہیں ولہذا شہادتین بوجہ تلازم کے گویا دونوں ایک ہیں (کما فی اتصال لازم والملزوم)

سوال ۔ علی خمسٍ کہ کر پانچ میں حصر کیوں کیا حالانکہ جہاد بھی اسلام کا بنیادی رکن ہے۔

جواب ۔ جہاد تو فرض کفایہ ہے ہاں بعض وقت فرض عین بھی ہوجاتا ہے یعنی ہر وقت تو فرض نہیں ہے وہ ایک وقتی فرض ہے لہذا وہ اسلام کے بنیادی چیزوں میں داخل نہیں لانّ

اَلْکَلَامُ فِی فُرُوْضِ الْعَیْنِ الَّتِیْ ھِیَ اَعْظَمُ شَعَائِرِ الْاِسْلَامِ (مرقات)

سوال حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ "بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ" تو اسلام مبنیٰ ہوا اور امورِ خمسہ مبنیٰ علیہ ہوئے۔ اور قانون ہے کہ مبنیٰ اور مبنیٰ علیہ ایک دوسرے کے غیر ہوتے ہیں یعنی مبنیٰ اور مبنیٰ علیہ کے مابین تغایر ہونا چاہیے کیونکہ یہاں پر مبنیٰ (اسلام) اور مبنیٰ علیہ (امورِ خمسہ) تو متحد ہیں۔

جوابِ اوّل یہ ہے کہ عَلٰی خَمْسٍ میں عَلٰی بمعنیٰ عَنْ ہے یعنی اسلام کی بنیاد ان پانچ چیزوں سے رکھی گئی ہے۔ فَلَا اِشْکَالَ عَلَیْہِ (ھٰکذا قالہ الکرمانی)

جوابِ دوم مختصراً عرض ہے کہ مبنیٰ (اسلام) کی جانب میں اجمال اور مبنیٰ علیہ (امورِ خمسہ) کی جانب میں تفصیل ملحوظ ہے اسی لیے فرمایا بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ:

سوال عند الاحناف ایمان بسیط ہے (صرف تصدیقِ قلبی کا نام ہے) حالانکہ حدیث مذکورہ میں ہے کہ بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ کہ اسلام ان پانچ چیزوں سے مرکّب ہے تو معلوم ہوا کہ ایمان مرکّب ہے لَا بَسِیْطٌ۔

جواب۔ ایمان کے دو درجہ ہیں (۱) نفسِ تصدیق یہ بسیط ہے۔ (۲) ایمانِ کامل یہ بدستور مرکّب ہے۔

اسمائے رِجال

حالات حضرت عبداللہ بن عُمر رضی اللہ عنہ

آپ اسلام کے دوسرے خلیفۂ راشد حضرت عمرؓ کے صاحبزادے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی ہیں آپ کی پیدائش سالِ نبوت سے ایک سال پہلے مکہ معظمہ میں ہوئی تھی۔ آپ نے بچپن ہی میں اپنے والد کے ساتھ اسلام قبول کر لیا تھا۔ جنگِ بدر میں صغرِ سنی کی وجہ سے شریک نہ ہوئے۔

غزوۂ خندق اور اس کے بعد تمام غزوات میں بالاتفاق شریک ہوئے۔ ۷۳ھ میں بعمر ۸۲ سال وفات پائی۔ آپ سے ۱۶۳۰ احادیث مروی ہیں۔ آپ سے بے شمار راویوں نے حدیث روایت کی ہے۔ آپ کے صاحبزادے حضرت سالمؒ اور آپ کے آزاد کردہ غلام نافعؒ سرفہرست ہیں۔

وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْاِیْمَانُ بِضْعٌ وَّسَبْعُوْنَ شُعْبَةً

ترجمہ : حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا ایمان کی شاخیں ستّر سے کچھ اوپر ہیں۔

لفظ ابُوہُریرہ کی نحوی تحقیق قیاس کا تقاضا تو یہ تھا کہ ھُریرۃ کی تا پر اضافت کی وجہ سے جَر پڑھی جائے چنانچہ ایک صاحب نے اسی کو ثواب بتایا ہے لیکن جمہور محدثین وغیرہم کے نزدیک مشہور مذہب منع صَرف کا ہے کیونکہ اس میں علمیت اور ترکیب ہے اور اب یہ بمنزلہ کلمہ واحدہ کے ہے۔ بہرحال ابوھریرہ میں دو مختلف حیثیات سے اصل حالت اور موجودہ حالت دونوں کی رعایت ہے، اصل حالت کے اعتبار سے اَبُو کا اعراب بدلتا رہتا ہے اور موجودہ حالت کے لحاظ سے ھُریرۃ کی تا پر جَر نہیں آتی۔

کُنیّت کی وجہ تسمیہ علامہ ابن عبدالبرؒ نقل فرماتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ نے خود فرمایا " کُنْتُ اَحْمِلُ یَوْمًا هِرَّةً فِیْ کُمِّیْ فَرَاٰنِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ مَا هٰذِہٖ فَقُلْتُ هِرَّةٌ فَقَالَ یَا اَبَا هُرَیْرَةَ رضؓ۔ بعض عُلماء نے کہا کہ آپ بچپن میں بلّی سے کھیلا کرتے تھے، اور بعض نے کہا کہ آپ بلّی کی تربیت اور دیکھ بھال کرتے تھے۔ (مرقات ص۶۹ ج۱)

قولہ بِضْعٌ ۔ (بکسر الباء وقد تفتح) کسی چیز کے ٹکڑے کو کہتے ہیں۔ اعداد میں راجح قول کے مطابق اس کا اطلاق تین سے نو تک آتا ہے کیونکہ وہ بھی عدد کا ایک ٹکڑا ہے۔ شعبہ کے اصل معنی درخت کی شاخ اور ہر چیز کی فرع کے ہیں لیکن مراد یہاں خصائل حمیدہ ہیں۔

حاصل حدیث : اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان کو ایسے درخت

کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو برگ وبار والا ہو۔ اگر اس کی شاخیں اور پتے سرسبز وشاداب ہوں تو درخت بارونق بھی ہوگا اور اس سے متعلقہ فوائد ومنافع بھی حاصل کیے جاسکیں گے اور اگر اس کی شاخیں اور پتے خشک ہوجائیں تو جب تک جڑ خشک نہیں ہوجاتی یہ درخت تو ہے لیکن بے رونق ہوگا۔ اسی طرح بہت سے اعمال واخلاق ایسے ہیں جو شجرہ ایمان کے لیے برگ وبار کی حیثیت رکھتے ہیں اگر وہ صحیح ہوں تو ایمان کا درخت بھی بارونق اور شاداب ہوگا۔ اور اگر وہ صحیح نہ ہوں تو جب تک تصدیق قلبی موجود ہے نفسِ ایمان تو موجود رہے گا لیکن بے رونق ہوگا۔ اس پر وہ ثمرات مرتب نہیں ہوں گے جو کامل ایمان پر ہونے چاہییں۔

سوال : بعض روایات میں سَبْعُوْنَ کے بجائے سِتُّوْنَ ہے (کما فی البخاری) اور بعض میں شک کے ساتھ سَبْعُوْنَ یا سِتُّوْنَ آیا ہے۔

جواب اوّل ۔ عدد سے تحدید مراد نہیں بلکہ تکثیر مراد ہے جو ساٹھ اور ستّر دونوں کو شامل ہے۔

جواب دوم ۔ عدد قلیل عدد کثیر کے منافی نہیں ہے کیونکہ وہ کثیر کے ضمن میں آجاتا ہے۔ پھر قلیل کی خصوصیت ذکری مقتضیٰ حال کی وجہ سے ہے۔

جواب سوم ۔ تعارض تب ہوتا ہے جب کہ ایک ہی وقت میں دونوں باتیں فرمائی ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ پہلے آپ کو وحی کے ذریعہ ساٹھ سے کچھ اوپر شعبوں کا علم ہوا ہو۔ اس وقت آپ نے ان ہی کا تذکرہ فرمادیا ہو بعد میں وحی سے دس اور معلوم ہوگئے ہوں، دوسری مجلس میں ان کا تذکرہ فرمادیا ہو۔ یقال لہٗ تنزیل وحی :-

قولہٗ فَاَفْضَلُھَا ۔ فَاَفْضَلُھَا کی فاء کو فاء تفصیلیہ کہا جائے گا یا فاء جزائیہ ہے تقدیر عبارت یوں ہے " اذا کان کمال الایمان ذا شُعَبٍ فَاَفْضَلُھَا ۔

قولہٗ وَاَدْنَاہُ اِمَاطَۃُ الْاَذٰی عَنِ الطَّرِیْقِ (اور ایمان کا سب سے ادنیٰ درجہ تکلیف دہ چیز کا راستہ سے ہٹانا ہے) ادنیٰ دو معنوں میں مستعمل ہے :۔

۱۔ بحیثیت مرتبہ کم تر ہونا۔ ۲۔ باعتبار حصول کے آسان ہونا۔

قولہٗ اِمَاطَۃ ۔ اماطۃ بمعنیٰ ازالہ کے ہے " کَمَا قَالَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ قِصَّۃِ الْعَقِیْقَۃِ اَمِیْطُوْا عَنْہُ الْاَذٰی (ابوداؤد شریف ص ۳۶ ج ۲ باب العقیقہ)

قولہ اَذیٰ ۔ اذیٰ یا تو مصدر بمعنی اسم فاعل ہے یا مبالغۃً وصف مصدر کا ذات پر حمل کیا گیا ہے اور اس سے مراد موذی چیز ہے ۔ مثلاً کانٹا، پتھر وغیرہ، نجاست، چھلکا

فائدہ اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اجمالاً ستّر سے اوپر ایمانی شاخوں کا تذکرہ فرمایا ہے اگر ان سب کی تفصیل کرتے تو تطویل کا باعث ہوتا۔ اس لیے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم نے انتہائی جامعیت اور اختصار کے ساتھ یہاں سب شعبوں کی طرف اشارہ فرما دیا۔ محدّثین عظام نے ان شعبوں کو مختلف قسموں میں تقسیم کیا ہے ۔

تقسیم اوّل ایمانی شعبے دو قسم ہو سکتے ہیں ۔ قولی، فعلی ۔ قولی شعبوں میں سے قول لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا ذکر کر دیا، اور فعلی میں سے اِمَاطَۃُ الْاَذٰی عَنِ الطَّرِیْقِ کا ذکر فرمایا ۔ مطلب یہ ہوا کہ ایمان کی سرسبزی کے لیے تمہارے افعال بھی صحیح ہونے چاہئیں ۔ اور اقوال بھی ۔

تقسیم دوم ایمانی شعبے دو قسم کے ہو سکتے ہیں ۔ فعلی ۔ ترکی ۔ فعلیات میں سے قول لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا ذکر کر دیا اور ترکیات میں سے اِمَاطَۃُ الاذیٰ عَنِ الطَّرِیْقِ کا ۔ خلاصہ یہ ہوا کہ ایمان کامل کرنے کے لیے اپنے افعال بھی شریعت کے مطابق بنانا ہوں گے اور تروک بھی

تقسیم سوم ایمانی شعبے دو قسم کے ہیں ۔ بعض وہ شعبے جو حقوق اللہ کے قبیل سے ہیں اور بعض وہ ہیں جن کا تعلق حقوق العباد سے ہے ۔ پہلی قسم کے شعبوں میں سے قول لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا ذکر کر دیا ۔ یہی سب سے پہلا اور اہم حق اللہ ہے ۔ اور حقوق العباد میں سے اِمَاطَۃُ الْاَذٰی عَنِ الطَّرِیْقِ کا ذکر کر دیا ۔ جب دوسروں کی رکھی ہوئی تکلیف دہ چیزیں دور کرے گا تو خود کیسے کسی کو تکلیف پہنچائے گا ۔

قولہٗ وَالْحَیَاءُ شُعْبَۃٌ مِّنَ الْاِیْمَانِ : حیاء کے دو معنی ہیں

لُغوی معنیٰ حیاء کا لغوی معنیٰ ہے تغیر و انکساری یَعْتَرِی الْاِنْسَانُ مِنْ خَوْفٍ مَا یُعَابُ بِہٖ ۔ یعنی وہ تغیر و انکساری جو بخوف عیب و ملامت انسان کو پیش آئے ۔

شرعی معنیٰ ۔ حیاء کا شرعی معنیٰ ہے" خلق یَبْعَثُ الْاِنْسَانَ عَلٰی اِجْتِنَابِ الْقَبِیْحِ وَیَمْنَعُ مِنَ التَّقْصِیْرِ فِیْ حَقِّ ذِی الْحَقِّ" یعنی وہ ملکہ جو حرکات قبیحہ سے بچنے پر انسان کو برانگیختہ کرتا اور صاحبِ حق کے حق میں کوتاہی کرنے سے روکتا ہے۔

قولہٗ شُعْبَۃٌ : شُعْبَۃٌ میں تنوین تعظیم کی ہے یعنی حیاء ایمان کا ایک بہت بڑا شعبہ ہے۔ بڑا اس لیے کہا گیا کہ یہ خود بھی ایمان کا ایک مستقل شعبہ ہے اور دوسرے شعبوں کو پورا کرنے کے لیے محرک بھی۔ حیاء جتنا زور دار ہوگا اتنا ہی دوسرے شعبوں کی ادائیگی زیادہ بہتر طریقہ سے ہوگی۔

سوال ۔ کہ بِضْعٌ وَّ سَبْعُوْنَ شُعْبَۃً میں حیاء بھی داخل ہے تو اسے مستقل طور پر کیوں ذکر فرمایا۔

جواب یہ تخصیص ذکری اہتمام شان کے لیے ہے یعنی کل شعب ایمانیہ کے لیے داعی ومنبع ہے اور تمام معاصی سے اجتناب کا ذریعہ ہے یہی وجہ ہے کہ قلتِ حیاء سے معاصی پر جرأت ہوتی ہے۔

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِمَّا اَدْرَکَ النَّاسُ مِنْ کَلَامِ النُّبُوَّۃِ الْاُوْلٰی اِذَا لَمْ تَسْتَحْیِ فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ (رواہ البخاری)

فارسی میں اس کا ترجمہ یوں ہے :

ع بے حیا باش ہر چہ خواہی کن۔

یقول ابو الاسعاد : حیاء ایک امر طبعی ہونے کی بناء پر شعب ایمان میں شبہ ہو سکتا تھا کیونکہ حیاء میں کسب کا دخل نہیں اس شبہ کے ازالہ کے لیے مستقل طور پر بیان فرمایا۔

سوال ۔ بعض کافروں میں بھی حیاء ہوتی ہے تو اس کو ایمان کا عظیم شعبہ کس طرح قرار دیا گیا کیوں کہ ایمان اور کفر دو متضاد چیزیں ہیں۔

جوابِ اوّل حیاء دو قسم پر ہے (۱) حیاء طبعی جس کو حیاء عرفی بھی کہتے ہیں کہ کوئی انسان کسی سے شرما کر منافع کو ترک کر دے (۲) حیاء حقیقی جس کو شرعی بھی کہا جاتا ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ سے شرما کر معصیت کو ترک کر دے حدیثِ پاک میں حیاء شرعی مراد ہے جو صرف مؤمن میں

پائی جاتی ہے۔

جواب دوم ۔ کہ کسی کافر میں جزء ایمان موجود ہونے سے مؤمن ہونا لازم نہیں آتا جس طرح مؤمن میں کوئی کفری خصلت پائی جانے سے کافر ہونا لازم نہیں آتا۔

سوال ۔ جب حیاء شعبہ ایمان ہے تو ایمان مرکب ہوا یہی وجہ ہے کہ شوافع حضرات مِنَ الْاِیْمَان کے مِن کو تبعیضیہ بناتے ہیں۔

جواب ۔ عندالاحناف الایمان کی الف لام کمال کی ہے اور مِنَ الایمَانِ کا مِنْ بیانیہ ہے معنٰی ہوگا "اَلْحَیَاءُ شُعْبَۃٌ منشعبۃ مِنَ الایمَانِ فَلَا اشکال۔

اسمائے رِجال

حالات حضرت ابوہریرہؓ

آپ نبوت سے گیارہ سال قبل پیدا ہوئے ۷ھ میں فتح خیبر کے سال میں اسلام لائے۔ ۵۷ھ میں بعمر ۷۸ سال وفات پائی۔ آپ نے حضور علیہ السلام کے ساتھ صرف چار سال صحبت اٹھائی لیکن اس کے باوجود صحابہ کرامؓ میں کثیر الروایت ہیں۔ چنانچہ آپ کی کل مرویات پانچ ہزار تین سو چونسٹھ (۵۳۶۴) ہیں۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ سے آٹھ صد سے زائد صحابہؓ اور تابعینؒ روایت کرتے ہیں۔ قبیلہ کے لحاظ سے دُوسی ہیں آپ کے نام میں پینتیس اقوال ہیں۔ علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ اصح قول یہ ہے کہ آپکا اسلامی نام عبدالرحمٰن بن صخر ہے لیکن آپ کی کنیت آپکے نام پر غالب آگئی اور جاہلی نام عبدشمس یا عبدعمرو تھا۔

وَعَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِہٖ وَیَدِہٖ۔

ترجمہ : آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ مسلمانوں کی ایذاء رسانی میں مستعمل نہ ہوں۔

یہ حدیث بھی ان احادیث خمسہ میں سے ہے جن کو امام ابوحنیفہؒ نے پانچ لاکھ احادیث سے منتخب فرمایا ہے۔ اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان کا تعارف کرایا ہے کہ مسلمان وہی شخص ہے جو کسی بھی طریقہ سے کسی مسلمان کو ایذا نہ دے بلکہ امن و سلامتی کا پیکر ہو۔

سوال : حدیث پاک میں ان دو اعضاء کی تخصیص کیوں فرمائی اس میں کیا حکمت ہے؟

جواب : تخصیص ذکری کی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر ایذا انہی دو عضووں سے دیجاتی ہے۔ اگر کوئی ان دو کو قابو کرلے تو دوسرے اعضاء سے ایذا رسانی کا خطرہ بہت کم رہ جاتا ہے اب اس حدیث کے اس جملہ کا مقصد یہ نہیں کہ دوسرے اعضاء سے کسی کو تکلیف پہنچانا اسلام کے منافی نہیں یعنی حدیث پاک میں جو حصر سمجھ میں آرہا ہے وہ حصر ایسا ہی ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے۔ اَلنَّاسُ العربُ کہ انسان تو عرب ہی ہے۔ اَلْمَالُ اَلْاِبِلُ مال تو اونٹ ہی ہے عرف میں فردِ اکمل کے مقابلہ میں فرد ناقص کو معدوم قرار دیا جاتا ہے۔

یقول ابوالاسعاد : فی الحقیقت زبان اور ہاتھ کے ذکر سے مراد پوری ذات انسان ہے، ہاں ان دو کی تخصیص اس لیے ہے کہ اکثر ایذا ان دو اعضاء سے ہوتی ہے لہذا حدیث میں ایذاء قولی اور ایذاء فعلی دونوں کی نفی مراد ہے۔

سوال ۔ زبان کو ہاتھ پر مقدم کیا گیا حالانکہ زبان سے تو زیادہ سے زیادہ گالیاں ہی دی جاسکتی سکتی۔ جب کہ ہاتھ سے تو قتل بھی کیا جاسکتا ہے اس میں کیا حکمت ہے؟

جواب اوّل ۔ لسان کا زخم بہ نسبت ید کے زیادہ ہے۔ کما قیل

؎ جَرَاحَاتُ السِّنَانِ لَهَا الْتِيَامُ   وَلَا يَلْتَامُ مَاجَرَحَ اللِّسَانُ

جواب دوم ۔ ہاتھ سے تو صرف حاضر ہی کو تکلیف پہنچائی جاسکتی ہے جبکہ زبان سے حاضر و غائب بلکہ زندہ و مردہ سب کو تکلیف پہنچائی جاسکتی ہے۔

جواب سوم ۔ لوگ زبان کے ایذاء کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے چنانچہ جب کوئی آدمی کسی کے کچھ کہنے سننے پر ناراض ہوتا ہے تو کہنے والا یہی کہتا ہے کہ کیا تجھے میں نے مارا تھا صرف ایک بات ہی تو کی تھی تو اس کے اہتمام کرنے کے لیے اُسے مقدم فرمایا۔

سوال ۔ یہ کہ شارع علیہ السلام نے مِنْ لِسَانِهٖ فرمایا مِنْ کَلَامِهٖ فرما دیتے۔

جواب کہ اگر مِنْ کَلَامِہٖ فرماتے تو زبان سے جو اذائیں بغیر کلام کیے ہوئے پہنچتی ہیں وہ شامل نہ ہوتیں مثلاً کسی کو زبان سے اشارہ کرنا جس کو چڑانا کہتے ہیں۔ تو چونکہ لسان اعم ہے بہ نسبت کلام کے کہ بعض مرتبہ بغیر کلام کے بھی صرف زبان سے ہی ایذا پہنچائی جاتی ہے اس لیے لِسَانِہٖ فرمایا۔

سوال ۔ اَلْمُسْلِمُوْنَ کی قید سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلم کو ایذا پہنچا سکتا ہے کیونکہ مفہوم مخالف حدیث پاک یہی ہے۔

جواب ۔ کفار کی دو قسمیں ہیں۔ اوّل حربی جن کے ساتھ نہ ہم نے عقد ذمہ کیا ہے اور نہ ہمارے ان کے درمیان صلح و آشتی کا معاہدہ یا معمول ہے اور ان سے ہم محفوظ نہیں اور وہ بھی ہم سے محفوظ نہیں۔ دوم ذمی جن کے ساتھ ہم نے عقد ذمہ کیا ہے اور روا داری کا معاہدہ ہے یا معمول ہے یہ ایذا رسانی کے معاملہ میں مسلمانوں کے حکم میں ہیں حتّٰی کہ اسلام نے ذمیوں کے مال و جان بلکہ ان کے مذہب کی بھی حفاظت کا ذمّہ لیا ہے تو اب مراد یہ ہوئی کہ مسلمان اور وہ جو مسلمانوں کے ذمہ ہیں معاملات میں المسلمون کے حکم میں ہیں اور جو کافر محارب ہیں وہ اس حکم سے خارج ہیں۔ کما فی قولہٖ تعالیٰ " لَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ (پ ۲۸ المُمْتَحِنَۃ)

فائدہ ۔ جس کا تعلّق اسی جواب سے ہے۔

یقول ابوالاسعاد : مسلمانوں کی تخصیص اکثریّت و اغلبیّت کی بناء پر کی گئی ہے کیونکہ مسلمان کا اکثر معاشرہ و معاملہ دوسرے مسلمان ہی سے ہوا کرتا ہے۔ ورنہ ناحق تو کفار کو بھی تکلیف دینا جائز نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ مسلم شریف کی ایک روایت میں المسلمون کی جگہ الناس کا لفظ آیا ہے انسان تو انسان ہے ناحق جانوروں کو بھی تکلیف دینے میں وعید آئی ہے جیسے بخاری کی حدیث ہے " عُذِّبَتِ امْرَأَۃٌ فِیْ ھِرَّۃٍ " باقی اقامتِ حدود و تادیب اطفال اس حدیث کے خلاف نہیں ہے کیونکہ اس سے مقصد ایذا نہیں بلکہ اصلاح ہے۔

سوال ، اس روایت سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ جس سے دوسرے مسلمان کو ایذا پہنچے وہ مسلمان ہی نہیں حالانکہ اہل السنّۃ والجماعۃ کے عقیدہ کے خلاف ہے یہ تو خارجیوں کی دلیل

بن جاتی ہے کیونکہ ان کے نزدیک مُرتکب کبیرہ کافر ہے۔

جواب ۔ اَلْمُسْلِمُ کی الف لام کمال کی ہے معنیٰ ہوگا کہ کامل مسلمان وہ ہے کہ جس کے ہاتھ و زبان سے مسلمان محفوظ رہیں نفی اسلام کامل کی ہے جنس اسلام کی نفی نہیں۔

سوال ۔ پھر یہ قید یعنی نفی اسلام کامل والی صراحۃً کیوں نہیں ذکر کر دی گئی۔

جواب اوّل یہ ہے کہ مقام دو ہوتے ہیں (۱) مقامِ تعلیم (۲) مقامِ تذکیر، مقام تذکیر اور مقامِ تعلیم میں ہر مسئلہ کی تنقیح اور تحقیق مقصود ہوتی ہے وہاں پر ہر قید کا ذکر صراحۃً کیا جاتا ہے بخلاف مقامِ تذکیر کے کہ اس میں عمل پر ابھارنا اور اس کی ترغیب دینا مقصود ہوتا ہے وہاں پوری قیود کا ذکر مقصود کے لیے مفید نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات مضر اور اس مقام کے منافی ہوتا ہے چنانچہ اس قسم کی جتنی احادیث ہیں وہ مقام تذکیر میں فرمائی گئی ہیں اس لیے ان میں کمال کی قید کا ذکر نہیں کیا گیا۔

جواب دوم یہ ہے کہ اس حدیث پاک کو ظاہر پر ہی رکھا جائے مگر اس کے باوجود ایذاء پہنچانے والے کو کافر نہیں کہا جائے گا اس کی مثال یوں سمجھو کہ مالدار لغۃً ہر اس شخص کو کہا جائے گا جو مال رکھتا ہو اگرچہ قلیل ہی ہو۔ مال کے معنیٰ ہیں عَيْنٌ يَنْتَفِعُ بِهٖ تو جس شخص کے پاس کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز منتفع بہ ہوگی وہ لغۃً مالدار ہوگا مگر عرفاً اس کو مالدار نہیں کہا جاتا کیونکہ عرف میں اس شخص کو مالدار کہتے ہیں جو معتد بہ مال رکھتا ہو ایسے ہی دوسروں کو ایذا پہنچانے والا حقیقۃً تو مسلم ہے مگر عرفاً اس لائق نہیں کہ اسے مسلم کہا جائے اسے تنزیل ناقص بمنزلۃ المعدوم کہا جاتا ہے۔

سیدنا نوح علیہ السلام کے بیٹے کے بارے میں قرآن مُقدس میں ہے " اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ وَاِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ (پ ۱۲) باوجودیکہ یہ حقیقۃً بیٹا تھا۔ مگر نقصان اہلیت کی وجہ سے بیٹے کی نفی کر دی گئی یعنی بیٹا کہنے کے لائق نہیں ۔ یہ تقریر اہل سنت والجماعت کے بھی خلاف نہیں اور اس حدیث کا وزن بھی باقی رہتا ہے، زجر و توبیخ کا مطلب بھی حل ہو جاتا ہے۔

قولہ اَلْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللّٰهُ ۔ (ترجمہ) مُہاجر وہ ہے جو ان چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ نے منع فرمایا ہے)

یہاں بھی حصر سے مراد وہی حصر ہے جو اَلْمُسْلِمُ میں گذرا۔

ماقبل سے ربط اس کا ماقبل سے ربط یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہجرت مدینہ کمالِ ایمان و مدارِ ایمان کی علامت تھی اس حدیث میں حقوق العباد کی خصوصیت کی وجہ اہتمامِ شان ہے کیونکہ حقوق العباد قابلِ عفو نہیں۔

اس جملۂ حدیث کے دو مطلب بیان کیے جاتے ہیں:۔

اوّل: مہاجرین کو تنبیہ کرنا ہے کہ صرف ان کا ہجرت کرلینا کافی نہیں کہ اس کے بعد پھر کسی شئی کی ضرورت ہی نہیں بلکہ ہجرت کے بعد آدمی گناہوں سے بچے تب اس کی ہجرت کا اصل فائدہ مرتب ہوگا۔ **دوم**: فریقین کے لیے اہم تنبیہ ہے یعنی ایک فریق کو تسلی دی جارہی ہے کہ جن کو ہجرت من المکۃ الی المدینۃ کی دولت نصیب نہ ہوئی تو اب بھی قیامت تک ہجرت کا ثواب حاصل کرنے کا موقعہ میسّر ہے کہ مَا نَهَى اللّٰهُ کو ترک کرتے رہو۔ دوسرا فریق جس کو یہ دولت نصیب ہوئی تھی ان کے دلوں میں تفاخر پیدا کرنے کا احتمال ہے تو ان کے تزکیہ کے لیے فرما رہے ہیں کہ تم ہجرت ظاہری پر اکتفاء وغرور نہ کرو کہ بس ہمیں یہی کافی ہے اور کچھ کرنے کی حاجت نہیں بلکہ ہمیشہ ترک مَا نَهَى اللّٰهُ کرنا چاہیے۔ تاکہ ہجرت کا اصل مقصد حاصل ہو۔ اس کی مفصّل بحث " إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ " کے آخری جملہ " فَهِجْرَتُهُ إِلَى مَا هَاجَرَ " میں ہوچکی ہے۔

قولہٗ وَلِمُسْلِمٍ قَالَ اِنَّ رَجُلًا سَأَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَيُّ الْمُسْلِمِيْنَ خَيْرًا

ترجمہ: (امام مسلمؒ نے اس روایت کو ان الفاظ میں نقل کیا ہے" ایک شخص نے نبی علیہ السلام سے دریافت کیا کہ مسلمانوں میں سب سے بہتر کون ہے۔)

اَیُّ الْمُسْلِمِيْنَ خَيْرًا سے مراد اَیُّ خَصْلَةِ الْمُسْلِمِيْنَ جس کا حاصل یہ بنتا ہے کہ اسلام کا کون سا عمل سب سے بہتر ہے اس سے ملتے جلتے مفہوم کی کئی روایات ذخیرہ احادیث میں آتی ہیں مشکوٰۃ شریف کے ص۴۲۸ پر حضرت ابوذرؓ کی روایت ہے " اَفْضَلُ الْاَعْمَالِ الْحُبُّ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ " کتاب الایمان کے آخر میں اسی مفہوم کی ایک روایت آرہی ہے اس میں ذکر اللہ کا اضافہ ہے۔ بعض میں بِرُّ الْوَالِدَيْنِ، بعض میں جہاد، بعض الصَّلٰوةُ لِوَقْتِهَا یہ سب سوالات مُتّحدُ المعنیٰ یا متقارب المعنیٰ ہیں۔ اختلافاتِ جوابات کی علماء نے مختلف وجہیں بیان فرمائی ہیں جن کو جواب سے

تعبیر کیا جاتا ہے۔

جواب اوّل یہ سائلین کے حالات کی بنا پر ہے کیونکہ آپ طبیب روحانی تھے جیسا مریض دیکھتے ویسا ہی نسخہ تجویز فرماتے تھے۔ چنانچہ حدیث الباب کے سائل کے اندر ایذاء رسانی کا مادہ غالب تھا اس لیے مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ الخ سے جواب دیا۔ وقس علیٰ ہذا۔

جواب دوم بسا اوقات حالات اور وقتی تقاضوں کے تحت بعض اعمال کو بہت اہمیت حاصل ہو جاتی ہے۔ مثلاً ہجرت کے دور میں ہجرت ہی سب سے افضل عمل تھا جہاں ایذاء رسانی سے بچنے کا اہتمام نہ ہو، وہاں ظاہر ہے کہ سب سے بڑا عمل یہی ہے کہ اپنی زبان وہاتھ سے دوسروں کو محفوظ رکھا جائے اور جن دنوں ملّت و مذہب کو مخالفین سے شدید خطرہ ہو تو ان دنوں میں ان سے جہاد کرنا ہی سب سے افضل عمل ہوگا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن حالات کے تحت جس عمل کو افضل الاعمال سمجھا ذکر فرما دیا۔

اسمائے رجال

حالات حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص آپ اپنے والد عمرو بن العاص سے پہلے مشرف باسلام ہوئے اور آپ کے والد ۸ھ میں اسلام لائے۔ اور اپنے والد سے صرف بارہ سال عمر میں چھوٹے تھے یہ دونوں حضرات بہت بہادر اور سلام کے قابل فخر جرنیل تھے۔ آپ نے مکّہ یا طائف یا مصر میں وفات پائی۔ آپ رات کو چراغ بجھا کر قیام لیل کرتے اور بہت زیادہ روتے تھے۔ حتیٰ کہ آخر عمر میں آنکھوں کی بینائی جاتی رہی۔ چونکہ آپ احادیث کو لکھ لیتے تھے اس لیے آپ کے پاس احادیث حضرت ابوھریرہؓ سے بھی زیادہ تھیں لیکن کتب احادیث میں صرف سات سو مذکور ہیں۔!

وَعَنْ اَنَسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ :

ترجمہ : حضرت انسؓ فرماتے ہیں فرمایا رسولُ اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم نے کہ تم میں سے کوئی (کامل) مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک باپ (اصُول) اور اولاد (فرُوع) اور تمام لوگوں سے زیادہ محبُوب نہ ہو جاؤں ۔

سوال : اولاد اور والدین سے فطرۃً اور طبعًا محبّت ہوتی ہے ۔ لہٰذا آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کی محبّت ان سے زیادہ ہونا تو حدِ استطاعت سے خارج ہے ۔

جواب اوّل

محبّت دو قسم ہے (۱) محبت طبعی غیر اختیاری : محبت طبعیہ کا مطلب یہ ہے کہ غیر اختیاری طور پر کسی کی طرف طبیعت کا میلان ہو اور یہ محبت اولاد اور بیوی سے ہوتی ہے ۔ (۲) محبت عقلی اختیاری : یعنی انسان اپنے مقتضیٰ عقل کو خواہشات پر ترجیح دے ۔ بالفاظِ دیگر محبت عقلیہ وہ محبت ہے جو کسی کے کمالات اور خوبیاں سوچنے سے پیدا ہوتی ہے خواہ اس کی طرف طبعی میلان نہ ہو ۔ جیسے کڑوی دوا کی طرف طبعی میلان نہیں ہوتا لیکن چونکہ اس کے فوائد اور منافع سے واقف ہے اس کے لیے رقم خرچ کرتا ہے اور تکلیف بھی برداشت کرتا ہے اور اس کو کھاتا ہے ۔ حدیث مذکور میں کمال ایمان کو جس پر موقوف رکھا گیا وہ محبت عقلی ہے ۔

جواب دوّم

حدیث الباب میں حُبِّ ایمانی مراد ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ امورِ دین کو تمام خواہشات و اغراض پر ترجیح دینا ضروری ہے ۔ مثلاً جب قول والدین قول رسولؐ کے مقابل ہو جاتا ہے تو کامل مؤمن قول رسول کو ترجیح دیتا ہے ۔ صحابہ کرامؓ میں یہی حب ایمانی تھی جو حبِ طبعی پر غالب تھی ۔

یقول ابوالا سعاد صانہ اللہ عن الشرِ والفساد : اسباب محبت چار قسم ہیں :

اوّل جمال ۔ کسی کے اندر جمال وحسن ہو تو اس سے محبت پیدا ہو جاتی ہے ۔ جمال پر بعض حیوان بھی عاشق ہو جاتے ہیں ۔ جیسے بعض پرندے چاند کے حسن پر عاشق ہیں اور پروانے چراغ کی روشنی پر عاشق ہیں کہ جان جیسی محبوب چیز بھی قربان کر دیتے ہیں ۔

دوم نوال ۔ کہ کسی پر کسی کا احسان ہو تو اس سے بھی محبت پیدا ہو جاتی ہے انسان تو انسان ہیں موذی جانور بھی احسان کی وجہ سے محبت کرنے لگتے ہیں اور محسن کے تابع ہو جاتے ہیں ۔

سوم کمال ۔ کوئی آدمی اگر صاحب کمال ہے ، بڑا بزرگ ہے تو اس سے محبت پیدا ہو جاتی ہے ۔ چاہے کتنا ہی بدصورت و بدشکل کیوں نہ ہو ۔

چہارم قرابت ۔ قرابت کی وجہ سے محبت کا پیدا ہونا یہ تو بدیہی بات ہے ۔

ان میں سے کوئی ایک سبب موجود ہونے سے محبت پیدا ہو جاتی ہے ۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر یہ اسباب اربعہ علی وجہ الاتم والاکمل موجود تھے ۔ لہذا آپ سے محبت نہ ہو تو کس سے ہو ۔

صفت اَجملُ الخلائِق کی وضاحت

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالی نے اجمل الخلائق پیدا کیا اور کیونکر نہ ہو جبکہ حضرتؐ کی ذات مبارک کو اپنا سب سے زیادہ محبوب بنایا تو سب سے زیادہ حسین بھی ضرور بنانا چاہیے ۔ اگرچہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں حدیث آتی ہے کہ آپ کو دنیا کا نصف جمال دیا گیا ہے ۔ مگر متکلم حکم سے خارج ہوتا ہے ۔ لہذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات اس حکم سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ جس ہستی کو اللہ تعالی نے ہر قسم کے مکارم سے مزین کیا تو صورت کے اعتبار سے بھی اعلیٰ ہونا چاہیے اس کے لیے حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے دو شعر ہی کافی ہیں ۔

۵ وَاَحْسَنُ مِنْكَ لَمْ تَرَقَطُّ عَيْنِيْ	وَاَجْمَلُ مِنْكَ لَمْ تَلِدِ النِّسَاءُ
خُلِقْتَ مُبَرَّأً مِّنْ كُلِّ عَيْبٍ	كَاَنَّكَ قَدْ خُلِقْتَ كَمَا تَشَاءُ

امّی عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالی عنہا فرماتی ہیں :

لَنَا شَمْسٌ وَلِلْاٰفَاقِ شَمْسٌ	وَشَمْسِیْ خَيْرٌ مِّنْ شَمْسِ السَّمَاءِ

۵ وَشَمْسُ النَّاسِ تَطْلُعُ بَعْدَ فَجْرٍ | وَشَمْسِیْ تَطْلُعُ بَعْدَ الْعِشَآءِ

اس کے علاوہ شمائل کی کتابوں میں آپ کے جمال کے بارے میں بہت سی احادیث آئی ہیں۔

صفت الکمال کی وضاحت

آپ کی ذات پرانوار کے کمال کا تو ٹھکانا ہی نہیں خواہ علمی ہو یا عملی، اخلاقی ہو یا تعلق مع اللہ کے اعتبار سے ہو، یا تعلق مع الناس کے اعتبار سے ہو اس کی شہادت ذوالجلال اپنی کلام مبارک میں دے رہے ہیں۔ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ تمام انبیاء علیہم السلام کو جو کمالات تقسیم کر دیے گئے وہ سب تنہا حضورؐ کو دیے گئے۔

خلاصہ یہ کہ —— ع بعد از خدا بزرگ توئی قصّہ مختصر۔

صفت احسنُ الاحسان کی وضاحت

آپ کا احسان و رحمت و رأفت اس درجہ میں ہے کہ خود قرآن کریم فرماتا ہے

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ رپ۱ الانبیآء

صفت اقربُ القرابت کی وضاحت

اگر ذرا گہری نظر سے دیکھا جائے تو آپ کی قرابت دوسروں کی قرابت سے اقویٰ ہے کیونکہ دوسروں سے قرابت جسمانی ہے اور آپ کی ذاتِ مبارک سے قرابت روحانی ہے اس کو قرآن پاک میں بیان کیا گیا :۔

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِھِمْ رپ۲ کہ نبیؐ سے ایمان داروں کا تعلق اپنی ذات سے بھی زیادہ ہے اور وہ بمنزلہ باپ کے ہیں۔ چنانچہ حضرت اُبَی بن کعبؓ کی قرأت وَھُوَ اَبٌ لَّھُمْ ہے اور ابو داؤد شریف ص۳ ج ۱ بابُ کَرَاھِیَۃِ اِسْتِقْبَالُ الْقِبْلَۃِ عِنْدَ قَضَاءِ الْحَاجَۃِ۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے :۔

قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّمَآ اَنَا لَکُمْ بِمَنْزِلَۃِ الْوَالِدِ

تو جب یہ اسباب محبّت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر علی وجہ الاتم والاکمل موجود ہیں تو آپ سے محبّت بھی سب سے زیادہ ہونا عقل کا تقاضا ہے۔ پھر یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ محبّت تین قسم کے لوگوں سے ہوا کرتی ہے۔ بڑوں سے تعظیم کی بناء پر اس کی طرف اشارہ کیا والدے

چھوٹوں سے شفقت کی بنا پر اس کی طرف اشارہ کیا ولد سے۔
عام لوگوں سے محبت ہوتی ہے جنسیت اور ہم عصری کی بنا پر، اس کی طرف اشارہ کیا اَلنَّاسُ کے لفظ سے۔
مقصد یہ ہے کہ ہر قسم کے لوگوں، بڑوں، چھوٹوں اور برابر کے لوگوں کی محبت سے آپکی محبت زیادہ ہونا ایمانِ کامل کا تقاضا ہے۔
سوال : حدیثِ پاک میں والد کو پہلے ذکر فرمایا حالانکہ آدمی کو بہ نسبت اپنے والد کے ولد سے زیادہ محبت ہوتی ہے۔
جواب اوّل : والد وجوداً مقدم ہے اس لیے ذکراً بھی مقدم فرمایا۔ فلا اشکال علیہ
جواب دوم : احتراماً مقدم ہے۔ کما فِیْ قَوْلِہٖ تَعَالیٰ "وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا۔
جواب سوم : ہر ایک کے لیے والد ہونا ضروری ہے لیکن ہر ایک کے لیے ولد ہونا ضروری نہیں یعنی کثرت کی بنا پر ذکر کیا ہے کیونکہ ہر ایک کا والد ہے مگر ولد نہیں۔
سوال : حدیث پاک میں اپنے نفس کا ذکر نہیں کیا جس سے ظاہراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی محبت اپنے نفس سے زیادہ ہونا ضروری نہیں۔
جواب اوّل : حضرت عبد اللہ بن ہشامؓ کی روایت میں مِنْ نَفْسِہٖ کا لفظ موجود ہے۔ لہٰذا اپنے نفس سے بھی محبت رسولؐ کا تقدم ثابت ہوا۔ کما فی فتح الملھم ص۲۲۱ ج ۱ بابُ وجوب مُحبتہ رسُولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
جواب دوم : بعض اوقات انسان اپنے فرزند و والد سے اپنی جان سے زیادہ محبت کرتا ہے تو ان سے زیادہ حضورؐ کی محبت ہونے کو ذکر کیا گیا تو اپنے نفس سے زیادہ محبت بطریق اولیٰ ہونی چاہیے۔ علاوہ ازیں بخاری شریف ص باب الایمان والنذور میں روایت ہے "کہ ایک بار حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ

"لَاَنْتَ یَا رَسُوْلُ اللّٰہِ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ کُلِّ شَیْئٍ اِلَّا مِنْ نَفْسِیْ فَقَالَ عَلَیْہِ السَّلَامُ لَا حَتّٰی اَکُوْنُ اَحَبُّ اِلَیْكَ مِنْ نَفْسِكَ فَقَالَ عُمَرُ فَاِنَّكَ الْاٰنَ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ نَفْسِیْ فَقَالَ عَلَیْہِ السَّلَامُ اَلْاٰنَ یَا عُمَرُ "!

تو اس سے معلوم ہوا کہ نفس سے بھی زیادہ محبت ہونا ضروری ہے۔
سوال ۔ اس حدیث سے خارجی دلیل پکڑتے ہیں کہ سارے زمانہ سے زیادہ محبت حضرتؐ کے ساتھ ہو تو مؤمن ہے ورنہ نہیں۔ تو جب تک حضرتؐ کے ساتھ محبت نہیں تو گویا مرتکب کبیرہ ہوا، اور مرتکب کبیرہ کو آپؐ لَا يُؤْمِنُ سے تعبیر کر رہے ہیں۔
جواب : نفی فعل پر دو طریقوں سے آتی ہے (۱) ایک نفی جنس کی جیسے لَا رَجُلَ فِي الدَّارِ (۲) دوسری نفی کمال کی تو لَا يُؤْمِنُ میں نفی کمال کی ہے جنس کی نہیں اگر حضرتؐ کو محبوب نہ رکھے گا تو وہ کامل مؤمن نہ ہوگا۔

یقول ابوالاسعاد : محبت کے دو درجہ ہیں (۱) درجہ کمال (۲) درجہ ناقص۔ درجہ کمال حاصل ہوتا ہے کمال اتباع سے۔ اس کو دوسری حدیث میں فرمایا گیا " لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهٖ " اگر کمال اتباع نہ ہو تو محبت تو ہو سکتی ہے لیکن ناقص ہوگی لہٰذا معصیت کے ساتھ محبت جمع ہو سکتی ہے جیسا کہ حدیث پاک میں آتا ہے کہ ایک آدمی شراب پی کر حضورؐ کی مجلس میں آیا تو صحابہ کرامؓ نے لعنت کرنا شروع کر دی تو آپؐ نے فرمایا " لَا تَلْعَنُوْهُ فَوَاللّٰهِ مَا عَلِمْتُ اِنَّهٗ يُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (مشکوٰۃ شریف ص۳۱۶ ج ۲ باب مالا یدعیٰ علی المحدود) اس سے معلوم ہوا کہ گناہ گاروں کے بارے میں یہ نہیں کہا جائے گا کہ ان کے دل میں اللہ و رسولؐ کی محبت نہیں بلکہ محبت ہے مگر ناقص نفسانی خواہش کی بناء پر مغلوب ہے۔

اسمائے رجال

حالات حضرت انسؓ

آپ کی کنیت ابوحمزہ اور والد کا نام مالک بن نضر ہے آپ حضور صلعم کے خادم خاص تھے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے حضرت انسؓ کی عمر دس سال تھی اسی وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور دس سال تک خدمت کی۔ آپ ہمیشہ مدینہ طیبہ میں رہے۔ لیکن خلافت عمر فاروقؓ میں تعلیم فقہ کے لیے بصرہ میں منتقل ہو گئے اور وہیں سنہ۹۱ھ میں بعمر ۹۹ سال وفات پائی۔ آپ کثیر الاولاد تھے۔ حتّٰی کہ عند البعض پوری سو اور عند البعض اسّی اولادیں تھیں جن میں سے ۷۸ ذکور اور صرف دو اناث تھیں آپ سے بہت مخلوق نے روایت کی ہے آپ کی کل

وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَلٰثٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ وَجَدَ بِهِنَّ حَلَاوَةَ الْاِيْمَانِ ۔

ترجمہ: روایت ہے انہی سے فرماتے ہیں فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جس شخص میں یہ تین خصلتیں ہوں گی وہ انکی وجہ سے ایمان حقیقی کی لذت سے لطف اندوز ہوگا۔

قولہٗ ثلٰث ۔ ثلٰث مبتدا ہے اور مَنْ كُنَّ فِيْهِ جملہ شرطیہ خبر ہے۔

سوال ۔ ثلٰث تو نکرہ محضہ ہے اور نکرہ محضہ کبھی مبتدا نہیں بن سکتا نکرہ کے مبتدا بننے کے لیے تخصیص ضروری ہے۔

جواب : یہ ہے کہ ثلٰث نکرہ محضہ نہیں ہے بلکہ نکرہ مختصہ ہے۔ تخصیص کی کئی وجہیں ہیں

قولہٗ ثلٰث ۔ ثلٰث مُبتدا ہے اور من کنّ فیہ جملہ شرطیہ خبر ہے۔

سوال ۔ ثلٰث تو نکرہ محضہ ہے بلکہ نکرہ مخصصہ ہے تخصیص کی کئی وجہیں ہیں :۔

ا : ثلٰث کی تنوین مضاف الیہ کے عوض میں ہے اصل میں ہے ثلاث خصالٍ اضافت سے تخصیص ہوگئی۔ (۲) ثلٰث صفت ہے اور موصوف محذوف ہے یعنی خِصَالٌ ثلٰثٌ ۔

قولہ حَلَاوَةَ الْاِيْمَانِ : بمعنیٰ ایمان کی چاشنی ۔ مُحدّثینؒ عضرات نے لکھا ہے کہ ایمان کی چاشنی یہ ہے کہ انسان اسلام میں مُشقّت برداشت کرے۔

فائدہ انسانی خصلتیں دو قسم کی ہیں اوّل تخلّی عن الرذائل : یہ کہ انسان اپنے وجود سے اخلاق رذیلہ وخبیثہ کو نکال دے مثلاً حسد، ضد، بغض، تکبّر وغیرہ دوّم تحلی بالفضائل : یہ کہ انسان اپنے اندر اخلاق حمیدہ پیدا کرے۔ مثلاً احسان کرنا، اور رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرنا وغیرہ مَنْ كَانَ اللهُ یہ خصلت تحلّی بالفضائل ہے۔ اور وَمَنْ اَحَبَّ عَبْدًا یہ تخلّی عن الرذائل ہے۔

حاصل بالحدیث اس حدیث پاک کا حاصل یہ ہے کہ ایمان کی چاشنی اور حلاوت کما حقّہٗ محسوس ہونے کے لیے تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ (۱) اللہ ورسولؐ کی محبت دوسری تمام محبّتوں پر غالب ہو (۲) اگر کسی مخلوق سے محبت

ہو تو صرف اللہ کے لیے ہو۔ (۳) مسلمان ہونے کے بعد کفر سے اتنی ہی نفرت ہو جتنی آگ میں ڈالے جانے سے۔

بحث حلاوت فی الایمان

یہ کہ حلاوت ایمان سے کونسی حلاوت مراد ہے اس میں مختلف اقوال ہیں:۔

قول اوّل شیخ محی الدین ابن العربیؒ اور صوفیاء کرامؒ کہتے ہیں کہ اس سے مراد طبعًا طاعات میں لذت محسوس کرنا، اور اللہ تعالیٰ کی رضامندی میں مشقت برداشت کرنا اور اسی میں لذت محسوس کرنا اور معاصی سے طبعًا نفرت کرنا ہے۔

قول دوم بعض عارفینؒ فرماتے ہیں کہ حلاوتِ ایمان سے مراد حلاوت حسیہ وظاہر یہ مراد ہے۔ گو ایمان باطنی چیز ہے مگر اس کا اثر ظاہری حد تک سرایت کر جاتا ہے مگر اس کا ادراک وہی کر سکتے ہیں جو خود بھی اس مقام تک پہنچے ہوں جیساکہ ہلال کسی کو نظر نہیں آتا مگر جن لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوتا ہے ان کے کہنے سے مان لیا جاتا ہے یہاں بھی یہی حال ہے۔ جیساکہ حضرت بلال حبشیؓ کا واقعہ مشہور ہے کہ وہ سختی کی حالت میں بھی احد احد ہی کہنے میں لذت محسوس کرتے تھے۔

قولہٗ مِمَّا سِوَاهُمَا : اللہ و رسول تمام ماسوا سے پیارے ہوں۔

سوال ایک خطیب نے خطبہ میں یوں پڑھا: مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ رَشَدَ وَمَنْ يَّعْصِهِمَا فَقَدْ غَوٰى ؛ ابوداؤد شریف ص۱۶۲ ج ۱ باب الرَّجُلِ يَخْطِبُ عَلٰى قَوْسٍ : اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بِئْسَ الْخَطِيْبُ اَنْتَ معلوم ہوا کہ اللہ و رسولؐ کو ایک ضمیر میں جمع کرنا درست نہیں علی التفصیل دونوں کا نام لینا چاہیے۔ مگر اس حدیث میں مِمَّا سِوَاهُمَا ضمیر میں دونوں کو جمع کر دیا۔ اس سے جواز معلوم ہوتا ہے فتعارضا

جواب اوّل اس سوال کے جواب میں علماء نے دو طرز اختیار فرمائے ہیں:۔ (۱) تطبیق کا راستہ (۲) دوسرا ترجیح کا۔ اوّلاً وجوہ تطبیق ذکر کیے جاتے ہیں علماء نے کئی طرح سے تطبیق دی ہے چند وجوہ حسب ذیل ہیں:۔

اوّل: ایک ہے مقام خُطبہ، ایک ہے غیر مقام خطبہ دونوں کا مُقتضٰی الگ الگ ہے مقام خُطبہ ایضاح کو چاہتا ہے اور ایضاح اسی میں ہے کہ اللہ و رسول کا نام الگ الگ بالتفصیل لیا جائے۔ مقام غیر خُطبہ میں ایجاز مقصود ہوتا ہے اور ایجاز اس میں ہے کہ ایک ضمیر میں دونوں کو جمع کیا جائے۔ حاصل جواب یہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے مُمانعت مقام خُطبہ میں فرمائی ہے اور خود

حضور علیہ السّلام کا مِمَّا سِوَاھُمَا کہنا مقام غیر خطبہ میں ہے لہذا دونوں میں کوئی تعارض نہیں۔
دوم: ایک ہے مقام محبّت ایک ہے مقام معصیت دونوں کا مقتضیٰ الگ الگ ہے مقام محبّت میں دونوں کو ایک ضمیر میں جمع کرنا مناسب ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ ایک ایک کی محبت کافی نہیں بلکہ مجموعہ محبتیْن کی ضرورت ہے بخلاف مقام معصیت کے کہ وہاں الگ الگ نام لے کر بالتفصیل تذکرہ مناسب ہے۔ تاکہ پتہ چلے کہ اگر بالفرض ایک کی معصیت دوسرے کی معصیت سے الگ ہو سکتی ہوتی تو ایک ایک کی معصیت بھی تباہ کرنے کے لیے کافی ہے صرف اللہ کی معصیت ہوئی تو بھی تباہ کن، اگر صرف رسولؐ کی ہوئی تو بھی گمراہ کن۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مقام محبّت میں جمع فرمایا، اور مقام معصیّت میں منع فرمایا۔

یقول ابوالاسعاد: بِئْسَ الْخَطِیْبُ فرمانا ضمیر میں جمع کرنے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس نے وقف میں غلطی کی تھی جس سے معنیٰ فاسد ہو جاتا ہے۔ اس نے یوں پڑھا تھا "مَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَقَدْ رَشَدَ وَمَنْ یَّعْصِہِمَا" یہاں وقف کیا تھا جس سے یہ وہم ہو سکتا ہے کہ "مَنْ یَّعْصِہِمَا کا عطف مَنْ یُطِع پر ہے تو دونوں کا حکم ہوگا فَقَدْ رَشَدَ یہ ظاہر البطلان ہے کیونکہ معصیت سے رشد حاصل نہیں ہو سکتا۔ وقف کی یہ غلطی چونکہ موہم فسادِ معنیٰ ہے اس کو اس لیے بِئْسَ فرمایا۔

جواب دوم ترجیح کا طریق، بعض علماء نے ترجیح کا طریقہ اختیار فرمایا ہے۔ وجہ ترجیح یہ ہے کہ مِمَّا سِوَاھُمَا والی روایت مبیح ہے اور بِئْسَ الْخَطِیْبُ والی محرم ہے۔ تو قاعدہ یہ ہے کہ جب محرم اور مبیح میں تعارض ہو تو ترجیح محرم کو دی جاتی ہے اس لیے ممانعت والی روایت کو ترجیح ہونی چاہیے یا یہاں قول و فعل کا مسئلہ بھی ہے کہ "بِئْسَ الْخَطِیْبُ قول ہے سِوَاھُمَا فعل ہے تو ترجیح قول کو ہوتی ہے۔

قولہ وَمَنْ اَحَبَّ عَبْدًا لَا یُحِبُّہٗ اِلَّا لِلّٰہِ۔ یہ ہے اصل معیار محبّت اس لیے کہ اگر کسی سے دنیا کے لیے محبّت کرتا ہو تو جب یہ معلوم ہوگا کہ یہ تو بڑا بخیل ہے تو پھر اس سے نفرت ہو جائے گی۔ لیکن اگر اللہ کے لیے محبت کرتا ہو تو اگر کچھ نہ بھی ملے اور وہ بے رخی کرے مگر پھر بھی اس کے ساتھ محبت کرے۔ اسی کو بعض عارفین نے یوں بیان کیا ہے ؎

عشق با مردہ نباشد پائیدار عشق را با حیُّ با قیُّوم دار

قَوْلُہٗ وَمَنْ یَّکْرَہُ اَنْ یَّعُوْدَ فِی الْکُفْرِ: کفر میں جانا یہ کراہت شرعی ہے اور نار میں

ڈالاجانا یہ کراہت حسّی اور طبعی ہے اور قانون ہے کہ طبعیات عقلیات پر غالب ہوتی ہیں تو حضرتؐ نے فرمایا کہ کفر میں جانے کو اسی طرح مکروہ سمجھے جیسے نار میں جانے والی کراہت کو مکروہ سمجھتا ہے یعنی کفر میں جانا کراہت طبعی بن جائے۔ یا مسلمان کو کفر سے اس درجہ نفرت ہونی چاہیے جیسے دیدہ دانستہ آگ میں گرنے سے ہوتی ہے۔ جب یہ تینوں چیزیں حاصل ہوجائیں گی تو حلاوتِ ایمان خود بخود حاصل ہوجائیگی۔

سوال : عَوْدٌ فِی الْکُفْرِ نومسلم میں تو متحقق ہوسکتا ہے لیکن جو جدّی وپیدائشی مسلمان ہے اس میں عَوْدٌ فِی الْکُفْرِ کیسے متحقق ہوسکتا ہے۔

جواب اوّل یہاں عود کے معنیٰ انتقال ورجوع کے نہیں بلکہ مطلق صیرورۃ واختیار کے معنیٰ مراد ہیں جو جدّی وپیدائشی مسلمان کو بھی شامل ہیں۔ جیساکہ قرآن مقدس میں انبیاءؑ کے متعلق ارشاد ہے: ”اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا (پ۱۳)

جواب دوم : کفر دو قسم ہے (۱) بالفعل (۲) بالقوۃ : اور یہاں عام معنیٰ مراد ہے کیونکہ ہر انسان میں کفر وشرک کی استعداد تو موجود ہے اور یہی کفر بالقوۃ ہے۔

قَوْلُہٗ اَنْقَذَہُ اللّٰہُ - یہ کلمہ حضرتؐ نے اپنے زمانہ کے اعتبار سے فرمایا کیونکہ حضرتؐ کے زمانہ میں سارے لوگ کفر سے نکل کر اسلام میں آئے تھے ورنہ حدیث میں عموم ہے کفر سے نکل کر آوے یا پہلے سے اسلام پر عند البعض اَنْقَذَہُ اللّٰہُ بمعنیٰ اَنْجَاہُ اللّٰہُ اب عام ہوگا کہ ابتداءً ہو خواہ ثانیاً اللہ پاک نے نجات دی۔

وَعَنِ الْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ذَاقَ طُعْمَ الْاِیْمَانِ ــــــ

ترجمہ : حضرت عباسؓ بن عبد المطلب سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے اللہ تعالیٰ کو اپنا پروردگار اسلام کو اپنا دین اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا رسولؐ خوشی سے مان لیا تو سمجھو کہ اس نے ایمان کا ذائقہ چکھ لیا۔

خُلاصَةُ الحَدِيث

: حدیث پاک کامفہوم ومطلب یہ ہے کہ ایمان کی لذت اور چاشنی حاصل ہونے کا مدار حق تعالیٰ کی ربوبیت اسلام کے دین ہونے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر راضی اور قانع رہنا ہے۔ جتنا ان اُمور ثلاثہ پر ایمان پختہ ہوگا لذت وحلاوت ایمان میں اس قدر اضافہ ہوتا جائے گا یہی وجہ ہے کہ قبر میں ان رضاؤں کے متعلق سوال ہوگا " مَنْ رَّبُّكَ ، مَنْ دِيْنُكَ، مَنْ نَبِيُّكَ

فائدہ

حضرت انسان کو اللہ پاک نے دنیا میں تین تعلق قائم کرنے کے لیے بھیجا ہے اوّل تعلق باللہ، دوّم : مذہب کا تعلق، سوّم : رہبر و مُرشد کا تعلق مَنْ رَضِيَ بِاللهِ : یہ پہلے تعلق باللہ کا ذکر ہے ربًّا تمیز ہے رب کا معنیٰ مُلاّ علی قاری کرتے ہیں :۔ مَالِكًا سَيِّدًا مُتَصَرِّفًا کہ اللہ پاک کے تینوں اوصاف پر راضی ہوجائے۔ وَبِالْإِسْلَامِ دِيْنًا یہ دوسرے تعلق مذہب کا بیان ہے۔ وَبِمُحَمَّدٍ رَسُوْلًا یہ تیسرے تعلق رہبر و مرشد کا بیان ہے

اسمائے رجال

حضرت عباسؓ کے حالات

آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ہیں۔ واقعہ فیل سے ایک سال قبل پیدا ہوئے۔ آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دو سال بڑے تھے۔ حضرت عباسؓ سے کسی نے پوچھا آپ بڑے ہیں یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم ؟ تو حضرت عباسؓ نے جواب دیا اَنَا اَكْبَرُ وَهُوَ اَعْظَمُ - آپ نے ١٢ رجب المرجب ٣٢ھ میں بعمر ٨٨ برس وفات پائی۔ اور جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔

آپ کی کل مرویات ٣٥ ہیں۔ آپ سے آپ کے صاحبزادوں حضرت عبداللہ اور کثیر، عبیداللہ نیز عامر بن سعد نے روایت کی ہے۔

وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِهٖ

ترجمہ : حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمدؐ کی جان ہے۔

حاصل حدیث

یعنی دنیا کے جس شخص کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت اور آپ کی رسالت کا علم ہوگیا تو اُس کی نجات اس وقت تک نہ ہوسکے گی جب تک کہ آپ کی رسالت پر ایمان نہ لے آئے یہ قاعدہ نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت کے بعد دُنیا کے ہر فرد کے لیے ہے۔

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کو مختارِ کُل ماننا عقیدہ کفریہ ہے

مُبتدعین جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مختار کل مانتے ہیں اس جملہ سے اس کی پوری تردید ہوگئی۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود فرما رہے ہیں کہ قسم ہے اس ذات پاک کی کہ جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے تو گویا کہ حضرتؐ کی ذات مُبارکہ کی جان مُبارکہ ان کے قبضہ میں نہیں۔ نیلِز یہ عقیدہ رکھنا کہ حضورؐ کی ذات بابرکات مختار کل ہیں تو یہ عقیدہ کفریہ کہلائے گا۔ کَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی :-

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ (پ۹)

یہاں لَآ اَمْلِكُ الخ کے کلمات کے ذریعہ آپؐ سے اپنے اختیار کامل کی نفی فرما دی۔

فائدہ

حدیث پاک کے اندر لَا بمعنیٰ لَیْسَ کے ہے اور اَحَدٌ اس کا اسم اور یَسْمَعُ الخ سب احد کی صفات ہیں اور خبر محذوف ہے تقدیر عبارت یوں ہے " لَیْسَ اَحَدٌ الخ کَائِنًا مِنْ اَصْحَابِ شَیْئٍ اِلَّا کَانَ مِنْ اَصْحَابِ النَّارِ عند البعض تقدیر عبارت یوں ہے " لَیْسَ اَحَدٌ یَسْمَعُ بِخَبَرِ رِسَالَتِیْ ثُمَّ یَمُوْتُ الخ کَانَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ : تو تین قسم کے لوگ ہوگئے :-

۱۔ ایک وہ جس نے سُنا اور ایمان نہیں لایا اس کا حکم وہی ہے جو مذکور ہوا۔

۲ - دوسرا وہ ہے جس نے سنا اور ایمان لایا اس کا حکم اس کے برعکس ہوگا۔
۳ - تیسرا وہ جس نے سنا بھی نہیں اور ایمان بھی نہیں لایا وہ مسکوت عنہ کے حکم میں ہے اور اس وعید سے خارج ہے۔

سوال کہ لَا نَصْرَانِیٌّ کا لَا زائدہ ہے اور یہ اَحَدٌ کی صفتیں ہیں۔ اب یہ حدیث پاک کا حکم تخصیصی بن گیا کہ ان یہودی اور نصرانی میں سے جو ایمان نہ لایا وہ جہنمی ہے تو بت پرست اور دھری اس حکم میں داخل نہیں ہوئے حالانکہ وہ بھی تو متفقہ طور پر جہنمی ہیں۔

جواب وہ بطریقِ اَولیٰ داخل ہیں کیونکہ یہودی اور نصرانی نبوّت، کتُب سماویہ اور خدا کے قائل ہیں۔ اس کے باوجود وہ آگ میں جائیں گے تو دھریوں اور بُت پرستوں کے پاس کچھ بھی نہیں یہ بطریق اَولیٰ نار میں جائیں گے۔

سوال : حدیث پاک میں یہود و نصاریٰ کو اس اُمّت میں سے قرار دیا ہے حالانکہ وہ ہمارے دین کے دشمن ہیں۔

جواب اُمّت کی دو قسمیں ہیں (۱) اُمّتِ دعوت : (۲) اُمّتِ اجابت۔ اُمّتِ دعوت سے مراد وہ لوگ ہیں جن کو دعوت دینے کے لیے نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے ہیں، اور امتِ اجابت سے مراد وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے آپ کی دعوت کو قبول کیا۔ امتِ دعوت میں یہود و نصاریٰ بلکہ پوری دنیا شامل ہے اس لیے یہود و نصاریٰ کو امت کہا۔

یقول ابوالاسعاد : یہودی اور عیسائی کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ پیغمبر موسیٰ کلیمُ اللہ اور عیسیٰؑ رُوح اللہ کے ہم پیروکار ہیں، اور توراۃ و انجیل کے متبع ہونے کی وجہ سے ہم نجات یافتہ ہیں۔ نیز جنّت تو ہمارا پیدائشی حق ہے۔ اس حدیث سے ان کے غلط عقیدہ کی تردید کی گئی کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے تمام ادیان منسوخ ہو گئے۔ لہٰذا جب تک وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لائیں گے ہرگز ناجی نہیں ہوں گے۔ اب جب یہودی اور عیسائی جن کی وُقعت مُشرکین کے قلب میں بھی تھی ان کا یہ حال ہے تو تمام مشرکین بطریق اَولیٰ ناجی نہیں ہوں گے۔

وَعَنْ اَبِىْ مُوْسٰى الْاَشْعَرِىِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَلَاثَةٌ لَهُمْ اَجْرَانِ

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تین شخصوں کے لیے دُہرا اجر ہے۔

حاصلُ الحدیث

اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ تین قسم کے لوگ ایسے ہیں جن کو دہرا اجر ملتا ہے۔

اوّل: وہ جو پہلے کسی سابق نبی اور آسمانی کتب پر ایمان لایا، پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا۔

دُوم: وہ غلام جو اللہ تعالیٰ کے حقوق بھی ادا کرتا ہے اور اپنے مولیٰ (مجازی) کے بھی۔

سوم: وہ شخص جس کی ملکیت میں کوئی باندی ہو اس کو وہ خوب تعلیم و تربیت سے آراستہ کر کے اس کو آزاد کردے اور اس کے بعد اس سے شادی کرلے۔

قولہٗ ثَلَاثَةٌ: اَىْ ثَلَاثَةُ اَشْخَاصٍ

سوال: ان تینوں کو دُہرا اجر ملنے کا سبب کیا ہے؟

جواب: یہ کہ ان کاموں میں مشقت زیادہ ہے:

پہلا شخص: اولاً ایک نبی پر ایمان لایا اور اس پر مکمل اعتماد کیا اس کے بعد اپنا مرکزِ اعتقاد بدل کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مرکزِ اعتقاد بنالیا، مرکزِ اعتقاد تبدیل کرنا بڑا مشکل کام ہے۔

دوسرا شخص: اس کے سامنے دو قسم کے حقوق ہیں۔ حقوق اللہ، اور اپنے آقا کے حقوق، کبھی دونوں کے حقوق اور ان کے مطالبہ میں تعارض بھی ہوسکتا ہے۔ ایسے موقعہ پر دونوں کے حقوق نبھانا بڑا مجاہدہ طلب کام ہے۔

تیسرا شخص: اس نے مجاہدہ تو کیا کہ باندی کی تعلیم و تربیّت کی۔ جب کہ عموماً ان سے خدمت تو لی جاتی ہے تعلیم و تربیّت نہیں دی جاتی۔ پھر جب اچھی تعلیم و تربیّت سے آراستہ ہوگئی اور خوب سلیقہ شعار بن گئی۔ تو اب اس کی خدمت حاصل کرنے کا بہترین موقع تھا۔ اب اس کو آزاد کردیا۔

یہ بہت بڑا مجاہدہ ہے پھر آزاد کرنے کے بعد اس سے نکاح کر لیا یہ اور اس سے بڑا مجاہدہ ہے کیونکہ پہلے تو وہ صرف اس کی مملوک اور ماتحت تھی اب زندگی کی برابر شریک بن گئی۔

سوال اور بھی کئی افراد ایسے ہیں جن کے لیے دوہرے اجر کا وعدہ ہے مثلاً ازواج مطہرات کے بارے میں ربّ ذوالجلال فرماتے ہیں :۔

وَمَنْ يَقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ (پ۲۲)

حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں بیس سے زائد نظائر پیش کیے ہیں پھر ان تین کی تخصیص کیوں کی گئی۔

جواب اوّل : یہ کہ وہ موقع ہی ان تین کو ذکر کرنے کا تھا اس لیے ان تین پر اکتفا کیا۔

جواب دوم : حالات کی مناسبت سے کوئی اور داعیہ ہو۔

جواب سوم : چونکہ یہ تین قسم کے لوگ تقریباً ہر زمانہ میں پائے گئے ہیں بخلاف ازواج مطہرات وغیرہنّ کے اس لیے ان تین کو خاص کیا۔

سوال : جب وہ عمل بھی دو دو کرتے ہیں تو ان کو دوہرا اجر دینا ان کی کیا خصوصیت ہوئی۔ ہر دو کام کرنے والے کو دو اجر ملتے ہیں۔

جواب : وہ یہ نہ سمجھیں کہ ہمیں ایک ثواب ملے گا۔ مثلاً حضور پُر نور پر ایمان لانے والا یہ نہ سوچے کہ اب تک میں جس شریعت پر رہا ہوں وہ منسوخ ہوگئی وہ سارے عمل بھی ختم ہوگئے ایسے ہی غلام نہ سوچے کہ مولی کی خدمت تو میرے فرائض میں داخل ہے اس پر کوئی اجر نہ ہوگا یا آزاد کر کے نکاح کرنے والا یہ نہ سمجھے کہ نکاح میں میری ذاتی منفعت ہے اس پر کیا اجر ملے گا۔ تو ان کو کہا گیا کہ تمہارے دونوں عمل میں سے ہر ایک عمل پر دوہرا اجر عطا فرمائیں گے۔

قولہ رَجُلٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اٰمَنَ بِنَبِيِّهٖ وَاٰمَنَ بِمُحَمَّدٍ : رَجُلٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ کا مصداق کون ہیں اس بارے میں دو مسلک ہیں۔

مسلکِ اوّل اس سے مراد صرف نصاریٰ ہیں یہود اگر مسلمان ہوجائیں تو ان کے لیے دوہرے اجر کا وعدہ نہیں ہے ان کی دلیلیں دو قسم کی ہیں عقلی و نقلی۔

دلیل نقلی صحیح بخاری ص۴۹۰ ج ۱ باب قول اللہ عزوجل وَاذْکُرْ فِی الْکِتَابِ مَرْیَمَ الخ حضرت ابی موسیٰ الاشعریؓ کی روایت ہے جس کے الفاظ ہیں اٰمَنَ بِعِیْسٰی ثُمَّ اٰمَنَ بِیْ : اس سے معلوم ہوا کہ یہ وعدہ صرف عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والوں کے لیے ہے۔

دلیل عقلی یہود موسیٰ علیہ السلام پر ایمان تو لائے لیکن عیسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کی جو کہ نبی ثابت الرسالت ہیں۔ ایک نبی ثابت الرسالت کی تکذیب سے دوسرے انبیاءؑ پر بھی ایمان غیر معتبر ہو جاتا ہے۔ لہٰذا یہود کا ایمان بموسیٰ کالعدم ہوا اس لیے وہ رَجُلٌ مِنْ اَهْلِ الْکِتَابِ اٰمَنَ بِنَبِیِّہٖ کے مصداق ہی نہیں بنتے۔

مسلک دوم ۔ عند الجمہور رجلٌ من اھل الکتاب سے یہود و نصاریٰ دونوں مراد ہیں

دلیل اول قرآن مقدس کی آیت ہے " اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنَاهُمُ الْکِتَابَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ یُؤْمِنُوْنَ وَاِذَا یُتْلٰی عَلَیْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا کُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِیْنَ اُولٰٓئِکَ یُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَیْنِ رپ۲ القصص

مفسرین حضراتؒ نے احادیث کی روشنی میں لکھا ہے کہ اس آیت کا شان نزول حضرت عبداللہؓ بن سلام اور دوسرے یہود کے علماء کا ایمان لانا مراد ہے جب اس وعدہ کے نزول کا سبب ہی یہود ہوئے تو ان کو اس کے مصداق سے خارج کیسے کیا جا سکتا ہے۔

دلیل دوم مسند احمد کی روایت کے لفظ ہیں رَجُلٌ اَسْلَمَ مِنْ اَهْلِ الْکِتَابَیْنِ کتابین تثنیہ لانے سے معلوم ہوا کہ اس سے مراد یہود و نصاریٰ دونوں ہیں پھر آیت قرآنی اور اس حدیث کے عموم کا تقاضا بھی یہی ہے۔

اَخْرَجَ النَّسَائِیُّ فِیْ کِتَابِ اَدَبِ الْقُضَاةِ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ یُؤْتِکُمْ کِفْلَیْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ اَیْ اَجْرَیْنِ بِاِیْمَانِهِمْ بِعِیْسَی بْنِ مَرْیَمَ وَبِالتَّوْرَاةِ وَالْاِنْجِیْلِ وَبِاِیْمَانِهِمْ بِمُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ :

حدیث مذکورہ میں ایمان بالتوراۃ والانجیل مذکور ہے رکذا فی التعلیق ص۱۲ ج ۱)

صحیح بخاری والی روایت کا جواب یہ ہے کہ امن بعیسٰی تمثیل کے لیے کہا گیا ہے حصر کے لیے نہیں، یعنی حضرت عیسٰی علیہ السلام کے ذکر کرنے سے دوسرے کی نفی مراد نہیں ہوسکتی۔
دلیل عقلی کا جواب یہ ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے تو حضرت عیسٰیؑ پر بھی ایمان لے آئے اس طرح ایمان بموسیٰؑ معتبر ہونے سے جو مانع تھا وہ ختم ہوگیا۔

قولہٗ والعبدُ المملوکُ اِذا ادّٰی حَقَّ اللّٰہِ وَ حَقَّ مَوَالِیہِ ۔ دوسرے وہ غلام جو اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرے اور اپنے مالکوں کا بھی۔

سوال : یہ کہ العبد کے ساتھ مملوک کی قید کیوں لگائی حالانکہ صرف لفظ العبد کی قید لگانے سے بھی تو بات سمجھ میں آسکتی ہے۔

جواب : یہ کہ مملوک کی قید اس لیے لگائی کہ آزاد نکل جائیں ورنہ عِبَادُ اللّٰہ میں تو وہ بھی داخل ہے۔

سوال ؛ حَقَّ مَوَالِیہِ میں مَوَالِیہِ کو جمع کے صیغہ کے ساتھ کیوں ذکر فرمایا؟

جواب اوّل ؛ یہ ہے کہ اَلعَبدُ پر الف لام جنس کا ہے تو ہر عبد کے لیے ایک مولیٰ ہوگا اس لیے جمع کا صیغہ استعمال فرمایا۔

جواب دوم : اس لیے جمع کا صیغہ استعمال فرمایا کہ عموماً غلام مختلف ہاتھوں میں فروخت ہوتا رہتا ہے عند البعض یہاں عبد مشترک مراد ہے۔

یقول ابوالاسعاد : حدیث مذکورہ کے ظاہر سے تو یہ بات ثابت ہو رہی ہے کہ ممالیک کے اجر سادات کے اجر سے زیادہ ہیں یعنی سادات کے اجور پر ممالیک کے اجروں کا بڑھ جانا لازم آرہا ہے

جواب اوّل ۔ علامہ کرمانیؒ نے کہا لا مَحذُورَ فِی ذٰلِکَ لقولہٖ تعالیٰ اِنَّ اَکرَمَکُم عِندَاللّٰہِ اَتقٰکُم۔
جواب دوم ؛ عند البعض حدیث مذکور میں بیان کردہ جہت سے غلام کا اجر دو چند ہے اور سادات کا اجر دوسری جہت یا دیگر اعمال کی جہت سے مضاعف ہوسکتا ہے۔
جواب سوم : حدیث مذکور میں اس عبد کو جس نے دونوں کا حق ادا کیا۔ اس عبد پر ترجیح

دینا ہے جس نے صرف ایک کا حق ادا کیا ترجیح علی السّادات کا ذکر بھی نہیں ۔
قولہٗ وَرَجُلٌ کَانَتْ عِنْدَہٗ اَمَۃٌ ،

سوال : حدیث مذکورہ میں اَجْرَانِ دو اجر کا ذکر ہے اس کی کیا وجہ ہے ؟

جواب : اَجْرَانِ (دو اجر) کی وجہ یہ ہے کہ امہ مملوکہ کے ساتھ نکاح کرنا عرفًا موجب تعییر ہے اس کے باوجود اس نے اپنے نفس پر بار ڈال کر اس کو اختیار کیا لہٰذا دو اجر ملیں گے " کما فی روایۃ ۔ اَجْرُکُمْ عَلٰی قَدْرِ نَصَبِکُمْ ای مُشَقَّتِکُمْ ۔

سوال ، حدیث پاک میں یطأھا (یعنی وطی کرے) کی قید کیوں لگائی ۔؟

جواب ، یہ ہے کہ یَطَأُھَا کی قید لگا کر اشارہ فرمایا تحصین فرج کی طرف کہ وطی کرنے سے اس کی باندی پاک دامن رہے گی ۔

سوال ، حدیث پاک میں تیسرے فریق (امۃ) کے لیے بھی دو اجر بیان کیے گئے ۔ حالانکہ ان کے اعمال کی تعداد چار بیان کی گئی ہے ۔ تعلیم ، تأدیب ، اعتاق ، تزویج ۔ یعنی آجر اور اجرت میں فرق کیوں ہے ؟

جواب اوّل ، یہ ہے کہ تعلیم و تأدیب پر ایک اجر اور دوسرا اعتاق و تزویج پر یا بالعکس چنانچہ اسی فائدہ کی غرض سے ثُمَّ سے عطف کیا گیا ہے ۔

جواب دوم : جس کو جمہور حضراتؒ نے اختیار کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ دراصل اِمَاء کے بارے میں اعتبار صرف اعتاق و تزویج کا کیا گیا ہے کیونکہ تعلیم و تأدیب کا سببِ اجر ہونا اِمَاء کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اپنی اولاد اور اجنبی کے بارے میں بھی باعث اجر ہے ۔

سوال : حضرت نے فرمایا کہ آزاد کرے اور پھر خود شادی کرے اس میں کیا ثواب ہے اور تخصیص کی کیا وجہ ہے ؟

جواب : زمانۂ جاہلیّت میں لوگوں کا عقیدہ تھا کہ جو آدمی باندی آزاد کرے پھر اس کے ساتھ شادی کرے یہ ایسے ہے جیسے اپنی بیٹی کے ساتھ نکاح کرنا ۔ نبیِّ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو انسان اس کفر یہ رسم کو توڑے گا اس کو دو اجر ملیں گے ۔

قولہٗ فَاَدَّبَھَا ۔ تأدیب کا تعلّق عرف کے ساتھ ہے یعنی معاشرتِ انسانی کا طریقہ

سکھلائے کہ روٹی کیسے پکائی جاتی ہے، مہمان کو کھانا کیسے کھلایا جائے۔
قولہٗ عَلَّمَهَا : تعلیم کا تعلق احکامِ شریعت کے ساتھ ہے مثلاً نماز روزہ کی تعلیم دیتا ہے۔
قولہٗ فَلَهٗ اَجْرَانِ۔
سوال۔ فَلَهٗ میں لَهٗ کا ضمیر کس کی طرف راجع ہے۔
جواب۔ عند الجمہور لہٗ کی ضمیر ما قبل میں ہر ایک کی طرف راجع ہے یعنی تینوں آجروں کی طرف، باقی تکرار کلام طویل ہونے کی وجہ سے کیا گیا ہے۔
یقول ابو السعاد : یُشِیْرُ باندی کے معاملہ میں اہتمام کرنا ہے۔ لِتَسَاهُلِ النَّاسِ

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَشْهَدُوْا اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ

ترجمہ : حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں (کفار) سے اس وقت تک جنگ کروں جب تک کہ وہ گواہی نہ دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

یہ حدیث پاک سورۃ توبہ کی آیت ۱۱ کی تفسیر ہے :
فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِى الدِّيْنِ
اس حدیث پاک کو حدیث القتال بھی کہتے ہیں یعنی تسمیۃ الکل باسم الجزء کے قبیل سے ہے کیونکہ اس میں قتال کا ذکر ہے۔ اس حدیث کے متعلق اہم مباحث کو عنوانات سے لکھا جاتا ہے۔

عنوان اوّل ـــ حاصل الحدیث

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مجھے لوگوں سے قتال اور جہاد کا حکم دیا گیا جب تک کہ لوگ تین کام نہ کرلیں (۱) شہادتین کا اقرار۔ (۲) اقامۃ الصلوٰۃ (۳) ایتاء الزکوٰۃ۔ جو لوگ یہ تین کام کرلیں گے یعنی سچے مسلمان ہو جائیں گے

وہ معصوم الدم ہوجائیں گے۔ اب ہمارے لیے نہ ان کے مال سے تعرض جائز رہے گا اور نہ ہی جان۔
البتہ مسلمان ہوجانے کے بعد اگر کسی موقعہ پر کسی حق اسلام کا تقاضا ہو تو وہ معصوم الدم نہ رہے گا۔

قولہٗ اُمِرْتُ : یعنی مجھے حق تعالیٰ نے حکم دیا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے امر خدا تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوسکتا لہٰذا اُمِرْتُ کی ضمیر ربِّ ذوالجلال والاکرام کی طرف راجع ہے۔

قولہٗ حتّٰی : یہاں پر حتّٰی بمعنٰی کَیْ ہے۔ جیسے اسلمتُ حتّٰی ادخل الجنۃ یعنی مجھے حکم الٰہی ہے کہ ملک گیری یا مال گیری کی نیت سے جہاد نہ کروں بلکہ لوگوں کو ہدایت دینے کی نیت سے کروں۔

قولہٗ فَاِذَا فَعَلُوْا ذَالِکَ ۔ ذالک کا مشار الیہ مذکورہ تین کام ہیں۔

سوال ۔ کہ اس میں عمل داخل ہیں مگر شہادت داخل نہیں کیونکہ وہ ایک قولی چیز ہے۔

جواب : فَعَلُوْا عام ہے زبان سے ہو یا فعل سے۔

سوال ۔ مسلم شریف کی روایت میں ہے یُؤْمِنُوْا بِمَا جِئْتُ بِہٖ تو اس کے اندر عموم تھا نماز روزہ آگیا۔ پھر نماز روزہ کو علیحدہ کیوں ذکر فرمایا؟

جواب : یہ دونوں کام مہتم بالشان ہیں اس لیے ان کو علیحدہ ذکر فرمایا۔

قولہٗ اِلَّا بِحَقِّ الْاِسْلَامِ : استثناء ہے ان کے معصوم الدم اور معصوم المال ہونے سے یعنی ان کی جان و مال سے تعرض جائز نہیں۔ مگر حقُّ الاسلام کی وجہ سے جائز ہے مثلاً مرتد ہوگیا یا محصن سے زنا کر لیا، یا کسی معصوم الدم کو عمداً قتل کر دیا۔ ان صورتوں میں اس کا دم محفوظ نہ رہے گا۔

سوال ۔ اس حدیث میں صوم و حج کا ذکر نہیں۔

جواب اوّل : اس وقت تک یہ دونوں فرض نہیں ہوئے تھے۔

جواب دوم : نماز بدنی عبادت کی اور زکوٰۃ مالی عبادت کی اصل ہے۔ اس لیے ان دونوں کو خاص کیا۔

قولہٗ وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ : یہ ایک سوال کا جواب ہے۔ سوال یہ ہے

کہ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص مذکورہ تین کام ظاہری طور پر صرف جان بچانے کے لیے کرے دل سے مسلمان نہ ہو تو یہ جملہ ارشاد فرما کر اس کا جواب دے دیا کہ تم صرف ظاہر کے مکلف ہو باطن کا معاملہ خدا کے سپرد ہے۔

عنوانِ دوم

حدیث القتال کا حکم اور اعطاءِ جزیہ سے تعارض

سوال اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قتال کی غایت صرف اسلام لانا ہے حالانکہ اجماعی مسئلہ ہے کہ اگر کوئی اسلام لانے کے بجائے جزیہ دینا قبول کرے تو اس سے بھی قتال کو روک دیا جائے۔ کما فی قولہ تعالیٰ:۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿پ۱۰، براءۃ﴾

جواب اوّل: یہ حدیث جزیہ کا حکم نازل ہونے سے پہلے کی ہے۔ جزیہ کا حکم نازل ہونے کے بعد یہ حدیث منسوخ ہوگئی۔

جواب دوم: اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ میں النّاس پر الف لام استغراق کے لیے نہیں بلکہ الف لام عہد خارجی کے لیے ہے اس سے خاص لوگ مراد ہیں یعنی مشرکینِ عرب اور ان کا حکم یہی ہے کہ ان سے جزیہ قبول کرنا جائز نہیں۔ جب تک کہ مسلمان نہ ہوں ان سے جہاد ضروری ہے الف لام عہد کی ہونے کی تائید نسائی شریف کی روایت سے ہوتی ہے جس کے الفاظ ہیں:۔

اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ الْمُشْرِكِيْنَ۔ (عمدۃ القاری ص۱۸۱ ج۱)

جواب سوم۔ حَتّٰى يَشْهَدُوْا کا معنیٰ ہے کہ یہاں تک کہ وہ اسلام لے آئیں یا ایسی چیز کا التزام کریں جو ان کو اسلام تک پہنچا دے اور جزیہ کو قبول کر کے مسلمانوں کے ملک میں رہنا یہ

بھی اسلام تک پہنچانے والا ہے۔ کیونکہ اس طریقہ سے وہ اسلام کو سمجھیں گے اور ان کے دلوں میں سلام کی محبت پیدا ہوگی تو جزیہ بھی موصل الی الاسلام ہو سکتا ہے اس لیے کہ ذمی بنانے کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ اسلامی معاشرہ میں رہے۔ اسلام کے محاسن قریب سے دیکھے اور اسلام کی حقانیت کے دلائل سوچنے کا موقعہ ملے اور ان سے متأثر ہو کر مسلمان ہوجائے۔

عنوانِ سوم

تارکِ صلوٰۃ کا حکم

تارک صلوٰۃ دو قسم ہے اوّل تارکُ الصّلوٰۃ استحلالاً: یعنی جو شخص نماز چھوڑے اور چھوڑنے کو جائز بھی سمجھے تو یہ بالاجماع کافر ہے۔ دوّم تارک الصّلوٰۃ تکاسُلاً: یعنی جو شخص نماز کو فرض اور اس کے چھوڑنے کو ناجائز تو سمجھتا ہے لیکن سستی اور تکاسُلاً نماز نہیں پڑھتا تو اس کے حکم میں اختلاف ہے اور اس بارے میں دو مسلک ہیں۔

مسلکِ اوّل حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن مبارکؒ و اسحٰق بن راہویہ اور حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک تارکُ الصّلوٰۃ المکتوبۃ عمدًا بلا عذر کافر ہے۔

مُستدل ۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ صلوٰۃ اسلام کے ان بنیادی حکموں میں سے ایک حکم ہے جس پر اسلام اور دین کی بنیاد ہے۔ کما فی قولہٖ علیہ السّلام: بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ نیز صلوٰۃ کا ثبوت نص قطعی سے ثابت ہے تو گویا یہ نص قطعی کا بھی منکر ہے اور عند الجمہور نص قطعی کا منکر کافر ہے۔

مسلک دوّم ۔ جمہور علمائے اُمّت کے نزدیک تکاسُلاً فرض نماز کو عملاً چھوڑنے والا کافر نہیں فاسق ضرور ہے

مستدل ۔ ترکِ صلوٰۃ بھی ایک گناہِ کبیرہ ہے اور اس کا حکم دوسرے مُرتکب کبیرہ جیسا ہے کہ تحت المشیئۃ ہے "ان شآء عذّبہ وان شآء غفر لہٗ" کما فی المشکوٰۃ ص۵۸ ج۱

کتابُ الصَّلوٰۃ فصلِ اوّل" وَمَنْ لَمْ یَأْتِ بِهِنَّ فَلَيْسَ لَهُ عَلَى اللهِ عَهْدٌ إِنْ شَاءَ عَذَّبَهُ وَإِنْ شَاءَ غَفَرَلَهُ -!

کفر کا حکم لگانے والوں کے مستدل کا جواب

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ تارکُ الصّلوٰۃ عملاً ہے۔ لَا إِعْتِقَادًا وَحُكْمًا وَلِهٰذَا لَا يُحْكَمُ بِالْكُفْرِ۔

عُنوان چہارم

تارکِ صلوٰۃ عمدًا کی سزا

تارکِ صلوٰۃ عمدًا کی سزا کیا ہے؟ اس بارہ میں بھی دو مسلک ہیں۔

مسلکِ اوّل ۔ امام مالکؒ وامام شافعیؒ کے نزدیک اس کی سزا یہ ہے کہ اسے قتل کیا جائے۔ اور یہ قتل ردّاً نہ ہوگا بلکہ حدّاً ہوگا۔

مسلکِ دوم ۔ امامِ ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس کی سزا قتل نہیں بلکہ اس کی سزا یہ ہے کہ حاکمِ وقت اس کو قید کرے اور خوب پٹائی کرے۔ یہاں تک کہ یا تو مر جائے یا توبہ کرے۔

قائلین بالقتل کی دلیلِ اوّل

جو حضرات تارک الصلوٰۃ کی سزا قتل بتلاتے ہیں ان کا استدلال اس حدیث اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ سے بھی ہے۔ اس میں قتال کی غایت شہادتین اور اقامۃ الصّلوٰۃ بیان کی گئی ہے۔ معلوم ہوا کہ اقامۃُ الصّلوٰۃ نہ کریں تو ان سے قتال کیا جائے گا۔

جوابِ اوّل الزامی

اس دلیل کا الزامی جواب تو یہ ہے کہ قتال کی غایت میں اقامۃ الصّلوٰۃ کے ساتھ ایتاء الزکوٰۃ بھی مذکور ہے۔ اگر اس حدیث سے یہ استدلال کیا جائے کہ تارک الصّلوٰۃ کو قتل کیا جائے تو لازم آئے گا کہ تارک زکوٰۃ کو بھی قتل کیا جائے حالانکہ یہ حضرات اس کے قائل نہیں۔ مَا هُوَ جَوَابُكُمْ فَهُوَ جَوَابُنَا۔

جواب دوم تحقیقی علامہ ابن دقیق العید اس استدلال کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ استدلال قتال اور قتل میں فرق نہ کرنے پر مبنی ہے حالانکہ قتال اور قتل میں فرق ہے۔ قتال کا معنیٰ لڑنا، اس کو قتل لازم نہیں اور یہ باب مفاعلہ کا مصدر ہے جوکہ جانبین سے ہوتا ہے۔ اور قتل میں جانبین سے لڑائی نہیں ہوتی بلکہ ایک فریق دوسرے کو مارتا ہے۔ چنانچہ امام بیہقی نے امام شافعیؒ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے:۔

لَیْسَ الْقِتَالُ مِنَ الْقَتْلِ بِسَبِیْلٍ فَقَدْ یَحِلُّ قِتَالُ الرَّجُلِ وَلَا یَحِلُّ قَتْلُہٗ

(فتح الباری ص ۲۶)

خلاصہ یہ ہے کہ تارک صلوٰۃ سے قتال ثابت ہوتا ہے اس کے ہم بھی قائل ہیں بلکہ نماز تو بڑی چیز ہے۔ امام محمدؒ نے آذان کے بارہ میں لکھا ہے کہ اگر کوئی بستی والے آذان کہنا چھوڑ دیں یا چھوڑنے پر اتفاق کرلیں اور حاکم وقت کے کہنے پر نہ مانیں تو حاکم وقت ان سے قتال کرسکتا ہے۔ جب حنفیہ تارکِ آذان سے قتال کے قائل ہیں تو تارکِ صلوٰۃ سے بدرجہ اولیٰ قائل ہوں گے البتہ قتل کے قائل نہیں اور نہ ہی قتل حدیث سے ثابت ہوتا ہے۔

قائلین بالقتل کی دلیل دوم تارکِ صلوٰۃ کے وجوب قتل پر اس آیت سے بھی دلیل پکڑی جاتی ہے " فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَخَلُّوْا سَبِیْلَھُمْ (پ) اس سے قبل قتل مشرکین کا حکم آرہا ہے پھر فرمایا اگر وہ توبہ قبول کرلیں اور نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں تو ان کا راستہ چھوڑ دو۔

جواب یہ کہ اِقَامَتُ الصَّلٰوۃ اور اِیْتَآءُ الزَّکٰوۃ تخلیہ سبیل کی شرط ہے یعنی جب تک نماز کی پابندی نہ کریں، زکوٰۃ نہ دیں تب تک ان کا راستہ نہ چھوڑو بلکہ گرفت کرو۔ یہ آیت احناف کے خلاف تب ہوتی جب کہ ترکِ صلوٰۃ کی صورت میں ان کا مذہب یہ ہوتا کہ ان کو چھوڑ دو، کچھ نہ کہو اور حنفیہ اس کے قائل نہیں بلکہ وہ حبس اور تعزیر شدید کے قائل ہیں۔ کَمَا مَرَّ: اگر بالفرض ان حضرات کا استدلال اس آیت سے صحیح مان لیا جائے تو خود ان کے بھی خلاف ہوگا اس لیے کہ اِقَامَۃُ الصَّلٰوۃ کے ساتھ اٰتُوا الزَّکٰوۃ بھی ہے تو تارکُ الزکوٰۃ کا قتل لازم آئے گا۔ حالانکہ یہ حضرات بھی اس کے قائل نہیں۔

وَعَنْ اَنَسٍؓ اَنَّهٗ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَلّٰى صَلٰوتَنَا

ترجمہ : حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص ہماری طرح نماز پڑھے۔

مَنْ صَلّٰى صَلٰوتَنَا کی تشریح

مطلب یہ ہے کہ شریعۃ محمدیہ کے موافق نماز پڑھے یعنی رکوع بھی کرے۔ کیونکہ یہود کی نماز میں رکوع نہیں تھا۔ اور پانچ وقتہ نماز پڑھے کیونکہ پہلی امتوں میں صرف دو یا ایک نماز تھی اور ایسی نماز اقرار توحید اور اعتراف نبوت پر موقوف ہے۔ اور اعتراف نبوت تمام احکام شرعیہ کو مستلزم ہے۔ تو ادعیہ نماز سے جمیع ما جاء بہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق ہوگئی۔ اس لیے نماز اسلام کی علامت ہے۔

وَاسْتَقْبَلَ قِبْلَتَنَا کی تشریح

اور ہمارے قبلہ کی طرف نماز میں رخ کرے۔ یعنی اہل کتاب والا قبلہ نہ ہو بلکہ وہ مسلمانوں کے قبلہ کی طرف منہ کرے۔

سوال یہ کہ استقبالِ قبلہ بھی تو بضمن مَنْ صَلّٰى صَلٰوتَنَا میں آگیا بلکہ صلوٰۃ میں مشروطہ ہوکر موجود ہے پھر اس کو علیحدہ مستقل کیوں ذکر فرمایا ؟

جواب اوّل یہ ہے کہ اگرچہ نماز ہر ایک کو معلوم نہ ہو لیکن قبلہ ظاہر عرف مشہور کالمحسوس ہونے کی بناء پر ہر ایک کو معلوم ہے تو گویا کہ قبلہ اعرف من الصلوٰۃ ہوا اسی لیے اس کو مستقل ذکر فرمایا۔

جواب دوم بعض اعمال صلوٰۃ وہ ہیں جو امت محمدیہ کی نماز کے ساتھ خاص نہیں کالقیام وَالْقِرَأَةِ وَاسْتِقْبَالُ الْقِبْلَةِ مَخْصُوْصٌ بِنَا فَلِذَا ذَكَرَهٗ مُسْتَقِلًّا یعنی یہود و نصاریٰ کی نمازیں بھی قیام وقرآت وغیرہ ہے اس سے بالکلیہ امتیاز کے لیے استقبال کا صراحۃً ذکر فرمایا کیونکہ وہ لوگ نماز بیتُ المقدس کی طرف منہ کرکے پڑھتے تھے جبکہ ہمارا قبلہ کعبۃ اللہ ہے۔

قولہٗ وَاَکَلَ ذَبِیْحَتَنَا (اور ہماری ذبیحہ کو کھائے) ذبیحہ فعیل بمعنیٰ مفعول ہے اکل ذبیحہ عبادت اور عادت دونوں کو شامل ہے تو آپ نے ایسا ممیز ذکر فرمایا جو عادت میں بھی تمیز کرے کہ وہ مسلمانوں کی ذبیحہ کھاتا ہو کیونکہ بعض کفار مسلمانوں کی ذبیحہ نہیں کھاتے تھے اور اس سے پہلے دو ممیزات صرف عباداتی ہیں۔ بہرحال یہاں حصر مقصود نہیں بلکہ علامات کفر کا فقدان اور علامات اسلام کا وجود مراد ہے اور ان تین علامات کی خصوصیت مقتضائے زمانہ کی وجہ سے ہے۔

ترجمہ : پس وہ مسلمان ہے جو اللہ اور اس کے رسول کے عہد وامان میں ہے۔	قولہٗ فَذَالِكَ الْمُسْلِمُ الَّذِیْ لَهٗ ذِمَّةُ اللّٰهِ وَذِمَّةُ رَسُوْلِهٖ

پس جو شخص اللہ تعالیٰ کے عہد وامان میں ہے تم اس کے ساتھ عہد شکنی مت کرو! یعنی شعائر اسلام کی بجا آوری کے بعد ان کے ساتھ کسی قسم کا برا سلوک نہ کرو یعنی ان کے ساتھ بد سلوکی کرنا اللہ تعالیٰ کے عہد کو توڑنے کے مترادف ہے۔

قولہ وَلَا تُخْفِرُوْا ۔ تخفروا، اخفار سے ہے بمعنیٰ خیانت کرنا، عہد شکنی کرنا۔ حدیث کا حاصل یہ ہے کہ تین چیزیں مسلمان ہونے کی علامت ہیں جس میں یہ علامتیں پائی جائیں اس کو مسلمان سمجھو اور مسلمان سمجھنے کا لازمی نتیجہ ہے کہ اس کو اللہ ورسول کی ذمہ داری میں سمجھا جائے اس کے مال وجان وآبرو میں بغیر حق کے تعرض نہ کیا جائے۔

سوال ۔ اس حدیث سے مرزائی وغیرہ استدلال پکڑتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو تین کام کرلے وہ مسلمان ہے اس کو کافر کہنا جائز نہیں یہ تین کام تو ہم بھی کرتے ہیں پھر ہماری تکفیر کیوں کی جاتی ہے۔

جواب اوّل یہ تین چیزیں ایمان کی ظاہری علامت ہیں اور ظاہری علامت اس وقت معتبر ہوتی ہے جب کہ اس کا منافی موجود نہ ہو اور ان لوگوں میں منافی موجود ہے منافی بعض ضروریات دین کا انکار ہے۔

جواب دوم الزامی ۔ کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنے نہ ماننے والوں کو کافر قرار دیا ہے

حالانکہ ان کے مخالفین یہ تینوں کام کرتے ہیں۔ اس کے باوجود انہوں نے ان کی تکفیر کی۔ کیا اس حدیث کے خلاف نہیں ہے۔

وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ اَتَی اَعْرَابِیٌّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ دُلَّنِیْ عَلٰی عَمَلٍ اِذَا عَمِلْتُهٗ دَخَلْتُ الْجَنَّةَ

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ ایک دیہاتی نبی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ مجھے ایسا عمل بتا دیجیے کہ جس کے کرنے سے میں جنت میں داخل ہو جاؤں۔

قولہ اَعْرَابِیٌّ ۔ بمعنیٰ دیہاتی جو آداب مجلس نبویؐ سے ناآشنا ہو جس کو فارسی میں بادیہ نشین کہتے ہیں۔ اور یہ اعرابی قبیلہ قیس کا ایک شخص تھا۔ جن کا نام بعض نے ابن المنتفق اور بعض نے لقیط بن صبرۃ بتایا جب کہ علامہ عینی کی رائے یہ ہے کہ یہ اعرابی سعد بن الاخرم ہیں۔ بہرحال صحابیٔ رسول ہونے میں اتفاق ہے۔

قولہ عَلٰی عَمَلٍ ۔ صحابی رسولؐ نے تعلیم عمل کو دخول جنت کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ اور یہ ظاہری سبب کی حد تک ہے کیونکہ حقیقی ذریعہ لدخول الجنت رحمت وفضل رب ذوالجلال ہے۔

قولہ دَخَلْتُ الْجَنَّةَ ۔ یہاں جنت کا دخول اُولیٰ مراد ہے جو بغیر عذاب کے ہو۔

قولہ تَعْبُدُ اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا ۔ تعبدُ اللہ یہ خبر بمعنیٰ امر ہے ای اعبُدُ اللہَ یا لفظ اَنْ مقدر ہے جس کی وجہ سے بتاویل مصدر مبتدا محذوف کی خبر ہے اَیْ هُوَ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ۔

سوال ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادتین کا ذکر کیوں نہیں فرمایا حالانکہ بغیر شہادتین زیادتی فی الکلام تصور ہوتی

جواب اوّل ؛ یہ کہ وہ مسلمان تھا مسلمان ہونے کی بنا پر تعلیم شہادتین زیادتی فی الکلام تصور ہوتی اس لیے ترک فرمایا۔

جواب دوم۔ تَعْبُدُ اللہَ بمعنیٰ وَحِّدِ اللہ کے ہے کیونکہ آئندہ عبادت کا ذکر آرہا ہے اور وحدانیت بغیر اقرار نبوت معتبر نہیں۔ لہٰذا اس کے ضمن میں شہادتین کا ذکر آگیا ہے بنا بریں ذکر کی حاجت نہیں۔

سوال۔ تعلیمِ اعمال میں حج کا ذکر کیوں نہیں فرمایا؟

جواب اوّل: یہ واقعہ ۵ھ کا ہے اور بقولِ مشہور حج کی فرضیت ۹ھ میں ہوئی فکیف یُعَلِّمُ الحجّ۔

جواب دوم: یہ ہے کہ نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ذکر فرمایا جیسا کہ حضرت ابنِ عباسؓ کی روایت میں ہے یہاں راوی سے نسیانًا یا اختصارًا چھوٹ گیا۔

جواب سوم: یہ ہے کہ وہ اعرابی بنیّت حج ہی نکلا تھا اس لیے ذکر کی ضرورت نہیں

قولہٗ قَالَ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَا اَزِیْدُ عَلٰی ھٰذَا شَیْئًا وَلَا اَنْقُصُ مِنْہُ

(ترجمہ) اس ذات کی قسم ہے جس کے قبضہ میں میری جان ہے میں نہ اس پر کچھ زیادہ کروں گا اور نہ اس میں سے کچھ کم کروں گا۔

سوال: یہ ہے کہ اس شخص نے زیادت خیر کے ترک پر قسم کھائی اور آپ نے اسے برقرار رکھا یعنی نکیر نہیں فرمائی۔ حالانکہ وَقَدْ وَرَدَ النَّکِیْرُ عَلٰی مَنْ حَلَفَ اَنْ لَّا یَفْعَلَ خَیْرًا۔ کما فِی ابی داؤد ص۹۱ ج۲ بابُ الْحِنْثِ اِذَا کَانَ خَیْرًا بروایۃ عبدِ الرَّحْمٰن بن سَمُرَۃ اِذَا حَلَفْتَ عَلٰی یَمِیْنٍ فَرَأَیْتَ غَیْرَھَا خَیْرًا مِنْھَا فَأْتِ الَّذِیْ ھُوَ خَیْرٌ وَکَفِّرْ یَمِیْنَکَ: وَفِیْ مَقَامٍ اٰخَرَ ابوداؤد ص۱۱۵ ج۲ بابُ الْیَمِیْنِ فِیْ قطیعۃِ الرَّحِمِ کَفِّرْ عَنْ یَمِیْنِکَ وَکَلِّمْ اَخَاکَ۔:

جواب: یہ کہ احوال و اشخاص کے اختلاف کی بنا پر احکام بھی مختلف ہو جاتے ہیں۔ یہاں بھی کسی خاص آدمی کے لیے کسی خصوصی حالت میں جائز رکھا گیا ہو۔

سوال: یہ کہ لَا اَنْقُصُ پر جنتی ہونے کی بشارت دینا تو مقتضیٰ عقل ہے لیکن لَا اَزِیْدُ عَلٰی ھٰذَا پر یہ بشارت خلاف نقل و عقل ہے کیونکہ قرآن مقدس میں زیادتی فی الخیر کا حکم ہے۔ فَاسْتَبِقُوا الْخَیْرَاتِ:

جواب اوّل : یہ ہے کہ لَا اَزِیْدُ ھٰذَا کا معنیٰ ہے کہ لَا اَزِیْدُ عَلٰی ھٰذَا السُّؤَال مطلب یہ تھا کہ اس وقت صرف یہی پوچھنا تھا جو پوچھ لیا ہے اس وقت اور سوال نہیں کروں گا اور جو کچھ جناب نے فرما دیا ہے اس پر عمل کرنے میں کمی نہ کروں گا۔

جواب دوّم : یہ شخص اپنے قبیلہ کا نمائندہ بن کر تعلیم حاصل کرنے آیا تھا جا کر اس نے اپنی قوم کے سامنے یہ باتیں نقل کرنی تھیں اس لیے لَا اَزِیْدُ وَلَا اَنْقُصُ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تبلیغ کرنے کے وقت یہ باتیں بعینہٖ نقل کرنے میں کمی زیادتی نہ کروں گا، پوری دیانت داری سے کام لونگا اور یہی سفارتکاری کا شعار ہے۔

جواب سوّم : یہ ہے کہ اصل مقصود اس شخص کا لَا اَنْقُصُ ہے لَا اَزِیْد کہنا مقصود نہیں یعنی لَا اَزِیْد تاکیدًا ومحاورۃً ہے۔ محاورات میں عام طور پر یہ الفاظ اکٹھے ذکر کر دیئے جاتے ہیں مثلاً بائع سے مشتری نے ثمن پوچھے اس نے کہا سو روپے! مشتری جواب میں کہہ دیتا ہے کہ بھائی کچھ کمی بیشی کرو! حالانکہ مقصود کمی کرانا ہے زیادتی نہیں اسی طرح سے اس صحابیؓ کا مقصد صرف نقص کی نفی کرنا تھا۔

قولہٗ فَلَمَّا وَلّٰی قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ سَرَّہٗ اَنْ یَّنْظُرَ اِلٰی رَجُلٍ مِّنْ اَھْلِ الْجَنَّۃِ فَلْیَنْظُرْ اِلٰی ھٰذَا : (ترجمہ) جب وہ دیہاتی چلا گیا تو نبی علیہ السلام نے فرمایا جو شخص کسی جنتی آدمی کو دیکھنے کی سعادت حاصل کرنا چاہے تو وہ اس شخص کو دیکھ لے۔

سوال ؛ جنّت کے دخول اُولیٰ کے لیے تمام محرمات سے اجتناب اور تمام واجبات کی پابندی ضروری ہے حالانکہ یہاں ان کا ذکر نہیں۔

جواب۔ عبادت کا مفہوم سب کو شامل ہے اور نماز کے متعلق قرآن مُقدّس میں ہے " اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ (پ۲۱) لہذا نماز کے ذکر سے تمام محرّمات سے اجتناب کا ذکر اجمالاً ہو گیا۔

یقول ابوالاسعاد ؛ جنتی ہونا گو خاتمہ بالخیر پر موقوف ہے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی معلوم ہو گیا تھا کہ اس کا خاتمہ بالخیر ہو گا۔ اس لیے لسانِ نبوت نے اس کے جنتی ہونے کی

بشارت سنادی۔ اس سے معلوم ہوا کہ جنتی آدمی کو دیکھنا بھی باعثِ ثواب اور اس کے دیدار سے گناہ بخشے جاتے ہیں۔ ؎

اٹھ جاگ فریدا ستیا ول مسجد دے جا | متّاں کوئی رل پوے تو بھی بخشا جا
(فریدؒ)

وَعَنْ سُفْيَانَ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ الثَّقَفِيِّ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قُلْ لِّيْ فِي الْاِسْلَامِ قَوْلًا لَا اَسْئَلُ عَنْهُ اَحَدًا بَعْدَكَ :

ترجمہ : روایت ہے حضرت سفیانؓ ابن عبداللہ ثقفی سے کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اسلام کے متعلق ایسی بات بتائیں کہ آپ کے بعد اس کے متعلق کسی سے نہ پوچھوں۔

قولہٗ بَعْدَكَ : لفظ بَعْدَكَ کے دو معنیٰ ہیں۔ اوّل یہ کہ آپ کے سوا کسی دوسرے سے سوال کرنے کی ضرورت نہ رہے۔ یعنی مضاف مقدر ہے اصل میں ہے "بَعْدَ سُؤَالِكَ"! دوّم یہ کہ آپ کی وفات کے بعد کسی سے سوال کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ پہلا معنیٰ زیادہ راجح ہے۔ کیونکہ دوسری روایت میں صراحۃً غیرك کا لفظ موجود ہے۔

قولہٗ قَالَ قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ : (ترجمہ) آپ نے فرمایا کہ دل سے اس بات کا اقرار کرو کہ اللہ پر ایمان لایا، اور پھر اس اعتراف و اقرار پر قائم رہو۔

اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ کے دو مطلب بیان کیے گئے ہیں۔ اوّل اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ سے اگر تمام ایمانیات مراد ہوں تو فَاسْتَقِمْ سے جمیع احکام وطاعات مراد ہوں گے۔ دوّم اگر اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ سے جمیع مأمورات ومنہیات مراد ہوں تو فَاسْتَقِمْ سے اس پر مداومت کرنا مراد ہوگی گویا یہ حدیث قرآن پاک کی اس آیت کی تفسیر ہے "اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا (پ۲۴)

یقول ابو الاسعاد : یہ حدیث جوامع الکلم میں سے ہے کیونکہ یہ تمام ایمانیات اور تمام طاعات کو شامل ہے بلکہ یہ ع عِبَارَاتُنَا شَتّٰى وَحُسْنُكَ وَاحِدٌ : کے قبیل سے ہے ایک

جامع لفظ کی تعبیر وتفسیر مختلف عنوان سے ہوتی ہے۔ لفظ استقامت کے مختلف معانی بیان کئے گئے ہیں۔ مثلاً سیدنا ابوبکر الصدیقؓ سے استقامت کے متعلق سوال کیا گیا تو جواب میں فرمایا «

اَنْ لَا تُشْرِكَ بِاللّٰهِ شَيْئًا۔

وَقَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِؓ: "اَلْاِسْتِقَامَةُ اَنْ تَسْتَقِيْمَ عَلَى الْاَمْرِ وَالنَّهْيِ وَلَا تَرُوْغَ رَوْغَانَ الثَّعَالِبِ": استقامت کہا جاتا ہے کہ امر ونہی پر اس طرح مضبوط رہنا کہ لومڑی کی طرح ادھر ادھر میلان نہ ہو۔

وقال عثمانؓ بن عفان: ـ اِسْتَقَامُوا اَخْلَصُوا الْعَمَلَ لِلّٰهِ۔

خلاصۃُ الکلام استقامت نام ہے تصلّب فی الدین کا۔ یعنی جمیع مامور کی ادائیگی اور ہر منکرات سے اجتناب میں مضبوط رہنا۔ لہٰذا دین کے کسی حکم سے ادنیٰ انحراف بھی استقامت کی ضد ہے اور یہ بہت عظیم الشان چیز ہے۔ چنانچہ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شَيَّبَتْنِيْ هُوْدٌ وَاَخَوَاتُهَا مجھے سورۃ ہود نے بوڑھا کر دیا کیونکہ اس میں فَاسْتَقِمْ كَمَا اُمِرْتَ کے ساتھ حکم کیا گیا ہے۔ نیز صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ اَلْاِسْتِقَامَةُ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ كَرَامَةٍ

اسمائے رِجال

حضرت سُفیانؓ بن عبد اللہ الثقفی کے حالات

آپ کی کنیت ابوعمرو ثقفی ہے ان کا شمار اہل طائف میں ہوتا ہے کیونکہ ثقفی قبیلہ طائف میں رہتا تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانۂ خلافت میں آپ طائف کے عامل رہے۔ آپ کی صحبت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے آپ کی کل مرویات صرف پانچ احادیث ہیں۔

وَعَنْ طَلْحَةَؓ بْنِ عُبَيْدِ اللّٰهِ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ اَهْلِ نَجْدٍ ثَائِرُ الرَّأْسِ نَسْمَعُ دَوِيَّ صَوْتِهٖ وَلَا نَفْقَهُ مَا يَقُوْلُ :

ترجمہ : حضرت طلحہؓ بن عبید اللہ فرماتے ہیں کہ اہلِ نجد سے ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا جس کے سر کے بال پراگندہ تھے ہم اس کی آواز کی گنگناہٹ سنتے تھے اور اس کی بات سمجھتے نہ تھے۔

قولہ جَاءَ رَجُلٌ : تعیین رجل میں مختلف روایات ہیں۔ (۱) بقول قاضی عیاضؒ یہ رجل ضمام بن ثعلبہ تھے جو قبیلہ بنی سعد کے نمائندہ بن کر آئے تھے (۲) ابن حجرؒ اور علامہ عینیؒ کی تحقیق کے موافق وہ ضمام بن ثعلبہ نہیں بلکہ کوئی اور شخص ہیں لیکن قول اوّل کو جمہور علماء نے ترجیح دی ہے۔

قولہ مِنْ اَهْلِ نَجْدٍ : نجد اونچے علاقہ کو کہتے ہیں۔ اس کے مقابل نچلے علاقہ کو غور یا تہامہ کہتے ہیں۔ ملک عرب کے دو حصّے ہیں ایک پستی والا جسے تہامہ وغور کہتے ہیں اور دوسرا بلندی والا جس کو نجد کہتے ہیں۔ یعنی وہ رجل ملکِ عرب کا باشندہ تھا لیکن عرب کے بالائی (نجد) علاقہ سے تعلق رکھتا تھا۔

قولہ ثَائِرُ الرَّأْسِ : اس کی دو ترکیبیں ہیں (۱) ثَائِرُ الرَّأْسِ رجل کی صفت ہونے کی بنا پر مرفوع ہے اور اضافت لفظی کی وجہ سے تعریف کا فائدہ نہیں دیا۔ (۲) یا حال بن رہا ہے رجل سے معنیٰ ہو گا حال ہونا اس آدمی کا کہ وہ پراگندہ سر والا تھا۔

سوال : سر تو پراگندہ نہیں ہوتا بلکہ بال پراگندہ ہوتے ہیں۔

جواب اوّل : ثَائِرَ الرَّأْسِ : رَجُلٌ سے حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور مضاف محذوف ہے اصل میں عبارت تھی ای ثَائِرُ شَعْرِ الرَّأْسِ۔

جواب دوم : ذکر محل باراده حال کی بناء پر مجازاً بال مراد ہیں یعنی ذکر محل سر کا مراد حال بال ہیں۔

جواب سوم : کلام میں مبالغہ پیدا کرنا مقصود ہے کہ بال اتنے پراگندہ تھے کہ گویا سارا سر پراگندہ ہے۔

یقول ابوالاسعاد : علماء فرماتے ہیں کہ وہ متعلم اور سائل بن کر آیا تھا اس لیے یہ تعلیم دے گیا کہ طالب علم کو بناؤ سنگھار نہیں کرنا چاہیے بلکہ ایک ہی دھن ہو کہ کسی طرح علوم نبویہ کی تعلیم کی تکمیل ہو۔

قولہ دَوِيّ صَوْتِہٖ : بفتح الدال وکسر الواو وتشدید الیاء یعنی صوت مرتفع اور مستکرہ جو لا یفہم کے درجہ میں ہے لیکن عند العلماء دَوِيّ شہد کی مکھی کی بھنبھناہٹ کو کہتے ہیں یہاں مراد وہ آواز ہے جو سنائی دے اور مفہوم و معنیٰ سمجھ میں نہ آئیں۔

خُلاصۃُ الکلام کہ وہ شخص بوجہ رعب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سوالات کو دہرلتے ہوئے آرہے تھے تاکہ گفتگو کرتے وقت غلطی کا باعث نہ بن جائے اور قوم کی نمائندگی میں کوئی فرق نہ آجائے۔ اس سے اس شخص کی رغبت فی الطلب معلوم ہوتی ہے۔

سوال : یہ کہ حدیث پاک میں حَتّٰی دَنَا اِلیٰ رسولِ اللّٰہ صَلّی اللّٰہ علیہ وسلّم کے الفاظ ہیں۔ یعنی اب تک تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کلام بھی شروع نہیں کی پہلے کیسے دَوِيّ کر رہا تھا۔

جواب : یہ کہ قانون ہے کہ جب بدوی یا جاہل آدمی کسی شہری یا پڑھے لکھے کے پاس آئے تو اس کو اپنے مافی الضمیر کو بیان کرنے میں تکلیف ہوتی ہے اور خوف لگتا ہے کیونکہ اس کا اثر اس پر پڑتا ہے اور ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ اس لیے آدمی اپنے سوال وغیرہ کی پہلے مشق کرتا ہے تاکہ بیان کرنے میں آسانی رہے۔ یہی حال اسی مکرم انسان کے ساتھ ہوا لہٰذا اپنے تئیں وہ سوال وغیرہ کی مشق کر رہا تھا لیکن انداز بیان ایسا تھا کہ ہمیں اس کی فہم کا پتہ نہیں چلتا تھا۔

قولہ وَھُوَ یَسْئَلُ عَنِ الْاِسْلَامِ : لبعض شُرّاح نے لکھا ہے کہ اسلام کے متعلق سوال کر رہا تھا جیسا کہ ظاہر حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔

سوال : یہ کہ اگر اس بدوی کا سوال اسلام کی حقیقت کے متعلق ہے تو پھر نماز کے متعلق کیوں بیان فرمارہے ہیں کیونکہ اسلام کی حقیقت شہادتین میں ہے (کما مرّ)

جواب اوّل : شہادتین اس کو آتی تھی اس لیے نماز سے شروع کیا۔

جواب دوم : سوال کے اندر اسلام کی حقیقت مراد لینا بالکل غلط ہے دراصل یہاں لفظ مقدر ہے " وَهُوَ يَسْأَلُ عَنِ الْإِسْلَامِ اى عَنْ فَرَائِضِ الْإِسْلَامِ وَاَحْكَامِهِ "

چنانچہ بخاری شریف کی روایت میں یوں ہے :" اَخْبِرْنِي مَاذَا فَرَضَ اللّٰهُ عَلَيَّ (مرقاۃ ج ۱ ص ۸۶)

اس لیے شہادتین کا ذکر نہیں فرمایا۔

سوال : سائل کے سوال کے جواب میں نماز کا ذکر تو فرمایا مگر حج کو کیوں ذکر نہیں فرمایا۔

جواب اوّل : یہ کہ عدم استطاعت کی وجہ سے حج اس پر فرض نہ تھا اس لیے ذکر نہیں فرمایا۔

جواب دوم : یہ کہ اس وقت حج فرض نہیں ہوا تھا۔ لیکن

يقول شيخ جاجروى رحمه القوى : سب سے بہتر توجیہ یہ ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں حج کا ذکر بھی ہے یہاں راوی سے نسیاناً رہ گیا ہے۔

وجوبِ وتر کا مسئلہ :

اس مسئلہ کی وضاحت سوال وجواب کی شکل میں پیش کی جاتی ہے۔

سوال ۔ یہ کہ اس حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سائل کو پانچ نمازوں کا فرمایا اس نے پوچھا کہ کیا اس سے زائد نماز مجھ پر فرض ہے۔ جواب میں ارشاد فرمایا کہ نہیں فرض تو اور کوئی نہیں البتہ نفل جتنے چاہو پڑھ سکتے ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ پانچ نمازوں کے علاوہ کوئی نماز فرض وضروری نہیں جب کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک وتر واجب ہیں یہ وجوب وتر والا قول اس حدیث کے خلاف ہے۔ وجوبِ وتر میں مذاہب اور دلائل کی تفصیل ان شاء اللہ اپنے مقام پر ہی آئیگی ۔ البتہ اس حدیثِ پاک کے جوابات عرض کر رہا ہوں ۔

جواب اوّل : یہ جواب بطور الزام کے ہے یعنی الزامی جواب ہے جس کا خلاصہ

یہ ہے کہ بالکل اسی طرح کے الفاظ زکوٰۃ کے بارے میں بھی ہیں اس کا تقاضا یہ ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ کوئی انفاق مالی فرض نہیں ہونا چاہیے۔ حالانکہ ائمہ ثلاثہ صدقہ فطر کو فرض کہتے ہیں۔ اگر وجوبِ وتر اس حدیث کے خلاف ہے تو فرضیّت صدقہ فطر بھی اس حدیث کے خلاف ہے۔ مَاهُوَ جَوَابُكُمْ فَهُوَ جَوَابُنَا!

جواب دوم: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد وجوبِ وتر سے پہلے کا ہے اس وقت واقعی یہ حکم تھا کہ ان پانچ کے علاوہ کوئی اور نماز واجب نہ تھی (مزید تفصیل سیأتی)

یقول ابوالاسعاد: "عدم وجوب وتر پر اس حدیث سے دلیل پکڑنا غیر صحیح ہے کیونکہ یہاں فرائض اعتقادیہ کی نفی کرنا مقصود ہے اور عندالاحناف بھی وتر فرائض اعتقادیہ میں سے نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قاضی شوکانی باوجود اپنی ظاہریت کے نیل الاوطار میں فرماتے ہیں کہ عدم وجوب پر اس حدیث سے استدلال کرنا محلِ نظر ہے اس لیے کہ یہ ابتدائی تعلیم ہے ابتدائی اجمالی تعلیمات سے تمسک دلیل کرتے ہوئے ان فرائض و واجبات کا انکار کرنا جن کی تفصیل بعد میں وارد ہوئی یہ درست نہیں۔

قولہٗ اِلَّا اَنْ تَطَوَّعَ: اس کو دو طرح سے پڑھا جاتا ہے (۱) تطوع بتخفیف طاء اصل میں تتطوّع تھا قاعدہ مشہورہ کی بناء پر ایک تاء کو گرا دیا (۲) دوسری وجہ تطوع ہے بتشدید طاء اصل میں تتطوّع تھا تاء کو طاء کیا اور طاء کو طاء میں ادغام کیا۔

فائدہ: مختصراً عرض ہے کہ استثنیٰ کی دو قسمیں ہیں (۱) متصل (۲) منقطع۔ اصل استثناء میں اتصال ہے استثناء منقطع وہاں مراد لینا چاہیے جہاں متصل نہ بن سکتا ہو۔ یہاں اگر مستثنیٰ منقطع بنائیں تو ترجمہ یوں ہوگا "تیرے ذمہ اور نمازیں فرض نہیں مگر یہ کہ تو نفل پڑھے"۔ اس صورت میں استثناء مندوب کا ہے واجبات سے۔ اور استثناء متصل ہو تو معنیٰ یہ ہوگا "تیرے ذمہ اور واجب نہیں مگر یہ کہ تو نفل نماز کو شروع کر دے" نفل نماز شروع کرنے سے واجب ہو جائے گی تو استثناء واجب کا واجبات سے ہوا۔

فقہی مسئلہ: یہاں پر ایک فقہی مسئلہ ہے جس کا نام ہے بعد شروع عبادت اتمام عبادت واجب ہے یا نہیں اس بات پر سب فقہاء کا اتفاق ہے کہ نفل حج شروع

کرنے سے واجب ہو جاتا ہے۔ نفل نماز اور نفل روزہ میں اختلاف ہے اور دو مسلک ہیں :۔

مسلک اوّل شوافع اور حنابلہ کے نزدیک اِلَّآ اَنْ تَطَوَّعَ کی استثناء منقطع ہے جو الکن کے معنیٰ میں ہے "الکن اِنْ شِئْتَ افعل تطوعًا بغیرِ الزام یعنی اوقاتِ خمسہ کے علاوہ اور کوئی فرض نہیں ہاں اگر نفل ادا کرنا چاہو تو منع نہیں کیا جائے گا۔ اس سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ نفل شروع کرنے سے اتمام واجب نہیں ہوتا۔ جس طرح نفل شروع کرنے سے قبل نفل تھے بعد میں بھی نفل ہی ہیں اور توڑ دینے سے اس کی قضا بھی لازم نہیں ہوتی۔

دلیل اوّل عَنْ اُمِّ هَانِیْ قَالَتْ قَالَ رَسُولُ اللہِ صَلَّی اللہُ علیہِ وَسلّم اَلصَّائِمُ الْمُتَطَوِّعُ اَمِیْنُ نَفْسِہٖ اِنْ شَآءَ صَامَ وَاِنْ شَآءَ اَفْطَرَ : ترمذی شریف ص۱۵۵ ج ۱ کتابُ الصَّومِ باب ماجآء فی افطار الصَّائِمِ المتطوِّع جب کہ واجب میں اختیار نہیں دیا جاتا۔ هٰکذا فی المشکوٰۃ ص۱۸۱ ج۱)

دلیل دوم اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللہُ علیہِ وَسلّمَ کَانَ اَحْیَانًا یَنْوِی صَوْمَ التَّطَوُّعِ ثُمَّ یُفْطِر : (نسائی شریف ص۳۱۹ کتاب الصوم : اگر بعد شروع اتمام واجب ہوتا تو افطار کیسے فرمایا۔

مسلک دوم احناف و موالک (فی روایۃ) فرماتے ہیں کہ اِلَّآ اَنْ تَطَوَّعَ میں استثناء متصل ہے اور یہی استثناء میں اصل بھی ہے اس میں ضروری ہے کہ مستثنیٰ، مستثنیٰ منہ کی جنس سے ہو: اَیْ لَیْسَ عَلَیْکَ شَیْئٌ عَلٰی سَبِیْلِ الْوُجُوْبِ اِلَّا اَنْ تَطَوَّعَ فَعَلَیْہِ اِتْمَامُہٗ : یعنی تطوّع کے شروع کرنے میں تم مختار ہو۔ ہاں اگر شروع کر دو گے تو اس کا اتمام واجب ہو جائے گا اگر کسی ضرورت سے ناتمام چھوڑ دیتے ہو تو اس کی قضاء واجب ہو جائے گی۔

دلیل اوّل قرآنِ پاک میں ربِّ لایزال کا ارشاد ہے " وَلْیُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ صاحب بدائع نے فرمایا ہے کہ اس بات پر سب کا اتفاق ہے۔ اگر کوئی آدمی قولاً نذر کرے تو اس پر ایفائے قول لازم ہے حالانکہ اب تک شروع نہیں کیا تو جب فعلی نذر سے شروع کر دے تو بطریقِ اولیٰ لازم ہونا چاہیے۔ تو آیت مبارکہ سے بعد الشروع اتمام

کا وجوب ثابت ہوا۔

دلیل دوم قرآن مقدس میں ہے "لَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَکُمْ" ابطال عمل سے نفی فرمادی ہے جس نماز اور روزہ کو شروع کیا گیا ہے اس کا مشروع فیہ حصہ بھی ایک عمل ہے اگر اس کو پورا نہ کیا تو یہ رائیگاں ہو جائے گا اور ابطال عمل لازم آئے گا جو منہی عنہ ہے لہذا شروع کر کے پورا نہ کرنا منہی عنہ ہے اور منہی عنہ کی ضد مامور بہ ہوتی ہے۔ لہذا اتمام مأمور بہ ہوا۔ احناف حضرات بھی یہی کہتے ہیں۔

دلیل سوم ابو داؤد شریف صفحہ ۳۴۰ ج ا کتاب الصوم باب من رای علیہ القضاء میں روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ نے نفل روزہ رکھا تھا کہیں سے ہدیۃً بکری مل گئی اور دونوں نے افطار کر لیا اور بکری کا گوشت کھا لیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس کا ذکر کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "لَا عَلَیْکُمَا صُوْمَا مَکَانَہٗ یَوْمًا اٰخَرَ" آپؐ نے قضا کا امر فرمایا اور امر وجوب کے لیے ہی ہوتا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ روزہ شروع کرنے سے واجب ہو گیا تھا اس لیے کہ واجبات ہی کی قضا واجب ہو سکتی ہے۔

دلیل چہارم دار قطنی میں حضرت ام سلمہؓ کا اسی قسم کا واقعہ ہے انہوں نے بھی نفل افطار کر لیا تھا۔ "اَمَرَهَا النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنْ تَصُوْمَ یَوْمًا مَکَانَهٗ" اس کی دلالت مطلوب پر واضح ہے۔ (بحوالہ نصب الرایہ صفحہ ۲۶ ج ۲)

دلیل پنجم عقلی حج کے بارے میں اجماع ہے کہ شروع کرنے سے اتمام واجب ہو جاتا ہے، نماز روزہ بھی حج کی طرح رکن اسلام ہیں۔ قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ حج کی طرح شروع کرنے سے یہ بھی دونوں واجب ہونے چاہئیں کما قالہ الاحناف۔

دلائل شوافع حضرات کے جوابات

شوافع حضرات نے اپنے استدلال میں کتاب الصوم کی کچھ حدیثیں پیش کیں ان کے تفصیلی جوابات تو اپنے مقام پر ہی آئیں گے لیکن مختصرًا دو جواب پیش خدمت ہیں:۔

جوابِ اوّل ۔ یہ ہے کہ جہاں کہیں بھی نفل روزہ کو کھولنے کا حکم ہے تو وہ عذر کی بنار پر ہے اور عذر کی حالت میں ہمارے نزدیک بھی افطار کرنا جائز ہے۔

جوابِ دوم ۔ یہ ہے کہ قضار کا ذکر نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ قضار کا حکم دیا ہی نہیں کیونکہ مسلّمہ ضابطہ ہے کہ عدمِ ذکر عدمِ وجود کو مستلزم نہیں معہٰذا وجوب قضا کی روایات پہلے ذکر کی جاچکی ہیں۔

قولہٗ قَالَ وَذَکَرَلَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : قال کا فاعل طلحہ ہے۔ طلحہؓ راوی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ بھول گئے اس لیے لفظ ذکرؔ بولا اس سے معلوم ہوا کہ روایت باللفظ اصل ہے اور اگر لفظ بھول جائیں تو ان کی طرف اجمالی اشارہ کر دیا جائے۔

قولہٗ لَا اَزِيْدُ هٰذَا وَلَا اَنقُصُ : تقدم تحقیقہ آنفاً۔

قولہٗ اَفْلَحَ الرَّجُلُ اِنْ صَدَقَ : آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر اس نے سچ کہا تو کامیاب ہوگیا یہ اِنْ شرطیہ بھی پڑھا گیا ہے اور اَنْ نصب کے ساتھ بھی یعنی لِاَنْ صَدَقَ۔

تعارض بین الرّوایتین اور اس کا حل

ما قبل میں اسی نوعیّت کی حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث گذری ہے اس کے آخر میں ہے کہ وہ سائل چلا گیا تو حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مشروط طور پر اس کے جنتی ہونے کی بشارت سنائی اور فرمایا « مَنْ سَرَّهٗ اَنْ يَّنْظُرَ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ فَلْيَنْظُرْ اِلٰى هٰذَا » اور زیر بحث حدیث میں ہے کہ اس کی فلاح کی خبر دی لیکن بشرطِ صدق اَفْلَحَ الرَّجُلُ اِنْ صَدَقَ علمار کا اس میں اختلاف ہوا ہے کہ یہ دونوں واقعات ایک ہی شخص کے ہیں یا الگ الگ دو شخصوں کے اس میں دو قول ہیں۔

قولِ اوّل ۔ علّامہ قرطبیؒ و بعض شارحینؒ کے نزدیک یہ دو الگ الگ واقعات ہیں اس صورت میں یہاں کوئی اشکال نہیں۔

قولِ دوم۔ بعض حضرات کے نزدیک دونوں روایتوں میں ایک ہی واقعہ کا بیان ہے اگر یہ قول لیا جائے تو **سوال** ہوگا کہ دونوں روایتوں میں تعارض ہے ایک میں جزم کے ساتھ بغیر شرط کے جنت کی بشارت دی گئی اور دوسری میں مشروط بشارت ہے۔ ایک ہی چیز مشروط بھی ہو اور غیر مشروط بھی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے اس کے مختلف جوابات دیے گئے ہیں۔

جوابِ اوّل یہ کہ اَفْلَحَ الرَّجُل اِنْ صَدَقَ یہ اس کے سامنے فرمایا تھا تاکہ جزمًا جنتی ہونے سے مغرور نہ ہو جائے۔ جب وہ چلا گیا اس کی غیر حاضری میں دوسرے حاضرین کے سامنے اس کے جنتی ہونے کا اظہار فرما دیا۔

جوابِ دوم پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کے صدق کی وحی نہیں آئی تھی تو اس وقت فرمایا تھا اَفْلَحَ الرَّجُل اِنْ صَدَقَ بعدہٗ اس کے دل میں صدق پائے جانے کی وحی آئی تو آپ نے اس کو جزمًا جنتی فرما دیا۔

جوابِ سوم فلاح سے مراد جنت کا دخول اوّل ہے جو مقیّد ہے اور پہلی حدیث میں نفس دخول جنت کا ذکر ہے جو مطلق اور عام ہے۔ فاندفع التعارض۔

سوال اس حدیث کے بعض طرق میں یہ الفاظ ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:۔ "اَفْلَحَ وَاَبِیْهِ" یعنی وہ شخص کامیاب ہو گیا اس کے باپ کی قسم (کما فی البخاری ومسلم) تو یہاں غیر اللہ کی قسم موجود ہے۔ حالانکہ حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ حَلَفَ بِغَیْرِ اللّٰہِ فَقَدْ اَشْرَكَ (ابوداؤد شریف ص۱۱۲ ج۱، باب الیمین بغیر اللہ)

جوابِ اوّل علّامہ خطابیؒ فرماتے ہیں کہ اہلِ عرب کی عام عادت تھی کہ کسی بات کی تاکید کے لیے الفاظِ قسم لے آتے ہیں اور اس سے حقیقۃً حلف مراد نہیں لیتے تھے تو آپ نے اس عادت کی بناء پر فرمایا۔

جوابِ دوم یہ کہ یہاں نحویوں سے غلطی ہو گئی واؤ کو حرفِ قسم کے لیے خاص کر لیا حالانکہ اس کو واؤ شہادت کہنا چاہیے۔ کقولہٖ تعالیٰ وَالتِّیْنِ وَالزَّیْتُوْنِ وغیرہ۔ ایسی صورت میں کسی قسم کا اشتباہ ہی نہیں ہوتا۔ ہٰکذا قالہٗ علّامہ انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ رحمۃً واسعۃً

جواب سوم[٣] علامہ زرقانیؒ نے شرح مؤطا میں فرمایا ہے کہ حلف بالآباء تعظیم غیر اللہ کے خوف کی وجہ سے منع ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں تعظیم غیر اللہ کا وہم بھی نہیں۔ لہٰذا لا بأس بہ۔

جواب چہارم[٤] یہ کاتبین کا سہو ہے اصل میں واللہ تھا تصحیف ہو کر وابیہ ہو گیا۔ کیونکہ دونوں کا رسم الخط یکساں ہے کیونکہ زمانہ سابقہ میں نقطے وغیرہ نہیں ہوتے تھے۔

اسمائے رجال

حضرت طلحہؓ بن عبید اللہ کے حالات

آپ کی کنیت ابو محمدؒ ہے آپ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔ بدر کے سوا تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ جنگِ احد میں نیزوں کے چوبیس۲۴ زخم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت میں اپنے جسم پر برداشت کیے۔ جنگِ جمل میں ۳۶ھ کو بعمر ۶۴ سال شہید ہوئے۔

وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ اِنَّ وَفْدَ عَبْدِ الْقَيْسِ لَمَّا اَتَوا النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْقَوْمِ اَوْ مِنَ الْوَفْدِ قَالُوْا رَبِيْعَةُ۔

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ جب وفد عبد القیس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو آپ نے فرمایا یہ کون لوگ ہیں یا کس قوم سے آئے ہیں تو وفد نے جواب دیا ربیعہ کے لوگ ہیں۔

قولہ وَفْدَ : وَافِد کی جمع ہے وافد اسم فاعل کا صیغہ ہے الوفادۃ سے الوفادۃ کا معنیٰ ہے کسی قوم کا نمائندہ بن کر امیر یا حاکم سے ملنے جانے۔ بالفاظ دیگر وہ منتخب جماعت جو کوئی اہم غرض لے کر بادشاہ یا حاکم کے پاس جاوے۔

مُضَر۔ رَبیعہ۔ اور عبدُالقیس کا اجمالی تعارُف

حدیث میں تین قبیلوں کے نام آئے ہیں۔ مُضَر، رَبِیعہ اور عبدؔ القیس یہ قبائل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اجداد میں سے ہیں نزار بن معد بن عدنان۔ نزار کے کئی صاحبزادے تھے ربیعہ اور مُضر یہ دو زیادہ مشہور ہوئے ہیں۔ دوسرے دو لڑکے زید اور انمار تھے نزار نے مرتے وقت یہ وصیّت کی تھی کہ میرے مال کی ایک جنس ایک ایک لڑکے کو مل جائے مضر کے حصہ میں سونا آیا اور ربیعہ کے حصّہ میں گھوڑے۔ اس لیے مضر کو مضر الحمراء اور ربیعہ کو ربیعۃ الفرس کہنے لگے۔ پھر مُضر سے جو خاندان چلا اس کو قبیلہ مضر کہدیتے ہیں۔ اور ربیعہ سے جو خاندان چلا اس کو قبیلہ ربیعہ کہتے ہیں۔ ربیعہ کی پھر آگے کئی شاخیں ہیں ان میں سے ایک کا نام عبد القیس ہے۔ اس شاخ کا وفد حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا ہے قبیلہ عبد القیس بحرین میں رہتا تھا۔ مضر کی اولاد میں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہی وہ وفد ہے

جس کے قبیلہ کی مسجد میں اسلام میں مسجد نبوی کے بعد سب سے پہلے جمعہ قائم ہوا۔ چنانچہ بخاری شریف میں ج ا کی روایت ہے:۔

اوّل جُمُعَۃ جمعت بَعْدَ جُمُعَۃ فِی مَسْجِدِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِی مَسْجِدِ عَبْدِ الْقَیْسِ بجواثی مِن الْبَحْرَیْنِ (ابوداؤد ج۱ ص۱۶۰ باب الجمعۃ فی القریٰ)

ترجمہ: مسجد نبوی کے بعد سب سے پہلا جمعہ بحرین کے مقام جواثی میں عبد القیس کی مسجد میں قائم ہوا ہے۔

مدینہ طیبہ میں وفد عبد القیس کی آمد کس طرح ہوئی؟

قبیلہ عبد القیس کی آمد کا سبب یہ ہوا تھا کہ ان کا ایک آدمی منقذ بن حیان تجارت کے لیے مدینہ طیبہ میں آتا جاتا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد بغرض تجارت حسب معمول مدینہ طیبہ میں آیا ہوا تھا اور اپنا سامان فروخت کر رہا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس طرف تشریف لے آئے تو یہ آپؐ کو ملا آپ نے اس کا حال پوچھا اور اس قبیلہ کے بڑے بڑے اشراف کا نام لے لے کر حال پوچھا۔ الغرض اس قدر حال دریافت فرمایا کہ منقذ کو بہت تعجب ہوا اور اسلام قبول کر لیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سورۃ فاتحہ اور سورۃ اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ کا سبق لیا اور وطن آگیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شرفاءِ قبیلہ کی طرف ایک والانامہ بھی لکھوا دیا تھا۔ منقذ نے اپنے قبیلہ میں آکر ابتداءً اپنے اسلام کو اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوب کو مخفی رکھا اور گھر میں نماز پڑھتا رہا۔ اس کی بیوی قبیلہ کے سردار منذر بن عائذ کی بیٹی تھی بیٹی نے اپنے خاوند کی نماز کا تذکرہ اپنے والد منذر کے سامنے کیا کہ جب سے مدینہ سے واپس آیا ہے اس طرح منہ ہاتھ دھوتا ہے اور کبھی کھڑا ہو جاتا ہے اور کبھی بیٹھ جاتا ہے اور کبھی ماتھا زمین پر ٹیک دیتا ہے۔ غرضیکہ ہیئتِ صلوٰۃ کو نقل کیا۔ منذر نے منقذ سے پوچھا کہ یہ کیا کرتے ہو اس نے اپنے اسلام لانے کا

سارا ماجرا بیان کر دیا۔ منذر کے دل میں اسلام کی محبت آگئی۔ والا نامہ بھی اس کو دکھلایا گیا اس نے قبیلہ کے لوگوں کو حالات سنائے اور والا نامہ سنایا سب اسلام لانے کے لیے تیار ہوگئے اور یہ فیصلہ کیا کہ تعلیم دین کے لیے ایک وفد مدینہ طیبہ بھیجنا چاہیے۔ چنانچہ رئیس قبیلہ منذر کی قیادت میں ایک وفد تیار کیا گیا چنانچہ وہ وفد مدینہ طیبہ میں حاضر ہوا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تعلیمات فرمائیں جن کا تذکرہ حدیث میں ہے۔

یقول ابو الاسعاد : اس وفد کی آمد کے سلسلہ میں حدیث پاک کے اندر ہے کہ ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کرامؓ سے فرمایا کہ تمہارے پاس ابھی ایک ایسا قافلہ آنے والا ہے جو اہل مشرق میں سب سے بہتر ہے۔ حضرت عمرؓ ان کو دیکھنے کیلئے کھڑے ہوئے تو انہیں ۱۳ آدمیوں کا ایک قافلہ آتا ہوا نظر آیا جب قافلہ قریب آیا تو حضرت عمرؓ نے ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت سنائی اور قافلہ کے ساتھ ساتھ دربارِ رسالت میں حاضر ہوئے۔ اہل قافلہ کی نظر جونہی روئے انور اقدس پر پڑی تو سب کے سب بے تابانہ آپ کی طرف دوڑ پڑے اور فرطِ اشتیاق سے اپنا سامان اسی طرح چھوڑ کر دیوانہ وار آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر آپؐ کے دست مبارک کو چومنے لگے۔ حضرت عبد القیس (منذر الاشج) جو امیر قافلہ تھے اگرچہ نوعمر تھے لیکن سب سے پیچھے رہ گئے تھے۔ انہوں نے پہلے سب کے اونٹ باندھے پھر اپنا بکس کھولا، سفر کے کپڑے اتارے اور دوسرا لباس پہنا پھر سکون ووقار کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپؐ کے دست مبارک کو بوسہ دیا بدشکل آدمی تھے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف نظر اٹھائی تو انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) آدمی کی محبت صرف اس کے ڈھانچے سے نہیں ہوتی بلکہ اس کی قدر وقیمت اس کے دو چھوٹے اعضاء بتاتے ہیں اور وہ زبان و دل ہیں۔ آپؐ نے فرمایا تم میں دو خصلتیں ہیں جن کو اللہ ورسول پسند کرتے ہیں یعنی دانائی و بردباری۔ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ خصلتیں مجھ میں پیدائشی ہیں یا کسبی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پیدائشی ہیں (مظاہر حق ص۱۱۱ ج ۱ کتاب الایمان، ابو داؤد شریف ص۳۶۳ ج ۲ کتاب الادب باب القُبلہ الرجل۔)

وفد عبدالقیس کس سال آیا اور اُن کی تعداد کتنی تھی؟

اس وفد کے افراد کی تعداد بعض روایات میں چودہ ہے اور بعض میں تیرہ اور بعض میں چالیس آئی ہے۔ ان کے مابین محدثین حضرات نے دو طرح سے تطبیق دی ہے :-

ا۔ وفد عبدالقیس دو مرتبہ آیا ہے ایک ۵ھ میں فتح مکہ سے پیشتر قال الحافظ و کان ذالک قدیما اما فی سنۃ خمس او قبلھا (فتح الباری ص۸۶ ج۸) جن کی تعداد چودہ یا تیرہ تھی۔ اور دوسری مرتبہ ۸ھ میں فتح مکہ کے سال فتح مکہ کیلیے روانگی سے پہلے اس وفد کی تعداد چالیس تھی۔

۲۔ بعض نے اس طرح تطبیق دی ہے کہ کل افراد تو چالیس تھے ان میں سے زیادہ قابل ذکر معزز افراد چودہ تھے کسی نے کل کا تذکرہ کر دیا تو چالیس تعداد نقل کی، کسی نے صرف معزز افراد کے ذکر پر اکتفار کیا ان کی تعداد چودہ بتائی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

قولہ من القوم او من الوفد : کلمہ اَو کبھی تنویع کے لیے آتا ہے اور کبھی شک کے لیے جب شک کے لیے آئے تو اس کے بعد قال کا لفظ مقدر ہوتا ہے یہاں دراصل عبارت یوں تھی "من القوم او قال من الوفد"۔

یقول الشیخ جاجروی رحمہ القوی : حضور علیہ السلام کو اس وفد کی آمد کی اطلاع پہلے بذریعہ وحی ہو چکی تھی۔ یہاں یہ سوال (قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من القوم او من الوفد) قبیلہ والا علم حاصل کرنے کے لیے نہیں بلکہ تانیس و الفت کیلئے ہے

قولہ قالوا ربیعۃ - ربیعۃ مبتدا محذوف کی خبر ہے جو کہ نحن ہے اصل میں عبارت تھی نحن ربیعۃ۔

قولہ مرحبا بالقوم : مرحبا کا باب کرم اور سمع کے وزن پر آتا ہے مرحب اصل میں المکان الواسع کو کہتے ہیں۔ کما فی قولہ تعالیٰ وضاقت علیھم الارض بما رحبت اور مرحبا منصوب ہے اس کا فعل اصاب مقدر ہے اور بالقوم کی با زائدہ

فاعل پر داخل ہے اَیْ اَتَی الْقَوْم مَوضِعًا واسِعًا عند البعض باء تعدیۃ کے لیے ہے اور مرحبا مفعول مُطلق ہے اَیْ اَتَی اللّٰہُ بِالْقَوْمِ مَرْحَبًا۔ میزبان کی طرف سے مہمان کی آمد پر اس کے اعزاز واکرام اور اس کے دل سے احساس اجنبیت دور کرنے کے لیے کہا کرتے ہیں کہ آپ کی آمد پر مجھے مسرت ہوئی اور میرے قلب میں آپ کے لیے وسعت وگنجائش ہے۔ اور آپ ایک ایسی جگہ تشریف لائے ہیں جو وسیع اور آرام دِہ ہے فِیْہِ دَلِیْلٌ عَلٰی اِسْتِحْبَابِ تَانِیْسِ الْقَادِمِ۔

قولہٗ غَیْرَ : حال کی بناء پر منصوب ہے یا قوم سے بدل ہونے کی بناء پر مجرور ہے۔

قولہٗ خَزَایَا وَلَا نَدَامٰی : خزایا جمع ہے خَزْیان کی بمعنیٰ وہ شخص جس کی رسوائی ہو۔ نَدَامٰی جمع ہے نَدْمان کی مگر وہ یہاں مناسب نہیں۔ کیونکہ ندمان شرابی مصاحب یا مطلق مصاحب کو کہتے ہیں اگر اسے نادِم کی جمع کہیں تو بھی درست نہیں کیونکہ نادم کی جمع ندامیٰ نہیں آتی۔ اس لیے علماء نے کہا ہے کہ یہ جمع نادم کی ہے مشاکلت کے لیے یعنی خَزَایَا کے مقابلہ میں اسے ندامیٰ بنایا گیا بمعنی شرمسار وپشیمان کما یُقَالُ غَدَایَا وعَشَایَا بوجودیکہ غَدَاۃ کی جمع غداوت آتی ہے لیکن عَشَایَا کے مقابلہ میں جمع کے لیے غَدَایَا کہہ دیا ایسے ہی یہاں ہے۔ مقصد ان دونوں جملوں کا یہ ہے کہ دوسرے لوگ جنگ کے بعد مسلمان ہوئے یعنی ضرب حرب قید وبند والی ذلت اٹھانی پڑی جب کہ تم برضا ورغبت مسلمان ہوئے اللہ پاک نے تم کو تمامی رسوائیوں سے محفوظ رکھا ہے۔

قولہٗ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنَّا لَا نَسْتَطِیْعُ اَنْ نَّاْتِیَکَ اِلَّا فِی الشَّھْرِ الْحَرَامِ۔ (ترجمہ) پھر وفد نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم شہر حرام (حرمت والے مہینے) کے علاوہ اور کسی ماہ میں آپ کے پاس نہیں آسکتے۔

خُلاصۃ الکلام قبیلہ عبدالقیس والوں نے یہ بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس لیے بیان کی کہ اس قبیلہ کے افراد کو اپنے وطن سے مدینہ منورہ آنے کے لیے کفار مُضر کے قبیلہ کے پاس سے گذرنا پڑتا تھا، اور اس قبیلہ کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ یہ بہت زیادہ جنگ جو تھا۔ ان کی آبادی کے قریب سے جو بھی گذرتا تھا ان سے جنگ ہونی ضروری تھی اس لیے اس وفد نے کہا کہ چونکہ ہمارے لیے عام دنوں میں آنا بہت مشکل ہے اس لیے بار بار نہیں آسکتے۔

صرف انہی مہینوں میں آسکتے ہیں جو عرب میں اشہر حرام سمجھے جاتے ہیں۔

شہر حرام کون سے مہینے ہیں اور اُن کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟

محدثینؒ حضرات نے اَلشّھر کی الف لام میں دو قول نقل کیے ہیں:۔

قول اوّل اَلشّھرُ میں الف لام جنس کی ہے اور اس سے ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم رجب یہ چاروں مہینے مراد ہیں۔ اور روایت حماد بن زید (فی المناقب کما فی التعلیق) میں اِلّا کلّ شَھرٍ حَرَام ۔ کل کے ساتھ منقول ہے لہٰذا یہ دونوں روایتیں الف لام جنس ہونے کی تائید کرتی ہیں۔

قول دوم عند البعض الف لام عہد کی ہے مراد ماہِ رجب ہے بیہقی کی روایت میں اس کی تصریح ہے (کما فی التعلیق) کیونکہ قبیلہ مُضر رجب کی بے پناہ تعظیم کرتا تھا اس لیے رجب کو رجب مُضَر کہا جاتا ہے۔ زمانۂ جاہلیت کے لوگ ان مہینوں کو بڑی عزت وحُرمت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان میں جنگ وجدال لوٹ مار حرام جانتے تھے اس لیے ان کو اشہر حرم کے ساتھ نام رکھا گیا۔

یقول ابوالاسعاد : رجب مُضر کی تشریح یہ ہے کہ قرآن مُقدس میں ہے :۔ اِنَّمَا النَّسِیْئُ زِیَادَۃٌ فِی الْکُفْرِ یعنی جاہلیت کے لوگ ہنگامی ضرورت کے تحت اشہر حرم میں بھی قتل وقتال کرتے تھے اس کے بدلہ دوسرے مہینے کو عارضی اشہر حرم قرار دیتے تھے اور قبیلہ مُضَر دوسرے اشہر حرم کے متعلق اس قسم کا معاملہ اگرچہ روا رکھتے تھے لیکن رجب کے متعلق ایسا معاملہ روا نہیں رکھتے تھے بلکہ رجب کو ہر حالت میں اشہر حرم کی حیثیت سے بحال رکھتے تھے۔

قولہٗ بِاَمْرٍ : امر مفرد ہے اور امر دو ہیں (۱) وہ امر جو مشتق ہے امور سے اس کا معنیٰ ہوتا ہے کام (۲) امر ہے جو مشتق ہے اوامر سے اس کا معنیٰ ہوتا ہے حکم کرنا۔

قولہٗ فصلٍ : اس کے دو معنیٰ ہیں (۱) فصل بمعنیٰ فاصل یعنی الفاصل بین الحق والباطل حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والا (۲) فصل بمعنیٰ مفصول یعنی

مفصول معنیٰ ظاہر اور واضح کیونکہ ہمارے اور آپؐ کے درمیان کفار مضر کا (مشہور جنگ جو) قبیلہ پڑتا ہے لہٰذا آپ حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والی ایسی بات بتلائیں جسے ہم ان لوگوں کو بھی بتلادیں جو ہمارے پیچھے ہیں اور اس پر عمل کرنے سے جنّت میں جائیں۔

قولہٗ وَسَأَلُوْهُ عَنِ الْاَشْرِبَةِ : (ترجمہ) اور ان لوگوں نے مشروبات (ظروف) کے متعلق دریافت کیا۔

سوال : وفد عبدالقیس نے جو اَشْرِبَہ کے متعلق سوال کیا اس سے کیا مراد ہے

جواب : اشربہ سے نفس اشربہ مراد نہیں (کہ شراب پینا کیسے ہے) کیونکہ ان کی حرمت کا علم ان کو پہلے تھا یعنی وفد عبدالقیس کو خمر کی حرمت تو پہلے سے معلوم تھی بلکہ اس سے شراب کے برتنوں کو دوسرے کاموں میں استعمال کرنے کے بارے میں سوال تھا اس لیے آپؐ نے بھی برتنوں کے بارے میں حکم بیان فرمایا یعنی مقام ہذا پر مضاف مقدر ہے : اَیْ ظُرُوْفُ الْاَشْرِبَةِ اَوْ اٰنِیَةِ الْاَشْرِبَةِ :

قولہٗ فَاَمَرَهُمْ بِاَرْبَعٍ وَنَهَاهُمْ عَنْ اَرْبَعٍ (ترجمہ) تو آپؐ نے انہیں چار چیزوں کا حکم فرمایا اور چار چیزوں سے روکا۔

یہاں سے اجمال قبل تفصیل بیان کیا تاکہ تفصیل کا شوق پیدا ہو یا یاد کرنے میں سہولت ہو۔

قولہٗ اَمَرَهُمْ بِالْاِيْمَانِ بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ قَالَ لَتَدْرُوْنَ مَا الْاِيْمَانُ بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ قَالُوا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ شَهَادَةُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ

(ترجمہ) آپؐ نے انہیں یہ حکم دیا کہ اللہ تعالیٰ کی توحید پر ایمان رکھیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ تم جانتے ہو اللہ تعالیٰ کی وحدانیّت پر ایمان کا مطلب کیا ہے۔ انہوں نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول زیادہ جاننے والے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا اس بات کی شہادت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہاں دو سوال ہیں جو حل طلب ہیں :۔

سوال اوّل : یہ ہے کہ مامور بہ تو دراصل ایک ہے ای ایمان کیونکہ اَتَدْرُوْنَ مَا الْاِيْمَانُ سے ایمان کی تفسیر ہے لہٰذا اصل مامور بہ ایک چیز ہے اس کو اربع سے کیوں تعبیر کیا؟

جواب : یہ ہے کہ ایمان جو اصل مامور بہ ہے اس کو اجزاء مفصلہ کے اعتبار سے اربع کے ساتھ بیان کیا گیا ہے

سوال دوم : یہ ہے کہ اجمال کے درجہ میں اَمَرَهُمْ بِأَرْبَعٍ فرمایا گیا اور تفصیل میں پانچ مامورات کو ذکر کیا۔ (۱) ایمان باللہ (۲) نماز (۳) زکوٰۃ (۴) روزہ (۵) خمس غنیمت۔ تو اجمال اور تفصیل میں مطابقت نہیں۔

جواب اوّل علامہ طیبیؒ وقرطبیؒ فرماتے ہیں کہ دراصل بیان کرنا مامورات اربعہ کا ہے لیکن بطور تمہید وتبرک آپؐ نے شہادت کا ذکر فرمادیا چنانچہ ایک روایت میں اس طرح ہے "اَمَرَهُمْ بِأَرْبَعٍ وَنَهَاهُمْ عَنْ أَرْبَعٍ أَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَصُوْمُوْا رَمَضَانَ وَاَعْطُوْا خُمُسَ مَا غَنِمْتُمْ (بخاری شریف ص ۹۱۲ ج ۲ کما فی التعلیق)

جواب دوم علامہ ابن العربیؒ کہتے ہیں کہ ادائے خمس کوئی جداگانہ چیز نہیں بلکہ زکوٰۃ کی تفصیل ہے۔ ایک زکوٰۃ وہ ہے جو ہمہ وقت وصول کی جاتی ہے اور ایک گاہِ بگاہِ وقتاً فوقتاً، کَاَدَاءِ الْخُمُسِ۔

جواب سوم قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں کہ اصل مقصود پہلے چار اقسام ہیں باقی خمس غنیمت کا ذکر علی اسلوب الحکیم خاص ان کی ضرورت کے لیے زائد فرمایا کیونکہ ان کا کفار مضر سے مقابلہ ہوتا رہتا تھا یعنی یہ لوگ اکثر جہاد کیا کرتے تھے اور کفار سے مقابلہ آرائی کے نتیجہ میں مال غنیمت حاصل کرتے تھے اس لیے اسی ضرورت کو دیکھ کر مستقلاً علیحدہ ادائے خمس کا حکم دیا۔

سوال : یہ ہے کہ اجزائے ایمان میں حج کو کیوں نہیں ذکر کیا گیا؟

جواب اوّل : زیر بحث حدیث پاک میں ایسے احکام کا بیان مقصود ہے جو فی الفور واجب ہوں جب کہ حج تو واجب علی التراخی ہے۔

جواب دوم : گو ذکر حج اس روایت میں متروک ہوا ہے لیکن مسند احمد کی روایت میں حج مذکور ہے (کما فی فیض الباری)

یقول ابوالاسعاد : حج کی ادائیگی کے لیے مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلًا (زاد و راحلہ) شرط ہے اور یہ شرط ان میں مفقود تھی کیونکہ ان کے اور محل حج کے درمیان جنگ جو قبیلہ مُضر حائل تھا۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بیان نہیں فرمایا۔

قولہ وَنَهَاهُمْ عَنْ اَرْبَعٍ عَنِ الْحَنْتَمِ وَالدُّبَّاءِ وَالنَّقِيْرِ وَالْمُزَفَّتِ

(ترجمہ) اور چار چیزوں سے روکا یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ عبدالقیس کو چار برتنوں کے استعمال سے روکا۔

ظُروفِ اربعہ کی تفصیل

ظُروفِ اربعہ کی تفصیل مختصرًا پیش خدمت ہے :۔

الحَنْتَم : رنگ دار گھڑا یا روغنی مرتبان خواہ کسی بھی رنگ کا ہو۔ بعض نے سبز رنگ کی تخصیص کی ہے۔ لیکن صحیح رائے یہی ہے کہ ہر رنگ کے روغنی گھڑے یا مرتبان کو حنتم کہتے ہیں چونکہ اس زمانہ میں شراب کے لیے عمومًا سبز رنگ کیا کرتے تھے۔ اس لیے بعض نے اس کی تخصیص کردی اس لیے اس کی تفصیل الجَرّة الخُضْراء سے کی گئی۔

قولہ الدُّبَّاء : تونبی یعنی کدو کو اندر سے کرید کر جو برتن بنایا جائے۔
عرب کے اندر رواج تھا کہ کدو کا گودا نکال کر اس کے چھلکہ کو خشک کرکے برتن بناتے تھے۔ دُبّاء اسی کو کہا جاتا ہے اس میں چونکہ مَسام کم ہوتے ہیں اور ہوا نہیں لگتی اس لیے اس میں سکر جلدی پیدا ہو جاتا ہے۔

قولہ النَّقِیْر : (فعیل بمعنیٰ مفعول ہے النَّقر بمعنیٰ کریدنا) کھجور کے تنے کو یا کسی اور لکڑی کا بنایا ہوا برتن۔

قولہ اَلْمُزَفَّت : بعض روایات میں اس کو المقیر کہا گیا ہے وہ برتن جس پر روغنِ زفت یا روغن قار ملا ہوا ہو یہ روغن کشتیوں پر ملا جاتا ہے اور زمانہ جاہلیت میں شراب کے برتنوں پر بھی ملتے تھے۔

ظُروفِ اربعہ کے استعمال سے کیوں منع کیا گیا

ان چار برتنوں کے استعمال سے کیوں منع کیا گیا اس میں

علماء حضرات کے دو قول ہیں :۔

قول اوّل ۔ بعض علماء تو کہتے ہیں کہ ان برتنوں کے استعمال سے مطلقاً روکنا مقصود ہے خواہ کسی بھی مقصد کے لیے ہو۔

قولِ اوّل پر نہی کی حکمتیں

حکمتِ اوّل : شاربینِ خمر کے ساتھ تشبیہ سے روکنا مقصود ہے ۔ شراب نوش ان چار قسم کے برتنوں کو استعمال کیا کرتے تھے ان برتنوں کے استعمال میں ان کے ساتھ تشبیہ ہوگا اس لیے منع فرمایا۔

حکمت دوم : نہی سے مقصود شراب کی نفرت مُبالغۃً ذہنوں میں بٹھانا ہے کہ شراب تو کیا شراب سازی کے برتنوں کے استعمال کی بھی اجازت نہیں ۔ اس انداز سے نفسیاتی طور پر شراب کی نفرت اچھی طرح راسخ ہو جائے گی۔

حکمت سوم : ہوسکتا ہے کہ ان برتنوں کو دیکھ کر شراب کا پرانا تلذذ یاد آجائے۔ اور شراب پینے کی تحریک دل میں پیدا ہو اس چیز کو روکنے کے لیے ان برتنوں کے استعمال سے نہی کر دی گئی۔

قول دوم : یہ ہے کہ ان برتنوں میں نبیذ بنانے سے روکنا مقصود ہے ۔

قولِ دوم پر نہی کی حکمت

اگر ان برتنوں میں نبیذ بنانے سے نہی کرنا مقصود ہے تو پھر حکمت یہ ہوگی کہ ان برتنوں میں اگر نبیذ رکھا جائے گا تو اس کے جلدی مُسکر ہو جانے کا اندیشہ ہے ۔ اس لیے کہ ان برتنوں میں مسام نہ ہونے کی وجہ سے ہوا نفوذ نہیں کر سکتی اس لیے اس برتن کی چیز جلدی نشہ آور ہو جائے گی ۔ ہوسکتا ہے کہ مسکر کو غلطی سے پی جائے اور اگر مسکر ہونے کا پتہ چل گیا تو گرانی پڑے گی جس سے اضاعت مال ہوگا ، اور اگر پتہ نہ چلا تو مسکر کا پینا لازم آئے گا۔ اس لیے ان میں نبیذ بنانے سے منع کیا گیا تاکہ نہ دین خراب ہونے کا خطرہ ہو نہ مال۔

ظروفِ اربعہ سے نہی کا حکم

ان ظروفِ اربعہ سے جو نہی کی گئی ہے یہ نہی اب بھی باقی ہے یا منسوخ ہو چکی ہے

اس میں دو مسلک ہیں :۔

مسلک اوّل امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کا مسلک یہ ہے کہ یہ نہی اب بھی باقی ہے اس لیے کہ اس حدیث کے راوی حضرت ابن عباسؓ سے مسئلہ پوچھا گیا کہ ان برتنوں کا کیا حکم ہے ؟ تو انہوں نے ان برتنوں کے ناجائز ہونے کا فتویٰ دیا تھا جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ منسوخ نہیں ہے ۔ (شرح نووی للمسلم ص۳۴ ج۱)

دلیل ۔ عَلیٰ اَنَّ مَذْهَبَ ابن عبّاسؓ اَنَّ النَّهیَ عَنِ الْاِنْبَاذِ فِی هٰذِهِ الْاَوْعِيَةِ لَيْسَ بِمَنْسُوْخٍ بَلْ حِکْمَةٌ بَاقٍ الخ

مسلک دوم ۔ حنفیہؒ اور جمہور علماء کے نزدیک یہ نہی منسوخ ہے ۔

دلیل ۔ مشکوٰۃ شریف ص۱۵۴ ج۱ باب زیارۃ القبور : حضرت بریدہؓ کی روایت ہے ۔ نَهَيْتُكُمْ عَنِ النَّبِيْذِ اِلَّا فِیْ سِقَاءٍ فَاشْرِبُوْا فِی الْاَسْقِيَةِ كُلِّهَا وَلَا تَشْرِبُوْا مُسْكِرًا ۔!

امام مالکؒ کی دلیل کا جواب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ابن عباسؓ کو نسخ نہی والی روایت نہ پہنچی ہو ۔

عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَحَوْلَهٗ عِصَابَةٌ مِنْ اَصْحَابِهٖ بَايِعُوْنِیْ عَلٰی اَنْ لَا تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ شَيْئًا

ترجمہ : حضرت عبادہ بن صامتؓ فرماتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کی اس جماعت کو جو آپ کے گرد بیٹھی ہوئی تھی (مخاطب کرکے) فرمایا تم مجھ سے اس بات پر بیعت کرو کہ اللہ کا کسی کو شریک نہ بناؤ گے ۔

قولہٗ عِصَابَةٌ ۔ (بکسر العین) یہ مأخوذ ہے عصب سے بمعنیٰ باندھنا

اسم جمع ہے عصابہ اس پٹی کو کہتے ہیں جو ٹوٹی ہوئی ہڈی یا زخم پر باندھی جاتی ہے جس سے ہڈی یا زخم درست ہو جاتے ہیں اس کے مترادف ہے۔ عُصْبَۃٌ بمعنیٰ جماعت چونکہ افراد کی قوت جماعت پر موقوف ہے اس کے جماعت کو عِصَابَۃ کہا جاتا ہے۔ اور لفظ عِصَابَۃ کا اطلاق دس سے لے کر چالیس عدد تک کی جماعت پر بولا جاتا ہے۔ کما فی قولہ تعالیٰ فی سُورۃ النّور " اِنَّ الَّذِیْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَۃٌ "۔

قولہٗ بَایِعُوْنِیْ : بیعت کے معنیٰ مُعاہدۂ طاعت کے ہیں۔ بیعت میں بیع کی مشابہت ہے کیونکہ بیع میں ثمن مبیع کا عوض ہوتا ہے اور بیعت میں ثواب طاعت کا عوض ہوتا ہے اور اس کا منشأ یہ آیت کریمہ ہے۔ حیثُ قال تعالیٰ " اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّۃَ "۔ (پ۱۱ البراءۃ)

بیعت کے اقسام

اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا بَایِعُوْنِیْ یہ کیسی بیعت تھی اس کے سمجھنے کے لیے بیعت کی اقسام سمجھنا ضروری ہیں بیعت کی چار قسمیں ہیں۔

۱۔ بیعتِ اسلام

بیعتِ اسلام وہ بیعت ہے جو اسلام لانے کے وقت کسی کے ہاتھ پر کی جائے۔ عہد و پیمان کی پختگی کے لیے شرک و کفر سے توبہ کر کے بہت سے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر بیعتِ اسلام کرتے رہتے تھے۔

۲۔ بیعتِ جہاد

بیعتِ جہاد وہ بیعت ہے کہ مسلمان امام کے ہاتھ پر اس عہد و پیمان کے لیے کریں کہ ہم اللہ کے راستہ میں جان دینے اور ہر بڑی سے بڑی قربانی کے لیے تیار ہیں جیسے حدیبیہ کے مقام پر حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضور علیہ السلام کے دستِ مبارک پر مشرکین کے ساتھ قتال کرنے کے لیے بڑے جوش و خروش کے ساتھ کی تھی جس کا ذکر قرآن مقدس میں ہے :-

لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ
(پ۲۶ الفتح)

اس کو بیعتِ رضوان کہا جاتا ہے ۔ حضرات صحابہ کرامؓ کی یہ بیعتِ جہاد تھی ۔

۳ بیعتِ خلافت بیعتِ خلافت وہ بیعت ہے جو خلیفۃ المسلمین کے ہاتھ پر اس کی خلافت کے تسلیم کرنے کی نشانی کے طور پر کی جائے جیسے سیّدنا ابوبکر صدیق رضؓ کے ہاتھ پر حضرات صحابہؓ نے بیعت کی ۔

۴ بیعتِ طریقت بیعتِ طریقت اس بیعت کو کہتے ہیں جو کسی شیخ کامل کے ہاتھ پر اس عہد و پیمان کے لیے کی جائے کہ میں آپ کی تعلیم کی اتباع کرتے ہوئے اپنے ظاہر و باطن کو شریعت کے مطابق کروں گا یعنی گناہ چھوڑ دوں گا اور نیکیاں کروں گا ۔

یقول ابوالاسعاد : حضرت عبادہؓ بن صامت کی روایت میں جس بیعت کا ذکر ہے وہ بیعتِ طریقت ہی بن سکتی ہے ظاہر ہے کہ یہ بیعتِ اسلام تو ہے نہیں اس لیے کہ بَایِعُوا کے مخاطب حضرات صحابہ کرامؓ ہیں جو پہلے سے اسلام لائے ہوئے ہیں ان کا بیعتِ اسلام کرنا تحصیل حاصل ہے ۔ بیعتِ جہاد بھی مراد نہیں اس لیے کہ اس میں جہاد کا کوئی مضمون مذکور نہیں نہ ہی جہاد کا کوئی موقعہ ہے اور بیعتِ خلافت بھی مراد نہیں ہو سکتی کیونکہ بیعتِ خلافت رسولؐ کے ہاتھ پر نہیں ہوتی بلکہ خلیفۂ رسول کے ہاتھ پر ہوتی ہے ۔ لازمًا یہ بیعتِ طریقت ہی کہلائے گی جس کو صوفیائے کرامؒ و مشائخ عظامؒ کی اصطلاح میں بیعتُ السّلوک کہتے ہیں جس کا مقصد صرف اور صرف اجتناب عن المعاصی کا عہد و پیمان لینا ہے ۔ پہلی تین قسم کی بیعتوں کو سب مانتے ہیں ۔

بعض علماءِ ظاہر نے بیعتِ طریقت کو بدعت قرار دیا ہے یہ غایت درجہ کی بے انصافی اور جہل مرکب ہے جس قسم کی بیعت کو صوفیاءِ کرامؒ بیعتِ طریقت کہتے ہیں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم سے اس کا ثبوت حضرت عُبادۃ بن صامتؓ کی اس روایت سے بھی ہے اور جو بخاری شریف میں روایت ہے وہ اس طرح ہے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا :۔ بَایِعُوْنِیْ : صحابہ کرام رضؓ نے عرض کیا قَدْ بَایَعْنَاکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ حضورؐ نے پھر دوبارہ فرمایا بَایِعُوْنِیْ جب کہ وہ پہلے بیعتِ اسلام کر چکے تھے ۔ پھر یہ بیعت سوائے

بیعتُ السلوک کے اور کیا تھی ۔ مُسلم شریف صؔ۲۳۴ ج ا بابُ النّھی عن المسئلۃ ۔
اسی طرح درج ذیل آیت سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے ۔ قولہٗ تعالیٰ :۔
یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ یُبَایِعْنَكَ عَلٰٓی اَنْ لَّا یُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَیْئًا وَّلَا یَسْرِقْنَ وَلَا یَزْنِیْنَ الخ (الممتحنہ ایت ۱۲ ۔۔)
لہٰذا اگر بزرگانِ دین کے پیشِ نظر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم والی بیعت اور طریقۂ بیعت مقصود ہو تو ان کی بیعت یقیناً سنّت کہلائیگی ۔ ہاں جو لوگ حبِ جاہ و مال میں مبتلا ہیں تو ان سے بیعت ہونا ہرگز مناسب نہیں کیونکہ وہ رسمی بیعت ہے جو دکان داری ہے وہ بلاشبہ بدعت اور باعثِ ہلاکت و ندامت ہے ۔ دکاندار سجادہ نشینوں کے متعلق علامہ رومیؒ نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

بسا ابلیس آدم رُوئے ہست ۔۔۔ بہر شخصے کہ نباید داد دست

قولہٗ وَلَا یَاْتُوْا بِبُهْتَانٍ تَفْتَرُوْنَهٗ بَیْنَ اَیْدِیْكُمْ وَاَرْجُلِكُمْ الخ
(ترجمہ) جان بوجھ کر کسی پر بہتان تراشی نہ کروگے ۔
قولہٗ بُھْتَانٌ یہ بُھْتٌ سے مأخوذ ہے بمعنیٰ مبہوت یعنی ایسا جھوٹ جس کو سُن کر سامع مبہوت اور حیران ہوجائے ۔
قولہ بَیْنَ اَیْدِیْكُمْ وَاَرْجُلِكُمْ : محدثین حضراتؒ نے اس کے مختلف مطلب بیان فرمائے ہیں ۔
اوّل : بَیْنَ اَیْدِیْكُمْ وَاَرْجُلِكُمْ سے مُراد ہے مِنْ قِبَلِ نُفُوْسِكُمْ یعنی ایسا بہتان جو دل سے گھڑ لیا گیا ہو خارج میں اس کی کوئی حقیقت نہ ہو ۔
سوال : یہ ہے کہ جب یَدْ اور رِجْل سے مراد قلب ہے تو پھر یہ تعبیر کیوں اختیار فرمائی بَیْنَ قُلُوْبِكُمْ ہی فرما دیتے ۔
جواب : یہ تعبیر اس لیے اختیار فرمائی کہ دل ہاتھ اور پاؤں کے درمیان ہوتا ہے یا یہ کہ اکثر افعال کا صدور ان ہی سے ممکن ہوتا ہے ۔
دوؔم : زمانہ جاہلیت میں عورتیں کسی ناجائز بچے کو اپنے خاوند کی طرف منسوب کردیا کرتی

تھیں۔ پھر یہ تعبیر کیسے منطبق ہو سکتی ہے تو وہ یوں ہے کہ حمل پیٹ میں ہوتا ہے یہ بَيْنَ اَيْدِي ہوگیا اور شرمگاہ سے جنتا ہے یہ بَيْنَ اَرْجُلِكُمْ ہوگیا خطاب میں مقصود اصلاً عورتیں ہیں۔

سوم: عند البعض بَيْنَ اَيْدِيكُمْ وَاَرْجُلِكُمْ سے مراد مشافۃً ہے لیکن کسی کے منہ پر بہتان مت لگاؤ کسی کے پس پشت بہتان لگانا بھی برا ہے لیکن اس کو منہ پر کہ ڈالنا اس سے بھی برا ہے۔

قولہ فَمَنْ وَفٰى مِنْكُمْ (تم میں سے جو وفائے عہد کرے گا)

يقول ابوالاسعاد :— قَالَ الطِّيْبِي لفظ وَفٰى يَرْشِدُ اِلٰى اَنَّ الْاَجْرَ اِنَّمَا يَنَالُ بِالْوَفَاءِ بِالْجَمِيْعِ لِاَنَّ الْوَفَاءَ هُوَ الْاِتْيَانُ بِجَمِيْعِ مَا الْتَزَمَهُ مِنَ الْعَهْدِ وَالْحُقُوْقِ۔

سوال۔ یہ ہے کہ یہاں صرف منہیات پر کیوں اکتفا کیا گیا حالانکہ شریعت مقدسہ کے اور مامورات بھی تو ہیں۔

جواب۔ کہ حدیث پاک میں اجمالاً مامورات کا بھی ذکر ہے۔ حَيْثُ قَالَ وَلَا تَعْصُوْا عِصْيَان مخالفتِ امر کو کہا جاتا ہے عصیان سے منع کرنا گویا کہ مخالفتِ امر سے منع کرنا ہے تو ارتکاب منہیات و مخالفتِ اوامر دونوں سے منع کیا گیا چونکہ بصورت اجتناب عن المفاسد، تخلی عن الرذائل اجتلاب مصالح تحلی بالفضائل پر مقدم ہے اس لیے اجتناب عن المناہی کو مقدم کیا پھر فرمایا کہ " ولا تعصوا "

قولہ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللهِ : اہلِ سنّت والجماعت کا مسلک یہ ہے کہ لَا يَجِبُ عَلَى اللهِ شَيْئٌ کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں، معتزلہ حضرات کئی چیزیں اللہ تعالیٰ پر واجب سمجھتے ہیں مثلاً جو شخص ارتکاب کبائر سے بچے اس کے متعلق کہتے ہیں کہ اللہ پر واجب ہے کہ اس کو ثواب دے۔ مرتکب کبیرہ کو سزا دینا بھی اللہ تعالیٰ پر واجب سمجھتے ہیں جب کہ اہلِ سنت والجماعت کے نزدیک اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں۔

سوال۔ مُعتزلہ حضرات اَجْرُهٗ عَلَى اللهِ سے استدلال کرتے ہیں۔ طرز استدلال یوں ہے کہ علیٰ کا استعمال عموماً لزوم کے لیے آتا ہے۔ یہاں علیٰ کا لانا اس بات کی دلیل ہے

کہ ایسے شخص کا اجر اللہ پر واجب اور لازم ہے اس قسم کے اور بہت سے جملے کتاب و سنت میں آتے ہیں جن سے بظاہر وجوب علی اللہ کا وہم ہوتا ہے۔

جواب اوّل وجوب کی دو قسمیں ہیں (۱) وجوب استحقاقی (۲) وجوب تفضلی اہل سنّت والجماعت اللہ تعالیٰ پر لزوم استحقاقی کے نافی ہیں لزوم تفضلی کے نافی نہیں اور اس قسم کی نصوص میں لزوم تفضّلی مراد ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ گو کسی بندہ کا کوئی حق اللہ تعالیٰ پر واجب نہیں لیکن ایسے پابندِ شرع کے متعلق اللہ نے اپنے تفضّل اور عنایت سے جنّت دینا لازم قرار دے لیا ہے (۲) لزوم کی دو قسمیں ہیں: (۱) لزومِ عقلی (۲) لزومِ شرعی۔ اہل سنّت والجماعت لزومِ عقلی کے نافی ہیں اور یہاں لزومِ عقلی مراد نہیں بلکہ لزومِ شرعی مراد ہے۔

قولہ وَمَنْ اَصَابَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا فَعُوْقِبَ بِهٖ فِي الدُّنْيَا فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ (ترجمہ) یعنی جو کوئی ان گناہوں میں سے کچھ کر بیٹھے اس کو دنیا میں اس کی سزا مل جائیگی۔ یہ سزا اس کے گناہ کے لیے کفارہ ہو جائے گا)

حدیثِ پاک کے اس جملہ سے مسئلہ مُستنبَط ہوتا ہے کہ حدود گناہوں کے لیے کفّارہ اور مُطہر ہیں یا زواجر۔

حُدود کفارات ہیں یا نہیں؟

عُلماء میں اختلاف ہے کہ حدود و قصاص سواتر ہیں یا زواجر یعنی دنیا میں سزا دینے سے آیا اس کا مواخذہ آخرت میں بھی معاف ہو جاتا ہے۔ ثانیاً اس کو عذاب نہیں دیا جائے گا، یا صرف زجر کے لیے ہیں اور دنیا کا انتظام باقی رکھنے کے لیے ہیں اور آخرت کے معاملہ کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ آخرت میں مواخذہ ہوگا اس بارہ میں دو مسلک ہیں۔

مسلکِ اوّل: ائمہ ثلاثہ کے نزدیک حدود و قصاص گناہ کے لیے کفارہ ہیں

سب گناہ معاف ہوجائیں گے، آخرت میں مؤاخذہ نہیں ہوگا خواہ توبہ کرے یا نہ کرے یعنی حدود سواتر ہیں اور حد لگنا گناہ کی معافی کا سبب ہے۔

شافعیہ کی دلیل شافعیہ کے دلائل میں سے ایک دلیل حدیث باب کے یہی الفاظ ہیں "مَنْ اَصَابَ ذَالِكَ شَيْئًا فَعُوقِبَ بِهٖ فِي الدُّنْيَا فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَهٗ" جب دنیا میں اسے سزا دی گئی تو یہ سزا اس کے لیے مطلقًا کفارہ ہے دنیا کے لحاظ سے بھی اور آخرت کے لحاظ سے بھی۔

مسلک دوم ۔ احناف کے نزدیک حدود مکفرات ذنوب نہیں بلکہ فقط زواجر ہیں اور مکفر توبہ ہے نہ کہ حد۔ لہٰذا توبہ کے بغیر اگر صرف حد ہوگی تو آخرت میں سزا ملے گی۔

حنفیہ کے دلائل ۔ اختصارًا چند دلائل کے نقل کرنے پر اکتفا کیا جارہا ہے۔

دلیل اول قطاعِ طریق کی حد بیان کرنے کے بعد قرآن مقدس میں فرمایا ذَالِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ○ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ فَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ (پ) یہاں دو باتیں رب ذو الجلال نے بیان فرمائی ہیں اولاً یہ بیان فرمایا کہ ان کے لیے آخرت میں بڑا عذاب ہے ثانیًا یہ فرمایا کہ "جب توبہ کرلیں" یہ اس بات کی صریح دلیل ہے کہ اگر قاطع الطریق پر حد جاری ہوجائے اور توبہ نہ کرے تو اس کے لیے آخرت میں عذاب عظیم ہے۔ اس عذاب سے خلاصی کا وعدہ توبہ پر ہے صرف حد جاری ہونے پر نہیں۔ متنازع فیہ مسئلہ میں حنفیہ کا یہی مسلک ہے۔

دلیل دوم سارق کی حد قطع ید بیان کرنے کے بعد قرآن پاک کہتا ہے "فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (پ) یہ آیت بھی اس بارے میں صریح ہے کہ اجرائے حد کے بعد توبہ کی ضرورت ہے توبہ اور اصلاح کے بغیر معافی کا وعدہ نہیں۔

دلیل سوم ۔ حدِّ قذف بیان کرنے کے بعد قرآن مقدس میں فرماتے ہیں:۔

وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَ اَصْلَحُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ یہ اسلوب بیان بھی صراحۃً اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ گناہ کی معافی کے لیے اور فسق سے نکلنے کے لیے صرف حد کا جاری ہونا کافی نہیں بلکہ توبہ اور اصلاح کی ضرورت ہے۔

دلیل چہارم ابو داؤد شریف ص۲۵۴ ج ۲ کتاب الحدود باب فی التلقین فی الحد میں روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک چور لایا گیا، اس نے چوری کا اعتراف کیا اور ہاتھ کاٹا گیا۔ قطع ید کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو فرمایا "اِسْتَغْفِرِ اللّٰهَ وَتُبْ اِلَيْهِ" اس سے معلوم ہوا کہ حد کے بعد بھی توبہ و استغفار کی احتیاج ہے۔

شافعیہ کی دلیل کے جوابات

محدثینؒ حضرات نے مختلف جوابات دیے ہیں:-

جواب اوّل اس حدیث میں عقاب سے مراد عقاب تشریعی نہیں ہے بلکہ عقاب تکوینی یعنی مصائب مراد ہیں مطلب حدیث کا یہ ہے کہ جس نے کوئی جرم کیا اور اس جرم کی وجہ سے حق تعالیٰ کی طرف سے اس پر مصیبتیں آگئیں تو یہ مصیبتیں اس کے لیے معافی کا ذریعہ بن جائیں گی۔ یہاں مصائب کو کفارہ قرار دیا ہے نہ کہ حدود کو مصائب کا کفارہ سیئات بننا اتفاقی مسئلہ ہے نزاع حدود کے بارے میں ہے۔

جواب دوم جس پر حد جاری ہو اس کی حالتیں مختلف ہوتی ہیں اکثر لوگوں کی یہ حالت ہوتی ہے کہ حد لگنے سے ان کے دل میں ندامت اور شرمساری آجاتی ہے جو توبہ کی حقیقت ہے اور بعض ضدی مزاج ایسے ہوتے ہیں کہ حد لگنے سے بھی نادم نہیں ہوتے۔ حنفی جو کہتے ہیں کہ حد کفارہ نہیں بنتی اس سے مراد یہ ہے کہ دوسری قسم کے لوگوں کے لیے کفارہ نہیں بنتی، پہلی قسم کے لوگوں کے لیے ہمارے نزدیک بھی حد کفارہ بن جاتی ہے اس لیے کہ وہ حد مقرون بالتوبہ ہو گئی، اور حدیث عبادہؓ کا محل ایسے ہی لوگ ہیں

جو حد لگنے سے نادم ہو جاتے ہیں چونکہ اکثریت ایسے لوگوں کی ہوتی ہے اس لیے اس نقص میں تفصیل کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

جواب سوم گناہ کی معافی کا سببِ قریب توبہ ہے اور حد سبب بعید ہے اس لیے کہ حد سے توفیقِ توبہ ہوگی اور توبہ سے معافی حنفیہ حد کے معافی کے لیے سبب قریب بننے کے منکر ہیں اس بات کے ہم بھی قائل ہیں کہ حد گناہ کی معافی کے لیے سبب بعید ہے اور اس حدیث کا محل بھی یہی ہے کہ حد کفارہ ہے یعنی گناہ معاف ہونے کے لیے سبب بعید ہے۔ حد کی برکت سے توبہ اور توبہ سے معافی ہو ہی جائیگی۔

من شاء فلیطالع الی کتب المطول۔

اسمائے رجال

حالات حضرت عبادۃؓ بن الصامت

آپ کی کنیت ابوالولید ہے قبل الہجرت مدینہ منورہ سے دو دفعہ بیعت کے لیے حاضر خدمت ہوئے۔ ایک دفعہ عقبہ اُولیٰ میں جس میں بارہ آدمی شریک ہوئے۔ اور دوسری دفعہ عقبہ ثانیہ میں جس میں ستّر شریک تھے آپ جنگِ بدر وغیرہ میں بھی حاضر ہوئے۔

حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ میں حمص کے قاضی مقرر ہوئے۔ حضور علیہ السلام نے آپ کو مدینہ منورہ کا سردار بنا کر بھیجا تھا۔ عقبہ اُولیٰ کے بارہ نقباء میں سے ایک نقیب آپ بھی ہیں ۳۴ھ میں بعمر ۷۲ سال وفات پائی۔ آپ کی کل مرویات ۸۱ ہیں۔

وَعَنْ اَبِىْ سَعِيْدِنِ الْخُدْرِىِّ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِىْ اُضْحًى اَوْ فِطْرٍ اِلَى الْمُصَلّٰى فَمَرَّ عَلَى النِّسَآءِ

ترجمہ : روایت ہے حضرت ابوسعید خدریؓ سے فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بقرعید یا عیدُالفطر میں عیدگاہ تشریف لے گئے پس عورتوں کی جماعت پر گذرے ۔

قولہ فِیْ اُضحیٰ : اگر یہ تنوین کے ساتھ ہو تو اضحاۃ بمعنیٰ قربانی ای فی یوم الاضحیٰ اور اگر بلا تنوین ہو تو یوم اضحیٰ مراد ہے ۔ مطلب ایک ہی ہے قربانی اور عید چونکہ بوقت ضحیٰ یعنی چاشت کے وقت کی جاتی ہے اس لیے ان کو اضحیٰ کہا جاتا ہے ۔

قولہ اَوْ فِطْرٍ : اَوْ شک راوی کے لیے ہے یعنی راوی کو تردد ہو گیا ہے کہ حضور علیہ السلام عید الاضحیٰ یا عید فطر کے لیے نکلے ایسے موقعہ پر اَوْ کے بعد قَالَ پڑھا جاتا ہے ۔

قولہ فَمَرَّ عَلَى النِّسَاءِ : اسلام کے ابتدائی زمانہ میں عورتیں بھی مردوں کے ساتھ ہی مسجد شریف میں نمازیں ادا کرتی تھیں اس لیے عید الاضحیٰ یا عید الفطر کی نماز کے لیے عورتیں عیدگاہ میں آتی تھیں اور چونکہ وہ الگ ایک کونہ میں بیٹھی ہوئی تھیں اور خطبہ کی آواز مبارک ان تک نہیں پہنچتی تھی اس لیے ضروری ہوا کہ احکام دینی اور ضروری باتیں ان کو سنائیں چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لے گئے اور ان کو وعظ و نصیحت سے مشرف فرمایا ۔

قولہ فَقَالَ يَا مَعْشَرَ النِّسَاءِ تَصَدَّقْنَ فَاِنِّىْ اُرِيْتُكُنَّ اَكْثَرَ اَهْلِ النَّارِ ۔ (ترجمہ) پس فرمایا اے عورتوں کی جماعت تم صدقہ خیرات کیا کرو کیونکہ میں نے تم میں سے اکثر کو دوزخ میں دیکھا ہے ۔

سوال :- نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معشر نساء کو صدقہ کا حکم کیوں فرمایا ؟

جواب : حدیث پاک میں ہے کہ " اَلصَّدَقَةُ تُطْفِئُ غَضَبَ الرَّبِّ " یعنی صدقہ اللہ تعالیٰ کے غصہ کو ٹھنڈا کرتا ہے تو غصہ رب ذوالجلال دخولِ نار کا سبب ہے

جب صدقہ ہوگا تو یہی صدقہ دُخولِ نار سے مانع اور رُکاوٹ بن جائے گا فَلِھٰذَا اُمَرْنَ بِصَدَقَۃٍ عندالبعض صدقہ کا حکم بحیثیت مُکفِّرالذّنوب نہیں بلکہ اس کے ذریعہ یہ بُری عادت زائل ہوجانے یا توبہ کی توفیق ہونے کی اُمید کی حیثیّت سے ہے۔

قولہ رَأَیْتُکُنَّ : مُحدّثینؒ حضرات نے بحث کی ہے کہ یہ رُؤیت کونسی ہے اس میں مُختلف قول ہیں ا۔

(۱) یہ ارأت شبِ معراج میں ہوئی ۔

(۲) یاحالتِ کشف میں ۔ (۳) عندالبعض وحی کے ذریعہ اطلاع دی گئی ۔

(۴) عندالجمہور کہ صلوٰۃ کسوف میں جب مسجد میں قبلہ کی جانب دیوار میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جنت و دوزخ پیش کی گئی تھی۔کذافی ابی داوٗد شریف ص۱۶۴ ج ا بابُ صلوٰۃِ الکسُوف وبابُ مَنْ قَالَ اربعُ رکعاتٍ ۔

قولہ تُکْثِرْنَ اللَّعْنَ : جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اکثر اھل النار والا قول ارشاد فرمایا تو عورتوں نے کہا یارسول اللہ اس کا سبب کیا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ تم لعن طعن بہت کرتی ہو لَعَنْ کے لغوی معنیٰ ہیں رحمت سے دور کرنا اور انسان کی طرف سے لعن کے معنیٰ ہیں رحمت الٰہیہ سے دوری اور غضب کی بد دُعاء کرنا چونکہ حق تعالیٰ کی رحمت غضب سے بہت وسیع ہے اس لیے کسی پر بھی لعن کرنا درست نہیں الّا وہ کافر جس کی موت کفر پر یقینی ہو اور وحی سے معلوم ہو ابلیس اور ابوجہل وغیرہ ورنہ کافر پر بھی جائز نہیں نہ زندہ پر نہ مُردہ پر کیونکہ ممکن ہے کہ اس کا خاتمہ اچھا ہو یا اچھا ہوا ہو ہاں بطور بُری وصف کے غیر معین آدمی پر اور قاعدہ کلیہ کے طور پر لعن کرنا درست ہے مثلاً لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الکافِرِیْنَ یا عَلَی الکاذِبِیْنَ یا حدیث پاک میں ہے لَعَنَ اللّٰہُ الوَاصِلَۃَ وَالمُسْتَوْصِلَۃَ الخ (مشکوٰۃ ص۳۸۱ ج۲) اس کو خصوصًا اس لیے ذکر کیا گیا کہ اکثر عورتوں کی عادت ہوتی ہے کہ جہاں ایک دو مِل کر بیٹھیں وہاں لعن طعن کی بوچھاڑ کرنا شروع کردیتی ہیں حالانکہ یہ حقوق العباد میں سے ہے جو من قبیل الکبائر ہے۔

قولہٗ وَتَكْفُرُ الْعَشِيْرَ : (اور خاوند کی ناشکری کرتی رہتی ہو) کفر کے معنیٰ چھپانا کے ہیں اس سے زارع (کاشت کار) کو کافر کہا جاتا ہے کیونکہ وہ دانہ کو زمین میں چھپاتا ہے، اور شرعی معنیٰ ہیں شریعت نبوت، وحدانیت اور دین کا انکار کرنا یہ بڑا کفر ہے، اور کفرانِ نعمت نام ہے ناشکری کا یہ چھوٹا کفر ہے اور یہاں یہی مراد ہے اور اسی مناسبت سے اس حدیث کو کتاب الایمان میں لایا گیا ہے۔

قولہٗ اَلْعَشِيْرَ : عَشِیْر بمعنیٰ معاشر اور رفیق حیات یعنی زوج کفرانِ عشیر یہ بھی کفر میں داخل ہے لیکن چھوٹا کفر ہے۔ یہاں خصوصی طور پر اس لیے ذکر کیا گیا ہے کہ حدیث پاک میں آتا ہے :۔

لَوْ كُنْتُ اٰمِرُ اَحَدًا اَنْ يَّسْجُدَ لِاَحَدٍ لَاَمَرْتُ الْمَرْأَةَ اَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِهَا۔ (ترجمہ) اگر غیر اللہ کو سجدہ کی اجازت دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ خاوند کو سجدہ کیا کرے۔

حالانکہ غیر اللہ کو سجدہ کرنا شرک ہے اس سے معلوم ہوا کہ شوہر کے ساتھ ناشکری کرنا سخت گناہ ہے۔ نیز جب یہ حقوق الزوج کی ادائیگی میں سستی کرتی ہے تو وہ حقوق اللہ میں بھی کوتاہی کریگی اسی وجہ سے اکثر عورتوں کو دوزخ میں دیکھا گیا۔

قولہٗ مَارَأَيْتُ : اس کا مفعول مقدر ہے ای مَا رَأَيْتُ اَحَدًا۔

قولہٗ لِلُبِّ : پہلا لام جارہ ہے دوسرا نفس کلمے کا اور لب نام ہے شائبہ ہوا سے خالص عقل کا اور عقل اس قوت کو کہتے ہیں جس سے معانی کا ادراک ہو اور وہ جو برے کاموں سے روکے اور وہ مؤمن کے قلب میں اللہ تعالیٰ کا ایک نور ہے لب خاص اور عقل عام ہے۔

قولہٗ الْحَازِمِ ۔ یہ رجل کی صفت ہے بمعنیٰ ہوشیار، مقصد یہ ہے کہ ناقص عقل والی ہوکر سمجھدار انسان کو اپنے جال میں پھنسا لیتی ہیں یعنی بہت بڑے مکر والی ہیں " اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ " :

قولہٗ وَمَا نُقْصَانُ دِيْنِنَا وَعَقْلِنَا ، اس سے معلوم ہوا کہ جو بات سمجھ میں نہ آئے اس کو متعلم دوبارہ استاد سے پوچھ لے اور ان عورتوں نے ترتیب بدل دی کہ

دین کو عقل پر مقدم کر دیا یا تو دین کی اہمیت کی وجہ سے یا ناقصات عقل کا ثبوت دینے کیلئے۔

سوال ۔ صنف نسار کا یہ تعطل اختیاری نہیں بلکہ فطری ہے یہ ان کے دینی نقصان کا سبب کیسے بنا؟

جواب اگر اس فطری نقصان کے ساتھ شریعت ان سے صنف رجال کے کمالات حاصل کرنے کا مطالبہ کرتی تو بے شک ناانصافی ہوتی مگر ان سے مطالبہ ہے تو ان ہی کمالات کا ہے جو ان کے عالم میں کمال تصور کیے جاتے ہیں قدرت نے اگر انسان کو بازوئے پرواز نہیں دیے اور اس حیثیت سے اس کو ایک پرندے سے بھی ناقص بنایا ہے تو اس سے اڑنے کا مطالبہ بھی نہیں کیا پھر اس کو کیا حق ہے کہ وہ قدرت سے اپنے اس نقصان کا گلہ کر سکے۔ اصل یہ ہے کہ اجناس ہوں یا انواع سب خدا کی مخلوق ہیں اور سب ہی میں ایک جہت سے نقصان موجود ہے شریعت اس فطری نقصان پر تم سے مؤاخذہ نہیں کرتی تم کمال ونقصان کی اس تقسیم سے اس پر اعتراض مت کرو۔ وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ اِلٰى قَوْلِهٖ وَاسْاَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ (پ۵)

اس حدیث پاک میں ہے کہ جہنم میں عورتیں بکثرت ہونگی اس کے بالمقابل دوسری حدیث میں ہے کہ جنت میں کم از کم ہر شخص کو دو بیویاں ملیں گی اس سے معلوم ہوا کہ جنت میں مردوں سے زیادہ عورتیں ہونگی یا کم از کم دوگنی تو ہونگی اس کا تقاضا یہ ہے کہ جب وہاں عورتیں ہیں تو مرد کم ہوں اور جہنم کے اندر مرد زیادہ ہونے چاہئیں اور عورتیں کم جب کہ اس حدیث سے مسئلہ عکس ہے۔

جواب اوّل : عورتوں کی پیداوار کثرت سے ہے اس لیے دونوں جگہ ہی زیادہ ہونگی

جواب دوم : چونکہ وہ عورتیں کفرانِ عشیر کی وجہ سے جہنم میں ہونگی اور کفرانِ عشیر کفر دون کفر ہے تو ابتداءً سزا بھگتنے کے لیے جہنم میں جائینگی، اور پھر وہاں سے جنت میں آئینگی تو گویا ابتداءً جہنم کے اندر کثرت اور پھر انتہاءً جنت میں کثرت ہوگی۔

سوال بی بی مریم ؑ و آسیہؓ، خدیجہؓ، عائشہؓ، اور فاطمہؓ ان کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ وہ کامل عقل والی ہیں اس طرح دورِ حاضر میں بھی بہت

سی عورتیں مردوں پر حکمران ہیں پھر کیسے فرمایا کہ ناقصاتِ عقل و دین ہیں۔

جواب اوّل : مردوں کی نسبت یہ اقل قلیل ہے القلیل کالمعدوم ولہذا وہ مستثنیٰ ہیں۔

جواب دوم : علامہ عینیؒ لکھتے ہیں " اِنَّ الْحُکْمَ عَلَی الْکُلِّ بِشَیْئٍ لَا یَسْتَلْزِمُ الْحُکْمَ عَلٰی کُلِّ فَرْدٍ مِنْ اَفْرَادِہٖ بِذٰلِکَ الشَّیْئِ یعنی عام چیز پر کوئی حکم لگانا اس چیز کے ہر ہر فرد پر یہ حکم پورا منطبق ہونے کو مستلزم نہیں ہوتا یعنی نَاقِصَاتُ عَقْلٍ وَدِیْنٍ سے یہ مستثنیٰ ہیں۔

سوال : نبی علیہ السلام نے نقصانِ دین کا سبب حیض جو غیر اختیاری اور عادی مرض ہے اس کو قرار دیا حالانکہ دوسری احادیث میں مریض کو حالتِ مرض میں اس کی عادت مستمرہ کے مطابق اجر بغیر عمل کے ملتے رہنے کا ذکر ہے لہذا حائضہ عورت کو بھی دوسرے مریض سے زیادہ ثواب ملنا چاہیے چہ جائیکہ نقصان دین کا سبب بنے۔

جواب : دوسری قسم کے مرض میں نیت عبادت صحیح ہے گو عبادت کی طاقت نہیں ہوتی اس لیے اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَاتِ کی بناء پر اجر کا مستحق ہوگا لیکن حالتِ حیض میں نیت عبادت صحیح نہیں لہذا ثواب بھی نہ ملے گا اور نقصان دین کا سبب بھی قرار پائے گا۔

اسمائے رجال

حضرت ابی سعید خدریؓ کے حالات

آپ کا نام سعد بن مالک بن سنان خدری انصاریؓ ہے کثیر الروایت صحابیؓ ہیں۔ حفاظِ حدیث علماء فضلاء وعقلاء صحابہؓ میں سے ہیں آپ کنیت سے زیادہ مشہور ہیں۔ آپ سے صحابہؓ اور تابعینؒ کی ایک جماعت نے روایت کی ہے۔ ۷۴ھ میں بعمر ۸۴ سال وفات پائی اور جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔!

وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى كَذَّبَنِیْ اِبْنُ آدَمَ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ ذَالِكَ :

ترجمہ : حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ابن آدم (انسان) مجھ کو جھٹلاتا ہے اور یہ بات اس کے شایانِ شان نہیں۔

فائدہ سب احادیث وحی الٰہی ہیں لیکن بعض احادیث ایسی ہیں جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قال اللہ وغیرہ کہ کر صراحۃً اس بات کی حق تعالیٰ کی طرف نسبت کردی ہے ایسی حدیث کو حدیث قدسی کہتے ہیں۔ قرآن کریم کی نسبت بھی صراحۃً حق تعالیٰ کی طرف ہے اس اشتراک کے باوجود حدیث قدسی اور قرآن میں کئی وجوہ سے فرق ہے اور اس فرق کا اظہار ان دو تقسیموں سے واضح ہوجاتا ہے۔

تقسیم اوّل ـــــ اقسامِ وحی

وحی تین طرح کی ہوتی ہے :-

اوّل ؛ یہ کہ الفاظ و معانی اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی جلی کے ساتھ ہوتے ہیں اور اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے تو اسی کو کلام اللہ ای القرآن کہا جاتا ہے۔

دوم ؛ اور اگر معانی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوں اور نسبت بھی اس کی طرف ہو لیکن الفاظ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوں تو یہ حدیث قدسی ہے۔

سوم ؛ اور اگر معانی و مضمون اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوں اور الفاظ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوں اور نسبت بھی حضورؐ کی طرف ہو تو یہ حدیث نبوی ہے۔

تقسیم دوم ــ قرآن اور حدیث قُدسی میں فرق

حدیث قدسی	قرآن پاک
(۱) حدیث قدسی کے لیے مُعجز ہونا ضروری نہیں	(۱) قرآنِ پاک معجز ہے ۔
(۲) حدیث قدسی پڑھنے سے یہ فرض ادا نہ ہوگا ۔	(۲) نماز میں قرأت قرآن ضروری ہے ۔
(۳) حدیث قدسی کا یہ حکم نہیں	(۳) قرآن مُقدس کا مُنکر کافر ہے ۔
(۴) حدیث قدسی عام ہے بواسطہ جبریلؑ ہو یا بلا واسطہ بیداری یا نیند میں القاء کر دیا جائے ۔	(۴) قرآن کریم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اللہ تعالیٰ کے درمیان جبریل علیہ السلام کا واسطہ ضروری ہے ۔
(۵) حدیث قُدسی میں ضروری نہیں ۔	(۵) قرآن کریم کے الفاظ کا بھی منجانب اللہ ہونا ضروری ہے
(۶) حدیث قُدسی کے لیے وضو ضروری نہیں	(۶) قرآن کریم کو بے وضو چھونا جائز نہیں ۔
(۷) حدیث قُدسی کے لیے اس کا تواتر تک پہنچنا شرط نہیں خبر واحد کے درجہ میں ہو تو بھی اس کو حدیث قُدسی کہہ دیتے ہیں ۔	(۷) قرآن کریم مُتواتر ہے بدوں تواتر قرآنیت ثابت نہیں ہوتی ۔

فَاَمَّا تَکْذِیْبُہٗ اِیَّایَ فَقَوْلُہٗ لَنْ یُّعِیْدَنِیْ کَمَا بَدَاَنِیْ (ترجمہ) اس کا مجھ کو جھٹلانا تو یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ جس طرح اللہ نے مجھ کو (اس دنیا میں) پہلی مرتبہ پیدا کیا اسی طرح وہ (آخرت میں) مجھ کو دوبارہ ہرگز پیدا نہیں کرے گا۔

انکارِ بعثت سے لزُوم تکذیب الٰہی

انکار حیات بعد الممات سے تکذیب الٰہی دو حیثیت سے لازم آتی ہے :-

(۱) قرآن مقدس میں رب ذوالجلال نے متعدد مقامات پر حشر و نشر اور بعثت کا ذکر فرمایا اور قرآن مقدس کلامِ الٰہی ہونے کے ساتھ صفت اللہ بھی ہے تو صفت الٰہیہ کی تکذیب خود ذات باری تعالیٰ کی تکذیب ہے۔

(۲) اگر حشر و نشر اور حساب نہ ہوتا تو طاقتور اور جابر مظلوم پر ظلم کرتا رہتا تو یہ سب کارخانہ ہستی کھیل تماشا عبث اور بے حکمت ہو جاتا حالانکہ قرآن مقدس میں عبث اور لعب کی نفی کی گئی ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ (پ۱۷)

تو منکرِ حشر گویا اللہ تعالیٰ کے اس قول کی تکذیب کرتا ہے اس لیے فرمایا: كَذَّبَنِي ابْنُ اٰدَمَ:

سوال: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ہیں كَذَّبَنِي ابْنُ اٰدَمَ جب کہ اللہ تعالیٰ نے كَذَّبَنِي الْاِنْسَانُ کیوں نہیں فرمایا؟

جواب: رب ذوالجلال کا مقصد كَذَّبَنِي ابْنُ اٰدَمَ سے تحقیر بیان کرنا مقصود ہے کہ دیکھو بنی آدم جس کا مادہ بعیدہ مٹی جیسی حقیر چیز ہے اور مادہ قریبہ مَآءٍ مَّهِيْنٍ ہے۔ یہ میری تکذیب کرتا ہے جس طرح کسی انسان کو عار دلانے کے طور پر حقیر خاندان کی طرف نسبت کی جاتی ہے۔

قَوْلُهٗ وَلَيْسَ اَوَّلُ الْخَلْقِ بِاَهْوَنَ عَلَيَّ مِنْ اِعَادَتِهٖ (ترجمہ) حالانکہ دوبارہ پیدا کرنا پہلی مرتبہ پیدا کرنے کے مقابلہ میں مشکل نہیں ہے۔

يَقُوْلُ اَبُوالْاَسْعَاد: حدیث پاک کے اس جملہ سے تحقیق معاد و امکان اعادہ کی طرف علیٰ وجہ ابلغ اشارہ ہے یعنی اس سے حیات بعد الممات کے ثبوت کی طرف ابلغ طریقہ سے اشارہ فرمایا کہ جو خالق کسی چیز کو عدم سے نکال کر وجود کا لباس پہنا سکتا ہے وہ اسی چیز کو جب کہ وہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر اپنا قالب کھو چکی ہو دوبارہ قالب اور وجود عطا کیوں نہیں کر سکتا خود محدود قدرت رکھنے والا انسان کسی چیز کو دوبارہ بنانے میں پہلے کی مانند مشکل نہیں سمجھتا ہے۔ پہلی اور دوسری مرتبہ یہ محض انسان کو سمجھانے کے لیے ورنہ اللہ تعالیٰ کے لیے

ابتدا، وانتہا یعنی اعادہ دونوں یکساں ہیں کیونکہ وہ قادر مطلق ہے ۔ کما فی قولہٖ تعالیٰ
" وَهُوَ الَّذِیْ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَیْهِ وَلَهُ الْمَثَلُ
الْاَعْلٰی فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ " (پ۲۱ سورۃ روم)

قَوْلُهٗ وَاَمَّا شَتْمُهٗ اِیَّایَ فَقَوْلُهٗ اِتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا (ترجمہ) اور
اس کا میرے بارے میں بد گوئی کرنا یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا بیٹا بنایا ہے،
حالانکہ میں تنہا اور بے نیاز ہوں ۔

تعریف شتم : کسی حقیر اور عیب دار چیز کو کسی کی طرف منسوب کرنے کا نام شتم ہے ۔

سوال حدیث پاک میں ہے کہ اِتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ربّ ذوالجلال کے حق میں گالی ہے حالانکہ عرف میں تو اس کو گالی نہیں کہتے لہٰذا اس کی وضاحت ضروری ہے ۔

جواب اِتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ایسے گالی ہے کہ اولاد کا ہونا ممکن کا خاصہ ہے اور حق تعالیٰ واجب الوجود ہیں ان کے لیے اولاد ثابت کرنا و
واجب الوجود کو ممکن کہنا ہے ظاہر ہے کہ یہ بہت بڑی گالی ہے جس طرح کسی انسان کو گدھا کہنا گالی ہے حالانکہ انسان اور گدھا ممکن اور حادث ہونے میں مساوی ہیں صرف نوع کا فرق ہے ۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ لکھتے ہیں کہ کسی عورت سے سانپ یا بندر پیدا ہونا اس کے حق میں سخت عیب ہے حالانکہ دونوں من حیث الجنسیت متحد ہیں ۔
اب خدا کی طرف غیر جنس حادث اور ممکن کو منسوب کرنا کتنا بڑا عیب ہے لہٰذا یہ شتم ہے
(کما فی الایضاح)

وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی یُؤْذِیْنِیْ ابْنُ اٰدَمَ یَسُبُّ الدَّهْرَ ۔

ترجمہ : حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کا ارشاد ہے کہ ابن آدم مجھے تکلیف دیتا ہے (اس طرح کہ) وہ زمانہ کو برا کہتا ہے ۔

تعریفِ ایذاء۔ ایذاء کہا جاتا ہے اپنے قول وفعل سے دوسرے کے ساتھ ایسا مُعاملہ کرنا جو اس کو ناپسندیدہ ہو خواہ وہ دوسرے میں تأثیر کرے یا نہ کرے۔

سوال یہ ہے کہ حدیث کے اندر ایذا کی نسبت ذات باری تعالیٰ کی طرف ہے جو ناممکن ہے کیونکہ حقیقتاً ربِ ذوالجلال کے شایانِ شان یہ بات نہیں ہوسکتی اس لیے کہ وہ ذات متأثر نہیں ہوتی بلکہ مؤثر ہے۔

جواب اوّل ۔ یہ ہے کہ یہاں ایذاء سے حقیقی معنیٰ مراد نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایذاء والا معاملہ کرنا۔

جواب دوم۔ سلفؒ کا مذہب مراد ہے یعنی ایذاء کما یلیق لشانہ۔

جواب سوم۔ ایذاء سے غایت ونتیجہ مراد ہے اور اور ایذاء کی غایت ناراض کرنا ہے کہ بنی آدم ایسا قول وفعل کرتے ہیں کہ جس سے اللہ تعالیٰ ناراض ہو جاتے ہیں۔

قولہٗ یَسُبُّ الدَّھْرَ : یعنی بنی آدم زمانہ کو گالیاں دیتے ہیں یَسُبُّ الدَّھْرَ سے مراد یہ ہے کہ اہل جاہلیت کہتے تھے یَا خَیْبَۃَ الدَّھْرِ فَعَلَ بِنَا کَذَا وَکَذَا جیسا کہ فی زمانہ بعض ایام کو منحوس خیال کیا جاتا ہے تو خدا تعالیٰ کے افعال کو دھر کی طرف منسوب کرکے دَھر کو گالیاں دیتے تھے۔

قولہٗ وَاَنَا الدَّھْرُ ھُوَ بِیَدِیْ الْاَمْرُ اُقَلِّبُ اللَّیْلَ وَالنَّھَارَ (ترجمہ) حالانکہ زمانہ (کچھ نہیں) وہ تو میں ہی ہوں سب تصرفات میرے قبضہ میں ہیں اور شب وروز کی گردش میرے ہی حکم سے ہوتی ہے

لفظ "اَنَا الدَّھْرُ" کی بحث

محدثینؒ حضرات نے بحث کی ہے کہ "اَنَا الدَّھْرُ" سے کیا مراد ہے اس کی مختلف توجیہات بیان کی گئی ہیں :۔

اوّل : امامِ راغب اصفہانیؒ فرماتے ہیں کہ اَنَا الدَّھْرُ سے مراد یہ ہے دھر کی

طرف جس خیر و شر کی نسبت کی جاتی ہے اس خیر و شر کا فاعل میں ہی ہوں پس جس کو تم فاعل اعتقاد کرتے ہو جب اس کو گالی دیتے ہو تو گویا مجھ کو گالی دیتے ہو۔

دوم : قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں کہ یہاں مضاف محذوف ہے ای اَنَا مُقَلِّبُ الدَّھْرِ یا اَنَا مُصَرِّفُ الدَّھْرِ اب معنیٰ یہ ہوگا کہ دہر میرے تصرف و اختیار سے جاری ہے اس کو کوئی اختیار نہیں تو زمانہ میں جو خیر و شر جاری و ساری ہے وہ دراصل میرے تصرف سے ہے لہٰذا جو شخص دہر کو گالی دے گا وہ دراصل مجھے گالی دے گا کیونکہ اصلاً نافع ضار میں ہی ہوں۔ ؎ درحقیقت فاعل ہر شئ خداست۔

سوم : عند البعض دہر اسماءِ حسنیٰ میں سے ایک ہے جس کی صحت قاموس سے بھی معلوم ہوتی ہے۔

یقول ابوالاسعاد : اسماءِ الٰہی توفیقی ہونے کی وجہ سے بلا دلیل یہ قول مسلّم نہیں یہی وجہ ہے کہ علامہ خطابیؒ نے اس کی تردید کی ہے لیکن با قطع نظر از اں جودت معنیٰ ندارد۔ (کما قالہ الشیخ الدھلویؒ فی اشعۃ اللمعات)

ردّ فرقہ دہریہ

فرقہ دہریہ کہتا ہے کہ تمام عالم کا خالق دھر ہے وہ اَنَا الدَّھْرُ کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں کہتے ہیں کہ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ میں ہی زمانہ ہوں یعنی میں جو خالق ہوں وہ اصل میں زمانہ ہی کا نام ہے۔

یقول ابوالاسعاد : یہ دعویٰ سراسر غلط اور بے بنیاد ہے کیونکہ اس کے بعد بِیَدِ الْاَمْرِ اُقَلِّبُ اللَّیْلَ وَالنَّھَارَ اس کے بطلان پر واضح دلیل ہے کیونکہ زمانہ نام ہے لیل و نہار کی گردش کا اور گردش دینے والی ربّ ذوالجلال کی ذات پاک ہے پھر کہو کہ یہ گردش لیل و نہار بھی خود خدا ہے۔

وَعَنْ اَبِیْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیِّ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا اَحَدٌ

ترجمہ : حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تکلیف دہ کلمات سن کر خدا تعالیٰ سے

اَصْبَرَ عَلٰی اَذًی الخ | زیادہ تحمُّل کرنے والا کوئی نہیں ہے۔

قولہٗ اَصْبَرَ : اَفْعَلَ کے وزن پر بمعنٰی زیادہ صبر کرنے والا۔

تعریفِ صبر : صبر کا معنٰی ہے " حَبْسُ النَّفسِ عَلٰی مَا تَکرَہُ " یعنی نفس کو ناگوار چیز پر روکنا اور بند کرنا۔

سوال یہ ہے کہ صبر کی اضافت ذات باری تعالیٰ کی طرف درست نہیں کیونکہ حق تعالیٰ اس بات سے منزہ ہیں مثلاً اِکراہ اور نفس وغیرہ سے۔

جواب یہاں صبر کا حقیقی معنٰی (حَبْسُ النَّفسِ عَلٰی مَا تَکرَہُ) مراد نہیں بلکہ صبر سے مراد تَاخِیْرُ العَذَابِ عَنْ مُستحِقِّ العَذَابِ ہے یعنی جو عذاب کا مستحق ہے اس کو فوری عذاب نہ دینا مراد ہے۔

قولہٗ عَلٰی اَذًی : یہ مصدر بمعنٰی اسم فاعل اور اس کا موصوف محذوف ہے ای علٰی کلام موذٍ :

قولہٗ ثُمَّ یعافیھم و یَرْزُقھم : یہاں عفو کا معنٰی معاف کرنا نہیں بلکہ مہلت دینا ہے لیکن ثُمَّ یُعَافِیْھِمْ فرما کر اس طرف اشارہ کردیا کہ اِنَّ الصَّبْرَ عَلٰی اِحْتِمَالِ الاَذٰی مَحْمُوْدٌ وَتَرْکُ الاِنتقَامِ مَمْدُوْحٌ۔

خُلَاصَۃُ الحَدِیْث

محدثینؒ نے لکھا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی مخلوق اپنی جانب سے ایذاء کا سامان خود تیار کرلیتی ہے تو وہ ذاتِ پاک اس کی اطلاع دے دیتی ہے کہ میں اس سے بے خبر نہیں ہوں مگر اس کے جواب میں عافیت و رزق عطا فرماتے رہتے ہیں اگر اس کے سوا دوسرے جواب کا ارادہ فرمالیں تو سب دنیا ویران ہوجائے۔ ہماری تنگ ظرفی اور اس کی فراخی حوصلگی ہماری بغاوت اور اس کا تحمل یہ نقشہ قیامت تک رہے گا : کما فی قولہٖ تعالٰی :-

وَلَوْ یُؤَاخِذُ اللّٰہُ النَّاسَ بِظُلْمِھِمْ مَا تَرَکَ عَلَیْھَا مِنْ دَابَّۃٍ
وَلٰکِنْ یُؤَخِّرُھُمْ اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی : (پ۱۴ النحل)

ترجمہ : روایت ہے حضرت معاذؓ فرماتے ہیں کہ (ایک سفر میں) گدھے پر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے بیٹھا تھا میرے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان پالان کی پچھلی لکڑی حائل تھی۔	وَعَنْ مُعَاذٍ قَالَ كُنْتُ رِدْفَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى حِمَارٍ لَيْسَ بَيْنِيْ وَبَيْنَهٗ اِلَّا مُؤْخِرَةُ الرَّحْلِ

قولہٗ رِدْفَ النَّبِيِّ : بکسر الراء وسکون الدال بمعنی یرکب خلف الراکب یعنی سوار کے پیچھے سوار ہونا اردو میں ربیل چڑھنا کہتے ہیں۔

قولہٗ علی حِمَارٍ : محدثین حضرات نے لکھا ہے کہ سواریوں میں سے فرس کے مقابلہ میں حمار معیوب سواری ہے اس لیے معنوی قباحت سے بچتے ہوئے حمار بمعنی گدھا نہیں بلکہ بمعنی دراز گوش سے کرنا چاہیئے۔

ثانیًا : عَلٰی حِمَارٍ : سے شدّت تواضع کی طرف بھی اشارہ کرنا ہے چونکہ دراز گوش گھٹیا قسم کی سواری ہے اس لیے سیدُ الاولین والآخرین جیسے عالی منقبت ذات پاک کا دراز گوش پر سوار ہونا انتہائی تواضع پر دال ہے۔

قولہٗ مُؤْخِرَةُ الرَّحْلِ : اس میں کئی لغات ہیں (۱) باب افعال سے اسم فاعل کے وزن پر (۲) باب تفعیل سے اسم فاعل کے وزن پر ہو (۳) باب تفعیل سے اسم مفعول (۴) اٰخرة الرحل پہلی اور آخری لغت افصح ہیں اس کا معنیٰ کجاوہ کی پچھلی لکڑی یعنی اَلْعُوْدُ الَّذِیْ یَکُوْنُ خَلْفَ الرَّاکِبِ :

سوال : حضرت معاذؓ کو یہ بتانے کی کیا ضرورت تھی کہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے تھا اور ہمارے درمیان بہت کم فاصلہ تھا۔

جواب اوّل حضرت معاذؓ یہاں اپنا تثبیت فی الرّوایت بتانا چاہتے ہیں یعنی یہ واقعہ خوب یاد ہے حتیٰ کہ اس کی معمولی چیزیں بھی نہیں بھولیں لہٰذا میں جس حدیث کو بیان کر رہا ہوں اس میں کسی قسم کی غفلت وتساہل نہیں ہوا اور یہ حدیث

نہایت اہم ہے تم سامعین غور و شوق سے سنو ۔

جوابِ دوم عارفینؒ کے انداز کے مطابق جواب یہ ہے کہ معشوق کی ہر ہیئت کو بیان کر کے تلذذ حاصل کیا جاتا ہے ۔ یہی حال حضرت معاذؓ کے ساتھ ہوا ہے کہ وہ لمحہ کتنا سعادت مند ہوگا کہ جب ایک محِب اپنے محبوب کے اس قدر قریب ہوا کہ سوال و جواب، پیار و نیاز کا سلسلہ چل نکلا ۔ حتّٰی کہ دل کی بات کہہ ڈالی ، عاشق آگے راز افشاء کرنے کا حکم چاہتا ہے مگر معشوق نے بدستور گوشہ گمنامی میں رہنے کی تلقین کرتا ہے ۔

فَقَالَ یَا مُعَاذُ هَلْ تَدْرِیْ مَا حَقُّ اللّٰهِ عَلٰی عِبَادِهٖ وَمَا حَقُّ الْعِبَادِ عَلَی اللّٰهِ :

(ترجمہ) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے معاذؓ جانتے ہو بندوں پر اللہ کا حق کیا ہے اور اللہ پر بندوں کا کیا حق ہے ۔

حدیث کے جملہ مذکورہ سے اِستدلال معتزلہ اور اُس کا ردّ

جمہور علماء اہل سنّت والجماعت کے نزدیک ذات باری تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں وہ مختار کل ہیں ۔ کما فی قولہ تم ۔ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ (پ)، وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓی اَمْرِهٖ (پ)، وَاللّٰهُ الْغَنِیُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ (پ)، لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَهُمْ یُسْئَلُوْنَ (پ)، اِنَّ اللّٰهَ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ (پ)، مُعتزلہ حضرات حق بمعنیٰ واجب اور لازم قرار دے کر اس جملہ سے استدلال کیا ہے کہ اَصْلَح لِلْعِبَاد یعنی مطیع کو جنّت میں اور عاصی کو نار میں داخل کرنا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے تو حدیث پاک کے اس جملہ کی مختلف توجیہات بیان کی گئی ہیں :

اوّل لفظ حق معانی مختلفہ میں مستعمل ہے حق بمعنیٰ ثابت ۔ واجب و لازم ۔ لائق

شایانِ شان ۔ ملک ۔ نصیب تو مقام کا لحاظ کر کے الگ الگ معنیٰ مراد لیئے جائیں گے یعنی بمقتضیٰ مقام معنیٰ کی تعیین کی جائے گی ۔ حق اللہ علی العباد میں حق بمعنیٰ واجب ولازم کے ہے اور حق العباد علی اللہ میں حق بمعنیٰ لائق اور شایان شان کے ہے لہذا حَقُّ الْعِبَادِ عَلَی اللّٰہِ اَنْ لَّا یُعَذِّبَ مَنْ لَّا یُشْرِكُ بِہٖ شَیْئًا کے معنیٰ یہ ہیں کہ شانِ خداوندی کے لائق یہی ہے کہ جن بندوں نے کسی کو اللہ کا شریک نہ ٹھہرایا اسے عذاب نہ دے ۔

دوم علامہ نووی فرماتے ہیں کہ چونکہ پہلا کلمہ" یعنی حق اللہ علی العباد" فرمایا اس بناء پر اس کو بھی مُشاکلۃً حقّ العِبَادِ عَلَی اللّٰہِ فرمادیا تاکہ عبارت درست اور وزن برقرار رہے گو معنیٰ ایک نہیں ۔

سوم اگرچہ ربّ ذُوالجلال پر کسی طرف سے کچھ واجب نہیں تاہم بطور احسان اپنے اوپر واجب کرلیا ہے جس کو وجوب تفضّلی یا احسانی سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔

قولہٗ اَنْ لَّا یُعَذِّبَ مَنْ لَّا یُشْرِكُ بِہٖ شَیْئًا : شانِ خداوندی کے لائق یہی ہے کہ جن بندوں نے کسی کو اللہ کا شریک نہ ٹھہرایا ہو اسے عذاب نہ دے ۔

سوال حدیث معاذؓ سے ثابت ہوتا ہے کہ جس نے شرک نہیں کیا اور صدق دل سے توحید و رسالت کا اقرار کیا تو اس پر عذاب نہ ہوگا اسی طرح اگلی حدیث میں ہے کہ " حَرَّمَہُ اللّٰہُ عَلَی النَّارِ " حالانکہ صحاح ستّہ کی متواتر نصوص سے ثابت ہے کہ عصاۃ مؤمنین کے ایک طائفہ کو عذاب دیا جائے گا پھر شفاعت یا رحمتِ خداوندی کے ذریعہ نکالا جائے گا تو دونوں قسم کی روایات میں تعارض معلوم ہوتا ہے ۔

جواب اوّل حضرت معاذؓ کی روایت کا مقصد یہ ہے کہ یہ حکم (حرمت نار والا) اس شخص کے متعلق ہے کہ جس نے بوقت ندامت و توبہ کلمہ توحید کہا اور قدرت علی العمل سے قبل ہی مرگیا اس کے لیے لَا یُعَذِّبُ وَحَرَّمَہُ اللّٰہُ عَلَی النَّارِ کا حکم ہے یعنی یہ حکم عمومی نہیں بلکہ خصوصی ہے ۔ کما ہو قول البخاریؒ

جواب دوم : یہاں عذابِ مُخلّد و مُؤبّد کی نفی مراد ہے نہ کہ عذاب مؤقت کی بھی۔

جواب سوم : فُسّاق وعصاۃ مؤمنین کو دوزخ میں داخل کرنا بغرض تطہیر ہوگا نہ کہ

بغرض تعذیب۔

قولہ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَفَلَا اُبَشِّرُ بِهِ النَّاسَ قَالَ لَا تُبَشِّرْهُمْ فَيَتَّكِلُوْا (ترجمہ) میں نے عرض کیا یارسول اللہ میں یہ خوشخبری لوگوں کو سنادوں۔ آپ نے فرمایا لوگوں کو یہ خوشخبری نہ سناؤ کیونکہ وہ اس پر بھروسہ کر بیٹھیں گے (اور عمل کرنا چھوڑ دیں گے)

قولہ فَيَتَّكِلُوْا۔ ای يَعْتَمِدُوْا اَوْ يَتْرُكُوْا الْاِجْتِهَادَ فِي حَقِّ اللّٰهِ تَعَالٰى یعنی ان کو نہ بتانا یہ دین کے اندر محنت کرنا چھوڑ دیں گے اور بس اسی کو دین بنالیں گے اور کہیں گے کہ جب فقط درستی عقیدہ سے ہی نجات مل جاتی ہے تو نماز وغیرہ اور عبادات کی کیا ضرورت ہے حالانکہ دین کے اندر تو سَابِقُوْا بِالْخَيْرَاتِ کا حکم ہے اور امر ہے وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ۔

اسمائے رجال

حضرت معاذؓ کے حالات

آپ کی کنیت ابوعبداللہ انصاری خزرجی ہے لیکن آپ معاذ بن جبل کے نام سے مشہور ہیں۔ مدینہ طیبہ کے باشندے ہیں، قدیم الاسلام ہیں۔ چنانچہ آپ بیعت عقبہ ثانیہ میں شامل تھے جب کہ آپ کی عمر ۱۸ سال تھی آپ تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو یمن کا قاضی و معلم بناکر بھیجا تھا پھر حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ میں حضرت ابو عبیدہؓ بن جراح کے بعد ملک شام کے عامل بنائے گئے ۱۸ھ میں طاعون عمواس کے زمانے میں بعمر ۴۸ سال وفات پائی آپ سے حضرت عمرؓ ابن عباسؓ اور بہت سی مخلوق نے روایت حدیث کی ہے۔

وَعَنْ اَنَسٍؓ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَمُعَاذٌ رَدِیْفُہٗ عَلَی الرَّحْلِ قَالَ یَا مُعَاذُ قَالَ لَبَّیْكَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَسَعْدَیْكَ

(ترجمہ) حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اونٹ پر سوار تھے، اور حضرت معاذؓ آپ کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے تو فرمایا اے معاذ! عرض کیا حاضر ہوں یا رسول اللہ! اور فرمانبرداری کے لیے تیار ہوں۔

قولہٗ رَدِیْفُہٗ : اس کی تشریح حدیث سابق میں گذر چکی ہے۔

قولہٗ لَبَّیْكَ : یہ لَبَّ بمعنی اَجَابَ سے تثنیہ مضاف ہے ای اَجِبْتُ لَكَ اِجَابَۃً بَعْدَ اِجَابَۃٍ :

قولہٗ وَسَعْدَیْكَ : تقدیر عبارت یوں ہے سَاعَدْتُ طَاعَتَكَ مُسَاعِدَۃً بَعْدَ مُسَاعِدَۃٍ : لَبَّیْكَ وَسَعْدَیْكَ کا اردو میں مختصر ترجمہ یہ ہے کہ میں خدمت اقدس میں حاضر ہوں۔

قولہٗ ثَلٰثًا : ای وقع ھٰذا النداء والجواب ثلاث مرات۔

سوال : ندائے نبویؐ اور جواب معاذؓ میں تکرار کیوں ہے؟

جواب : آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ کو بار بار اس لیے مخاطب فرمایا تاکہ ان کے دل ودماغ میں مضمون کی اہمیت وعظمت بیٹھ جائے اور وہ جان لیں کہ جو بات کہی جانے والی ہے وہ ایسی نہیں ہے کہ سرسری طور پر سن لی جائے بلکہ اس کی عظمت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو پوری توجہ سے سنا جائے۔

قولہٗ صِدْقًا مِنْ قَلْبِہٖ : یہ یا تو یَشْھَدُ کی ضمیر سے تمیز ہے یا مفعول مطلق محذوف کی صفت ہے ای شَھَادَۃً صَادِقَۃً مِنْ قَلْبِہٖ۔

حاصل حدیث

اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ جس نے صدق دل سے وحدانیت ورسالت کی گواہی دی تو اللہ تعالیٰ اسے آگ پر حرام کر دیں گے۔ اس مضمون کی کئی روایات اس باب میں آرہی ہیں مثلاً

(۱) حدیث ابوذرؓ میں ہے مَامِنْ عَبْدٍ قَالَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ثُمَّ مَاتَ عَلٰی ذَالِكَ اِلَّا دَخَلَ الْجَنَّةَ

(۲) حدیث عبادۃ بن الصامتؓ میں ہے: مَنْ شَهِدَ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ النَّارَ :

(۳) حدیث معاذؓ میں ہے مَفَاتِيْحُ الْجَنَّةِ شَهَادَةُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اس قسم کی تمام روایات سے بطور قدرِ مشترک یہ بات نکلتی ہے کہ نجات و دخول جنت کے لیے صرف اقرار الشہادتین کافی ہے۔

حدیث الباب سے مُرجیہ کا استدلال اور اس کے جوابات

ان احادیث ثلاثہ مذکورہ سے مرجیہ نے اپنے باطل مدعیٰ پر استدلال کیا ہے کیونکہ مُرجیہ کے نزدیک لَا تَضُرُّ الْمَعْصِيَةُ مَعَ الْاِيْمَانِ ایمان کے ہوتے ہوئے معصیت مُضر نہیں۔ حالانکہ احادیث سے ثابت ہے کہ بہت سے عُصاۃ مؤمنین بھی ایک مدت کے لیے دوزخ میں جائیں گے یہی مسلک اہل السّنۃ والجماعۃ کا ہے تو اس کے متعدد جوابات دیے گئے ہیں۔

جوابِ اوّل حضرت سعید بن المسیب وغیرہ کی رائے یہ ہے کہ یہ حدیث اس زمانہ میں تھی جب کہ فقط ایمان باللہ والرّسول فرض تھا، دوسرے احکام نازل نہیں ہوئے تھے۔ بعدہٗ نزولِ احکام سے یہ حکم حدیث منسوخ ہوگیا۔

جوابِ دوم جن حدیثوں میں آتا ہے کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ پڑھنے والا جنّت میں داخل ہوگا وہاں مطلق دخولِ جنّت کا وعدہ ہے، دخول اوّلی کا وعدہ نہیں، دخولِ اوّلی کا وعدہ اسی وقت ہے جب کہ اعمال بھی ٹھیک ہوں۔

جوابِ سوم جن حدیثوں میں آتا ہے کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ پڑھنے والے پر نار حرام ہے ان کا مطلب یہ ہے کہ اس پر خلود فی النار حرام ہے

یہ معنیٰ نہیں کہ دخول فی النار بھی حرام ہے ۔ دخول فی النار اس وقت حرام ہوگا جب کہ عمل بھی ٹھیک ہوں ۔

جوابِ چہارم یقولہ ابوالاسعاد : جب اللہ تعالیٰ کی شانِ رحمت وکرم پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر پڑی تو فرمایا بڑے مجرم بھی فقط ایمان سے جنت میں داخل ہوجائیں گے ، اور جب اللہ تعالیٰ کی شانِ انتقام پر نظر پڑی تو فرمادیا چھوٹی چھوٹی سی نافرمانی بھی جہنم میں لے جائے گی ۔ کما قال علیہ السلام: " لَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَتَّاتٌ وَلَا نَمَّامٌ ۔ سعدیؒ شیرازی نے کیا خوب فرمایا ہے

بتہدید اگر برکشد تیغ حکم | بمانند کروبیاں صم بکم
دگر در دہد یک صلائے کرم | عزازیل گوید نصیبے برم

(ترجمہ) دھمکانے کے لیے اگر انصاف کی تلوار کھینچے ۔ تو مقرب فرشتے بہرے گونگے ہوجائیں ۔
اگر بخشش کا ایک اعلان کر دے ۔ تو شیطان بول اٹھے کہ میں بھی حصہ حاصل کرلوں گا ۔

قولہ فَاَخْبَرَ بِهَا مُعَاذٌ عِنْدَ مَوْتِهِ تَأَثُّمًا : (ترجمہ) حضرت معاذؓ نے اپنی وفات کے وقت خود کو گناہ سے بچانے کی خاطر مخصوص حاضرین کے سامنے اس کا اظہار کردیا ۔

سوال حضرت معاذؓ کی روایت میں ہے " اَخْبَرَ بِهَا عِنْدَ مَوْتِهِ تَأَثُّمًا ۔ تأثم کا معنیٰ ہے تجنُّب عَنِ الْاِثْم یعنی گناہ سے بچنا ، کتمانِ علم کے گناہ سے بچنے کے لیے موت کے وقت یہ حدیث سنائی ہے اس پر سوال یہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بشارت کو آگے پہنچانے سے خود منع فرمایا تھا تو پھر کتمانِ علم کا گناہ کیونکر ہوتا ، بالفاظِ دیگر پہلی حدیث میں یہ خوشخبری لوگوں کو سنانے سے منع فرمایا ، اور اس حدیث میں ہے کہ کتمانِ علم کے گناہ سے بچتے ہوئے حدیث سنادی ۔

جوابِ اوّل یہ ہے کہ حضرت معاذؓ کا یہ گمان تھا کہ یہ ممانعت خاص حالات کی وجہ سے ہے کہ لوگ نومسلم ہیں اور ابھی دین میں رسوخ حاصل

نہیں ہوا تو اس وقت بتانے سے لوگ ظاہری معنیٰ کے اعتبار سے اعمال چھوڑ دیں گے جیسا کہ فَیَتَّکِلُوا سے معلوم ہوتا ہے پھر جب لوگوں کو عملی استقامت نصیب ہو گئی اور سُستی و اتکال کا اندیشہ دُور ہو گیا تو آپ نے یہ حدیث سنا دی۔

جواب دوم پہلے حضرت معاذؓ اس ممانعت کو مُطلق سمجھتے رہے ہیں اس لیے نہیں بتایا بعد میں سمجھ آئی کہ یہ مُمانعت عامۃ النّاس کے سامنے بیان کرنے میں ہے، خواص کے سامنے بیان کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اس لیے موت کے وقت خواص کے سامنے اس کو بیان کر دیا۔ اس خیال سے کہ اگر خواص کو بھی نہ بتاؤں گا تو کتمانِ علم کا گناہ ہوگا۔

جواب سوم علامہ شبیر احمد عثمانیؒ فتح المُلہم میں فرماتے ہیں کہ حضرت معاذؓ کا مقصد موت کے وقت کلمہ شہادت کی فضیلت حاصل کرنا ہے، کیونکہ اس حدیث کے آخر میں کلمہ شہادت ہی ہے۔ ایک حدیث میں ہے :-
مَنْ قَالَ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ دَخَلَ الْجَنَّۃَ یہ حدیث آخر وقت میں اس لیے سنائی کہ یہ فضیلت بھی حاصل ہو جائے اور آخری دَم تک تعلیم و تعلّم جاری رکھنے کی سعادت بھی نصیب ہو جائے۔ چنانچہ بہت سے صحابہ کرامؓ اور اکابرِ اُمت نے یہ حدیث آخری وقت میں سنانے کا اہتمام کیا ہے۔

مشہور مُحدّث ابوزُرعہ رازی رحمۃ اللہ کے مُتعلّق بھی منقول ہے کہ جب ان کے انتقال کا وقت قریب ہوا تو حاضرین نے کلمہ کی تلقین کے لیے حدیثِ معاذؓ کا تذکرہ شروع کیا تو حضرت ابوزرعہؒ نے پہلے اپنے سے لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک سند سنائی پھر حدیث کا متن شروع کیا ابھی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ تک پہنچے تھے، حدیث کا اگلا حصّہ باقی تھا کہ روح پرواز کر گئی گویا دَخَلَ الْجَنَّۃَ (جوابِ شرط) کا عملی مُظاہرہ ہو گیا۔
(فتح الملہم ص۹۸ ج۱)۔

وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّؓ قَالَ اَتَیْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَعَلَیْہِ ثَوْبٌ اَبْیَضُ وَھُوَ نَائِمٌ ثُمَّ اَتَیْتُہٗ وَقَدْ اِسْتَیْقَظَ :	(ترجمہ) حضرت ابی ذرؓ سے مروی ہے کہ میں نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اس حال میں کہ آپ ایک سفید کپڑا اوڑھے ہوئے سو رہے تھے پھر آپ کے پاس آیا اس حال میں کہ آپ بیدار ہو چکے تھے ۔

قولہٗ وَعَلَیْہِ ثَوْبٌ اَبْیَضُ : حضرتؐ پر سفید کپڑا تھا۔

سوال : یہ ہے کہ حضرت ابی ذرؓ نے روایت میں یہ قیودات کیوں ذکر فرمائیں ہیں مثلاً علیہ ثوبٌ اَبْیَضُ یا نَائِمٌ وَبَعْدَہٗ قَالَ اِسْتَیْقَظَ

جواب اوّل : حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ان قیودات کے ذکر کرنے سے مقصود قصّہ کے استحضار و اتقان کی طرف اشارہ کرنا ہوتا ہے تاکہ سامعین کو اطمینان کلی حاصل ہو جائے اور سامع ، مسموع پر پورا اعتماد کریں ۔

جواب دوّم : عند العارفین حالات محبوب کے ذکر استلذاذ بھی مقصود ہوتا ہے کیونکہ کثرت ذکر حالات محبوب بھی مثل محبوب کے متصوّر ہے ۔

قولہٗ قَالَ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ثُمَّ مَاتَ عَلٰی ذَالِکَ اِلَّا دَخَلَ الْجَنَّۃَ

(ترجمہ) جس نے صدقِ دل سے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہا پھر انتقال ہو گیا تو وہ جنت میں ضرور داخل ہوگا۔

سوال : یہ ہے کہ روایت حضرت ابی ذرؓ سے معلوم ہوتا ہے کہ دخولِ جنت کے لیے اقرار رسالت ضروری نہیں ۔ فقط اقرار توحید کافی ہے ۔ حالانکہ اقرار رسالت اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے ایک اصول ہے ۔ بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ الخ

جواب اوّل یہ ہے کہ یہاں ذکر جزء مراد کل ہے ظہور کی وجہ سے دوسرا حصّہ ذکر نہیں کیا کما یقال قَرَأْتُ قُلْ ھُوَ اللّٰہُ مقصود صرف لفظ قل ھو اللہ نہیں بلکہ پوری سورت ہوتی ہے ۔ اس جواب کا قرینہ آئندہ حدیث

حضرت عبادة بن الصامت ہے جس میں شہادتِ رسالت کا بھی ذکر ہے " وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ الخ

جوابِ دوم : یہ ہے کہ اقرار رسالت امر بدیہی ہے اور بعض دفعہ اختصار کے لیے امر بدیہی کو ذکر نہیں کیا جاتا اور یہ طریقہ کلامِ عرب میں شائع و ذائع ہے۔

سوال بظاہر اس حدیث سے معتزلہ و خوارج کی تردید ہوتی ہے جو کہتے ہیں کہ کبائر مُخرِج عَنِ الْاِیمان ہیں۔ اگر بقول شما مُخرِج عَنِ الْاِیمان ہیں تو پھر دخولِ جنت کیوں مکرر ہو رہا ہے جو عندی و عندھما متفق علیہ ہے۔ البتہ ظاہرًا مرجیہ کی تائید ہو رہی ہے جو لَا تَضُرُّ الْمَعْصِیَۃُ مَعَ الْاِیْمَانِ کے قائل ہیں تو قَدْ مَرَّ تَحْقِیْقُهٗ فِی روایۃ انسؓ مع قِصَّۃِ سَیِّدِنَا مُعاذؓ۔

قولہٗ ، وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ : ای اَدْخَلَ الْجَنَّۃَ وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ

سوال : یہ ہے کہ حضرت ابوذرؓ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ فرما دیا پھر بار بار تکرار کیوں کیا؟

جوابِ اوّل ۔ تکرار کی وجہ یہ حدیث حضرت ابوذرؓ کے پیشِ نظر تھی ۔ قَالَ عَلَیْهِ السَّلَامُ لَا یَزْنِی الزَّانِی حِیْنَ یَزْنِیْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ ؛

جوابِ دوم ۔ حضرت ابوذرؓ کا تکرار اس لیے تھا کہ شاید حضور صلی اللہ علیہ وسلم کوئی دوسرا مفید جواب عنایت فرما دیں۔

جوابِ سوم ۔ تکرار کی وجہ تعجب تھا کہ کوئی شخص محض اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کے رسول کی رسالت پر ایمان و اقرار کے بعد جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔ جبکہ کبائر کا مرتکب بھی کیوں نہ ہو۔ مگر نگاہِ نبوت خدا کی بیکراں رحمت پر تھی کہ بڑے سے بڑا سرکش انسان ندامت سے توبہ کر لے تو ابدی نجات مل سکتی ہے ۔

سوال ۔ یہ ہے کہ کبائر تو اور بھی بہت ہیں ۔ حضرت ابوذرؓ نے فقط زنا و سرقہ کو خاص کر کے کیوں ذکر فرمایا ؟

جواب گناہ اجمالاً دو قسم ہیں (۱) حق اللہ یہ زنا ہوا (۲) حق العباد اَیْ اَخَذَ مَالَهُمْ بِغَیْرِ حَقٍّ یہ سرقہ ہوا ۔ اس لیے ان دونوں کو ذکر

کر کے تمام قسم کے گناہوں کی طرف اشارہ کیا کقولہٖ تعالیٰ " وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا اس سے دوام مراد ہے اگرچہ دو کو ذکر کیا یعنی بُكْرَةً اور عَشِيٌّ ۔

سوال یہ ہے کہ اِنْ زَنٰى وَاِنْ سَرَقَ والی روایت اور لَا يَزْنِي الزَّانِي حِيْنَ يَزْنِي وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا يَسْرِقُ السَّارِقُ حِيْنَ يَسْرِقُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ الخ (مشکوٰۃ شریف ص۱۷ ج۱ باب الکبائر و علامات النفاق) کے مابین تعارض ہے پہلی روایت میں زانی زنا کے باوجود مؤمن ہے جب کہ دوسری روایت میں فعلِ زنا کی وجہ سے مؤمن نہیں ۔

جواب اوّل حدیثِ ابی ہریرہؓ میں وہ مُوحّدین مُراد ہیں جن کے پاس تبلیغ احکام آچکی ہو ۔ اور حدیثِ معاذؓ میں وہ مُوحِّدین مراد ہیں جن کے پاس تبلیغ احکام نہ پہنچی ہو ۔

جواب دوم وَاِنْ زَنٰى وَاِنْ سَرَقَ میں عدمِ تخلید فی النّار مُراد ہے ۔ اور لَا يَزْنِي الزَّانِيْ میں کمال ایمان کی نفی مراد ہے ۔

قولہ عَلٰى رَغْمِ اَنْفِ اَبِيْ ذَرٍّ : رَغْم مَاْخُوذ مِنَ الرَّغَامِ اَىِ التُّرَاب يُقَالُ اَرْغَمَ اللّٰهُ اَنْفَهٗ اَىْ اَلْصَقَهٗ بِالرَّغَامِ اَىِ التُّرَابِ : ناک خاک آلودہ ہو ۔ اب عَلٰى رَغْمِ اَنْفِ اَبِيْ ذَرٍّ کے دو معنیٰ ہیں (۱) کہ ان کے ارادہ ورائے کے مخالف ہونے کی بناء پر ان کی ذلت کے باوجود یہی حکم ہے ۔ (۲) یا ان کی کراہیّت وناگواری کے باوجود یہی حکم ہے چونکہ حضرت ابوذرؓ نے یہ الفاظ اپنے محبوب سے سنے تھے ۔ اس لیے حدیث روایت کرتے وقت استلذاذاً یا تفاخراً بیان کرتے تھے ۔

اسمائے رِجال

حضرت اَبی ذرؓ کے حالات آپ کا نام جندب بن جنادہ غفاری ہے جو بنو غفار قبیلہ کی طرف منسوب ہے آپ قدیم الاسلام ہیں پانچویں نمبر پر اسلام لائے، تارک الدنیا تھے کہ دوسرے دن کا سامان رکھنا جائز نہ سمجھتے تھے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

وَعَنْ عُبَادَةَؓ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ شَهِدَ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ وَاَنَّ عِيْسٰى عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ اِبْنُ اَمَتِهٖ وَكَلِمَتُهٗ اَلْقَاهَا اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ:

ترجمہ: عبادہؓ بن الصّامت سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص گواہی دیتا ہے کہ خدائے واحد کے بغیر کوئی معبود نہیں اور اس کا کوئی شریک نہیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے پیارے بندے اور رسول ہیں (اور اس بات کی شہادت دے) کہ حضرت عیسیٰؑ بھی خدا کا بندہ اور رسول اور خدا کی باندی (مریم) کے بیٹے اور اس کا حکم ہیں۔ جس کو اس نے مریمؑ کی طرف ڈالا تھا۔ اور خدا کی بھیجی ہوئی رُوح ہیں۔

اس حدیث میں شہادت کا ذکر ہے اس کی تشریح سابقہ روایتوں میں آچکی ہے۔

یقول ابوالاسعاد: مختصراً عرض ہے کہ مقصودِ اصلی یہ ہے کہ تمام ضروریاتِ دین پر اس کا اعتقاد ہو۔ اس بات کی حدیثوں میں مختلف تعبیریں ہیں کہیں صرف لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا ذکر ہے، کہیں عبدیّتِ عیسیٰؑ کے اعتقاد کا بھی ذکر ہے۔ وغیر ذالک من التعبیرات معبر عنہ ایک ہی ہے کہ تمام ضروریاتِ دین کا اعتقاد ہو۔ تعبیر کا یہ اختلاف احوالِ مخاطب کے اختلاف کی وجہ سے ہے ہر مخاطب کے حال کے مناسب تعبیر اختیار کی گئی۔ مخاطب کی حالت دیکھ کر بعض ضروریاتِ دین کا خصوصی طور پر ذکر کر دیا جاتا ہے۔ اس قبیل قال سے

چنانچہ اکثر اوقات اسی مسئلہ پر صحابہ کرامؓ سے بحث مباحثہ بھی ہوتا رہتا تھا۔ ۳۲ھ میں بزمانہ خلافت عثمانؓ مقام ربزہ میں وفات پائی۔ آپ سے صحابہؓ اور تابعینؒ کی ایک جماعت کثیرہ نے روایت کی ہے۔

یہ سوال بھی رفع ہو گیا کہ اکثر احادیث میں صرف شہادت توحید کا ذکر ہے۔ کیا ایمان بالرسالۃ وایمان بالقدر وغیر ذالک ضروری نہیں تو **حاصل جواب** یہ ہے کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ صرف ایک عنوان و باب ہے تمام ضروریاتِ دین کو مان لینے کا۔

سوال : اہل سنّت والجماعت کے نزدیک تمام انبیاء علیہم السّلام پر ایمان لانا فرض ہے۔ پھر اس کے باوجود صرف حضرت عیسٰی علیہ السلام کی تخصیص کیوں ہے؟

جواب : تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے بارے میں یہود ونصارٰی بہت افراط وتفریط کا شکار ہوئے جس کی تشریح آرہی ہے۔

قولہٗ اَنَّ عِیْسٰی عَبْدُ اللّٰہِ : اس سے نصارٰی کی تردید مقصود ہے کیونکہ نصارٰی نے ان کو اللہ یا ابن اللہ یا ثالث ثلاثہ قرار دیا جوان کے مرتبہ میں افراط ہے۔

قولہٗ رَسُوْلُہٗ : اس سے یہود کی تردید مقصود ہے۔ یہودیوں نے ان کو (العیاذ باللہ) ولدُ الزّنا قرار دے کر رسالت کا انکار کیا تو تردید ہو گئی کہ وَلَدُ الزِّنا کبھی رسول نہیں ہو سکتا۔

قولہٗ اِبْنُ اَمَتِہٖ یہ کلمہ فرما کر دونوں فِرَق ضالّہ مُضلّہ پر رد ہے۔

نصارٰی پر اس طرح کہ وہ اللہ تعالٰی کی باندی کے صاحبزادے ہیں وہ کیسے اللہ یا ابن اللہ ہو سکتے ہیں۔ اور یہود پر اس طرح کہ وہ (العیاذ باللہ) اگر ولدالزنا ہوتے تو یہ شریف لقب (امتہ) جواضافت تشریفی کے ساتھ اپنی طرف کیا یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔

لفظ کَلِمَتُہٗ کی تحقیق

لفظ کلمہ کی یہ تحقیق ادنی مناسبت سے کی جارہی ہے یہ کَلْم سے مأخوذ ہے۔ بمعنٰی توڑنا پھاڑنا چونکہ انسان کلمہ کے ذریعہ سکوت کو توڑتا ہے اس لیے زبان سے نکلے ہوئے الفاظ جن کو معنٰی مفرد پر دلالت کرنے کے لیے وضع کیا گیا اس کو کلمہ کہا جاتا ہے اور کبھی کلمہ کا اطلاق کلام پر بھی ہوتا ہے جس طرح لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کو کلمہ توحید کہا جاتا ہے باوجودیکہ وہ کلام ہے۔

یقول ابوالاسعاد : فی الحقیقت محاوراتِ عرب کی بناء پر اس کو کلمہ کہا جاتا ہے جس طرح کلمۃ الترحیب، کلمۃ التصنیۃ وغیرہ کہا جاتا ہے اور کلمہ کا اطلاق کبھی دلیل وحُجّت پر بھی ہوتا ہے کیونکہ وہ مخالف کے لیے جارح ہوتا ہے۔

حضرت عیسیٰؑ پر کَلِمَۃُ اللّٰہِ کا اِطلاق اور اُس کی وُجوہات

حضرت عیسیٰ علیہ السّلام پر لفظ کلمۃ اللہ کے اطلاق کرنے کی مختلف وجوہات ہیں

(۱) چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش حق تعالیٰ کے کلمہ کُنْ سے ہوئی۔ اس لیے ان کو کلمہ سے تعبیر کیا۔

(۲) یا حضرت عیسیٰ علیہ السّلام سے بحالت صغر سنّی بے وقت یہ کلمہ (اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ) صادر ہوا اس لیے ان کو کلمہ سے تعبیر کیا۔

(۳) ان کی کلام سے چونکہ لوگوں کو زیادہ فائدہ پہنچا اس لیے ان کو کلمہ کہا جیسا کہ کوئی شخص تلوار سے زیادہ فائدہ پہنچا سکتا ہے تو اس کو سیف اللہ کہا جاتا ہے یا جو شجاعت سے فائدہ پہنچائے اس کو اسد اللہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر لفظِ رُوح کا اِطلاق

حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر لفظ روح کے اطلاق کرنے کی وجوہات مختلفہ بیان کرنے سے قبل عرض ہے کہ رُوْحٌ مِّنْہُ کا مضاف محذوف ہے ای ذی روح کائن منہ یعنی آپ کی پھونک سے مُردہ آدمی زندہ ہوجاتا تھا جیسا کہ رُوح سے زندگی آجاتی ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ "وَاُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰہِ" (الآیۃ پ۳)

سوال ۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر لفظ روح کا اطلاق کیونکر ہوا ہے؟

جواب : اس کی مختلف وجوہات ہیں۔

اوّل : حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کو اس لیے روح کہا گیا کہ ان کے ذریعہ اموات میں روح آجاتی تھی۔ کیونکہ قُمْ بِاِذْنِ اللّٰہِ کہہ کر اموات کو زندہ کرتے تھے۔

دوّم : حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اس لیے روح کہا گیا کہ وہ آخری زمانہ تک آسمان میں ذی روح رہیں گے۔

سوم ۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام پر روح کا اطلاق اس لیے ہے کہ روح الامین کے نفخ سے پیدا ہوئے ہیں ۔

چہارم ۔ ان کے ذریعہ مُردہ قلوب میں روح آجاتی تھی یعنی مردہ قلوب کو ایمان وہدایت دے کر زندہ کرتے جیساکہ عدل کرتے کرتے زید عدل کہا جاتا ہے ۔

قولہٗ مِنْہُ : لفظ مِنْہ سے خدا کی مخلوق اور آپ کے مقرب ہونے کی طرف اشارہ ہے یعنی مِنْ تبعیضیہ نہیں جس سے جزئیت وبعضیت باری تعالیٰ کا شبہ ہو ۔ کما فی قولہ تعالیٰ " وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ " میں بالاجماع مِن تبعیضیہ نہیں کیونکہ اس وقت جمیع مخلوقات اللہ تعالیٰ کی جزء بن جائینگی ۔

فائدہ نصاریٰ کے بڑوں میں سے کسی بڑے نے کسی قاریٔ القرآن کو قولہٗ تعالیٰ وروحٌ مِّنہ پڑھتے ہوئے سُنا تو کہا یہی بعینہٖ نصاریٰ کا دین ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السّلام خدا کا جزء ولبعض ہے تو علی بن حسینؓ بن واقد نے جواب دیا کہ ایک آیت میں تو یوں بھی ہے " وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (پ۲۵) اگر لفظ مِنْہ کے لفظ سے حضرت عیسٰی علیہ السلام خدا کا جزء ہونا ثابت ہو تو جمیع مخلوق بھی جزء بن جائے گی ۔ تو وہ نصرانی مسلمان ہو گیا ۔

قولہٗ وَالْجَنَّةَ وَالنَّارَ حَقٌّ : لبعض کے نزدیک حَقٌّ صفت مشبہ ہے بمعنی ثَابِتٌ عند البعض کلمہ حق مبالغۃً جنّت اور نار پر محمول ہے ۔ اس سے فلاسفہ اور زنادقہ کی تردید ہوگئی جو جنّت اور دوزخ کے وجود کے منکر ہیں ۔

جنّت و دوزخ الآن موجود ہیں

مذہب مُعتزلہ ۔ معتزلہ حضرات کہتے ہیں کہ جنّت اور دوزخ قیامت کے دن بنائی جائیں گی ۔

دلیل اوّل عقلی : اگر جنت و دوزخ فی الحال بھی موجود ہوں تو پھل پھول سڑ کر گر پڑیں گے، حور و غلمان بوڑھے ہو جائیں گے، جہنم کی آگ ٹھنڈی پڑ جائے گی وغیرہ :

دلیل دوم نقلی : معتزلہ حضرات آیت تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا سے یہ سمجھتے ہیں کہ فی الحال یہ دونوں موجود نہیں بلکہ نَجْعَلُ ان کے مستقبل میں موجود ہونے کو ظاہر کر رہا ہے۔

مذہب اہل السُّنّة والجماعة : اہل السنۃ والجماعۃ فرماتے ہیں کہ جنت و دوزخ فی الحال موجود ہیں۔

دلیل اوّل : وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ اُعِدَّتْ لِلْکَافِرِیْنَ (پ البقرہ) وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ (پ۴ ال عمران)

دلیل دوم : اَلنَّارُ یُعْرَضُوْنَ عَلَیْهَا غُدُوًّا وَّعَشِیًّا (المؤمن پ۲۴)

دلیل سوم : وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلّٰی لَنَا یَوْمًا الصَّلٰوةَ ثُمَّ رَقَی الْمِنْبَرَ فَاَشَارَ بِیَدِهٖ قِبَلَ قِبْلَةِ الْمَسْجِدِ فَقَالَ قَدْ رَاَیْتُ الْاٰنَ مُنْذُ صَلَّیْتُ لَکُمُ الصَّلٰوةَ الْجَنَّةَ وَالنَّارَ مُمَثَّلَتَیْنِ الخ تو تمثیل وجود کے ساتھ متعلق ہوتی ہے۔

مُعتزلہ کی دلیل عقلی کا جواب : یہ ہے کہ خَالِقُ الْجَنَّةِ وَالنَّارِ کے لیے ان چیزوں کو اپنی حالت پر رکھنے کی قُدرت ضرور حاصل ہے۔

مُعتزلہ کی دلیل نقلی کا جواب : یقول ابوالاسعاد : جمہور عُلماء نے اس سے استدلال کو کمزور اور واہ کہا ہے۔ کیونکہ نَجْعَلُ میں جَعَلَ بمعنٰی خَلَقَ نہیں بلکہ بمعنٰی صَیَّرَ ہے۔ یعنی جنّت وجہنم کا مستقبل میں مخلوق ہونا بیان نہیں کیا جا رہا بلکہ اصالۃً مقصود یہ بیان کرنا ہے کہ اہل تقوٰی کو نامزد کر کے جنّت میں داخل کرنا ابھی نہیں بلکہ مستقبل میں ہوگا۔

قولهٗ عَلٰی مَا کَانَ مِنْ عَمَلٍ : علٰی ما حال بن رہا ہے ادخلہ کی ضمیر سے

من العمل یہ بیان ہے ما کا۔ من صلاحٍ وفسادٍ حسنٍ اوقبیحٍ قلیلٍ اوکثیرٍ صغیرٍ اوکبیرٍ : حدیث کا مطلب یہ ہے کہ کبائر کے بموجب اگرچہ عذاب کا مستحق ہوتا ہم اہلِ توحید جنت میں داخل ہوں گے۔ یہی مراد حدیث ابی ذرؓ میں بھی ہے جو وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ کہا گیا۔ لہٰذا معتزلہ پر صراحۃً رد ہوگیا اور یہ اہلِ سنت کا عین مسلک ہے۔ کمامرّ مفصلاً۔

سوال : بعض حدیث سے تو مؤمن موحد کے لیے معاصی کی بناء پر عذاب ثابت ہے۔ اس کے جوابات تفصیل سے گذر چکے۔ مگر خاص **جواب** یہ ہے کہ عَلٰی مَا کَانَ مِنْ عَمَلٍ کے معنیٰ یہ ہیں کہ درجات ومراتب کے اعتبار سے اہلِ جنّت کے جو اعمال ہیں اس کے موافق جنت میں داخل ہوں گے جس کے پاس جس درجہ کا عمل ہے وہ اس درجہ کی جنت میں داخل ہوگا۔ معاصی کی بناء پر عدم دخول مراد نہیں۔

وَعَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِؓ قَالَ اَتَیْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ اُبْسُطْ یَمِیْنَكَ فَلِاُبَایِعْكَ۔

ترجمہ : روایت ہے عمرو بن العاصؓ سے فرماتے ہیں کہ میں حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا عرض کیا کہ اپنا ہاتھ بڑھائیے تاکہ آپ کی بیعت کروں۔

یہ بیعتِ اسلام ہے صحابہ کرامؓ اسلام لاتے وقت حضورؐ سے بیعت بھی کیا کرتے تھے۔ معلوم ہوا کہ بیعت کے وقت شیخ کے ہاتھ میں ہاتھ دینا مسنون ہے۔ بیعت پر مفصلاً بحث قد مرّ آنفًا۔

قولہٗ فَقَبَضْتُ یَدِیْ : میں نے اپنا ہاتھ سمیٹ لیا۔ یہ بے ادبی نہیں بلکہ مقصود قبل از بیعت اپنے معاہدات پر توثیق وپختگی ہے۔

قولہٗ تَشْتَرِطُ مَاذَا : یہ استفہام ہے اصل میں عبارت تھی فَقَالَ مَاذَا اَیْ مَا الَّذِیْ تَشْتَرِطُ قِیْلَ کَاَنَّهٗ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَمْ یَسْتَحْسِنْ مِنْهُ الْاِشْتِرَاطَ فِی الْاِیْمَانِ۔

قولہٗ قَالَ اَمَا عَلِمْتَ یَا عَمْرُوؓ (ترجمہ) حضور علیہ السلام نے فرمایا اے عمروؓ

کیا تم نہیں جانتے۔

سوال ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اَمَا عَلِمْتَ کا کلمہ کیوں فرمایا؟

جواب حضرت عمرو بن العاصؓ کے قبولِ اسلام کے آگے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کو اَمَا عَلِمْتَ کے ساتھ خطاب کرنا یہ ان کی حذاقت وجودتِ طبع کی طرف اشارہ ہے یعنی آپ جیسے باکمال شخص کے لیے اسلام کے متعلق یہ بات مخفی نہیں رہنی چاہیئے۔ لہٰذا شرط لگانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

قولہٗ اِنَّ الْاِسْلَامَ یَھْدِمُ مَا کَانَ قَبْلَہٗ : محدثین حضرات میں اختلاف ہے کہ اسلام لانے سے سابقہ گناہوں میں سے کون سے گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔ اس میں مختلف اقوال ہیں۔

اوّل ۔ علامہ تورپشتی حنفیؒ فرماتے ہیں کہ اسلام سے حقوق اللہ وحقوق العباد، کبائر وصغائر سب معاف ہوجاتے ہیں۔ لیکن ہجرت اور حج سے دوسری احادیث کے پیش نظر حقوق العباد ساقط نہیں ہوتے۔ ہاں حقوق اللہ معاف ہوجاتے ہیں۔ یہی قول حافظ ابن حجرؒ کا بھی ہے۔

دوم ۔ علمائے محققین فرماتے ہیں کہ اسلام سے حقوق اللہ اور حقوق العباد غیر مالیہ مثلاً غیبت بہتان وغیرہ معاف ہوجاتے ہیں لیکن حقوق العباد المالیہ مثلاً دَین وغیرہ باقی رہ جاتے ہیں اور اگر کوئی ذمّی مسلمان ہو تو حقوق العباد مطلقاً معاف نہیں ہوتے۔ خواہ مالیہ ہوں یا غیر مالیہ اور ہجرت و حج سے صرف صغائر معاف ہوتے ہیں، کسی قسم کے حقوق العباد معاف نہیں ہوتے۔

سوال ۔ ابن ماجہ شریف ص۲۱۶ ج ۱ بابُ الدّعاء بعرفۃ، کتاب المناسک میں حدیث ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفہ کی شام کو اپنی امت کی مغفرت کے لیے جب دعاء کی تو مظالم کے علاوہ تمام گناہ معاف کردیے گئے، پھر مزدلفہ کی صبح جب دعاء کی تو مظالم بھی معاف ہونے کی وجہ سے ابلیس کا جزع فزع دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہنس پڑے۔ معلوم ہوا کہ حج سے جمیع معصیات ختم ہوجاتے ہیں۔

جواب اوّل ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس اُمّت کے مظالم حج سے معاف ہوئے جو حضورؐ کے ساتھ اس حج میں شریک تھے۔ کیونکہ ان میں کوئی بھی مُصِر علی المعاصی

نہیں تھا۔

جواب دوم۔ معافی ان مظالم کے متعلق تھی جن کا تدارک کسی شکل اور کسی صورت میں ناممکن و مشکل تھا۔ عمومی حکم نہیں ہے۔

جواب سوم۔ محدثین حضرات کے نزدیک حدیث ابن ماجہ کی سند ضعیف ہے۔ فَلَا اِشْکَالَ عَلَیْہِ۔

قَوْلُہٗ وَاَنَّ الْھِجْرَۃَ تَھْدِمُ مَا کَانَ قَبْلَھَا وَاَنَّ الْحَجَّ یَھْدِمُ مَا کَانَ قَبْلَہٗ۔ (ترجمہ) اور ہجرت پہلے کے تمام گناہوں کو ڈھا دیتی ہے۔ اور حج بھی ماقبل کے تمام گناہوں کو ختم کر دیتا ہے۔

خُلاصَۃُ الحَدِیث

اسلام کی دولت سے مستفیض ہونے کے بعد بھی چونکہ ایک مسلمان سے بتقاضائے بشریت گناہ سرزد ہو سکتے ہیں۔ اس لیے ان کے کفارہ کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حج اور ہجرت دو ایسے عمل بتا دیے کہ اگر یہ دونوں کام اپنی تمام شرائط کے ساتھ پورے کیے جائیں تو ان سے مظالم کی تلافی ہو سکتی ہے۔

ہجرت اور حج کا ماقبل سے ربط

ماقبل سے اس کی مناسبت یہ ہے کہ اسلام تو کجا اس کے بعض اعمال بھی ھادم اور مُسقطِ ذنوب ہیں پھر جمہور اہل سنت والجماعت کا مذہب یہ ہے کہ حج اور ہجرت سے صرف صغائر معاف ہوتے ہیں نہ کہ کبائر اور حقوق العباد بھی، بلکہ کبائر توبہ سے اور حقوق العباد توبہ اور ادائے حقوق یا عفوِ حقوق سے معاف ہوتے ہیں۔ عند البعض کبائر بھی معاف ہو جاتے ہیں تفصیلاً مسئلہ گذر چکا ہے۔

سوال اَلْاِسْلَامُ مَا کَانَ قَبْلَہٗ سے اسلام کا ہادم ہونا ثابت ہے پھر ایک روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بَعْدَ الْاِسْلَامِ اوّل و آخر

تمام گناہوں پر مؤاخذہ ہوگا۔ کما فی حدیثِ ابن مسعودؓ : ...... قَالَ قُلْنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَنُؤَاخَذُ بِمَا عَمِلْنَا فِی الْجَاھِلِیَّۃِ فَقَالَ عَلَیْہِ السَّلَامُ مَنْ اَحْسَنَ فِی الْاِسْلَامِ لَمْ یُؤَاخَذْ بِمَا عَمِلَ فِی الْجَاھِلِیَّۃِ وَمَنْ اَسَاءَ فِی الْاِسْلَامِ اُخِذَ ؛ الخ

جوابِ اوّل علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ احسان فی الاسلام سے اسلام میں ظاہراً و باطناً داخل ہونا مراد ہے اور اساءۃ فی الاسلام سے عدم الدخول فی الاسلام بقلبہ وکونہ منقاداً فی الظاہر غیر معتقد بقلبہ مراد ہے۔ اب اَلْاِسْلَامُ یَھْدِمُ سے وہ اسلام مراد ہے جو ظاہراً و باطناً کامل طور پر ہو۔ اور بعد الاسلام جو تمام گناہ پر مؤاخذہ کے متعلق ہے یہ وہ اسلام ہے جو اساءۃ کے ساتھ منافقانہ طور پر بغیر اعتقادِ قلبی کے ہو۔

جوابِ دوم علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ احسان فی الاسلام سے مراد یہ ہے کہ اعتقادِ قلبی کے ماتحت اس طرح مسلمان ہوا کہ اس کا اسلام معاصی سابقہ سے خالص توبہ پر بھی متضمن ہو۔ پھر بعد الاسلام اس گناہ کی طرف عود نہ کرے۔ یہی مطلب "الاسلام یھدم ما کان قبلہ" کا ہے۔ اور اساءۃ فی الاسلام سے مراد یہ ہے کہ اس کا اسلام معاصی سابقہ سے توبہ پر متضمن نہ ہو بلکہ وہ اس معاصی پر مُستمر رہ گیا ہے تو اس کا مؤاخذہ اوّل و آخر پر ہوگا تو فَحَدِیْثُ الْھَدْمِ مَحْمُوْلٌ عَلٰی مَا تَضَمَّنَ اِسْلَامُہُ التَّوْبَۃَ وَحَدِیْثُ ابْنِ مَسْعُوْدٌ مَحْمُوْلٌ عَلٰی مَا لَمْ یَکُنْ کَذَالِکَ : ھٰذَا کُلُّہٗ فِی فَیْضِ الْبَارِی ۔ اَللّٰھُمَّ یَسِّرْ لَنَا اُمُوْرَنَا کُلَّھَا۔

قولہٗ وَالْحَدِیْثَانِ مَرْوِیَّانِ : اس جملہ کا مقصد یہ ہے کہ یہ دو حدیثیں مصابیح والے بزرگ یہاں لائے ہیں۔ اور مشکوٰۃ والے آگے لائیں گے۔

بَابُ الرِّیَاءِ وَالْکِبْرِ : یا یہ لف نشر مرتب ہے۔ پہلی حدیث بابُ الریاء میں آئے گی، دوسری حدیث بابُ الکبر میں۔ کیونکہ یہ وہاں ہی کے مناسب ہیں۔ یہ فقیر اِنْ شَاءَ اللّٰہ ان حدیثوں کی شرح بھی وہیں عرض کرے گا۔

اسمائے رجال

حضرت عمرو بن العاص رضؓ کے حالات

عاص میں یاء کا حذف اصح ہے جو تحقیق کی بناء پر ہے۔ آپ ۵ھ یا ۸ھ میں مشرف باسلام ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو عمان کا والی بنایا۔ پھر حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں آپ اکثر لشکروں کے اعلیٰ افسر رہے۔ مصر آپ کی قیادت میں فتح ہوا۔ اس لیے آپ کو فاتح مصر کہتے ہیں۔ ۴۳ھ میں بعمر ۹۰ سال وفات پائی۔ آپ سے آپ کے صاحبزادہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے، نیز ابن عمرؓ اور قیسؒ بن ابی حازم وغیرہم نے روایت کی ہے۔

اَلفَصلُ الثَانِی

عَنْ مُعَاذٍؓ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَخْبِرْنِیْ بِعَمَلٍ یُدْخِلُنِی الْجَنَّۃَ وَیُبَاعِدُنِیْ مِنَ النَّارِ قَالَ لَقَدْ سَأَلْتَ عَنْ اَمْرٍ عَظِیْمٍ وَاِنَّہٗ لَیَسِیْرٌ عَلٰی مَنْ یَسَّرَہُ اللّٰہُ :

ترجمہ : حضرت معاذؓ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے کوئی ایسا عمل بتا دیجئے (کہ جس کے کرنے سے) میں جنّت میں داخل ہو جاؤں اور دوزخ کی آگ سے محفوظ رہوں ۔ آپؐ نے فرمایا سوال تو تم نے ایک بہت بڑی چیز کا کیا ہے لیکن جس پر خدا آسان کر دے ، اس کے لیے یہ بہت آسان بھی ہے ۔

قولہٗ بِعَمَلٍ : عند البعض عَمَلٍ کی تنوین تعظیم کی ہے یعنی عَمَلٍ عَظِیْمٍ علامہ تورپشتیؒ فرماتے ہیں کہ یہ تنوین نوع کی ہے ۔ معنیٰ کہ خبر دو مجھ کو خاص قسم کے عمل کی جو شرع کے اندر معتبر اور مقبول ہو۔

قولہٗ یُدْخِلُنِی الْجَنَّۃَ وَیُبَاعِدُنِیْ مِنَ النَّارِ : علامہ فضل اللہ تورپشتیؒ شارحِ مصابیح نے لکھا ہے کہ یہ دونوں مرفوع ہیں اور عَمَلٍ کی صفتیں بن رہی ہیں ۔ مگر عند البعض اس کو مجزوم پڑھا جائے کیونکہ امر کے جواب میں ہے ۔ غَیْرُ مُسْتَقِیْمٍ لَفْظًا وَمَعْنًا :

سوال ۔ حدیث پاک میں ہے کہ کوئی شخص اعمال کے ذریعہ جنّت میں نہیں جائیگا۔ بلکہ رحمتِ الٰہی سے جائے گا ۔ جب کہ صحابیؓ سوال کر رہے ہیں کہ ایسا عمل بتائیں کہ جس کے ذریعہ جنّت میں جاؤں ۔

جواب : دخول جنّت کے لیے دو چیزیں ہیں :

اوّل : سبب ظاہری وہ اعمال صالحہ ہیں۔ **دوّم** : مؤثر حقیقی یہ رحمتِ الٰہی ہے۔
حدیثِ باب میں سببِ ظاہری کی طرف اشارہ ہے نہ کہ مؤثر حقیقی کی طرف۔

یقول ابوالاسعاد : ادخال فی الجنۃ کی نسبت عمل کی طرف کرنا مجازًا ہے۔
کیونکہ دخولِ جنّت کی اصل علّت تو رحمتِ خداوندی ہے اور اعمال تو من قبیل الاسباب ہیں۔

قولہٗ اَمْرٍ عَظِیْمٍ : ای سَأَلْتَنِیْ عَنْ شَیْئٍ عَظِیْمٍ مُشْکِلٍ مُتَعَسِّرِ الْجَوَابِ :

سوال : نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے سائل کے جواب میں مسئولہ شئ کو امرِ عظیم سے کیوں تعبیر فرمایا ہے ؟۔

جواب اوّل : عند البعض عمل کے اعتبار سے عظیم ہے کہ دائمًا اس مُداومت واستقامت امرِ مشکل ہے۔ اسی لیے عمل میں اصالۃً استقامت شرط ہے نہ کہ احیانًا اداءً۔

جواب دوّم : یقول ابوالاسعاد : امرِ عظیم اس لیے فرمایا کہ سائل کا مقصد دخولِ جنّت کے متعلق پوچھنا تھا۔ جب کہ دخولِ جنّت کا معاملہ مغیباتِ الٰہیہ میں سے ہے وَلَا یَعْلَمُہٗ اِلَّا اللّٰہُ کسی کو معلوم نہیں کہ کون سے عمل کی بدولت جنّت نصیب ہو گی۔ لیکن جس کے لیے اللہ آسان کر دے اس کے لیے کوئی مشکل نہیں۔ تو جو چیز فی نفسہٖ مشکل ہے اللہ تعالیٰ کے آسان کر دینے سے آسان ہو جاتی ہے۔ لہٰذا امرِ عظیم اور وَاِنَّہٗ لَیَسِیْرٌ میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ یعنی امرٌ عظیمٌ فِی الْعَمَلِ وَلَیَسِیْرٌ لِمَنْ یَسَّرَہُ اللّٰہُ تعالیٰ

قولہٗ تَعْبُدُ اللّٰہَ : بعض حضرات کے نزدیک تَعْبُدُ۔ تُشْرِكُ۔ وَتُقِمُ یہ مضارع بمعنیٰ امر ہے۔ عند البعض تَعْبُدُ سے پہلے ھُوَ مقدر ہے جو تعبد مُبتدا کی خبر بن رہا ہے۔

سوال : تَعْبُدُ اللّٰہَ کیسے خبر بن رہا ہے کیونکہ یہ جملہ فعلیہ ہے۔

جواب : تَعْبُدُ اللّٰہَ سے پہلے اَنْ مقدر ہے۔ تو پھر **سوال** ہوگا کہ اَنْ کے مقدر ہونے کی چھ جگہیں ہیں ان میں یہ جگہ تو نہیں ہے۔ **جواب** : مشہور جگہیں تو چھ ہیں مگر غیر مشہور بھی بہت ہیں۔ یہ غیر مشہور جگہ ہے۔ عند البعض مضارع کو مضارعت والے

معنیٰ سے خالی کرکے بمعنیٰ مصدر کر دیتے ہیں تو معنیٰ ہوگا ھُوَ عِبَادَۃُ اللّٰہِ ؛

سوال : کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مضارع کیوں فرمایا امر فرما دیتے ؟

جواب : یہ اصطلاح ہے اظہار رغبت کی کہ ہم نے حکم دیا، انہوں نے کر بھی لیا اب ہم خبر بھی دے رہے ہیں۔

قولہ ثُمَّ قَالَ اَلَا اَدُلُّكَ عَلٰی اَبْوَابِ الْخَیْرِ : (ترجمہ) پھر ارشاد فرمایا اے معاذؓ! کیا تمہیں خیر و بھلائی کی راہ کے دروازے نہ بتا دوں۔

سوال : ان اُمورِ مذکورہ کو اَبْوَابُ الْخَیْرِ کیوں کہا گیا ؟

جواب : تشبیہ مشقّت کے اندر ہے۔ جیسے دارِ مُغلق کے اندر داخل ہونے کے لیے اس کا دروازہ کھولنا ہی مشکل ہوتا ہے۔ ایسے ہی امورِ ثلاثہ جو بمنزلہ الابواب الخیر کے ہیں ان کی عاملیت پر مشقت ہے۔ مثال کے طور پر رات کو اٹھنا آسان کام نہیں کما فی قولہ تعالیٰ " اِنَّ نَاشِئَةَ اللَّیْلِ هِیَ اَشَدُّ وَطْئًا وَّاَقْوَمُ قِیْلًا۔
ایسا ہی صدقہ کیونکہ اس میں اِخراجِ مال ہے جس کی محبّت انسان کے دل میں بھری ہوئی ہے۔ ایسے ہی صوم ہے جس کے اندر جمیع بدن کے لیے منہیات ہی منہیات ہیں جیسے جماع اکل شرب غیبت وغیرہ۔

یقول ابوالاسعاد : خیر کو ایک مکان کے ساتھ تشبیہ دے کر اس کے لیے ابواب کو ثابت کیا ہے تو یہ استعارہ مکنیہ اور تخلیہ ہے۔

سوال : کلام میں تکرار ہے کیونکہ ان کا ذکر پیچھے ہو چکا ہے۔ یعنی پہلے بھی ان عبادتوں کا ذکر تھا اور دوبارہ بھی ذکر کر دیا۔

جواب : پہلے فرائض کا ذکر تھا اب نوافل کی تلقین ہے۔ قرینہ اس پر صلوٰۃُ الرَّجُلِ فی جوف اللیل ہے۔

قولہٗ وَالصَّوْمُ جُنَّةٌ : روزہ ڈھال ہے۔ کیسے ڈھال ہے۔ اس میں مختلف وُجوہ ہیں۔

اوّل : بھوک میں شیطان کی آمد و رفت کی راہ مسدود ہو جاتی ہے۔ کما فی الحدیث :-
اِنَّ الشَّیْطَانَ یَجْرِیْ مِنَ الْاِنْسَانِ مَجْرَی الدَّمِ اَلَا فَضَیِّقُوْا مَجَارِیَهٗ

بِالْجُوْعِ : لہٰذا شیطان کے مجاری بھوک وصوم کے ذریعہ بند کیے جائیں تو شیطان داخل نہ ہوگا۔ اور نافرمانی کا سبب بھی نہ ہوگا۔

دوم : قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں کہ صوم کو ڈھال اس لیے قرار دیا کہ وہ خواہشاتِ نفس کا قلع قمع کر دیتا ہے۔ کما فی قولہ علیہ السلام : مَا مَلَأَ آدَمِیٌّ وِعَاءً شَرًّا مِنْ بَطْنِہٖ بخلاف بھوک و پیاس کے وہاں یہ نہیں ہے۔ لہٰذا صوم مانع شہوات ہو کر ڈھال بنے گا۔

قولہٗ وَالصَّدَقَۃُ تُطْفِئُ الْخَطِیْئَۃَ کَمَا یُطْفِئُ الْمَاءُ النَّارَ : (ترجمہ) اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا گناہ کو اس طرح مٹا دیتا ہے جیسے پانی آگ کو بجھا دیتا ہے۔

سوال : حدیث پاک میں خطیئہ کو نار کے ساتھ کیوں تشبیہ دی ہے ؟

جواب : یہ کہ خطیئہ کو نار کے ساتھ اس لیے تشبیہ دی ہے کہ جالب الی النار ہے پھر اس کے لیے معافی بجائے اطفاء کو ثابت کیا ہے یہ اصلاً استعارہ مکنیہ اور تخلیہ کی طرف اشارہ کیا ہے لیکن اطفاء مستعمل معافی کے معنیٰ میں ہے۔ نیز خطیئہ سے صغیرہ گناہ مراد ہیں۔

قولہٗ : ثُمَّ قَالَ اَلَا اُدُلُّکَ بِرَأْسِ الْاَمْرِ وَعَمُوْدِہٖ وَذُرْوَۃِ سَنَامِہٖ قُلْتُ بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ (ترجمہ) پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تمہیں اس چیز (دین) کا سر اور اس کا ستون اور اس کے کوہان کی بلندی نہ بتا دوں۔ میں نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ ضرور بتا دیجئے۔

قولہٗ بِرَأْسِ الْاَمْرِ : رَأْسٌ کہتے ہیں مَالَا وُجُوْدَ الشَّیْئِ بِدُوْنِہٖ : یعنی جس کے بغیر شئی کا وجود برقرار نہ رہے۔ محدثین حضراتؒ نے لکھا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رأس الامر کہہ کر اس طرف اشارہ کیا کہ اسلام بقیہ اعمال کی بہ نسبت بمنزلہ رأس کے ہے بہ نسبت بقیہ بدن کے کہ جیسا کہ بدن بدون رأس کے باقی نہیں رہتا۔ ایسے ہی بقیہ اعمال بدون اسلام بیکار ہیں۔ اور رأس الامر سے مراد دین کا سر یعنی اسلام ہے اور اسلام سے مراد شہادتین ہیں کیونکہ ان کے بغیر اعمال کا اعتبار و بقاء نہیں۔

قولہٗ وَعَمُوْدُہُ الصَّلٰوۃُ : عَمود بفتح العین بمعنیٰ ستون اور کھمبا۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح مکان کی مضبوطی ستون سے ہوتی ہے یا خیمہ کا قیام ستون کی مرہون منت ہے اسی طرح دین کی بنیاد و استواری بھی نماز میں ہے۔ کما یقال علیہ السلام : اَلصَّلٰوۃُ

عِمَادُ الدِّینِ۔ وَفِیْ مَقَامٍ آخر لَا خَیْرَ فِیْ دِیْنٍ لَیْسَ فِیْهِ رُکُوْعٌ ۔ (ابوداؤد شریف ج۲ ص۴۲ باب ماجاء فی خبر الطائف کتاب الخراج والفئ ۔

قولہٗ وَذِرْوَةَ سَنَامِهِ الْجِهَادُ : ذِرْوَةَ بکسر الذال مشہور ہے ویسے ضمہ اور فتحہ بھی درست ہے اس کے معنیٰ ہیں چیز کی بلندی اور بلند جگہ اور سَنام بفتح السین بمعنیٰ کوہان شتر مطلب یہ ہے کہ اے انسان جب تک تو کلمہ شہادت کا مُقِر نہ ہوگا تو دین میں سے تجھے کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔ جب کلمہ شہادت کا اقرار کرلیا تو اصل دین حاصل ہوا لیکن اس کے لیے ستون جو اس کی عمارت کے لیے مضبوطی کا ذریعہ ہیں۔

اُن پر عمل ضروری ہے۔ اس عمل کی بلندگی کے لیے جہاد ضروری ہے یعنی دین کی عمارت کی عظمت وشوکت ورفعت اور اس کی ترقی وکامیابی جہاد کے ذریعہ ہوسکتی ہے اور یہ جہاد عام ہے خواہ بالسیف ہو یا بالمال او بالقلم او باللّسان۔ کَمَا قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ جَاهِدُوا الْمُشْرِكِیْنَ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ وَاَلْسِنَتِكُمْ۔

قولہٗ ثُمَّ قَالَ اَلَا اُخْبِرُكَ بِمِلَاكِ ذَالِكَ كُلِّهٖ (ترجمہ) پھر آپ نے فرمایا کیا تمہیں ان تمام چیزوں کی جڑ نہ بتا دوں۔

قولہٗ مِلَاكِ : بکسر یا بفتح میم بمعنیٰ سہارا، ذریعہ، بقا اور استحکام۔

قولہٗ ذَالِكَ كُلِّهٖ : اس سے مذکورہ بالا عبادات کی طرف اشارہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مندرجہ بالا تمام امور وعبادات کی پختگی کا ذریعہ زبان کو لایعنی امور سے بچانا ہے کیونکہ کفر و شرک غیبت وبہتان سب وشتم کذب، شہادۃُ الزُّور وغیرہ اکثر گناہ زبان سے ہی صادر ہوتے ہیں۔ لہٰذا زبان کو لایعنی باتوں سے بچانا تمام عبادات کی جڑ ہے۔

قولہٗ فَاَخَذَ بِلِسَانِهٖ : زبان کو پکڑ کر سمجھانا اہتمام کے لیے تھا اور مراد یہ ہے کہ لایعنی بات نہ کہو کہ پہلے تولو بعد میں بولو، زبان کو لگام دو۔ رب نے چھونے کے لیے دو ہاتھ اور چلنے کے لیے دو پاؤں، دیکھنے کے لیے دو آنکھیں، سننے کے لیے دو کان دیے مگر بولنے کے لیے زبان صرف ایک دی کہ کلام کم کرو کام زیادہ۔

قولہٗ ثَكِلَتْكَ اُمُّكَ : اس کا معنیٰ ہے تیری ماں تجھے گم کردے۔ یعنی تو مرجا، مگر اہلِ عرب

اس کو اپنے اصلی معنیٰ پر استعمال نہیں کرتے تھے بلکہ اس لفظ کو تعجب وحیرت اور غضب کے وقت بولا کرتے تھے جیسے ہم بھی کہتے ہیں کہ اتنی آسان بات نہیں سمجھتے ہو تو زندگی سے موت بہتر ہے۔ خلاصہ یہ کہ ان لفظوں سے بد دعا مقصود نہیں بلکہ اس سے تنبیہ و تعجب مراد ہے۔

قولہٗ وَهَلْ يَكُبُّ النَّاسَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوهِهِمْ اَوْ عَلٰى مَنَاخِرِهِمْ اِلَّا حَصَائِدُ اَلْسِنَتِهِمْ : (ترجمہ) (یہ جان لو کہ) لوگوں کو ان کے منہ کے بل یا پیشانی کے بل دوزخ میں گرانے والی اسی زبان کی (بری) باتیں ہونگی۔

قولہٗ يَكُبُّ : ای سقط علٰی وجہہ : یعنی اوندھا یا منہ کے بل۔

قولہٗ مَنَاخِرِهِمْ : یہ مَنْخَرٌ کی جمع ہے جو میم کے فتحہ اور خاء کے کسرہ یا فتحہ سے ہے۔ بمعنیٰ ثقبۃ الانف (ناک کا سوراخ) مراد یہاں ناک و پیشانی ہے۔

قولہٗ حَصَائِدُ : حَصَائِدُ جمع ہے حَصِيدَةٌ کی بمعنیٰ کٹی ہوئی کھیتی لیکن مراد اس سے درانتی ہے اور اس میں تشبیہ ہے کہ زبان بمنزلہ درانتی کے ہے تو یہ استعارہ مکنیہ ہے اور کلام بمنزلہ کھیتی کے ہے تو یہ استعارہ تصریحیہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح درانتی رطب و یابس کا فرق نہیں کرتی۔ خشک گھاس ہو یا تر کاٹ دیتی ہے۔ یہی حال زبان کا ہے کہ اکثر زبان بھی صحیح و غلط کا امتیاز نہیں کرتی۔ لہٰذا لایعنی باتوں سے زبان کی حفاظت کرنا بہت ضروری ہے۔

وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَاَبْغَضَ لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْاِيْمَانَ۔

ترجمہ : حضرت ابو اُمامہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے کسی سے صرف اللہ کی رضامندی کے لیے دوستی کی اور اللہ ہی کے لیے نفرت کی اور اللہ ہی کے واسطے عطا کی اور اللہ ہی کے واسطے کوئی چیز روکی تو بلاشبہ اس نے ایمان کو مکمل کر لیا۔

خُلاصَةُ الحَدِيث

اس حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ جب دواعی قلب اور حرکات جوارح سب رضاءِ الٰہی کے تابع بن جائیں تو یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ اب ایمان اس کے ظاہر و باطن میں رچ چکا ہے۔ قلب و زبان

میں پوری یک رنگی اور پوری صداقت پیدا ہوچکی ہے اور اس میں نفاق کے کسی شعبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی صوفیاء کرام اس کو فناء و بقاء کے نام سے تعبیر کرتے ہیں اور یہی نسبت احسان کا خلاصہ ہے۔

(ف) محدثینؒ نے لکھا ہے کہ حدیث پاک میں چار فعل مذکور ہیں مگر ان کا مفعول مذکور نہیں تو علم معانی والوں کے اصول کے تحت حذف مفعولیت بقصد تعمیم ہوتی ہے کیونکہ حذف مفعولیت تعمیم کا فائدہ دیتی ہے تو ان کا مفعول تعمیم کے لیے مقدر نکالیں گے ای شَیْئًا او شَخْصًا۔

سوال : نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے استکمال ایمان کے لیے ان چار چیزوں کو کیوں خاص کیا جب کہ ایمان کے بِضْعٌ وَسِتُّوْنَ شُعْبَةً ہیں۔

جواب یہ کہ سارے دین میں ان چار پر اخلاص بہت مشکل ہے۔ تو حضرتؐ نے فرمایا کہ جو شخص ان چار کے اخلاص کو حاصل کرے گا تو وہ باقیوں میں بطریق اولیٰ کرے گا باقی اس روایت سے اَلْاِیْمَانُ یَزِیْدُ وَ یَنْقُصُ پر دلیل کرنا صحیح نہیں کیونکہ یَزِیْدُ وَیَنْقُصُ تصدیق کی جزء نہیں بلکہ خارجی چیز ہے۔

قَوْلُہٗ اِسْتَکْمَلَ : اس میں سین استفعال برائے مبالغہ ہے۔ اَلْاِیْمَانُ میں فاعلیت کی بناء پر رفع اور مفعولیت کی بناء پر نصب دونوں جائز ہیں۔

اسمائے رجال

حضرت اَبی اُمامہؓ کے حالات

آپ کا نام صُدَیّ بن عجلان باھلی ہے آپ اسی کنیت سے زیادہ مشہور ہیں پہلے مصر میں مقیم تھے پھر حمص چلے گئے اور وہیں ۸۶ھ میں بعمر ۹۱ سال وفات پائی۔ آپ کثیر الروایت صحابی ہیں۔ آپ کی اکثر احادیث اہلِ شام کے پاس تھیں۔ آپ سے خلقِ کثیر نے روایتِ حدیث کی ہے۔ بقول سفیانؒ بن عیینہ آپ کی وفات سلام میں تمام صحابہ کرامؓ کے بعد ہوئی لیکن صحیح قول یہ ہے کہ شام میں تمام صحابہ کرامؓ کے بعد حضرت عبداللہ بن بشیر کی وفات ہوئی ہے۔

وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَفْضَلُ الْاَعْمَالِ اَلْحُبُّ فِی اللّٰہِ وَالْبُغْضُ فِی اللّٰہِ :

ترجمہ : روایت ہے حضرت ابی ذرؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہترین عمل اللہ کے لیے محبت اور اللہ کے لیے عداوت ہے۔

فِیْ دونوں جگہوں پر اجلیہ اور تعلیلیہ ہے فِی اللّٰہ کا معنیٰ ہوگا لِوَجْہِ اللّٰہِ : نیز کلمہ فی تعلیل کے لیے بھی آتا ہے۔ کما فی قولہ تعالیٰ " فَذٰلِکُنَّ الَّذِیْ لُمْتُنَّنِیْ فِیْہِ رپ۱۲ وہ شخص جس کی وجہ سے تم مجھے ملامت کرتی تھیں۔حدیث پاک میں معنیٰ ہوگا کہ بغض رکھنا اللہ کی خاطر، محبت رکھنی اللہ کی خاطر۔

قولہ اَلْاَعْمَالُ : اَلْاَعْمَالُ کی الف لام عہد کی ہے اس سے مُراد مطلق اعمال نہیں بلکہ اعمال قلبیہ مراد ہیں۔

سوال ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف اعمال کے متعلق افضل ہونا ارشاد فرمایا ہے مثلاً ایمان باللہ، اطعام الطعام، نماز، الحب فی اللہ وغیر ذالک تو یہ تعارض ہوا۔

جواب اوّل ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات میں مخاطبین کے احوال کی رعایت فرمائی ہے۔کیونکہ آپؐ روحانی طبیب تھے۔ تو جیسا مریض دیکھتے ویسا ہی نسخہ تجویز فرمادیتے۔

جواب دوّم : افضل اعمال ایک نوع ہے جس کے بہت سے افراد ہیں تو حضورؐ نے فرمایا کہ یہ تمام اعمال اس نوع کے تحت داخل ہیں۔

جواب سوّم ۔ اعمال کی افضلیت کی حیثیات مختلف ہیں مثلاً ایمان باللہ اس حیثیت سے افضل ہے کہ وہ تمام اعمال کی بنیاد ہے۔ اور اطعام الطعام اس حیثیت سے کہ اس کو مؤمن وکافر نیک و بد سب ہی پسند کرتے ہیں اور نماز اس حیثیت سے کہ اس میں معبود برحق کے سامنے غایۃ درجہ کا انکسار اور تذلّل پایا جاتا ہے۔ اور الحبُّ فِی اللہ اس حیثیت سے کہ وہ اعمال باطنیہ میں سے ہے۔

وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ الخ وَالْمُؤْمِنُ مَنْ اٰمَنَهُ النَّاسُ عَلٰی دِمَائِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ

ترجمہ : حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پکا مؤمن وہ ہے جس سے لوگ اپنی جان و مال کے بارے میں بے خوف رہیں۔

قولہٗ اٰمَنَهُ النَّاسُ : یہاں اٰمن سے امین سمجھنا اور بے خوف رہنا مراد ہے یعنی مؤمن کی امانت، دیانت، عدالت، صداقت اور اخلاق و مُرّوت اس طرح ظاہر ہو کہ نہ کسی کو اپنے مال کے ہڑپ کر لیے جانے کا خوف ہو اور نہ کسی کو اپنی جان و آبرو پر دست درازی کا خدشہ ہو۔

یقول ابوالاسعاد : اس روایت کی دو جزئیں ہیں **اوّل** مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ اس کی مکمل بحث مشکوٰۃ شریف ص۱۲ ج۱ بروایت حضرت عبد اللہ بن عمرو میں ہو چکی، **دوم** من امنہ الناس علی دمائھم واموالھم کی بحث مشکوٰۃ شریف ص۱۲ ج۱ بروایت حضرت ابن عمرؓ عصموا من دمائھم واموالھم میں ہو چکی ہے۔

بِرِوَایَةِ فُضَالَةَؓ وَالْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهٗ فِیْ طَاعَةِ اللّٰهِ

ترجمہ : اور فضالہؓ کی روایت میں یہ اضافہ ہے اور حقیقی مجاہد وہ ہے جس نے خدا کی اطاعت میں اپنے نفس کو قابو میں کر لیا۔

جہاد دو قسم ہے (۱) اکبر نفس کے خلاف جہاد کرنا (۲) اصغر فی سبیل اللہ قتال کرنا۔ محدثینؒ نے لکھا ہے کہ مجاہد فقط وہ نہیں ہے جو کفار سے لڑتا رہے۔ بلکہ مجاہد وہ بھی ہے جو نفس سے جہاد کر کے اس کو طاعت پر برانگیختہ و مجبور کرے کیونکہ انسان کا نفس کفار سے بھی اشد عداوۃ ہے جیسا کہ حدیث پاک میں ہے " اِنَّ اَعْدٰی عَدُوِّكَ مَا فِیْ جَنْبَیْكَ "

یقول ابوالاسعاد : وجوہات مختلفہ کی بناء پر نفس کے خلاف کرنا جہاد اکبر ہے۔ **اوّلاً** نفس بمنزلہ امیر کے ہے اور کفار بمنزلہ لشکر کے ہیں تو لشکر کے مقابلہ میں امیر سے جہاد کرنا

اور نبرد آزما ہونا افضل اور اصل ہے۔ ثانیاً کفار ہم سے دور ہیں جب کہ نفس فی جنبک :
ثالثاً کفار سے کبھی کبھی مقابلہ ہوتا ہے جب کہ نفس کے ساتھ تو ہر وقت حالت جنگ ہے۔
رابعاً کفار ظاہر ہیں جب کہ نفس پوشیدہ ہے ؎ مار آستین ہے۔ خامساً کفار سے آلات ظاہریہ کے ذریعہ مقابلہ کیا جاتا ہے جب کہ نفس امارہ کے ساتھ ظاہراً مقابلہ ممکن نہیں۔ بنابریں نفس سے جہاد کرنے کو جہاد اکبر کہا گیا۔

قولہ اَلْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ الْخَطَايَا : مشکوٰۃ شریف ج۱ پر بحث ہو چکی ہے۔

وَعَنْ اَنَسٍؓ قَالَ قَلَّمَا خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَّا قَالَ لَا اِيْمَانَ لِمَنْ لَّا اَمَانَةَ لَهٗ وَلَا دِيْنَ لِمَنْ لَّا عَهْدَ لَهٗ

ترجمہ : حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا خطبہ کم دیا ہوگا کہ جس میں یہ نہ فرمایا ہو کہ اس شخص کے پاس ایمان نہیں جس کے پاس امانت نہیں اور اس کے اندر کچھ دین نہیں جس میں وفاء عہد نہیں۔

خُلَاصَةُ الْحَدِيْث

امانت و دیانت ایفائے عہد اعلیٰ اوصاف ہیں جن کا ہر مسلمان مؤمن مرد و عورت میں ہونا ضروری ہے۔ ان اوصاف کا اندازہ حدیثِ باب سے لگایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی خطبہ دیتے تو ان کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے۔

قولہ قَلَّمَا : قَلَّمَا میں مَا مصدریہ ہے ای قَلَّ خُطْبَةً خَطَبَنَا یا ما کافہ ہے بمعنیٰ ای مَا وَعَظَنَا دونوں صورتوں میں غایتِ قلت مقصد ہے جس کا حاصل عدم اور نفی ہے۔

امانت کے معنیٰ میں اختلاف

امانت سے کیا مراد ہے اس میں مختلف اقوال ہیں۔ اوّل : قَالَ ابن عباسؓ اَلاَمَانَةُ ای الطَّاعَةُ : دوم : قَالَ علیؓ بن ابی طلحۃؒ الامانۃ

الفرائض : سوم : وَقَالَ بَعْضُهُمُ الْاَمَانَةُ الْغُسْلُ مِنَ الْجَنَابَةِ۔
چہارم : امانت سے مراد عہد اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ہے ۔کما فی قولہ تعالیٰ وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِیْٓ اٰدَمَ (پ) پنجم ایمان و توحید مراد ہے مِنْہُ قَوْلُ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَّا اَمَانَۃَ لَہٗ ۔

محاکمہ حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ یہ تمام اقوال ایک دوسرے کے منافی و معارض نہیں بلکہ باعتبار غرض سب متفق ہیں کیونکہ تمام اقوال سے مقصد مکلف ہونا اور اوامر و نواہی کو اپنی اپنی شرائط کے ساتھ قبول کرنا ہے پھر اس کی ترتیب یوں ہے کہ ایک امانت جو مخلوق کے متعلق ہے جو حقوق العباد سے تعبیر ہے ۔ایک امانت مَعَ اللّٰہِ مِنَ الطَّاعَۃِ والتوحید، اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔ (پ ۲۲ الاحزاب)

بحث امین امین تین قسم ہیں اوّل امین فی المال دوم امین فی الاہل ۔سوم امین فی النفس ۔یہاں تینوں قسم مراد ہیں یعنی تعمیم ہے ۔کیونکہ حضرتؐ نے فرمایا " اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ " کہ انسان جس سے مشورہ کرے وہ بھی امین ہے ۔

قَوْلُہٗ لَا عَھْدَ لَہٗ : اس مقام پر اگر عہد سے مراد وہ عہد ہے جو مخلوق کے ساتھ ہے تو بمعنی نگہداشتن پیمانے کہ بایک دیگر بہ بندند۔ اگر عہد سے مراد حق تعالیٰ کا عہد ہے تو پھر یہ دو قسم ہے ۔ اوّل عہد سے مراد حق تعالیٰ کا عہدُ الاقرار بربوبیت ہے جس کو تمام ذریات آدم سے روز ازل میں لیا تھا کما فی قولہ تعالیٰ " وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ الخ دوم عہد الاتباع والہدایت جو بوقت اہباط آدم الی الدنیا تھا کہ فی قولہ تعالیٰ " قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًى

فرق بین الوعد والعہد علماءِ ربانیینؒ نے مختلف فرق بیان فرمائے ہیں **فرق اوّل** وعد ایک جانب سے ہوتا ہے کما فی قولہ تعالیٰ " وَوَاعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً " جب کہ عہد جانبین سے ہوتا ہے کما فی قولہ تعالیٰ " وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِیْٓ اٰدَمَ الخ جانب اوّل جانب دوم قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا الخ ۔

فرق دوم ۔ وعدہ کا ایفاء مستحب ہے برخلاف عہد کے کہ اسکا ایفاء واجب ہے (اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا)

سوال : حدیث مذکورہ کے اس جملہ (لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَّا اَمَانَۃَ لَہٗ) سے معتزلہ کا مذہب ثابت ہوتا ہے کہ اعمال صالحہ حقیقت ایمان میں داخل ہیں قَدْ مَرَّ تفصیلاً ۔

جوابِ اوّل ۔ حدیث مذکورہ سے زجر وعید اور تغلیظ مقصود ہے معنیٰ حقیقی مراد نہیں
جوابِ دوم ۔ لَا اِیْمَانَ میں لا نفی کمال کے لیے ہے جنس کے لیے نہیں جیسا کہ لَا صَلٰوۃَ لِجَارِ الْمَسْجِدِ اِلَّا فِی الْمَسْجِدِ میں ہے۔ یا لَا عَیْشَ اِلَّا عَیْشُ الْاٰخِرَۃِ میں ہے اور اس پر قرینہ حضرت ابوذرؓ کی یہ حدیث ہے " وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ " اور احادیث میں نفی کمال والا لَا اٹھائیس جگہ مذکور ہے ۔
جوابِ سوم ۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ خیانت اور نقضِ عہد یہ دونوں انجام کار کے طور پر کفر تک پہنچا دیتے ہیں ۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ
یہ تیسری فصل ہے ۔

عَنْ عُبَادَۃَؓ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَنْ شَھِدَ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حَرَّمَ اللّٰہُ عَلَیْہِ النَّارَ۔

ترجمہ : روایت ہے عبادہؓ ابن صامت سے فرماتے ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ جو گواہی دے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں اور یقیناً محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں ۔ اللہ تعالیٰ اس پر آگ حرام کرے گا ۔

(**ف**) شرح حدیث اور فرق باطلہ کے اعتراضات اور ان کے جوابات کافی تفصیل سے گزر چکے ہیں ۔ مگر مختصراً ایک سوال کا جواب دیا جا رہا ہے ۔
سوال ۔ اہل السنّت والجماعت کے مقابلہ میں مُرجِئہ اس حدیث سے استدلال پکڑتے ہیں کہ دخولِ جنّت کے لیے فقط اقرار باللسان کافی ہے عمل کی ضرورت نہیں ھٰکَذَا فِی الْحَدِیْثِ مَنْ شَھِدَ الخ حَرَّمَ اللّٰہُ عَلَیْہِ النَّارَ :
جوابِ اوّل ۔ اس سے وہ شخص مراد ہے جو ایمان لاتے ہی فوت ہو جائے ۔

جسے اعمال کا موقع ہی نہ ملے اس کے لیے اقرار شہادت کافی ہے۔

جواب دوّم ۔ تحریم نار دو قسم ہے (۱) تحریم نار مطلقاً (۲) تحریم نار مؤبّدًا ۔ یہاں پر تحریم مؤبدی مراد ہے اور یہ متفقہ مسئلہ ہے کہ مؤمن غیر عمل صالحہ نار میں جائے گا لیکن ہمیشہ کیلئے نہیں الّا ماشاء اللہ بعدہٗ نجات ملے گی ۔ بخلاف کام یہ مؤبدًا جہنم میں رہے گا ۔

وَعَنْ عُثْمَانَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ مَّاتَ وَهُوَ يَعْلَمُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ :

ترجمہ : حضرت عثمانؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے اس پختہ اعتماد پر وفات پائی کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں تو وہ جنتی ہے ۔

سوال ۔ یہ کہ حدیث مذکورہ میں صرف علم کا ذکر ہے شہادت کا ذکر نہیں ۔ حالانکہ دخول جنّت کیلئے شہادت ضروری ہے نہ کہ علم ۔ کیونکہ علم تو کفّار کو بھی حاصل ہے ۔ تو پھر کفار کے لیئے بھی جنّت لازم ہو ۔

جواب ۔ یہاں علم کا معنیٰ صرف دانستن نہیں ۔ صرف دانستن نہ تو شرع کا نقطہ نظر ہے اور نہ اس کی کوئی اہمیت ہے اور نہ اس پر دخول جنّت کی بشارت ہے بلکہ معرفت ولقین کے معنیٰ مراد ہیں جیساکہ اس باب کی دوسری حدیث سے ظاہر ہے ۔

خُلاصۃُ الحدیث تو اب اس حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ جو اس عقیدہ حازم اور یقین کامل کے ساتھ دنیا سے گذر جائے گا وہ ضرور جنّت میں داخل ہو کر رہے گا ۔ کیونکہ جنّت و دوزخ کی تعیم ایمان وکفر پر کی گئی ہے ۔ اچھے بُرے اعمال پر نہیں ۔ اس حدیث پر بھی وہی پہلی حدیث والا اعتراض ہوتا ہے اس کا جواب بھی وہی ہے کہ دخول سے مراد دخول اوّلی نہیں بلکہ مُطلق دُخول مراد ہے ۔ سزا بھگتنے کے بعد کبھی نہ کبھی جنّت میں جائے گا ۔

اسمائے رجال

حالات حضرت عثمانؓ

آپ کی کنیت ابوعبداللہ یا ابوعمرو ہے۔ واقعہ اصحاب فیل سے چھ سال بعد پیدا ہوئے۔ آپ شروع زمانہ ہی سے اسلام لے آئے تھے۔ ذوہجرتین ہیں۔ اولاً حبشہ کی طرف ثانیاً مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ آپ حکماً بدری ہیں۔ کیونکہ غزوہ بدر کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت رقیہ جو حضرت عثمانؓ کے عقد نکاح میں تھیں وہ بیمار تھیں تو حضور علیہ السلام نے حکماً آپ کو تیمارداری کے لیے چھوڑ دیا اور پھر آپ کو ثواب سے نیز مال غنیمت سے حصہ ملا، ذوالنورین آپ کا لقب ہے کیونکہ آپ کی دو صاحبزادیاں رقیہ وام کلثوم یکے بعد دیگرے آپ کے حق زوجیت میں آئیں۔ اور آنحضرتؐ نے دوسری صاحبزادی کی وفات کے بعد فرمایا کہ اگر میری تیسری لڑکی ہوتی تو میں وہ بھی عثمانؓ کے نکاح میں دے دیتا۔ آپ صائم الدہر قائم اللیل تھے، عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔ محرم ۲۴ھ میں خلیفہ بنے اور ۱۷ یا ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ میں بروز جمعۃ المبارک بعمر ۸۲ سال شہید ہوئے۔ اور ہفتہ کی رات کو جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔ حضرت جبیرؓ بن مطعم نے نماز جنازہ پڑھائی۔ آپ کی کل مدت خلافت ۱۲ دن کم ۱۲ سال ہے۔ آپ سے کل ۱۱۴۶ احادیث مروی ہیں۔

وَعَنْ جَابِرٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثِنْتَانِ مُوْجِبَتَانِ :

ترجمۃ ۔ حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دو چیزیں جنّت و دوزخ کو واجب کرنے والی ہیں۔

فائدہ فائدہ کا تعلّق مُستقر جنّتی اور مُستقر جہنّمی کے ساتھ ہے۔
یقول ابوالاسعاد : اگرچہ انسان ازلی نہیں مگر ابدی ضرور ہے۔ اس لیے اس کو ایک ابدی مستقر کی ضرورت ہے۔ دنیا اس کا ابدی مستقر نہیں صرف عارضی مستقر ہے۔ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ (پ۱) تمہیں خدا کی زمین پر صرف چند روز رہنا ہے اور ایک وقت مقرر تک اس کی نعمتوں سے فائدہ حاصل کرنا ہے۔ اس کا دائمی مستقر جنّت یا دوزخ ہیں۔ قادرِ مطلق نے اس کی تقسیم اچھے برے اعمال پر نہیں کی بلکہ ایمان و کفر پر کی ہے۔ اس لیے مؤمن کتنا ہی برا و گنہ گار کیوں نہ ہو۔ مگر اس کا ابدی مستقر جنت ہی رہے گا۔ اور کافر خواہ کتنے بھی اچھے کام کیوں نہ کرے لیکن اس کا ابدی مستقر دوزخ ہی رہے گا۔ جیسا کہ حدیث باب میں دو چیزیں موجبِ جنّت و موجبِ نار بن رہی ہیں۔

سوال ۔ یہ ہے کہ یہاں سوال تو دو صفات و خصلتوں کے متعلق ہے لیکن جواب دیتے ہیں دو شخصوں سے یہ کس طرح صحیح ہے یعنی بظاہر سوال وجواب میں مطابقت نہیں۔

جواب اوّل ۔ یہاں فعل یا صفت محذوف ہے یعنی فَعَلَ مَنْ مَّاتَ یہ فعل کرتا ہے اور مر جاتا ہے۔

جواب دوم ۔ بسا اوقات مشتق ذکر کر کے مبدأ اشتقاق مراد لیا جاتا ہے۔ یعنی اَیُّ مَوتِ مَنْ يُّشْرِكُ بِاللّٰهِ : فَلَا اِشْكَالَ عَلَيْهِ۔

اسمائے رجال

حضرت جابرؓ کے حالات

آپ کی کنیت ابو عبداللہ انصاریؓ ہے۔ والد کا نام بھی عبداللہ ہے۔ مدینہ طیّبہ کے باشندے ہیں۔ مشاہیر صحابۂ

وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ ۴۷ قَالَ کُنَّا قُعُوْدًا حَوْلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَمَعَنَا اَبُوْبَکْرٍ وَّعُمَرُ فِیْ نَفَرٍ :

ترجمہ : حضرت ابوہریرۃؓ سے مروی ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اردگرد بیٹھے ہوئے تھے، ہمارے ساتھ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ ایک جماعت کے ساتھ تھے۔

قولہٗ نَفَرٍ : ای مع جماعۃ ۔

قولہٗ بَیْنَ اظهُرِنَا ۔ اظھرنا یہ مشتق ہے ظہر سے بمعنی پشت ۔ شُراح حضرات فرماتے ہیں کہ اظھرنا کا کلمہ زائد ہے مقصود تحسین کلام ہے اصل میں من بَیْنِنَا تھا۔

یقول ابوالاسعاد : حق بات یہ ہے کہ مِنْ بَیْنِ اظهُرِنَا اور مِنْ بَیْنِنَا میں فرق ہے ، مِنْ بَیْنِ اَظْهُرِنَا کا اطلاق اس جگہ پر ہوتا ہے جہاں جماعت حلقہ بناکر بیٹھی ہو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم درمیان میں بیٹھے ہوں جب کہ مِنْ بَیْنِنَا کا اطلاق اس جگہ پر ہوتا ہے کہ جماعت صف باندھ کر بیٹھی ہو۔

قولہٗ فَاَبْطَأَ عَلَیْنَا ۔ ای مکثا طویلا وتاخیرا کثیرا یعنی لمبی دیر۔

قولہٗ وَخَشِیْنَا وَفَزِعْنَا ۔ عندالبعض دونوں ایک لفظ ہیں جو ہم معنیٰ ہیں ۔ نیز ایک دوسرے کی تاکید ہیں ۔ مگر صحیح قول یہ ہے کہ دونوں جدا ہیں اس لیے کہ خشیت کا تعلق قلب کے ساتھ ہے جب کہ فزع کا تعلق ظاہر سے ہے ۔ مقصد یہ ہے کہ ہم خدمتِ اقدس میں حاضر نہ ہوں اور حضورؐ کہیں اکیلے ہوں اور کوئی دشمن آپ کو ایذاء پہنچائے ۔ کیونکہ عرب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت دشمن ہیں ۔ یہ گھبراہٹ اسباب کے لحاظ سے ہے ورنہ اللہ ہمیشہ حضورؐ کے ساتھ تھا۔

قولہٗ حَائِطًا : اصل میں حائط دیوار کو کہتے ہیں اور یہاں وہ باغ مراد ہے

اور کثیر الروایۃ صحابہؓ میں سے ہیں ۔ غزوہ بدر وغیرہ اٹھارہ غزوات میں شریک ہوئے ۔ اخیر عمر میں نابینا ہو گئے۔ ۷۴ھ میں بزمانہ عبدالملک بن مروان بعمر ۹۴ سال وفات پائی ۔ آپ سے خلق کثیر نے روایت حدیث کی ہے۔

جس کے گرد دیوار ہو۔ اور بستان ہر باغ کو کہ سکتے ہیں دیوار ہو یا نہ ہو۔

قولہ لِلانصارِ : انصار بڑا قبیلہ ہے، بنی النجار اس کی شاخ ہے۔ عند البعض بنی النّجار ذکر کرنا یا تو تخصیص بعد از تعمیم ہے یا بنی النّجار بدل ہے انصار سے۔

قولہ فَدُرْتُ بِہٖ ھَلْ اَجِدُ لَہٗ بَابًا فَلَمْ اَجِدْ : (ترجمہ) میں نے اس باغ کے چاروں طرف دروازہ تلاش کیا مگر دروازہ نظر نہیں آیا۔

سوال۔ یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کو بسیار تلاش کے بعد جب دروازہ نہ ملا تو پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کیسے داخل ہوئے ؟

جواب اوّل۔ یہ ہے کہ دروازہ تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے داخل ہونے کے بعد مالکِ باغ نے بند کر دیا تھا کہ حضرت کی ذات پاک دشمنوں سے مأمون ہو جائیں۔

جواب دوّم۔ دروازہ تھا مگر حضرت ابو ہریرہؓ کو کثرتِ حیرت و پریشانی کی بناء پر نظر نہیں آیا، اور ایسا بہت ہوتا ہے کہ پریشانی کے وقت سامنے کی چیز نظر نہیں آتی۔ لہذا فَلَمْ اَجِدْ کا حقیقی معنیٰ مراد نہیں۔ کیونکہ کوئی باغ بغیر دروازہ کے نہیں ہوتا۔

قولہ فَاِذَا رَبِیْعٌ یَدْخُلُ فِی جَوْفِ حَائِطٍ مِنْ بِئْرٍ خَارِجَةٍ : (ترجمہ) اچانک ایک نالی پر نظر پڑی جو باہر کے کنوئیں سے باغ کے اندر جا رہی تھی۔

قولہ رَبِیْعٌ ۔ اس کی تفسیر آیا ہی چاہتی ہے۔

قولہ بِئْرٍ خَارِجَةٍ : لفظ خارجة میں تین اعراب ہونے کا احتمال ہے۔

(۱) بالکسر و تنوین۔ اس وقت یہ بئر کی صفت ہوگی (۲) بالفتح غیر منصرف مضاف الیہ اور خارجہ مالک بیر کا نام ہے۔ (۳) خارجہ بالضمیر المجرور اور صفت ہے موصوف محذوف کی " اَیْ مِنْ بِئْرٍ فِیْ مَوْضَعٍ خَارِجِہٖ ۔

قولہ وَالرَّبِیْعُ الْجَدْوَلُ : یہ ربیع کی تفسیر ہے اور ربیع سے مراد چھوٹی نہر (در ہندی واٹری) ہے۔

قولہ فَاحْتَفَزْتُ اَیْ تَضَامَمْتُ یعنی میں ابو ہریرہ سمٹ، سکڑ کر اس نالی میں داخل ہو گیا۔

قولہٗ فَقَالَ اَبُوْھُرَیْرَۃَؓ فَقُلْتُ نَعَمْ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ (ترجمہ) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اس حالت میں مجھے اندر دیکھ کر حیرت سے) فرمایا ابو ہریرہؓ ہو! میں نے کہا ہاں یارسول اللہ
فقال ابو ہریرہؓ والا استفہام یا تقریر کے لیے ہے یا تعجب کے لیے کہ دروازہ بند ہونے کے باوجود تو کیسے یہاں آگیا؟ ۔ لیکن مُلّا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ یہ حقیقت پر محمول ہے کہ نبی علیہ السلام اس بشارت کے وقت بشریت سے خارج ہوکر مستغرق فی کرم اللہ تھے ۔ لہٰذا حضرت ابو ہریرہؓ کو پہچاننے میں دیر ہوئی۔

سوال ۔ حضرت ابو ہریرہؓ کو کیسے معلوم ہوا کہ سرکار دو عالم ؐ کی ذات بابرکات باغ میں تشریف رکھتے ہیں۔

جوابِ اوّل : یہ کہ اندازہ سے پتا لگا یا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس باغ میں ہیں۔

جوابِ دوم : شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ اصلاً معاملہ برعکس ہے کہ نسیم جمال نے بوئے محبوبؐ عاشق کے دماغ میں پہنچائی جیسے بوئے یوسفؑ مصر سے کنعان پہنچ گئی ۔ مگر عشاق کے حال مختلف ہوتے ہیں کبھی قبض، کبھی بسط۔

قولہٗ مَاشَانُکَ : ای مَا سَبَبُ مَاتَاکَ وَاِضْطِرَابُکَ یعنی پریشان کیوں ہو ہانپ کیوں رہے ہو۔

قولہٗ فَابْطَاْتَ عَلَیْنَا : ای تَاَخَّرْتَ عَلَیْنَا یعنی واپس آنے میں آپ نے تاخیر فرمادی۔

قولہٗ تُقْتَطَعَ : اَیْ یَقْطَعُکَ اَعْدَاؤُکَ اَحْبَابَکَ (نعوذ باللہ) خدا نہ کرے کہ آپ کے دشمن آپؐ کو ہم سے جدا کردیں یا ہلاک کردیں۔

قولہٗ دُوْنَنَا : اَیْ مِنْ غَیْرِ اِطِّلَاعِنَا :

قولہٗ کَمَا یَحْتَفِرُ الثَّعْلَبُ : ای فِی تَحْصِیْلِ الْمَطْلَبِ یہاں سے وجہ تشبیہ ہے کہ جیسے لومڑی مکار جانور اپنے مقصد کے حصول کے لیے کوشش کرتی ہے اور اپنے سوراخ میں داخل ہونے کے لیے اپنے وجود کو سکیڑ لیتی ہے ۔ میرا حال بھی تقریباً یہی ہے۔

قولہٗ وَھٰؤُلَاءِ النَّاسُ وَرَائِیْ : ھٰذَا مُقْتَبَسٌ مِنْ قَوْلِہٖ تَعَالٰی حِکَایَۃً عَنْ مُوْسٰی ھُمْ اُولَآءِ عَلٰٓی اَثَرِیْ وَعَجِلْتُ اِلَیْکَ رَبِّ لِتَرْضٰی (پ۱۶ طٰہٰ)

ع نہ تنہا من دریں میخانہ ہستم ـــ ع ایک میں ہی نہیں عالم ہے طلب گار تیرا

قولہٗ فَقَالَ اِذْهَبْ بِنَعْلَيَّ هَاتَيْنِ (ترجمہ) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دونوں نعلین مبارک مجھے عنایت فرمائیں۔

سوال ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوہریرہؓ کو نعلین منورین ومبارک کیوں عطاء فرمائیں؟

جواب اوّل : حضرت ابوہریرہؓ کو نعلین مبارک اس لیے عطاء کیں تاکہ صحابہ کرامؓ کو یہ یقین ہو جائے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہو کر ہی آرہے ہیں اس سے پریشانی دور ہو جانی چاہیے۔

جواب دوم : یہ کہ جو بشارت دی وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہے میں اپنی طرف سے نہیں کہ رہا درجۂ یقین کا اظہار ہے۔

اِعطاءِ نعلین مُنوّرین کی وُجوہِ تخصیص

محدثینؒ حضرات نے بحث کی ہے کہ بطور علامت کوئی اور چیز بھی دے سکتے تھے پاپوش مبارک کی تخصیص کیوں ہے اس کے مختلف وجوہ ہیں۔ اوّل : شاید اس کے علاوہ کوئی اور نشانی آپ کے پاس نہ تھی اس لیے پاپوش مبارک عنایت فرمائیں۔ دوم : پاپوش قدمین کے لیے لازم ہیں۔ چنانچہ عرب میں پاپوش اور قدمین اتباع اور نقشِ قدم پر چلنے سے کنایہ لیتے ہیں۔ چنانچہ اعطاءِ نعلین میں اشارہ ہے کہ دخول جنت کے لیے میرے نقشِ قدم پر چلنا ہی اصل راہِ نجات ہے۔ سوم : اعطاءِ نعلین سے اشارہ تھا استقامت فی الدین کی طرف ۔ یہی وجہ ہے کہ حدیثِ پاک میں حافی نعلین یعنی ننگے پاؤں چلنے والے کو ماشی (یعنی پیدل) سے اور لابسِ نعلین (جوتی پہننے والے) کو راکب سے تشبیہ دی ہے ۔ کما فی قولہ علیہ السلام

وَعَنْ جَابِرٍؓ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ غَزْوَةٍ غَزَاهَا يَقُوْلُ اسْتَكْثِرُوْا مِنَ النِّعَالِ فَاِنَّ الرَّجُلَ لَا يَزَالُ رَاكِبًا مَا انْتَعَلَ (مشکوٰۃ شریف ص ۳۷۹ ج ۲ بَابُ النِّعَالِ)

قولہٗ فَبَشِّرْہُ بِالْجَنَّۃِ : آپ کا یہ خوش خبری دے کر حضرت ابوہریرہؓ کو روانہ فرمانا اس بناء پر تھا کہ صحابہ کرامؓ کے غم کا تدارک ہو جائے جو نہایت رحمت وعنایت اور شفقت پر مبنی ہے۔

سوال : پختہ اعتقاد اور استیقان بِالشَّہادَتَین قلبی امر ہے جس کا جاننا طاقت بشری سے خارج ہے پھر ان کو کیسے حکم فرمایا کہ پہچان کر بشارت دو۔

جواب : بشارت میں بھی استیقان قلب کی قید ملحوظ ہے کہ اس شرط پر بشارت دو کہ اس کے استیقان پر تم کو یقین ہو ورنہ نہیں۔

قولہٗ فَضَرَبَ عُمَرُ بَیْنَ ثَدْیَیَّ فَخَرَرْتُ لِاِسْتِیْ (ترجمہ) حضرت عمرؓ نے میرے سینے پر اتنے زور سے ہاتھ مارا کہ میں سُرین کے بَل گر پڑا۔

قولہٗ ثَدْیَیَّ : لغت میں ثَدْیَیَّ کا اطلاق عورت کے پستانوں پر ہوتا ہے لیکن مراد تمامی صدر ہے چونکہ پستان صدر پر ہوتے ہیں اس لیے ان کو ذکر کیا۔

قولہٗ فَخَرَرْتُ : ای سَقَطْتُ ؛

قولہٗ لِاِسْتِیْ : بمعنی چوتڑ کے بَل یعنی مقعد ای سَقَطْتُ عَلٰی مَقْعَدِیْ شدّتِ ضرب کی وجہ سے چوتڑ کے بل جا گرا۔ جو ضد ہے منہ کے بل گرنے کی۔

سوال ۔ حضرت عمرؓ کا یہ رُویّہ کیا شانِ صحابیّت کے منافی نہ تھا۔ حالانکہ بدلیل اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِہٖ وَیَدِہٖ یہ حرام تھا۔

جوابِ اوّل | حضرت عمرؓ نے حضرت ابوہُریرہؓ کو واپس کرنے کے لیے ہاتھ مارا تھا۔ لیکن وہ اتفاقاً گر گئے یعنی گرانا مقصود نہ تھا۔ کیونکہ حضرت عمرؓ نہایت قوی اور حضرت ابوہریرہؓ نہایت ضعیف و کمزور تھے۔ جیساکہ قصۂ موسیٰ علیہ السّلام میں ہے فَوَکَزَہٗ مُوْسٰی فَقَضٰی عَلَیْہِ ؛

جوابِ دوم | جو مصالح حضرت عُمرؓ کے پیشِ نظر تھیں وہ حضرت ابوہریرہؓ کے پیشِ نظر نہ تھیں اس بناء پر روکا مگر حضرت ابوہریرہؓ نہ رُکے۔ حضرت عمرؓ کو دینی غیرت آئی اور فرطِ جوش میں یہ عمل کیا جیسے حمیّت دینی اور غیرت دینی کی

بنا پر موسٰی علیہ السلام سے القاء لوحِ تورات ثابت ہے ایسے ہی یہاں بھی ہے کیونکہ اَشَدُّهُمْ فِیْ اَمْرِاللّٰهِ عُمَرُ ہونا ثابت ومشہور ہے۔

قولہٗ فَقَالَ ارْجِعْ يَا اَبَا هُرَيْرَةَ فَرَجَعْتُ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (ترجمہ) حضرت عمرؓ نے کہا اے ابوہریرہؓ واپس چلے جاؤ! لہٰذا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں واپس لوٹ آیا۔

سوال ۔ حضرت ابوہریرہؓ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد تھے اور قاصد کا قول اصل کا قول ہوتا ہے۔ تو حضرت عمرؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کیوں کی، اور واپسی کا کہہ رہے ہیں۔

جواب یہ امر وجوب کے لیے نہیں تھا بلکہ محض صحابہ کرامؓ کی خوشنودی کیلئے تھا۔ اس کا قرینہ یہ ہے کہ حضرتِ معاذؓ کی روایت میں حضور صلعم نے خود فرمایا ہے " لَا تُبَشِّرْهُمْ فَيَتَّكِلُوْا لیکن یہاں غلبہ شفقت ورحمت اور غلبہ استغراق کی وجہ سے ادھر توجہ نہ رہی۔ حضرت عمرؓ کے یاد دلانے سے آپ کو وہ مصلحت مستحضر ہوگئی، اور آپؐ کو حضرت عمرؓ کی رائے پسند آگئی اس لیے رجوع فرمالیا۔ ورنہ اگر امر وجوب کے لیے ہوتا تو کیا مجال تھی کہ حضرت عمرؓ حضرت ابوہریرہؓ کو واپس کرتے یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عمرؓ کی رائے کو پسند فرماتے۔

قولہٗ فَاَجْهَشْتُ بِالْبُكَاءِ : اَجْهَشْتُ ماضی واحد متکلم اَلْاِجْهَاش بمعنی رو روکے فریاد کرنا : كَمَا يَفْزَعُ الصَّبِيُّ اِلٰى اُمِّهٖ ۔

قولہٗ وَرَكِبَنِيْ عُمَرُؓ: رکب کا معنی سوار ہونا، یہ عرب کا محاورہ ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ فلاں پر قرض سوار ہو گیا، یعنی غالب آگیا، یا غم ہم پر سوار ہے۔ عند البعض شدتِ تلاصق واتصال کی وجہ سے رَكِبَنِيْ فرمایا۔

قولہٗ قَالَ فَلَا تَفْعَلْ فَاِنِّيْ اَخْشٰى اَنْ يَّتَّكِلَ النَّاسُ (ترجمہ) عرض کیا ایسا نہ کیجئے میں خوف کرتا ہوں کہ لوگ اس پر بھروسہ کر بیٹھیں گے۔

خلاصۃ الکلام : یعنی آئندہ حضرت ابوہریرہؓ کو عام لوگوں سے یہ کلام کرنے کی

اجازت نہ دیں ۔ اس میں آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک مشورہ کی پیش کش ہے نہ کہ حضورؐ کے حکم سے سرتابی وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقعہ پر عتاب نہ فرمایا۔ بلکہ آپ کا مشورہ قبول فرمالیا ۔

سوال ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بشیر کو بشارت دینے کا حکم فرمایا۔ جب کہ حضرت عمرؓ منع فرماتے ہیں لَا تَفْعَلْ تو ظاہراً آپؐ کے ساتھ مقابلہ ہے ۔ اور آپ کے حکم کی عدولی ہوئی اور یہ مسلمان کی شان نہیں ۔ چہ جائیکہ حضرت عمرؓ ایسا کریں ۔

جواب حضرت عمرؓ کا گمان تھا کہ یہ بشارت خصوصی ہے اور حضرت ابوہریرہؓ نے عمومی بشارت سمجھ کر لوگوں کو بیان کرنا شروع کر دیا ہے ۔ اس لیے حضرت عمرؓ خود بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر صورتِ حال کی تحقیق کی اور جان لیا کہ یہ عمومی بشارت ہے، تو حضرتِ عمرؓ نے نہایت ادب سے اپنی رائے بارگاہِ رسالت میں درج ذیل عبارت سے پیش فرمادی ۔ قَالَ لَا تَفْعَلْ فَاِنِّی اَخْشٰی اَنْ یَّتَّكِلَ النَّاسُ عَلَیْهَا۔ یہی وجہ ہے کہ بارگاہِ رسالت میں پذیرائی ملی ، اور بشارت کی اشاعت سے روک دیا گیا ۔

وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍؓ قَالَ قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَفَاتِیْحُ الْجَنَّةِ شَهَادَةُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ؛

ترجمہ : حضرت معاذ بن جبلؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا جنت کی کنجیاں (خلوصِ دل سے) اس بات کی گواہی دینا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے ۔

سوال ۔ یہ ہے کہ مَفَاتِیْحُ مبتدا ہے اور شَهَادَةُ خبر ہے ۔ قانون ہے کہ مُبتدأ و خبر میں مطابقت ضروری ہے ۔ جب کہ یہاں مطابقت مفقود ہے ۔ کیونکہ مُبتدا (مفاتیح) جمع ہے اور خبر (شہادۃ) مفرد ہے ۔

جواب اوّل ۔ کہ شَهَادَةُ مصدر ہے اور مصدر کا مفرد و جمع لانا برابر ہے ۔ فلا اشکال علیہ

جواب دوم ۔ یہاں شہادت سے جنس شہادت مراد ہے جو قلیل وکثیر دونوں کو شامل ہے تو ہر شخص کی شہادت ایک ایک مفتاح ہے۔

وَعَنْ عُثْمَانَ قَالَ اِنَّ رِجَالاً مِّنْ اَصْحَابِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حِیْنَ تُوُفِّیَ حَزِنُوْا عَلَیْہِ حَتّٰی کَادَ بَعْضُھُمْ یُوَسْوِسُ قَالَ عُثْمَانُ وَکُنْتُ مِنْھُمْ

ترجمہ: حضرت عثمانؓ سے مروی ہے کہ جب سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو صحابہؓ کی ایک جماعت پر رنج وافسوس کا ایسا غلبہ تھا کہ ان میں سے بعض صحابہ کرامؓ کے بارے میں یہ خطرہ پیدا ہوگیا تھا کہ کہیں یہ شک وشبہ میں گرفتار نہ ہوجائیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد دین وشریعت کا بھی خاتمہ ہوگیا ہے (نعوذ باللہ) حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں کہ میں بھی ان لوگوں میں سے تھا۔

قولہ رِجَالاً ۔ رِجَالاً اِنَّ کا اسم ہے حَزِنُوا خبر ہے۔

قولہ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِیِّ : مِنْ بیانیہ ہے یعنی رِجَالاً کا بیان ہے۔

قولہ حِیْنَ تُوُفِّیَ : متعلق ہے حُزن کے، اور حُزن کے دو باب آتے ہیں۔ لازمی بمعنٰی کسی کو غمگین کرنا۔ متعدی بمعنٰی مغموم کردن دیگرراما نند کان النبیّ اذا حَزَنَہ۔

قولہ حَتّٰی کَادَ بَعْضُھُمْ یُوَسْوِسُ : وسواس کا معنٰی ہے حدیث النفس اور یہ امر غیر اختیاری ہے اور اس سے مراد انقضائے دین ہے کہ اسلام کیسے باقی رہے گا، اس کا والی چلا گیا، سالارِ قافلہ رخصت ہوگیا اب یہ قافلہ کیسے سنبھلیگا۔ نیز حتّٰی کَادَ سے معلوم ہوتا ہے کہ قریب بہ وَسْوسہ تھے۔ مگر مُبتلائے وَسْوسہ نہ ہوئے۔ عند البعض وَسْوسہ سے مُراد جنون ہے یعنی نزدیک تھے لوگ کہ از غمِ آنحضرتؐ مجنون می شوند۔

یقول ابوالاسعاد : نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد صحابہ کرامؓ پر مختلف

حالات وکیفیات طاری ہو گئے تھے۔ بعض کے دل میں تو یہ وسوسہ پیدا ہو گیا تھا کہ جب حضور پرنورؐ کا انتقال ہو گیا تو یہ دین ختم ہو جائے گا، اور بعض نے تو حضورؐ کی موت سے انکار ہی کر دیا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ جیسے قوی آدمی بھی ننگی تلوار لے کر فرمانے لگے کہ جو کہے گا کہ حضورؐ کی وفات ہو گئی تو اس کا سر اسی تلوار سے اڑا دوں گا۔ اور بعض حواس باختہ ہو کر خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ جیسے حضرت عثمانؓ وغیرہ، حضرت صدیق اکبرؓ عین وقت پر حاضر نہ تھے۔ بلکہ مدینہ منورہ سے باہر مقام سنح پر تھے۔ یہ خبر سنکر تشریف لائے اور اندر جا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دونوں آنکھوں کے درمیان چہرۂ انور اقدس کو بوسہ دے کر فرمایا طِبْتَ حَيًّا وَّمَيِّتًا۔

پھر صحابہ کرامؓ کے حالات دیکھ کر سیدھے مسجد نبوی زادھا اللہ شرفاً میں تشریف لے گئے اور سب کو مسجد میں جمع ہونے کا اعلان کیا چنانچہ سب جمع ہو گئے تو حمد و ثنا کے بعد ایک تقریر فرمائی یہ تقریر نہیں بلکہ امت محمدیہ کی کشتی کو ساحل پر لگانا، ڈوبتے ہوئے دلوں کو سہارا دینا تھا کیونکہ یہ وقت انتہائی اہم تھا۔ کیونکہ ہر آدمی اس فکر میں تھا کہ اب اسلام کی کیا صورت ہو گی؟ مختلف خدشات تھے کہ دلوں میں آ جا رہے تھے کہ حضرت سیدنا ابوبکر صدیقؓ منبر نبوی پر جلوہ افروز ہوتے ہیں، اور درد میں ڈوبی آواز سے خطاب فرماتے ہیں:۔

اَلَا مَنْ كَانَ يَعْبُدُ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ حَيٌّ لَّا يَمُوْتُ وَمَنْ كَانَ يَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَقَدْ مَاتَ : (ترجمہ) تم میں سے جو خدا کی پرستش کرتا تھا وہ جان لے کہ وہ خدا زندہ ہے وہ کبھی نہیں مرے گا، اور جو شخص محمدؐ کی پرستش کرتا تھا وہ جان لے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا ہے۔: اور درج ذیل آیات پڑھیں:۔

۱۔ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۔ (آل عمران آیت ۱۴۴)

۲۔ وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ۔ (الانبیاء آیت ۳۴)

۳۔ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ۔ (الزمر آیت ۳۰)

تو صحابہ کرامؓ کو ہوش آ گیا حتیٰ کہ حضرت عمرؓ کا جوش بھی ختم ہو گیا۔ صحابہ کرامؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیات تو ہم ہمیشہ پڑھتے تھے مگر پریشانی کی بنا پر ذہول ہو گئی تھیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے تلاوت کرنے سے معلوم ہو رہا تھا کہ ابھی ابھی نازل ہو رہی ہیں۔ پھر آگے طویل واقعہ ہے یہاں اس

کی ضرورت نہیں ۔ وَاللہُ اعلمُ بالصَّواب ۔

اللّٰھمّ اغفر لکاتبہٖ ولوالدیہ ولاساتذتہم ولمن سعیٰ فیہ ۔

قولہٗ فلو اشعُرْ بہٖ : بہٖ کا ضمیر عند البعض تسلیم کی طرف ہے ۔ عند البعض مرور کی طرف ہے ۔ مگر محقق بات یہ ہے کہ ضمیر تاؤیل مذکور راجع بطرف ہر دو یعنی تسلیم و مرور جیسے ماقبل کی عبارت سے پتہ چلتا ہے ۔ وَاللہ مَا شَعُرْتُ اِنَّك مَرَرْتُ ولا سَلَّمتُ ۔

قولہٗ فقال ابوبکر مَا حَمَلَكَ : اس مقام پر سوال ہوتا ہے :۔

سوال ۔ یہ کہ حضرت عثمانؓ نے شدّتِ غم کی وجہ سے جواب نہ دیا جب کہ حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ پر سلام پڑھا گیا تو انہوں نے جواب کیوں نہ دیا ؟

جواب ۔ بعد از قال عبارت اقتضاء النص کے طور پر مقدر ہے ای بَعْدَ اَنْ اَجَابَہٗ

قولہٗ مَا فَعَلْتُ : مفعول مقدر ہے ای مَا فَعَلْتُ عَدْمَ رَدِّ السَّلَامِ :

قولہٗ لَقَدْ فَعَلْتُ ۔ : مفعول مقدر ہے ای فَعَلْتُ عَدْم رَدِّ السَّلَامِ :

قولہٗ عَنْ ذَالِكَ ۔ : یعنی از جواب سلام

نجاۃ ہذا الامر کی تشریح

امر کی تشریح میں مختلف اقوال ہیں :۔

اوّل ۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اَلْاَمْرُ سے مُراد دینؔ ہے یعنی دین کے اندر آتشِ دوزخ سے نجات و خلاصی کسی چیز کے ذریعہ ہوگی ۔

دوئم الامر سے مراد یہ ہے کہ اکثر لوگ شیطان کے دھوکا و دنیا کی محبّت و میلان الی الشہوات وارتکاب معاصی میں مبتلا ہیں ۔ ان خطرناک امور سے ذریعہ نجات کیا ہے ۔

سوئم یا وسوسہ شیطانی سے نجات مراد ہے ۔ جیساکہ خود اس حدیث میں کَادَ بَعْضُھُمْ یُوَسْوِسُ وَقَالَ عُثْمَانُ وَکُنْتُ مِنْھُمْ کا جُملہ بھی ہے ۔

سوال : نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے مختصرًا کلمہ بول کر اتنا اطناب کیوں فرمایا ہے ؟

جواب ۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے یہ نہیں فرمایا کہ یہ کلمات باعثِ نجات ہیں بلکہ اطناب کرکے جواب فَھِیَ لَہٗ نجاۃٌ جس میں حکمت یہ ہے کہ جو ابوطالب نے تمام عمر بحالت کفر ہی گذاری ایک لمحہ کے لیے اقرار نہیں کیا اگر ایسا شخص بھی صرف صدقِ دل سے ایک دفعہ وہ

کلمہ کہتا تو اس کی نجات کے لیے یہ کلمہ توحید وسیلہ بنتا اور اس کو جہنم سے خلاص کرنے میں میرے لیے حجّت ہوتی۔ مگر وہ مؤمن جس کے رگ وریشہ ولحم وشحم گوشت وپوست میں کلمہ توحید سرایت کرکے جزوِ اعظم بن گیا ہے۔ تو اس کے لیے کیسے نجات کا ذریعہ نہ ہو۔ اگر کلمہ کو صراحۃً کہہ دیتے تو یہ تفخیم حاصل نہ ہوتی۔

قَولُہٗ اَنْتَ اَحَقُّ بِھَا : اَیْ اَنْتَ اَلْیَقُ بِھٰذِہِ الْمَسْئَلَۃِ لِاَنَّکَ اِلٰی کُلِّ خَیْرٍ اَسْبَقُ وَاِلٰی حُصُوْلِ الْعِلْمِ اَشْوَقُ :

وَعَنِ الْمِقْدَادِؓ اَنَّہٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ لَا یَبْقٰی عَلٰی ظَھْرِ الْاَرْضِ :

ترجمہ : حضرت مقدادؓ سے مروی ہے، کہ انہوں نے حضور علیہ السّلام کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ نہیں باقی رہے گا زمین کے پیٹ پر۔

قَولُہٗ ظَھْرِ الْاَرْضِ : اس سے مُراد جزیرۃُ العرب اور اس کا گرد ونواح مراد ہے جو قریب قریب حضور علیہ السّلام کے زمانہ میں اور مابقی حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بالکل مغلوب اور مفتوح ہو چکا تھا۔

قَولُہٗ بَیْتُ مَدَرٍ : یہ مدرۃ کی جمع ہے بمعنیٰ خام اینٹ اور مٹّی کا ڈھیلا۔ اس سے مراد شہر اور دیہات کے مکانات ہیں کیونکہ اکثر گھر اینٹ سے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔

قَولُہٗ وَلَا وَبَرٍ : یعنی اونٹ وغیرہ کی پشم اس سے مراد صحرا اور جنگل کے خیمے ہیں۔ کیونکہ عرب کے اکثر دیہاتی آدمی پشم سے گھر بناتے تھے۔

خُلَاصَۃُ الْحَدِیْث

تو حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ خواہ شہر ہو یا دیہات تمام گھروں میں اسلام کا کلمہ داخل ہو کر رہے گا گویا یہ حدیث مستنبط ہے اس آیت مقدسہ سے " ھُوَالَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ :

قولہٗ بِعِزِّ عَزِیْزٍ : اَدْخَلَہٗ کے ضمیر سے حال ہے کہ ان کا دخول عزت کے ساتھ ہوگا نہ قید ہو نہ قتال کیا، یعنی عبارت ہوگی " ای مُلتبسًا بعزِّ شخصٍ عَزِیْزٍ :

قولہٗ وَذُلِّ ذَلِیْلٍ : یہاں بھی ادخلہٗ کے ضمیر سے حال ہوگا کہ ان کا دخول فی الاسلام اکراہ وجبر کے طور پر ہوگا کہ قید ہونگے قتل کیے جاویں گے، ذمّی یا حربی ہونگے ای مُلتبسًا بذلِّ شَخْصٍ ذَلِیْلٍ۔

بحث تعیین زمانہ لَایَبْقیٰ عَلیٰ ظَهْرِالْاَرْضِ بَیْتُ مَدَرٍ وَلَاوَبَرٍ

بحث یہ ہے کہ اس سے کونسا زمانہ مراد ہے اس میں مختلف قول مراد ہیں ۔

اوّل : بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری زمانہ مراد ہے اور ظَهْرِالْاَرْضِ سے صرف جزیرۃ العرب اور اس کے آس پاس کے علاقے مراد ہیں کیونکہ اسلام اس وقت اس سے باہر نہیں نکلا تھا ۔ مگر حدیث کا آخر جزء اس کے مطابق نہیں ہوتا کیونکہ ذلّ ذلیل سے جزیہ مراد ہے کہ ذمّی جزیہ دے کر اسلام کے تابع ہونگے ۔ حالانکہ جزیرۃ العرب میں جزیہ قبول نہیں ہوگا ۔ وہاں تو دو ہی صورتیں ہیں ۔ اسلام ۔ یا قتل ۔

دوّم : بعض نے کہا کہ ظَهْرِالْاَرْضِ سے مراد پوری روئے زمین ہے ۔ یہ حضرت امام مہدیؑ کے زمانہ کی طرف مشیر ہے ۔ اور بیت سے مراد بیت صاحب مدر یعنی مٹی کے نیچے بسنے والی قوم جس طرح امریکہ میں ایک قوم کے گھر مٹی کے نیچے ہیں اور وَلَا وَبَرٍ سے مراد بیت صاحب وبرہے یعنی وہ قوم جن کے لباس چمڑے اور پرندے کے پر ہوں جیسے اسکیمو نامی قوم جو برف کی بستی میں زندگی گذارتے ہیں لیکن اس میں بھی اشکال ہے کیونکہ زمانہ مہدیؑ میں بھی جزیہ قبول نہیں ہوگا ۔

سوّم : سب سے بہترین توجیہ یہ ہے کہ اس سے پورے عالم کا مسلمان ہونا مراد نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد اسلام کا غلبہ ہے یعنی اسلام دلائل وبراہین کے ذریعہ تمام عالم پر غالب ہوگا اور کافر اس حیثیت سے ذلیل وخوار رہے گا ۔ یہ توجیہ اشکال سے خالی ہے ۔

اسمائے رجال

حضرت مقدادؓ کے حالات

آپ ذوہجرتین ہیں ۔ آپکا نام مقدادؓ ابن عمرو ابن ثعلبہ کندی ہے ۔ مگر مشہور مقدادؓ بن اسود کے نام سے ہیں۔ اس لیے کہ آپ کی اسود نے پرورش کی ہے ۔ آپ جلیل القدر صحابیؓ ہیں ۔ مقام جُرُف میں جو مدینہ طیبہ سے تین میل کے فاصلہ پر ہے ۳۳ھ میں بعمر ۷۰ سال وفات پائی ۔ حضرت عثمان غنیؓ نے نماز جنازہ پڑھائی ۔ ان کی نسبت کندی ہے کیونکہ آپ کے والد اسود (نسبتی) نے بنو کندہ کے ساتھ معاہدہ اور حلف وفاداری کیا تھا ۔ آپ قدیم الاسلام ہیں حتیٰ کہ بعض نے کہا کہ آپ چھٹے نمبر پر اسلام لائے ۔

وَعَنْ وَهْبِ ابْنِ مُنَبِّهٍ قِيْلَ لَهُ اَلَيْسَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مِفْتَاحُ الْجَنَّةِ :	ترجمہ : حضرت وہب بن مُنبہؒ (تابعی) سے مروی ہے کہ کسی نے ان سے سوال کیا کہ کیا کلمہ توحید جنّت کی کنجی نہیں ہے ۔

قولہ اَسْنَانٌ : اَسْنَان جمع سن بمعنیٰ دانت مگر چابی کے دانت سے مراد اس کے دندانے ہیں جس سے تالہ کھلتا ہے ۔

خُلَاصَۃُ الْحَدِیْث

حضرت وہب بن مُنبہؒ اپنی مجلس میں وعظ و نصیحت کر کے لوگوں کو عمل کی اہمیت بتا رہے تھے ۔ کسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مبارک حدیث ۲۵ (عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِفْتَاحُ الْجَنَّةِ شَهَادَةُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ) کا سہارا لے کر کہا کہ آپ تو عمل کے بارے میں اتنی شدّ و مدّ کے ساتھ متنبہ کر رہے ہیں ۔ حالانکہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ جنت کی کنجی ہے یعنی جس نے صدقِ دل سے وحدانیت کا اقرار کیا وہ جنّت کا حقدار بن گیا ۔ خواہ اس کی عملی زندگی کیسی بھی ہو ۔ اس پر وہب بن مُنبہؒ نے جواب دیا کہ بلاشبہ کلمہ توحید جنت کی کنجی ہے لیکن یہ بات بھی یاد رکھو کہ کنجی اس وقت کام کرتی ہے جب کہ اس میں دندانے بھی ہوں ۔ اگر کسی کنجی میں دندانے نہیں تو ظاہر ہے کہ اس سے تالہ نہیں کھلتا تو جب کلمہ توحید جنّت کی کنجی بنی تو اس کنجی کے دندانے شریعت کے احکام و فرائض ہیں پس جو شخص فرائضِ شریعت پر عمل نہیں کرے گا تو گویا وہ آخرت میں ایسی کنجی لے کر جا رہا ہے جس کے دندانے نہ ہوں گے تو پھر ایسی کنجی سے ابوابِ جنّت کس طرح کھولے جائیں گے ۔ ولہٰذا عمل کی شریعت میں اشد ضرورت ہے ۔ یعنی مفتاح سے مراد عقائد اور اسنان سے مراد اعمال ہیں ۔

سوال ۔ یہ حدیث مسلک اہل سنت والجماعۃ کے خلاف ہے ۔ کیونکہ اعمال (اسنان) کے بغیر ابواب جنّت نہیں کھولے جائیں گے ۔ حالانکہ مرتکب اعمال سیئات ضرور بالضرور جنّت میں جائے گا ۔

جواب اوّل ۔ مفتاح سے مراد اقرار باللسان اور اسنان سے مراد تصدیق بالقلب ہے ۔

ہاں اگر اقرار کے ساتھ تصدیق نہ ہوئی تو لَمْ یَفْتَحْ فَلَا اِشْکَالَ عَلَیْہِ ۔

جواب دوم : فتح سے مراد مطلق فتح نہیں بلکہ فتح اُولیٰ مراد ہے ۔ تدبر تحقیقہ مُفصلاً ۔

وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا اَحْسَنَ اَحَدُکُمْ اِسْلَامَہٗ فَکُلُّ حَسَنَةٍ یَعْمَلُهَا تُکْتَبُ لَہٗ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا :

ترجمہ : روایت ہے حضرت ابوہریرہؓ سے فرماتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب تم میں سے کوئی اپنا اسلام ٹھیک کرے تو جو نیکی کرے گا وہ دس گنا لکھی جاویگی

قولہٗ اَحْسَنَ اَحَدُکُمْ اِسْلَامَہٗ : اسلام کا حسن یہ ہے کہ تمام عقائد اسلامیہ کا دل سے اعتقاد رکھے اور زبان سے اقرار کرے ۔ کمافی قولہ تعالیٰ بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَہٗ لِلّٰہِ وَهُوَ مُحْسِنٌ :

قولہٗ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا : یعنی کم ازکم دس گنا زیادہ سات سو گنا جیسا اخلاص اور موقع ویسا ثواب ۔ یہ قانون ہے فضل کی حد نہیں ۔ اس حدیث میں دو آیتوں کی طرف اشارہ ہے ایک مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَہٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا (پ۸) دوسری مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ : (پ۳ البقرہ)

خلاصۃ الحدیث اس حدیث میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس امت کی خصوصیات بہت ہیں ۔ ان میں سے دو سرفہرست ہیں :۔

اوّل : جب کوئی مؤمن نیک عمل کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اجر صرف اسی ایک عمل کے برابر دینے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اس جیسے دس عمل کا ثواب اس کو دیا جاتا ہے اور اسی پر بس نہیں ہوتا ۔ بلکہ جوں جوں ایمان میں صدق بڑھتا جاتا ہے تو اجر بھی بڑھتا جاتا ہے ۔ حتّٰی کہ سات سو تک ، بلکہ بعض دفعہ اضافہ ہو کر سینکڑوں اور ہزاروں تک چلا جاتا ہے جیسا کہ حرم پاک میں عمل کیا جائے تو لاکھ تک اجر چلا جاتا ہے ۔

دوم : اس کے برعکس اور مؤمن سے بتقاضائے بشریت کوئی برائی ہوجائے تو اس کے گناہ کا اضافہ نہیں لکھا جاتا جتنی برائی ہوتی ہے اتنی جزا ہوتی ہے اس کا جتنا شکر کیا جائے کم ہے۔

وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ اَنَّ رَجُلاً سَئَالَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا الْاِیْمَانُ قَالَ اِذَا سَرَّتْكَ حَسَنَتُكَ وَسَاءَتْكَ سَیِّئَتُكَ فَاَنْتَ مُؤْمِنٌ :

ترجمہ : حضرت اُمامہؓ راوی ہیں کہ ایک شخص نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا یا رسول اللہ! ایمان کی سلامتی کی نشانی کیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا جب تمہاری نیکی تم کو خوش کرے اور تمہاری برائی تم کو پریشان کرے تو (سمجھو کہ) تم مؤمن ہو۔

قولہٗ مَا الْاِیْمَانُ : بعض وقت کلمہ مَا حقیقتِ سوال کے لیے آتا ہے۔ مگر اس مقام پر علامتِ ایمان کے متعلق سوال ہے یعنی ایمان کی درستگی کی کیا نشانی ہے۔

خُلاصَۃُ الحدیث یہ حدیث انسان کے حاسہ فطرت کی سلامتی پر مبنی ہے جس طرح صحت کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ زبان کا ذائقہ درست ہو میٹھی چیز میٹھی معلوم ہو، اور کڑوی چیز کڑوی۔ اسی طرح حاسہ فطرت کی صحت کی علامت یہ ہے کہ قلب کا حاسہ درست ہو، اس میں حسنہ اور سیئہ کا امتیاز باقی ہو۔ اگر یہ امتیاز باقی نہ رہے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ اب کسی رُوحانی مرض نے اس کو گھیر لیا ہے۔ اب اس حدیث کی دو جزئیں ہیں :۔

اوّل : مَا الْاِیْمَانُ یہ سوال اوّل ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ ایمان کی سلامتی بتا دی جائے جس سے استقامت کا اندازہ کیا جاسکے۔ تو آپ نے فرمایا وہ کیفیت محسوس کرنے لگو کہ نیکی پر دل و دماغ خوش ہو برائی پر مغموم ہو تو وہ استقامت کی علامت ہے۔

دوم : فَمَا الْاِثْمُ یہ سوال دوم ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ روز مرّہ کی زندگی میں مؤمن کو ایسے امور کے ساتھ واسطہ پڑتا ہے کہ جس کی شرعی حیثیت معلوم نہیں اب وہ کیا کرے۔ جواب دیا کہ

مُؤمن کی قلب لوح ہے۔ اگر اس میں تردد و شک ہو تو سمجھ لینا کہ گناہ ہے اس کا ترک اولیٰ ہے جس کو مَلامتِ ضمیر کہہ سکتے ہیں کما فی قولہ علیہ السلام "اتقوا فراسۃ المؤمن فانہ ینظر بنور اللہ۔"

قولہ وَاِذَا حَاكَ فِیْ نَفْسِكَ شَیْئٌ فَدَعْهُ : یعنی جب کوئی چیز تیرے دل میں کھٹکے اور چُبھے تو اس کو چھوڑ دے۔

سوال - یہ ہے کہ اگر فرائض و واجبات میں کسی کو کھٹکا ہونے لگے تو کیا اسے بھی چھوڑ دے۔

جواب - یہاں ایک قید محذوف ہے" ای اذا حاك فی غیر المنصُوص علیہ" یعنی جس کے گناہ ہونے کی شریعت میں تصریح نہ ہو بلکہ وہ مشتبہ ہو یا قرآن وحدیث اور اجماع سے معلوم نہ ہو بلکہ مختلف فیہ ہو۔

یقول ابو الاسعاد : یہ معیار ان لوگوں کے لیے ہے جو کامل مؤمن، ارباب باطن اور اولیاء اللہ ہوتے ہیں کیونکہ وہ اپنے قلب و دماغ کی صفائی و پاکیزگی کی بناء پر برائی کی ہلکی خلش کو بھی برداشت نہیں کر سکتے اور خدا کی فرمانبرداری پر ہی ان کا دل مطمئن اور مسرور ہوتا ہے۔

وَعَنْ عَمْرِو بْنِ عَبَسَةَ قَالَ اَتَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَنْ مَّعَكَ عَلٰی هٰذَا الْاَمْرِ قَالَ حُرٌّ وَّعَبْدٌ۔

ترجمہ : حضرت عمرو بن عبسہؓ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ اس دینِ اسلام پر آپ کے ساتھ کون کون ہیں آپ نے فرمایا ایک آزاد ایک غلام۔

قولہ هٰذَا الْاَمْر : اَیِ الْاِیْمَان وَالْمَذْهَب وَالْاِسْلَام یعنی اسلام میں کوئی خاص بندے داخل ہو سکتے ہیں یا عام داخلہ ہے۔

قولہ حُرٌّ وَّعَبْدٌ : حُر و عبد سے کیا مراد ہے اس میں مُتعدّد قول ہیں :۔

۱۔ تمام لوگ مراد ہیں خواہ آزاد ہوں یا غلام کہ وہ سب اس امر دین کی مُوافقت کے لیے مأمور ہیں۔

۲- حُر سے حضرت ابوبکر صدیقؓ اور عبد سے زیدؓ بن حارثہ مراد ہیں۔

۳- حُر سے مراد حضرت ابوبکر صدیقؓ اور عبد سے حضرت بلالؓ مراد ہیں جیساکہ صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے" وَمَعَهُ يَوْمَئِذٍ اَبُوبَكْرٍ وَبِلَالٌ"۔

سوال۔ ابتدائے اسلام میں حضور علیہ السلام کے ساتھ حضرت علیؓ و بی بی خدیجہؓ بھی تھیں ان کو شمار نہیں کیا۔

جواب:۔ حضرت علیؓ کو کم سنی کی بناء پر اور حضرت خدیجہؓ کو مستورات میں ہونے کی بناء پر ذکر نہیں کیا اگرچہ وہ بھی اس وقت مسلمان تھے۔

قولہٗ قُلْتُ مَا الاِسْلَامُ قَالَ طِيْبُ الْكَلَامِ وَاِطْعَامُ الطَّعَامِ (ترجمہ) میں نے کہا اسلام کیا ہے فرمایا خوش کلامی اور کھانا کھلانا ہے۔

سوال:۔ یہ ہے کہ حدیث جبریلؑ میں اسلام کے متعلق اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ سے جواب دیا جب کہ یہاں طِيْبُ الْكَلَامِ وَاِطْعَامُ الطَّعَامِ فَتَعَارَضَا:

جوابِ اوّل: حدیث جبریلؑ میں سوال حقیقتِ اسلام سے تھا کیونکہ وہ بغرضِ تعلیم تشریف لائے تھے۔ اس لیے جواب میں حقیقتِ اسلام کو بیان فرمایا اور عمروؓ بن عبسہؓ حقیقتِ اسلام سے واقف تھے کیونکہ وہ پہلے سے مسلمان تھے۔ یعنی ان کے سوال کا مقصد لوازماتِ اسلام تھے نہ کہ خود اسلام۔

جوابِ دوم: جبریل علیہ السلام ایمان کی حقیقت کو سمجھنے پر قادر تھے۔ اس لیے اس کے سوال میں حقیقتِ ایمان کو بیان فرمایا۔ بخلاف عمرو بن عبسہؓ کے کیونکہ وہ حدیثُ العہد بالاسلام تھے۔ حقیقتِ ایمان سمجھنے کے لیے ان میں استعداد پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے جواب میں تفاوت کیا گیا۔

جوابِ سوم۔ یہ جواب علیٰ طریق اسلوب الحکیم ہے یعنی عمرو بن عبسہؓ کو حقیقتِ ایمان سے اعمالِ ایمان سے ضرورت زیادہ تھی اس لیے اسے بیان کیا گیا۔

قولہٗ قُلْتُ مَا الْاِيْمَانُ قَالَ الصَّبْرُ وَالسَّمَاحَةُ (ترجمہ) میں نے عرض کیا ایمان کی باتیں کیا ہیں فرمایا صبر اور سخاوت۔

ایمان امر باطنی ہے اس لیے اس کا جواب بھی امورِ باطنی سے دیا گیا ہے۔ ایمان کے مکارم اخلاق سے سوال کرنے پر ان دونوں کو اس لیے ذکر کیا کہ اوّل سے ترکِ منہیات کی طرف اشارہ ہے ثانی سے فعل مأمورات کی طرف اشارہ ہے۔ حَیْثُ قَالَ الْحَسَنُ الْبَصْرِی عَنْ مَعْصِیَۃِ اللہِ وَالسَّمَاحَۃِ عَلٰی اَدَاءِ فَرَائِضِ اللہِ۔ عند البعض الصّبر سے مفقود اشیاء کی طرف اشارہ کیا السَّمَاحَۃ سے موجود کی طرف اشارہ کیا۔

قولہ اَیِ الْاِیْمَانُ اَفْضَلُ : خلق حسن مَاالْاِیْمَان کے بجائے ای الْاِیْمَان میں ذکر کیا کیونکہ حسن خلق جامع ہونے کی وجہ سے دونوں کو شامل ہے یعنی صبر وسماحۃ اس لیے ای الْاِیْمَان کے جواب میں نقل کیا۔ حَیْثُ قَالَتْ عَائِشَۃُ خُلُقُہُ الْقُرْآن ای خلقہ علیہ السّلام۔

فائدہ حضرتؐ نے چار جملے جو اُبا ارشاد فرمائے اور سائل نے چار سوال عرض کیے ۱ ای الْاِسْلَام ۲ ای الْاِیْمَان ۳ مَاالْاِسْلَام ۴ مَاالْاِیْمَان۔ ان میں فرق ہے یا نہیں عند الجمہور فرق ہے برابر نہیں۔ ای الْاِسْلَام وَایِ الْاِیْمَان میں تحقیقِ ایمان ہے۔ ماالاسلام وَمَاالْاِیْمَان میں علامتِ ایمان واسلام ہے" قلتُ ای الصَّلوٰۃ افضلُ قال طُوْلُ الْقُنُوْت (ترجمہ) میں نے کہا نماز میں کونسی چیز افضل ہے فرمایا درازی قنوت۔

فائدہ محدّثینؒ حضرات نے قنوت کے متعدد معانی بیان کیے ہیں۔ قنوت بمعنٰی طاعت[۱]، خشوع[۲]، صلوٰۃ[۳]، دعاء[۴]، قیام[۵]، سکوت[۶]۔ ہر معنٰی کی تعیین قرائن سے کی جائے گی۔ عندالاحناف قنوت بمعنٰی قیام ہے۔ اس کی مکمّل بحث تفصیل کے ساتھ کتابُ الصلوٰۃ میں آئیگی۔

قولہٗ قَالَ قلتُ اَیِ الْھِجْرَۃِ اَفْضَلُ - چونکہ ہجرت مختلف قسم کی ہے۔ ۱ ایذاءِ کفار سے بچنے کے لیے کَمَا وَقعَتْ لِلصَّحَابَۃِ اِلَی الْحَبْشَۃِ ۲ اعلاءِ کلِمَۃِ اللہِ کے لیے کَمَا وَقعَتْ مِنْ مَکَّۃَ اِلَی الْمَدِیْنَۃِ وفِیْ مَعْنَاھَا الْھِجْرَۃ مِنْ دَارِالْکُفْرِ اِلٰی اِلٰی دَارِالسَّلَامِ۔ ۳ وھجرۃ القبائل لتعلیم المسَائِلِ مِنَ النَّبِیِّ عَلَیْہِ السّلام ۴ والھجرۃ عَمَّا نَھَا اللہُ عَنْہُ : اس لیے افضل کے متعلق سوال کیا گیا۔

قولہٗ قَالَ مَنْ عُقِرَ جَوَادُہٗ وَاُھْرِیْقَ دَمُہٗ (ترجمہ) فرمایا وہ شخص جس کا گھوڑا مارا جائے اور وہ خود بھی شہید ہوجائے۔

قولہٗ نَعقرَ جَوَادُہٗ ای قتل فرسہٗ :

قولہٗ اُھرِیْقَ : اَرَاقَ یُرِیْقُ میں بعض وقت ہمزہ کو ھاء سے بدل دیتے ہیں۔ ھَراق یھریق ۔ اور بعض اوقات ہمزہ کے ساتھ ھاء زائدہ بڑھا دیتے ہیں اور اھراق پڑھتے ہیں تو یہاں بھی ھاء زائدہ ہے۔ اس جہاد میں چونکہ جانی ومالی دونوں قسم کا نقصان ہوا ہے۔ اس لیے اُسے افضل الجہاد کہا گیا ہے۔

قولہٗ جَوْفُ اللَّیْلِ الْآخِرِ (آخری رات کا درمیانی حصّہ) یعنی آخری تہائی رات کے تین حصّے کرو، اس کے درمیانی حصّے میں تہجد پڑھو گویا رات کے چھٹے حصّہ میں اسی وقت نماز پڑھنا دعائیں مانگنا بلکہ استغفار کرنا افضل ہے۔ کیونکہ اس وقت رحمتِ الٰہی دنیا کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ اور اس وقت جاگنا نفس پر شاق ہے۔

ے پچھلی راتیں رحمت رب دی گھر گھر کرے آوازہ
سونے والو رب کرلو کھلا ہے دروازہ۔

وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ الخ ترجمہ : روایت ہے حضرت معاذ بن جبل
وَیُصَلِّ الْخَمْسَ وَیَصُوْمُ رَمَضَانَ سے الخ پانچوں نمازیں اور رمضان کے روزے۔

سوال ۔ کہ حدیث مذکورہ میں زکوٰۃ اور حج کو ذکر نہیں فرمایا ؟

جواب اوّل ۔ یہ ہے کہ یہ دو فرائض مالداروں کے ساتھ خاص ہیں یعنی یہ دو حکم عمومی نہیں بلکہ خصوصی ہیں

جواب دوم ۔ عند البعض یہ دونوں حکم اس وقت فرض نہیں ہوئے تھے یعنی ان کی فرضیت نازل نہیں ہوئی تھی ۔

قولہٗ قَالَ دَعْھُمْ یَعْمَلُوْا : فرمایا نہیں رہنے دو کہ عمل کرتے رہو۔ یعنی عوام میں مجمل حدیث مت پھیلاؤ کہ وہ اس کا مطلب نہیں سمجھیں گے اور عمل میں کوشش چھوڑ دیں گے۔

سوال ۔ اَفَلَا اُبَشِّرُھُمْ : میں ھُمْ ضمیر عوام الناس کی طرف پھر رہا ہے۔ اگر مرجع خواص بنائیں تو سوال ہوگا کہ جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام فرما رہے ہیں خوش خبری نہ دینا تو آپ کیوں

بیان کر رہے ہیں۔

جواب ۔ یہ ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عام آدمیوں سے روکا تھا نہ کہ خواص سے خواص کو تو خوشخبری دے رہے ہیں۔

وَعَنْهُ اَنَّهٗ سَأَلَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَنْ اَفْضَلِ الْاِیْمَانِ قَالَ اَنْ تُحِبَّ لِلّٰہِ وَتُبْغِضَ لِلّٰہِ وَتَعْمَلَ لِسَانَكَ فِیْ ذِکْرِ اللّٰہِ

ترجمہ : انہی سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کامل ایمان کے متعلق پوچھا تو حضرتؐ نے فرمایا یہ ہے کہ تم اللہ کے لیے محبت وعداوت کرو۔ اور اپنی زبان کو اللہ کے ذکر میں مشغول رکھو۔

قولہٗ تُحِبَّ وَتُبْغِضَ لِلّٰہِ : تحب وتبغض دونوں کا مفعول مقدر ہے "اَنْ تُحِبَّ اَحَدًا لِلّٰہِ وَتُبْغِضَ اَحَدًا لِلّٰہِ"۔

قولہٗ وماذا : اصل میں تھا "مَاذَا اَصْنَعُ بَعْدَ ذَالِكَ" یعنی اس کے بعد پھر کیا کریں

سوال :۔ حدیث پاک کا جملہ تُحِبُّ لِلنَّاسِ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِكَ صحیح نہیں کیونکہ ایک شخص حسین بیوی رکھتا ہے، یا اس کے پاس حکومت ہے وہ کیسے برداشت کر سکتا ہے کہ دوسرا اس کو دیکھے اور اس کی تمنا کرے کَمَا فِی وَاقِعَةِ سُلَیْمَان عَلَیْهِ السَّلَام "رَبِّ هَبْ لِیْ مُلْكًا لَّا یَنْبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْ بَعْدِیْ۔ (پ۲۳ س صٓ)

جواب : یہ کلام مقید باللفظ فی ما امکن شرعًا ہے یعنی جو چیز شریعت میں ممکن ہے ای اَنْ تُحِبَّ لِلنَّاسِ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِكَ فِی مَا اَمْكَنَ شَرْعًا اور یہ اشیاء زن، زر، ملک شرعی امکان ندارد۔

هٰذا اٰخرُ بابُ الایمانِ بتوفیقِ الحنّانِ والمنّانِ ذی الجُودِ والاحسانِ :

ربِّ یسّر ولا تعسّر وتمّم بالخیر (آمین)

۷ جمادی الاولیٰ ـــــ ۱۴۲۲ھ ـــــ وبموافقات ۲۹ جولائی ـــــ ۲۰۰۱ء ـــــ

ـــــ بروز اتوار ـــــ

بابُ الکبائرِ وعلاماتِ النّفاق

اس ترجمۃ الباب کے دو حصّے ہیں۔ حصّہ اوّل فی بحث الکبائر : حصّہ ثانی علامات النفاق۔ کبائر یہ کبیرہ کی جمع ہے بمعنیٰ عظیمہ جو مقابل صغیرہ ہے۔ یعنی گناہ دو قسم ہیں کبیرہ ۔ صغیرہ ۔ اس کے متعلق یہاں تین بحثیں ہوں گی۔

بحث اوّل تقسیم معاصی

علمائے کرام میں اختلاف ہے کہ گناہوں میں تقسیم ہے یا نہیں اس میں دو طائفہ ہیں:۔

طائفہ اولیٰ :۔ قاضی عیاضؒ اور ابو اسحاقؒ اسفرائنی وغیرہ کے نزدیک ہر معصیت کبیرہ ہی ہے اس میں کوئی تقسیم نہیں۔

دلیل اوّل نقلی ۔ وَعَنِ ابنِ عبّاسٍؓ کُلّ شَیْئٍ نَھَی اللہُ عَنْہُ فَھُوَ کَبِیْرَۃٌ : یعنی ہر وہ شئی جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے اس کا کرنا گناہ کبیرہ ہے اس میں کوئی تقسیم نہیں۔

دلیل دوم عقلی ۔ حق تعالیٰ کی نافرمانی کا نام گناہ ہے۔ اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کی شانِ عظمت وکبریائی کے اعتبار سے ان کی معمولی نافرمانی بھی سخت قبیح چیز ہے۔

طائفہ ثانیہ :۔ جمہور سلفؒ وخلفؒ کے نزدیک معاصی دو قسم ہیں۔ (۱) صغیرہ (۲) کبیرہ اس طائفہ کے دلائل کثیرہ ہیں۔

دلیل نقلی اوّل : وَوُضِعَ الْکِتَابُ فَتَرَی الْمُجْرِمِیْنَ مُشْفِقِیْنَ مِمَّا فِیْہِ وَیَقُوْلُوْنَ یٰوَیْلَتَنَا مَالِ ھٰذَا الْکِتَابِ لَا یُغَادِرُ صَغِیْرَۃً وَّلَا کَبِیْرَۃً اِلَّا اَحْصٰھَا (پ۱۵ س کہف ع ۱۸)

دلیل نقلی دوم ۔ اَلَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ (پ ۲۷ س نجم ع ۲)

دلیل نقلی سوم ۔ اِنْ تَجْتَنِبُوْا کَبٰٓئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُکَفِّرْ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ (پ ۵ س النسآء ع ۲) پہلے کبائر سے تعبیر کیا اور دوسرے کو سیئات سے جو صغائر ہیں ان جمیع نصوص سے تقسیم ذنوب کی تائید ہوتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ امام غزالیؒ اپنی کتاب البسیط فی المذہب میں فرماتے ہیں " اِنْکَارُ الْفَرْقِ بَیْنَ الصَّغِیْرَۃِ وَالْکَبِیْرَۃِ لَا یَلِیْقُ بِالْفِقْهِ اور بھی نصوص قرآنی بہت ہیں لیکن طوالت کی وجہ سے ترک کیا جارہا ہے۔

دلیل عقلی بر تقسیم معصیت عقل کا تقاضا بھی ہے کہ معاصی میں تقسیم ہو کیونکہ تمام گناہوں کے آثار یکساں نہیں ہیں۔ تفاوت آثار کے اعتبار سے یہ کہنا پڑے گا کہ کچھ گناہ کبیرہ ہیں اور کچھ صغیرہ اس لیے کہ نصوص سے گناہوں کے آثار مختلف سمجھ میں آرہے ہیں۔ بعض گناہ ایسے ہیں کہ بغیر توبہ کے ان کی معافی کا وعدہ نہیں اور بعض ایسے ہیں کہ حسنات کے ضمن میں ہی معاف ہوتے رہتے ہیں۔ اس لیے عقلاً ماننا پڑے گا کہ تفاوت آثار کے اعتبار سے معصیت میں انقسام ہے کبیرہ اور صغیرہ کی طرف۔

دلیل قیاسی بر تقسیم معصیت قیاس کا تقاضا بھی ہے کہ معاصی میں تقسیم ہو۔ کیونکہ بعض معاصی کے مرتکب کو فاسق مردود الشہادۃ ٹھہرایا جاتا ہے اور بعض کو نہیں۔ نیز زنا اور قبلہ، اسی طرح قتل، گالی دینا ہرگز برابر نہیں۔ لہذا تقسیم معاصی کا انکار کرنا قیاس کے بھی خلاف ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت کا جمہور کی طرف سے جواب :

فریق اول نے حضرت ابن عباسؓ کے قول سے جو استدلال کیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ سیدنا ابن عباسؓ سے تقسیم کا قول بھی موجود ہے۔ کما فی التعلیق ۔ لہذا اس اصول کے تحت کہ اِذَا تَعَارَضَا تَسَاقَطَا کی وجہ سے ابن عباسؓ کے قول سے دلیل پکڑنا ناقابل استدلال ہے۔

دلیل عقلی کا جواب

انہوں نے جو یہ دلیل عقلاً پیش کی کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے اعتبار سے سب کبیرہ گناہ ہونے چاہئیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ گناہ کی دو حیثیتیں ہیں (۱) ذاتِ خداوندی کی طرف نسبت کرتے ہوئے اس حیثیت سے بے شک سب گناہ کبیرہ ہونے چاہئیں (۲) گناہوں کی حیثیت ایک دوسرے کی نسبت سے ہو۔ تو ظاہر ہے کہ سب گناہ برابر نہیں بلکہ بعض، بعض سے بڑے ہیں " كَمَا يَدُلُّ عَلَيْهِ الْحَدِيْثُ الْاَوَّلُ فِي الْبَابِ عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ حَيْثُ سَأَلَ بِقَوْلِهٖ ثُمَّ اَيٌّ كَمَا هُوَ ظَاهِرٌ " تو ہم جہاں تقسیم کے قائل ہیں وہ دوسری حیثیت سے ہیں پہلی سے نہیں۔

البحثُ الثّانی فی تعریفاتِ کبیرہ وصغیرہ

کبائر وصغائر کی مختلف تعریفات کی گئی ہیں :۔

اوّل : علامہ ابو حامد امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ کبیرہ وصغیرہ امور اضافیہ میں سے ہیں۔ ہر گناہ اپنے ماتحت کے اعتبار سے کبیرہ ہے اور اپنے مافوق کے اعتبار سے صغیرہ ہے۔ لیکن اس پر اشکال یہ ہے کہ اپنے ماتحت گناہ کی بہ نسبت ہر چھوٹی سی بات پر بھی کبیرہ کا اطلاق ہوگا لہٰذا وہ بھی بلا توبہ معاف نہ ہوگا، اور کبیرہ اپنے مافوق کے اعتبار سے صغیرہ ہونے کی وجہ سے بلا توبہ معاف ہو جائے گا۔

دوّم : علامہ ابن قیمؒ لکھتے ہیں کہ گناہوں کا کبیرہ وصغیرہ ہونا باعتبار فاعل کے ہے۔ کما قال الشاعر ؎

فَكَبَائِرُ الرَّجُلِ الصَّغِيْرِ صَغَائِرٌ   وَصَغَائِرُ الرَّجُلِ الْكَبِيْرِ كَبَائِرٌ

وَمَا اَشْبَهَ قولهم ـــــ حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَيِّئَاتُ الْمُقَرَّبِيْنَ۔

(كذا فی التهذيب ومدارج السالكين)

سوّم : حسن بصریؒ، ابنِ جُبیرؒ، مُجاہدؒ، ضحاکؒ وغیرہم فرماتے ہیں کہ جس گناہ پر قرآن وحدیث میں آگ یا جہنم کی وعید بصراحت آئی ہو وہ کبیرہ ہے، اور جس پر اس کی تصریح منقول نہیں

محض ممانعت وارد ہوئی ہو وہ صغیرہ ہے۔

چہارم : علامہ ابوالحسنؒ الواحدی نے کہاہے کہ صحیح بات یہ ہے کہ کبیرہ کی کوئی خاص تعریف نہیں ہے۔ بلکہ شریعت نے بعض معاصی کو کبائر سے تعبیر کیا، اور بعض کو صغائر سے تعبیر کیا اور بہت سے گناہوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا کہ کبیرہ ہیں یا صغیرہ۔ لیکن وہ بھی کسی ایک میں ضرور داخل ہیں۔ اور عدم بیان میں یہ حکمت ہے کہ خالص بندہ اسی کو کبیرہ خیال کرکے پرہیز کرے۔ اور بھی بہت سے اقوال ہیں طوالت کی وجہ سے فلا نذکرہ :

البحث الثالث عدد کبائر

بعض احادیث میں کبیرہ گناہوں کی خاص خاص تعداد کا ذکر ہے مثلاً اسی باب کی تیسری حدیث میں سات کا ذکر ہے۔ اس سے پہلی حدیث میں اس سے کم کا ذکر ہے۔ بعض احادیث میں اس سے زیادہ کا ذکر ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ کبائر کسی خاص تعداد میں منحصر نہیں۔ جہاں خاص تعداد کا ذکر ہے وہاں بھی حصر مقصود نہیں۔ ایک عدد اپنے سے مازاد کے لیے نافی نہیں ہوتا۔

سوال ۔ جب حصر مقصود نہیں تو پھر خاص خاص تعداد کا ذکر کیوں کیا گیا ؟

جواب ۔ یہ کہ خاص خاص گناہوں کی تخصیص ذکری خصوصیت احوال مخاطبین یا خصوصیت مقام کی وجہ سے ہوتی ہے۔ مخاطبین کے حالات کے لحاظ سے یا سائلین کی رعایت کے لحاظ سے ان کا تذکرہ کر دیا جاتا ہے باقی کی نفی مقصود نہیں ہوتی۔

یقول ابوالاسعاد : شیخ ابوطالب مکیؒ لکھتے ہیں کہ احادیث میں جن گناہوں کو بصراحت کبائر سے تعبیر کیا گیا ہے ان کی تعداد سترہ معلوم ہوتی ہے بترتیب حسب ذیل ہے :

۱ شرک باللہ ۲ اصرار علی المعصیت ۳ رحمتِ خداوندی سے مایوس ہوجانا ۴ عذابِ الٰہی سے بے خوف ہونا۔ ان چار کا تعلق قلب سے ہے۔ ۵ شہادۃ الزور۔ ۶ قذفِ محصنات ۷ یمینِ غموس۔ ۸ سحر۔ ان چار کا تعلق زبان سے ہے۔ ۹ شرب خمر۔ ۱۰ اکل مالِ یتیم۔

ء۱۱ اکل مالِ ربوا۔ ان تین کا تعلّق بطن سے ہے۔ ء۱۲ زنا۔ ء۱۳ لواطت۔ ان دونوں کا تعلّق فرج سے ہے۔ ء۱۴ قتلِ ناحق۔ ء۱۵ سرقہ۔ ان دونوں کا تعلّق ہاتھ سے ہے۔ ء۱۶ فرار من الکفار یوم الزّحف اس کا تعلّق پاؤں سے ہے۔ ء۱۷ عقوقُ الوالدین۔ اس کا تعلّق پورے بدن سے ہے اور بعض نے ء۱۸ قتلِ اولاد۔ ء۱۹ قطع طریق۔ ء۲۰ خیانت در مالِ امانت جو ہاتھ سے متعلق ہے ان کا اضافہ کرکے ۲۰ شمار کیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ کل بدن انسانی جرائم کبائر میں شامل ہے۔

یقولُ ابُو الاِسْعَاد صَانَہُ اللہُ عَنِ الشرِّ والفسادِ : بندہ عاصی درخدمت ناظرین وفالحین عرض گذار ہے کہ چند باتیں جن کا تعلّق معصیات سے ہے پیش کرنا چاہتا ہے۔ اُمید ہے کہ بنظرِ تحسین دیکھی جائینگی اور جن کو عرائض ثلاثہ کے نام سے تعبیر کر رہا ہوں۔

عرض اوّل

یہ ہے کہ گناہ کرنے والے کی قلبی کیفیت کا بھی شریعت مُقدسہ میں اعتبار ہے مثلاً ایک گناہ اپنی ذات کے اعتبار سے کبیرہ ہوتا ہے لیکن کرنے والے کے دل میں ندامت و شرمساری کی کیفیت پائی جاتی ہے ہو سکتا ہے کہ اس کی قلبی کیفیت کی وجہ سے یہ کبیرہ اس کے حق میں کبیرہ نہ رہے۔ اسی طرح ایک گناہ صغیرہ ہے لیکن کرنے والے کے دل میں بے باکی اور لاپرواہی کی کیفیت ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی یہ قلبی کیفیت اس کے حق میں اس صغیرہ کو کبیرہ بنا دے۔ بقول شخصے ؎

اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا صَغُرَتْ ذُنُوْبُہٗ عِنْدَہٗ کَبُرَتْ عِنْدَ اللّٰہِ
وَاِذَا کَبُرَتْ عِنْدَہٗ صَغُرَتْ عِنْدَ اللّٰہِ

عرض دوم

اس میں کوئی شک نہیں کہ علمی تحقیق کے مطابق تفاوت آثار کے اعتبار سے کچھ گناہ صغیرہ ہیں اور کچھ کبیرہ ہیں لیکن عمل کے اعتبار سے دونوں قسموں سے گریز کرنے کا اہتمام ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ معصیت کو مثل آگ کے سمجھا جائے۔ آگ کی چنگاری بڑی ہو یا چھوٹی، کوئی شخص اس کو اپنے کپڑوں میں رکھنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ کوئی یہ جرأت نہیں کرتا کہ چونکہ یہ چنگاری چھوٹی ہے۔ اگر یہ کپڑوں میں صندوق میں پڑی بھی رہے تو کیا حرج ہے اس لیے کہ علم ہے کہ چھوٹی ہونے کے باوجود یہ آگ ہے۔ جلدی یا دیر سے اپنا اثر ضرور کرے گی۔ اسی طرح صغائر پر بھی جرأت نہ کرنا چاہیے، ان کے بارہ میں بے باک نہ ہونا چاہیئے۔

عرضِ سوم جیسے گناہوں کے بارے میں بے باک ہو جانا خطرناک ہے ایسے ہی مایوس ہو جانا بھی بہت خطرناک ہے اس سے بھی بچنا چاہیئے۔ کسی حدتک بھی گناہ پہنچ جائیں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا چاہیے۔ اگر بار بار توبہ کرکے توڑ چکا ہے تو بھی مایوس نہ ہونا چاہیے۔ مایوسی حق تعالیٰ کی اہانت اور بے ادبی ہے۔ گناہوں سے زمین و آسمان بھی بھر جائیں پھر بھی محدود ہی ہیں۔ جب کہ اس کے مقابل حق تعالیٰ کی رحمت اور مغفرت غیر محدود ہے بار بار توبہ کرکے ٹوٹنے سے شیطان اس کو مایوس کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ یہ توبہ سے دور رہے، اور اسی حالت میں مرجائے۔ اس لیے مایوسی بے باکی سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ حق تعالیٰ کے دربار پُرانوار سے ہر وقت صدائیں آتی ہیں۔

(۱) قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ○ (پ ۲۴ س الزُّمر)

(۲) نَبِّئْ عِبَادِي أَنِّي أَنَا الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ○ (پ ۱۴ س حِجر)

---

(۳) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَنْزِلُ رَبُّنَا عَزَّ وَجَلَّ كُلَّ لَيْلَةٍ إِلَى سَمَاءِ الدُّنْيَا حِينَ يَبْقَى ثُلُثُ اللَّيْلِ الْآخِرِ فَيَقُولُ مَنْ يَدْعُونِي فَأَسْتَجِيبَ لَهُ مَنْ يَسْأَلُنِي فَأُعْطِيَهُ مَنْ يَسْتَغْفِرُنِي فَأَغْفِرَ لَهُ :

(ابو داؤد شریف ج ۱ ص ۱۹۳ باب ای اللیل افضل)

قال الحافظ ؎

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ	گر کافر و گبر و بُت پرستی باز آ
ایں درگہ نا اُمیدی نیست	گر صد بار توبہ شکستی باز آ

بحث علامات النّفاق

نفاق نَفَقَ باب نَصَرَ اور باب سَمِعَ سے مأخوذ ہے۔ اردو میں اس کا معنیٰ ہے دورنگی۔ مگر لغت عرب میں نافقا کا معنیٰ ہے ضَبّ، در فارسی سوس مار، (در ہندی گوہ) کے سوراخ کو کہتے ہیں۔ وہ اپنے گھر میں دو سوراخ رکھتی ہے۔ ایک ظاہری ہوتا ہے اور یہی کھلا رہتا ہے۔ دوسرا سوراخ کسی اور جانب سے اس طرح بناتی ہے کہ نظر نہیں آتا اور دیکھنے میں زمین کے برابر معلوم ہوتا ہے۔ مگر سوراخ کے منہ پر مٹی کا بہت ہلکا سا پردہ ہوتا ہے جو معمولی ٹھوکر سے کھل جاتا ہے وہی چھپا ہوا سوراخ اسی وقت کام آتا ہے۔ جب کوئی شکاری اُسے پکڑنے آتا ہے اور ظاہری سوراخ پر ٹھہرتا ہے جب کہ یہ اس دوسرے خفیہ سوراخ سے نکل جاتی ہے اور شکاری کے ہاتھ نہیں لگتی۔ اس خفیہ سوراخ کا نام نافقا ہے۔ اور کھلا سوراخ جس سے آتی جاتی ہے اس کا نام قاصعًا ہے۔

خُلاصۃ الکلام: جس طرح یہ جانور شکاری کو عین وقت پر دھوکا دے جاتا ہے۔ منافق بھی اہم وقت پر مسلمانوں کو دھوکا دیتے رہتے ہیں۔ عند البعض نفاق کا لغوی معنیٰ چوہے کا سوراخ میں کبھی داخل ہونا اور کبھی خارج ہونا ہے۔ پھر بھی مناسبت ظاہر ہے کہ چوہا بھی پریشانی کے وقت کبھی داخل ہوتا ہے اور کبھی خارج۔ منافق کی بھی یہی حالت ہوتی ہے ہر وقت حیران و پریشان رہتا ہے (یَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ هُمُ الْعَدُوُّ)

نِفاق کا اصطلاحی معنیٰ

نفاق کا شرعی و اصطلاحی معنیٰ ہے ظاہر کا باطن کے خلاف ہونا! یہاں بھی مناسبت ظاہر ہے کہ ہمیشہ منافق کا ظاہر، باطن کا ساتھ نہیں دیتا۔ کمافی قولہ تعالیٰ " اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۔ (پ۲۸ المنافقون)

پھر نفاق دو قسم ہے۔ (۱) نفاق اعتقادی حقیقی (۲) نفاق عملی مجازی۔

نِفاق اِعتقادی حقیقی: یہ ہے کہ ظاہر میں اسلام ہو اور باطن میں کفر ہو، یعنی زبان سے

کسی مصلحت کے لیے کلمہ پڑھتا ہے لیکن اس کے دل میں توحید ورسالت کا عقیدہ ٹھیک نہیں ہے، یہ نفاق خالص کفر ہے۔ بلکہ اشد اقسام الکفر ہے۔ اسی لیے اعتقادی منافق کا ٹھکانا جہنم کے طبقہ سفلی میں ہوگا۔

نفاقِ عملی مجازی نفاق عملی یہ ہے کہ دل کا اعتقاد بالکل ٹھیک ہے اور زبان سے عمل کا اقرار بھی ہے۔ مگر ظاہر میں ترکِ عمل ہے یعنی عملی طور پر اس میں منافقین والی خصلتیں پائی جاتی ہیں۔ جیسا کہ حدیث پاک میں ہے :۔

اِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ وَاِذَا اُؤْتُمِنَ غَدَرَ اَوْخَانَ :

یہ نفاق کفر تو نہیں لیکن فسق ضرور ہے اس پر خلود فی النار کی سزا نہیں ملے گی، دخول فی النار کا خطرہ ہے۔

بعض مُخلص صحابہؓ کا اپنے آپ کو مُنافق سمجھنے کی حقیقت

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک آدمی کا اعتقاد بھی بالکل ٹھیک ہے اعمال بھی بالکل درست ہیں تقویٰ والی زندگی ہے پھر بھی اس کو کبھی کبھی اپنے آپ پر نفاق کا شبہ ہوجاتا ہے، اپنے آپ کو منافق سمجھنے لگ جاتا ہے۔ یہ بات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کو بھی پیش آتی رہی ہے۔

حالتِ مذکورہ کا منشاء اس حالت کا منشاء یہ ہوتا ہے کہ دل میں جو ایمانی کیفیات اور بہاریں تھیں ان میں کچھ کمی نظر آنے لگ گئی ہے اور اس کمی کو وہ نفاق سمجھتا ہے اور یہ شبہ کمالِ تقویٰ سے پیدا ہوتا ہے۔ سالک کی شان ہمیشہ یہ ہوتی ہے

؎ بر دلِ سالک ہزاراں غم بود —— گر زباغ دل خلالے کم شود

پھر جب اس کے دل میں وہی کیفیات عود کر آتی ہیں تو بڑی خوشی سے یہ کہتا ہے ؎

باز آمد آبِ من در جوئے من —— باز آمد یارِ من در کوئے من

مثال :۔ حدیثِ پاک میں ہے (مشکوٰۃ شریف ص۱۹۷ ج ا باب ذکر اللہ عزّ وجلّ والتقرّب الیہ کتاب الدعوات) حضرت حنظلہؓ سے حضرت ابوبکر صدیقؓ ملے تو پوچھا حنظلہ کیا حال ہے؟

حضرت حنظلہؓ نے فرمایا نافق حنظلہؓ : حنظلہ تو منافق ہوگیا۔ حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا کیا
کہہ رہے ہو؟ سوچ کر کہو! حضرت حنظلہؓ نے کہا کہ جب ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس
بیٹھے ہوتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے جنت اور دوزخ نگاہوں کے سامنے ہیں۔ اور جب
وہاں سے اٹھ کر بیوی بچوں کے پاس آجاتے ہیں تو دل کی وہ کیفیات نہیں رہتیں۔ حضرت ابو بکرؓ
نے کہا کہ یہی کیفیت تو میری بھی ہے۔ دونوں حضرات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دربارِ اقدس میں
پہنچے اور اپنی یہ حالت پیش کی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تسلی دی اور فرمایا کہ میرے
پاس بیٹھنے سے جو تمہاری حالت ہوتی ہے اگر ہمیشہ وہی رہے تو تمہارے بستروں اور راستوں
میں ملائکہ تمہارے ساتھ مصافحہ کرنے لگ جائیں۔ آخر میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد
فرمایا" وَلٰكِنْ یاحنظلۃؓ ساعۃً وساعۃً یعنی ہمیشہ یہی کیفیت رہنا مناسب نہیں۔ حکمت
اسی میں ہے کہ کوئی گھڑی کیسی ہو، کوئی کیسی۔

یقول ابوالاسعاد : مسلمان پر اور خصوصًا ذکر و شغل کرنے والے پر دو قسم کی کیفیات
پیدا ہوتی رہتی ہیں کبھی تو اعمال صالحہ میں خوب نشاط ہوتا ہے اور دل لگتا ہے۔ اس حالت کو
صوفیاء کی اصطلاح میں بسط (یعنی خوشی و فراخی) کہتے ہیں اور کبھی طبیعت میں گھٹن سی پیدا ہو جاتی
ہے اور ذکر وغیرہ میں وہ نشاط نہیں رہتا۔ اس حالت کو عندالصوفیہ قبض کہتے ہیں (یعنی بندش)
یہ گھٹن و انقباض بعض اوقات اتنا زیادہ ہو جاتا ہے کہ بندہ اپنے آپ کو مردود سمجھنے لگتا ہے۔
قبض و بسط میں سے کوئی حالت بھی مذموم نہیں ہے۔ دونوں حالتیں مقبولین پر آتی رہتی ہیں۔
دونوں میں فوائد و حکمتیں ہوتی ہیں۔ اعمال صالحہ یعنی ذکر وغیرہ کا ثواب دونوں حالتوں میں پورا ملتا
ہے بلکہ بعض دفعہ حالتِ قبض کا ثواب بڑھ بھی جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں مجاہدہ زیادہ کرنا پڑتا
ہے۔ اور قبض کی حالت میں گھبرانا نہیں چاہیے۔ بلکہ دونوں حالتوں میں حق تعالیٰ پر راضی رہنا
چاہیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حنظلہؓ کو فرمایا" لکن یا حنظلۃؓ ساعۃً وساعۃً
اس کا بھی یہی مطلب ہے کہ نہ تو ہر وقت بسط رہنا مناسب ہے اور نہ ہی ہر وقت قبض بلکہ حکمت
اسی میں ہے کہ کبھی بسط ہو اور کبھی قبض۔ بسط کو نورِ نہار سمجھو، اور قبض کو ظلمتِ شب۔ نہ ہمیشہ دن
اچھا لگتا ہے اور نہ ہی ہمیشہ تاریکی اچھی ہوتی ہے بلکہ دونوں کا یکے بعد دیگرے آتے رہنا ہی

مُناسب ہے۔ قرآن مُقدس میں وَالضُّحٰی وَاللَّیْلِ اِذَا سَجٰی میں ضُحٰی اور لَیل کی قسم کھانے سے مقصود بھی وحی کو دن کی روشنی اور فترتِ وحی (زمانہ انقطاع) کو رات کی تاریکی سے تشبیہ دے کر یہی نکتہ سمجھانا ہے" اللّٰھم الفعنا بہ للمسلمین۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

یہ پہلی فصل ہے۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ قَالَ رَجُلٌ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ اَیُّ الذَّنْبِ اَکْبَرُ عِنْدَ اللّٰہِ قَالَ اَنْ تَدْعُوْا لِلّٰہِ نِدًّا وَّھُوَ خَلَقَکَ

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بڑا گناہ کون سا ہے۔ آپ نے فرمایا خدا کے ساتھ کسی کو شریک بنانا ہے۔ حالانکہ اس نے تجھے پیدا کیا ہے۔

قولہٗ نِدًّا ۔ بِالکسرِ وَالنَّدِیرِ مِثْلُ الشَّیْئُ الَّذِیْ یُضَادُّہٗ وَیُنَاوِیْہِ فِی اُمُوْرِہٖ ۔ اور تَدْعُوْا مُتضمّن ہے معنیٰ جَعَلَ کو ای یَجْعَلُوْنَ لِلّٰہِ نِدًّا شریک ٹھیرانے کا مطلب ذات وصفات اور عبادت میں کسی کو اللہ تعالیٰ کا ہمسر وہمتا بنانا ہے۔ مثلاً عبادت وبندگی کے جو طریقے اور جو افعال صرف ذات باری تعالیٰ کی عبادت کے لیے مخصوص ہیں وہ طریقے اور افعال اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے لیے بھی اختیار کرنا ۔ جس طرح اللہ تعالیٰ حاجتوں کو پورا کرنے والا ہے۔ اسی طرح کسی اور کو بھی حاجت روا مان کر یوں فریاد رسی کرنا کہ اے فلاں میری یہ حاجت پوری کر، میری مدد کر وغیرہ وغیرہ۔

قولہٗ اَنْ تَقْتُلَ وَلَدَکَ خَشْیَۃَ اَنْ یَّطْعَمَ مَعَکَ (ترجمہ) تم اپنی اولاد کو محض اس خیال سے مار ڈالو کہ کھانے میں تمہارے ساتھ شریک ہوجائیں گی۔

مُطلقًا نسمہ کا قتل کرنا گناہ کبیرہ ہے۔ مگر اولاد کا ذکر خصوصیّت کے ساتھ اس بناء پر ہے

کہ اس میں چار گناہ پائے جاتے ہیں (۱) قتل (۲) قطع رحمی (۳) قساوت قلب (۴) فقر و فاقہ کا اندیشہ جو رزاقیت باری تعالیٰ پر عدمِ ایمان کو ثابت کرتا ہے۔

قتل اولاد کی اقسام

یقول ابوالاسعاد : قتلِ اولاد کی چند صورتیں ہیں :۔

اوّل :۔ برائے خوف انفاق : کما فی قولہٖ تعالیٰ " وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ (پ۱۵ بنی اسرائیل)

دوم : برائے معبودانِ باطلہ : جس طرح مشرکین جانوروں کو آستانہ پر ذبح کرتے اسی طرح بچوں کو بھی ذبح کرتے تھے۔ کما فی قولہٖ تعالیٰ " وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَاۗؤُهُمْ (پ ۸ س انفال)

سوم :۔ اولاد کو ایسی تعلیم یا پیشہ سکھلایا جائے جس سے وہ دین اور اسلام سے دور ہو جائے یا اس کے دل کے اندر دین و اسلام کی محبت ختم ہو جائے اور اللہ والوں سے دور ہو جائے۔ یہ بھی قتلِ اولاد میں داخل ہے۔ کما فی زمننا۔ مقام ہذا پر قتال کی قسمِ اوّل مراد ہے یعنی خشیۃ املاق۔

سوال :۔ حدیثِ پاک میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قتال اولاد کے ساتھ خَشْيَةَ اَنْ يَطْعَمَ مَعَكَ کی قید کیوں لگائی۔ کیونکہ قتالِ اولاد تو ہر وقت ممنوع اور غیر شرعی فعل ہے۔

جواب :۔ یہ قید احترازی نہیں بلکہ اتفاقی ہے جو زیادت قباحت کے لیے ہے۔ یعنی قتل کرنا مطلقاً حرام اور گناہ کبیرہ ہے۔ لیکن اپنی اولاد کو محض انفاق کے ڈر سے قتل کرنا اکبر الذنوب میں سے ہے۔

قولہ اَنْ تُزَانِيَ حَلِيْلَةَ جَارِكَ (ترجمہ) ہمسائے کی بیوی سے زنا کرنا۔

حَلِيْلَة حلول سے مشتق ہے بمعنیٰ دخیلہ یہاں مراد بیوی ہے۔ کیونکہ بیوی شوہر کے اکثر معاملات میں دخیل ہوتی ہے یا حَلِيْلَة حلال سے مشتق ہے بایں معنیٰ کہ بیوی کے تمام جسم پر تصرف کرنا شوہر کے لیے حلال ہے۔ زنا مطلقاً گناہ کبیرہ ہے لیکن پڑوسی کی بیوی سے زنا کرنا اور بھی

قبیح ہے کیونکہ اس میں دو قباحتیں جمع ہو جاتی ہیں (۱) حقِ جوار کا ضیاع (۲) اور امانت داری میں خیانت کیونکہ ایک پڑوسی دوسرے پڑوسی پر پورا اعتماد کرتا ہے اور اس کو اپنی جان ومال اور عزت کے حق میں امین سمجھتا ہے۔ تو جب اس نے اس کی بیوی سے زنا کیا تو اس نے حق جوار ادا نہ کیا، اور امانت داری میں خیانت کی بناء پر حلیلۂ جار کو خاص کر کے بیان کیا۔

قولہ فَأَنْزَلَ اللّٰہُ تَصْدِیْقَھَا (ترجمہ) تب اللہ تعالیٰ نے اس کی تصدیق میں یہ آیت اتاری۔

سوال یہ ہے کہ مُصدِّق تصدیق اس کی کرتا ہے جو مُصدَّق کے موافق وبرابر ہو۔ جب کہ یہاں معاملہ برعکس ہے کیوں کہ یہاں حدیث (یعنی مصدَّق) خاص ہے کہ زنا اور وہ بھی جار کی بیوی کے ساتھ۔ اسی طرح قتل اور وہ بھی خوف رزق کی وجہ سے۔ جب کہ آیت مبارکہ (یعنی مصدِّق) عام ہے کہ وَلَا یَزْنُوْنَ اس میں زنا عام ہے خواہ جار کی بیوی ہو یا غیر جار کی بیوی۔

جواب تفصیلاً قَدْ مَرَّ۔ مختصراً عرض ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد تخصیص کرنا نہیں حلیلہ جار کے ساتھ بلکہ مقصد زیادت قباحت وزیادت تشنیع بیان کرنا ہے کہ یہ بات کتنی قبیح ہے کہ قتلِ اولاد ہو لیکن وہ بھی رزق کی خاطر، اور زنا ہو وہ بھی ہمسائے کی بیوی کے ساتھ۔

اسمائے رجال

حالات حضرت عبداللہ بن مسعودؓ آپ کی کنیت ابو عبدالرحمٰن ہُذلی ہے۔ قدیم الاسلام ہیں، ذو ہجرتین ہیں۔ نیز ذو قبلتین بھی ہیں۔ کیونکہ ہجرت سے قبل ونیز ۱۶ ؁ یا ۱۷ ماہ بعد الھجرت بھی مسلمانوں کا قبلہ بیت المقدس تھا آپ غزوہ بدر اور اس کے بعد کے تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ حضور علیہ السلام کے راز دار ومقرب صحابی ہیں۔ سفر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مسواک، پاپوش مبارک، اور وضو کا پانی آپ ہی اٹھاتے تھے۔ اس لیے آپ

وَعَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْکَبَائِرُ اَلْاِشْرَاکُ بِاللّٰہِ وَعُقُوْقُ الْوَالِدَیْنِ :

ترجمہ : حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گناہوں کے سلسلہ میں فرمایا خدا کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا اور ماں باپ کی نافرمانی کرنا

قولہٗ اَلْاِشْرَاکُ بِاللّٰہِ : شرک کی دو قسمیں ہیں :۔
اوّل شرکِ اکبر : یہ کہ اللہ کی ذات وصفات وعبادت میں کسی کو شریک کرنا۔ یہ بغیر توبہ کے معاف نہیں ہوگا بلکہ تجدیدِ ایمان کی ضرورت ہوگی۔
دوم شرکِ اصغر : جسے شرک خفی بھی کہہ سکتے ہیں جیسے عبادت میں ریاء کاری کرنا یا شرک فی التسمیہ یعنی حلف لغیر اللہ یہ بلا توبہ اور نیک اعمال سے معاف ہوجاتا ہے۔ بحث یہ ہے کہ حدیث پاک میں اَلْاِشْرَاکُ بِاللّٰہِ سے کونسا شرک مراد ہے۔ عند البعض یہاں شرک سے کفر باللہ مراد ہے کیونکہ اس کو اَکْبَرُ الْکَبَائِرُ کہا گیا ہے۔ اور مطلق شرک کفر سے اکبر نہیں ہے مگر اہل عرب میں شرک کے بکثرت موجود ہونے کی بناء پر خاص کرکے اس کو ذکر کیا گیا، اور بعض کے نزدیک شرک سے مطلق شرک ہی مُراد ہے۔ وَالرَّاجِحُ هُوَ الْاَوَّلُ۔
قولہٗ وَعُقُوْقُ الْوَالِدَیْنِ : عُقُوْق مشتق ہے عَقٌ سے باب نصر سے اس کے لغوی معنیٰ ہیں قطع کرنا اور پھاڑنا۔ لیکن یہاں عقوق سے مراد یہ ہے کہ غیر معصیت

صاحب السواد والسواک کے لقب سے مشہور ہیں، عادات وفضائل میں حضور علیہ السلام کے مشابہ تھے۔ آنحضرتؐ نے آپ کے لیے چار چیزوں کے متعلق دعاء فرمائی تھی ۱۔ قرآن ۲۔ حدیث ۳۔ فقہ ۴۔ سیادت وامارت۔ آپؓ نے لوگوں سے فرمایا کہ تم یہ چار علوم ان سے حاصل کرو۔ آپ مذہب حنفی کے اصل الاصول ہیں۔ مدینہ طیبہ میں بعمر ۶۳ سال ۳۲ھ میں وفات پائی۔ حضرت عثمان غنیؓ نے نماز جنازہ پڑھائی اور جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔ حضرت ابن مسعودؓ کی کل مرویات ۸۴۸ ہیں۔ آپ سے خلفاء اربعہ نیز دیگر صحابہؓ اور تابعینؒ نے روایت حدیث کی ہے۔

ہیں والدین یا ان میں سے کسی ایک کے حکم کی مخالفت کرے یا ان کو کوئی ایسی تکلیف پہنچائے جو عرفاً وعادۃً والدین اپنی اولاد سے گوارا نہ کرتے ہوں لیکن کفر سے نکالنے کے لیے ایذار پہنچانا جائز ہے۔

یقول ابوالاسعاد : یہاں دو فائدے قابلِ سماعت ہیں :۔

۱۔ اجداد وجدات وعم بھی والدین کے حکم میں ہیں یعنی تعظیم وعدمِ ایذار رسانی میں یہ افراد بھی داخل ہیں۔

۲۔ والدین کو تکلیف نہ پہنچانا واجب ہے اور اسی طرح ان کی مالی وجانی خدمت کرنا جب کہ والدین خدمت کے محتاج ہوں۔ نیز اولاد خدمت گذاری پر قادر بھی ہو۔ لیکن والدین کے کہنے پر معصیت کا ارتکاب یعنی فرائض وواجبات کا ترک کرنا جائز نہیں کما فی قولہ تعالیٰ " وَاِنْ جَاهَدَاكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِىْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا :

کما فی قولہ علیہ السلام لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِىْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ : البتہ مستحبات کا چھوڑنا جائز ہے، اور سنن مؤکدہ مثلاً جماعت اور صومِ عرفہ وغیرہ کا ایک آدھ دفعہ چھوڑ دینا بھی جائز ہے۔

سوال : اس کی کیا وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اشراک باللہ کے بعد متصلاً عقوق والدین کو ذکر فرمایا۔ حالانکہ اور بھی بہت سارے گناہ ہیں۔ مثلاً قتلِ ناحق سب وشتم وغیرہ۔

جواب باصواب یقول ابوالاسعاد صانہ اللہ عن الشر والفساد : مختصراً عرض ہے کہ اللہ تعالیٰ کو جیسے ایجاد میں دخل ہے اسی طرح والدین کو بھی ایجادِ بندہ میں دخل ہے۔ اگرچہ دونوں میں فرق ہے کہ اللہ تعالیٰ سبب حقیقی ہیں جبکہ والدین سبب ظاہری ہیں تو سببیت میں اشتراکیت کی بنار پر اشراک باللہ کے بعد ہی کبائر میں عقوق الوالدین کو دوسرے مرتبہ پر رکھا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مقدس میں جہاں بھی اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا ذکر کیا گیا تو وہاں ساتھ ساتھ اطاعت والدین کو بھی ذکر کیا گیا :۔

(۱) وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ط (پ۵ نساء)

(۲) وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ط (پ۱۵ اسرائیل)

(۳) وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (پ۱ البقرہ)

وَالدین کے حکم کے تحت بیوی کو طلاق دینے کی حیثیت

علماء حضرات نے بحث کی ہے کہ اگر والدین بیوی کو طلاق دینے کا حکم دیں تو آیا ان کی اطاعت کرنا واجب ہے یا نہیں اس میں دو آراء ہیں :-

اوّل یہ کہ ایسی صورت میں طلاق دینا ضروری ہے ۔

دوّم یہ کہ اس بات میں ان کی اطاعت ضروری نہیں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ والدین غصّہ اور جذبات سے متأثر ہو کر ایسا حکم دیدیں اور بیٹا عمل کر بیٹھے ۔ لیکن بعد میں اس کے نتائج برداشت کرنے کا تحمل نہ ہو ۔ اس لیے ایسی صورت میں طلاق دینا ضروری نہیں ۔ بلکہ خود اپنے حالات کا جائزہ لے کر دیکھ لینا چاہیئے کہ طلاق دینا مناسب ہے یا نہیں ۔ مزید بحث مع دلائل طلاق کے باب میں آئے گی ۔

قولہٗ وَالیَمِینُ الغَمُوسُ ۔ یمین کی تین قسمیں ہیں ۱۔ یمین لغو ۲۔ یمین منعقدہ ۳۔ یمین غموس ۔

یمین لَغو یمین لغو یہ ہے کہ ماضی کے کسی امر پر خلافِ واقعہ قسم کھائے یہ سمجھ کر کہ میں درست کہ رہا ہوں ۔ اس پر نہ کفارہ ہے اور نہ ہی گناہ ! کما فی قولہٖ تعالیٰ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيٓ اَيْمَانِكُمْ ، امام شافعیؒ کے نزدیک لغو سے مراد وہ قسم ہے جو بلا قصد منہ سے نکل جائے خواہ ماضی کے کسی واقعہ پر ہو یا مستقبل کے واقعہ پر ہو ۔

یمین مُنعَقدہ یمین منعقدہ مستقبل میں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی قسم کھانے کو کہتے ہیں ۔ اس میں حانث ہونے کی صورت میں بالاتفاق کفارہ ہے ۔

یمین غمُوس یمین غموس یہ ہے کہ کسی گذشتہ جھوٹی بات پر عمداً قسم اٹھائے ۔ مثلاً واللہ میں نے یہ کام نہیں کیا ، اور واقع میں وہ کام کیا تھا عند البعض یمین غموس کے معنیٰ ہیں کسی دوسرے سے مال لینے کے لیے جھوٹی قسم کھانا ، احنافؒ کے نزدیک اس میں فقط گناہ ہے ۔ اور شوافعؒ کے نزدیک کفارہ بھی ہے ۔

غموس کی وجہ تسمیہ ــــــ غموس کے لغوی معنیٰ ہیں غوطہ دینے والی۔ تو یہ قسم بھی اپنے فاعل کو اوّل گناہ میں اور پھر دوزخ میں غوطہ دیتی ہے۔

قولہٗ وفی روایۃ انسؓ ـ فی روایۃ انسؓ خبر مقدم اور شہادۃ الزور مبتداء مؤخر۔ بدل معنیٰ مکان منصوب بوجہ ظرفیت اور یمین الغموس پر دو اعراب پڑھنے جائز ہیں۔

۱۔ رفع اَلْیَمِیْنُ الْغَمُوْسُ اعراب حکائی ہے۔ ۲۔ جر اَلْیَمِیْنِ الْغَمُوْسِ مضاف الیہ بنا کر۔

سوال: اختلافِ روایت کیوں ہے ؟

جواب اوّل : دونوں روایتیں جدا جدا ہیں یعنی حضرت عمرؓ کی روایت اور ہے اور حضرت انسؓ کی روایت اور ہے۔

جواب دوم : اختلافِ روایت بوجہ اختلاف مجلسین کے ہے کہ جس مجلس میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ تھے وہاں الیَمِین الغموس ارشاد فرمایا، اور جس میں حضرت انسؓ تھے۔ وہاں شَہَادَۃُ الزّور ارشاد فرمایا۔

وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِجْتَنِبُوا السَّبْعَ الْمُوْبِقَاتِ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا هُنَّ قَالَ اَلشِّرْكُ بِاللّٰهِ وَالسِّحْرُ

ترجمہ : حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سات ہلاک کرنے والی چیزوں سے بچو! پوچھا گیا یا رسول اللہ وہ کون سی ہیں فرمایا خدا کے ساتھ شریک کرنا، اور سحر وجادو کرنا۔

فائدہ ـ پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اجمالاً موبقات کو بیان فرمایا بعدہٗ تفصیل بیان فرمائی۔ تاکہ اوقع فی الذھن والنفس ہو۔ کیونکہ اوّلاً اجمال بعدہٗ تفصیل۔ تو بات جلدی سمجھ میں آجاتی ہے۔

سوال ـــ اُمور مذکورہ کو موبقات کیوں فرمایا ؟

جواب ـــ مُوبِقات باین وجہ ہے کہ ان امور مذکورہ سے اولاً روحانیت ختم ہوجاتی ہے ۔ پھر آہستہ آہستہ جسمانیت کے بھی ہلاک ہونے کا قوی خطرہ ہوتا ہے ۔

سِحر کے بارہ میں مختصر بحث

یقول ابوالاسعاد ـــ اس حدیث پاک میں سات ہلاک کرنے والی چیزوں میں سے سحر کو بھی شمار کیا گیا ہے ۔ لہٰذا اس بحث کو امور خمسہ پر تقسیم کیا جارہا ہے ۔

امر اوّل سِحر کی تعریف محدثینؒ حضرات نے سحر کی مختلف تعریفیں کی ہیں ۔ مگر یہ احقر افقر صرف دو پر اکتفا کررہا ہے جو میرے نزدیک جامع مانع ہونے کے ساتھ جمیع تعریفات کو محیط ہیں ۔

تعریف اوّل سحر کی تعریف یہ ہے کہ اسباب خفیہ کے ذریعہ ایسے امور کو اپنے قابو میں لے آنا جو خارق للعادات ہوں اور اس کی نسبت خدا کی ذات یا صفات کی طرف نہ کی جائے ۔

تعریف دوم شرعی اصطلاح میں سحر اس کو کہتے ہیں کہ جس میں شیطان کو خوش کرکے اس سے مدد حاصل کی جائے جس طرح فرشتے تقویٰ طہارت پاکیزگی اعمال صالحہ ، ذکر اللہ سے خوش ہوتے ہیں ان کی اعانت انہی ذرائع سے حاصل کی جاسکتی ہے اسی طرح شیاطین کلماتِ کفر وشرک کواکب ونجوم کی پرستش خونِ ناحق نجاست وناپاکی سے خوش ہوتے ہیں ان کی امداد ان ذرائع سے حاصل کی جاتی ہے ۔

امر دوم اقسام سِحر سحر کی بہت سی قسمیں ہیں :-

اوّل ـــ بعض اوقات ارواحِ شیاطین یا کسی بہادر آدمی کی روح کو مسخر کرلیا جاتا ہے اور اس کے ذریعہ ایسے امور کو اپنے قابو میں کرلیا جاتا ہے جو دوسروں کے لیے مشکل ہوتے ہیں اور ان ارواح کی ایسی تعظیم کی جاتی ہے جس طرح خدا کی تعظیم کی جاتی ہے ۔

تو یہ سحر بالاتفاق کفر ہے۔

دوم: اپنی قوت حاکمہ کو یکسو کر لیا جاتا ہے کہ ہمیشہ ایک طرف دھیان ہو۔ اس کی اہم شرط یہ ہے۔ قلتِ طعام۔ قلتِ منام۔ قلتِ کلام۔ تو اس میں اگر اسلام کے خلاف کفر کی تائید مقصود ہو تو یہ کفر ہے۔ اور اگر اسلام کی تائید مقصود ہے تو جائز بلکہ ثواب کی امید ہے اور اگر کچھ مقصود نہ ہو صرف جادو سے اپنی حفاظت کرنا مقصود ہے تو مُباح ہے۔

سوم: سحر کی تیسری قسم یہ ہے کہ کسی چیز کی حقیقت ہی تبدیل ہو جائے انسان کو جانور یا پتھر بنا دیا جائے۔ امام راغبؒ اور ابوبکر جصاصؒ وغیرہ علماء سحر کی وجہ سے حقیقت کی تبدیلی نہیں مانتے۔ معتزلہ کی رائے بھی یہی ہے ان کے نزدیک یہ سب فریب نظر اور خیال بندی ہے کما فی قولہٖ تعالیٰ فِی قصّۃِ سیّدنا موسیٰ علیہ السّلام یُخَیَّلُ اِلَیۡہِ مِنۡ سِحۡرِهِمۡ اَنَّهَا تَسۡعٰی۔ (پ۱۶ طٰہٰ)

امر سوم سحر میں صرف خیال بندی ہے یا تغیر نفس الامر ہے

اس بات پر تو اتفاق ہے کہ جادو کا اثر ہو سکتا ہے اس میں علماء نے بحث کی ہے کہ سحر میں صرف خیال بندی ہوتی ہے یا نفس الامر میں بھی کوئی تغیرُ ہوتا ہے۔ اس میں دو قول ہیں:

قول اوّل

شافعیہؒ میں سے ابوجعفر استرآبادی، حنفیہؒ میں سے ابوبکر رازیؒ، اصحاب ظواہر میں سے ابن حزمؒ اور چند علماء کا قول یہ ہے کہ جادو سے کسی چیز میں انقلاب نہیں آتا یہ محض تخیّل اور نظر بندی ہوتی ہے۔

دلیل

وہ دلیل پیش کرتے ہیں ساحرین فرعون کے سحر سے کہ اس بارہ میں قرآن کریم اعلان کرتا ہے: قولہٗ تعالیٰ "فَاِذَا حِبَالُهُمۡ وَعِصِيُّهُمۡ يُخَيَّلُ اِلَيۡهِ مِنۡ سِحۡرِهِمۡ اَنَّهَا تَسۡعٰى" کہ لاٹھیاں اور رسیاں حقیقۃً سانپ نہیں بنی تھیں بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے خیال میں سانپ کی شکل ڈال دی گئی۔ لہٰذا یہ خیال امر ہوا حقیقت نہیں ہے۔

قولِ دوّم — جمہور علماء کی رائے یہ ہے کہ بعض جادو سے سچ مچ انقلاب بھی ہو جاتا ہے مثلاً تندرست بیمار ہو گیا۔ جمہور نے حضرت کعبؓ (یعنی عبداللہ بن سلام) کی اس روایت سے اس دعاء پر استدلال کیا ہے "لولا کلمات اقولهن لجعلتني اليهود حمارًا" یعنی اگر میں ان کلمات کا ورد نہ رکھتا تو مجھے یہود گدھا بنا دیتے۔ وہ دعاء یہ ہے:۔

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ الَّذِيْ لَيْسَ بِشَيْئٍ اَعْظَمُ مِنْهُ وَبِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ الَّتِيْ لَا يُجَاوِزُهُنَّ بَرٌّ وَلَا فَاجِرٌ وَبِاَسْمَاءِ اللّٰهِ الْحُسْنٰى كُلِّهَا مَا عَلِمْتُ مِنْهَا وَمَا لَمْ اَعْلَمْ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ وَبَرَاَ وَذَرَاَ

ترجمہ: میں اللہ عظیم کی پناہ مانگتا ہوں جس سے کوئی بڑا نہیں۔ اور اللہ کے کلماتِ تامہ کے ذریعہ جن سے کوئی نیک و بد انسان آگے نہیں جا سکتا، اور پناہ مانگتا ہوں اسماءِ حسنیٰ کے ذریعہ خواہ میں ان کو جانتا ہوں یا نہیں جانتا ہوں۔ اللہ کی مخلوق کے شر سے، اور جس کو وجود دیا اور پھیلایا۔

پس حضرت کعبؓ کے گدھا کہنے کا مطلب حقیقی معنیٰ کے لحاظ سے یہی ہوگا کہ انسان واقعی گدھا بن جائے۔ اگرچہ حمار کہنے میں مجازی معنیٰ بھی مراد ہو سکتے ہیں جو بیوقوفی سے کنایہ ہے۔

دلیلِ دوّم — بعض صحیح روایات میں اِنَّ السِّحْرَ لَحَقٌّ کے الفاظ آئے ہیں۔

معتزلہ کے مستدل کا جواب معتزلہ حضرات وغیرہ نے جو آیت پیش کی وہ جادو کی ایک قسم کا بیان ہے، مطلق سحر کا بیان نہیں ہے جب کہ کلام مطلقاً سحر کے متعلق ہو رہی ہے۔

امرِ چہارم — سحر کا حکم سحر کبیرہ گناہوں میں سے ہے بعض حضرات نے اس کو کفر بھی قرار دیا ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ اگر حلال سمجھ کر نہیں کرتا تو حرام ہے، اور اگر حلال سمجھ کر کرتا ہے تو کفر ہے۔

یقول ابو الاسعاد — ظاہراً سحر و معجزہ و کرامت کے خارق للعادت ہونے میں اشتراک ہے۔ ان میں ما بہ الامتیاز کیا ہے تو چند اعتبار سے معجزہ، کرامت اور سحر میں فرق کیا گیا ہے۔

اَمرِ پنجم ـــــ سحر اور معجزہ کے مابین فرق

ان میں مختلف فرق بیان کیے گئے ہیں ـــــ

فرق اوّل سحر ایک ایسا فن ہے جس کی روزمرّہ تعلیم وتعلّم ہوتا ہے۔ اس پر بہت سی کتابیں تصنیف کی گئی ہیں جو بھی اس کی تعلیم حاصل کرے گا اظہارِ سحر میں کامیاب ہوگا۔ لیکن معجزہ ایک فعل خداوندی ہے جو نبیؐ کے ہاتھ سے ظاہر ہوتا ہے وہ کسی ضابطہ اور قاعدہ کے تحت داخل نہیں وہ جب چاہے اسی کے ذریعہ معجزہ کو وجود میں لائے۔

فرق دوّم صاحبِ معجزہ قبل از ظہورِ معجزہ اس کی کیفیت وتفصیل سے ناآشنا رہتا ہے، لیکن ساحر سحر کی کیفیّات وتفصیلات کو حاوی ہوتا ہے۔

فرق سوّم ساحر کے سحر کا مقابلہ دوسرا ساحر پیش کر سکتا ہے۔ لیکن معجزہ کا مقابلہ قیامت تک نہیں ہو سکتا۔

کرامت اور معجزہ کا فرق

فرق اوّل کسی غیر نبی کے ہاتھ پر اتباع نبی کی برکت سے جو خارقِ عادات اور افعال عجیبہ نمودار ہوتے ہیں اس کا نام کرامت ہے۔ جب کہ معجزہ میں کسی کی اتباع کی ضرورت نہیں ہوتی سوائے وحی کے۔

فرق دوّم معجزہ میں تحدّی (یعنی چیلنج) کی دعوت ہوتی ہے جب کہ کرامت میں یہ نہیں ہوتا۔

اَلحَاصِل ـــــ پھر ان تینوں میں ایک عام فرق یہ ہے کہ جس شخص سے افعالِ عجیبہ اور خارق للعادات امر ظاہر ہوں اور وہ اگر متبع شریعت نہ ہو تو یہ سحر اور استدراج ہے۔ اور اگر وہ شخص مُتّبع شریعت ہے اور ساتھ ساتھ نبوّت کا دعویٰ بھی کرتا ہے تو وہ امر معجزہ ہے۔ اگر نبوّت

کا دعوی نہ ہو تو کرامت ہے۔

مختصر اور اختتامی ضابطہ

خلاصہ یہ ہے کہ تعویذ گنڈے، وظیفہ عزیمت، جادو میں پہلے الفاظ کو دیکھا جائے اگر کفریہ الفاظ ہیں خبیث ارواح، شیاطین وجنات، دیوی یا دیوتاؤں، ستاروں اور فرشتوں سے مدد حاصل کی جارہی ہے تو حرام اور کفر ہے۔ چاہے غرض صحیح ہو یا غلط۔ لیکن اگر کلمات صحیح ہوں تو پھر دوسرے نمبر پر غرض اور مقصد کو دیکھا جائے گا۔ وہ بھی اگر صحیح ہے تو یہ سب چیزیں جائز ہونگی، ورنہ نقصان پہنچانے کی نیت سے کی جائینگی تو ناجائز ہوں گی۔ تیسرے نمبر پر اگر الفاظ نامعلوم المعنٰی ہوں تو چونکہ اس میں کفری معنٰی کا احتمال ہے۔ اس لیے ایسے وظیفہ وغیرہ سے بچنا بھی ضروری ہے۔

فَاِنْ يَكُ صَوَابًا فَمِنَ اللهِ وَاِنْ يَكُ خَطَأً فَمِنِّيْ وَمِنَ الشَّيْطَانِ وَاللهُ وَرَسُوْلُهُ بَرِيْئَانِ :— رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○ وَاغْفِرْلَنَا مَا وَقَعَ مِنَ الْخَطَاءِ وَالزَّلَلِ وَمَا لَا تَرْضٰى بِهٖ مِنَ الْعَمَلِ — اٰمِيْن

وقد فرغتُ من هٰذا البحثِ فی یومِ الجمعۃ بوقتِ الضُّحیٰ

۱۹ جمادی اولیٰ — ۱۴۲۲ھ

۱۰ اگست — ۲۰۰۱ء

قولہ وَاَكْلُ الرِّبٰوا — ای استعمالہ یعنی ذکرِ اکل مراد استعمال ہے۔ خواہ لینا ہو تب بھی ناجائز ہے، دینا ہو تو تب بھی ناجائز۔ کیونکہ بعض اشیاء ایسی بھی ہیں جن کا تعلق اکل کے ساتھ نہیں مثلاً لباس وغیرہ۔

قولہ وَاَكْلُ مَالِ الْيَتِيْمِ — بلوغ سے قبل جس کا والد فوت ہو جائے۔ بلوغ

کی قید اس لیے لگائی کہ لَا یُتْمَ بَعْدَ الْبُلُوْغِ اگر ماں مر جائے تو یتیم نہ ہوگا۔

قولہٗ وَالتَّوَلِّیْ یَوْمَ الزَّحْفِ — التّولی ای الادبار للفرار یعنی بھاگنا الزَّحْف اس کے دو معنیٰ ہیں:۔

۱۔ اَلزَّحْفُ : ای الصّف الاوّل کیونکہ صف اوّل مرکزی مقام ہوتا ہے۔ اس سے بھاگنے میں کئی قباحتیں ہیں۔ ایک تو تفریقِ جماعت کہ اس کو دیکھ کر اور لوگ بھی فرار ہونے میں کوشش کرینگے۔ دشمنوں کے سامنے مسلمانوں کی کمزوری ظاہر ہوگی وغیرہ۔ اس لیے اس بارے میں سخت وعید فرمائی۔

۲۔ اَلزَّحْفُ : بمعنیٰ بڑا لشکر جو دشمن کی طرف چلے اور یہ زَحْفُ الصَّبِیِّ سے مأخوذ ہے یعنی بچے کا سُرین کے بَل گھسٹنا چونکہ بڑا لشکر بھی بہت آہستہ آہستہ گھِسٹتا ہوا چلتا ہے۔ مبالغۃً اس پر مصدر کا اطلاق کیا گیا۔ یہاں مراد جنگ ہے۔

حَاصِل جُمْلَہ : حدیث پاک میں دشمن کے مقابلے میں راہِ فرار اختیار کرنے کو ہلاکت کا موجب بتلایا گیا ہے۔ اس لیے کہ جس شخص نے اتنی بزدلی دکھائی کہ عین اس موقع پر جب کہ اس کو ایمانی شجاعت ودلیری کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا۔ دشمن کو پیٹھ دکھا کر بھاگ کھڑا ہوا اور یہ مذموم حرکت اصالۃً اہلِ اسلام کی رسوائی کا سبب بنی۔

مسئلہ جہاں تک مسئلہ کا تعلق ہے تو اس میں حکم یہ ہے کہ اگر ایک مسلمان کے مقابلہ میں دو یا دو سے کم کافر ہوں تو ان کے مقابلہ میں راہِ فرار اختیار کرنا گناہ کبیرہ ہے۔ ہاں اگر مقابلہ میں دو سے زیادہ تعداد ہو تو پھر بھاگنا حرام نہیں بلکہ جائز ہے مگر اس میں بھی اولیٰ اور بہتر یہی ہے کہ وہ اس صورت میں پیٹھ نہ دکھلائے۔ بلکہ مقابلہ کرے یا غازی ہو یا شہید۔ کما فی زمننا فلسطین و عزرائیل۔

قولہٗ وَقَذْفُ الْمُحْصَنَاتِ — (ترجمہ) اور تہمت لگانا پاک دامن ایماندار عورتوں پر جو زنا سے غافل ہیں) شریعت کے اندر محصن مرد کا بھی یہی حکم ہے۔ عورت کی تخصیص عادت اور آیت کی وجہ سے ہے۔ اس میں المؤمنات کی قید احترازی ہے یعنی اگر غیر مؤمنات پر تہمت لگائی جائے تو گناہ کبیرہ نہیں ہے غَافِلَات کی قید اتفاقی ہے۔

اس کا معنیٰ ہے بے خبراز زنا و تابعاتِ آں ۔ یعنی عشقیہ باتیں ۔

وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا یَزْنِی الزَّانِیْ حِیْنَ یَزْنِیْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ :

ترجمہ : حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ ایسا نہیں ہوتا کہ زانی زنا کرنے کی حالت میں مؤمن ہو۔

سوال

بظاہر اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ زنا چوری وغیرہ کبائر مخرج عن الایمان ہیں جس سے معتزلہ و خوارج کی تائید ہو رہی ہے جو مرتکب کبائر کو خارج عن الایمان قرار دیتے ہیں اور ساتھ ساتھ ظاہرًا اہل السنۃ والجماعۃ کی مخالفت بھی ہو رہی ہے کیونکہ ان کے نزدیک مرتکب کبیرہ مُخرج عَنِ الایمان نہیں ہے تو اس کے مختلف جوابات دیے گئے ہیں

جواب اوّل

سب سے بہتر جواب جس کو صاحب مشکوٰۃؒ نے امام بخاریؒ سے نقل کیا ہے کہ ان حدیثوں کا مطلب یہ ہے کہ زنا وغیرہ کے وقت کمالِ ایمان اور نورِ ایمان باقی نہیں رہتا ۔ نفسِ ایمان کی نفی نہیں ، کمال ایمان کی نفی ہے ۔

قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہ یُنْزَعُ مِنْهُ نُوْرُ الْاِیْمَانِ وَقَدْ رُوِیَ مَرْفُوْعًا اَخْرَجَهٗ اَبُوْجَعْفَرِ الطَّبَرِیْ مِنْ طَرِیْقِ مُجَاهِدٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہ سَمِعْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَنْ زَنٰی نَزَعَ اللّٰهُ نُوْرَ الْاِیْمَانِ مِنْ قَلْبِهٖ فَاِنْ شَآءَ اَنْ یَّرُدَّهٗ اِلَیْهِ رَدَّهٗ هٰکَذَا فِیْ ابوداؤد شریف ص۲۹۶ ج۲ بَابُ الدَّلِیْلِ عَلَی الزِّیَادَةِ وَالنُّقْصَانِ وَفَتْحِ الْبَارِیْ ص۵۹ ج۱۲ کِتَابُ الْحُدُوْدِ ؛

نیز مؤلف مشکوٰۃ فرماتے ہیں ۔

وَقَالَ اَبُوْعَبْدِ اللّٰهِ لَا یَکُوْنُ هٰذَا مُؤْمِنًا تَامًّا وَلَا یَکُوْنُ لَهٗ نُوْرُ الْاِیْمَانِ (مشکوٰۃ شریف ص۱ ج۱)

جواب دوم اس حدیثِ پاک میں نفی کے صیغے نہی کے معنیٰ میں ہیں نفی اور نہی ایک دوسرے کی جگہ بلغاء کے ہاں استعمال ہوتے رہتے ہیں۔ حدیث کا معنیٰ یہ ہے کہ مؤمن کو حالتِ ایمان میں زنا وغیرہ نہ کرنا چاہیے۔ یعنی اس کی حالتِ ایمان ایسی حرکات سے آبی اور مانع ہے۔ اس کا قرینہ یہ ہے کہ بعض روایات میں نفی کی جگہ نہی کے صیغے وارد ہوئے ہیں۔ (کما فی فتح الباری ص۶۱ ج ۱۲)

جواب سوم یہاں ایمان بول کر اس کا بڑا شعبہ مراد لیا ہے یعنی حیاء۔ تو مؤمن کا معنیٰ ہوگا مُستحیٔ یعنی حیاء والا۔ مطلب حدیث کا یہ ہوگا کہ "نہیں زنا کرتا زنا کرنے والا اس حال میں کہ وہ حیاء والا ہو"۔ یعنی حیاء کے ہوتے ہوئے یہ حرکات نہیں ہوسکتیں۔

جواب چہارم الزامی یقول ابوالاسعاد : اس حدیث سے عین ارتکاب کبیرہ کے وقت خروجِ ایمان ثابت ہو رہا ہے حالانکہ معتزلہ خروج دائمی کے قائل ہیں۔ فلا حُجّة لھم!

قولہٗ وَلَا يَنْتَهِبُ نُهْبَةً : ای اخذ مالہٗ قھرًا یعنی ظلمًا : کسی کا مال لوٹنا جس کو ڈاکہ زنی بھی کہتے ہیں۔

قولہٗ يَرْفَعُ النَّاسُ اَبْصَارَهُمْ — رفع بصر یا تو تعجبًا ہے ان کی جرأت پر یا ان کے خوف کی وجہ سے ہے۔ علامہ طیبیؒ معنیٰ کرتے ہیں :۔

وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْهِ وَيَتَضَرَّعُوْنَ وَيَبْكُوْنَ وَلَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى دَفْعِهٖ وَهٰذَا ظُلْمٌ عَظِيْمٌ لَا يَلِيْقُ بِحَالِ مَنْ هُوَ مُؤْمِنٌ :

ڈاکہ زنی میں تین چیزیں جرم ہیں (۱) مال غیر پر ناجائز قبضہ (۲) ظاہر ظہور دوسرے کا مال چھین لینا (۳) دل کی سختی کہ لوگوں کی حسرت اور آہ و پکار پر ترس نہ کھائے۔ لہذا یہ گناہوں کا مجموعہ ہوا جو مؤمن کی شان کے خلاف ہونے کے ساتھ ظلمِ عظیم ہے۔

قولہٗ وَلَا يَغُلُّ — غَلَّ غلول سے ہے غلول مالِ غنیمت میں خیانت کرنے کو کہتے ہیں۔ کبھی مطلقاً خیانت پر بول دیا جاتا ہے۔ یہاں دوسرا معنیٰ زیادہ ظاہر ہے۔

قولہٗ قال عکرمةؒ — عکرمہ ابن ابی جہل نہیں ہیں۔ بلکہ عبداللہ ابن عباس رضؓ

کے آزاد کردہ غلام آپ کے خادم اور کاتب ہیں۔

قولہٗ وَهٰكَذَا شَبَّكَ بَيْنَ اَصَابِعِهٖ (ترجمہ) اور اپنی انگلیوں کو داخل کر دیا اور پھر انگلیوں کو نکالا۔

حضرت ابن عباسؓ نے اپنی انگلیوں کی مثال کے ذریعہ واضح کیا۔ انہوں نے پہلے اپنے ایک ہاتھ کے پنجہ کو دوسرے ہاتھ کے پنجہ میں داخل کیا اور دکھایا کہ یہ گویا ارتکاب معصیت سے قبل کی حالت ہے کہ نورِ ایمان مؤمن کے قلب میں جاگزیں ہے۔ پھر انہوں نے دونوں پنجوں کو ایک دوسرے سے علیٰحدہ کرکے بتایا کہ جس طرح ایک پنجہ دوسرے پنجہ سے الگ ہوگیا ہے۔ اسی طرح ارتکابِ معصیت کے وقت نورِ ایمان مؤمن کے قلب سے علیٰحدہ ہو جاتا ہے۔ پھر انہوں نے دوبارہ پنجوں کو ایک دوسرے میں داخل کر دیا اور کہا کہ جس طرح یہ پنجے پھر ایک دوسرے میں داخل ہوگئے ہیں اسی طرح اگر مؤمن ارتکابِ معصیت کے بعد توبہ کرلیتا ہے تو اس کا نورِ ایمان پہلے کی طرح اپنی جگہ واپس آجاتا ہے۔

قولہٗ وَقَالَ اَبُوْعَبْدِ اللّٰہِ لَا يَكُوْنُ هٰذَا مُؤْمِنًا تَامًّا (ترجمہ) حضرت ابوعبداللہؒ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ کامل مؤمن نہیں رہتے) —— یہاں سے صاحبِ مشکوٰۃ ایک سوال کا جواب دے رہے ہیں جس کی مکمل وضاحت جوابِ اوّل کے اندر بیان کردی گئی ہے۔

وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اٰيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ :

ترجمہ : حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ منافق کی تین علامتیں ہیں۔

قولہٗ اٰيَة - یہاں آیت سے جنس آیت مراد ہے اسی لیے ثَلَاثٌ کا اس پر حمل درست ہے۔

قولہٗ وَزَعَمَ اَنَّهٗ مُسْلِمٌ - اَىْ وَاِنْ عَمِلَ اَعْمَالَ الْمُسْلِمِيْنَ مِنَ الصَّوْمِ وَالصَّلٰوةِ وَغَيْرِهِمَا مِنَ الْعِبَادَاتِ۔

قولہٗ اِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ ۔ وَعَدَ کا لفظ خیر و شر دونوں میں مستعمل ہے جب کہ ایعاد کا لفظ محض شر کے لیے مستعمل ہے ۔ یہاں پر لفظ وَعَدَ جو بظاہر دونوں کو عام ہوگا ۔ مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ خیر کا وعدہ مراد ہے کہ اس میں خلاف نہ کرے بخلاف وعدہ شر کے کہ اس کے خلاف کرنا محمود ہے بلکہ بعض جگہ خلاف کرنا واجب ہوتا ہے ۔ عند العلماء اگر بوقت وعدہ ایفاء کی نیت ہو پھر کوئی مانع درپیش ہوگیا تو وہ مکروہ نہیں اور نہ اس میں قباحت ہے ۔ کَمَا فِی رِوَایَۃِ اَبِیْ دَاوٗدَ وَالتِّرْمِذِیْ عَنْ زَیْدِ بْنِ اَرْقَمَ مَرْفُوْعًا اَنَّهٗ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ قَالَ اِذَا وَعَدَ الرَّجُلُ اَخَاهُ وَمِنْ نِيَّتِهٖ اَنْ يَّفِيَ لَهٗ فَلَمْ يَفِ لَهٗ وَلَمْ يَجِئْ لِلْمِيْعَادِ فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ ؛

فائدہ ۔ محدثین حضرات نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان جوامع الکلم سے ہے ۔ کیونکہ انسان کی عملی زندگی تین چیزوں میں بند ہے ۔ (۱) قول (۲) فعل (۳) نیت ۔ یہ تینوں درست ہوجائیں تو باقی کچھ نہیں رہتا ۔ اسی طرح عمل کے تین درجہ ہیں ۔ ایک دل کا فعل، دوسرا زبان کا، تیسرا جوارح کا ۔ اِذَا حَدَّثَ کَذَبَ قول کے فساد پر دال ہے ۔ وَاِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ فعل کے فساد پر مبنی ہے ۔ وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ میں نیت کا فساد ہے

وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَرْبَعٌ مَّنْ كُنَّ فِيْهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا ۔

ترجمہ ؛ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جس میں چار عیوب ہوں وہ بڑا منافق ہے ۔

قولہٗ اَرْبَعٌ ۔ اس کی صفت خِصَالٌ محذوف ہے ۔ اصل عبارت تھی اربع خِصَالٍ

قولہٗ اِذَا عَاهَدَ غَدَرَ ۔ پہلی حدیث میں اِذَا وَعَدَ تھا ۔ اس میں اِذَا عَاهَدَ ہے ۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ معاہدہ طرفین سے ہوتا ہے اور وعدہ ایک طرف سے ۔ مگر اس کے عموم میں معاہدہ بھی داخل ہے ۔ نیز معاہدہ کا نقض حرام ہے ۔ بشرطیکہ یہ معاہدہ خلاف شرع نہ ہو ۔

اور وعدہ کا نقض مکروہ ہے۔

قولہٗ فَجَرَ ۔ ای شَتَمَ یعنی گالیاں دینا یہ اتنا قبیح فعل ہے کہ مسلمانوں کو روکا جارہا ہے کہ کافروں کو گالیاں نہ دو۔ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ۔ (پ انعام)

سوال اوّل حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں منافق کی تین علامتیں بیان کی گئی ہیں:۔ (۱) کذب (۲) وعدہ خلافی (۳) خیانت۔ جب کہ حضرت ابن عمرؓ کی روایت میں چار علامتیں بیان کی گئی ہیں۔ ان چار میں دو علامتیں تو پہلی ہی روایت کی ہیں یعنی کذب اور خیانت۔ اور دو علامتیں زائد ہیں یعنی عہد شکنی اور فجور، وعدہ خلافی صرف پہلی روایت میں ہے فَتَعَارَضَا۔

جواب اوّل کسی چیز کی بہت سی علامات ہوسکتی ہیں کبھی سب کو بیان کیا جاتا ہے اور کبھی بعض کو اس لیے ایک کے ذکر کرنے سے دوسروں کی نفی نہیں ہوتی کیونکہ عدد کا مفہوم مخالف بالاتفاق معتبر نہیں ہے۔

جواب دوم یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے تین کی وحی آئی تو تین کو بیان فرمایا۔ بعد میں ایک اور کی وحی آئی تو چار کو بیان فرمایا۔

جواب سوم حدیث ابوہریرہؓ میں انحصار مقصود نہیں کیونکہ مسلم شریف میں آیۃ المنافق کے بجائے من آیۃ المنافق مِن تبعیضیہ کے ساتھ وارد ہونا اس پر قرینہ ہے۔

سوال دوم یہاں جو چیزیں علامتِ نفاق بتائی گئی ہیں۔ یہ سب ایسے مؤمنین کے اندر بھی پائی جاتی ہیں جن کے ایمان میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں ہے۔ تو اب مطلب یہ ہوگا کہ سب مؤمنین منافق ہیں اِلّا من شاء اللہ۔ تو اس کے مختلف جواب دیے گئے ہیں۔

جواب اوّل علامہ قرطبیؒ اور علامہ بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ یہاں منافق عملی کا بیان ہے جو مسلمانوں میں بھی ہوسکتا ہے نہ کہ منافق اعتقادی کا جو کافر اور مخلد فی النار ہے

جواب دوم علامہ محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ علامت وعلت میں فرق ہے۔ علت پائے جانے سے معلول کا ہونا ضروری ہے۔ لیکن

علامت کے موجود ہونے سے ذوالعلامت ہونا ضروری نہیں ہے۔ لہذا ایک چیز کی علامت دوسری چیز میں پائی جاتی ہے۔ مگر دوسری چیز پہلی چیز نہیں ہوجاتی۔ بنا بریں یہ چیزیں منافق کی علامت تو ہیں لیکن کسی مسلمان کے اندر (یعنی ذوالعلامۃ) پائے جانے سے اس کا منافق ہونا لازم نہیں آتا۔ کیونکہ اصل ایمان و نفاق کا تعلق قلب کے ساتھ ہے۔

جواب سوم حدیث کا مطلب یہ ہے کہ کذب، خیانت اور وعدہ خلافی پر مداومت کرنے والا منافق حقیقی ہے کیونکہ لفظ اذا دوام اور تکرار پر دال ہے اور مسلمان فاسق کے اندر یہ خصلتیں علی الدوام نہیں پائی جاتیں۔ مثلاً اگر ایک دفعہ خیانت کرے بھی تو دوسری دفعہ امانت داری کا ثبوت بھی دیتا ہے۔

وَعَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَثَلُ الْمُنَافِقِ كَالشَّاةِ الْعَائِرَةِ بَيْنَ الْغَنَمَيْنِ

ترجمہ: روایت ہے ابن عمرؓ سے فرماتے ہیں کہ فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منافق اس بکری کی طرح ہے جو دو بکریوں کے درمیان کھولے (چکر لگائے)

قولہٗ عَائِرَةِ ۔ عَارَ یُعِیْرُ عِیْرًا سے ماخوذ ہے بمعنیٰ اَیِ الطَّالِبَۃِ لِلْفَحْلِ الْمُتَرَدِّدَۃِ ذَھَبَ وَبَعُدَ یعنی دوڑنا وچکر لگانا۔ منافق کی مثال اس بکری سے دی گئی ہے جو اپنے نر کی تلاش میں ادھر اُدھر ماری ماری پھرتی ہے یعنی منافقین کے عدم ثبات علی الایمان کو شاۃ عائرہ جو عدم ثبات علی الواحد ہے۔ اس کے ساتھ تشبیہ دی ہے جس طرح عائرہ کا کام صرف خواہش رانی ہوتا ہے۔ اسی طرح منافقین کا کام مقصد برآری اور مال وجان کی حفاظت ہوتی ہے۔ لہذا اس اغراض کی تکمیل کے لیے کبھی مسلمانوں کی طرف آتے ہیں اور کبھی کفار کے پاس جاتے ہیں۔ کما قال اللہ تعالیٰ ۔ (۱) وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِھِمْ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَکُمْ (بقرہ آیت ۱۴) ۔ (۲) مُذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِکَ لَآ اِلٰی ھٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰی ھٰٓؤُلَآءِ (النساء آیت ۱۴۲)

قولہٗ تعیر ۔ بفتح اوّلہ ای تَنَفُّر

قولہ الیٰ ھٰذہٖ ۔ ای القطۃ ۔

اَلفَصلُ الثَّانِیْ ـــــ یہ دوسری فصل ہے ۔

عَنْ صَفْوَانؓ بْنِ عَسَّالٍ قَالَ قَالَ الْیَھُوْدِیُّ لِصَاحِبِہٖ اِذْھَبْ بِنَا اِلیٰ ھٰذَا النَّبِیِّ فَقَالَ لَہٗ صَاحِبُہٗ لَا تَقُلْ نَبِیٌّ ۔

ترجمہ : صفوانؓ بن عسّال سے منقول ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک یہودی نے اپنے ایک ساتھی سے کہا کہ مجھے اس نبی کے پاس لے چلو ساتھی نے کہا کہ نبی نہ کہو کہ اگر ان کو خبر ہوگئی کہ ہم بھی ان کو نبی کہتے ہیں تو ان کی چار آنکھیں ہو جائیں گی ۔

قولہٗ اِذْھَبْ بِنَا ۔ با تعدیّت کی ہے مقصد ان کے آنے کا یہ تھا لِنَسْئَلہ المَسْئلۃ امتحانًا جیسا کہ بے جا اعتراض کرنے کی ان کی فطرت وجبلّت خبیثہ تھی ۔

عِنْدَ البعض اَلْبَاءُ فِی البِنَاءِ بِمَعْنَی المُصَاحَبَۃِ ای کُنْ رَفِیْقِی لَنَا بَتِیْہِ ھٰذَا مَذْھَبُ المُبَرِّد ۔

قولہٗ اِلیٰ ھٰذَا النَّبِیِّ ـــ محدثینؒ حضرات نے لکھا ہے کہ جملہ مذکورہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودی دل سے حضرتؐ کی حقانیت کی گواہی دیتے تھے ۔ مگر محض حسد اور ضد سے انکاری تھے یَعْرِفُوْنَہٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَاءَھُمْ :

قولہٗ لَکَانَ لَہٗ اَرْبَعُ اَعْیُنٍ ـــ یہ لَا تَقُلْ نَبِیٌّ کی علت ہے اور اس کے دو مطلب ہیں :۔

اوّل ۔ اس جملہ سے خوش ہونے کی طرف کنایہ ہے ۔ کیونکہ انسان جب خوش ہوتا ہے

تو آنکھیں بڑی ہو جاتی ہیں۔ تو گویا دو آنکھیں چار ہو جاتی ہیں، یا خوشی سے آنکھیں چمک اٹھتی ہیں جیسا کہ غم سے عالم تاریک نظر آتا ہے تو مطلب یہ ہوا کہ جب وہ سُنے گا کہ تم نے نبی کہ دیا تو وہ خوش ہو جائے گا کہ مخالفین نے مجھے نبی کہ دیا۔

دوم۔ یا کنایہ ہے انتظار کرنے سے کیونکہ انسان جب کسی چیز کی انتظار کرتا ہے تو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہتا ہے۔ تو مطلب یہ ہوا کہ جب سُنے گا کہ تم نے اسے نبی کہ دیا ہے تو انتظار کرے گا تمہاری کہ عنقریب یہ آپ کی اتباع بھی کریں گے۔

قولہٗ فَاَتَیَا رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَسَئَلَاہُ عَنْ اٰیَاتٍ بَیِّنَاتٍ۔ (ترجمہ) پھر وہ دونوں حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے کھلی نشانیوں کے بارے میں پوچھا۔

قولہٗ اٰیَاتٍ۔ اٰیۃ کی جمع ہے بمعنیٰ احکام الٰہیہ ومعجزے۔ یہاں دونوں معنوں کا احتمال ہے۔ جس طرح قرآن مُقدس کی آیت "وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰی تِسْعَ اٰیَاتٍ بَیِّنَاتٍ (بنی اسرائیل آیت ۱۰۱) میں مفسرینؒ کی ایک جماعت نے دونوں معنیٰ لے کر تفسیر کی ہے۔ اٰیَاتٍ بَیِّنَاتٍ کی تفسیر میں دو قول ہیں :۔

قول اوّل یہ کہ ان یہودیوں کا سوال ان نو احکام کے متعلق تھا جو ہر ملت میں مشروع ہیں، اور آپ نے ان نو کے ساتھ علیٰ سبیل الحکمۃ دسواں حکم بھی ارشاد فرما دیا جو یہودیوں کے ساتھ خاص تھا تو اس پر ان کے دل میں غیر اختیاری طور پر تصدیق پیدا ہوگئی، اور وہ حضور علیہ السلام کے ہاتھ پاؤں چومنے لگ گئے۔ آپ نے اس پر نکیر نہ فرمائی کیونکہ اس میں غلبۂ اسلام تھا۔

قول دوم یہ کہ یہودیوں کا سوال موسیٰ علیہ السلام کے ان نو معجزات کے بارے میں تھا۔ جن کا ذکر قرآن مجید کی سورۃ اعراف میں پوری تفصیل کے ساتھ اور سورۃ نمل وسورۃ بنی اسرائیل میں اجمالاً آیا ہے۔ اور وہ یہ ہیں ۱ عصا ۲ یدِ بیضاء ۳ قحط سالی ۴ نقص ثمرات ۵ طوفانِ بارش ۶ جراد (ٹڈی) ۷ قمل ۸ ضفادع (مینڈک) ۹ دم۔

سوال۔ یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب ان کے سوال کے مطابق نہیں اس کے دو جواب ہیں :۔

جواب اوّل ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب علیٰ اُسلوبِ الحکیم ہے ۔ اور مطلب یہ ہے کہ تمہیں معجزات سے زیادہ احکام کی ضرورت ہے ۔ اس لیے جواب میں احکام کا ذکر ہے ۔

جوابِ دوم ۔ اب آپؐ نے معجزات و احکام دونوں بتائے تھے ۔ مگر چونکہ معجزات مشہور اور قرآن مقدس میں مذکور تھے ۔ اس لیے راوی نے اختصاراً ان کو ذکر نہیں کیا ۔ چنانچہ ترمذی شریف کی روایت میں ہے کہ آپ نے یہ احکام بیان فرمانے کے بعد بطور استشہاد کے یہ آیت تلاوت فرمائی "وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰی تِسْعَ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ (پ۱۵ ع۱۲)

یقول ابوالاسعاد : حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ سے نہ معجزات مراد ہیں اور نہ احکام عام بلکہ تورات میں دس وصایا لکھی ہوئی تھیں ان کے متعلق انہوں نے سوال کیا تھا کیونکہ ان کا مقصد بھی یہی تھا کہ کسی طرح حضرتؑ کو تنگ کیا جائے رغیب کی چیز کا سوال کر کے ۔

سوال ۔ ترمذی شریف کی روایت سے احکام یا معجزہ کی تائید ہوتی ہے اور وہ نو ہیں پھر وصایا کیسے مراد ہو سکتے ہیں ۔ کیونکہ وصایا تو دس ہیں ۔

جواب ۔ اس روایت کے راوی عبداللہ بن سلمہؓ ہیں ۔ انہوں نے تِسْعَ کی زیادتی کی ہے ان کا حافظہ آخری عمر میں خراب ہو گیا تھا ۔ لیکن جمہور حضرات نے پہلے دو قولوں کو ترجیح دی ہے ۔

قولہٗ وَلَا تَمْشُوْا بِبَرِیٍّ ۔ ای بمبترئٍ من الاثم کہ ایسا آدمی جو گناہ سے بری ہے ۔ صرف ذاتی دشمنی کی بناء پر اس کو بادشاہ کے پاس لے جانا کہ اسے قتل کرے ۔

قولہٗ وَعَلَیْکُمْ خَاصَّۃً الْیَهُوْدِ اَنْ لَّا تَعْتَدُوْا فِی السَّبْتِ ۔ اَنْ لَّا تَعْتَدُوْا ۔ اس کے اعراب میں دو احتمال ہیں ۔ ۱ یہ بتأویل مصدر مُبتدا مؤخر ہے اور عَلَیْکُمْ ظرف مستقر محل خبر مقدم میں ہے ۔ ۲ عَلَیْکُمْ اسم فعل ہے بمعنیٰ اِلْزَمُوْا اَنْ لَّا تَعْتَدُوْا الخ بتأویل مصدر مفعول بہ ہے ۔ دونوں صورتوں میں خَاصَّۃً الْیَهُوْد جملہ معترضہ ہے ۔

قولہٗ خَاصَّۃً الْیَهُوْدِ ۔ اس کی ترکیب میں بھی دو احتمال ہیں :-

ع۱ یہاں اَخَصُّ فعل محذوف ہے خَاصَّۃً اس کا مفعول مطلق ہے اور الیھود مفعول بہ ہے یعنی یہ امر میں یہود کے ساتھ خاص کرتا ہوں۔

ع۲ اَلْیَھُوْدَ منصوب علی الاختصاص ہے یعنی یہ اَعْنِیْ فعل مقدر کا مفعول بہ ہے اور خاصۃ الیھود سے حال ہے۔

فِی السَّبْتِ کی تشریح

اس کی تفصیل یہ ہے کہ جس طرح تمام قوموں کے لیے ہفتہ میں ایک دن عبادت کے لیے مخصوص تھا اسی طرح یہود کے لیے بھی شنبہ کا دن عبادت کے لیے متعین کردیا گیا تھا، اور ان کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ اس دن خدا کی عبادت میں مشغول رہا کریں۔ چونکہ یہ قوم شکار کا خاص ذوق رکھتی تھی۔ اس لیے ان کو اس دن کے شکار سے بھی منع کردیا گیا لیکن اس قوم نے اس حکم کو کوئی اہمیّت نہ دی اور سخت مُمانعت کے باوجود اس دن مچھلی کا شکار کرنے لگے۔ سخت مُمانعت کے بعد آخر ان کو عذاب میں مُبتلا کیا گیا۔ چنانچہ حضرت ؐ نے ان کو بطور تاکید وہ واقعہ یاد دلایا۔

قولہٗ وَقَالَا نَشْھَدُ اَنَّکَ نَبِیٌّ ۔ (ترجمہ) اور بولے کہ ہم گواہ ہیں کہ آپ ؐ سچے نبی ہیں۔

سوال ۔ جملہ مذکورہ سے معلوم ہوا کہ وہ دونوں یہودی مسلمان ہوگئے کیونکہ وہ نبوّت کی شہادت دے رہے ہیں۔

جوابِ اوّل[۱] یہ کہ مسلمان نہیں ہوئے تھے کیونکہ ان کا اِنَّکَ نَبِیٌّ کہنے کا مطلب نبیِ عرب مراد ہے اسرائیل کا نہیں۔ گویا ان کا مقصد نبی العرب ہے۔ عمومی بعثت کے منکر تھے جب کہ عموم بعثت کا عقیدہ ضروریاتِ دین سے ہے اس کا منکر کافر ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَّلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ (پ ۲۲ س سبا)

جواب دوم ۔ شہادت سے مراد تصدیق نہیں بلکہ معرفت ہے ان کو معرفت حاصل تھی نہ کہ تصدیق ۔ جب کہ ایمان معرفت کا نام نہیں بلکہ تصدیق کا نام ہے ۔ کما فی قولہٖ تعالیٰ " یَعْرِفُوْنَهٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَ هُمْ "۔ صرف معرفت سے آدمی مؤمن نہیں بنتا ۔

سوال ۔ قرینہ کیا ہے کہ وہ مؤمن نہیں ۔

جواب ۔ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب فرمایا " فَمَا یَمْنَعُکُمْ اَنْ تَتَّبِعُوْنِیْ الخ تو جواب میں کہتے ہیں کہ وَاِنَّا نَخَافُ اِنْ تَبِعْنَاكَ اَنْ یَقْتُلَنَا الْیَهُوْدُ : تو یہود کے خوف سے ایمان نہیں لا رہے ۔

قولہٗ اَنَّ دَاوٗدَ عَلَیْهِ السَّلَامُ دَعَا رَبَّهٗ اَنْ یَزَالَ ۔ حاصل اس کا یہ بنتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے دعاء کی تھی کہ میری اولاد میں ہمیشہ نبی آتے رہیں اور وہ بنی اسرائیل میں سے تھے ۔ لہٰذا ان کی دعاء کے مطابق بنی اسرائیل میں نبی آتے رہیں گے ۔ اگر ہم آپ پر ایمان لے آئیں تو یہود اس نبی کے ساتھ مل کر غلبہ پاکر ہمیں قتل کر دیں گے ۔ اس مجبوری کی وجہ سے ایمان نہیں لا سکتے ۔

یقول ابو الاسعاد : یہودیوں کی یہ بات ایک افتراء اور بہتان تھا ۔ کیونکہ تورات اور ان کی کتاب زبور میں یہ مکتوب ہے کہ قبیلہ قریش سے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوں گے اور ان کا دین تمام ادیان سابقہ کے لیے ناسخ ہوگا اس پر مطلع ہونے کے باوجود داؤد علیہ السلام اس کے برخلاف کیسے دعاء کر سکتے ہیں ۔ لہٰذا انہوں نے جو نَشْهَدُ کہا تھا یہ بطور نفاق تھا اسی لیے صاحب مصابیح اس واقعہ کو علامات نفاق کے باب میں لائے ہیں ۔

یقول ابو الاسعاد ثانیًا : اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ داؤد علیہ السلام نے یہ دعاء کی تھی کہ نبوت میری نسل سے منقطع نہ ہو تو اس کے مختلف جواب دیے گئے ہیں ۔

جواب اوّل ۔ یہ کہ اس دعاء کا مقصد اور اس کی مراد اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ نہ تھی ۔ بلکہ الی بعثت نبیٔ آخر الزماں تھی ۔

جواب دوم ۔ یہ کہ ان کی اولاد میں سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت تک کے لیے نبی ہیں ۔ وہ خاتم النبیین کے بعد امتِ محمدیؐ کا ایک فرد بن کر آسمان سے نزول فرمائیں گے ۔ فلا اشکال علیہ ۔

وَعَنْ اَنَسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ثَلٰثٌ مِّنْ اَصْلِ الْاِیْمَانِ

ترجمہ : روایت ہے حضرت انسؓ سے فرماتے ہیں کہ فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تین چیزیں ایمان کی بنیاد ہیں۔

قولہ ثَلٰثٌ ۔ تنوین عوض ہے مضاف الیہ محذوف کے اصل میں ثَلٰثُ خِصَالٍ تھا۔

قولہٗ اَصْلٌ ۔ بمعنیٰ اساس وقاعدہ ۔

قولہٗ اَلْکَفُّ ۔ یہ احدھا کی خبر ہے اصل میں عبارت تھی اَحَدُھُمَا اَلْکَفُّ عَمَّنْ قَالَ الخ

قولہٗ لَاتُکَفِّرْ ۔ یہ بیان ہے اَلْکَفُّ کا کہ اس کو کافر نہ کہو۔

قولہ بِذَنْبٍ ۔ اس سے ماسوا شرک وکفر مراد ہے ۔کیونکہ صرف شرک وکفر سے آدمی کافر بن جاتا ہے۔

فائدہ اس حدیث میں کسی کی بدعملی دیکھ کر تکفیر کرنے سے نہی ہے ۔ اس سے خوارج کی تردید ہوگئی اور لَاتُخْرِجُہٗ مِنَ الْاِیْمَانِ بِعَمَلٍ سے معتزلہ کی تردید ہوگئی ۔ رہا سوال مرزائیوں کی تردید کا تو ان کی تکفیر ان کی بداعمالی کی وجہ سے نہیں کی جاتی بلکہ ان کی بداعتقادی کی وجہ سے انہیں کافر کہا جاتا ہے ۔

قولہٗ وَالْجِھَادُ مَاضٍ مُذْ بَعَثَنِیَ اللّٰہُ ۔ اصل میں الثانی الجہاد تھا۔

قولہٗ مَاضٍ ۔ بمعنیٰ جارٍ کے ہے ۔

قولہٗ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ ۔ اس سے مراد اُمّتِ اجابت ہے اور اُمّتِ اجابت سے مُراد حضرت عیسیٰ علیہ السّلام امام مہدیؒ اور ان دونوں کے متبعین ہیں جو دجّال کو قتل کریں گے۔

حاصل جُملہ : وَالْجِھَادُ مَاضٍ کا مقصد یہ ہے کہ جہاد اس وقت تک جاری رہے گا ۔ جب تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام دجّال اور اس کے تابعین سے جہاد کریں گے ۔ یہ مطلب نہیں کہ اس کے بعد جہاد منسوخ ہو جائے گا۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی شرعی حکم منسوخ نہیں ہوسکتا بلکہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ دجّال کے

قتل کے بعد جہاد کی ضرورت اور اس کا موقع نہیں رہے گا۔ کیونکہ اس کے بعد سب لوگ مسلمان ہو جائیں گے، جہاد کس سے کریں گے پھر ایک ایسا وقت آئے گا جب کہ صرف کافر ہی دنیا میں رہ جائیں گے تو جہاد کون کرے گا۔

قولہٗ لَا یُبْطِلُہٗ جَوْرُ جَائِرٍ ۔ (ترجمہ) جہاد کو ظالم کا ظلم باطل نہیں کر سکتا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی اسلامی سربراہِ مملکت ظالم وجابر ہو اگر دشمنانِ دین کے خلاف جہاد کا اعلان کر دے تو اس کو ماننا اور اس کے ساتھ جہاد میں شریک ہونا شرعی طور پر ضروری ہوگا یہ نہیں کہ اس کے ظلم وجبر کا بہانہ لے کر جہاد میں شرکت اور مددگار رہنے سے انکار کر دیا جائے۔

قولہٗ وَلَا عَدْلُ عَادِلٍ ۔ عدل عادل کا بھی جہاد کو ختم نہیں کر سکتا۔ اس کے دو مطلب ہیں۔

اوّل:۔ نفی بمعنیٰ نہی ہے اور مقصد یہ ہے کہ امام کا عادل یا ظالم ہونا مانع جہاد نہ ہونا چاہیئے بلکہ ہر قسم کے امام کے ساتھ مل کر جہاد کرنا چاہیئے۔ تو امیر کا ظلم اور فسق شرکتِ جہاد سے مانع نہ ہو۔ نیز عدالت کی صورت میں یہ خیال نہ ہو کہ ملک میں امن وسکون ہے اور غنیمت کی ہمیں ضرورت نہیں بلکہ اس وقت بھی اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے جہاد جاری رکھنا چاہیئے۔

دوّم ۔ نفی اپنے ظاہر پر ہے اور مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کا کوئی امام اور کوئی بادشاہ بھی جہاد کو ختم اور باطل نہیں کرے گا۔ اس سے مسیلمہ قادیان کا دجل بھی ظاہر ہو گیا جو یہ کہتا ہے کہ میرے آنے کے بعد جہاد کی فرضیت منسوخ ہو گئی ہے۔

سوال ۔ حضرتؒ نے فرمایا جہاد کا باطل ہونا جورِ جائر سے یہ بات تو صحیح ہے کہ ہر کوئی اس سے تنگ ہوگا، اس کا ساتھ نہ دیں گے بلکہ عادل کے ساتھ ہر کوئی ہوتا ہے۔ اس کو کیوں بیان فرمایا؟

جواب اوّل ۔ مقصود تسویۃ الحکم مُبالغۃً ہے کہ جہاد کا حکم یکساں ہے چاہے بادشاہ عادل ہو یا ظالم ہو اس کے ساتھ مل کر جہاد کرنا اور تسویہ بیان کرتے وقت دونوں طرفیں برابر ہوتی ہیں۔

جواب دوّم ۔ دونوں صورتوں میں وہم ہوتا تھا، ظالم میں ظلم کی وجہ سے وہم تھا،

عادل ہیں عدل کی وجہ سے وہم تھا اس لیے دونوں کو ذکر کیا۔

قولہٗ وَالْاِیْمَانُ بِالْاَقْدَارِ — اور تقدیروں پر ایمان رکھنا۔ یعنی یہ اعتقاد رکھے کہ اَنَّ مَا یَجْرِیْ فِی الْعَالَمِ هُوَ مِنْ قَضَاءِ اللّٰهِ وَقَدْرِهٖ۔ جسے یوں بھی بیان کر سکتے ہیں۔ وَالْقَدْرِ خَیْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰی " مُعتزلہ پر بھی ایک قسم کا رد ہے۔ جو مخلوق کے لیے قدرت مُستقلہ کے قائل ہیں۔

یَقُوْلُ اَبُوالْاِسْعَادِ ۔ اس حدیث کو باب الکبائر میں لانے کی غرض یہ ہے کہ کبائر کے ارتکاب سے مسلمان کافر نہیں بنتا۔

وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا زَنَی الْعَبْدُ خَرَجَ مِنْهُ الْاِیْمَانُ فَکَانَ فَوْقَ رَاْسِهٖ کَالظُّلَّةِ فَاِذَا خَرَجَ مِنْ ذٰلِكَ الْعَمَلِ فَرَجَعَ اِلَیْهِ الْاِیْمَانُ ۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب بندہ زنا کرتا ہے تو ایمان (اس کے قلب سے) نکل کر سر پر سائبان کی طرح مُعلّق ہو جاتا ہے۔ جب وہ اس معصیت سے فارغ ہو جاتا ہے تو ایمان پھر اس کی طرف (قلب میں) لوٹ آتا ہے۔

قولہٗ کَالظُّلَّةِ : مثل سائبان کے —— علامہ ابن العربیؒ نے لکھا ہے کہ کالظُّلّۃ سے تشبیہ دینا یہ اشارہ ہے کہ وہ اوپر بادلوں میں چلا جاتا ہے تاکہ اس پر اوپر سے عذاب نہ آجائے۔

قولہٗ فَاِذَا خَرَجَ ۔ اَیْ فَرَغَ مِنْ عَمَلِ الزِّنَاءِ ۔

سوال ۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مرتکب کبیرہ ایمان سے خارج ہو جاتا ہے تو یہ معتزلہ کی دلیل ہونے کے ساتھ مسلک اہل السُّنّۃ والجماعۃ کے خلاف ہے۔

جواب اوّل ۔ یہ خروج عارضی ہوتا ہے نہ کہ دائمی۔

جواب دوم ۔ یہ زجر و تہدید اور تشدید پر محمول ہے ۔
جواب سوم ۔ حدیث کا مقصد یہ ہے کہ کمالِ ایمانی اور حیائے ایمانی خارج ہو جاتی ہے۔ اس پر گذشتہ حدیث لَا تکفر بِذَنب قرینہ ہے۔

یقول ابوالاسعاد ۔ حافظ ابنِ تیمیہؒ نے اس موقعہ پر بہترین مثال دی ہے ۔ فرماتے ہیں کہ ایک گناہ گار انسان کی مثال ایسی ہے کہ ایک بینا شخص اپنی آنکھیں بند کرلے تو اسے کچھ نظر نہیں آتا تو اس لحاظ سے یہ بینا شخص اور ایک نا بینا شخص دونوں برابر ہیں، نہ یہ دیکھتا ہے اور نہ وہ ۔ لیکن حقیقت کے اعتبار سے دونوں میں بڑا فرق ہے ۔ وہ اس طرح کہ نابینا شخص نورِ بصارت سے مستقلاً محروم ہے اور بینا شخص نورِ بصارت تو رکھتا ہے مگر حجاب و غلاف کی وجہ سے دیکھنے سے محروم ہے ۔ یہی حال مؤمن و کافر کا ہے کہ مؤمن کے نورِ بصیرت پر جب معصیت کا حجاب پڑتا ہے تو وہ بھی کافر کی طرح معصیت وطاعت کا فرق نہیں کرتا لیکن خروجِ معصیت کے بعد پھر اپنی فطرت و نورِ بصیرت پر واپس آجاتا ہے ۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

یہ تیسری فصل ہے ۔

عَنْ مُعَاذٍ قَالَ اَوْصَانِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِعَشْرِ کَلِمَاتٍ قَالَ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰہِ شَیْئًا وَاِنْ قُتِلْتَ اَوْحُرِّقْتَ ۔

ترجمہ : حضرت معاذؓ فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے مجھے دس باتوں کی وصیت فرمائی تھی ۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا اگرچہ تمہیں قتل کر دیا جائے یا آگ میں جلا دیا جائے ۔

قولہ اَوْصَانِیْ ۔ ان لفظوں سے مقصود تاکید ہے ۔ یہ حکم تاکیداً دیا تھا ۔ لغتِ عرب میں تاکیدی حکم کو وصیت کہا جاتا ہے ۔ کما فی قولہٖ تعالیٰ " یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ فِیْ

اَوْلَادِکُمْ۔ (پ۵ النسآء)

قولہٗ کَلِمَاتٍ ۔ سوال ۔ کَلِمَات کلمہ کی جمع ہے بمعنیٰ باتیں ۔ حالانکہ آگے جن کا بیان ہو رہا ہے وہ کلمے نہیں بلکہ دس کلام ہیں پھر کیسے کَلِمَات فرمایا ؟

جواب ۔ اِبدال والا قانون مراد ہے کہ کبھی کبھی کلمہ سے مراد کلام لی جاتی ہے ۔ ھٰکذا فی مقامہٖ

قولہٗ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ۔ حکمِ اوّل کو قید لگی ہوئی ہے " اِنْ قُتِلْتَ اَوْ حُرِّقْتَ ۔

حکم دوم کو بھی مِنْ اَهْلِكَ وَمَالِكَ اسی طرح حکمِ سوم کو بھی ۔

سوال ۔ یہ کہ قیودات مذکورہ قرآن مقدس کے خلاف ہیں کیونکہ حکم ہے کہ قتل کا خطرہ ہو یا حالتِ اکراہ ہو تو زبان سے کلمہ کفر کا کہنا جائز ہے " اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ (پ۱۴) اسی طرح اگر قصور ہے تو والدین کے حکم پر طلاق دینا واجب ہے ۔ اور اگر جنگ یا مقابلہ میں دشمن ثلثین سے زائد ہوں تو بھاگنا جائز ہے ۔

جواب اوّل ۔ یہ عزیمت کی تعلیم ہے کیونکہ اخذ بالعزیمۃ بہ نسبت عمل بالرخصۃ کے اولیٰ ہے ۔ ہاں اس کی موت سے اگر اسلام کا نقصان ہو تو رخصت پر عمل کرنا اولیٰ ہے ۔

جواب دوم ۔ یہ قیودات حضرت معاذؓ جیسے خاص لوگوں کے لیے ذکر فرمائی ہیں ۔ کیونکہ حضرت معاذؓ شریعت کے معاملہ میں انتہائی محتاط تھے اور وہ اس پر عمل کرتے تھے ۔ جو اولیٰ و بہتر ہوتا تھا ۔ ان کے مزاج کے مطابق یہ حکم فرمایا ۔

یقول ابوالاسعاد : جو کوئی جان دیدے اور کلمہ کفر نہ کہے تو اجر کا مستحق ہے ۔ جان دے دینا عزیمت ہے ، اور جان بچانا رخصت ۔ اگر حدیث کا یہ مطلب ہو تو حضورؐ نے حضرت معاذؓ کو عزیمت کا حکم دیا ۔

قولہٗ وَلَا تَعُقَّنَّ وَالِدَيْكَ ۔۔۔ اَیْ لَا تُخَالِفْهُمَا اَوْ اَحَدَهُمَا فِيْمَا لَمْ يَكُنْ مَعْصِيَةً ۔

قولہٗ وَاِنْ اَمَرَاكَ اَنْ تَخْرُجَ مِنْ اَهْلِكَ وَمَالِكَ ۔۔۔ اَیْ اَمَرْتُكَ بِالطَّلَاقِ اَوِ الْبَيْعِ وَالْعِتْقِ وَغَيْرِهَا ۔۔۔ مقصد یہ ہے کہ والدین کی نافرمانی نہ کرو ۔ اگرچہ وہ بیوی اور مال چھوڑ دینے کا حکم بھی دیں ۔ مگر یہ بھی عزیمت اور اولیّت پر محمول ہے ۔ کیونکہ والدین

کے حکم کے باوجود بیوی کو نہ چھوڑنے کی اور مال ہبہ نہ کرنے کی بھی اجازت ہے۔ کیونکہ یہ حکم استحبابی ہے وَالِدَیْن کے حکم پر بیوی کو طلاق دینا مستحب ہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السّلام نے حضرت ابراہیمؑ کا اشارہ پاکر طلاق دے دی۔ یہ مستحب عمل تھا۔

قَولُہٗ وَلَا تَتْرُکَنَّ صَلٰوۃً مُکْتُوْبَۃً۔ (ترجمہ) جان بوجھ کر کوئی فرض نماز نہ چھوڑنا کیونکہ جو شخص قصدًا نماز چھوڑدیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے بری الذمہ ہوجاتا ہے اس کے دو مطلب بیان کیے جاتے ہیں۔

اوّل ۔ یعنی تارک الصلوٰۃ عمدًا اللہ تعالیٰ کے عہد و امان میں نہیں رہتا۔ بلکہ وہ دنیا میں تعزیر کا اور آخرت میں عذاب کا مستحق ہوجاتا ہے۔ چنانچہ جو شخص ایک نماز عمدًا ترک کردے۔ اس کو امامِ مالکؒ امام شافعیؒ کے نزدیک حَدًّا اور امامِ احمدؒ کے نزدیک اِرْتِدَادًا قتل کیا جائے گا اور امامِ اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک مدّۃ العمر قید کیا جائے گا اِلَّا یہ کہ وہ ادائے صلوٰۃ کا عہد کرے تو پھر چھوڑ دیا جائے گا۔

دوّم ۔ یہ کہ بے نمازی اللہ تعالیٰ کے امن میں نہیں رہتا، نمازی برکت سے انسان دنیا میں آفتوں سے مرتے وقت خرابیٔ خاتمہ سے قبر میں فیل ہونے سے حشر میں مصیبتوں سے بفضلہٖ تعالیٰ امن میں رہتا ہے۔

قَولُہٗ وَلَا تَشْرَبَنَّ خَمْرًا ـــ ای شربھا خَمْرًا اَیْ مَاخَامَرَ الْعَقْلَ کیونکہ نشہ سے عقل ہی جاتی رہتی ہے۔ شراب کی تخصیص اُمّ الخبائث کی وجہ سے ہے۔ جیسا کہ سُمِّیَتُ الصَّلٰوۃَ اُمُّ الْعِبَادَاتِ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ۔

قَولُہٗ وَاِیَّاکَ وَالْمَعْصِیَۃَ ـــ خدا تعالیٰ کی نافرمانی سے دور رہنا۔ کیونکہ نافرمانی کرنے سے خدا کا غصّہ اترتا ہے۔

یقول ابوالاسعاد : معصیت سے مراد صغائر ہیں اور نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا مقصد یہ ہے کہ چھوٹے گناہ کو چھوٹا سمجھ کر مت کرو۔ لیکن چھوٹی نیکی کو حقیر جان کر مت چھوڑو۔ چھوٹا گناہ چنگاری کی طرح ہے جو کبھی مکان کو جلا دیتی ہے۔ معمولی نیکی تھوڑے پانی کی طرح ہے جو کبھی جان بچا لیتا ہے۔ شیطان پہلے چھوٹے گناہ کراتا ہے پھر بڑے۔ یہاں تک کہ

پھر معصیت پر ہمیشگی ہوجاتی ہے جو ناراضگیِ ربِ ذوالجلال کا سبب ہوتا ہے۔ اس لیے حلّ سَخَطُ اللّٰہِ کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔

قولہٗ وَاِیَّاكَ وَالْفِرَارَ مِنَ الزَّحْفِ ـ اور جہاد سے بھاگ جانے سے بچو اگرچہ لوگ ہلاک ہوجائیں ـــــ یہ حکم بھی استحبابی ہے۔ اگر کوئی نمازی ایسے موقع پر ڈٹا رہے اور شہید ہوجائے تو ثواب پائے گا، اور اگر بھاگ جائے تو گنہ گار نہ ہوگا۔ کما فی قولہٖ تعالیٰ " اَلْاٰنَ خَفَّفَ اللّٰہُ عَنْكُمْ ": اس کی مکمل بحث فصل ثانی میں فی روایۃ صفوان بن عسّال گذر چکی ہے۔

قولہٗ وَاِذَا اَصَابَ النَّاسَ مَوْتٌ وَاَنْتَ فِیْھِمْ فَاثْبُتْ ۔ (ترجمہ) جب لوگوں میں وَبا پھیلے اور تم ان میں موجود ہو تو ثابت قدم رہو اور بھاگو مت۔

قولہٗ مَوْتٌ ۔ موت سے مراد وبائی امراض ہیں جیسے طاعون یا دیگر مُہلکات۔

سوال ۔ طاعون زدہ مُقام وشہر میں اقامت کا حکم کیوں دیا جا رہا ہے؟

جواب ۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ مسلمانوں کی نعوش کو درندے کھا جائیں گے اور ان کو کفن، دفن کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔ کیونکہ تمامی لوگ تو ہجرت کرچکے ہوں گے۔

سوال ۔ دوسری روایت میں ہے کہ جہاں وبا رہو وہ علاقہ ممنوعہ ہے وہاں نہ جانا۔ حالانکہ یہ توکّل کے خلاف ہے اور شرک اصغر ہے۔

جواب ۔ یہ اصلاحِ عقیدہ کے لیے ہے کہ اگر وَباء والی جگہ پر جائیں اور مَوت واقع ہو تو کہیں گے کہ اگر میں نہ جاتا تو موت واقع نہ ہوتی۔ حالانکہ اس سے تو عقیدہ خراب ہوجاتا " وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ۔

مسئلہ : حدیثِ پاک کا جملہ " اِذَا اَصَابَ النَّاسَ مَوْتٌ" الخ یہ استقامت اور عزیمت پر محمول ہے ورنہ محل وباء سے ضرورۃً یا احتیاطًا خروج کی اجازت ہے۔ ہاں اگر بھاگنے والا یہ عقیدہ رکھے کہ یہاں رہوں گا تو مَر جاؤں گا یہ کفر ہے۔

قولہٗ وَاَنْفِقْ عَلٰی عِیَالِكَ مِنْ طَوْلِكَ ۔ اپنے اہل وعیال پر اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرتے رہو۔

قولہٗ طَوۡلًا ۔ ای الفضل من المال کما فی قولہٖ تعالیٰ "وَمَنۡ لَّمۡ یَسۡتَطِعۡ مِنۡکُمۡ طَوۡلًا" لیکن یہاں معنیٰ لُبّ مُراد بِقَدۡرِ الوُسۡعِ وَالطَّاقَۃِ عَلٰی طَرِیۡقِ الۡاِقۡتِصَادِ ہے۔ معلوم ہوا کہ زن وفرزند پالنے کے لیے کمائی کرنا بھی عبادت ہے۔ اسلام ترک مِنَ الدُّنیا نہیں سکھاتا بلکہ غرق فِی الدُّنیا سے منع کرتا ہے۔

قولہٗ وَلَا تَرۡفَعۡ عَنۡهُمۡ عَصَاكَ اَدَبًا ۔ ادب کی خاطر اپنا ڈنڈا ان سے نہ ہٹاؤ۔ اَدَبًا مفعول لہٗ ہے ای اضۡرِبۡهُمۡ تَأۡدِیۡبًا ۔ یعنی بیوی بچوں کے حالات پر نگاہ رکھو، ان کی اصلاح کرتے رہو، چھوٹے بچوں کو مارسے اور بڑوں کو زبانی ڈانٹ ڈپٹ سے۔

قولہٗ وَاَخِفۡهُمۡ فِی اللّٰهِ ۔ اور اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں انہیں ڈراتے رہو۔ ای اَنۡذِرۡهُمۡ فِیۡ مُخَالَفَۃِ اَمۡرِ اللّٰهِ ۔ کیونکہ قیامت کے معاملہ میں تم سے ان کے متعلق بھی سوال کیا جائے گا۔ کما فی قولہٖ تعالیٰ "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا قُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ وَ اَهۡلِیۡکُمۡ نَارًا"۔

وَعَنۡ حُذَیۡفَۃَ رضی اللہ عنہ قَالَ اِنَّمَا النِّفَاقُ کَانَ عَلٰی عَهۡدِ رَسُوۡلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیۡهِ وَسَلَّمَ فَاَمَّا الۡیَوۡمَ فَاِنَّمَا هُوَ الۡکُفۡرُ وَ الۡاِیۡمَانُ ۔

ترجمہ: روایت ہے حضرت حذیفہؓ سے فرماتے ہیں کہ نفاق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھا۔ لیکن آج کفر ہے یا ایمان۔

خُلَاصَۃُ الۡحَدِیۡث : اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک آدمی کے بارے میں یقینی طور پر معلوم ہونے کے باوجود کہ یہ منافق ہے۔ اس کو مسلمان سمجھا جاتا تھا اور اس پر مسلمانوں والے احکام جاری کیے جاتے تھے۔ چند مصالح وضرورتوں کی وجہ سے، لیکن زمانہ رسالت کے بعد یہ حکم باقی نہیں رہا۔ لہذا اگر معلوم ہو جائے کہ فلاں شخص واقعی طور پر کافر ہے۔ اور راہِ نفاق سے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کر رہا ہے تو وہ مباح الدم

اور مباح المال ہوگا۔ مصالح اور ضروریات مندرجہ ذیل ہیں :۔

۱۔ ایک مصلحت تو یہ تھی کہ اگر انہیں قتل کیا جاتا تو مخالفین یہ کہنا شروع کر دیتے " اَنَّ مُحَمَّدًا یَقْتُلُ اَصْحَابَہٗ " کہ یہ تو اپنے آدمیوں کو قتل کر دیتے ہیں۔ اس افواہ کی وجہ سے لوگ اسلام کے قریب آنے سے ڈرتے۔

۲۔ دوسری مصلحت یہ تھی کہ مسلمانوں کی کثرت ظاہر کرنی مقصود تھی۔ اس کا تقاضا یہ تھا کہ جتنی آدمی مدعیٔ اسلام ہوں ان کو مسلمان ہی ظاہر کیا جائے۔

۳۔ تیسری مصلحت یہ تھی کہ بعض منافقین جب اپنے نفاق کے بوجود اور آنحضرتؐ کے سب کچھ سمجھنے کے باوجود اخلاقِ کریمانہ کا مشاہدہ کرتے تو دل وجان سے آپ کے گرویدہ ہو جاتے، اور سچے دل سے مسلمان ہو جاتے تو یہ طرزِ عمل بہت سے لوگوں کے سچے مسلمان بننے کا ذریعہ بن جاتا۔

بَابُ فِی الْوَسْوَسَۃِ

یقول ابوالاسعاد :۔ یہاں تین مباحث ہیں :۔

اَلْبَحْثُ الْاَوَّلُ ۔ فِیْ ذِکْرِ التَّعْرِیْفِ وَحُکْمِ الْوَسْوَسَۃِ

وسوسہ کے دو معنیٰ ہیں لغوی اور شرعی۔

وَسْوَسَہ کا لُغوی معنیٰ وَسْوَسَۃٌ دَحْرَجَۃٌ کے وزن پر ہے یہ رباعی مجرّد کا مصدر ہے اس کی جمع وسَاوِس آتی ہے۔ لغت میں وساوس کا معنیٰ ہوتا ہے اَلصَّوْتُ الْخَفِیُّ یعنی آہستہ آہستہ باتیں کرنا۔

شرعی و اصطلاحی معنیٰ ——— اَلْوَسْوَسَۃُ ھِیَ حَدِیْثُ النَّفْسِ وَالْاَفْکَارِ وہ خیالات

جو دل میں آتے ہیں ۔ پھر خیالات دو قسم ہیں :-

اوّل ۔ بعض خیالات ایسے ہوتے ہیں جو رذائل کی طرف دعوت دیتے ہے ۔ ان کو وسوسہ کہا جاتا ہے ۔

دوم ۔ بعض خیالات ایسے ہوتے ہیں جو فضائل کی طرف دعوت دیتے ہیں ان کو الہام کہا جاتا ہے ۔

حکمِ وَسوَسہ یہ کہ جو برے خیالات از خود یعنی غیر اختیاری طور پر آجائیں تو ان پر مؤاخذہ نہیں لیکن جو بُرے خیالات انسان اپنے قصد و اختیار سے لائے یا غیر اختیاری وساوس میں غور وخوض شروع کر دے تو ان دونوں پر مؤاخذہ ہوگا ۔

اِلہام کا حُکم یہ کہ انبیاء علیہم السّلام کا اِلہام ایک قسم کی وحی ہے جو قطعی حجت اور قابلِ عمل ہے ۔ لیکن غیر نبی کا الہام قطعی حجت و قابلِ عمل نہیں بلکہ اس میں غلطی کا احتمال بھی ہے ۔

اَلبحثُ الثّانیْ

فِیْ ذِکْرِ اَقْسَامِ خِیَالَاتِ قَلبِیَۃ مَعَ الدَّلَائِلِ وَالْحکمِ

محدثینؒ حضرات نے دل میں آنے والے خیالات کی پانچ قسمیں بیان فرمائی ہیں :-

۱ ہاجس ۲ خاطر ۳ حدیث النفس ۴ ہمّ ۵ عزم ۔

ہاجس کی تعریف ہاجس ھجس سے ہے بمعنیٰ گذرنا اور ہاجس بھی اس خیال کو کہتے ہیں جو از خود دل میں آئے اور فوراً نکل جائے ۔ دل میں قرار نہ پکڑے ۔

خاطر کی تعریف خاطر یہ خطور (ن ض) سے مشتق ہے بمعنیٰ پیش آنا ۔ یعنی جو خیالات دل میں بار بار آتے ہیں اور کچھ دیر جولانی کر کے چلے جائیں مگر فعل اور عدمِ فعل کی طرف کچھ بھی متوجّہ نہ کرے ۔

حَدِیثُ النّفس کی تعریف ۔ اس خیال کو کہتے ہیں جو دل میں آئے اور ٹھہرے ۔ فعل یا عدمِ فعل کے متعلق کچھ بات بھی ہوئی لیکن کسی جانب کو ترجیح نہیں دی ۔

ان تینوں قسموں کا حکم ان تین قسموں پر نہ ثواب ہے ، نہ عِقاب ۔ یعنی اگر یہ خیالات اچھے ہوئے تو ثواب نہیں ہوگا ، بُرے ہوئے تو عقاب نہیں ہوگا ثواب وعقاب کا تعلق ان باتوں سے ہوتا ہے ۔ جو آدمی کے اختیار میں ہوں ۔ غیر اختیاری، چیز پر نہ ثواب ہے نہ عقاب بدلیل قولہٗ تعالیٰ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا ۔ (بقرہ آیت ۲۸۶) کیونکہ تکلیف مَالَا یُطَاق کسی اُمّت کے لیے جائز نہیں ۔

ھَمّ کی تعریف ھَم اس خیال کو کہتے ہیں جو دل میں ٹھہرے، اور فعل یا عدم ایک جانب کو ترجیح بھی دی ۔ لیکن یہ ترجیح ہلکی سی تھی ، قوی نہ تھی ۔

ھَمّ کا حُکم ۔ ہم کا حکم یہ ہے کہ اس میں ثواب تو ہے لیکن عذاب نہیں نیکی کا ہم ہو تو ثواب ہے اور بدی کا ہم ہو تو عذاب نہیں ۔

دلیل عَنْ اَنَسٍ وَمَنْ ھَمَّ بِحَسَنَۃٍ فَلَمْ یَعْمَلْھَا کُتِبَتْ لَہٗ حَسَنَۃً فَاِنْ عَمِلَھَا کُتِبَتْ لَہٗ عَشْرًا وَمَنْ ھَمَّ بِسَیِّئَۃٍ فَلَمْ یَعْمَلْھَا لَمْ تُکْتَبْ لَہٗ شَیْئًا ۔ الخ ۔ (مشکوٰۃ شریف ج۲ ص۵۲۸ باب ۹ فی المعراج)

جب کہ سابقہ اُمتوں پر ھَمّ سیئۃ میں مُؤاخذہ تھا ۔

عزم کی تعریف عزم بالجزم کی تعریف یہ ہے کہ اگر جانبِ فعل کو قوی ترجیح ہو جائے ۔ اور اس پر پختہ ارادہ بھی ہو جائے اور ہر قسم کے اسباب بھی مہیا کرلے ، اگر مانع پیش نہ آئے تو وہ کام کر گزرے ۔

عَزم بالجزم کا حُکم عزم بالجزم میں عذاب بھی ہے اور ثواب بھی ہے یعنی اگر عزم نیکی کا ہے تو ثواب ہے اور اگر عزم بدی کا ہے تو عذاب ہے ۔

اختلافی مسئلہ اس میں فقہاء کا اختلاف ہے کہ بدی کے عزم پر مؤاخذہ ہے یا نہیں ؟ اس بارے میں دو مسلک ہیں :۔

مسلک اوّل جمہور محدثینؒ وفقہاءؒ کے نزدیک اگر عزم نیکی کا ہے تو ثواب ہے اور اگر عزم بدی کا ہے تو عذاب ہے ۔

دلیل جمہور حدیث صحیح میں ہے " اِذَا التَقَی المُسْلِمَانِ بِسَیفِہِمَا فَالقَاتِل وَالمَقتُولُ فِی النَّار " صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ قاتل نے تو قتل کیا لیکن مقتول کا گناہ کیا ہے۔ آپ نے فرمایا " اِنَّہ کَانَ حَرِیصًا عَلیٰ قَتلِ صَاحِبِہ ۔ یعنی مقتول کے جہنمی ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا بھی قتل کرنے کا پختہ ارادہ تھا۔ (مشکوٰۃ شریف ص۳۰۰ ج۲ باب قَتْلِ اَھلِ الرِّدَّۃِ والسُّعَاۃِ بِالفَسَادِ فصل اول)

مسلک دوم ۔ بعض علماء کے نزدیک عزم سیئہ میں بھی مؤاخذہ نہیں ہے۔

دلیل حدیث باب " اِنَّ اللہَ تَجَاوَزَ عَنْ اُمَّتِی مَا وَسْوَسَتْ بِہ صُدُورُھَا مَالَمْ تَعْمَلْ بِہ اَوْ تَتَکَلَّمْ مُتَّفَق علیہ (مشکوٰۃ ج۱ ص۱۸)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب تک وسوسہ عمل اور قول مثلاً قتل اور غیبت کی حد تک نہ پہنچے معاف ہے۔ تو ثابت ہوا کہ محض بدی کے عزم پر بھی مؤاخذہ نہیں بلکہ وہ بھی معاف ہے۔ جمہور حضرات نے اس کے مختلف جواب دیے ہیں۔

جواب اوّل ۔ حدیث کے قرینہ سے یہاں وَسْوَسَتْ سے مراد ھَمّ کا درجہ ہے نہ کہ عزم بالجزم کا، اور ھمّ سیئہ میں عدم مؤاخذہ کے ہم بھی قائل ہیں۔

جواب دوم ۔ تجاوز سے مراد یہ ہے کہ عزم سیئہ میں فعل سیئہ جیسا مؤاخذہ نہ ہوگا بلکہ اس سے کم گناہ ہوگا۔ بخلاف پہلی اُمتوں کے کہ ان کے لیے عزم معصیت پر بھی فعل معصیت کا مؤاخذہ وعذاب تھا۔

یقول ابو الاسعاد : جو حضرات عزم بد و شر پر مؤاخذہ کے قائل ہیں ان کا آپس میں اختلاف ہوا ہے کہ اس مؤاخذہ کی نوعیت کیا ہوگی۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ ایسے عزائم کی سزا مصائب کی شکل میں دنیا ہی میں دیدیتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ آخرت میں مؤاخذہ ہوگا لیکن عتاب کی صورت میں ہوگا (عقاب) عذاب کی صورت میں نہیں۔ اور بعض حضرات اس کے قائل ہیں کہ عزائم شر پر آخرت میں عذاب بالنار بھی ہو سکتا ہے۔ کسی شاعر نے خیالات کی ان پانچ قسموں اور ان کے حکموں کو نظم کر دیا ہے۔

؎ مَرَاتِبُ القَصْدِ خَمْسٌ ھَاجِسٌ ذَکَرُوا ۔۔۔ فَخَاطِرٌ فَحَدِیثُ النَّفسِ فَاسْتَمِعَا

يَلِيهِ هَمٌّ فَعَزْمٌ كُلُّهَا رُفِعَتْ ـــــ سِوَى الْأَخِيْرِ فَفِيْهِ الْأَخْذُ قَدْ وَقَعَا

(حاشیہ جلالین شریف نمبر ۲۳ ص ۲۲۹ ج ۱)

سوال ارشاد باری تعالیٰ ہے " وَإِنْ تُبْدُوا مَا فِيٓ أَنْفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ " یہاں لفظ مَا عام ہے جس میں ہر قسم کے خطرات داخل ہیں جس کیلئے مُحاسبہ ثابت کیا گیا ۔ جب کہ حدیث الباب میں بھی مَا عام ہے جس کے لیے تجاوز یعنی معافی ثابت کی گئی فَتَعَارَضَا ۔

جواب اوّل امام قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ حدیث الباب احکام دنیا سے مُتعلق ہے ۔ یعنی بیع ہبہ اور طلاق وغیرہ ۔ مطلب یہ ہے کہ یہ احکامات وغیرہ دل میں ارادہ کرلینے سے منعقد نہیں ہوجاتے ۔ جب تک ان کو زبان اور عمل سے نہ کیا جائے اور آیت احکام آخرت سے متعلق ہے ۔ مثلاً عقیدہ شرک ، عقیدہ انکار ختم نبوّت ، حسد ، بُغض اور کینہ وغیرہ ان میں بلا قول وعمل محض استقرار کی صورت میں مُحاسبہ اور عذاب ہوگا ۔

جواب دوّم وسوسہ دو قسم ہے ۱ اختیاریہ ۲ غیر اختیاریہ ۔ حدیث میں وساوس اور خیالات غیر اختیاریہ مراد ہیں اور آیت میں جس محاسبہ کا ذکر ہے اس سے مراد وہ ارادے اور وساوس ہیں جو انسان اپنے قصد اور اختیار سے اپنے دل میں جمالیتا ہے اور اسباب بھی مہیّا کرلیتا ہے ۔ اتفاقاً موانع آنے سے عمل نہیں کرسکتا ۔

جواب سوّم مَا فِيٓ أَنْفُسِكُمْ میں تمام خطرات و وساوس داخل ہیں مگر آیت لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا سے وہ منسوخ ہے ۔

(حاشیہ جلالین علیٰ هٰذه الآیۃ)

اَلْبَحْثُ الثَّالِثُ ـــــ فِيْ ذِكْرِ عِلَاجٍ لِدَفْعِ الْوَسَاوِسِ

علماء حضرات ومشائخ صوفیاء کرام نے دفع وساوس کے لیے کئی طریقے بیان کئے ہیں ۔ ان میں سے دو عمدہ اور آسان طریقے یہ ہیں :۔

طریقہ اوّل عدم التفات یعنی وساوس کی طرف دھیان اور توجہ ہی نہ کرے بلکہ اپنے کام میں لگا رہے اور ان کے دفع کرنے کا اہتمام ہی نہ کرے۔

طریقہ دوم۔ عدم مؤاخذہ واُمید اجر یعنی یہ تصور کرے کہ جب شریعت نے غیر اختیاری وساوس میں مؤاخذہ نہیں رکھا تو پھر غم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ بلکہ ان وساوس سے طبیعت میں کلفت وتشویش ہوتی ہے تو اس کلفت وتشویش کی برداشت میں اجر وثواب کی امید ہے۔

یقول ابوالاسعاد : دراصل ہر شخص کا مزاج جدا ہوتا ہے اس لیے مزاج کے بدلنے سے علاج بھی بدل جاتا ہے۔ ایسے موقعہ پر سب سے بہترین طریق اپنے شیخ کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ وہ حسب مزاج علاج تجویز کر دیں گے۔ اگر اس مُبارک طریق کا راہی نہیں تو پھر تلاوت قرآن پاک کثرت سے کرے۔ کیونکہ اس مبارک ومُقدس کلام کا نزول مبنی بر شفاء ہے۔ کما فی قولہٖ تعالیٰ " يٰاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ " (پ ۱۱ یونس)

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

یہ پہلی فصل ہے

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ تَجَاوَزَ عَنْ اُمَّتِيْ مَا وَسْوَسَتْ بِهٖ صُدُوْرُهَا مَالَمْ تَعْمَلْ بِهٖ اَوْ تَتَكَلَّمْ۔

ترجمہ : روایت ہے حضرت ابوہریرہؓ سے فرماتے ہیں کہ فرمایا نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم نے یقیناً اللہ تعالیٰ نے میری اُمت سے ان کے دلی خطرات میں درگذر فرما دی۔

قولہٗ اُمَّتِيْ : اُمتِ اجابت مراد ہے۔

قولہٗ وَسْوَسَتْ : یہ لازمی بھی آتا ہے اور متعدی بھی۔ اگر لازمی بناؤ تو صَدُوْرُھَا اس کا فاعل بنے گا اور بِہٖ کا ضمیر مَا کی طرف ہوگا تو معنیٰ ہوگا کہ معاف کر دیا میری امت سے ان خیالات کو جو خیال کرتا ہے ساتھ ان خیالوں کے سینہ ان کا۔ اگر مُتَعَدِّیْ بناؤ تو پھر وَسْوَسَتْ بمعنیٰ حَدَّثَتْ ہوگا۔ تو پھر صَدُوْرُھَا منصوب ہوگا اور ھِیَ ضمیر وَسْوَسَتْ کا امت کی طرف ہوگا معنیٰ ہوگا "معاف کر دیا میری امت سے ان خیالات کو جو بات کرتی ہے وہ امت ساتھ ان خیالات کے اپنے دل میں" تو صَدُوْرُھَا بمعنیٰ نفسھا ہوگا۔

قولہٗ مَالَمْ تَعْمَلْ بِہٖ اَوْ تَتَکَلَّمْ ۔ وسواس دو قسم ہیں ۱؎ فعلی ۲؎ قولی۔ مَالَمْ تَعْمَلْ کا تعلق فعلی کے ساتھ ہے۔ اور اَوْ تَتَکَلَّمْ کا تعلق قولی کے ساتھ ہے۔

حدیث کی اصلی بحث

نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث ہذا میں عزائم قلبیہ کو بیان فرمایا ہے، عزائم قلبیہ کی تین قسمیں ہیں:۔

اوّل وہ عزائم قلبیہ جن کا تعلق اعتقادات سے ہے جیسے عقائدِ حقّہ، توحید و رسالت، ختم نبوت اور جیسے عقائدِ باطلہ، انکارِ توحید، انکارِ رسالت، انکارِ ختم نبوّت۔ عزائم کی اس قسم میں سب کا اتفاق ہے۔ اگر عقائد حقہ ہیں تو ان پر اجر ملے گا، اگر عقائد باطلہ ہیں تو ان پر عذاب ہوگا۔

دوم وہ عزائم جن کا تعلق مَلکات اور اخلاق سے ہے۔ ان میں کچھ مَلکات محمودہ ہیں، اور اخلاق حمیدہ ہیں جیسے صبر، شکر، تواضع، توکّل اور کچھ ملکات مذمومہ اور اخلاقِ رذیلہ ہیں۔ جیسے حُبِّ دنیا، حسد، کبر اس قسم میں بھی سب علماء کا اتفاق ہے کہ اخلاق حمیدہ پر اجر ہے اور اخلاق رذیلہ پر عذاب ہے۔

سوم دل کے وہ عزائم جن کا تعلق افعال جوارح سے ہے۔ مثلاً کسی نے عزم کیا کہ میں سُود لوں گا یہ عزم شر ہے اس پر مؤاخذہ ہوگا۔ بشرطیکہ اس کا ارتکاب و مُباشرت ہو یا جن کا تعلق اَفعال جوارح سے ہے مگر خیر سے مثلاً نماز پڑھنا، صدقہ کرنا وغیرہ اس پر بھی اجر ہے۔ بغیر مُباشرت کے اور وَسْوَسَتْ سے مراد اَفعال جوارح شر والے مراد ہیں۔

وَعَنْهُ قَالَ جَآءَ نَاسٌ مِّنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَأَلُوْهُ اِنَّا نَجِدُ فِيْ اَنْفُسِنَا مَا يَتَعَاظَمُ اَحَدُنَا اَنْ يَّتَكَلَّمَ بِهٖ

ترجمہ: چند صحابہؓ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ ہم اپنے دلوں میں بعض ایسی باتیں (وسوسے) پاتے ہیں جن کو بیان کرنا بھی ہم برا سمجھتے ہیں۔

قولہٗ نَاسٌ ۔ ای جَمَاعَۃٌ مِّنَ الصَّحَابَۃِؓ۔

قولہٗ مَا يَتَعَاظَمُ ۔ اَیْ نَجِدُ فِیْ قُلُوْبِنَا اشیاءً قَبِیحَۃً نحو مَنْ خَلَقَ اللّٰہ وَکَیْفَ ھُوَ وَغیرہٗ، ثانیًا تعاظم بروزن تفاعل بمعنی المُبالغۃ۔ جو زیادتی معنی پر دال ہے یعنی عظیم سمجھتے ہیں عظیم سمجھنا " ای تَسْتَعْظِمُ غَایَۃَ الاِسْتِعْظَامِ۔

قولہٗ اَحَدُنَا ۔ بِرَفْعِ الدَّالِ مَعْنَاہُ یجد احدنا التکلم۔

قولہٗ اَوَقَدْ ۔ ہمزہ کا استفہام تقریری ہے۔ اور ہمزہ کے بعد اور واؤ سے پہلے معطوف علیہ مقدر ہے اصل میں تھا " حصل ذالک وقد وجد تموہ اور ہٗ کا ضمیر یتعاظم کی طرف راجع ہے۔

فائدہ ۔ وَجَدْتُمُوْہُ کے ہٗ ضمیر کے مرجع اور ذَالِکَ کے مشارالیہ کون ہیں اس میں دو قول ہیں۔

قولِ اوّل یہ کہ ہٗ ضمیر کا مرجع اور ذَالِکَ کا مشارالیہ تعاظم یعنی ان وساوس کو گراں سمجھنا۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال فرمایا کہ کیا واقعی تم ان وساوس کو گراں سمجھتے ہو یہ گراں سمجھنا تو صریح ایمان ہے۔ اس لیے کہ اس گرانی کا منشاء اللہ اور اس کے رسولؐ کی شدید محبت ہے کہ ان کی شان کے خلاف غیر اختیاری وساوس بھی برداشت نہیں کر سکتے۔

قولِ دوم یہ کہ ضمیر کا مرجع اور ذالک کا مشارالیہ وساوس ہیں۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ واقعی تم کو وساوس آنے لگے ہیں۔ یہ وساوس آنا تو صریح ایمان ہے۔ یعنی وساوس ایمان کی علامت ہیں ان سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ اس لیے کہ وساوس شیطان لاتا ہے

اور شیطان دشمن ہے دشمن وہیں نقب لگاتا ہے ۔ جہاں سرمایہ ہو وساوس آنے سے معلوم ہوا کہ تمہارا دل دولتِ ایمان سے مالا مال ہے ۔

سوال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وساوس کو ایمان کے صریح ہونے کی علامت قرار دیا ہے اس میں کیا حکمت ہے ؟ کیونکہ بظاہر وساوس اور ایمان میں تبعّد ہے ۔

جواب شیطان کافروں کو کھلونے کی طرح بنا کر ان پر قبضہ کامل کرتے ہوئے ہمیشہ ان کے ساتھ کھیلتا رہتا ہے ۔ کفار میں صرف وسوسہ ڈالنے پر اکتفاء نہیں " بَلْ يَتَلَاعَبُ بِهِمْ كَيْفَ اَرَادَ ۔ اور مؤمنوں کو اس مرتبہ میں بے جانے سے ناامیدی ہونے کی بناء پر قبضہ کامل تو نہیں کر سکا ۔ لہٰذا وسوسہ ڈالتا ہے ۔ اب وسوسہ کا سبب محض الایمان یا وسوسہ علامت محض الایمان ہے ۔ اگر ایمان نہ ہوتا بلکہ کافروں کی طرح ہوتے تو فقط وسوسہ ڈالنے پر اکتفاء نہ کرتا ۔ جیسا کہ ملّا علی قاریؒ نے کہا کہ چور اس گھر میں داخل نہیں ہوتا جو خالی ہو ۔ لہٰذا کافروں سے تو وہ فارغ الذمہ ہو گیا ۔ اب مؤمنوں کی فکر ہے " وَلِذَا رُوِيَ عَنْ عَلِيٍّ اِنَّ الصَّلٰوةَ الَّتِيْ لَا وَسْوَسَةَ فِيْهَا اِنَّمَا صَلٰوةُ الْيَهُوْدِ وَالنَّصَارٰى » اس سے معلوم ہوا کہ کاملین کو بھی وساوس آسکتے ہیں ۔ وساوس کسی نقص کی علامت نہیں ۔ بعض صحابہ کرامؓ کو ایسے وساوس آتے تھے ۔ فرماتے ہیں کہ ہم جل کر کوئلہ ہونا تو پسند کر سکتے ہیں ، ان کو زبان پر نہیں لا سکتے ۔

لِاَنْ اَكُوْنَ حُمَمَةً اَحَبُّ اِلَيَّ مِنْ اَنْ اَتَكَلَّمَ بِهٖ (مشکوٰۃ شریف ص۱۹ ج ا باب الوسوسہ)

وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَأْتِي الشَّيْطَانُ اَحَدَكُمْ فَيَقُوْلُ مَنْ خَلَقَ كَذَا مَنْ خَلَقَ كَذَا حَتّٰى يَقُوْلَ مَنْ خَلَقَ رَبَّكَ فَاِذَا بَلَغَهُ فَلْيَسْتَعِذْ بِاللّٰهِ وَلْيَنْتَهِ ۔

ترجمہ : روایت ہے انہی سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ تم میں سے کسی کے پاس شیطان آتا ہے تو اس سے یہ کہتا ہے کہ فلاں فلاں چیز کو کس نے پیدا کیا یہاں تک کہ پھر وہ اس سے پوچھتا ہے کہ تیرے پروردگار کو کس نے پیدا کیا ۔ جب اس حد کو پہنچے تو اَعُوْذُ بِاللّٰهِ پڑھو اور اس سے باز رہو ۔

قولہٗ یَأْتِی الشَّیْطَانُ ۔ یا تو خود ابلیس مراد ہے کیونکہ وہ تمام دنیا پر نظر رکھتا ہے اور سب جگہ چکر لگاتا رہتا ہے۔ یا قرین جو ہر ایک انسان کا الگ الگ شیطان ہے اور ہر وقت اس کے ساتھ رہتا ہے یا برا انسان جو ایسی باتیں کرکے لوگوں کو بہکائے۔

قولہٗ فَیَقُوْلُ مَنْ خَلَقَ کَذَا ۔ یہاں سے تمہید کفر ہے یعنی جب کفر کرانا مقصود ہو تو پہلے تمہید باندھتا ہے کہ اس کو کس نے پیدا کیا۔ یہاں تک کہ ذات باری تعالیٰ کی خلقت تک پہنچا دیتا ہے۔ تو نتیجۃً انسان حیران و سرگردان ہوکر وجود باری تعالیٰ کی خلقت میں سوچنا شروع کر دیتا ہے۔ حالانکہ پیدا وہ چیز کی ہے جو ناپید بھی ہو سکے۔ رب تعالیٰ واجب الوجود ہیں۔ ان کو کون پیدا کرے۔

ثانیًا :۔ اگر خالق کے لیے بھی خالق ہو تو خلقت کا تسلسل لازم آئے گا جو باطل ہے۔ اور مستلزمِ باطل خود باطل ہے۔ لہذا یہ سوال بھی غلط ہے۔

سوال ۔ یہ ہے کہ دونوں مقام پر آنحضرتؐ نے یَقُوْلُ کہا۔ حالانکہ وہ زبان سے تو نہیں کہتا بلکہ دل میں وسوسہ ڈالتا ہے۔

جواب ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یَقُوْلُ کہہ کر اشارہ فرمانا چاہتے ہیں کہ دل کی بات (یعنی وسوسہ) پر بھی قول کا اطلاق ہوتا ہے۔

قولہٗ فَاِذَا بَلَغَہٗ ۔ ہٗ ضمیر کا مرجع قول کی طرف راجع ہے۔

قولہٗ فَلْیَتَعَوَّذْ بِاللّٰہِ ۔ تعوذ دو قسم پر ہے (۱) لسانی یعنی قولی (۲) فعلی ۔ تعوّذ قولی واجب نہیں بلکہ مستحب ہے۔ اور تعوّذ قولی واجب ہے۔

قولہٗ وَالْیَنْتَہِ ۔ یعنی تعوذ کے بعد اس فکر سے رُک جائے یعنی اس کے سوال کا جواب سوچنے کی کوشش بھی مت کرو۔ کیونکہ ہر سوال کا جواب نہیں دیا جاتا۔ رب ذوالجلال نے شیطان کے سجدہ نہ کرنے پر اس کے دلائل کا جواب نہ دیا بلکہ فرمایا فَاخْرُجْ مِنْھَا ۔

یقول ابوالاسعاد : معالج حقیقی نے اپنے فرمان میں وساوس سے بچنے کے لیے چار طریقے بتائے ہیں۔

(۱) ـــــ مالکِ حقیقی کی پناہ لینا ۔ جو اس کی پناہ میں آتا ہے اس کو پناہ مِل جاتی ہے۔

(۲) ـــــ تذلیلِ خصم ۔ یعنی وہیں رُک جانا، اور بات کو آگے نہ بڑھنے دینا۔

ع جوابِ جاہلاں باشد خموشی۔

٢ ـــــ ذکر اللہ ۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے" اِنَّ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا اِذَا مَسَّهُمۡ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیۡطٰنِ تَذَکَّرُوۡا فَاِذَا هُمۡ مُّبۡصِرُوۡنَ (پ٩ الاعراف)

٣ ـــــ تجدیدِ ایمان، ایمان کی تجدید کرنا ـــــ پہلے اور دوسرے طریقہ کی طرف اسی حدیث میں اشارہ ہے ۔ مثلاً طریقہ اوّل استعاذہ ہے جو فَلۡیَسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِ سے سمجھا جارہا ہے ۔ دوّم : رک جانا وَلۡیَنۡتَهِ سے سمجھا جارہا ہے ۔ سوّم : آیت مذکورہ سے مستنبط ہے ۔ اور طریقہ چہارم تجدیدِ ایمان اگلی حدیث میں مذکور ہے جو فَلۡیَقُلۡ اٰمَنۡتُ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ سے سمجھا جارہا ہے ۔

ترجمہ : نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے رہیں گے ۔	وَعَنۡ اَبِیۡ هُرَیۡرَةَ لَا یَزَالُ النَّاسُ یَتَسَاءَلُوۡنَ

قولہٗ لَا یَزَالُ النَّاسُ : اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا کام ہی خلقِ خدا کو طریقِ مستقیم سے ہٹا کر طریقِ شبہات میں ڈالنا ہے ۔ جیسا کہ آج کل وجودِ خدا کے منکر دہریہ کہتے ہیں۔

قولہٗ فَلۡیَقُلۡ اٰمَنۡتُ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ؛ یا تو بطورِ تسلّی اور دفعِ وساوس کے یہ الفاظ کہے کہ اللہ اور اس کے رسولوں نے جو کچھ ذات وصفاتِ باری تعالیٰ کے متعلق بیان کیا ہے اس پر ایمان لایا " وَهُوَ اَنَّهٗ قَدِیۡمٌ وَاحِدٌ " یا بطورِ ایمان کی تازگی و پختگی کے یہ الفاظ کہے ۔ کیونکہ ایسے خیالات سے ایمان کمزور ہوجاتا ہے اور یہ وساوس حدِ کفر تک پہنچا دیتے ہیں۔

یقول ابوالاسعاد : شیطان دو قسم ہیں ایکؒ وہ جو آنکھوں سے نظر آئے ۔ یہ شیطان الانس ہیں ۔ دوّم جو آنکھوں سے نظر نہ آئیں یہ شیطان الجن ہیں ۔ جو آنکھوں سے نظر آئیں، ان کے شر سے حفاظت کی صورت اعراض اور درگذر کرنا ہے ۔ دوسری قسم کا علاج استعاذہ ہے ۔

اس حدیث میں شیطان الانس کی طرف اشارہ ہے ۔ ان دونوں صورتوں کو کسی شاعر

سے نظم کیا ہے۔

۵ فَمَاھُوَاِلَّا الِاستعَاذۃ ضَارِعًا	اَوِالدَّفع بِالحُسنیٰ خَیرُ مُطلوب
فھٰذا دواء الداء من شرّ مایرٰی	وذالکَ دواءُ الداء من شرّ محجوب

زاد المعاد صہ ۴۸ ج ۲

حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ اگر انسان کو خالق کے بارے میں وسوسہ پڑے تو اس کا علاج یہ کلمات ہیں " ھُوَالاَوَّلُ وَالآخِرُ وَالظَّاھِرُ وَالبَاطِنُ وَھُوَ بِکُلِّ شَیئٍ عَلِیمٌ (پ ۲۷)

وَعَن ابنِ مَسعُودٍؓ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَسَلَّمَ مَا مِنکُم مِّن اَحَدٍ اِلَّا وَقَد وُکِّلَ بِہٖ قَرِینُہٗ

ترجمہ: روایت ہے حضرت ابن مسعودؓ سے فرماتے ہیں کہ فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تم میں سے ایسا کوئی نہیں جس پر ایک ساتھی جن اور ایک ساتھی فرشتہ مقرر نہ ہو۔

قولہٗ وُکِّلَ ۔ یہ توکیل سے ہے بمعنی تسلیط یعنی مسلّط کر دیا جاتا ہے۔

قولہٗ قَرِینُہٗ مِنَ الجِنِّ ۔ اس کا نام اہرمن یا وسواس ہے جو بدی کا حکم کرتا ہے۔

قولہٗ قَرِینُہٗ مِنَ المَلٰئِکَۃِ ۔ اس کا نام مُلہِم ہے جو اس کو اچھائی کا حکم کرتا ہے۔ یہ کراماً کاتبین کے علاوہ ہے۔

خُلاصَہ یہ کہ جب انسان پیدا ہوتا ہے تو دو ساتھی اس کے ساتھ لگا دیے جاتے ہیں، اوّل فرشتہ، دوم جن۔ پھر ہر ساتھی اپنی اپنی فطرت کے مطابق انسان کو چلانے کی کوشش کرتا ہے۔

قولہٗ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ اَعَانَنِی عَلَیہِ فَاَسلَمَ ۔ یہاں دو روایتیں ہیں۔

۱ اَسلَمُ (میم کے ضمہ سے مضارع متکلّم کا صیغہ) سَلَامَۃ باب سَمِعَ سے یعنی میں اس کے شر اور وسوسہ سے سالم اور محفوظ رہتا ہوں۔ یہ علامہ خطابیؒ کا قول ہے۔

۲۔ اَسۡلَمَ (بفتح المیم ماضی کا صیغہ) اِسلام سے بمعنیٰ منقاد ہونا، یعنی وہ میرے تابع و منقاد ہوگیا ہے یعنی مجھے برائی کا حکم نہیں کرتا۔ مفسّرینؒ حضرات کا ان دونوں معنوں پر زور ہے۔ قاضی عیاضؒ اَسۡلَمَ کا معنیٰ کرتے ہیں کہ وہ شیطان مسلمان ہوگیا۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے:۔

شَیۡطَانُ اٰدَمَ کَانَ کَافِرًا وَشَیۡطَانِیۡ مُسۡلِمًا۔

سوال۔ یہ کہ شیطان کیسے مسلمان ہوگیا؟ کیونکہ اس کی پیدائش طبعًا و فطرۃً کفر پر ہے۔

جواب۔ جو بڑا شیطان ہے وہ مسلمان نہیں ہوسکتا اور وہ لوگوں کو کافر بناتا رہتا ہے۔ باقی دوسرے شیطان جو جنّوں سے ہیں وہ مسلمان ہوجاتے ہیں۔ ان کا اسلام لانا قرآن سے ثابت ہے حتّٰی کہ شاہ صاحبؒ نے لکھا ہے کہ بڑے شیطان کا بیٹا بھی حضرتؐ پر ایمان لایا تھا اور مسلمان ہوا تھا کیونکہ جس اللہ نے اس کو کفر پر پیدا کیا، اسی اللہ کی قدرت ہے کہ اس کے اندر قبولِ اسلام کی صلاحیت پیدا کردے۔ کَمَا قَالَہٗ علامہ کاندھلویؒ "فَاِنَّ اللّٰہَ ھُوَالۡقَادِرُ عَلٰی کُلِّ شَیۡئٍ وَلَا یُسۡتَبۡعَدُ مِنۡ فَضۡلِہٖ اَنۡ یَّخُصَّ نَبِیَّہٗ صلی اللہ علیہ وسلم بِاَمۡثَالِ ھٰذِہِ الۡکَرَامَۃِ وَبِمَا ھُوَ فَوۡقَھَا۔ اور خصوصًا فَلَا یَاۡمُرُنِیۡ اِلَّا بِخَیۡرٍ اس صورت کی تائید کرتی ہے۔

وَعَنۡ اَنَسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ اِنَّ الشَّیۡطَانَ یَجۡرِیۡ مِنَ الۡاِنۡسَانِ مَجۡرَی الدَّمِ۔

ترجمہ: روایت ہے حضرت انسؓ سے فرماتے ہیں فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ شیطان انسان کے خون کے ٹھکانوں میں گردش کرتا ہے۔

قولہٗ مَجۡرَی الدَّمِ ۔ مَجۡرٰی میں دو احتمال ہیں:۔

(۱) مجری مصدر میمی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شیطان انسان کے جسم میں بڑی تیزی سے اور غیر محسوس طریقہ سے چلتا ہے۔

۲۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ مَجۡرٰی ظرف مکان ہے تو مطلب یہ ہوگا کہ شیطان بھی انسان کی ہر رگ میں اثر انداز ہوتا ہے جیسا کہ خون جسم کے ہر حصّہ میں پہنچتا ہے۔

سوال ۔ حدیث پاک کی مراد کیا ہے ؟

جواب ۔ محدثین حضرات نے اس کے دو مطلب بیان کیے ہیں :۔

اوّل ۔ کہ یہ حدیث اپنے ظاہر پر محمول ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ واقعی شیطان خون کی طرح رگوں میں گردش کرتا ہے ۔

دوم ۔ دوسری رائے یہ ہے کہ حدیث کا حقیقی معنیٰ مراد نہیں بلکہ یہ کنایہ ہے تسلّط اور غلبہ سے یعنی جس طرح خون ہر وقت جسم میں گردش کرتا رہتا ہے ۔ اسی طرح شیطان بھی ہر وقت انسان پر مُسلّط رہتا ہے کیونکہ اللہ پاک نے اس کو قیامت تک اس تسلّط کی طاقت عطا کر رکھی ہے ۔

(قَالَ رَبِّ اَنْظِرْنِیْ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ (پ ۱۴ س حجر)

وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ بَنِیْ اٰدَمَ مَوْلُوْدٌ اِلَّا یَمَسُّهُ الشَّیْطَانُ حِیْنَ یُوْلَدُ۔

ترجمہ : روایت ہے حضرت ابوہریرہؓ سے فرماتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی آدمی زادہ ایسا نہیں جسے پیدائش کے وقت شیطان چھوتا نہ ہو۔

قولہ مَوْلُوْدٌ ۔ مَوْلُوْدٌ مرفوع ہے کیونکہ یہ فاعل ہے اور ظرف ہے مِنْ بَنِیْ اٰدَمَ کا۔

سوال ۔ یہ کہ ظرف اس وقت عمل کرتا ہے جب سہارا پکڑے ۔

جواب ۔ یہاں ظرف کا سہارا حرفِ نفی مَا پر ہے ۔

دوسری ترکیب ۔ مِنْ بَنِیْ اٰدَمَ خبر مقدم ہے اور مَوْلُوْدٌ مُبتداء مؤخر ہے۔

سوال ۔ تم مُبتداء بنا رہے ہو مَا کا عمل کہاں جائے گا یہ مُشبّہ بلیس ہے اور عمل کرتا ہے

جواب ۔ یہ ہے کہ ترکیب بدلنے سے مَا کا عمل باطل ہو جاتا ہے ۔ اب اس مقام پر دو بحثیں ہیں ۔

بحث اوّل ۔ کہ مَسّ سے کون سا مَسّ مُراد ہے حقی مَسّ مراد ہے یا کوئی اور چیز مراد ہے اس میں علماء کی دو آراء ہیں :۔

اوّل: عند البعض مَس سے مراد یا مَس کنایہ ہے وسوسہ سے کہ وسوسہ ڈالتا ہے۔
دوم: عند الجمہور مَس حسّی مراد ہے چنانچہ فَیَستہل صَارخًا کے الفاظ اسی پر دال ہیں۔ ثانیًا:۔ پیدائش کے وقت اکثر و بیشتر اس کا مشاہدہ ہوا ہے۔
حاصل حدیث: یہ ہے کہ جو بچہ بھی پیدا ہوتا ہے اس کو شیطان ضرور چھیڑتا ہے لیکن دو شخصیات کا اس سے استثناء کیا گیا ہے۔ ایک مریم علیہا السلام، دوسرے ان کے صاحبزادے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام۔ ان کو پیدائش کے وقت شیطان نے مَس نہیں کیا باجابتِ دُعاء وَاِنِّیْٓ اُعِیْذُھَا بِکَ وَذُرِّیَّتَھَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ (آل عمران پ۳)
بحث دوم ۔ علماء نے بحث کی ہے کہ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی شیطان نے مَس کیا ہے یا نہیں اس میں دو رائے ہیں۔
اوّل: عند البعض آپ کو شیطان نے مَس نہیں کیا۔
سوال ۔ یہ کہ اس حدیث میں صرف دو شخصیات کا استثناء کیا گیا ہے۔
جواب ۔ یہ ہے کہ چونکہ قرآن مقدس میں ان ہی دو کے لیے شیطان سے حفاظت کی دُعاء کا ذکر ہے۔ (کما فی قولہٖ تعالیٰ وَاِنِّیْٓ اُعِیْذُھَا بِکَ وَذُرِّیَّتَھَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ) اس لیے قبولیتِ دُعاء بتلانے کے لیے دو ہی کا استثناء کیا گیا ہے۔ حدیث میں مستثنیات کا احاطہ مقصود نہیں بلکہ اجابتِ دُعاء بتانا مقصود ہے۔
دوم ۔ دوسری رائے یہ ہے کہ عدم مَس صرف مریم علیہا السلام و عیسیٰ علیہ السلام کی خصوصیت ہے، اس پر دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔

سوال اوّل یہ ہے کہ اس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر فضیلت لازم آتی ہے۔ جب کہ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی افضل الانبیاء ہے

جواب اوّل ان دونوں مبارک ہستیوں کی فضیلت جزئی ہے۔ جس سے حضور علیہ السلام کی فضیلت کلّی پر کوئی حرج نہیں آتا اور مفضول کے اندر ایک جزوی فضیلت کا ہونا افضل کی فضیلت کلّی کے منافی نہیں ہے جیسے کہ حدیث پاک میں ہے کہ جس راستہ پر حضرت عمرؓ چلتے ہیں۔ شیطان وہ راستہ چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔ کیا کوئی اس سے یہ سمجھ سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل تھے کیونکہ حضرتؓ کے ساتھ یہ معاملہ

نہیں ہے تو صرف اس سے مقصود حضرت عمرؓ کی ایک جزئی فضیلت بیان کرنی تھی۔

جوابِ دوم اس عمومی مضمون میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم داخل ہی نہیں ہیں کیونکہ متکلّم عرفاً حکم سے خارج ہوتا ہے۔ چنانچہ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ میں کُلِّ شَیْءٍ سے خدا تعالیٰ خارج ہیں انہوں نے اپنی مثل نہیں بنائی۔

جوابِ سوم اگر آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم اور دوسرے انبیاء اس ضابطہ سے مُستثنیٰ نہ ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ جو لوگ اس صفت پر ہوں وہ بھی معصوم ہیں۔ لقولہٖ تعالیٰ " اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ "۔

سوالِ دوم ۔ یہ ہے کہ مَس شیطان تو عظمت کے منافی ہے۔

یقول ابوالاسعاد : عصمت کا معنیٰ ہے گناہ سے محفوظ رہنا۔ لہذا گناہ تو عصمت کے منافی ہے کوئی تکلیف ہو جانا عصمت کے منافی نہیں ہے اور مَسّ شیطان سے کوئی گناہ لازم نہیں آتا، یہ صرف ایک تکلیف ہے۔ کفار نے آنحضرتؐ کو بہت ایذائیں دیں ان سے عصمت پر کوئی فرق نہیں آیا۔ عصمت کو توڑنے والی معصیت ہے۔

قولہٗ فَيَسْتَهِلَّ : يَسْتَهِل اِهْلَال سے ہے بمعنیٰ رَفْعُ الصَّوْت صَارِخًا بمعنی الصَّوْت، یعنی بچہ چیختا ہے اور روتا ہے، یا پہلے کم روتا ہے پھر شدّتِ تکلیف کی وجہ سے زیادہ رونا شروع کر دیتا ہے۔

وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صِيَاحُ الْمَوْلُوْدِ حِيْنَ يَقَعُ نَزْغَةٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ۔

ترجمہ : روایت ہے انہی سے فرماتے ہیں فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین پر گرتے وقت بچہ کی چیخ شیطان کی چوک سے ہے۔

خُلَاصَةُ الْحَدِيْث : حدیث کا مطلب یہ ہے کہ بچہ کی پیدائش کے بعد شیطان بچہ کی کوکھ میں انگلی مارتا ہے اور اس کی تکلیف سے بچہ روتا ہے۔ اس لیے سُنّت ہے کہ بچہ پیدا ہوتے ہی اس کو غسل دے کر داہنے کان میں آذان اور بائیں کان میں تکبیر

کہی جائے تاکہ شیطان دفع ہو۔ کیونکہ آذان کی آواز سے شیطان بھاگتا ہے۔ کَمَا جَاءَ فِی قَوْلِ رسولِ اللّٰہ صَلَّی اللّٰہ عَلَیہِ وسلّم " عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا نُوْدِیَ بِالصَّلٰوۃِ اَدْبَرَ الشَّیْطَانُ (ابوداؤد شریف ص۸۳ ج۱ باب رَفعِ الصَّوت بِالْاَذَانِ)۔!

یقول ابوالاسعاد: مزید اس حدیث میں کوئی بحث نہیں یہ حدیث جمہور کا مستدل بنتی ہے جن کے نزدیک مَسّ شیطان حسّی ہے وسوسہ مُراد نہیں۔ کَمَا یَدُلُّ لفظ صیاح المولود۔

وَعَنْ جَابِرٍ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اِبْلِیْسَ یَضَعُ عَرْشَہٗ عَلَی الْمَاءِ ثُمَّ یَبْعَثُ سَرَایَاہُ یُفْتِنُوْنَ النَّاسَ

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ ابلیس اپنا تختِ حکومت پانی (سمندر) پر رکھتا ہے پھر وہاں سے اپنی جماعتوں کو لوگوں کے درمیان گمراہی پھیلانے کے لیے روانہ کرتا ہے۔

قولہٗ یَضَعُ عَرْشَہٗ ـــــ وضع عرش کے دو معنیٰ بیان کئے گئے ہیں:۔

اوّل: یہ کہ حقیقت پر محمول ہے کہ وہ ظاہری طور پر عرش اور تخت رکھتا ہے۔ ربّ ذوالجلال نے ابتلاء کے لیے شیطان کو اس بات کی قدرت دی ہے تاکہ وہ یہ سمجھے کہ عرش رحمانی کے مقابلہ میں میرا عرش شیطانی بھی ہے۔ چنانچہ قرآن مُقدّس میں عرش رحمانی کے متعلق ارشاد ہے:" وَکَانَ عَرْشُہٗ عَلَی الْمَآءِ (پ۱۲)

دوم: یہ مجاز ہے اور کمالِ تسلّط سے کنایہ ہے۔

قولہٗ عَلَی الْمَاءِ۔ اس سے مراد سمندر ہے۔ یعنی بہت بڑے پانی پر عرش رکھتا ہے کَمَا جَاءَ فِی رِوَایَۃٍ عَلَی الْبَحْرِ۔

قولہٗ سَرَایَا۔ سریہ کی جمع ہے بمعنیٰ چھوٹی فوج جن کی تعداد پانچ افراد سے چار سو تک ہے۔ ذُرّیت شیطان کی مختلف جماعتیں ہیں ان کے نام اور کام الگ الگ ہیں چنانچہ وضوء میں بہکانے والے کا نام وَلہان ہے اور نماز میں درغلانے والے کا نام خَنزب ہے۔

ایسے ہی مسجدوں، بازاروں میں اس کی الگ الگ فوجیں رہتی ہیں۔

قولہٗ یَفْتِنُوْنَ النَّاسَ ۔ بفتح الیاء وکسر التاء ای یُضِلُّوْنَهُمْ۔

قولہٗ اَعْظَمُهُمْ فِتْنَةً ۔ ای اکبرهم اِضْلَالًا اَوْ اَشَدُّهُمْ ابتلاءً یعنی ابلیس اپنی ذریت میں سے اُسے اپنا خصوصی قرب بخشتا ہے جو لوگوں میں بڑی گمراہی یا فتنہ پھیلا کر آئے

قولہٗ قَالَ ۔ اس کے قائل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

قولہٗ حَتّٰی فَرَّقْتَ بَیْنَهٗ ۔ تفریق سے مراد طلاق ہے یعنی فساد برپا کر کے میاں بیوی کی دائمًا جدائی کرادی ہے۔ طلاق اگرچہ مباح چیز ہے لیکن اکثر فساد کی جڑ بن جاتی ہے اس لیے ابلیس اس پر خوش ہوتا ہے۔ فرمانِ نبوی ہے " اَبْغَضُ الْحَلَالِ الطَّلَاقُ ۔ حتی الامکان اس سے بچنا بہتر ہے۔ عند البعض یہ مطلب بھی ہے کہ میں نے خاوند بیوی میں جدائی کرادی کہ خاوند نے عورت کو معلّقہ کر دیا کہ نہ چھوڑ سکتا ہے اور نہ بساتا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے" فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ۔

سوال ۔ گناہوں میں سے اور گناہ بھی تو بہت ہیں تفریق بین الزوجین کو کیوں ترجیح دی؟

جواب ۔ اس گناہ کے اثرات اور نتائج بہت دور رس ہیں۔ ثانیًا یہ زنا اور اولادِ زنا کی کثرت کا سبب بنتا ہے۔ نیز بسا اوقات اس سے پیدا ہونے والی عداوتوں سے خاندان کے خاندان تباہ ہوجاتے ہیں اس لیے یہ فعل شیطان کے ہاں اَحَبُّ الاشیاء ہے۔

قولہٗ نِعْمَ اَنْتَ ۔ اگر نِعْمَ پڑھیں تو فعل مدح ہے معنیٰ ہوگا نِعْمَ الْوَلَدُ یا نِعْمَ العونُ ۔ اَنْتَ نَعَمْ پڑھیں تو حرفِ ایجاب ہے، پھر معنیٰ ہوگا نَعَمْ اَنْتَ صَنَعْتَ شَيْئًا عَظِیْمًا یعنی کام تو تونے کر دکھایا ہے۔

قولہٗ قَالَ الْاَعْمَشُ ۔ اَعْمَش بمعنیٰ چوندھا اس کی آنکھیں اسی طرح چوندھی تھیں۔!

سوال ۔ اللہ پاک فرماتے ہیں" وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ " بُرے القاب سے نہ پکارو" چوندھا تو برا لقب ہے۔

جواب :۔ محدثینؒ حضرات کے نزدیک یہ القاب توہین کے لیے نہیں بلکہ امتیاز کے لیے ہے۔

قولہ اُرَاہُ ۔ مجہول ہے بمعنیٰ اَظُنُّ معلوم ہوا کہ شیطان کا محبوب عمل یہی ہے ۔ نیز اُرَاہُ کی ضمیر کا مرجع ابوسفیان طلحہؓ ہیں جو سلیمان اعمش کے شیخ اور حضرت جابرؓ کے شاگرد ہیں۔ یا اس کا مرجع خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک ہیں ۔

قولہ فَیَلْتَزِمُہٗ ۔ حدیث کے راوی اعمش کہتے ہیں کہ میرا خیال ہے حضرت جابرؓ نے بجائے فَیُدْنِیْہِ کے فیلتزمہ (پس ابلیس اس کو گلے لگا لیتا ہے) کے الفاظ نقل کئے ہیں ۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ ۔!

وَعَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ الشَّیْطَانَ قَدْ اَیِسَ مِنْ اَنْ یَّعْبُدَہُ الْمُصَلُّوْنَ فِیْ جَزِیْرَۃِ الْعَرَبِ وَلٰکِنْ فِی التَّحْرِیْشِ بَیْنَھُمْ

ترجمہ : روایت ہے انہی سے فرماتے ہیں فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ شیطان جزیرۃ العرب کے مسلمانوں کے متعلق اس کی پرستش کرنے سے ناامید ہو گیا ہے لیکن انہیں آپس میں بھڑکانے میں مشغول ہے ۔

قولہ اَیِسَ ۔ اَیِسَ بمعنیٰ ای صَارَ مَحْرُوْمًا یعنی ناامید ہونا ۔ کما فی قولہ تعالیٰ " لَا تَیْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰہِ اِنَّہٗ لَا یَیْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰہِ اِلَّا الْقَوْمُ الْکَافِرُوْنَ ۔ پ ۱۳ یوسف)

قولہ یَعْبُدُہٗ ۔ اَیْ عِبَادَتُنَا کہ میری عبادت کریں ۔ مطلب یہ ہے کہ شیطان کو اس بات کی امید نہیں رہی کہ جزیرہ عرب میں میری عبادت کی جائے گی ۔

سوال : شیطان کی عبادت سے کیا مراد ہے ؟ اس کے مختلف جوابات دیے گئے ہیں :

جواب اوّل : شیطان کی عبادت سے مراد دین اسلام سے مرتد ہونا ہے ۔

سوال : یہ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد بہت سے لوگ مرتد ہوئے ہیں (کما فی واقعۃ مُسَیْلِمَہ کذّاب وَاَسْوَدُ عَنسی وغیرہ) تو اس مطلب پر یہ اس حدیث کے خلاف ہوگا

جواب : حدیث میں یہ نہیں کہا گیا کہ لوگ مرتد نہیں ہوں گے بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ اسلام

کی قوت اور شوکت دیکھ کر شیطان ارتداد سے مایوس ہوگیا ہے اور اسے یہ اندازہ ہوگیا ہے کہ اب کوئی شخص دین سے نہیں پھرے گا، کسی وجہ سے لوگوں کا مرتد ہو جانا اس کی مایوسی کے منافی نہیں۔

جواب دوم ۔ عند البعض عبادۃ الشیطان سے بت پرستی مراد ہے۔ یعنی شیطان جزیرۂ عرب میں بت پرستی سے مایوس ہوگیا ہے۔ اور واقعی جزیرۂ عرب میں بت پرستی کبھی نہیں ہوئی" کما فی قولہٖ تعالیٰ" یٰاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّیْطٰنَ ۔ (پ۱۶ مریم)

سوال ۔ حدیث پاک میں آتا ہے کہ قیامت کے قریب دوس کی عورتیں ذوالخلصہ بت کے ارد گرد طواف کریں گی، دورانِ طواف ان کے سُرین ہلتے ہوں گے ۔ اس سے معلوم ہوا کہ عرب میں بھی بتوں کی پوجا ہوگی (مشکوٰۃ شریف ص۴۸۱ ج۲ باب لا تقوم الساعۃ الّا علٰی شرار النّاس :

جواب : یہ قیامت کے قرب کی وجہ سے ہے کہ قربِ قیامت میں ہر برائی عود کر آئے گی۔ حدیث میں جو نفی ہے وہ قیامت سے پہلے کی ہے ۔

جواب سوم ۔ شیطان کی عبادت سے مراد جاہلیت کا دور دوبارہ لانا ہے اس سے شیطان مایوس ہو چکا ہے ۔ دورِ جاہلیت میں گمراہی ہی گمراہی تھی ۔ ہدایت معدوم یا بالکل مغلوب تھی۔ اب ایسا دور کبھی نہیں آئے گا۔

قولہٗ اَلْمُصَلُّوْنَ ۔ مُصَلُّوْنَ سے مراد اگر مسلمان ہیں تو جزء کہہ کر کل مُراد لینا ہے۔ کما فی قولہٖ علیہ السلام نُهِیْتُكُمْ عَنْ قَتْلِ الْمُصَلِّیْنَ عند البعض اہلِ ایمان مراد ہیں پھر نماز افضل العبادات اور عمادُ الدّین اور ایمان کی بڑی علامت ہے۔ اس لیے اسے اختیار کیا گیا ہے ۔

قولہٗ جَزِیْرَةُ الْعَرَبِ ۔ اس کی تعیین میں متعدّد قول ہیں :۔

اوّل : امامِ مالکؒ کے نزدیک مکہ، مدینہ، یمن ۔

دوم : مُلّا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ بحرِ ہند اور بحرِ شام نے جس کا احاطہ کر رکھا ہے ۔ وہ جزیرۃُ العرب ہے۔

سوم : قاموس میں ہے کہ جزیرۃُ العرب کی حدود یہ ہیں عدن سے شام تک طولاً ، اور

جدہ سے عراق تک عرضاً ہے۔

سوال ۔ جزیرۃ العرب کو کس بنار پر خاص کیا گیا ؟

جواب اوّل : جزیرۂ عرب کی خصوصیت اس لیے ہے کہ اس وقت تک اسلام عرب سے باہر نہیں پھیلا تھا۔ صرف جزیرۂ عرب میں ہی اسلام تھا اس بنار پر تخصیص کی ہے۔

جواب دُوم : عند البعض تخصیص کی وجہ مُہبطِ وحی اور دینِ اسلام کا مرکز ہونا ہے بخلاف دوسرے علاقوں کے وہاں یہ صُورت نہیں ہے۔

قولہٗ وَلٰكِنْ فِى التَّحْرِيْشِ ۔ تحریش بمعنی الاغراء علی الشیئ کسی شئ کو ابھارنا اس کا اطلاق دو جانوروں کو آپس میں لڑانے پر ہوتا ہے۔ جس طرح کہ مُرغ اور کتے آپس میں لڑائے جاتے ہیں۔ مگر اس حدیث میں تحریش کا معنیٰ ہے کہ ایک کے قتال پر دوسرے کو اکسانا۔ لٰكِنْ کے بعد ھُوَ مقدر ہے۔ اصل میں تھا ھو فی التحریش کہ ھُوَ مُبتدا ہے اور فِى التَّحْرِيْشِ خبر ہے۔ اس کا مُرادی معنیٰ ہے کہ عربوں کو آپس میں لڑاتا رہتا ہوں یا لڑا کر آیا ہوں۔ اس حدیث میں مُشاجراتِ صحابہؓ کی پیشینگوئی کی گئی ہے۔

اَلْفُصْلُ الثَّانِىْ

یہ دوسری فصل ہے۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِىَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَاءَهٗ رَجُلٌ فَقَالَ اِنِّىْ اُحَدِّثُ نَفْسِىْ بِالشَّيْئِ لِاَنْ اَكُوْنَ حُمَمَةً اَحَبُّ اِلَىَّ مِنْ اَنْ اَتَكَلَّمَ بِهٖ

ترجمہ : حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ ایک صحابیؓ دربارِ رسالت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہؐ میں سوچتا ہوں ایسی چیز (وسوسہ) کہ میں جل کر کوئلہ ہو جانا بہتر سمجھتا ہوں لیکن زبان سے اس کو ظاہر کرنا نہیں چاہتا۔

قولہٗ اِنِّىْ اُحَدِّثُ نَفْسِىْ ۔ یعنی میں دل میں سوچتا ہوں اور خیال کرتا ہوں۔

اس کی مکمل بحث بابُ الوسوسہ کے ابتداء میں آچکی ہے۔

قولہٗ بِالشَّیْئِ ۔ یہ لفظاً معرفہ اور معنیً نکرہ ہے۔ اور اس کے بعد والا جملہ اسمیہ لِاَنْ اَکُوْنَ الخ اس کی صفت ہے۔

مثال ع وَلَقَدْ اَمُرُّ عَلَی اللَّئِیْمِ یَسُبُّنِیْ جملہ فعلیہ اللئیم کی صفت ہے۔

قولہٗ حُمَمَۃً ۔ اس کا معنیٰ کوئلہ بھی ہے کیونکہ لکڑی جل کر آگ میں کوئلہ بن جاتی ہے یا بمعنیٰ انگارا بھی ہے۔

سوال۔ صحابیٔ رسول نے انگارا بن جانے کو کلام پر کیوں ترجیح دی ؟

جواب ۔ غایتِ قباحت کی وجہ سے انگارا بننا پسند کیا۔ صحابیٔ رسولؐ کا مقصد یہ تھا کہ مجھے عقائدِ اسلامیہ اور ذات وصفاتِ الٰہی کے متعلق ایسے بُرے خیالات آتے ہیں کہ مجھے ان کا قبول کرنا تو دور کی بات ہے یا اتنا برا ہے کہ انگارا بن جاؤں مگر زبان پر ان کا ذکر نہ لاؤں۔

قولہٗ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ رَدَّ اَمْرَہٗ اِلَی الْوَسْوَسَۃِ (ترجمہ) اس خدا کی تعریف ہے جس نے اس چیز کو صرف وسوسہ کی حد تک محدود رکھا۔

خُلاصَۃ الجواب : نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابیؓ کو تسلی دیتے ہوئے یہ کلمات ارشاد فرمائے جن کا خلاصہ یہ ہے کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں یہ تو اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے کہ تمہارا ایمانی احساس وشعور پوری طرح بیدار ہے۔ اور اس برے خیال کو خود تمہارے دل و دماغ نے قبول نہیں کیا اور وَسوسہ سے آگے نہیں بڑھنے دیا اور وَسوسہ پر نہ کوئی مؤاخذہ ہے اور نہ عقاب ہے۔

سوال۔ رَدَّ اَمْرَہٗ کی ضمیر کا مرجع کس طرف ہے ؟

جواب۔ اس میں دو احتمال ہیں :۔

اوّل ــــ یہ کہ اس کا مرجع رجل ہے جس کا ذکر حدیث پاک میں ہے اور امر بمعنیٰ شان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس آدمی کا معاملہ صرف وساوس تک پہنچا ہے اور قول وعمل تک نہیں پہنچا۔ اگر خدا تعالیٰ کی مدد شاملِ حال نہ ہوتی تو اس پر عمل کر لیتے تو اس پر مؤاخذہ ہو جاتا اور جہاں تک وَسوسہ کا تعلق ہے وہ تو معاف ہے۔

دوؔم ۔ اس کا مرجع شیطان ہے اور یہی قول باصواب ہے۔

سوال ۔ رجل کا ذکر تو حدیثِ پاک میں ہے ۔ مگر شیطان کا ذکر تو حدیث میں نہیں ۔ پھر مرجعِ ضمیر اس کی طرف کیسے لوٹے گی ؟ ۔

جواب ۔ شیطان کا ذکر صراحۃً حدیث میں نہیں مگر وہ ضمناً سیاق کلام سے سمجھا جا رہا ہے ۔

سوال ۔ وہ تضمینی جملہ کونسا ہے جس سے شیطان کا ذکر مترشح ہوتا ہے ۔

جواب ۔ وہ جملہ اُحَدِّثُ نَفْسِیْ بِالشَّیْئِ ہے کہ میرے دل میں وسوسہ پیدا ہوتا ہے ۔ اور وسوسہ شیطان ہی ڈالتا ہے کیونکہ انسان کے دو قرین ہیں ایک فرشتہ اس کے ذمہ الہامِ خیر ہے ۔ اور دوسرا شیطان جس کے ذمہ وسوسہ شر ہے ۔ لہٰذا اُحَدِّثُ نَفْسِیْ بِالشَّیْئِ سے ذکرِ شیطان ضمناً معلوم ہوا ۔ یعنی شیطان پہلے صریح کفر کی طرف دعوت دیتا تھا ۔ اب اس کو بغیر وسوسہ ڈالنے کے کوئی راستہ نہیں ملتا ہے ۔

وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ لِلشَّیْطَانِ لَمَّۃً بِابْنِ اٰدَمَ وَلِلْمَلَکِ لَمَّۃً ۔

ترجمہ : حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ انسان میں شیطان کا بھی تصرّف ہے اور فرشتہ کا بھی ۔

قَوْلُہٗ لَمَّۃً ۔ محدثینؒ حضرات نے لَمَّۃً کے مختلف معانی بیان فرمائے ہیں ۔ (۱) اثر (۲) چوک (۳) تصرّف ۔ معنیٰ ہوگا کہ مؤمن کے لیے دو اثر ہیں ایک شیطان کی طرف سے جو شر اور تکذیبِ حق کے لیے ہے ۔ اور دوسرا فرشتہ کی طرف سے جو خیر کے لیے ہے ۔

قَوْلُہٗ فَاَمَّا لَمَّۃُ الشَّیْطَانِ ۔ یہاں سے اثرِ شیطان کا بیان ہے ۔

اثرِ شیطان کا مطلب

شیطان کے اثر کا مطلب یہ ہے کہ راہِ حق کو تاریک کر کے دکھاتا ہے ۔ وسوسہ کے ذریعہ دین کی بنیادی باتوں میں تردّد و شک پیدا کرتا ہے ۔ مثلاً توحیدِ باری تعالیٰ، عقیدہ ختمِ نبوّت وغیرہ اگر ان پر عمل کرو گے تو پریشان ہو گے ۔

اثرِ فرشتہ کا مطلب فرشتہ کے اثر کا مطلب یہ ہے کہ وہ نیکی کی اہمیت اور اس پر ملنے والے اجر و انعام کی کشش ظاہر کرتا ہے۔ اور انسان کے دل میں یہ بات ڈالتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا سچا دین ہی انسانی ترقی کا ضامن ہے۔ اگر اپنی فلاح و نجات چاہتے ہو تو برائی کے راستہ سے بچو اور نیکی کے راستہ کو اختیار کرو۔

سوال ۔ یہ ہے کہ لفظ ایعاد عرفاً شر کے ساتھ مخصوص ہے ۔ جب کہ یہاں خیر کے ساتھ متعلق کیا گیا ہے ۔

جواب ۔ ایعاد گو عرفاً شر کے ساتھ مخصوص ہے لیکن بِالخَیر کے قرینہ کی بناء پر یہاں خیر میں استعمال کیا گیا ہے کیونکہ قرینہ کے بدلنے سے معنیٰ میں تبدیلی ہو جاتی ہے ۔

قولہٗ فَمَنْ وَجَدَ ذٰلِكَ ۔ ذٰلِكَ کا مشار الیہ لمّۃ المَلَک ہے۔

سوال ۔ لَمَّۃٌ مؤنث ہے ۔ اور ذٰلِكَ مذکر ہے تو تطبیق کیسے ہوگی ؟

جواب ۔ لَمَّۃٌ کو اَلمَام کی تأویل میں کریں گے اور قانون ہے کہ جس لفظ کو جس کے ساتھ مؤل (تاویل) کریں تو پھر اس کا حکم وہی بن جاتا ہے تو اب المام مذکر ہے تو لمّۃٌ والا حکم بھی مذکر کا ہوگا۔

قولہٗ فَلْیَعْلَمْ اَنَّہٗ مِنَ اللّٰہِ ۔ یعنی جس شخص کے دل میں اس فرشتہ کے وعدہ کا خیال پیدا ہو تو سمجھنا چاہیے کہ یہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہدایت ہے اس لیے اسے چاہیے کہ وہ اس (نعمت) پر خدا کی تعریف کرے ۔

قولہٗ ثُمَّ قَرَأَ اَلشَّیْطَانُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَیَأْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَاءِ ۔ یہ بیانِ استشہاد یا بیانِ قرینہ ہے ۔ یعنی یہ شیطان برائیوں کو خوبیاں اور نیکیوں کو مصیبت بنا کر دکھاتا ہے ، خیرات کے ارادہ پر فقر سے ڈراتا ہے ، ناجائز ناجائز اخراجات کے موقعہ پر ناموری کا لالچ دیتا ہے ۔ بہت دفعہ دیکھا گیا ہے کہ اکثر مسلمان حج و خیرات کرنے سے گھبراتے ہیں لیکن شادی بیاہ کے حرام رسوم پر خوب دل کھول کر خرچ کرتے ہیں ۔ یہ اسی کا اثر ہے۔

وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رضی اللہ عنہ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

ترجمہ : روایت ہے حضرت ابوہریرہؓ سے ، وہ نبیِّ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے

قَالَ لَا يَزَالُ النَّاسُ يَتَسَاءَلُوْنَ حَتّٰى يُقَالَ هٰذَا خَلَقَ اللّٰهُ الْخَلْقَ فَمَنْ خَلَقَ اللّٰهَ

روایت کرتے ہیں فرمایا لوگ پوچھ گوچھ کرتے رہیں گے حتیٰ کہ یہ کہا جائے گا کہ مخلوق کو خدا نے پیدا کیا تو خدا کو کس نے پیدا کیا۔

قولہ لَا یَزَالُ النَّاسُ ۔ ناس سے مراد اگر امتِ اجابت ہے تو پھر سوال سے مراد سوال وسوسہ کا ہوگا جس پر شریعت میں کوئی مؤاخذہ نہیں۔ اگر ناس سے مراد امتِ دعوت ہے تو پھر سوال سے مراد سوال اعتقاداً ہوگا یا بطریق تعریض کے ہوگا۔ جس میں شریعت کے اندر مؤاخذہ ہے۔

قولہ فَمَنْ خَلَقَ اللّٰهَ ۔ یعنی ہر موجود کا کوئی موجد چاہیئے، اور اللہ تعالیٰ بھی موجود ہے۔ لہٰذا اس کا موجد بھی ہونا چاہیے۔ یہ شیطانی وسوسہ ہے۔ خیال رہے کہ شیطان عُلماء کے دل میں عالمانہ وسوسے، اور صوفیاء کے دل میں عاشقانہ وسوسے عوام کے دل میں عامیانہ وسوسے ڈالتا ہے۔ جیسا شکار ویسا جال۔ بسا اوقات انسان گناہ کو بھی عبادت سمجھ لیتا ہے۔

قولہ فَقُوْلُوْا اَللّٰهُ اَحَدٌ ۔ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خالق کے بارے میں خالق کے وسوسہ کا بیان فرمایا ہے کہ اگر خالق کی خِلقت کے بارے میں وسوسہ ہو تو کیا کرنا چاہیئے اس کے دو ظاہر علاج تجویز فرمائے ہیں۔ اوّلاً سورۂ اخلاص کا وِرد ثانیًا بائیں طرف تھوکنا۔ سورۂ اخلاص میں خالصۃً توحید ہے اور توحید سے اس کو چڑ ہے۔ باطنی علاج تفصیلاً بَابُ الوسوسہ کی تیسری حدیث میں ذکر کردیا گیا ہے۔

یقول ابوالاسعاد : فَقُوْلُوْا اللّٰهُ اَحَدٌ یہ فَمَنْ خَلَقَ اللّٰهَ والے قول پر رد ہے۔ سورۂ اخلاص کے اندر صفاتِ خمسہ کا ذکر ہے۔ اور صفاتِ خمسہ کے ذکر سے مقصود اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات کے مخلوق ہونے کی نفی کرنا ہے جس کی تفصیل یہ ہے:۔

صفت ۱: اَحَدٌ

اَحَد وہ یکتا ذات ہے جس کا ذات وصفات میں کوئی شریک نہ ہو۔ لہٰذا ذات باری تعالیٰ مخلوق نہیں ورنہ مخلوقیّت کی صفت میں مخلوق کے ساتھ شرکت لازم آئے گی جو احدیّت کے منافی ہے۔

صفت ۲۔ اَلصَّمَدُ صمد وہ ذات ہے جو کسی کی محتاج نہ ہو اور باقی سب اس کے محتاج ہوں حالانکہ مخلوق اپنے خالق کی محتاج ہوتی ہے لہذا اللہ تعالیٰ مخلوق نہیں ورنہ احتیاج لازم آئے گا۔

صفت ۳۔ لَمْ یَلِدْ اس میں اللہ تعالیٰ کے والد ہونے کی نفی ہے جو اعلیٰ صفت ہے تو اعلیٰ کی نفی سے ادنیٰ (یعنی مولود و مخلوق) ہونے کی بطریق اولیٰ ثابت ہوتی ہے۔

صفت ۴۔ وَلَمْ یُوْلَدْ اس میں صراحۃً اللہ تعالیٰ کے مولود و مخلوق ہونے کی نفی ہے۔

صفت ۵۔ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ اس میں مساوی کی نفی ہے کیونکہ کُفُوًا کے معنیٰ مثل اور مماثل کے ہیں یعنی نہ کوئی مثل ہے اور نہ کوئی اس سے مشابہت رکھتا ہے تو اس سے اللہ تعالیٰ کے لیے کسی اعلیٰ یعنی خالق و والد کی نفی بطریقِ اولیٰ ثابت ہوتی ہے۔

قولہٗ ثُمَّ لِیَتْفُلْ عَنْ یَسَارِہٖ ۔ پھر بائیں طرف تین بار تھوکو۔ یہ نَصَرَ ضَرَبَ دونوں سے ہے۔ تھوکنے سے مقصود اظہارِ نفرت و کراہت ہے کیونکہ عموماً جس کی نفرت دل میں ہو تو انسان اعراض بھی کرتا ہے اور تھوکتا بھی ہے۔

تھوکنے کے بارے میں فقہی مسئلہ اگر انسان نماز میں مشغول ہو، اور وساوس شیطانی گھیر لیں تو پھر اگر فرض نماز ہے تو ارکان ہی میں مشغول رہنا چاہیے، اور اگر نفل نماز ہے اور مسجد بھی ہے تو تعوّذ پڑھ لے لیکن تھوکے نہیں، یا اگر تھوکے تو اپنے کپڑے میں لے لے، اور اگر مسجد سے باہر ہے تو پھر تھوک بھی سکتا ہے وَلٰکِنْ اِلْعَمَلُ قَلِیْلٌ۔

سوال ۔ یَسَارِہٖ کی قید کیوں لگائی ؟

جواب اوّل : اظہارِ فضیلت مقصود ہے یعنی دائیں جانب افضل ہونے کی وجہ سے بائیں طرف کو اختیار کیا گیا ہے۔

جواب دوم : صوفیاءِ کرام کے نزدیک یہ اشارہ ہے کہ شیطانی القاء بائیں طرف سے

ہوتا ہے اور خدائی القاء دائیں طرف سے ہوتا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

یہ تیسری فصل ہے۔

عَنْ اَنَسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ لَنْ یَّبْرَحَ النَّاسُ یَتَسَآءَ لُوْنَ الخ

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ ہمیشہ لوگ ایک دوسرے سے سوال کرتے رہیں گے۔

قولہ کَذَا یہ کنایہ ہے کثرتِ سوال سے۔
قولہ قَالَ قَالَ اللّٰہُ عَزَّ وَجَلَّ۔ یہ حدیثِ قدسی کی طرف اشارہ ہے۔ مزید حدیث کی مکمل بحث قد مرّ آنفاً۔

وَعَنْ عُثْمَانَؓ بْنِ اَبِی الْعَاصِ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنَّ الشَّیْطَانَ قَدْ حَالَ بَیْنِیْ وَ بَیْنَ قِرَاءَ تِیْ یُلَبِّسُھَا عَلَیَّ۔

ترجمہ: حضرت عثمانؓ بن ابی العاصؓ سے مروی ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے اور میری نماز کے درمیان شیطان حائل ہوجاتا ہے اور پڑھنے میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔

قولہ حَالَ بَیْنِیْ۔ حائل کی ایک[۱] علت دخول فِی الصلوٰۃ ہے کہ شیطان نماز تو نماز رہی بلکہ نماز میں داخل ہونے سے روکتا ہے۔ دوم[۲] حائل سے مراد قرأت کا حائل ہے کہ قرأت کے اندر پڑھتے پڑھتے کئی وساس نظر آتے ہیں۔
قولہ یُلَبِّسُھَا عَلَیَّ: اَیْ یَخْلِطُنِیْ وَ یُشَکِّکُنِیْ یَلْبِسُھَا کی ضمیر بھی صلوٰۃ یا قرأۃ دونوں کی طرف پھر سکتی ہے۔

قَوْلُہٗ يُقَالُ لَہٗ خِنْزَبٌ ؛ اس میں تین لغات ہیں ۱۔ بکسرتین یعنی خاء اور زار مکسورہ ۲۔ بفتحتین یعنی دونوں مفتوح کجَعْفَرَ ۳۔ بکسرۃٍ علی وَزْنِ دِرْهَمٍ : محدثین حضرات کے نزدیک یہ علَم شخصی نہیں بلکہ وصفی ہے یعنی ایک شیطان مراد نہیں بلکہ نوعِ شیطان مراد ہے لغت کے اندر خِنْزَبْ کا معنیٰ ہے" جَرِیٌّ عَلَی الْمَعْصِیَتِ یعنی معصیت پر جرأت کرنے والا" اس کی وجہ تسمیہ واضح ہے کہ نماز میں سارے شیطان بھاگ جاتے ہیں یہ ایسا جری ہے کہ نماز میں بھی وسوسہ ڈالنے سے نہیں چوکتا۔

قولہٗ فَتَعَوَّذْ بِاللّٰہِ مِنْہُ ۔ یہ تعوّذ والاحکم نماز سے فارغ ہونے کے بعد کا ہے نہ کہ اثنائے صلوٰۃ میں ۔

وَعَنِ الْقَاسِمِ بْنِ مُحَمَّدٍ اَنَّ رَجُلًا سَأَلَہٗ فَقَالَ اِنِّیْ اَهِمُ فِیْ صَلٰوتِیْ فَيَكْثُرُ ذَالِكَ عَلَیَّ

ترجمہ : قاسم بن محمدؒ سے کسی نے دریافت کیا کہ میں اپنی نماز میں وہم کرتا ہوں جس کی وجہ سے مجھے بڑی گرانی ہوتی ہے۔

قولہٗ فَيَكْثُرُ ؛ ثار کے ساتھ کثرت سے ہے اور اگر یَکْبُرُ بار کے ساتھ ہو تو بمعنیٰ عظمت یا عظیم ہے۔

قَولُہٗ فَقَالَ لَہٗ اِمْضِ فِیْ صَلٰوتِكَ : یہ حکیمانہ جواب ہے کہ وساوس میں بے جا سوچ وبچار مت کرو اور نماز پوری کرلو۔ لیکن یہ اس صورت میں ہے جب کہ یہ ظن غالب ہو کہ میں نماز پوری کرچکا ہوں۔ ہاں اگر جانبین متساوی ہوں تو اعادہ کرے اور یہ محض اس کے متعلق ہے جو بعض وقت وہم میں مبتلا ہوتا ہے، اور اگر کسی کی عادت بن گئی ہو تو غالب گمان پر نماز ختم کرے۔

قولہٗ فَاِنَّہٗ لَنْ يَّذْهَبَ ذَالِكَ عَنْكَ : بے شک وہ تم سے دور نہیں ہوگا۔

قولہٗ تَنْصَرِفَ : ای تَفْرُغَ مِنْ صَلٰوتِہٖ : یہاں تک کہ تم نماز سے فارغ ہوجاؤ۔ یعنی ان خطرات کی وجہ سے تم نماز کو نہ چھوڑو اور نہ لوٹاؤ یہ آتے ہی رہیں گے

جب نفس اور شیطان اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتے تو تم نماز کیوں چھوڑتے ہو۔ مکھیوں کی وجہ سے کھانا نہیں چھوڑا جاتا تم اللہ کے بندے ہو دل کے بندے نہیں، دل لگے یا نہ لگے نماز پڑھتے رہو۔!

بَابُ الایمانِ بِالقدر

اس مقام پر آٹھ بحثیں ہیں یعنی مَباحِث ثمانیہ کا باب ہے۔

اَلبَحثُ الاوّل ـــــ ماقبل سے ربط

مُختصرًا عرض ہے کہ یہ باب تخصیص بعد از تعمیم کے قبیل سے ہے۔ پہلے بتایا جاچکا ہے کہ ایمان تمام ضروریاتِ دین کے ماننے کو کہتے ہیں۔ ضروریاتِ دین کے عموم میں تقدیر بھی تھی۔ اس عموم میں یہ بات آگئی تھی کہ تمام ضروریاتِ دین کے ضمن میں تقدیر کا ماننا بھی ضروری ہے حدیث جبریل میں ایمان کی تعریف میں تقدیر کا صراحۃً ذکر تھا۔ اب مُصنّف رح نے چاہا کہ عموم کے بعد خصُوصیّت سے تقدیر کو بیان کردیا جائے۔ اس کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ تقدیر کا مسئلہ نہایت اہم و نازک ہے۔ اس میں فِرَقِ اسلامیّہ کا بہت اختلاف ہوا ہے جس کی وجہ سے بہت سے لوگ گمراہی کی طرف چلے گئے ہیں۔ اس لیے صاحبِ مشکوٰۃ نے اس کو خصُوصی اہمیّت دی ہے۔

اَلبَحثُ الثّانِی ـــــ اہمیّت مسئلہ تقدیر

مسئلہ تقدیر مزلۃ الاقدام میں سے ہے۔ سِرٌّ مِّنْ اَسرَارِ اللہِ ہے جس کی پوری حقیقت کی اطلاع نہ کسی مُقرّب فرشتہ کو دی گئی اور نہ کسی نبیؑ و رسُول کو۔ اس لیے اس میں

زیادہ غور و خوض کرنا جائز نہیں ہے۔ بلکہ جہاں تک قرآن و حدیث میں اجمالاً مذکور ہے۔ اسی پر اکتفاء کرکے ایمان لانا چاہیئے کما حقہٗ اس کو سمجھنا انسانی طاقت (عقل) سے باہر ہے جتنی بحث کی جائیگی اتنا ہی خطرہ میں واقع ہونے کا اندیشہ ہے۔ چنانچہ ایک سائل نے حضرت علیؓ سے تقدیر کے بارے میں پوچھا تو آپ نے جواباً ارشاد فرمایا:۔

قَالَ طَرِيْقٌ مُظْلِمٌ فَلَا تَسْلُكْهُ فَاَعَادَ السُّوَالَ فَقَالَ بَحْرٌ عَمِيْقٌ فَلَا تَلِجْهُ وَاَعَادَ السُّوَالُ فَقَالَ سِرُّ اللهِ قَدْ خَفِيَ عَلَيْكَ فَلَا تُفَتِّشْهُ (مرقات ج ا ص ۱۴۵) ترجمہ: حضرت علیؓ نے فرمایا یہ اندھیرے والا راستہ ہے۔ تو اس پر نہ چل۔ پھر اس نے سوال دُہرا دیا تو پھر فرمایا یہ گہرا سمندر ہے۔ اس میں غوطہ نہ مار، پھر اس نے سوال کا اعادہ کیا تو حضرت علیؓ نے فرمایا یہ اللہ تعالیٰ کا راز ہے تجھ پر مخفی ہے تو اس کی کھوج نہ لگا۔

اس لیے بی بی عائشہؓ کی روایت سامنے آرہی ہے:۔

مَنْ تَكَلَّمَ فِيْ شَيْئٍ مِّنَ الْقَدْرِ سُئِلَ عَنْهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَمَنْ لَّمْ يَتَكَلَّمْ فِيْهِ لَمْ يُسْئَلْ عَنْهُ۔

اَلْبَحْثُ الثَّالِثُ ــــ فِیْ تَحْقِیْقِ مَعْنَی الْقَدْرِ وَالْقَضَاءِ

لفظ قَدَر عند البعض تحریک کے ساتھ ہے قَدَرَ جب کہ بعض حضرات کے نزدیک تسکین کے ساتھ قَدْر بمعنیٰ اندازہ کرنا، تدبیر کرنا۔ دنیا و ما فیہا میں جو کام ہو رہے ہیں یا ہونگے اس کا اندازہ ذاتِ باری تعالیٰ پہلے لگا چکے ہیں۔ کما فی قولہٖ تعالیٰ " اِنَّا كُلَّ شَيْئٍ

خَلَقۡنَاهُ بِقَدَرٍ (پ۲۷) قدر کا مقابل قضاء ہے، قضاء بمعنیٰ فیصلہ کرنا۔ کما فی قولہٖ تعالیٰ "فَقَضَاهُنَّ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ (پ۲۴)"

یقول ابوالاسعاد : اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ قضاء وقدر کے مابین کچھ فرق ہے یا نہیں۔ اکثر علماء کے نزدیک ان دونوں میں فرق ہے "اِنَّ القضاءَ ھوالحکم الکلی فی الازل۔ والقدر جزئیات ذالک الحکم۔ جیسے اللہ پاک فرماتے ہیں" وَاِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا عِنۡدَنَا خَزَآئِنُهٗ (پ۱۴) یہ حکم قضاء اور حکم کلی ہے آگے" وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعۡلُوۡمٍ یہ تقدیر اور جزئیات ہیں۔ عند البعض قدر وہ ہے جو چیز ذھن میں خاکہ کی شکل میں ہو اور قضاء اس کا وجود میں آجانا ہے۔

مثال نقشہ پنہانی جس طرح ایک انجینیر یا معمار مکان بنانے سے قبل اسی کا ایک نقشہ اپنے ذہن میں اور ایک نقشہ کاغذ پر بناتا ہے۔ اور پھر اسی نقشہ کے مطابق خارج میں مکان تیار کرتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کا وجود سے پہلے اپنے علم میں اور پھر لوح محفوظ میں ایک نقشہ قائم فرمایا ہے۔ تو مکان بنانے سے قبل اس کا اجمالی نقشہ ذھن میں آنا یہ قدر ہے اور اسی نقشہ کے مطابق جو مکان تیار ہوکر موجود فی الخارج ہوا یہ بمنزلہ قضاء ہے۔ اصطلاحِ شریعت میں اللہ تعالیٰ کے حکم کلی اجمالی ازلی کو تقدیر کہتے ہیں۔

البحث الرّابع ــــ فِی بیان اقسامِ تقدیر

تقدیر دو قسم پر ہے:۔

۱۔ مُبۡرَم یعنی اٹل تقدیر مبرم جو قطعی طور پر متعین ہو اور اس میں تغیرُ و تبدُّل کا ذرا بھی احتمال نہ ہو۔

۲۔ مُعَلَّق وہ یہ ہے کہ مثلاً لوحِ محفوظ میں لکھا ہو کہ اگر فلاں نے حج کیا تو بیس[۲۰] سال زندہ رہے گا اور اگر حج نہ کیا تو پندرہ سال زندہ رہے گا فی الحقیقت تقدیر معلق علم الٰہی کے

اعتبار سے مُبرم ہی ہے اور یہ تعلیق صرف لوح محفوظ کے اعتبار سے ہے ۔ اور قرآن مُقدس میں جو ارشاد ہے یَمْحُوا اللّٰہُ مَا یَشَآءُ وَ یُثْبِتُ (پ ۱۳) تو یہ محو اور اثبات بھی لوح محفوظ کے لحاظ سے ہے نہ کہ علم الٰہی کے لحاظ سے ۔

یقول ابوالاسعاد : بندہ کے ہاں تقسیم ثانی بھی ہے کہ تقدیر تین قسم ہے ۔
۱ مُبرم ۲ مشابہ مُبرم ۳ مُعلّق ۔ پہلی قسم میں تبدیلی ناممکن ہے ۔ دوسری قسم خاص محبوبوں کی دُعا سے بدل جاتی ہے ۔ اور تیسری قسم عام دعاؤں اور نیک اعمال سے بدلتی رہتی ہے ۔ رب تعالیٰ فرماتے ہیں " یَمْحُوا اللّٰہُ مَا یَشَآءُ وَ یُثْبِتُ وَعِنْدَہٗ اُمُّ الْکِتَابِ " حضرت ابراہیم کو قومِ لوط کے لیے دعا کرنے سے روک دیا گیا کیونکہ ان پر دنیوی عذاب کا فیصلہ مُبرم ہو چکا تھا ۔ حضرت آدم علیہ السّلام کی دعا سے حضرت داؤد علیہ السّلام کی عمر بجائے ساٹھ کے سو سال ہو گئی ۔ وہ قضاء مُبرم تھی اور یہ مُعلّق ۔ یا جیسے حدیثِ پاک میں صِلہ رحمی کو تاخیر اجل کا سبب قرار دیا گیا ہے ۔ (مَنساۃ فی الاثر) یا دُعاء کو تقدیر کی تبدیلی کا ذریعہ کہا گیا ہے ۔

البحثُ الخامسُ ـــ ثبوتِ تقدیر فی الکتابِ الحمید

مسئلہ تقدیر کو قرآن مُقدس نے بھی مُتعدد بار وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے ۔ چند آیات مبارکہ ملاحظہ فرمائیں :۔

۱ ۔ سُورج اور چاند کے متعلق فرمایا :۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ
وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰی عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْمِ
لَا الشَّمْسُ یَنْۢبَغِیْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّیْلُ سَابِقُ
النَّهَارِ (پ ۲۲ س یٰسٓ)

ان آیات سے معلوم ہوا کہ سورج اور چاند کی رفتار اور راستے متعین ہیں ۔ نیز رات اور دن کی آمد و رفت حق تعالیٰ کے علم ازلی کے مطابق ہے ۔

۲۔ زمین کی غذاؤں کے متعلق فرمایا:۔
وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا (پ۲۴)

۳۔ اور موت کے متعلق فرمایا:۔
نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ (پ۲۷)

۴۔ اور مصیبت کے متعلق فرمایا:۔
مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنْفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِنْ قَبْلِ أَنْ نَبْرَأَهَا۔ (پ۲۷)

۵۔ اور تمام چیزوں کے متعلق فرمایا:۔
وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا۔ (پ۱۸)

اَلبحثُ السّادِس ـــ فوائدِ اعتقادِ تقدیر

تقدیر پر اعتقاد رکھنا ضروریاتِ دین میں سے ہے۔ اس اعتقاد کے بغیر کوئی مسلمان نہیں ہو سکتا۔ تقدیر کو ماننا حقیقت کو تسلیم کرنا ہے۔ اس عنوان کے ماتحت یہ بتانا ہے کہ تقدیر کے اعتقاد میں انسان کے لیے بہت فوائد و برکات ہیں۔ مختصراً صرف چھ فوائد کے بیان پر اکتفاء کر رہا ہوں۔

① زیادتیِ اعتقاد یعنی لوحِ محفوظ کے نقشہ کے مطابق واقعاتِ عالم کو دیکھ کر فرشتوں کے اعتقاد و تصدیق میں ترقی اور اضافہ ہوتا ہے۔

② معرفتِ مرتبہ یعنی لوحِ محفوظ کے نقشہ کو دیکھ کر فرشتے قابلِ مدح اور قابلِ مذمت انسان کی معرفت حاصل کر لیتے ہیں۔ اور پھر ہر ایک کے مرتبہ کے مطابق اس کے لیے دُعاءِ خیر یا دُعاءِ غیر خیر کرتے ہیں۔

③ اِستقامت و صبر یعنی انسان اپنی ناکامی اور مصیبت میں مایوس اور شکستہ دل نہیں ہوتا۔ بلکہ اس میں خدا کی حکمت و مصلحت کا تصور

کر کے صبر کرتا ہے۔ کما فی قولہٖ تعالیٰ " لِکَیْلَا تَأْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ ۔ (پ۲۷)

④ شکر یعنی عقیدہ تقدیر کی وجہ سے انسان اپنے کسی کمال اور کامیابی پر مغرور نہیں ہوتا بلکہ اس کو خدا تعالیٰ کی طرف سے جان کر اس کا شکر بجالاتا ہے۔ کما فی قولہٖ تعالیٰ " وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتَاکُمْ (پ۲۷)

⑤ شجاعت یعنی عقیدۂ تقدیر کی وجہ سے انسان موت کے خوف سے بے غم ہوجاتا ہے، اور اس میں جوان مردی اور ہمت پیدا ہوجاتی ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: " وَمَا کَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ کِتَابًا مُّؤَجَّلًا (پ۴) اور قُلْ لَّنْ یُّصِیْبَنَا اِلَّا مَا کَتَبَ اللّٰہُ لَنَا (پ۱۰)

⑥ تدبیر یعنی تقدیر کا معتقد انسان ظاہری اسباب کی تنگی کو دیکھ کر اپنی تدبیر اور حیلہ جوئی ترک نہیں کرتا، اور حوصلہ نہیں ہارتا۔ کیونکہ اس کی نظر صرف ظاہری اسباب پر نہیں بلکہ مسبب الاسباب اور مؤثر حقیقی پر ہوتی ہے۔ جیسا کہ قرآن مقدس میں ہے: " کَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِیْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً کَثِیْرَةً بِاِذْنِ اللّٰہِ (پ۲)

مسئلہ تقدیر میں اہل السنۃ والجماعۃ کا موقف

اہل السنۃ والجماعۃ کا تقدیر کے متعلق یہ عقیدہ ہے کہ تمام حوادث اور واقعات کے وقوع سے پہلے ہی حق تعالیٰ کو ہر بات کا علم ازلی تھا۔ حق تعالیٰ نے اپنے اس علم ازلی کی حکایت لوح محفوظ میں کروائی ہوئی ہے یعنی جو کچھ بھی عالم میں ہونا تھا سب کچھ لوح محفوظ میں لکھوا دیا۔ جو کچھ بھی اب ہو رہا ہے اللہ کے علم ازلی اور لوح محفوظ کے لکھے ہوئے کے موافق ہو رہا ہے۔

البحث السابع ــــ فی ذکر ازالۃ الشبہات

چند اہم شبہات کے نقل کرنے پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

شُبہ اوّل ۔ تقدیر کی صورت میں انسان مجبور محض ہے ۔ لہٰذا جزاء و سزا نہیں ہونی چاہیے

جواب اللہ تعالیٰ نے انسان کو قوت و ارادہ اور کسب و اختیار بھی بخشا ہے جس کے تحت بندہ سے افعال تکلیفیہ صادر ہوتے ہیں تو تکلیف اور جزاء و سزا کی بنیاد اسی ارادہ اور قوت پر ہے ۔ لہٰذا انسان مجبور محض نہیں کیونکہ حرکت اختیاریہ اور حرکت رعشہ میں فرق نہ کرنا اور انسان کو پتھر کی طرح مجبور محض سمجھنا یہ بداہت کا انکار ہے ۔

شُبہ دُوم ۔ تقدیر سے انسان میں سستی کم ہمتی اور بے عملی پیدا ہو جاتی ہے ۔

جواب قرآن و حدیث میں تقدیر کے ساتھ ساتھ اسباب کے اختیار کرنے کی بھی بہت تاکید فرمائی گئی ہے ، مثلاً مرض میں علاج ، جنگ میں اسلحہ ، رزق میں محنت وغیرہ ۔ تو پھر تقدیر پر بھروسہ کر کے بے عملی کا سبق لے لینا انسان کی اپنی غلطی ہے ۔ و نیز کسب معاش میں تو انسان کبھی بھی تقدیر پر بھروسہ نہیں کرتا بلکہ اس کے لیے رات دن اسباب اختیار کرتا ہے تو پھر اعمال شرعیہ میں تقدیر پر بھروسہ کرنے کے کیا معنیٰ ہو سکتے ہیں ۔

شُبہ سوّم ۔ جب تمام معاصی تقدیر الٰہی سے واقع ہوتے ہیں اور مسلمانوں پر رضاء بالقضاء لازم ہے تو اس سے معاصی پر راضی ہونا لازم آتا ہے ۔ حالانکہ یہ شریعت کے خلاف ہے ۔

جواب معاصی خود قضاء نہیں بلکہ معاصی میں قضاء نام ہے اللہ کے علم معصیت اور تخلیق معصیت کا تو خود معاصی قدر و قضاء نہیں بلکہ محلِ قدر و قضاء ہیں ۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے علم معصیت اور تخلیق معصیت پر راضی ہونے سے خود معصیت پر راضی ہونا لازم نہیں آتا اور تخلیقِ معصیت پر رضا اس لیے ہے کہ وہ باعثِ کمال ہے کیونکہ خلق و ایجاد کمالِ قدرت کو مقتضی ہے ۔

یقول ابوالسعاد : اس شبہ کو یوں بھی حل کیا جا سکتا ہے کہ ایک قضاء بمعنیٰ خلق و ایجاد ہے وہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اس پر رضا واجب ہے ، دوسرا قضاء بمعنیٰ مفعول یعنی جس کا فیصلہ کیا گیا ۔ یہ بندہ کی صفت ہے اس پر رضا واجب نہیں ۔ اب رضا بالکفر والمعاصی میں وہ قضاء مراد ہے جو بندہ کی صفت ہے نہ کہ ربّ ذوالجلال کی صفت !۔

خلق اور کسب کے مابین وُجوہِ فرق

علماء حضرات نے مختلف وُجوہِ فرق بیان کیئے ہیں :۔

فرق اوّل : خلق ایجاد الفعل بغیر توسط آلہ ہے ، اور کسب آلہ کے ذریعہ سے ہوتا ہے ۔

فرق دوم : حافظ ابنِ تیمیہؒ نے بیان فرمایا ہے کہ جو فعل قدرت کے ساتھ قائم ہو وہ کسب ہے مثلاً اِیمانُ العَبدِ وَکُفرِہٖ بندہ کے ساتھ قائم ہے جو قدرت حادثہ کا محل ہے ، اور اگر فعل محل قدرت کے ساتھ قائم نہ ہو تو وہ خلق ہے۔

فرق سوم : جو فعل قدرت قدیمہ سے صادر ہو وہ خلق ہے اور جو قدرت حادثہ سے صادر ہو وہ کسب ہے ۔

اَلبحثُ الثّامِنُ ۔ بیان مذاہب فی مسئلہ خلق افعالِ عباد

محدثین حضراتؒ نے بحث کی ہے کہ آیا بندوں میں اپنے افعال اختیاریہ کرنے کی قدرت ہے یا نہیں ؟ بندے اپنے افعال کے خود خالق ہو سکتے ہیں یا نہیں ؟ اس میں کئی مذہب ہیں جن کا خلاصہ حسب ذیل ہے اور قابلِ ذکر مذاہب یہ ہیں :۔

مذہب اوّل قدریہ | قدریہ کا مذہب یہ ہے کہ " لِلعَبدِ قدرۃٌ مُؤثِّرۃٌ فِی اَفعَالِہٖ کُلِّھَا سَیِّئَاتِھَا وَحسنَاتِھَا وَلَا یَکُونُ اِیجَادُ الفِعلِ مِنَ اللہِ تَعَالیٰ " یعنی انسان اپنے تمام افعال اختیاریہ اپنی قدرت و اختیار سے کرتا ہے ، اس کے افعال میں اللہ کی قدرت کا دخل نہیں ہوتا انسان اپنے افعال کا خود خالق ہے۔

حدیث میں بطور پیشگوئی کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فرقہ کا تذکرہ کیا ہے اور ان کی مذمت کی ہے ۔ ان کو معتزلہ بھی کہتے ہیں ۔

سوال : قدریہ اور معتزلہ کی وجہ تسمیہ کیا ہے ؟

جواب ۔ اس نظریہ والوں کو قدریہ کہنے کی دو وجہیں ہیں :۔

۱۔ یہ اپنے اندر قدرت تامّہ مانتے ہیں جس سے اپنے افعال کا خود خَلق کر سکیں۔ قدریہ کا معنیٰ ہوگا کہ اپنے اندر ایسی قدرت ماننے والے ہیں۔

۲۔ یہ لوگ مسئلہ تقدیر میں زیادہ الجھتے تھے اور عقلی غوض کرتے تھے۔ اس لیے ان کا نام قدریہ پڑ گیا۔ مُعتزلہ عزل سے ہے بمعنیٰ جدا ہونا۔ چونکہ علماءِ اہل سنّت والجماعۃ سے یہ علیحدہ اور جدا ہو گئے ہیں۔ اس لیے ان کو معتزلہ کہتے ہیں۔

قدریّہ کی تردید میں چند نصُوص

قرآن مُقدّس کی سینکڑوں آیات مذہب قدریہ کی تردید کر رہے ہیں۔

۱۔ قُلْ کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ : سب کچھ اللہ تعالیٰ کا پیدا کردہ ہے خواہ عرض ہوں یا جواہر

۲۔ اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (پ۸)

۳۔ اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ (پ۲۹)

۴۔ وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ (پ۲۳)

۵۔ وَرَبُّکَ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ وَیَخْتَارُ (پ۲۰)

۶۔ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمْ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ (پ۲۴)

۷۔ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ (پ۳۰)

ان تمام آیات سے واضح طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ ہدایت وضلالت کا مالک وہی ہے۔ تمام مخلوقات اور ان کے اعمال کا خالق وہی ہے۔

مذہب دوّم جبریّہ

جبریّہ کہتے ہیں کہ " لَا قُدْرَۃَ لِلْعَبْدِ اَصْلاً بَلْ ھُوَ کَالْجَمَادِ : بندہ میں کسی درجہ کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ بندہ اپنے افعال کا کاسب ہے نہ خالق ہے اس کے افعال محض حق تعالیٰ کی قدرت سے صادر ہو رہے ہیں یعنی بندہ مجبور محض ہے۔

سوال۔ جبریہ کی وجہ تسمیہ کیا ہے ؟

جواب ۔ چونکہ جبریہ کے نزدیک انسان مجبور محض ہے۔ پتھر کی طرح اس کو جس طرف گرا دو گر جائے گا۔ یہی حال انسان کا ہے کہ وہ نعوذ باللہ ربّ ذو الجلال کے جبر میں ہے۔ وَلِهٰذَا يُسَمّٰى جَبْرِيَّةً ۔

جَبریّہ کی تردید اور اختیارِ عَبد میں دلائل

یقول ابوالاسعاد : جبریّہ کا مذہب نہایت واہیات ہے، اس میں دو قباحتیں ہیں :۔

قباحت اوّل ـــــ یہ مذہب وجدانِ صریح کے خلاف ہے

انسان کا وجدان صراحۃً اس کو بتا رہا ہے کہ اس کے افعال اختیاریہ اس کے اختیار سے صادر ہو رہے ہیں بلکہ انسان کے مختار ہونے کا علم حیوانات کو ہے۔

مِثال اوّل بعض جانوروں کو جب لاٹھی ماری جاتی ہے تو وہ لاٹھی پر حملہ نہیں کرتے لاٹھی مارنے والے کے پیچھے پڑ جاتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ لاٹھی مجبور ہے اور مارنے والا مختار ہے۔

مثال دوم اگر چھت میں سے لکڑی گر کر کسی کے سر پر لگ جائے تو کسی کو غصّہ نہیں آتا اور اگر یہی لکڑی کسی نے جان بوجھ کر مار دی ہو تو اس پر غصّہ آتا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ پہلی لکڑی کے لگنے میں کسی کے بھی اختیار کا دخل نہیں تھا، دوسری میں اس کے اختیار کا دخل ہے۔

قباحت دوم ـــــ یہ مذہب نصُوص قرآنیہ کے بھی خلاف ہے

نیز یہ مذہب نصوص قرآنیہ کے بھی خلاف ہے کما فی قولہٖ تعالیٰ " لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ

نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا - یعنی آدمی میں جس قدر وسعت اور اختیار ہوتا ہے اسی کے مطابق اس کو مکلّف بنایا جاتا ہے - دیگر دلائل قرآنیہ ملاحظہ فرمائیں :-

۱ - فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ - (پ ۱۵)

۲ - فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّہٖ سَبِیْلًا (پ ۲۹)

۳ - وَلَوْ شَآءَ رَبُّکَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ کُلُّھُمْ جَمِیْعًا (پ ۱۱)

ان آیات سے معلوم ہوا کہ ایمان وہدایت کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر جبر نہیں کیا۔

مذہب سوم ــــ اہلِ حق

اہل السنۃ والجماعۃ (جن کو اہلِ حق سے تعبیر کیا جاتا ہے) نہ تو ایسے سفہاء ہیں کہ وجدانِ صحیح اور نصوصِ صریح کا انکار کریں نہ ایسے بے دین بننے کے لیے تیار ہیں کہ نصوص میں توڑ موڑ کر تاویلات کریں بلکہ ان کے نزدیک انسان کو اپنے افعال کا اختیار حاصل ہے لیکن یہ اختیار کامل اور مستقل نہیں بلکہ ناقص اور عارضی ہے یعنی انسان کو قوتِ خالقہ تو حاصل نہیں لیکن قوتِ کاسبہ حاصل ہے (ظَهَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِی النَّاسِ) قوتِ خالقہ صرف خدائے برتر کی صفت ہے یہ مذہب متوسط اور معتدل ہے کہ خلقِ افعال کو اللہ کی قدرت وتقدیر کے تابع قرار دیتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ بندہ کے لیے کسب کو بھی ثابت کرتا ہے۔

ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم

واغفرلنا ما وقع من الخطاء والزلل

وما لا ترضیٰ بہ

من العمل امین

الفَصلُ الاوّل

یہ پہلی فصل ہے ۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَتَبَ اللّٰہُ مَقَادِیْرَ الْخَلَائِقِ قَبْلَ اَنْ یَّخْلُقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِخَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَۃٍ

ترجمہ: روایت ہے حضرت عبداللہؓ بن عمرو سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کو پیدا کرنے سے پچاس ہزار برس پہلے مخلوقات کی تقدیروں کو لکھا ہے ۔

قولہٗ کَتَبَ اللّٰہُ ۔ یہاں پر ایک سوال ہے ۔

سوال ۔ کتابت کی نسبت ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے حالانکہ وہ کتابت کرنے سے پاک ہیں ۔ لہٰذا یہ نسبت کیسے صحیح ہو سکتی ہے ؟

جواب اوّل ۔ کتابت کی نسبت فرشتوں کی طرف ہے کہ فرشتوں کو لکھنے کا حکم دیا ۔ چونکہ آمر خود ذاتِ باری تعالیٰ تھی اس لیے نسبت کتابت ان کی طرف کر دی گئی ۔ جیسے بناء الامیر ھٰذا المصر اس شہر کو امیر نے بنایا ہے ۔ حالانکہ امیر نہ تو گارا اٹھاتا ہے اور نہ کوئی اور کام کرتا ہے ۔ مگر چونکہ آمر ہوتا ہے تو نسبت اس کی طرف کر دی جاتی ہے ۔

جواب دوم ۔ کَتَبَ بمعنیٰ اَرَادَ ہے یعنی اللہ پاک نے صرف ارادہ کیا اور فی الفور لوح محفوظ میں سب کچھ منقش ہو گیا تھا ۔

یقول ابوالاسعاد : حدیث پاک کے اس جملہ سے اس طرف اشارہ ہے کہ تقدیر ازلی شئی ہے یا ازل میں ہوئی ۔

قولہٗ مَقَادِیْرَ الْخَلَائِقِ ۔ مَقَادِیْر جمع ہے مِقْدَار کی اس کے دو معنیٰ ہیں ۔ اوّل اندازہ کرنے کا آلہ ، دوم خود اندازہ ۔ یہاں پر دوسرا معنیٰ (اندازہ) مراد ہے ۔

قولہٗ خَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَۃٍ ۔ اس کا معنیٰ ہے پانچ سو صدیاں ۔

سوال ۔ فلاسفہ کے نزدیک حرکتِ فلک کا نام زمانہ ہے اس وقت فلک تو نہ تھا پھر

پچاس ہزار سال کے ساتھ اندازہ کرنا کس طرح صحیح ہوا ؟

جواب اوّل ۔ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَۃٍ میں عدد تحدید کے لیے نہیں بلکہ تکثیر کیلئے ہے یعنی مدت طویل مراد ہے ۔

جواب دوّم ۔ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَۃٍ کا فرمانا مخلوق کو سمجھانے کے لیے ہے ۔ کہ اگر خلائق اس کا اندازہ کرتی تو ان کی نسبت سے پچاس ہزار سال کی مدت ہوتی ۔

جواب سوّم ۔ عند البعض حقیقت پر محمول ہے ، اور ممکن ہے کہ فلک کے وجود سے قبل عرش کی حرکت کا نام زمانہ ہو ۔

قولہٗ وَكَانَ عَرْشُہٗ عَلَى الْمَاءِ ۔ بعض محدثینؒ حضرات نے اس کی تشریح یہ کی ہے کہ اس سے مُراد زمین و آسمان نہ تھے اور صرف پانی تھا ۔ مگر یہ غلط ہے ۔ اس کی صحیح تفسیر وہی ہے جو جمہور سے منقول ہے ۔ وہ یہ ہے کہ جس طرح اب عرش اور پانی کے درمیان بہت سی چیزیں حائل ہیں اس طرح اس وقت کوئی چیز حائل نہ تھی پھر ان کی بھی تردید ہوگئی جو یہ کہتے ہیں کہ " وَكَانَ عَرْشُہٗ عَلَى الْمَاءِ کا معنیٰ ہے کہ عرش پانی پر مستقر تھا ۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اس سے سمندروں کا پانی مراد نہیں بلکہ عرش کے نیچے ایک قسم کا پانی ہے وہ مراد ہے ۔

وَعَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْہِ وَسَلَّمَ كُلُّ شَيْئٍ بِقَدَرٍ حَتَّى الْعِجْزُ وَالْكَيْسُ ۔

ترجمہ : روایت ہے حضرت ابن عمرؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ ہر شئے اندازہ سے ہے یہاں تک کہ عاجزی اور عقلمندی بھی ۔

قولہٗ العجز والکیس ۔ عجز کا معنیٰ بیوقوفی ، کیس بمعنیٰ دانائی ۔ حَتَّى العجز والکیس میں دو ترکیبیں ہیں ۔ ۱ حَتّٰی عاطفہ ہے ، اس کا عطف کلّ پر ڈالیں گے تو عجز اور کیس مرفوع ہوں گے ۔ ۲ حَتّٰی جارہ ہے تو اس کا عطف شَیْئٍ پر ہوگا اور اس کو مجرور پڑھیں گے ۔

سوال ۔ یہاں کیس اور عجز کے تقابل پر اشکال ہے ۔ کیفیّت اشکال یہ ہے کہ عجز کی

ضد کیس نہیں آتی بلکہ قدرت آتی ہے اسی طرح کیس کی ضد عجز نہیں آتی بلکہ اس کی ضد بلادۃ ہے تو دونوں میں تقابل صحیح نہیں۔

جواب ۔ اس عبارت کی دو توجیہیں کی گئی ہیں۔ اوّل عند البعض یہاں کیس کو قدرت کے معنیٰ میں لے لیں۔ اب اس کا تقابل عجز کے ساتھ درست ہوگا۔ یا عجز کو بلادۃ کے معنیٰ میں لے لیں۔ اب اس کا تقابل کیس سے درست ہوگا لیکن یہ تکلف ہے۔ دوم۔ جمہور حضرات کے نزدیک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرمانا چاہتے تھے حتیٰ العجز والقدرۃ والبلادۃ والکیس لیکن آپ نے بڑی جامعیت اور بلاغت کے ساتھ اختصار فرمایا کہ ہر دو ضدین میں سے ایک کو ذکر کرکے دوسرے کو سامع کے فہم پر چھوڑ دیا جائے دوسری وہ خود سمجھ جائے گا۔ یہ طریقہ محمود حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کلام مبارک میں شائع وذائع ہے۔

یقول ابوالاسعاد : اس حدیث سے معتزلہ پر رد مقصود ہے کہ جب افعالِ عباد کا منشاء بھی مقدر ہے تو افعال بطریق اولیٰ مقدر ہوں گے یا اس سے انسان کے عموم صفات کی طرف اشارہ ہے یعنی تقدیر کو صرف جنّت و دوزخ تک محدود رکھنا غلط ہے۔ وہ انسانی حیات کے ہر ہر شعبہ کو حاوی ہے خواہ اس کے خلقی اوصاف ہوں یا کسبی اعمال اس سے مقصد قضاء وقدر کی عظمت کا نقش قائم کرنا ہے۔

وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِحْتَجَّ اٰدَمُ وَمُوْسٰی ۴۱ عِنْدَ رَبِّھِمَا۔

ترجمہ : روایت ہے حضرت ابوہریرۃؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ آدمؑ اور موسیٰ علیہ السّلام نے اپنے رب کے سامنے مناظرہ کیا۔ پس آدم علیہ السّلام موسیٰ علیہ السّلام پر غالب آگئے۔

قولہٗ اِحْتَجَّ ۔ اَیْ تَحَاجَّ یعنی طَلَبَ کُلٌّ مِّنْھُمَا الْحُجَّۃَ مِنْ صَاحِبِہٖ عَلٰی مَا یَقُوْلُ ؛ ہر آدمی اپنے کہے پر دلائل پیش کرے۔ اس مقام پر چند بحثیں ہیں :۔

بحث اوّل ـــــ اِحتجاج سے کیا مراد ہے ؟

جمہور مُحدّثینؒ حضرات کا اس بات پر اتفاق ہے کہ احتجاج سے مراد وہ احتجاج نہیں۔ جو جدال یا مُفضی الی الجدال ہوتا ہے کیونکہ انبیاء کرام کی ذات بابرکات ایسے احتجاجوں سے پاک ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہاں پر احتجاج سے مراد طلب الدلیل یعنی قیل وقال پر دلائل طلب کرنا ہے، توموسیٰ علیہ السّلام نے آدم علیہ السّلام سے اور آدم علیہ السّلام نے موسیٰ علیہ السّلام سے دلائل طلب کیے۔

سوال ۔ مناظرہ کی ابتدا کس نے کی ؟ موسیٰ علیہ السّلام نے یا آدم علیہ السّلام نے ۔

جواب ۔ ابوداؤد شریف ص ۲۹۹ ج ۲ بابُ القدر میں حضرت عمرؓ کی روایت ہے :۔ قَالَ یَارَبِّ اَرِنَا آدَمَ الَّذِیْ اخرجنا الخ کہ موسیٰ علیہ السّلام نے دعاء مانگی کہ اے اللہ! ہمیں آدم علیہ السّلام دکھلا جنہوں نے ہمیں جنّت سے نکلوایا۔ تومعلوم ہوا کہ ابتداء موسیٰؑ سے ہوئی ۔

بحث دوّم ـــــ محلِ مُناظرہ کونسا مقام تھا ؟

محلِ مناظرہ کی تعیین میں دو احتمال ہیں :۔

اِحتمال اوّل عندالبعض یہ مناظرہ دنیا میں ہوا ہے ۔ یعنی جسمانی مکالمہ ومناظرہ ہوا ہے، وہ اس طرح کہ آدم علیہ السّلام کو جُثّہ دے کر موسیٰ علیہ السّلام کے زمانہ میں زندہ کیا گیا، یا موسیٰ علیہ السّلام کی وفات کے بعد دونوں کو زندہ کیا گیا۔

احتمال دوّم جمہور حضرات کے نزدیک یہ مناظرہ عالمِ ارواح میں ہوا ہے ۔ جیساکہ خود حدیثِ باب کے الفاظ اس پر دال ہیں عِنْدَ رَبِّھِمَا ۔

سوال اوّل ـــــ اس مُناظرہ کی حکمت کیا تھی ؟

جواب ـــــ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السّلام سے فرمایا تھا کہ میری تمام باتوں کو فراموش کرکے کیوں گیہوں کھایا ۔ آدم علیہ السّلام نے جو جواب دیا وہ صرف گریہ وزاری تھا ۔ اس کے

سوا ایک حرف تک منہ سے نہیں نکالا۔ اب ممکن تھا کہ کسی کے دل میں یہ وسوسہ گذرتا کہ شاید آدمؑ کے دل میں اس وقت جواب نہ آسکا ہوگا۔ اس لیے عالمِ غیب میں اس عقدہ کے حل کے لیے ایک محفل مناظرہ مُرتّب فرمائی۔ ع گفتہ آید در حدیث دیگراں۔ کی صورت سے معاملہ کی حقیقت واضح کردی گئی کہ سراسر یہ تقدیری مسئلہ ہے۔

سوال دوم۔ یہ ہے کہ اس مناظرہ کے لیے تمام انبیاء علیہم السّلام میں سے موسیٰ علیہ السّلام کو منتخب کرنے میں کیا حکمت ہے؟

جواب اوّل: حضرت آدم علیہ السّلام بنی آدم کے لیے مصدر وجود ہیں۔ پس یہ ملامت ومناظرہ ایسے نبی سے ہونا چاہیے۔ جن کو تکالیف شدیدہ جھیلنے کا حکم دیا گیا ہو۔ موسیٰ علیہ السّلام وہ اوّل نبی ہیں جن کو تکالیف شدیدہ اور جہاد کا مکلّف بنایا گیا (حاشیہ بخاری)

جواب دوم۔ حضرت موسیٰ علیہ السّلام فطرۃً تیز مزاج اور ناز پروردہ تھے۔ لہٰذا ابو البشر کے ساتھ مکالمہ کرنے میں خائف نہ ہوں۔

قولہٗ وَاَسْجَدَ لَكَ مَلٰٓئِكَتَهٗ ــ چونکہ عبادت لغیر اللہ جمیع ادیان وازمان میں حرام اور شرک ہے۔ اس لیے سجدہ سے لغوی معنیٰ بطور تعظیم آدم علیہ السّلام تواضع کرنا مراد ہے کیونکہ سجدہ کے معنیٰ شرعی "ای وَضْعُ الْجَبْهَةِ عَلَى الْاَرْضِ بقصد العبادۃ" مراد ہو تو یہ سوائے خدا تعالیٰ کے جائز نہیں ہے۔ لہٰذا کہا جائے گا کہ مسجود لہٗ حقیقۃً حق تعالیٰ ہی ہے۔ آدم علیہ السّلام کی تفخیم شان کے لیے صرف ان کو قبلہ سجود بنایا گیا جیسا کہ قبلہ کی طرف منہ کرکے سجدہ کرتے ہیں۔ اصل سجدہ خدا تعالیٰ ہی کے لیے ہے۔ عند البعض آدم علیہ السلام کی شریعت میں سجدہ تعظیمی یعنی سجدہ تحیہ کا غیر خدا کے لیے جائز تھا (کما فی البیضاوی وغیرہ)

قولہٗ ثُمَّ اَهْبَطْتَ النَّاسَ بِخَطِيْئَتِكَ (ترجمہ) پھر آپ نے اپنی خطائے سے لوگوں کو زمین پر اتروا دیا۔

سوال ۔ آدم علیہ السّلام سے صدور خطیئہ عصمت انبیاء کے منافی ہے۔

جواب اوّل: یہاں خطیئہ سے مراد حقیقی گناہ نہیں کیونکہ گناہ کے لیے قصد وارادہ شرط ہے حالانکہ قرآن مقدس کا بیان ہے "فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا (پ۱۶)

جواب دوم جنت احکامِ شرعیہ کا محل نہیں۔ لہذا شجرہ ممنوعہ سے کھانے کی ممانعت تشریعی حکم نہ تھا بلکہ تشفیقی حکم یعنی محض شفقت و مہربانی کے اظہار کے لیے ایک حکم تھا جس کا توڑنا گناہ تو نہیں ہوتا لیکن باعثِ ضرر ضرور ہوتا ہے۔ جیسا کہ مریض کو بد پرہیزی سے ضرر ہوتا ہے۔ لہذا یہاں خطیئۃ سے مراد خطاءِ اجتہادی اور پیغمبرانہ اجتہاد کی ایک معمولی سی لغزش ہے کیونکہ جب حضرت آدم علیہ السلام کو ابلیسِ لعین نے قسم کھا کر یہ لالچ دیا کہ اس شجرہ ممنوعہ کے کھانے میں حیاتِ دائمی یا ملکیت کا اثر ہے۔ تو آپ نے اس مقصدِ خیر کی تحصیل کے لیے انظر الی ما قال ولا تنظر الی من قال کے پیشِ نظر یہ اجتہاد کیا کہ شاید پہلے یہ ممانعت ضعفِ استعداد کی وجہ سے ہوا اور اب تو ماشاء اللہ استعداد مکمل ہو چکی ہے۔

قولہٗ اِصْطَفَاکَ اللّٰہُ بِرِسَالَتِہٖ وَبِکَلَامِہٖ۔ زمین پر رہ کر بلا واسطہ فرشتہ رب تعالیٰ سے کلام کرنا موسیٰ علیہ السلام کی خصوصیت ہے۔ اس لیے آپ کا لقب کلیم اللہ ہے۔ لامکان میں پہنچ کر رب کا دیدار اور اس سے کلام ہمارے حضور علیہ السلام کی خصوصیت ہے۔ کیونکہ آپ حبیبُ اللہ ہیں۔

قولہٗ قَالَ مُوْسٰی بِاَرْبَعِیْنَ عَامًا۔ موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا چالیس سال پہلے۔

سوال ۔ اس باب کی پہلی حدیث میں کہا گیا کہ پچاس ہزار برس پہلے تقدیر لکھی گئی۔ (بِخَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَۃٍ) اور یہاں مذکور ہے کہ آدم علیہ السلام کی خلقت سے چالیس سال پہلے لکھی گئی تو دونوں روایتوں میں تعارض ہے۔

جوابِ اوّل قال حجۃُ اللہ علی العالمین الشھیر بولی اللہ بن عبد الرحیم تقدیر کے پانچ مراتب ہیں۔ ا۔ اجمالی جو ازل میں لکھی گئی۔ حدیثِ اوّل (خَمْسِیْنَ سَنَۃً) میں وہی مراد ہے۔ حدیثِ ثانی (اَرْبَعِیْنَ عَامًا) میں باقی درجات مراد ہیں۔

جواب دوم علامہ ابن الجوزیؒ فرماتے ہیں کہ تقدیر کی کتابت مختلف اوقات میں ہوئی۔ ممکن ہے کہ خصوصی طور پر قصۂ آدمؑ کی کتابت آپ کی پیدائش سے چالیس سال پہلے ہوئی۔

جوابِ سوم بعض محدثین حضراتؒ کے نزدیک کتابت مقادیر پچاس سال قبل ہوئی۔ اور چالیس سال کی یہ روایت آدم علیہ السلام کی تصویر اور نفخ روح کے ما بین مدت پر محمول ہے۔ کما ثبت فی مسلم ان بین تصویرہ طینا ونفخ الروح فیہ کان مدۃ اربعین سنۃ۔

قولہ افتلومنی ۔ حضرت آدم علیہ السلام کا یہ فرمانا افتلومنی اس کا مطلب یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام آپ ملامت کے انداز میں گفتگو کر رہے ہو۔ ورنہ موسیٰ علیہ السلام آپ کو ملامت نہ کر سکتے تھے۔ اور کسی بیٹے کو باپ پر، شاگرد کو استاذ پر ملامت کرنے کا حق نہیں۔

قولہ فحج آدم موسیٰ ۔ کہ حضرت آدمؑ موسیٰ علیہ السلام پر غالب رہے۔ ابتدائے حدیث میں احتج آدم بیانِ دعویٰ تھا۔ آخر میں فحج آدم یہ بیانِ نتیجہ ہے۔

سوال حضرت آدم علیہ السلام نے تقدیر کو بہانہ بنایا ہے حالانکہ اعتذار بالقدر جائز نہیں کیونکہ پھر تو ہر عاصی بھی یہ کہ کر جرم کر سکتا ہے کہ جو معصیت مجھ سے صادر ہوئی ہے وہ تقدیری معاملہ ہے، میرا کیا قصور ہے۔ چونکہ لوح محفوظ میں میرا یہ جرم لکھا ہوا ہے اس لیے مجھے یہ جرم کرنا چاہیے۔ اس سے تو جبریہ کا مذہب ثابت ہوتا ہے۔ نیز ارسالِ رسل اور تبلیغ وغیرہ بیکار معلوم ہوتی ہے۔

جوابِ اول عالمِ دنیا اور اس کے بعد کے عالموں کے حکموں میں فرق ہے۔ اعتذار بالقدر جو ناجائز ہے وہ اس دنیا میں ناجائز ہے۔ دوسرے عالم کا یہ حکم نہیں۔ آدم علیہ السلام نے دنیا میں اعتذار بالقدر نہیں کیا بلکہ یہاں تو یوں کہا "ربنا ظلمنا انفسنا الخ" اعتذار بالقدر آپ نے دوسرے عالم میں کیا ہے جیسا کہ حدیث میں عند ربہما کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے۔

جوابِ دوم یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنی معصیت پر تقدیر پیش نہیں کی بلکہ مصائب پر تسلی دینے کے لیے تقدیر پیش کی۔ کیونکہ حضرت موسیٰؑ نے عرض کیا کہ آپ کی خطاء کی بناء پر آپ کی ذریات دنیا میں آکر کتنے مصائب جھیل رہے ہیں تو حضرتِ آدمؑ نے حضرت موسیٰؑ کو تسلی دینے کے لیے تقدیر پیش کی کہ بیٹا کیا کروگے۔

تقدیر میں یہی تھا۔ تو یہاں مسئلہ تسلّی علی المصائب کا ہے، اعتذار عن المصائب کا نہیں۔ جیسے کفّار کو جب جہنم میں ملامت کی جائے گی تو وہ تسلّی کے لیے تقدیر پیش کریں گے۔ کما فی قولہٖ تعالیٰ "قَالُوْا بَلٰی وَلٰکِنْ حَقَّتْ کَلِمَۃُ الْعَذَابِ عَلَی الْکَافِرِیْنَ (۲۴)" فاندفع التعارض۔

سوال: مناظرہ میں آدم علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام پر کیسے غالب آ گئے؟

جواب اوّل: حضرت آدمؑ موسیٰؑ کے والد ہیں۔ ابو البشر ہونے کی وجہ سے ولد کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے والد کو ملامت کرے۔

جواب دوم: حضرت موسیٰ علیہ السلام بغیر اذن اپنے شارع کے آدم علیہ السلام کو ملامت کی اور یہ ملامت بھی تقدیر الٰہی پر ہوئی ہے۔ اس لیے آدم علیہ السلام نے تقدیر کا سہارا لے کر اوّلاً موسیٰ علیہ السلام کو خاموش کر دیا۔ ثانیاً خاموشی علامت مغلوبیت و شکست ہوتی ہے اس لیے غالب آ گئے۔

جواب سوم: سوالِ موسیٰ علیہ السلام عقل پر اور جوابِ آدم علیہ السلام حقیقت پر مبنی تھا تو ہمیشہ حقیقت عقل پر غالب رہتی ہے فلہٰذا آدم علیہ السلام غالب ہو گئے۔

وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ حَدَّثَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَھُوَ الصَّادِقُ الْمَصْدُوْقُ

ترجمہ: حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ صادق مصدوق سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

لفظی تشریح عرض کرنے سے قبل خلاصۃ الحدیث پیش خدمت ہے۔

خُلَاصَۃُ الْحَدِیْث: حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ ابدی نجات و عذاب کی مدار خاتمہ پر ہے۔ اگر کسی کی پوری زندگی گناہ و معصیت یا کفر و شرک میں گذری۔ لیکن اس نے صدقِ دل سے نادم ہو کر توبہ کر لی اور سعادت کے راستہ کو اختیار کیا تو وہ نجات پا جائے گا اور یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ انسان کو اپنے اعمال پر بھروسہ

نہ کرنا چاہیے ۔ بس ہر وقت فضلِ ربی کا طلب گار رہے ۔ معلوم نہیں خاتمہ بالخیر ہوگا یا نہ ۔

قولہٗ اَلصَّادِقُ وَالْمَصْدُوْقُ ۔ عند البعض مصدوق صادق کی تاکید ہے ۔ (کمَا فی شَاھِدٍ وَمَشْھُود) معنیٰ ہے سچا سچوں کا ۔

یقول ابوالاسعاد : صحیح قول کے مطابق صادق اور مَصدُوق میں فرق ہے ۔ فروق اربعہ ملاحظہ فرمائیں :

اوّل : صادق کا تعلّق قبل از بعثت ہے کہ آپ اپنی بعثت سے قبل بھی سچّے تھے ۔ اسی لئے مشرکین مکہ آپ کو امین اور صادق کے لقب سے یاد کرتے تھے ۔ اور مصدُوق کا تعلّق بعد از بعثت ہے ۔ چنانچہ علّامہ عبدالحق مُحدّث دہلویؒ صادق اور مصدوق کا فرق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

صَادِق درفارسی راست گوینده
اَلمَصدُوق راست گفتہ شدہ ۔
(اشعۃ اللمعات ص۸۹ ج۱) باب القدر

دوّم : صادق وہ جس کے سارے اقوال سچے ہوں ، مصدُوق وہ جس کے سارے اعمال سچے ہوں ۔یعنی اَلصَّادِقُ فِی اَقْوَالِہٖ وَالمَصْدُوْقُ فِی اَعْمَالِہٖ ۔

سوّم : صَادِق وہ جو ہوش سنبھال کر سچ بولے ، اور مَصدُوق وہ جو پہلے ہی سے سچّا ہو ۔ چہارم : صَادِق وہ جو واقعہ کے مطابق خبر دے ، اور مَصدُوق وہ جو اپنی زبان مبارک سے کہدے واقعہ اس کے مطابق ہو جائے ۔ حضورؐ کی ذات مبارک میں یہ سارے اوصاف جمع ہیں ۔

سوال : اس حدیث میں خصُوصی طور پر یہ جُملہ کیوں لایا گیا ؟

جواب اوّل : حضرت ابنِ مسعودؓ نے اس جملہ کو اپنی عقیدت کے اظہار کے لیے فرمایا ، اور حدیثِ پاک میں ایسے جملے شائع وذائع ہیں ۔

جواب دوّم : عند البعض یہاں جو حکم بیان ہو رہا ہے وہ اطبا کی اصطلاح کے خلاف ہے ۔ لہٰذا توثیق وتائید کے لیے اس کو لایا اور اضافہ کیا گیا ۔

قولہٗ عَلَقَةً : جما ہوا خون۔

قولہٗ مُضْغَةً : گوشت کا ٹکڑا۔

یقول ابوالاسعاد : تخلیقِ انسانی کے متعلق یہاں صرف تین مدارج کے بیان پر اکتفاء کیا گیا ہے۔ لیکن قرآن مقدس سورۂ مومنون آیت ۱۲، ۱۳، ۱۴ میں اس کے سات مدارج بیان کیے گئے ہیں:۔

(۱) سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ (۲) نُطْفَةً (۳) عَلَقَةً (۴) مُضْغَةً (۵) عِظَامًا (۶) كَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا یعنی ہڈیوں پر گوشت چڑھانا (۷) روح پھونکنا۔

سوال ۔ اللہ تعالیٰ تو انسان کو بیک لمحہ پیدا کر سکتے ہیں۔ (اِذَا اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ) پھر اس تدریج میں کیا حکمتیں ہیں؟

جواب اوّل ۔ انسان کو تدریج اور اختیار اسباب کی تعلیم دینا مقصود ہے۔

جواب دوم ۔ انسان اپنی حقیقت میں غور کرتے ہوئے تکبر نہ کرے۔ کما قیل:

اَوَّلُهٗ نُطْفَةٌ مَذِرَةٌ وَاٰخِرُهٗ جِيْفَةٌ قَذِرَةٌ وَتَحْمِلُ بَيْنَ ذَالِكَ عَذِرَةٌ

قولہٗ مِثْلُ ذَالِكَ ۔ اس کا مشارالیہ اَرْبَعِيْنَ يَوْمًا ہے۔

قولہٗ ثُمَّ يَبْعَثُ اللّٰهُ اِلَيْهِ مَلَكًا ۔ پھر اللہ تعالیٰ اس کے پاس ایک فرشتہ کو چار باتیں لکھنے کے لیے بھیجتا ہے۔

سوال | اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ تیسرے اربعین کے بعد فرشتے آجاتے ہیں۔ جب کہ مسلم شریف میں حضرت حذیفہؓ کی روایت ہے کہ بیالیس دن کے بعد فرشتے آجاتے ہیں اور نطفہ کو علقہ، پھر مضغہ بنا دیتے ہیں۔ فتعارضا۔

جواب | یہ کہ یہاں الگ الگ فرشتے ہیں۔ (۱) ایک نطفہ کی حفاظت کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ اس کا بیان مسلم شریف کی روایت میں ہے۔ اور ۲ دوسرا فرشتہ تقدیر لکھنے کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ جو تیسرے دور کے بعد آتا ہے۔ لہٰذا فلا اشکال علیہ۔

قولہٗ فَيَكْتُبُ عَمَلَهٗ وَاَجَلَهٗ ۔ فرشتہ اس کے عمل اس کی موت (کا وقت)

اس کا رزق اور اس کا نیک و بد ہونا لکھ دیتا ہے فیکتب یہ اربع کلمات کی تشریح کا بیان ہے۔

بیانِ تشریح اربعہ کلمات

حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ اربعہ کلمات کی کتابت ہوتی ہے لیکن کہاں ہوتی ہے اس میں مختلف قول ہیں چند ایک ملاحظہ فرمائیں :۔

اوّل : مجاہد رحؒ فرماتے ہیں کہ ان چار چیزوں کو ایک کاغذ پر لکھ کر اسے بچہ کے گلے میں لٹکا دیتے ہیں۔ لیکن وہ کاغذ انسانوں کو نظر نہیں آتا۔ کما قال اللہ تعالیٰ "وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ (بنی اسرائیل پ۱۵) یعنی ہر آدمی خواہ وہ مؤمن ہو یا کافر اس کی قسمت اس کی گردن میں لٹکا دی جاتی ہے اور چپٹا دی ہے۔

دوم : حافظ ابنِ حجرؒ فتح الباری میں لکھتے ہیں کہ ان کی کتابت کسی متعلقہ دفتر میں ہوتی ہے۔

سوم : بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ امور دونوں آنکھوں کے درمیان لکھے جاتے ہیں۔ دورِ حاضر میں دیکھا جاتا ہے کہ بعض شخص پیشانی پر ہاتھ مار کر ہائے مقدر کہا کرتے ہیں۔

سوال : یہاں حدیث میں اربع کلمات یعنی چار کا ذکر ہے جب کہ بعض روایات میں پانچویں چیز مقامِ موت کا بھی ذکر ہے۔ اس سے تو خمس کلمات بن جاتے ہیں۔

جواب اوّل : یہاں اختصار کرتے ہوئے پانچویں کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اور حذف اختصاراً شائع و ذائع ہے۔

جواب دوم : سابقہ قانون کی طرف اشارہ ہے کہ ایک عدد کے ذکر سے دوسرے عدد کی نفی نہیں ہوتی۔

قولہ ثُمَّ يُنْفَخُ فِيْهِ الرُّوْحُ ۔ پھر روح پھونکی جاتی ہے۔

سوال ۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ نفخ روح سے پہلے تقدیر لکھی جاتی ہے جب کہ بیہقی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ نفخ روح کے بعد تقدیر قلمبند کی جاتی ہے۔ فتعارضا۔

جواب ۔ حدیث الباب کو ترجیح دیں گے۔ کیونکہ یہ روایتِ شیخین ہے عند البعض

بیہقی کی روایت میں ترتیب اخبار ہے، ترتیب واقعہ نہیں۔

قولہٗ فَیَسْبِقُ عَلَیْہِ الْکِتَابُ : کتاب سے مراد کتاب الشقاوۃ والسعادۃ ہے۔

سوال : باب سبق متعدی بلا واسطہ ہوتا ہے۔ یہاں پر متعدی عَلٰی کے ساتھ ہے۔

جواب : سَبَقَ بمعنٰی غَلَبَ ہے۔ اور غَلَبَ عَلٰی کے ساتھ متعدی ہوتا ہے۔

قولہٗ لَیَعْمَلُ بِعَمَلِ اَھْلِ النَّارِ : حدیث پاک کے اس جملہ سے معلوم ہوا کہ یہ فیصلہ صرف تقدیر کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے ساتھ عمل کا بھی دخل ہے۔ حدیث کا ماحصل یہ ہے کہ کسی کے ظاہری عمل کو دیکھ کر اس کے جنتی یا دوزخی ہونے کا حکم نہیں لگایا جا سکتا بلکہ یہ خدا کی مرضی پر موقوف ہے۔ کما قَالَ اللہُ تعالٰی " یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ وَیَرْحَمُ مَنْ یَّشَآءُ۔ (العنکبوت آیت ۲۱) چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ کسی شخص کی راہِ خدا میں جانبازی دیکھ کر بھی کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں اچھے اعمال سے حسنِ خاتمہ کی امید اور برے اعمال سے سوءِ خاتمہ کا اندیشہ ضرور ہونا چاہیئے۔

یقول ابوالاسعاد : اس حدیث نے اولیاء اللہ کا خون پانی بنا رکھا ہے۔ کیونکہ یہ خبر کس کو ہے کہ اس کا خاتمہ کیسے اعمال پر ہوگا، اور اس خوف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابیؓ بھی یہاں گریہ وزاری میں مبتلا رہے۔

وَعَنْ سَھْلِ بْنِ سَعْدٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْعَبْدَ لَیَعْمَلُ عَمَلَ اَھْلِ النَّارِ۔

ترجمہ : روایت ہے حضرت سہل بن سعدؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بے شک بندے عمل تو دوزخیوں والے کرتے ہیں۔

سہل بن سعد کا اصلی نام حزن تھا بمعنٰی غم مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے نام پسند نہیں تھے۔ جس میں لفظی برائی کے ساتھ معنوی برائی بھی ہو۔ چنانچہ ان کا نام گرامی حزن سے تبدیل کر کے سہل رکھا۔

قولہٗ لَیَعْمَلُ۔ یہاں پر بھی اوّلاً وظاہراً مقدر کریں گے۔

قولہٗ اَهْلُ الْجَنَّةِ ۔ یہاں فِی عِلْمِ اللہِ مقدر نکالیں گے ۔

یقول ابوالاسعاد : اس حدیث نے پہلی حدیث کی توثیق کردی ۔ نیز اس سے مندرجہ ذیل باتیں نکلتی ہیں :۔

۱ ۔ انسان اپنے اعمال صالحہ پر مغرور نہ ہو، اور اعمال سیئہ کی بنا پر مایوس نہ ہو ۔

۲ ۔ اور کسی پر جنتی اور دوزخی ہونے کا قطعی حکم بھی نہ لگاؤ ۔

۳ ۔ کسی شریر آدمی کی تحقیر بھی نہ کرے ۔ شاید اس کا خاتمہ اچھا ہو ۔ شاعر نے کیا ہی خوب کہا :۔

زوجہ فرعون ہوئی طاہرہ ــــــ اہلیہ لوطؑ نبی ہو کافرہ
زاد آذر خلیل اللہ ہو ــــــ اور کنعان نوحؑ کا گمراہ ہو

۴ ۔ لوگوں کو چاہیے کہ آخری عمر تک نیک کام کرتے رہیں کہ کیا ہوا عمل برباد نہ ہو ۔

۵ ۔ چونکہ اعتبار خاتمہ بالخیر کا ہے ۔ ممکن ہے ہر کام آخری ہو ۔ اس لیے ہر کام کے متعلق اہتمام کرنا چاہیئے ۔

وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ دُعِيَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَى جَنَازَةِ صَبِيٍّ مِنَ الْاَنْصَارِ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللهِ طُوْبٰى لِهٰذَا عُصْفُوْرٌ مِّنْ عَصَافِيْرِ الْجَنَّةِ لَمْ يَعْمَلِ السُّوْءَ وَلَمْ يُدْرِكْهُ ۔

ترجمہ : حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک انصاری بچہ کے جنازہ پر رسول صلعم بلائے گئے میں نے کہا یارسول اللہ اس بچہ کو خوشخبری ہو یہ تو بہشتی چڑیوں میں سے ایک چڑیا ہے کہ کوئی برا عمل نہ کیا اور نہ اس حد تک پہنچا ۔

قولہٗ طُوْبٰى ۔ طُوْبٰى بروزن فُعْلٰى اس کے معانی میں مختلف اقوال ہیں :۔

۱ ۔ طُوْبٰى بمعنٰی فرح یعنی خوشی ۔ یہ قول حضرت ابن عباسؓ کا ہے ۔ کما فی قولہٖ تعالیٰ" طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ ۔ (پ ۱۳ س رعد)

۲۔ عند البعض خَیرٌ وَکَرَامَۃٌ لَھُمْ

۳۔ طُوْبٰی بمعنیٰ اُصِیْبَ خَیرٌ بہرحال اس کا معنیٰ خوشی ہی خوشی ہے۔

قولہٗ عُصْفُوْر ۔ بمعنیٰ طَیرٌ صَغِیرٌ۔ بعض محدّثینؒ حضرات نے لکھا ہے کہ یہاں عُصْفُوْر سے مراد جنّت کا چھوٹا سا انسان ہے۔ کبھی ایک لفظ بول کر اس کا فرد غیر متعارف مراد لیا جاتا ہے۔ جیساکہ کہا جاتا ہے اَلْقَلَمُ احدُ اللّسَانَین، یا سرعتِ سیر سے تشبیہ ہے یعنی وہ جہاں چاہے گا چلے پھرے گا۔

سوال : یہ فرمان اُمّ المؤمنینؓ من قبیل التشبیہ نہیں ہے کیونکہ جنّت میں چڑیا اور پرندے نہیں ہوں گے۔

جواب : بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جنّت میں پرندے ہوں گے مثلاً ایک حدیثِ پاک میں ہے" اِنَّ فی الْجَنَّۃِ طَیرًا کَاَمْثَالِ الْبُخْتِ" بختی اونٹ کی طرح پرندے ہوں گے، اور دوسری حدیث میں ہے" اِنَّ اَرْوَاحَ الْمُؤْمِنِیْنَ فِیْ اَجْوَافِ طَیرٍ خُضْرٍ، اور قرآن مقدس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی "وَلَحْمِ طَیرٍ مِّمَّا یَشْتَهُوْنَ (پ۲۷)

قولہٗ لَمْ یُدْرِکْہُ ۔ ای لَمْ یَلْحَق عَمَلٌ مِنَ السُّوْءِ ۔

قولہٗ اَوْ غَیْرُ ذَالِکَ ۔ کلمہ اَوْ میں چند احتمالات ہیں۔

۱۔ صحیح روایت میں ہمزہ استفہام کے لیے ہے اور واؤ مفتوحہ عاطفہ ہے۔ معطوف علیہ محذوف ہے" اَیْ اَتَقُوْلِیْنَ هٰذَا وَالْحَقُّ غَیْرُ ذَالِکَ ۔ یا۔ اَتَعْتَقِدِیْنَ مَا قُلْتِ وَالْحَقُّ غَیْرُ ذَالِکَ ! یعنی اے عائشہؓ ایسا اعتقاد رکھتی ہو۔ حق تو یہ ہے کہ اس بچہ پر قطعی جنّتی ہونے کا حکم مت لگاؤ۔

۲۔ اَوْ بسکونِ الواوِ تردید کے لیے ہے یعنی تم جو کہتی ہو وہ ہوگا، یا دوسرا حال ہوگا

۳۔ یا اَوْ بمعنیٰ بَلْ ہے۔ کمَا فی قولہٖ تعالیٰ " وَاَرْسَلْنَاہُ اِلٰی مِأَۃِ اَلْفٍ اَوْ یَزِیْدُوْنَ (الصّٰفّٰت ایت ۱۴۷) اَیْ بَلْ یَزِیْدُوْنَ یعنی وہ عصفور نہیں بلکہ اس کا غیر ہے۔

سوال : اُمّ المؤمنین بی بی عائشہؓ نے اس بچہ کو جنّتی قرار دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

نے اس پر انکار فرمایا۔ حالانکہ یہ بچہ مسلمانوں کا تھا۔ اور اس بات پر تمام علماءِ امت کا اجماع ہے کہ مسلمان کا بچہ مر جائے تو وہ جنّتی ہوتا ہے۔

جوابِ اوّل بعض شارحین نے کہا ہے کہ ابھی تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کو وحی سے یہ بات معلوم نہیں ہوئی تھی کہ مسلمانوں کے بچے جنّت میں جائیں گے۔ انکار کا مقصد یہ تھا کہ محض اپنی رائے سے مسئلہ کیوں بتاتی ہو۔ یعنی یہ حدیث ابتداء پر محمول ہے بعد میں آپ کو اَطْفَالُ الْمُؤمِنِین کے قطعی جنتی ہونے کا علم دیا گیا تھا۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے وَالمَولُودُ فِی الجَنَّۃِ (مشکوٰۃ شریف ص۳۲۵ ج۲) اور دوسری حدیث میں ہے "اِنَّ المُؤمِنِینَ وَاَولَادَهُم فِی الجَنَّۃِ۔ (مشکوٰۃ شریف ص۲۳ ج۱)

جوابِ دوم نابالغ بچے تبعاً للابوین کی حیثیت سے جنّتی ہوں گے۔ تو خاص اس لڑکے کو یقیناً جنّتی کہنے سے ان کے والدین کو جزماً جنتی ہونے کا حکم لازم آتا ہے، حالانکہ والدین کا خاتمہ بالخیر ہونا معلوم تو نہ تھا اس لیے نکیر فرمائی۔

جوابِ سوم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار ان کے بہشتی ہونے پر نہیں تھا بلکہ بی بی عائشہ صدیقہؓ کو کلام کا ادب سکھانا مقصد تھا کیونکہ کسی کے لیے امورِ غیب کے متعلق صاحبِ وحی کے سامنے ایسے جزم و یقین کے ساتھ کہنا مناسب نہیں۔

قولہٗ وَاِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ لِلجَنَّۃِ اَهلاً خَلَقَهُم لَهَا وَهُم فِی اَصلَابِ اٰبَائِهِم

(ترجمہ) بے شک اللہ تعالیٰ نے جنّت کے لیے ایک گروہ پیدا کیا ہے اس حال میں کہ وہ اپنے والدین کی پشت میں تھے۔

سوال حدیثِ پاک کے اس جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خواہ چھوٹے ہوں یا بڑے خدا نے ایک جماعت کے لیے ازل ہی میں جنّت لکھ دی ہے، اور ایک جماعت کے لیے ازل ہی میں دوزخ لکھ دی ہے، پھر عمل کی کیا ضرورت ہے۔

جواب اطفال مؤمنین کے جنتی ہونے کے متعلق احادیث تو ابھی نقل کی گئی ہیں۔ ہاں ازل ہی میں لکھ دیے جانے کے بعد بڑوں کو عمل کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ربِّ ذوالجلال کا قول " وَمَا خَلَقتُ الجِنَّ وَالاِنسَ اِلَّا لِیَعبُدُونَ اس پر صراحۃً دال ہے لیکن جنّت میں جانا، اور دوزخ سے محفوظ رہنا فضلِ الٰہی پر موقوف ہے۔ اور اس پر واقف

ہونا ہماری طاقت سے باہر ہے اس لیے ہم مجاز نہیں کہ اس پر توکل کر کے بیٹھے رہیں۔ ہمارا وظیفہ عمل کرنا ہے۔ اگر ہمیں نیک کام اچھے لگتے ہیں تو یہ جنتی ہونے کی علامت ہے۔ اور اگر بُرے اعمال کی طرف ہمارا رجحان ہے تو یہ دوزخی بننے کی علامت ہے۔

وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْكُمْ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا وَقَدْ كُتِبَ مَقْعَدُهٗ مِنَ النَّارِ وَمَقْعَدُهٗ مِنَ الْجَنَّةِ

ترجمہ: حضرت علیؓ فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ تم میں سے ایسا کوئی نہیں جس کا ایک ٹھکانہ دوزخ میں اور ایک ٹھکانہ جنّت میں نہ لکھا جا چکا ہو۔

سوال: بظاہر حدیث کے الفاظ اپنے مقصد پر واضح نہیں کیونکہ معنیٰ ہوتا ہے کہ ایک شخص کے لیے دو ٹھکانے ہیں مَقْعَدُهٗ مِنَ الْجَنَّةِ وَمَقْعَدُهٗ مِنَ النَّارِ، حالانکہ ہر آدمی کا ٹھکانہ تو ایک ہوگا۔

جواب: یہ ہے کہ یہاں پر واؤ بمعنٰی اَوْ جو کہ یا کے معنٰی میں ہے۔ اب معنٰی یوں ہوگا کہ یا تو ٹھکانہ جنّت میں ہوگا یا نار میں ہوگا۔

قولہٗ اَفَلَا نَتَّكِلُ۔ ای اَفَلَا نَعْتَمِدُ عَلٰى مَا كُتِبَ لَنَا اَفَلَا نَتَّكِلُ۔ یہ جزاء ہے اس کی شرط محذوف ہے "اِذَا كَانَ الْاَمْرُ كَذٰلِكَ جب معاملہ ہی ایسا ہے تو پھر اس پر بھروسہ کر کے بیٹھ جائیں عمل کی کیا ضرورت ہے۔

قولہٗ رِكِتَابُنَا۔ اس کی اضافت عہد کی ہے " اَلَّذِیْ قَدَّرْنَا۔

قولہٗ اِعْمَلُوْا فَكُلٌّ مُّيَسَّرٌ۔ فرمایا عمل کیے جاؤ ہر ایک کو وہی اعمال آسان ہوں گے جس کے لیے پیدا کیا گیا۔ اِعْمَلُوْا الخ سے جوابِ نبوی ہے جو علیٰ اسلوب الحکیم ہے

خلاصہ جوابِ نبویؐ

جواب کا حاصل یہ ہے کہ تقدیر مُظہر ہے مُجبِر نہیں۔ یعنی سعادت و شقاوت کا اصل دار و مدار بندہ کے کسب و سعی پر ہے۔ وہ نیک و بد کے جس راہ کو اختیار کرتا ہے اسی کے مطابق اس کے لیے اسباب و امور پیدا کر دیے جاتے ہیں۔ لہٰذا تقدیر سے جبر اور تعطّل لازم نہیں آتا۔

قولہٗ اَمَّا مَنْ کَانَ اَھْلَ السَّعَادَۃِ فَسَیُیَسَّرُ بِعَمَلِ السَّعَادَۃِ ۔ الخ
(لہٰذا جو شخص نیک بختی کا اہل ہوتا ہے خدا اس کو نیک بختی کے اعمال کی توفیق دیتے ہیں ۔

یقول ابوالاسعاد : اَمَّا مَنْ کَانَ اَھْلَ السَّعَادَۃِ اور اَمَّا مِنْ اَھْلِ الشَّقَاوَۃِ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک اصول بیان فرما رہے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا میں اعمال عموماً انجام کی علامتیں ہوتی ہیں ۔ جنّتی کو نیکیاں آسان اور گناہ بھاری معلوم ہوتے ہیں اور دوزخی کو اس کا عکس ۔ مگر یہ قاعدہ اکثریّہ ہے کُلّیہ نہیں ، کبھی عمر بھر کا مجرم جنّتی ہو کر مرتا ہے ۔ (کما فی واقعۃ سقایۃ الکلب : ابوداؤد ج۲ ص۳۵۲ کتاب الجهاد باب مایؤمر بہ من القیام علی الدّواب) اور کبھی اس کے برعکس بھی ۔ لہٰذا یہ حدیث گزشتہ حدیث سہل بن سعدؓ کے خلاف نہیں

قولہٗ ثُمَّ قَرَأَ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی ۔ الخ ۔ یہ آیت اگرچہ سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے ایمان اور سخاوت کے مُتعلق نازل ہوئی لیکن چونکہ حکم عام ہے ۔ اور یہ اصول بھی ہے کہ آیت اپنے شانِ نزول میں بند نہیں ہوتی ۔ اس لیے ہر جگہ مُنطبق ہو سکتی ہے ۔

وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ کَتَبَ عَلٰی ابْنِ اٰدَمَ حَظَّہٗ مِنَ الزِّنَا اَدْرَکَ ذٰلِکَ لَا مُحَالَۃَ ۔

ترجمہ : حضرت ابی ہریرہؓ فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ خدا نے انسان کی تقدیر میں زنا کا جتنا حصّہ لکھ دیا ہے وہ حصّہ ضرور عمل میں آئے گا ۔

قولہٗ اِنَّ اللّٰہَ کَتَبَ : محدّثین حضرات نے کتابت کے دو معنیٰ بیان فرمائے ہیں
اوّل : کتب بمعنیٰ ثبت ای ثبت فیہ الشهوات والمیل الی النساء ۔
دوّم : کتب بمعنیٰ قدر ای قدر فی الازل یعنی لوح محفوظ میں مگر اس کا ارتکاب اپنے اختیار سے ہے ۔ لہٰذا اس سے مجبور ہونا لازم نہیں آئے گا ۔

قولہٗ اِبْنِ اٰدَمَ : یہاں ہر انسان سے عام انسان مراد ہے ہاں جس کو اللہ تعالیٰ یَعْصِمُ مَنْ یَّشَآءُ بفضلہٖ انبیاء کرام کی ذات بابرکات اس سے مستثنیٰ ہیں ۔

قولہٗ فَزِنَا الْعَيْنِ النَّظْرُ ۔ غیر محرم عورتیں مراد ہیں ان کو نظرِ بد سے دیکھنا یہ آنکھوں کا زنا ہے اسی طرح اجنبی عورتوں کے حسن وجمال کی تعریف کرنا زبان کا زنا ہے ۔ پھر اسے شوق سے سننا لذت کے لیے کان کا زنا ہے ۔ بعض عورتیں اپنے خاوندوں سے دوسری عورتوں کا حسن بیان کرتی ہیں یہ سخت جرم ہے ۔ اعضاء مذکورہ کا ذکر توالعات اور مقدماتِ زنا کی وجہ سے کیا ہے نہ کہ اصالۃً کیونکہ ان سے زنا کا صدور غیر ممکن ہے ۔

قولہٗ وَالْفَرْجُ يُصَدِّقُ ذَالِكَ وَيُكَذِّبُهٗ (ترجمہ) اور شرمگاہ اس آرزو کی تصدیق کرتی ہے یا تکذیب ۔ تصدیقِ فرج کا مطلب یہ ہے کہ جب نفسِ انسانی ہوس و خواہشات کا غلام بن جاتا ہے اور فعلِ حرام کا مرتکب ہوتا ہے تو اگر شرمگاہ اس کی غلط خواہش پر عمل کرتی ہے اور زنا میں مبتلا ہو جاتی ہے تو یہی اس کی تصدیق ہے ۔ اور اگر اس کا احساس وشعور اور ضمیر خدا کے خوف سے بھرا ہوا ہوتا ہے ، اور شرمگاہ فعلِ حرام کی تکمیل سے انکار کر دیتی ہے ، اور بدکاری میں مبتلا نہیں ہوتی تو یہ اس کی تکذیب ہے ۔

خلاصۃ الحدیث

اصل زنا تو یہی ہے کہ کسی نامحرم عورت سے بدکاری کی جائے لیکن اصطلاح شریعت میں ان حرکات واعمال کو بھی مجازاً زنا کہا جاتا ہے جو حقیقی زنا کے لیے اسباب کا درجہ رکھتے ہیں ۔ یا جو اس تک پہنچاتے ہیں ۔ جیسا کہ حدیث باب میں ہے ۔ یہ سب چیزیں چونکہ حقیقی زنا کی محرک بنتی ہیں اس لیے ان کو بھی مجازاً زنا کہا جاتا ہے تاکہ ان حرکات واسباب کی نفرت وکراہت دلوں میں بیٹھ جائے ۔

وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍؓ اَنَّ رَجُلَيْنِ مِنْ مَزِيْنَةَ قَالَا يَارَسُوْلَ اللهِ اَرَأَيْتَ مَا يَعْمَلُ النَّاسُ الْيَوْمَ وَيَكْدَحُوْنَ فِيْهِ اَشَيْئٌ قُضِيَ عَلَيْهِمْ وَمَضٰى فِيْهِمْ مِنْ قَدَرٍ سَبَقَ ۔

ترجمہ : روایت ہے عمران بن حصینؓ سے کہ مزینہ کے دو شخصوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ فرمائیے آج جو کچھ عمل کر رہے ہیں اور جس میں مشغول ہیں کیا یہ ایسی چیز ہے جس کا ان پر فیصلہ ہو چکا ہے ۔ اور جس چیز کی تقدیر ان میں گذر چکی ہے ۔

قولہٗ مزینۃ ۔ اِسمٌ للقبیلۃ ۔
قولہٗ اَرَأَیتَ ۔ بمعنیٰ اخبرنی ۔
قولہٗ مَا ۔ مِنَ الخیروالشرِ ۔
قولہٗ اَلْیَوْمَ ۔ یَوْم سے مراد فی الدنیا ہے نہ کہ وقتِ محدود ۔
قولہٗ یَکْدَحُوْنَ ۔ کدح سے ہے بمعنیٰ سعی کرنا، تکلیف اٹھانا ۔
قولہٗ شَیْئٌ ۔ مُبتداءِ محذوف کی خبر ہے ۔ اَیْ ھُوَشَیْئٌ قضیٰ علیھم
قولہٗ اَوْفِیْمَا جار مجرور وَقَعَ کے متعلق ہے ۔
قولہٗ یَسْتَقْبِلُوْنَ : یہ معروف و مجہول دونوں طرح ہے یعنی کیا اعمال پہلے سے ازل میں مُقدّر ہیں یا لوگ آئندہ زمانے میں ان کی طرف مُتوجّہ ہوتے ہیں ۔
قولہٗ مِمَّا ۔ اس میں مِنْ بیانیہ ہے جو مَا یعمل النّاس کا بیان ہے ۔
قولہٗ فَقَالَ لَا ۔ مُلّا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ لَا تردُّد کے لیے ہے ۔ محدث عبدالحق دہلویؒ معنیٰ فرماتے ہیں " نیست امرے مستقبل"

خُلاصۃُ الحدیث

جس کا تعلق قبیلہ مزینہ کے لوگوں کے سوال سے ہے ۔ سوال یہ تھا کہ یارسول اللہ ﷺ ہمیں یہ بتلا دیجئے کہ دنیا میں لوگ جتنے اعمال کرتے ہیں خواہ وہ اعمال خیر ہوں یا بد کیا یہ وہی ہیں جو ان کے لیے ازل ہی میں مقدّر ہو چکے تھے ۔ اور اب وقت پر وقوع پذیر ہوتے ہیں ۔ یا یہ وہ چیزیں ہیں جو ازل میں تو ان کیلئے نوشتۂ تقدیر نہیں بنی تھیں ۔ بلکہ اب جب رسول آئے تو انہوں نے خدا کی طرف سے دیئے گئے معجزات کے ذریعہ اپنی صداقت کا اعلان کیا تو یہ اعمال وقوع پذیر ہونے لگے تو ایسی شکل میں کیا کہا جائے گا بارگاہِ رسالت سے جواب دیا گیا کہ یہ اعمال وہی ہیں جو ازل ہی سے بندوں کے مقدر میں لکھ دیے گئے تھے ۔ اور اب اسی نوشتۂ تقدیر کے مطابق اپنے اپنے وقت پر صادر ہوتے رہتے ہیں " کَمَا فی قولہٖ تعالیٰ : وَ نَفْسٍ وَّمَا سَوّٰاھَا فَاَلْھَمَھَا فُجُوْرَھَا وَتَقْوٰھَا ۔ (پ۳۰ والشمس)

آیت مُبارکہ سے طرزِ استدلال

اَلْھَمَ ماضی کا صیغہ ہے جس سے معلوم ہوا کہ نیکی اور بدی کا بیج پہلے سے بو دیا گیا ہے

اور یہی تقدیر ہے اور فجور و تقوٰی کو نفس کی طرف اضافت کرکے نفس کے اختیار کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ یعنی یہاں بندہ کا بھی کوئی فعل ضرور ہوتا ہے جس کی بناء پر اس کا نفس فاجر یا مُتقی بن جاتا ہے۔

وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّیْ رَجُلٌ شَابٌّ وَاَنَا اَخَافُ عَلٰی نَفْسِیْ الْعَنَتَ وَلَا اَجِدُ مَا اَتَزَوَّجُ بِهِ النِّسَآءَ کَاَنَّهٗ یَسْتَاْذِنُهٗ فِی الْاِخْتِصَآءِ

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میں ایک جوان شخص ہوں اور میں اپنے نفس سے ڈرتا ہوں کہ زناء کی طرف مائل نہ ہو جائے اور میرے اندر اتنی استطاعت نہیں ہے کہ کسی عورت سے شادی کرلوں۔

قولہٗ اِنِّیْ رَجُلٌ شَابٌّ ۔ عند البعض شَابٌّ بمعنٰی غیر شادی شدہ۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ غیر شادی شدہ کے لیے (عزب) کا لفظ حدیث میں مستعمل ہے۔ لہٰذا صحیح معنٰی قوی الشہوت ہے۔

قولہٗ الْعَنَتَ ۔ ای الاثم یعنی الفجور والزناء قال اللہ تعالٰی ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِیَ الْعَنَتَ مِنْکُمْ ۔

قولہٗ وَلَا اَجِدُ ۔ ای من المال :

قولہٗ اَتَزَوَّجُ بِهِ النِّسَآءَ ۔ عورتیں دو قسم ہیں۔ اوّل حُرّہ اس کا نفقہ وغیرہ زیادہ ہوتا ہے۔ دوم مملوکہ وہ خرید کرنی پڑتی ہے۔ یعنی بیوی کے نان نفقہ اور مہر پر بھی قادر نہیں چہ جائیکہ لونڈی خرید سکوں۔

قولہٗ کَاَنَّهٗ یَسْتَاْذِنُهٗ فِی الْاِخْتِصَآءِ : یقول ابو السعاد، یہ قول تلمیذ ہے یعنی کسی راوی کا قول ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی یہ عرض و معروض اس لیے تھی کہ حضور انورؐ ان کو خصّی ہو جانے کی اجازت دے دیں تاکہ زنا کا احتمال ہی باقی نہ رہے۔ صحابہ کرامؓ کا یہ انتہائی تقوٰی ہے کہ معصیّت پر مُصیبت کو ترجیح دیتے ہیں۔ خصّی ہو کر اپنے آپ کو ناقص و فاسد کر لینا منظور ہے مگر فاسق بننا منظور نہیں۔

قولہٗ فَسَکَتَ عَنِّیْ ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سنکر سکوت فرمایا۔

سوال : یہ کہ آپؐ نے خاموشی کیوں اختیار فرمائی ؟

جواب : یہ بار بار خاموشی یا تو اہتمام مسئلہ کے لیے تھی تاکہ حضرت ابوہریرہؓ اس کا جواب غور سے سنیں یا انہیں سوال سے روکنے کے لیے، یعنی خصی ہونا تو کجا اس کا ذکر بھی نہ کرو۔

سوال : جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم تین بار سکوت فرما گئے تو حضرت ابوہریرہؓ آپ کو کیوں تنگ کر رہے ہیں ؟

جواب : یہ سوال کرنا نہیں بلکہ التجاء وزاری کرنا اور چمٹ جانا ہے کہ مہربانی کرکے ہماری تسلی کرائیں۔

قولہٗ جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا اَنْتَ لَاقٍ ۔ جَفَّ یہ لفظ جَفَّ الثَّوْبُ ای اِذَا ابْتَلَّ ثُمَّ جَفَّ سے نکلا ہے کہ تر کپڑا خشک ہو جائے ۔ اور اطلاق اللازم علی الملزوم کے قبیلہ سے ہے۔ اور جَفَّ الْقَلَمُ سے مراد تقدیر کی کتابت سے فراغت ہے کیونکہ کتابت سے فراغت کو قلم کا خشک ہونا لازم ہے ۔ یہاں لازم ذکر کرکے ملزوم مراد لیا ہے۔

قولہٗ فَاخْتَصِّ عَلٰی ذٰلِکَ اَوْ ذَرْ ۔ (خواہ اب خصی ہو، یا رہنے دے) ذَرْ بمعنیٰ ای اترك الاختصاء۔

سوال - یہ دونوں (فَاخْتَصِّ اور ذَرْ) امر ہیں ۔ ان سے معلوم ہوا کہ امر اِباحی ہے اور اباحت رخصت کی علامت ہے جب کہ انسان کے لیے خصی ہونا اور کرنا دونوں ناجائز ہیں۔

جواب - اِخْتَصِّ اور ذَرْ میں امر تخییر کے لیے نہیں بلکہ تہدید کے لیے ہے ۔ یعنی اَمر اباحی مراد نہیں بلکہ توبیخی امر مراد ہے جیسے عرف عام میں مجرم کو کہا جاتا ہے جو کچھ کرنا ہے کرلو پھر دیکھا جائے گا۔ کما فی قولہٖ تعالیٰ فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ (پ۱۵)

خُلَاصَۃُ الْکَلَام | یقول ابوالاسعاد : نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول مبارک کا مقصد یہ ہے کہ اگر تمہاری تقدیر میں زنا لکھا جا چکا ہے تو خصی ہونے کے بعد بھی کرلو گے ورنہ بغیر خصی ہوئے بھی نہ کر پاؤ گے ۔ تو اس کلام میں

خصی ہونے کی اجازت نہیں دی جارہی بلکہ اچھے طریقہ کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے کیونکہ انسان کا خصی ہونا مُثلہ ہے یعنی بدن بگاڑنا اور مُثلہ کرنا اسلام میں حرام ہے۔ یعنی بیکار چیز کے لیے حرام کا ارتکاب کیوں کرتے ہو۔

وَعَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ قُلُوْبَ بَنِیْ اٰدَمَ کُلَّھَا بَیْنَ اِصْبَعَیْنِ مِنْ اَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ :

ترجمہ : روایت ہے عبداللہ بن عمرو سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ لوگوں کے سارے دل اللہ کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہیں۔

قولہٗ قُلُوْبَ بَنِیْ اٰدَمَ ۔ بنی آدمؑ میں انبیاءؑ و اولیاءؒ، مؤمنینؒ، کفار سب ہی داخل ہیں۔ کوئی بھی رب کے قبضہ سے خارج نہیں۔

سوال : حدیثِ پاک میں بنی آدم کی تخصیص کیوں ہے حالانکہ قبضہ و قدرت خداوندی میں جمیع ارواح و اجزاء داخل ہیں۔

جواب : چونکہ عام احکام شرعیہ کے مکلف صرف انسان ہیں اس لیے خصوصیت سے انسانوں کے دل کا ذکر فرمایا۔ ورنہ فرشتوں اور جنات وغیرہم کے دل بھی رب کے قبضہ میں ہیں۔

قولہٗ کَقَلْبٍ وَاحِدٍ : یعنی جیسے تم ایک چیز کے بدلنے پر قادر ہو ایسے ہی اللہ تعالیٰ تمام دلوں کو بیک وقت پھیرنے پر قادر ہیں۔ کقولہٖ تعالیٰ " مَا خَلْقُکُمْ وَلَا بَعْثُکُمْ اِلَّا کَنَفْسٍ وَّاحِدَۃٍ " بندوں کی عادت و قدرت کی وجہ سے کَقَلْبٍ وَاحِدٍ فرمایا ہے ورنہ کثرت و تعدد اللہ ذوالجلال کے لیے موجب دشوار نہیں بلکہ دونوں برابر ہیں۔

قولہٗ یُصَرِّفُہٗ کَیْفَ یَشَآءُ ۔ ای یقلبہ تقلیبا کیف شاء۔

قولہٗ اَللّٰھُمَّ مُصَرِّفَ الْقُلُوْبِ : یقول ابوالاسعاد : کہ یہ دعا کفار و مؤمن، نیک و بدکار سب ہی کے لیے ہے یعنی بدکاروں کے دل نیکی کی طرف پھیرنا

اور نیکوکاروں کے دل نیکی پر قائم رکھنا۔ خیال رہے کہ یہ دعاء درحقیقت اُمّت کی تعلیم کے لیے ہے ورنہ آپ کی ذات بابرکات تو سیّد المعصومین ہے ان کے لیے ہدایت و معصومیّت لازم ہے۔

خُلاصَۃُ الحَدیث حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ تمام قلوب خدا کے قبضہ و تصرف میں ہیں وہ جس طرف چاہتا ہے پھیر دیتا ہے کسی قلب کو گناہ و معصیّت کی طرف مائل کرنا بھی اسی کی صفت ہے اور کسی قلب کو فرمانبرداری اور نیکوکاری کی طرف مائل کر دینا بھی اسی ذات پاک کا کام ہے۔

کیا لفظُ اَصَابِعْ کا اِطلاق ذاتِ باریٰ تعالیٰ پر دُرست ہے؟

یہاں اللہ عزوجل کے حق میں اصابع کا اطلاق کیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ لوازمات اجسام میں سے ہے جب کہ اللہ تعالیٰ اس سے بالکل منزہ و پاک ہیں۔ تو اس بارے میں عرض ہے کہ تفصیلاً اس پر کلام تو آگے آ رہی ہے۔ مختصراً عرض ہے کہ اصابع کا اطلاق از قبیلِ متشابہات ہے اور متشابہات دو قسم ہیں۔

اوّل ۔ جس کے لغوی معانی معلوم ہوں: کقولہٖ تعالیٰ "یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ (پ۲۶) "اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی" (پ۱۶) اس قسم کے متعلق دو مذہب ہیں:۔

مذہب اوّل ، متقدمین جن کو مفوضہ (ہر معاملہ کو خدا کی طرف سونپنے والے) بھی کہتے ہیں ان کے نزدیک ثَابِتٌ کَمَا ھُوَ وَلَا نَعْلَمُ عَنْ کَیْفِیَّتِہٖ۔

مذہب دوّم ، متأخرین جنکو مؤوّلہ (تأویل کرنے والے) بھی کہتے ہیں ان کے نزدیک جو معانی شانِ باری تعالیٰ کے مناسب ہوں۔ ان معانی کے ساتھ مؤوّل ہیں اور یہ تأویل عوام کے ایمان کی حفاظت کے لیے ہے ورنہ وہ لوگ سخت اشتباہ میں پڑجائیں گے تو یَدْ بمعنیٰ قوت اِسْتَوٰی بمعنیٰ غَلَبَ ایسے ہی یہاں اصابع الرحمان کہا گیا ہے۔ لہٰذا اِصْبَعَیْن سے مراد اللہ تعالیٰ کی طاقت و قوّت کی طرف اشارہ ہے کہ بنی آدم کے قلوب اللہ تعالیٰ کے قبضہ و قدرت میں ہیں جیساکہ عرف میں کہا جاتا ہے کہ فلاں آدمی میرے ہاتھ میں ہے۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ شخص تمہارے ہاتھ میں سمویا ہوا ہے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ ہمارے ماتحت و قبضہ

ہیں ہے جو کہوں گا وہ ہر صورت مانے گا۔ عند البعض اصبعین سے مراد اللہ تعالیٰ کی دو صفتیں ہیں ۱ صفت جمالی ۲ صفت جلالی۔ جمالی سے الہام وتقویٰ وحسنات واقع ہوتے ہیں اور جلالی سے فسق وفجور کا القاء ہوتا ہے۔

دوم : وہ متشابہات جس کے لغوی معنیٰ کسی کو بھی معلوم نہیں۔ وَمنہ حُروفُ المُقطّعاتِ القرآنیۃِ فی ابتداءِ السُّوَرِ : اور اس پر اتفاق ہے کہ وَاللہُ اَعْلَمُ بمُرادہٖ۔

وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ مَوْلُوْدٍ اِلَّا یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَۃِ فَاَبَوَاہُ یُھَوِّدَانِہٖ اَوْ یُنَصِّرَانِہٖ اَوْ یُمَجِّسَانِہٖ

ترجمہ : روایت ہے حضرت ابوہریرہؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ ہر بچہ دینِ فطرت پر ہی پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی، عیسائی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔

قولہٗ مَوْلُوْدٍ ۔ مَوْلود سے انسان کا بچہ مراد ہے۔ جیسا کہ اگلے مضمونِ حدیث سے ظاہر ہے نہ کہ مُطلق مَولُود، کیونکہ مطلق مولود میں تو جانور بھی داخل ہیں۔ جب کہ مُکلّف صرف انسانی مولود ہے۔ ثانیاً مَوْلُوْدٍ نکرہ نفی کے بعد ہے تو فائدہ عموم کا دے گا۔ ہر مولود مذکر ہو یا مؤنث!

قولہٗ عَلَی فِطْرَۃٍ ۔ فَطَرَ باب نَصَرَ و ضَرَبَ بمعنیٰ پھاڑنا، ایجاد کرنا۔ اس سے کیا مراد ہے اس میں سلفؒ کا اختلاف ہے، اور مُتعدّد اقوال منقول ہیں :۔

قولِ اوّل فِطْرَۃٌ بمعنیٰ اسلام ہے۔ چنانچہ علّامہ ابن عبد البرؒ فرماتے ہیں :۔ وَھُوَ الْمَعْرُوْفُ عِنْدَ عَامَّۃِ السَّلَفِ اور آیت فِطْرَۃَ اللّٰہِ الَّتِیْ میں بھی یہی مُراد ہے۔ اور بعض احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ جیسا کہ عیاض بن حمار کی حدیث ہے "اِنِّیْ خَلَقْتُ عِبَادِیْ حُنَفَاءَ مُسْلِمِیْنَ" اور امام احمدؒ سے بھی یہی مروی ہے۔ تو حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ ہر انسان کی پیدائش اسلام پر ہوتی ہے۔ اگرچہ کافر کے گھر میں بھی کیوں نہ ہو مگر ماحول اس کو بگاڑ کر غیر مسلم بنا دیتا ہے۔ اگر ماحول

کے بیچ میں نہ پڑتا تو ہمیشہ مسلمان ہی رہتا۔

قولِ دوم [2] عند البعض فِطرۃ بمعنیٰ عقلِ سلیم وفہمِ مستقیم ہے یعنی ہر بچہ عقلِ سلیم اور فہمِ صحیح پر پیدا کیا جاتا ہے اور اسی پر رہتا ہے اگر مانع نہ آئے!

قولِ سوم [3] فِطرۃ سے مُراد دعویٰ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ ہے یعنی حق تعالیٰ نے تمام ذریاتِ آدمؑ کو پشتِ آدمؑ سے نکال کر فرمایا تھا "اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ" انہوں نے جواب دیا تھا بَلیٰ۔ اب بَلیٰ کہنے کو فطرۃ سے تعبیر کیا یعنی وہ جو اقرار کیا اس اقرار پر ہر مولود کی خلقت و پیدائش کی جاتی ہے۔

قولِ چہارم [4] جمہور علماءِ مُحقّقین کے نزدیک فطرت سے عین اسلام مراد نہیں بلکہ استعداد اور صلاحیّت وقابلیت مراد ہے۔ لہٰذا حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ہر بچہ میں فطری اور طبعی طور پر اسلام قبول کرنے کا مادہ رکھا جاتا ہے کہ اگر اس کو کچھ مانع پیش نہ آئے تو بلاشبہ وہ اسلام ہی قبول کرے لیکن ماں باپ جس دین پر ہوتے ہیں اس پر اس کو پھیر لیتے ہیں لیکن اس سے اس کی اصلی استعداد وصلاحیّت زائل نہیں ہوجاتی۔ اس قول کی تائید کرتے ہوئے حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے بے شمار مخلوقات، مختلف طبائع اور مزاج کی بنائی ہے، اور ہر مخلوق کی فطرت میں ایک خاص مادہ رکھ دیا ہے۔ مثلاً شہد کی مکھی میں یہ مادہ رکھ دیا ہے کہ وہ پھولوں کو پہنچانے اور انتخاب کرے، پھر اس کے رس کو اپنے پیٹ میں محفوظ کرکے اپنے چھتہ میں لاکر جمع کرے، اسی طرح انسان کی خلقت میں ایسی استعداد رکھی ہے کہ اپنے خالق کو پہنچانے اور اس کی اطاعت کرے۔ اسی کا نام فِطرت ہے۔ (ھکذا فی اشعۃ اللمعات)

یقول ابو الاسعاد: جمہور سلف وخلفؒ نے قولِ چہارم کو اختیار کیا، اور بقیہ اقوال خصوصًا قولِ اوّل (فطرۃ بمعنیٰ اسلام) کو چھوڑا اس لیے کہ قولِ اوّل کو اختیار کرنے سے دو اشکالات پیش آتے ہیں جس سے نجات مل جاتی ہے۔

اِشکالِ اوّل [1] یہ ہے کہ فطرت سے اسلام مراد لینے سے قرآنِ کریم اور حدیث میں تعارض واقع ہوتا ہے۔ اس لیے کہ قرآن پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ فطرت (اسلام) کوئی بدل نہیں سکتا۔ جب کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے

کہ ماحول وَالدَین اسے بدل دیتا ہے۔ فطرۃ بمعنیٰ استعداد مراد لینے پر یہ تعارض نہیں ہوتا کیونکہ وَالدَین یہودی اور نصرانی بنانے کے باوجود استعداد کو بدل نہیں سکتے لہٰذا لَا تَبْدِیْلَ اپنی جگہ پر درست ہے۔ کما فی واقعۃ الغلام الیھودی:۔

عن انسؓ اَنَّ غلامًا مِّنَ الیھُودِ کَانَ مَرِض فَاَتَاہُ النَّبِیُّ صَلَّی اللہُ علیہ وسلّم یَعُوْدُہٗ فَقَعَدَ عِنْدَ رَأْسِہٖ فعرض علیہ السّلام الاسلام فَقَالَ لَہٗ اَسْلِمْ فَنَظَرَاِلیٰ اَبِیْہِ وَھُوَعِنْدَ رَأْسِہٖ فَقَالَ لَہٗ اَبُوْہ اَطِعْ اَبَا الْقَاسِمِ فَاَسْلَمَ فَقَامَ النَّبِیُّ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ وَھُوَ یَقُوْلُ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَنْقَذَہٗ بِیْ مِنَ النَّارِ (ابوداؤد شریف ج۲ ص۸۵ کتابُ الجنائز باب فی عیادۃ الذمی) ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ ایک یہودی لڑکا بیمار ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے آپؐ اس کے سرہانے بیٹھ گئے اور اس سے فرمایا کہ تو مسلمان ہو جا یہ سنکر اس نے اپنے باپ کی طرف دیکھا جو اس کے سرہانے ہی کھڑا تھا پس اس کے باپ نے اس سے کہا ابوالقاسم (حضور علیہ السّلام) کی اطاعت قبول کر پس وہ مسلمان ہوگیا اور آپ یہ کہتے ہوئے کھڑے ہوگئے۔ کہ تعریف اس خدا کی جس نے اس لڑکے کو میری وجہ سے دوزخ کی آگ سے بچا لیا۔

تو چونکہ اس میں فطری اِستعداد و صلاحیّت موجود تھی جس کی بناء پر اسلام کی دولت سے مالا مال ہو کر فوت ہوا۔

اشکالِ دُوم یہ ہے کہ اسلام قبول کرنا مأمور بہ ہے اور یہ امر اختیاری ہے۔ اب اگر اسلام ہی پر سب کی پیدائش ہو تو یہ امر غیر اختیاری ہوگا۔ لہٰذا مأمور بہ نہیں ہو سکتا، اور لوگوں کو مُکلّف بالاسلام قرار نہیں دیا جا سکتا اور یہ بدیہہ البطلان ہے۔ جب کہ فطرت سے استعداد مُراد لینے پر کوئی اشکال پیش نہیں آتا۔ لہٰذا یہی اولیٰ و راجح ہوگا۔

سوال حضرت خضر علیہ السّلام نے جس بچہ کو قتل کیا تھا اس کے بارے میں روایات میں آتا ہے طُبِعَ یَوْمًا طُبِعَ کَافِرًا یعنی وہ پیدا ہی کافر کیا گیا تھا۔ اور یہ کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُّوْلَدُ عَلٰی فِطْرَۃِ الْاِسْلَامِ کے خلاف ہے۔

جواب

حدیثُ الباب کے قرینہ سے طُبِعَ بمعنیٰ قُدِّرَ ہے یعنی اس بچہ کی پیدائش کے وقت ہی یہ مقدر ہوچکا تھا کہ یہ بچہ بڑا ہوکر کافر ہوگا۔ لہذا اس سے قبولِ حق کی استعداد کی نفی ہوئی تو گویا کہ طُبِعَ کَافِراً بمعنیٰ قُدِرَ وجُبِلَ یعنی ہوش سنبھال کر کافر ہونا اس کے مقدر میں آچکا تھا۔ لہذا یہ حدیث اس کے خلاف نہیں۔

قولہٗ فَاَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ ۔ جملہ مذکورہ سے اشارہ فرمایا کہ ماحول اس استعداد کو ظاہر ہونے نہیں دیتا۔

سوال : والدین کی تخصیص کیوں ہے ؟

جواب

اَبَوَاهُ کی تخصیص قرب اور مؤثر فی الماحول کی وجہ سے ہے چونکہ زیادہ تاثیر والدین کے ماحول کی ہوتی ہے ۔ قرب اور فطری تعلق کی وجہ سے۔ اس لیے خصوصی طور پر اس کو ذکر کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ماں باپ بچہ کے پہلے استاد ہیں ان کی صحبت بچہ کی طبیعت کے لیے سانچہ ہے۔

قولہٗ تنتج ۔ ای تَلِدُ ۔

قولہٗ جَمْعَاء ۔ ای کامِلُ الاعضاء

قولہٗ هَلْ تُحِسُّونَ ۔ بمعنیٰ هَلْ تجدونَ

قولہٗ جَدْعَاءَ ۔ ای مقطوع الاُذُنِ

یقولُ ابوالاِسْعَاد : نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم روحانیت کو جسمانیت کے ساتھ تشبیہ دے کر ایک مثال بیان فرما رہے ہیں کہ ایک کامل اور سالم الاعضاء جانور کا بچہ پیدا ہوتا ہے اس میں کوئی نقص نہیں ہوتا نہ کان کٹا ہوا ہوتا ہے مگر بعد میں لوگ بت کے نام پر چھوڑنے کے لیے اس کا کان کاٹ دیتے ہیں تو پیدائشی طور پر یہ بالکل صحیح سالم تھا بعد میں لوگوں نے عیب دار بنا دیا اسی طرح انسان پیدائشی طور پر سالم الاستعداد ہوتا ہے۔ پھر والدین کا ماحول اسے بگاڑ دیتا ہے۔

وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰیؓ قَالَ قَامَ فِيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِخَمْسِ كَلِمَاتٍ فَقَالَ

ترجمہ : حضرت ابوموسیٰؓ فرماتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) نبی علیہ السلام نے خطبہ میں پانچ باتیں ارشاد فرمائیں کہ یقیناً اللہ تعالیٰ نہ

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَنَامُ وَلَا یَنْبَغِیْ لَہٗ اَنْ یَّنَامَ وَیَخْفِضُ الْقِسْطَ وَیَرْفَعُہٗ	سوتا ہے اور نہ سونا اس کے لائق ہے ۔ پلہ ترازو کا بلند و پست کرتا ہے ۔

قولہٗ قَامَ فِیْنَا ۔ ای لِلْوَعْظِ وَکَانَ اِذَا وَعَظَ قَامَ ؛ حضرت صلعم کی عادت مبارک تھی جب بھی وعظ کرتے تو قیام فرماتے ۔ تاکہ لسانی موتی حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ دیدار محبوب بھی رہے اس لیے وعظ و نصیحت اور دیگر خطبات وغیرہ کھڑے ہو کر کہنا سُنّت ہے ۔

قولہٗ بِخَمْسِ کَلِمَاتٍ ۔ کلمات ، کلمۃ کی جمع ہے بمعنیٰ جملۃ المفیدۃ یا کلام المفید عند البعض بمعنیٰ خمس اشیاء ؛ یعنی پانچ چیزیں خطبہ میں ارشاد فرمائیں ۔

قولہٗ فَقَالَ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَنَامُ ۔ جملہ مذکورہ سے کلماتِ خمسہ کی تشریح فرما رہے ہیں اصل میں عبارت تھی " وَاِحْدَی الْکَلِمَاتِ مِنْھَا اِنَّ اللّٰہَ لَا یَنَامُ ۔ مطلقاً نیند کی نفی مقصود نہیں بلکہ وقوعِ نیند کی نفی مقصود ہے کہ نیند واقع بھی نہیں ہو سکتی ۔ کما فی قولہٖ تعالیٰ " لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ " اس کا مقابل نعاس ہے جو نومِ خفیف ہے ۔ یا مقدمۃ النوم ہے ۔

قولہٗ وَلَا یَنْبَغِیْ لَہٗ اَنْ یَّنَامَ ۔ وَالثَّانِیَۃ وَلَا یَنْبَغِی اَنْ یَّنَامَ : یہ کلمہ ثانیہ ہے اس سے امکان کی نفی مقصود ہے کہ ممکن بھی نہیں کہ نیند آئے کیونکہ نفی وقوع کو نفی امکان لازم نہیں یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ جو واقع نہ ہو وہ ممکن بھی نہ ہو جیسے آسمان کا گرنا گو واقع نہیں ہوا مگر ممکن تو ہے ، کما فی قولہٖ تعالیٰ : وَیُمْسِکُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَی الْاَرْضِ (پ۱۷ سورۃ حج)

سوال ۔ کلمہ اولیٰ (اِنَّ اللّٰہَ لَا یَنَامُ) سے نوم کی نفی ہو گئی پھر دوبارہ فرمانا ولا ینبغی لہٗ ان یّنام کیونکر صحیح ہو سکتا ہے یہ تکرارِ کلام ہے ۔

جواب اوّل : کلمہ اُولیٰ اصولاً ہے اور کلمہ ثانیہ عادتاً و عُرفاً ہے محض سمجھانے کے لیے ہے ۔

جواب دُوم : اصالۃً تردید مقصود ہے مشرکین کی جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ دنیا بنا کر تھک گیا ہے ، اب دُنیا کا کام ہمارے بت چلا رہے ہیں (معاذ اللہ) کیونکہ نیند ایک قسم کی موت ہے ۔ جب کہ ربِّ ذوالجلال کی ذاتِ پاک حَیٌّ لَّایَمُوْتُ ہے اس لیے جنّت و دوزخ میں نیند نہ ہو گی ۔ ثانیًا نیند تھکن اتارنے اور آرام کے لیے ہوتی ہے جب کہ پروردگار تھکن

سے پاک ہیں، ارشاد فرماتے ہیں ''وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ (پ۲۶ س ق)

قولہٗ وَيَخْفِضُ الْقِسْطَ وَيَرْفَعُہٗ ۔ والثالثۃ ويخفض الخ خفض بمعنیٰ جھکانا، نیچے کرنا، اور يَرْفَعُہٗ بمعنیٰ بلند کرنا۔ یعنی نیچے کرتا ہے اور بلند کرتا ہے قسط کو۔ محدثین حضرات کے ہاں قسط کی مختلف تفسیریں کی گئی ہیں:۔

(۱) قسط سے مراد میزان عمل ہے۔ کسی کے میزان کو اونچا کر دیتا ہے اور کسی کے میزان کو پست یعنی کسی کو نیکیوں کی توفیق دیتا ہے، اور کسی کو نہیں دیتا اس معنیٰ کی تائید اگلی حدیثِ ابی ہریرہؓ کر رہی ہے کیونکہ اس میں خود لفظ میزان موجود ہے۔

(۲) قسط بمعنیٰ عدل ہے، یعنی عدل کو اونچا و پست کرتا ہے، پھر عدل کا اونچا کرنا کنایہ ہے کہ عادل بادشاہ کو لوگوں پر مسلط فرماتے ہیں۔ اور پست کنایہ ہے غیر عادل کے مسلط کرنے سے۔

(۳) جمہور حضرات کے نزدیک قسط کے لغوی معنیٰ حصّہ ہیں۔ لیکن اس کا اطلاق رزق پر ہے۔ یعنی قسط بمعنیٰ رزق اور ترازو کے پلّے کو بھی قِسط کہتے ہیں کیونکہ رزق حصّہ سے ملتا ہے اور ترازو بھی حصّے کرتی ہے۔ کما فی قولہٖ تعالیٰ '' وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ (پ۱۹) مطلب اس کا یہ ہے کہ کسی کو زیادہ روزی دیتے ہیں، کسی کو کم، یا ایک ہی شخص کبھی غریب ہوتا ہے اور کبھی امیر، کبھی غالب، کبھی مغلوب۔

قولہٗ يُرْفَعُ إِلَيْہِ عَمَلُ اللَّيْلِ ۔ والرابعۃ يرفع اليہ الخ اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ بندہ سے جو کوئی عمل سرزد ہوتا ہے وہ فورًا بلا تاخیر بارگاہِ الوہیت تک پہنچ جاتا ہے یعنی ابھی سورج بھی نہیں نکلتا اور کوئی عمل صادر ہونے بھی نہیں پاتا کہ رات کے عمل جو بندہ سے سرزد ہوتے ہیں وہ اوپر پہنچ چکے ہوتے ہیں۔ اسی طرح رات شروع بھی نہیں ہوتی کہ دن کے عمل وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ اب جو عمل نیک اور اچھا ہوتا ہے اسے قبولیت کے شرف سے نواز کر اس پر جزا و انعام کا پروانہ صادر کر دیا جاتا ہے۔ جو عملِ بد ہوتا ہے اس کو رد کر دیا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسے دو وقتہ پیشی کہتے ہیں۔

قولہٗ حِجَابُہُ النُّوْرُ ۔ حِجَاب وہ چیز ہے جو رائی اور مرئی کے درمیان حائل ہو لیکن یہاں مراد اللہ تعالیٰ کی جلالت و کبریائی کے انوارات ہیں۔ یہ حجاب مخلوق کے عجز کے اعتبار سے ہے نہ کہ خالق کے اعتبار سے جیسا کہ چمگادڑ اس عجز کی وجہ سے سورج

کونہیں دیکھ سکتا۔حالانکہ سورج ظاہر ہے۔ لہذا خدا کو مجوب نہیں کہہ سکتے۔کیونکہ مجوب مغلوب ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی شان تو وَاللّٰہُ غَالِبٌ عَلٰی اَمْرِہٖ ہے۔

قَولہٗ لَاَحْرَقَتْ سُبُحَاتُ وَجْھِہٖ ۔ بضم السّین والباء جمع سبحۃ کغرفۃ وغرفات۔ سبحہ بمعنیٰ تسبیح اس سے مراد انوار وتجلیات الٰہیہ کی روشنیاں ہیں۔ سبحات اس لیے کہا کہ انہیں دیکھ کر ملائکہ بغیر اختیار تسبیح وتہلیل شروع کردیتے ہیں۔

وَجْھِہٖ وجہ سے مراد ذات باری تعالیٰ ہے۔یعنی اگر اللہ تعالیٰ اپنی ذات کی عظمت وصفات کی حقیقت کھول دیں تو ساری کائنات حدِ نگاہ تک جل کر خاکستر ہو جائیگی۔

وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَدُ اللّٰہِ مَلْاٰی لَا تَغِیْضُھَا نَفَقَۃٌ سَحَّاءُ اللَّیْلَ وَالنَّھَارَ

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ بھرا ہوا ہے۔رات دن ہر وقت خرچ کرنے سے بھی اس میں کمی پیدا نہیں ہوتی۔

قولہٗ یَدُ اللّٰہِ مَلْاٰی ۔ اس سے مراد خزانہ ہے یا اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بڑا غنی ہے۔کما فی قولہٖ تعالیٰ وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُہٗ ۔ نیز یہ متشابہات سے ہے اس کی بحث اصابع الرحمٰن میں ہوچکی ہے۔

قولہٗ لَا تَغِیْضُھَا ۔ ای لا تنقصھا من الانفاق؛

قولہٗ سَحًّا ۔ سَحًّا سُحُوْحًا (باب نصر) اوپر سے نیچے کی طرف اترنا، لیکن یہاں سَحًّا بمعنیٰ رواں دواں یہ نفقۃ کی صفت ہے اس لفظ میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عطیہ فوقیت وبلندی اور سہولت اور کثرت کے ساتھ مُتّصف ہے۔

قولہٗ قَالَ ابْنُ نُمَیْرٍ ۔ یہ امام مسلمؒ کے استاذ ہیں۔

قولہٗ مَلْاٰنُ ۔ محدثین حضراتؒ کے نزدیک صحیح روایت مَلْاٰیُ ہے۔

وَعَنْهُ قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ ذُرَارِيِّ الْمُشْرِكِيْنَ قَالَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا عَامِلِيْنَ

ترجمہ: حضرت ابو ہریرۃؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرکین کی اولاد کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کیا اعمال کرتے تھے۔

یقول ابوالاسعاد: حدیثِ باب کی دو جزئیں ہیں۔ اوّل ذراری المشرکین دوّم اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا عَامِلِيْنَ: پہلے جزو اوّل کی بحث ہوگی۔

اَطْفَالُ الْمُشْرِكِيْن کا حکم

اطفالِ مُشرکین کا حکم دو طرح کا ہے ۱ دنیوی ۲ اُخروی۔

اَطفال کا دُنیوی حُکم

دنیا کے احکام کے اعتبار سے نابالغ بچوں کا حکم یہ ہے کہ خَيْرُ الْاَبَوَيْنِ دِيْنًا کے تابع ہوتے ہیں اگر بچہ کے ماں باپ دونوں مسلمان ہوں یا دونوں میں سے ایک مسلمان ہو تو بچہ کو مسلمان تصوّر کیا جائے گا۔ تمام مسائل میں اس کے ساتھ مسلمانوں والا برتاؤ کیا جائے گا مثلاً اگر مر گیا تو اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔ اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا۔ اور اگر بچہ کے دونوں ماں باپ کافر ہوں تو اس کے ساتھ کافروں والا برتاؤ کیا جائے گا۔ حکومتِ اسلامی اس کو مسلمان تصوّر نہیں کرے گی۔

اَطفال کا اُخروی حکم

اگر کوئی بچہ نابالغ ہونے کی حالت میں مَر جائے تو اس کا آخرت میں کیا حکم ہوگا۔ سو اطفال المسلمین کے بارہ میں تقریبًا اتفاق ہے کہ یہ جنّتی ہوں گے ان کی نجات ہو جائے گی۔ اطفال المشرکین اگر بچپن کی حالت میں مر جاتے ہیں تو ان کا کیا حکم ہے۔ اس میں اختلاف ہے۔ مختصرًا صرف تین قول نقل کر رہا ہوں۔

قول اوّل ۔ بعض علماء کی یہ رائے ہے کہ یہ تبعًا لِاٰبائِھم دوزخی ہوں گے ۔

قول دوم اصل فطرت کے اعتبار سے قطعًا جنتی ہیں کیونکہ حضور علیہ السلام نے شب معراج میں اولادِ مشرکین کو بھی ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ جنت میں دیکھا تھا ۔
(مشکوٰۃ شریف ص۳۹۷ ج۲)

قول سوم جمہور اہل سُنّت والجماعت کا مذہب یہ ہے کہ ذراری المشرکین کے بارے میں توقف کیا جائے ۔ امام ابوحنیفہؒ ، امام مالکؒ ، امام شافعیؒ ، سفیان ثوریؒ سفیان ابن عیینہؒ ، عبداللہ بن مبارکؒ ، اسحٰق بن راھویہؒ اور بہت سے اکابر امّت کا مسلک یہی ہے ۔
چنانچہ علاّمہ محدّث عبدالحق دہلویؒ فرماتے ہیں :۔

زیراکہ جزم دریں باب بے وصول خبر از جانب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنقلِ صحیح قطعی درست نباشد وآں خود یافتہ نشدہ وحدیثے قطعی دریں باب ورود نیافتہ وہرچہ گفتہ اند برائے قیاس خود گفتہ اند یا از اخبار ضعیفہ واہیہ گرفتہ اند پس واجب شد توقّف ۔ (اشعۃ اللمعات ص۹۸ ج۱)

ترجمہ : بہتر یہ ہے کہ شانِ اطفال کے بارے میں توقف کیا جائے اور کسی جانب یا کسی قول پر یقین نہ کیا جائے کیونکہ اس باب میں یقین رسول اللہ ﷺ کی جانب سے نقلِ صحیح قطعی پہنچنے کے بغیر درست نہیں ہے اور یہ بات خود پائی نہیں گئی اور حدیث قطعی کا ورود بھی اس باب میں نہیں پایا گیا اور جن حضرات نے جو کچھ کہا ہے وہ اپنی رائی اور قیاس سے کہا ہے یا احادیث ضعیفہ واہیہ کو لیا ہے پس توقف واجب ہوا

سوال ۔ ثواب اور عذاب کا مدار عمل ہوتا ہے ۔ اور عمل ان لوگوں نے کیا ہی نہیں تو ان کے عقاب اور ثواب کا کیا معنیٰ ؟

جواب نجات یا عذاب کے لیے واقعی عمل مدار بنتا ہے لیکن عمل کا مدار بننا صرف ان لوگوں کے لیے ہے ۔ جنہوں نے عمل کا زمانہ پایا ہے ۔ جن بچوں نے ابھی عمل کا زمانہ پایا ہی نہیں ان کے لیے عمل ضابطہ اور مدار نہیں ہے ان کا ضابطہ اور مدارِ نجات وعذاب الگ ہے وہ یہ کہ ان کے اندر استعداد کیسی ہے اور وہ اللہ کے علم میں ہے ۔

یَقُوْلُ اَبُوالْاِسْعَاد : اہل السنۃ والجماعۃ کے نزدیک عملِ صالح دخولِ جنت کا موجب

نہیں ۔ صرف دخولِ جنّت کی امارت ہے ۔ ایسے ہی عمل فاسد دخولِ نار کا موجب نہیں بلکہ صرف امارت ہے ۔ جب عمل کی حقیقت امارت ہونے کی ہی ہے تو پھر یہ عمل والا اعتراض کیوں، دخولِ جنّت کا موجب حقیقی لطفِ ربّانی ہے اور دخولِ نار کا موجب حقیقی عدلِ ربّانی ہے ۔ جو بھی دوزخ میں جائے گا ۔ وہ اللہ تعالیٰ کے عدل سے جائے گا ۔ اس کے خراب عمل صرف امارت ہے ایسے ہی جو بھی جنّت میں جائے گا وہ اللہ کے فضل سے ہی جائے گا ۔ اصل موجب دخولِ جنّت کا فضل الٰہی ہے ۔ عمل صالح صرف امارت ہیں ۔

قولہ اَللّٰہُ اَعْلَمُ بِمَا کَانُوْا عَامِلِیْنَ ۔ محدّثین حضرات نے اس کے دو مطلب بیان فرمائے ہیں ۔ اوّل کہ یہ تو خدا کو معلوم ہے کہ اگر وہ صغر سنی کی حالت میں نہ مرتے اور زندہ رہتے تو بڑے ہو کر کیا عمل کرتے ۔ لہٰذا اب ان کے ساتھ جو معاملہ ہوگا اسی کے مطابق ہوگا ۔

دوئم : یا یہ خدا ہی کو معلوم ہے کہ آیا وہ جنّت میں جاتے ہیں یا دوزخ میں وہاں کی حالت کسی بندہ کو کیا معلوم یعنی " اَللّٰہُ اَعْلَمُ بِمَا کَانُوا صَائِرِیْنَ اِلَی الْجَنَّۃِ اَوْاِلَی النَّارِ ۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ — یہ دوسری فصل ہے ۔

عَنْ عُبَادَۃَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَوَّلَ مَا خَلَقَ اللّٰہُ الْقَلَمَ فَقَالَ لَہٗ اُکْتُبْ فَقَالَ مَا اَکْتُبُ قَالَ اُکْتُبِ الْقَدَرَ ۔

ترجمہ : حضرت عبادۃ بن صامت فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ رب نے جو چیز پہلے پیدا کی وہ قلم تھا پھر فرمایا اس کو لکھ قلم نے کہا یا اللہ کیا لکھوں جواب ملا تقدیر لکھ !

سوال اوّل رب ذوالجلال اور قلم کے درمیان جو مکالمہ ہو رہا ہے یہ ان کی شایانِ شان سے بعید ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ بابرکات کلام سے پاک ہیں اور قلم کے اندر قوّتِ گویائی نہیں ہے ۔

جواب حدیثِ پاک کی یہ عبارت کسی تأویل کی مُحتاج نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے اندر اپنی شان کے مُطابق عرض معروض کرنے کی طاقت رکھی ہے ۔
کما فی قولہٖ تعالیٰ " وَاِنْ مِّنْ شَیْئٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ ۔ پ۱۵ بنی اسرائیل)

سوال دوم اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ تخلیق اوّل قلم کی ہوئی ۔ جب کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ تخلیق اوّل نورِ محمدی کی ہوئی ہے " اِنَّ اَوَّلَ مَا خَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ ۔ بعض روایات میں عرش ہے ان میں حقیقتاً تخلیق اوّل کس کی ہے ؟

جواب حضرت محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نور والی حدیث راجح ہے ۔ لہٰذا اس میں اولیّت حقیقی ہے اور باقی تمام اضافی ہے ۔ ترتیب یوں ہے کہ سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نور کو، پھر عرش پھر پانی، پھر ہوا، اور لوحِ محفوظ کی پیدائش کے بعد جو چیز سب سے پہلے پیدا ہوئی وہ قلم ہے پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نورِ مُبارک سے مُراد آپ کی رُوحِ مُبارک اقدس انور ہے ۔ کیونکہ ترمذی شریف کی روایت ہے " اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ رُوْحِیْ " تو نوری بمعنیٰ روحی کیونکہ " فَاِنَّ الْاَرْوَاحَ نُوْرَانِیَّۃٌ (مرقاۃ ج۱ ص۱۴۷)

قولہٗ فَکَتَبَ مَا کَانَ ۔ قلم نے اُن چیزوں کو لکھا جواب تک ہوچکی ہیں ۔
سوال : ۔ جب پہلے ہی قلم کو پیدا کیا گیا تو پھر قلم سے پہلے کیا تھا جسے قلم نے پہلے لکھا ۔
جواب اوّل : اس سے پہلے اللہ کی صفات وذات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نور عرش پانی وغیرہ موجود تھے ۔ یہ سب مَا کَانَ تھے ۔
جواب دوم : عند البعض مَا کَانَ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک کے اعتبار سے ہے جس کو مَا کَانَ سے تعبیر کیا گیا ہے ۔
قولہٗ وَمَا ھُوَ کَائِنٌ اِلَی الْاَبَدِ ۔۔۔ تب اس نے جو کچھ ہوچکا اور جو ہمیشہ تک ہوگا لکھ دیا ۔
سوال ۔ یہ کہ اَبَدْ مستقبل غیر متناہی کا نام ہے ۔ پھر غیر متناہی کو کیسے لکھا گیا کیونکہ غیر متناہی خارج عن الاحاطہ ہوتا ہے ۔ جب کہ مکتوب محدود ہوا کرتا ہے ۔
جواب اوّل ۔ غیر متناہی کو اجمالاً لکھا جاسکتا ہے ۔

جواب دوم آبد سے مراد یہاں زمانہ طویل ہے یعنی جہان کے ختم ہونے تک یا قیامت تک، یا جنتیوں کے جنت میں اور دوزخیوں کے دوزخ میں داخل ہونے تک کا زمانہ مراد ہے۔ چنانچہ حاکم اور بیہقی کی روایت میں اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ اور اِلٰی اَنْ تَقُوْمَ السَّاعَۃُ کے لفظ بھی آتے ہیں۔

وَعَنْ مُسْلِمِ بْنِ یَسَارٍ قَالَ سُئِلَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ عَنْ ھٰذِہِ الْاٰیَۃِ وَاِذْ اَخَذَ رَبُّکَ مِنْ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُھُوْرِھِمْ ذُرِّیَّتَھُمْ الاٰیۃ قَالَ عُمَرُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُسْاَلُ عَنْھَا۔

ترجمہ: مسلمؒ بن یسار راوی ہیں کہ حضرت عمر فاروقؓ سے " وَاِذْ اَخَذَ رَبُّکَ الخ والی آیت کے متعلق سوال کیا گیا پس انہوں نے کہا کہ جب اس آیت کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا تھا تو میں نے آپ کو فرماتے ہوئے سنا۔

قولہٗ ثُمَّ مَسَحَ ظَھْرَہٗ ۔ محدثینؒ حضرات نے اس کے متعدد معانی بیان فرمائے ہیں۔ اوّل: یہاں مسح (ہاتھ پھیرنا) کرنے والی اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات پاک ہے لیکن مسح من باب التصویر والتمثیل ہے۔

دوم: مسح کرنے والا فرشتہ ہے جس کے ذمہ میں تصویر اور بچہ کے نقش و نگار کرنے کا کام ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت للتشریف والتعظیم ہے۔

سوم: مسح مأخوذ من المساحۃ بمعنی التقدیر معنی مسح ای قدر ما فی ظھرہٖ من الذریّۃ ۔

سوال آیت مقدسہ کے الفاظ میں بنی آدم کی پشت سے ذریات نکالنے کا ذکر ہے اور حدیث پاک میں آدم علیہ السلام کی پیٹھ سے نکالنے کا ذکر ہے۔ بظاہر قرآن کریم وحدیث میں تعارض ہے۔

جواب اوّل اخراج کی کیفیت یہ تھی کہ پہلے حضرت آدم علیہ السّلام کی پشت سے چند ذرّیات مثلاً ھابل وقابل کو نکالا گیا، پھر ان سے ترتیب خارجی کے اعتبار سے قیامت تک آنے والی اولاد نکالی گئی۔ تو قرآن کریم میں ترتیب خارجی کے اعتبار سے بیان کیا گیا اور حدیث میں اصل کے اعتبار سے بیان کیا گیا کیونکہ بالواسطہ سب کی اصل آدم علیہ السلام ہیں۔

جواب دوم پہلے حضرت آدم علیہ السّلام کی پشت سے چند ذریات نکالی گئیں پھر انہی کی پشت پر ایک دوسرے سے قیامت تک آنے والی ذریات نکالی گئیں۔ پھر حضرت آدم علیہ السّلام کی پشت سے ایک ساتھ سب کو نکال دیا گیا۔ تو آیت میں اِخراج اولی کو بیان کیا اور حدیث میں اخراج ثانی کو بیان کیا گیا۔ فلا تعارض۔

سوال اہلِ جنّت کے بارے میں فرمایا " ثُمَّ مَسَحَ ظَهْرَهٗ بِيَمِيْنِهٖ یعنی یمین کا لفظ لائے کیونکہ خیر یمین کی طرف منسوب ہے۔ جب کہ اہلِ نار کے حق میں بِيَدِهٖ کا لفظ استعمال فرمایا۔ جب کہ تقابل کا تقاضا یہ تھا کہ شمال کو ذکر کرتے۔

جواب اوّل شمال کا ذکر اس لیے نہیں فرمایا کہ اس میں من وجہٖ سوءِ ادب ہے کَمَا وَرَدَ فِی الْحَدِیْثِ " كِلْتَا يَدَی الرَّحْمٰنِ يَمِيْنٌ "۔

جواب دوم شمال کے اطلاق سے کمزوری کی نسبت ہوگی کیونکہ وہ ہاتھ نسبتاً کمزور ہوتا ہے جب کہ کمزوری ذاتِ باری تعالیٰ کی شان کے خلاف ہے۔

قولہ فَاسْتَخْرَجَ مِنْهُ ذُرِّيَّةً یہاں پر دو بحثیں ہیں :۔

بحث اوّل صورتِ اخراج یعنی حضرت آدم علیہ السّلام کے جسم کے کون سے حصّہ سے اخراج کیا گیا۔ اس بارے میں محدثینؒ کے کئی قول ہیں۔ اوّل : شیخ عبدالوہاب شعرانیؒ کے نزدیک آدم علیہ السّلام کی پیٹھ میں شگاف کرکے نکالا گیا۔ کَمَا جَاءَ فِی الْاَحَادِیْثِ فَاَخْرَجَ مِنْ صُلْبِهٖ۔

دوم : عند البعض آدم علیہ السّلام کے سر کے بال کی جڑ میں جو سوراخ ہے اس سے نکالا گیا۔

سوم : جو اقرب الی الصواب ہے۔ کما قالہ الشیخ ابو طاہر القزوینیؒ حضرت آدم علیہ السّلام کی پیٹھ میں جو بال ہے اس کی جڑ میں جو سوراخ ہے اس سے نکالا گیا جیسا کہ اس

سوراخ سے پسینہ نکلتا رہتا ہے جسے مُسامات بھی کہتے ہیں۔

بحث دوم۲ ۔ مقامِ اِخراج کون سی جگہ ہے ؟

اس میں بھی متعدد اقوال ہیں
اوّل۱ : عالمِ اَرواح میں نکالا گیا۔
دوم۲ : حضرت آدم علیہ السّلام کو دنیا میں بھیجنے کے بعد نکالا گیا۔ سوم۳ : جمہور حضرات کے نزدیک وادیٔ نعمان جو میدانِ عرفات کے قریب ہے وہاں نکالا گیا۔ کما جاء فی حدیث ابن عباسؓ قَالَ اَخَذَ اللّٰہُ الْمِیْثَاقَ مِنْ ظَھْرِ اٰدَمَ بِنُعْمَانَ (مشکوٰۃ شریف ص۲۴ ج۱)

بحث سوم۳ ۔ عہد اَلَسْتُ حقیقی واقعہ ہے یا تمثیل ہے ؟

اس میں دو۲ قول ہیں :۔

قول اوّل۱ قاضی بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ آیت وحدیث کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام بنی آدم کو عقل دی، پھر اپنی معرفت کے دلائل کا مشاہدہ کرایا جس کی وجہ سے ان میں اللہ تعالیٰ کی معبودیت کو سمجھنے کی اہلیت پیدا ہوگئی۔ گویا بزبانِ حال سوال ہوا اور جواب دیا گیا ورنہ حقیقت میں کوئی سوال وجواب نہیں ہوا۔ معتزلہ کا بھی یہی عقیدہ ہے۔

قول دوم۲ جمہور محدثین حضراتؒ کے نزدیک حق تعالیٰ نے جمیع انسانوں کے روحوں کو نکال کر ان سے قولاً وعدہ ربوبیت لیا ہے۔ لہٰذا یہ عہد حقیقتاً ہے لامجازًا ولاتمثیلاً۔ کما قالہ البیضاویؒ اس کی مؤید حدیث ابنِ عباسؓ ہے :۔

" اِنَّہٗ قَالَ اخذ اللہ المیثاق من ظھر ادم فاخرج من صُلبہٖ کلّ ذریۃ فنشرھم بین یدیہ ثمّ کلّمھم قُبُلًا (آمنے سامنے) قَالَ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوْا بَلٰی شَھِدْنَا الخ

(اخرجہ النسائی فی صحیحہٖ)

سوال ۔ اس عہد لینے کا مقصد کیا تھا ؟

جواب چونکہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور ہستی کا عقیدہ پوری کائنات کی بنیاد ہے اس عقیدہ کو ابتداء ہی سے انسان کی فطرت میں ودیعت کیا گیا۔ تاکہ اس

فطری اثر کی وجہ سے انسان اس عقیدہ کو جلدی قبول کرلیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر مذاہب اللہ تعالیٰ کی ربوبیتِ عامہ پر کسی نہ کسی درجہ میں سب متفق ہیں۔ اگر اس مسئلہ کو صرف عقلی رہنے دیا جاتا تو لَوَجَدُوۡا فِیۡہِ اخۡتِلَافًا کَثِیۡرًا۔

سوال۔ وہ عہد یاد تو نہیں ہے پھر اسے کیسے تسلیم کریں؟

جواب ہر چند یاد نہیں مگر اس کے اثرات ضرور موجود ہیں جیسے کسی بھی عالم فاضل کو یہ یاد نہیں ہوتا کہ میں نے الف، با، تا رکس وقت کہاں اور کس کیفیت میں شروع کی تھی، لیکن اتنا اس کو یقین ہوتا ہے کہ ضرور کسی نے مجھ کو ابتداء میں یہ الفاظ سکھلائے ہیں، اور یہی سیکھنا میرے آگے بڑھنے کی بنیاد بنا ہے ایسے ہی اکثر اہلِ مذاہب کا اللہ تعالیٰ کی ربوبیت میں متفق ہونا اسی عہد کے اثر کی وجہ سے ہے۔ اور بعض اہلِ بصیرت کو وہ عہد اب بھی یاد ہے۔

؎ اَلَسْت از ازل ہمچناں شان بگوش — بفریادِ قَالُوا بَلٰی در خروش

کما قال علی رض:۔

انی لاذکر العهد الذی عهد الیّ ربی و اعرف من کان هناك عن یمینی و عن شمالی۔

اور ایسا ہی سہل بن عبد اللہ التستریؒ نے کہا کہ مجھے وہ عہد یاد ہے۔

ذوالنون مصریؒ نے فرمایا کہ یہ عہد ایسا یاد ہے گویا اس وقت سُن رہا ہوں۔

سوال۔ جب سب نے اقرار کیا تو دنیا میں آکر بعض نے انکار کیوں کیا؟

جواب یہ کہ کافروں پر رعب وہیبت طاری ہو گئی تھی اس لیے انہوں نے خوف کی وجہ سے بَلٰی کہ دیا اور مسلمانوں پر رحمت کی تجلّی ڈالی گئی۔ انہوں نے خوشی کے اندر بَلٰی کہا۔

قولہٗ خَلَقۡتُ هٰؤُلَاءِ لِلنَّارِ۔

سوال حدیثِ پاک میں ہے خَلَقۡتُ لِلنَّارِ وَخَلَقۡتُ لِلۡجَنَّةِ اس سے معلوم ہوا کہ بعض تخلیق جنتی ہے اور بعض ناری ہے۔ جب کہ اصالۃً سب کی تخلیق عبادت کے لیے ہے یہ وَمَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَالۡاِنۡسَ اِلَّا لِیَعۡبُدُوۡنِ (پ۲۷)

جواب

غرض تخلیق دو قسم ہے : اوّل تشریعی : جس کا تعلق رضائے الٰہی کے ساتھ ہے یعنی جس پر اللہ تعالیٰ راضی ہو، اسے عبادت کی توفیق عطا فرماتے ہیں دوّم تکوینی : اس کا تعلق ارادۂ الٰہی ومشیّتِ الٰہی کے ساتھ ہے۔ یہاں پر تکوینی غرض مراد ہے اور آیت مقدسہ میں تشریعی غرض مراد ہے۔ فلا تعارضا۔

وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَفِيْ يَدَيْهِ كِتَابَانِ فَقَالَ اَتَدْرُوْنَ مَا هٰذَانِ الْكِتَابَانِ قُلْنَا لَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِلَّا اَنْ تُخْبِرَنَا۔

ترجمہ : حضرت عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے اس حال میں کہ آپ کے ہاتھوں میں دو کتابیں تھیں اور فرمایا جانتے ہو کہ یہ دونوں کتابیں کیا ہیں۔ عرض کیا یا رسولَ اللہ ہمیں کیا معلوم آپ ہی بتا دیجئے۔

قولہ : کِتَابَانِ ۔ ان دو کتابوں کے بارے میں محدثین حضرات کی دو آراء ہیں :۔

اوّل : یہ کہ حسّی اور حقیقی کتابیں نہیں تھیں بلکہ یہ کلام بطور تمثیل وفرض کے ہے۔ اصل میں یہ بتانا ہے کہ جنّت والوں کے نام بھی طے شدہ ہیں اور جہنم والوں کے نام بھی ان میں کوئی کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ جیسے کسی مخفی یا مشکل مسئلہ کو سمجھانے کے لیے اس قسم کی مثال دی جاتی ہے۔ یا جیسے کوئی استاذ کسی حساب کو ذہن نشین کرانے کے لیے بغیر کاغذ وقلم کے ہاتھ کے اشارے سے سمجھاتا ہے، تو ہاتھ بمنزلہ کاغذ وقلم کے ہے۔

دوّم : اہلِ باطن اور اربابِ مکاشفہ کا قول یہ ہے کہ یہ دو حقیقی کتابیں تھیں جو عالمِ غیب سے آئی تھیں، اور اسی وقت واپس کر دی گئیں تھیں۔ اس کے اندر کوئی استحالہ نہیں جب کہ نبی کا تعلق عالمِ غیب سے اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اگر وہ چاہے تو جنّت کے باغوں میں سے انگور کا خوشہ توڑ لائے اور ہم کو دیدے۔ اس سے بھی بڑے بڑے معجزات پیش آئے ہیں۔ چنانچہ امام غزالیؒ نے کیمیائے سعادت میں لکھا ہے کہ خواص کا امتیاز عوام سے دو طرح ہے۔ اوّل یہ کہ عوام کو جو علوم کسب وتعلّم سے حاصل ہوتے ہیں وہ خواص کو بغیر کسب وتعلّم کے

منجانب اللہ حاصل ہوتے ہیں جس کو علماء کی اصطلاح میں علم لدنی کہا جاتا ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَدُنَّا عِلْمًا۔ دوم: عوام جس چیز کو خواب میں دیکھتے ہیں اُس عجیب وغریب چیز کو خواص بیداری میں دیکھ سکتے ہیں جب خواص امتِ محمدیہ کی یہ حالت ہے کہ عجائب وغرائب بیداری میں دیکھ سکتے ہیں۔ تو سیدالمرسلین، فخرالاولین والآخرین امام الانبیاء صلعم کے ہاتھ مبارک میں اگر عجیب وغریب کتاب آجائے تو تعجب واستبعاد کیا ہے بلکہ ظاہر حدیث میں تو یہ ہے کہ وہ کتاب صحابۂ کرام رض کو حضرت ص نے دکھائی بھی تھی۔ کما فی حدیث صحیح وَفِي يَدِهٖ عَلَيْهِ السَّلَامُ "كِتَابَانِ مَطْوِيَّانِ وَهُوَ قَابِضٌ بِيَدِهٖ عَلَى كِتَابِ اللّٰهِ۔ یہ طی اور قبض حسّی کتاب پر دال ہے۔

قولہ قُلْنَا لَا۔ اس کے بعد نَدْرِیْ مقدر ہے۔

قولہ فَقَالَ لِلَّذِيْ فِيْ يَدِهِ الْيُمْنٰى۔ اس کی دو ترکیبیں ہیں:۔

اوّل: لام بمعنیٰ فِیْ ہے اور اَلَّذِیْ سے پہلے مضاف مقدر ہے "ای فی حق الذی الخ اور قَالَ بمعنیٰ اَشَارَ کیونکہ قَالَ کا استعمال عموم ہر شیئی پر ہے۔

دوم: لام بمعنیٰ اِلٰی اور اَلَّذِیْ سے مراد کتاب ہے۔

قولہ ثُمَّ اُجْمِلَ عَلٰی اٰخِرِهِمْ۔ پھر آخر میں جمع بندی کر دی گئی۔ لہٰذا اس میں کسی نام کا اضافہ اور کمی نہیں ہو سکتی۔ اجمل یہ اِجْمَالٌ سے ہے یعنی مجموعی میزان وٹوٹل اور جمع بندی کر دینا۔

قولہ فَلَا يُزَادُ فِيْهِمْ وَلَا يُنْقَصُ مِنْهُمْ اَبَدًا۔ لہٰذا ان میں کبھی زیادتی کمی نہیں ہو سکتی۔

سوال یہ کہ اس میں کمی یا زیادتی نہیں ہو گی۔ جب کہ قرآن پاک میں ہے:۔ يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهٗ اُمُّ الْكِتَابِ (الآیۃ) جب کہ حدیث میں محو اور اثبات کی نفی ہے۔

جواب تقدیر دو قسم ہے: اوّل مُبرم: جو محکم فیصلہ ہوتا ہے اس میں تعلیق نہیں ہوتی۔ دوم مُعلّق: جو کسی کے ساتھ معلق ہو۔ مثلاً زید فلاں دوائی استعمال کریگا تو شفاء ہو گی۔ مُبرم تقدیر محو اثبات کو قبول نہیں کرتی۔ جب کہ معلق میں محو واثبات ہوتا ہے۔ تو حدیث محمول ہے تقدیر مبرم پر جب کہ آیت قرآنی میں تقدیر معلق کا مسئلہ ہے مگر یہ تقسیم عندالناس ہے عنداللہ جمیع تقدیر مبرم ہے کیونکہ ان کے علم میں ہے کہ یہ کام ہو گا یا نہیں۔

قولہ سَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا ۔ یعنی راہِ حق کے مطابق سیدھے چلتے رہو۔ عمل کو خوب مضبوطی سے کرو، اور اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرتے رہو۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے اصل مقصد یعنی عبادت میں لگے رہو۔ جبر اور قدر کی بحث میں مت پڑو۔ یہ حکیمانہ جواب ہے۔

قولہ فَنَبَذَهُمَا ۔ ای طَرَحَ مَا فِیْهِمَا یعنی ہاتھوں کو جھٹکا دیا جس سے دونوں کتابیں غائب ہوگئیں۔ اور یہ پھینکنا ان کی اہانت کے لیے نہ تھا بلکہ اس طرف اشارہ مقصود تھا کہ بارگاہِ ربوبیت سے اس معاملہ میں کہ جنتی و دوزخی کون کون لوگ ہیں ازل ہی میں حکم ہو چکا ہے جو کہ نوشتۂ تقدیر بن چکا ہے۔

قولہ فَرِیْقٌ فِی الْجَنَّةِ وَفَرِیْقٌ فِی السَّعِیْرِ ۔ یہ قرآن پاک کی آیت سے اقتباس ہے۔ اور بندوں سے مراد انسان ہیں کیونکہ جنّت میں ثواب کے لیے انسانوں کے سوا کوئی نہ جائے گا۔ یہ آدم علیہ السّلام کی میراث انہی کی اولاد کو ملے گی۔

وَعَنْ اَبِیْ خُزَامَةَ رضی اللہ عنہ عَنْ اَبِیْهِ قَالَ قُلْتُ یَارَسُوْلَ اللهِ اَرَاَیْتَ رُقًى نَسْتَرْقِیْهَا وَدَوَاءً نَتَدَاوٰی وَتُقَاةً نَتَّقِیْهَا هَلْ تَرُدُّ مِنْ قَدَرِ اللهِ شَیْئًا قَالَ هِیَ مِنْ قَدَرِ اللهِ ۔

ترجمہ: ابو خزامہ رضی اللہ عنہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے پوچھا یا رسول اللہ یہ جو جھاڑ پھونک ہم (شفاء کے لیے) پڑھواتے ہیں۔ یا دوائیں استعمال کرتے ہیں یا بچاؤ کی چیزیں (ڈھال زرہ وغیرہ) سے حفاظت کرتے ہیں کہ یہ چیزیں تقدیر کو بدل دیتی ہیں فرمایا نہیں یہ سب تقدیر ہی کے مطابق ہیں۔

قولہ رُقًى ۔ یہ رُقْیَةٌ کی جمع ہے بمعنیٰ تعویذ و منتر۔ یہاں اس سے مراد وہ تعویذات ہیں جن کے الفاظ مباح ہوں۔ مثلاً اسماء الٰہیہ وغیرہ اور ان کو مؤثر بالذات نہ سمجھا جائے اور وہ کسی جائز غرض کے لیے ہوں ورنہ حرام ہیں۔

قولہ تُقَاةً ۔ بمعنیٰ بچاؤ کی چیز۔ مثلاً زرہ ڈھال وغیرہ۔

قولہٗ نَتَّقِیْهَا - ای نَلْتَجِیْ بِهَا : یعنی دشمنوں سے حفاظت کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

حَاصِلُ الحَدِیْث

سوال کا حاصل یہ ہے کہ ان اسباب ظاہرہ کے اختیار کرنے سے تقدیر کا کوئی فیصلہ ٹل تو نہیں سکتا پھر ان اسباب کو اختیار کرنے کا کیا فائدہ۔ جواب کا حاصل یہ ہے کہ اسباب تقدیر کے منافی نہیں بلکہ تقدیر کے اجزاء ہیں اس لیے تقدیر میں جہاں نتائج لکھے ہوئے ہیں.. وہاں ان کے اسباب بھی لکھے ہوئے ہیں۔ مثلاً تندرست ہونا تقدیر میں لکھا ہے تو ساتھ ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ فلاں علاج سے تندرستی ہوگی۔ سائل نے یہ سمجھ لیا کہ تقدیر میں صرف نتائج ہی لکھے ہیں اسباب کا تقدیر کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

یَقُوْلُ اَبُوْدَاوٗد سَعَاد : حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قضاء وقدر اسباب کے خلاف نہیں ہیں بلکہ اسباب اختیار کرنا خود قضاء وقدر کے اندر داخل رہتے ہیں (حجۃ اللہ البالغہ صـ۶۷)

اسمائے رجال

حالات حضرت ابی خُزامہؓ

ان کے والد کے نام میں اختلاف ہے۔ غالباً ان کا نام یَعْمَر ہے۔ جو بنی حارث ابن سعد قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں یہ ابو خزامہؒ خود تابعی ہیں۔ اور حضرت ابو خزامہؓ دوسرے صحابی ہیں۔

وَعَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ قَالَ خَرَجَ عَلَیْنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَنَحْنُ نَتَنَازَعُ فِی الْقَدْرِ فَغَضِبَ حَتّٰی اَحْمَرَّ وَجْھُہٗ حَتّٰی کَاَنَّمَا فُقِئَ وَجْنَتَیْہِ حَبُّ الرُّمَّانِ ۔

ترجمہ : حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ (ایک دن) ہم قضاء وقدر کے مسئلہ پر بحث کر رہے تھے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے (ہمیں اس مسئلہ میں الجھے ہوئے دیکھ کر) آپ کا چہرہ انور اقدس غصہ کی وجہ سے سرخ ہو گیا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا انار کے دانے آپ کے رخسار مُبارک پر نچوڑ دیے گئے ہیں ۔

قولہ وَنَحْنُ نَتَنَازَعُ ۔ تنازع دو قسم ہے ۔ اوّل تنازع بدلائل یہ احسن ہے ۔ دوم تنازع بغیر الدلائل یہ قبیح ہے اور ضدی آدمی کا کام ہے ۔ صحابہ کرامؓ کے درمیان تنازع بدلائل تھا ۔

سوال ۔ تنازع بدلائل سے کیا مراد ہے ؟

جواب تنازع بدلائل سے مراد یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ آپس میں تقدیر کے مسئلہ پر بحث کر رہے تھے کہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے نوشتہ تقدیر ہیں تو پھر عذاب وثواب کا ترتّب کس لیے ہے ۔ بعض صحابہ کرامؓ کہ رہے تھے کہ اس میں خدا کی حکمت ومصلحت ہے بعض نے کہا کہ اعمال کا اختیار دیا ہے لیکن اختیار کس نے دیا وغیرہ وغیرہ ۔

قولہ اَحْمَرَّ وَجْھُہٗ ۔ غصہ اور تحمیر وجہ کا سبب یہ تھا کہ چونکہ تقدیر کا معاملہ خداوندی راز ہے ۔ اور رازِ خداوندی کی طلب منع ہے ۔ نیز جو اس میں واقع ہوگا تو کاہل احتیاط سے کام لینا پڑے گا ۔ جو ہر ایک کا کام نہیں لہذا خوف ہے کہ مائل بقدریہ وجبریہ نہ ہو جائے اور بندہ کو حکم یہ ہے کہ اوامر پر عمل کرے ، نواہی سے بچے ۔ اس لیے حضور علیہ السلام ناراض ہوئے مگر مُبْطِلین کے دفع اعتراض کے لیے یا نصرتِ دین کی خاطر کلام کرنا منع نہیں ۔

قولہ فُقِئَ ۔ بصیغۃ المجہول ای عُصِرَ یعنی نچوڑنا ۔

قولہ وَجْنَتَیْہِ ۔ ای خدّیہ یعنی رخسار مبارک لیکن کنایہ ہے چہرہ سے ۔

قولہٗ اَبِھٰذَا اُمِرْتُمْ اَمْ بِھٰذَا اُرْسِلْتُ اِلَیْکُمْ۔ اس مقام پر اَم بمعنی بَلْ ہے۔ اور یہ ترقی مِنَ الْاَھْوَنْ اِلَی الْاَغْلَظْ ہے۔ معنی ہوگا کہ تم اس جھگڑے کا حکم کیسے کیے گئے ہو پھر اس سے سخت کلمہ فرمایا کہ کیا میں اس تقدیر کے مسئلہ کے لیے بھیجا گیا ہوں۔

قولہٗ اِنَّمَا ھَلَکَ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ۔ یہ جملہ مستانفہ ہے جو جواب ہے سوال مُقدر کا۔ سوال تھا" لَمَا انکرت ھٰذا انکارا للتبلیغ۔ یارسول اللہؐ آپ ناراض اور غصہ کیوں فرمارہے ہیں اس کی وجہ کیا ہے؟ جواب دیا" اِنَّمَا ھَلَکَ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ" لہٰذا مجھے خطرہ ہے کہ تم بھی سابقہ اُمتوں کی طرح ہلاک نہ ہوجاؤ۔

قولہٗ عَزَمْتُ عَلَیْکُمْ۔ ای اَقْسَمْتُ عَلَیْکُمْ: قسم دیتا ہوں تم کو۔ عَزَمْتُ عَلَیْکُمْ۔ ای اَوْجَبْتُ عَلَیْکُمْ: واجب کرتا ہوں کہ تم تقدیر کے مسئلہ میں جھگڑا نہ کیا کرو۔

قولہٗ اَنْ لَّا تَتَنَازَعُوْا: شراحِ حدیث نے بحث کی ہے کہ اَنْ لَّا تَتَنَازَعُوْا کا اَنْ کون سا ہے؟ کیونکہ اَنْ مصدریہ بھی نہیں بن سکتا۔ اس لیے کہ یہ جملہ مُفرد بن جائے گا۔ اور جوابِ قسم جملہ ہوتا ہے۔ اسی طرح اَنْ زائدہ بھی نہیں بن سکتا اس لیے کہ جو اَنْ لَا کے ساتھ آئے وہ زائدہ نہیں ہوتا۔ تولامحالہ اَنْ مُفسرہ ہوگا یا اَنْ مخففہ مِنَ المثقلہ ہوگا بمعنی" اَنْ لَّا تَخَاصَمُوْا وَاَنْ لَّا تُجَادِلُوْا۔

قولہٗ وَرَوٰی ابن مَاجۃَ عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَیْبٍ عَنْ اَبِیْہِ عَنْ جَدِّہٖ آخرِ حدیث میں صاحبِ مشکوٰۃ نے ابن ماجہ کی اس طرح کی روایت کردہ حدیث کی سند کا ذکر کیا ہے۔ یہ سند کتبِ حدیث میں بکثرت آتی رہتی ہے اس کے متعلق ضروری باتیں جان لینا ضروری ہے۔

مکمّل سلسلۂ نسب

اس قسم کی روایات کو روایۃ الابناء عن الآباء کہا جاتا ہے اس عمرو بن شعیبؒ کا نسب نامہ یوں ہے؟ عمرو بن شعیب بن محمّد بن عبداللہ بن عمرو بن العاص بن وائل" امامِ احمدؒ اور دوسرے جمہور محدثینؒ اس سند سے حدیث لاتے ہیں لیکن امامِ بخاریؒ وامامِ مُسلمؒ نہیں لاتے۔ مؤلفِ مشکوٰۃؒ اپنے رسالہ" الاکمال فی اسماء الرّجال ص۶۱۱ میں اس کی وجہ لکھی ہے جو وہاں دیکھی جاسکتی ہے۔ مزید اس کی وضاحت بحث کے اندر بھی آرہی ہے۔ اب اس سند میں دو ضمیریں ہیں۔ اوّل عَنْ اَبِیْہِ اس میں

اتفاق ہے کہ اَبِیْہِ کی ضمیر عمرو کی طرف راجع ہے اور اَبِیْہِ کا مصداق شعیب ہیں یعنی عمرو اپنے والد شعیب سے روایت کرتے ہیں۔ دوم عَنْ جَدِّہٖ ۔ جَدِّہٖ کی ضمیر میں دو احتمال ہیں۔ اوّل اس ضمیر کا مرجع عمرو ہیں۔ اور اس کے مصداق محمدؒ ہیں۔ یعنی شعیب عمرو کے دادا محمدؒ سے روایت کرتے ہیں حالانکہ محمد تابعی ہیں۔ اس صورت میں یہ روایت مرسل ہوگی۔
دوم جَدِّہٖ کی ضمیر کا مرجع اَبِیْہِ ہے۔ اب جد کا مصداق عبداللہ بن عمرو ہوں گے۔ جو کہ شعیب کے دادا ہیں مطلب یہ ہوگا کہ شعیب اپنے دادا عبداللہؓ سے روایت کرتے ہیں تو یہ روایت مرسل نہ ہوگی بلکہ منقطع ہوگی کیونکہ شعیب کو اپنے دادا عبداللہؓ سے سماع ثابت نہیں۔ بلکہ ان کو اپنے دادا کا صحیفہ مل گیا تھا اس سے روایت نقل کرتے ہیں۔

بحث یہ کہ ان دو احتمالوں میں سے کونسا احتمال راجح ہے؟

عام طور پر اس انداز کی سندوں میں اَبِیْہِ اور جَدِّہٖ دونوں ضمیروں کا مرجع پہلا راوی ہوتا ہے جیسے "عَنْ بَهْزِ بْنِ حَكِيْمٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ" اس میں دونوں ضمیروں کا مرجع بہز ہے لیکن زیر بحث سند میں عند الجمہور دوسرا احتمال راجح ہے۔ اس احتمال کے راجح ہونے کے کئی قرائن ہیں۔ سب سے واضح قرینہ یہ ہے کہ ابوداؤد شریف ج۱ ص۲۰ باب باب الوضوء ثلاثاً ثلاثاً۔ کتاب الطہارۃ اور نسائی شریف (بحوالہ تدریب الراوی ج۲ ص۲۵۸) کی روایات میں یوں ہے "عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ عبد الله" (کما فی الترمذی ج۱ ص۲) سوال یہ کہ شعیب کو عبداللہؓ سے سماع حاصل نہیں۔

جواب ۔ یہ ہے کہ شعیب کو اپنے دادا سے یعنی عبداللہؓ سے سماع حاصل ہے اس لیے کہ شعیب ابھی بچے ہی تھے کہ ان کے والد محمدؒ کا انتقال ہوگیا ان کی پرورش ان کے دادا عبداللہؓ نے کی ان سے شعیب نے علمی استفادہ بھی کیا۔

سوال ۔ اگر احتمال ثانی راجح ہے تو پھر امام بخاریؒ جیسے جلیل القدر محدثؒ نے کیوں اس سند کو اپنی صحیح میں نقل نہیں کیا، ان کا نقل نہ کرنا بیّن دلیل ہے کہ اس احتمال میں اتفاق نہیں

جواب ۔ امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں حدیث لانے کے لیے کڑی شرائط

مُقرّر کر رکھی ہیں اس لیے اس سند کی کوئی حدیث اپنی صحیح میں نہیں لائے اس کے برخلاف بڑے بڑے محدث اس سند کو ذکر فرماتے ہیں۔ کما فی نصب الرایۃ ج۱ ص۲۳ "رأیتُ احمدؒ بن حنبل وعلیؒ بن المدینی والحُمیدیؒ واسحقؒ بن راھویہ یحتجّون بعمروؒ بن شعیب عن ابیہ عن جدّہٖ" یہ بھی ممکن ہے کہ امام بخاریؒ کا حدیث کو نہ لینا کسی اور وجہ سے ہو۔

وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰیؓ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ اٰدَمَ مِنْ قَبْضَۃٍ قَبَضَھَا مِنْ جَمِیْعِ الْاَرْضِ فَجَآءَ بَنُوْ اٰدَمَ عَلٰی اَقْدَارِ الْاَرْضِ

ترجمہ: روایت ہے حضرت ابوموسیٰؓ سے فرماتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو ایک مٹھی (مٹی) سے پیدا کیا جو تمام روئے زمین سے لی گئی۔ لہٰذا اولادِ آدمؑ زمین کے اندازہ پر آئی۔

قولہٗ قُبْضَۃ۔ بِالضمِّ مِلْءُ الکفِّ یا قُبض بمعنی الاخذ بجمیع الکفِّ مٹھی بھری ہوئی۔

حَاصِلُ الحَدِیْث

حاصل یہ ہے کہ اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اصلی مادہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ انسانی برادری میں الوان کا اختلاف، فطرت کا اختلاف، شقاوت وسعادت کا اختلاف مزاج وطبیعت کا اختلاف اسی بنیادی مادہ کی وجہ سے ہے جس سے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کی گئی ہے۔

سوال

قُبضہ کی نسبت ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے۔ حالانکہ قبض وبسط یہ مکلفین کی صفت ہے ذاتِ باری تعالیٰ اِن صفات سے پاک ہیں۔

قبضہ کی نسبت ذات باری تعالیٰ کی طرف آمر ہونے کی وجہ سے ہے۔

جواب حدیث پاک میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتہ کو حکم دیا کہ ہر جگہ کی مٹی اکٹھی کی جائے۔ بعض محدثینؒ نے لکھا ہے کہ حضرت عزرائیل علیہ السلام نے ہر قسم کی زمین سے تھوڑی تھوڑی مٹی حاصل کی، اور اس کو ہر قسم کے پانی سے گوندھا۔ چونکہ حضرت عزرائیلؑ نے ہی یہ مٹی اٹھائی تھی۔ اس لیے جان نکالنے کا کام بھی انہی کے سپرد کیا۔ تاکہ زمین کی امانت وہی واپس کریں۔

سوال ۔ اس مٹی پر قبضہ کا اطلاق درست نہیں کیونکہ ہر جنس سے مٹی اکٹھی کی جائے تو انبار لگ جائیں۔ پھر قبضہ کیسے کہا ؟

جواب اوّل : یہ متشابہات سے ہے۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمُرَادِهٖ۔

جواب دوّم : یہاں مضاف مقدر ہے " قَبْضَهَا مِنْ جَمِيْعِ اَلْوَانِ الْاَرْضِ تو الوان سے اتنی مٹی بن جاتی ہے کہ اس پر قبضہ کا اطلاق ہو سکے۔

قولہٗ مِنْهُمُ الْاَحْمَرُ وَالْاَبْيَضُ۔ صفات دو قسم ہیں۔ اوّل ظاہرہ مِنْهُمُ الْاَحْمَرُ" سے صفات ظاہرہ کا بیان ہے۔ دوّم صفات باطنہ" وَالسَّهْلُ وَالْحُزْنُ سے صفات باطنہ کا بیان ہے۔

وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ خَلْقَهٗ فِيْ ظُلْمَةٍ فَاَلْقٰى عَلَيْهِمْ مِنْ نُوْرِهٖ فَمَنْ اَصَابَهٗ مِنْ ذٰلِكَ النُّوْرِ اهْتَدٰى وَمَنْ اَخْطَاَهٗ ضَلَّ فَلِذٰلِكَ اَقُوْلُ جَفَّ الْقَلَمُ عَلٰى عِلْمِ اللّٰهِ

ترجمہ : حضرت عبداللہ بن عمروؓ فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق (جن و انس) کو اندھیرے میں پیدا کیا اور پھر ان پر اپنے نور کا پرتو ڈالا جس کو اس نور کی روشنی میسر آگئی وہ راہ راست پر لگ گیا اور جو اس سے محروم رہا وہ گمراہی میں پڑا رہا۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ تقدیر الٰہی پر قلم خشک ہو چکا ہے۔

قولہٗ فِیْ ظُلْمَۃٍ ۔ ظُلْمَۃ سے مراد نفس امارہ کی ظلمت ہے کہ انسان کی جبلت میں خواہشاتِ نفسانی اور غفلت کا مادہ رکھا تھا ۔ لہٰذا جس کا قلب ایمان کی روشنائی سے منوّر ہو گیا اور اطاعتِ الٰہی سے اپنے آپ کو مشغول کر لیا وہ نفس کے مکروفریب سے نکل گیا جو اس نفس کے فریب میں پھنس گیا وہ نورِ ایمان سے محروم رہا ۔

قولہٗ فَاَلْقٰی عَلَیْھِمْ مِنْ نُوْرِہٖ ۔ نور سے مراد ذاتی نور نہیں بلکہ تجلّی ہے کیونکہ ذاتی نور کا پَرتَو ، تو انبیاء کرامؑ بھی برداشت نہ کر سکے کجا عام مؤمن ۔ کما فی قولہٖ تعالیٰ " فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّہٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَہٗ دَکًّا ۔ عند البعض نور سے مراد شواہد و دلائل قدرت اور مُنزَل آیات ہیں ۔ اور ظلمات سے مراد حرص ، حسد ، کبر وغیرہ ہے ۔

سوال ۔ یہ حدیث فطرت کے خلاف ہے ۔

جواب : دراصل یہ حدیث فطرت کے خلاف نہیں بلکہ اس کی شرح ہے کیونکہ یہاں ظلمت سے مراد ظُلمت نفسِ امارہ ہے اور ظلمت قُوّت بہیمیہ ہے ۔ اور نور سے دلائل عقل و فطرت اور قُوّت مُلکیہ مراد ہے ۔

قولہٗ جَفَّ الْقَلَمُ ۔ یہ جملہ فرما کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فطرت کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ خلقت کے وقت جس کی فطرت ہدایت والی تھی ۔ اس کو ہدایت نصیب ہوئی ۔ اور جس کی فطرت خلقت کے وقت ضلالت والی تھی اسے گمراہی کے سوا کچھ نہ ملا ۔ لیکن اس سے انسان کے لیے جَبر لازم نہیں آتا ۔ کیونکہ وہاں یہی لکھا جا چکا ہے کہ یہ بندہ اپنی خوشی یہ کام کرے گا ، کام بھی تحریر کے اندر آچکے اور اس کا ارادہ اور خوشی بھی ۔

وَعَنْ اَنَسٍؓ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُکْثِرُ اَنْ یَّقُوْلَ یَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِیْ عَلٰی دِیْنِکَ فَقُلْتُ یَا نَبِیَّ اللّٰہِ اٰمَنَّا بِکَ وَبِمَا جِئْتَ بِہٖ فَھَلْ تَخَافُ عَلَیْنَا

ترجمہ : حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر و بیشتر یہ فرمایا کرتے تھے " اے دلوں کو پھیرنے والے میرے دل کو اپنے دین پر قائم رکھ " میں نے کہا یا نبی اللہ ہم آپ پر ایمان لائے اور آپ کے لائے ہوئے دین و شریعت پر

بھی ایمان لائے توکیا اب بھی ہمارے بارے
میں آپ ڈرتے ہیں۔

قولہٗ ثَبِّتْ قَلْبِیْ عَلٰی دِیْنِكَ ۔ مُحدّثین حضرات ؒ نے لکھا ہے کہ یہ دُعاء اُمت کے لیے تھی نہ کہ اپنی ذات پاک کے لیے۔ اس قول پر دُو قرینے ہیں :۔

اوّل : آپ کی ذات پاک مِنْ کُلِّ الوُجُوہ محفُوظ و معصُوم ہیں۔ نَعُوذُ بِاللہ کسی غلط عمل کا شائبہ تک نہیں۔ یہ ایسے ہی ناممکن ہے جیسے خُدا کا شریک۔

دوم : حضرت انس ؓ کی کلام دلالت کر رہی ہے فَهَلْ تَخَافُ عَلَيْنَا کہ آپ ہمارا خوف کر رہے ہیں۔

قولہٗ فَهَلْ تَخَافُ عَلَيْنَا ۔ مُحدّثین حضرات ؒ نے بحث کی ہے کہ خوف سے کونسا خوف مراد ہے۔ خوف کی وضاحت سے قبل ایک فائدہ ملاحظہ فرمادیں :۔

فائدہ جمہور اہل السنۃ والجماعۃ کے نزدیک انبیاء کرامؑ کی ذاتِ پاک گناہوں سے معصوم ہیں ان سے کبھی کسی وقت گناہ سرزد نہیں ہوسکتے۔ گویا انبیاء کرام کی معصُومیّت پر امّت کا اتفاق ہے۔ اسی طرح صحابہ کرامؓ کے محفوظ ہونے پر امّت کا اتفاق ہے کہ ان سے گناہ سرزد ہوسکتے ہیں مگر خدا ان کی حفاظت کرتا رہتا ہے اب خوف دُو قسم بنتا ہے :۔

۱۔ مطلق ایمان سے پھرنا۔ اس کا حضرت نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو نہ خوف تھا، اور نہ حدیث کی یہ مراد ہے۔ کیونکہ خود قرآن پاک صحابہؓ کے قلوب کے بارہ میں فرماتا ہے :

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى (پ) رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ

۲۔ کامل الایمان کا کامل ایمان سے ضعیف ایمان کی طرف آنا۔ جمہور مُحدّثینؒ کے نزدیک خوف سے مراد یہی ضعف الایمان والا خوف ہے۔ نہ کہ مُطلق ایمان۔ مطلق ایمان کا خوف یہ شیعوں کا عقیدہ ہے نہ کہ مسلمانوں کا۔

حضرت انسؓ کے سوال کا خُلاصہ حضرت انسؓ کے سوال کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ تو معصوم ہیں لہذا یہ دعاء ہمارے

ایسے ہی کرتے ہوں گے کیا ہم آپ کے صحابہ ہونے کے با وجود گمراہ ہونے کے خدشہ میں ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ قلوب کا رخ خدا کے ہاتھ میں ہے وہ جس طرح چاہتا ہے ان کو پھیرتا رہتا ہے۔ نہ معلوم کس کے قلوب کا رخ گمراہی کی طرف کب ہو جائے اس لیے یہ دعا مانگنی چاہیئے۔

سوال ۔ سابقہ حدیث میں مِنْ اَصَابِعِ الرَّحْمٰن ہے اور حدیث الباب میں مِنْ اَصَابِعِ اللّٰہِ ہے اس میں کیا نکتہ ہے۔؟

جواب ۔ حدیث سابق میں مجرّد دعویٰ تھا پس اس کا مُقتضیٰ یہ ہے کہ صفتِ جمالی ذکر کی جائے اور یہاں بطور استدلال سائل کے سوال کا جواب ہے تو اس کا مُقتضیٰ ہے کہ اسم جلالی ذکر کیا جائے۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ !

وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰیؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَثَلُ الْقَلْبِ کَرِیْشَۃٍ بِاَرْضٍ فَلَاۃٍ یُقَلِّبُھَا الرِّیَاحُ ظَھْرَ الْبَطْنِ۔

ترجمہ : حضرت ابی موسیٰؓ فرماتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دل کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی پر کسی کھلے میدان میں پڑا ہوا ہو اور ہوائیں اس کو پیٹھ سے پیٹ اور پیٹ سے پیٹھ کی طرف پھیرتی رہتی ہیں ۔

قولہٗ کَرِیْشَۃٍ ۔ رِیش بمعنیٰ پَر یا بمعنیٰ شاخ ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ریش کی صفت اَرض بیان کی اس میں حکمت یہ ہے کہ جو ریش یا شاخ درخت پر لگی ہوئی ہو گی اس کی تقلیب قدرے مشکل ہوتی ہے بخلاف زمین پر پڑی ہوئی کے کہ اس میں تقلیب خوب سے خوب تر ہو گی ۔

قولہٗ فَلَاۃٍ ۔ بمعنیٰ خالی میدان ۔ یہ ارض کی صفت ہے کیونکہ بعض میدان زمین پر ہوتے ہیں مگر اس پر درخت ہوتے ہیں جن کی وجہ سے ہوا جو سبب تقلیب ہے رک کر آتی ہے ۔ بخلاف فلاۃ (خالی میدان) کے کہ اس میں ہوا کا دخول و خروج اچھے طریقہ پر ہوتا ہے

اس لیے فلاۃ کو اَرض کی صفت بنایا ہے۔

قولہٗ ظَهْرًا لِبَطْنٍ ۔ یہ يُقَلِّبُهَا کی ضمیر سے بدل بعض واقع ہوا ہے اور لام بمعنیٰ الیٰ ہے۔ اصل میں عبارت تھی "ای من ظهر الیٰ بطنٍ۔ کقولہٖ تعالیٰ "مُنَادِيًا يُنَادِىْ لِلْاِيْمَانِ۔ عند البعض مفعول مطلق ہے ای تَقْلِيْبًا ظَهْرَ الْبَطْنِ۔ یاحال مُقدرہ ہے" ای يُقَلِّبُهَا مُخْتَلِفَةً"۔

خُلَاصَةُ الحَدِيث

اس حدیث میں نبی کریم علیہ السلام نے صفت عجیبۃ الشان بیان کی ہے کہ ریش کو ہوائیں کبھی تو پیٹ کے بل کبھی پیٹھ کے بل پھیرتی رہتی ہیں۔ یہی حال انسانی دلوں کا ہے کہ وہ کبھی برائی سے بھلائی کی طرف رخ کر لیتے ہیں اور کبھی بھلائی سے برائی کے راستہ پر جا لگتے ہیں۔

یقول ابوالاسعاد : صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ دل گویا پتا ہے، دنیا فلاۃ ہے اوراچھی وبری صحبتیں تیز ہوائیں ہیں۔ اگر یہ پتّا کسی بھاری پتھر کے نیچے آجائے تو ہواؤں کی زد سے محفوظ رہتا ہے اسی طرح انسان اگر کسی اچھی صحبت والے شیخ کی پناہ میں آجائے تو بے دینی سے محفوظ رہتا ہے۔ چنانچہ بیعتِ مرشد کا بھی یہی منشاء ہوتا ہے۔

وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتّٰى يُؤْمِنَ بِاَرْبَعٍ يَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ بَعَثَنِىْ بِالْحَقِّ وَيُؤْمِنُ بِالْمَوْتِ وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ وَيُؤْمِنُ بِالْقَدْرِ ۔

ترجمہ : حضرت علیؓ فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اس وقت تک بندہ مؤمن نہیں ہوتا۔ جب تک چار باتوں پر ایمان نہ لائے۔ گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور میں اللہ کا رسول ہوں مجھے اللہ تعالیٰ نے حق کے ساتھ بھیجا اور مرنے اور مرنے کے بعد اٹھنے اور تقدیر پر ایمان لائے۔

قولہٗ يَشْهَدُ : يَشْهَدُ کو مرفوع پڑھو تو یہ اَرْبَعٍ کی تفصیل ہو گی۔ چار کیا ہیں

شہادت وغیرہ اگر منصوب پڑھو تو پھر اَرْبَع سے بدل ہے چار کیا ہیں ؟۔

قولہٗ بَعَثَنِیْ بِالْحَقِّ ۔ یہ حال مؤکدہ ہے رَسُوْلُ اللّٰہِ سے معنیٰ ہوگا بیشک میں اللہ کا رسول ہوں حال ہونے اس اللہ کے کہ اس نے مجھے حق کے ساتھ بھیجا یا یہ خبر بعد از خبر ہے "یَشْهَدُ اَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ یَشْهَدُ بَعَثَنِیْ بِالْحَقِّ۔

قولہٗ یُؤْمِنُ بِالْمَوْتِ ۔ موت پر ایمان لانا۔

سوال : موت پر ایمان تو ہر ایک کو ہے حتیٰ کہ کافر اور دھری کو بھی ہے ۔

جواب اوّل ۔ موت سے مراد موت العالم ہے کہ اس بات کو یقینی جانے کہ اس دنیا کی تمام زندگی عارضی وفانی ہے کہ دونوں جہان ایک دن فنا ہو جائیں گے ۔

جواب دوّم ۔ یا اسباب موت کی نفی کرنی ہے کہ موت کا ایک دن مقرر ہے اور خدا کے حکم سے آتی ہے ۔ بیماری یا حادثہ یا تکلیف موت کا حقیقی سبب نہیں بلکہ یہ چیزیں بادیُ النظر میں ظاہری اسباب ہوتے ہیں۔ کسی انسان کی زندگی اور موت کُلیۃً خدا کے ہاتھ میں ہے یعنی مقصود تردیدِ فلاسفہ ہے ۔

وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ صِنْفَانِ مِنْ اُمَّتِیْ لَیْسَ لَهُمَا فِی الْاِسْلَامِ نَصِیْبٌ اَلْمُرْجِئَةُ وَالْقَدَرِیَّةُ ؛

ترجمہ : حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ میری اُمت میں دو فرقے ایسے ہیں جن کو اسلام کا کچھ حصّہ نصیب نہیں ۔ اور وہ مُرجیہ وقدریہ ہیں ۔

قولہٗ نَصِیْبٌ ۔ یہ نکرہ ہے اور تحتَ النفی ہے یُفِیْدُ العُمُوْمَ مُطلقًا اسلام میں حصّہ نہیں ۔

خُلَاصَةُ الْحَدِیْث

اس حدیث میں دو جماعتوں کے متعلق پیشگوئی کرکے ان کی مذمت کی گئی ہے ۔ اور بتایا گیا ہے کہ وہ اسلام کی طرف اپنے آپ کو منسوب کریں گے حالانکہ اسلام میں ان کا کوئی حصّہ نہ ہوگا

یہ دو جماعتیں مُرجیہ اور قدریہ ہیں۔ ان کی تعریف تفصیلاً ایمان کی بحث میں گذر چکی ہے۔ مگر اجمالاً دوبارہ پیشِ خدمت ہے۔

تعریف مُرجیّہ ۔ ارجاء بمعنی تاخیر سے مشتق ہے کیونکہ یہ اعمال کو درجۂ اعتبار سے مؤخر اور پیچھے ڈالتے ہیں کہ ایمان کی بالکل ضرورت ہی نہیں۔ اور ان کا یہ مذہب بھی ہے کہ بندہ کو کسی قسم کا اختیار نہیں وہ مجبورِ محض ہے۔ اور مُرجیہ سے مراد جبریہ ہیں۔

تعریف قدریہ ۔ قدریہ سے مراد وہ فرقہ ہے جو تقدیر کا منکر ہے اور انکارِ تقدیر میں بہت بحث کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنے افعال کے خلق کی قدرت تامہ دے رکھی ہے۔

فائدہ ۔ جبریہ اور قدریہ کے متعلق سلف میں دو آراء ہیں بعض نے ان کی تکفیر کی ہے کیونکہ ایمان بالقدر دین کے بنیادی اصولوں میں سے ہے لیکن حافظ ابن حجرؒ کے نزدیک کافر نہیں بلکہ فاسق، فاجر اور گمراہ ہیں۔ علامہ توربشتیؒ فرماتے ہیں کہ ان کی تکفیر پر عجلت نہ کرنی چاہیئے۔ لیکن ان دونوں اقوال پر سوال ہوتے ہیں۔

سوالِ اوّل ۔ اگر ان کی تکفیر کی جائے جیسا کہ بعض حضرات کا قول ہے تو سوال یہ ہے کہ حدیث پاک میں ان کو حضور علیہ السلام کی اُمّت میں سے قرار دیا گیا ہے اور فرمایا "صِنْفَانِ مِنْ اُمَّتِیْ"۔

جوابِ اوّل ۔ اُمّت کی دو قسمیں ہیں ۱ اُمّتِ دعوت ۲ اُمّتِ اجابت۔ اور ان کو اُمّتِ دعوت قرار دیا ہے۔ اُمّتِ دعوت کے اعتبار سے نہ کہ اُمّتِ اجابت سے۔

جوابِ دوّم ۔ بعض علماء کے نزدیک اس حدیث کی صحت پر کلام ہے جیسا کہ آرہا ہے۔

سوالِ دوّم ۔ اگر ان کو صرف فاسق، فاجر اور مُبتدِع ہی کہا جائے تو سوال یہ ہے کہ حدیث میں تو کہا گیا ہے کہ "لَيْسَ لَهُمَا فِی الْاِسْلَامِ نَصِيْبٌ"۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔

جواب اوّل ۔ یہ ہے کہ لَیْسَ لَھُمَا فِی الْاِسْلَامِ نَصِیْبٌ میں نصیب سے مُراد نصیبِ کامل ہے ۔ یعنی یہ کامل مُسلمان نہیں ہیں بلکہ مُطلق مُسلمان ہیں ۔ کمَا یقال لَیْسَ لِلْبَخِیْلِ مِنْ مَّالِہٖ نَصِیْبٌ ۔

جواب دوّم ؛ یہ حدیث زجر و تغلیظ پر محمُول ہے " کمَا فِی الْحَدِیْثِ لَاصَلٰوۃَ لِجَارِ الْمَسْجِدِ اِلَّا فِی الْمَسْجِدِ ۔ !

یقول شیخ جَاجَروِیْ رحمہُ القوی : حضرت پیرانِ پیر شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃُ اللہ عنہ نے اپنی کتاب غُنیۃ الطّالبین میں جن گمراہ فرقوں کا ذکر کیا ہے ان میں مرجئہ کو بھی شمار کیا ہے اور ساتھ ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ حنفیہ مرجئہ ہیں اس لیے مُعتزلہ استدلال قائم کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حنفیہ گمراہ ہیں کیونکہ حضرت پیران پیر نے ان کو گمراہ کہا ہے ۔

جواب اوّل عند البعض غُنیۃ الطّالبین میں لوگوں نے اپنی طرف سے کافی اندراج کیا ہے ۔ کما فی زمننا ۔ لہٰذا یہ حضرت کی کلام نہیں بلکہ بعد کا اندراج ہے ۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ حضرت کی کلام کو لوگوں نے صحیح طریقہ پر سمجھا ہی نہیں دراصل حقیقت یہ ہے کہ حضرت نے تمامی اَحناف کو مُرجئہ میں شمار نہیں کیا بلکہ بعض حنفیہ جو فروعًا تو حنفی تھے لیکن اصولاً مُرجئہ کی طرف میلان رکھتے تھے ، یا مُعتزلہ کی طرف رجوع رکھتے تھے ۔ جیسے علامہ زمخشریؒ وغیرہم تو ان کو مرجئہ میں شمار کیا ہے ۔ چنانچہ غُنیۃ الطالبین ص۱۰۳ میں لکھتے ہیں " و بعض من الحنفیۃ الخ " لہٰذا حضرت کی عبارت سے خود اس بات کی تصریح ہوگئی کہ یہ حکم جمیع اَحناف پر نہیں لگایا جا سکتا ۔

جواب دوّم جس حدیث سے دلیل پکڑی گئی ہے وہ حدیث ہی ضعیف ہے چنانچہ امام ترمذیؒ نے کتابُ الایمان بالقدر میں اس حدیث کو ضعیف کہا ہے کیونکہ اس میں علی بن نزار اور اس کا باپ دونوں راوی ضعیف ہیں ۔ فَلَا اشکال علیہ

ترجمہ : حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرماتے ہوئے سنا کہ میری امت	وَعَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ یَکُوْنُ فِیْ

أُمَّتِيْ خَسْفٌ وَمَسْخٌ وَذَالِكَ فِي الْمُكَذِّبِيْنَ بِالْقَدْرِ۔	زمین میں دھنس جانا اور صورتوں کا مسخ ہوجانا بھی ہوگا اور یہ عذاب ان لوگوں پر ہوگا جو تقدیر کے منکر ہیں۔

قولہٗ خَسْفٌ ۔ اَلْخَسْفُ هُوَالتَّغَيُّوْبَةُ فِي الْاَرْضِ : یعنی زمین میں غائب ہونا یا زمین میں دھنس جانا۔

قولہٗ مَسْخٌ ۔ وَالْمَسْخُ تَحْوِيْلُ صُوْرَةٍ اِلٰى مَا هُوَ اَقْبَحُ مِنْهَا ۔ مسخ کے معنیٰ ہیں اپنی اصل صورت وشکل کو بدترین شکل وصورت میں تبدیل کر دینا۔

یقول ابوالاسعاد : یہ عذاب مکذبین تقدیر کے لیے جزاءً من جنس العمل کے طور پر ہے اس لیے کہ یہ لوگ تمام افعال کو غیر اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں تو گویا انہوں نے افعال کو جو اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں مٹا دیا، اور اس کی صورت کو بگاڑ دیا تو اللہ تعالیٰ بھی ان کو زمین کے نیچے دبا کر مٹا دیتے ہیں اور ان کی صورت بگاڑ دیتے ہیں۔

سوال : کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دُعا کی کہ اے اللہ میری اُمّت کو خسف ومسخ سے بچانا پھر فرمایا کہ دعا قبول بھی ہوگئی ہے مگر اس حدیث میں اس کے خلاف ہے۔

جواب اوّل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے ظاہری وصوری خسف ومسخ تو اٹھ گیا۔ یہاں جو ثابت ہے یا کیا گیا ہے وہ معنوی خسف ومسخ ہے یعنی باعتبار قلوب کے ہے۔ فَلَا تَعَارُضَ۔

جواب دوم : نفی کی حدیث اصل ہے اور یہ حدیث زجر وتهدید پر محمول ہے۔

جواب سوم عمومی طور پر خسف ومسخ امت محمدیہ پر نہ ہوگا۔ ہاں خصوصًا منکرین تقدیر پر قربِ قیامت میں خسف ومسخ ہوگا۔ عند البعض حدیث باب بطورِ شرط وجزاء کے ہے۔ یعنی اگر میری اُمّت میں خسف ومسخ ہوتا تو اس فرقہ منکرین تقدیر پر ہوتا۔ جب ان پر نہیں ہوا تو کسی پر نہیں ہوگا۔

وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْقَدَرِيَّةُ مَجُوْسُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِنْ مَرِضُوْا فَلَا تَعُوْدُوْهُمْ وَاِنْ مَاتُوْا فَلَا تَشْهَدُوْهُمْ۔

ترجمہ: روایت ہے انہی سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ قدریہ فرقہ اس امت کے مجوس ہیں۔ لہذا اگر وہ بیمار ہوں تو ان کی عیادت کے لیے نہ جاؤ۔ اور اگر وہ مرجائیں تو ان کے جنازہ میں بھی نہ جاؤ۔

قولہ مَجُوْسُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ۔ اس جملہ کی وضاحت سے قبل مجوس کی حقیقت واضح ہوجانے۔ مجوس ایک آگ پرست قوم ہے جو دو خدا مانتی ہے ایک وہ خدا جو نیکی اور بھلائی کا پیدا کرنے والا ہے اس کو یزدان کہتے ہیں۔ دوسرا وہ خدا جو برائی اور بدی کا پیدا کرنے والا ہے اس کو اہرمن یعنی شیطان کہتے ہیں۔

سوال۔ مجوس کے ساتھ قدریہ کو کس بات میں مشابہت ہے یعنی وجہ تشبیہ کیا ہے؟

جواب۔ مجوس کے ساتھ وجہ تشبیہ تعدد الٰہ میں ہے کہ جس طرح مجوس تعدد الٰہ کے قائل ہیں کہ خالق خیر اور خالق شر اور ہے۔ اسی طرح قدریہ ہیں کیونکہ وہ بھی بے انتہا خالقوں کے قائل ہیں۔ اس لیے کہ ان کے نزدیک ہر بندہ اپنے افعال کا خالق ہے تو جتنے بندے زیادہ ہوتے جائیں گے خالق بھی اتنے بڑھتے جائیں گے۔ ولھذا یقال القدریۃ مجوس ھذہ الامۃ۔

حضورِ جنازہ وعیادت کا حکم

وہ حضرات جو اس جماعت کو کافروں کے زمرہ میں شمار کرتے ہیں وہ اس حدیث کو ظاہر پر محمول کرتے ہیں، اور ہر قسم کے امور دینی و دنیوی سے منع کرتے ہیں۔ لہٰذا عیادت و حضورِ جنازہ بھی منع ہے۔ بعض حضرات کافر نہیں بلکہ فاسق و فاجر کہتے ہیں۔ وہ اس حدیث کی دو تاویلیں کرتے ہیں۔ اوّل یہ حدیث زجر و تهدید پر محمول ہے۔ دوم یہ کہ اس حدیث کا مقصد اس جماعت کی گمراہی و ضلالت بیان کرنا ہے۔

یقول ابوالاسعاد : محققین حضرات کے نزدیک عنیاد اسی میں ہے کہ عدم عیادت وعدم حضور جنازہ پر عمل کیا جائے کیونکہ شریعت مقدسہ کا مطلوب ومقصود بھی اسی میں ہے کہ ان سے ہر قسم کا مقاطعہ ہو اور ہر قسم کا بائیکاٹ ہو۔ تاکہ وہ تنگ آکر توبہ کرلیں۔ بائیکاٹ بڑا مکمل علاج ہے۔ رب تعالیٰ نافرمان بیویوں کے متعلق فرماتے ہیں۔ وَاهْجُرُوهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ یہ بھی ایک قسم کی نصیحت کا باب ہے۔

وَعَنْ عُمَرَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُجَالِسُوا أَهْلَ الْقَدَرِ وَلَا تُفَاتِحُوهُمْ

ترجمہ : روایت ہے حضرت عمرؓ سے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قدریوں کے ساتھ نشست وبرخاست نہ رکھو، نہ ان سے کلام کی ابتداء کرو۔

قولہ وَلَا تُفَاتِحُوهُمْ ۔ اس جملہ کے کئی معانی بیان کیے گئے ہیں۔

۱ : یہ فتاحۃ (بکسرۃ وبفتحۃ) بمعنی فیصلہ۔ کما فی قولہ تعالیٰ "رَبَّنَا افْتَحْ" یعنی ان کے پاس فیصلہ کے لیے مت جاؤ کہ یہ تمہارے حاکم ہوں۔

۲ : ان سے ابتداء بالسلام اور ابتداء بالکلام نہ کرو۔

۳ : جو زیادہ راجح ہے کہ ان سے مناظرہ نہ کرو۔ کیونکہ بحث مباحثہ سے عام طور پر وقت ضائع ہوتا ہے اور فائدہ بہت کم ہوتا ہے۔ پھر ہر آدمی مناظرہ کے قابل بھی نہیں ہوتا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ خود باطل سے متاثر ہوجائے۔ اسی لیے عوام الناس کے لیے یہی حکم ہے کہ باطل سے بحث مباحثہ نہ کریں بلکہ کہدیں کہ محقق علماء کے سامنے اپنے شبہات پیش کرو۔ کما فی قولہ تعالیٰ وَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۔ (پ)

وَعَنْ عَائِشَةَؓ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سِتَّةٌ لَعَنْتُهُمْ وَ

ترجمہ : روایت ہے حضرت عائشہؓ سے فرماتی ہیں کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھ آدمی ہیں جن پر میں نے اور اللہ نے

وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ وَكُلُّ نَبِيٍّ يُجَابُ الزَّائِدُ فِي كِتَابِ اللّٰهِ وَالْمُكَذِّبُ بِقَدَرِ اللّٰهِ :	لعنت کی، اور ہر نبی مقبول الدعا ہے - اللہ کی کتاب میں زیادتی کرنے والا، اللہ کی تقدیر کا انکار کرنے والا۔

قولہٗ لَعَنْتُهُمْ - شریعت مقدسہ کے اندر واضح کفر پر لعنت کرنے کی اجازت ہے یا جس کی لعنت شرعاً منقول ہو۔ یہاں شرعاً لعنت منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ لعنت فرما رہے ہیں۔

قَوْلُهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ - یہ جملہ یا تو بد دعائیہ ہے کہ اللہ پاک بھی لعنت کرے۔ یا یہ جملہ مستانفہ ہے اور قانون ہے کہ جملہ مستانفہ سوال مقدر کا جواب ہوتا ہے۔

سوال : یہ ہے کہ آپ نے لعنت کیوں کی ؟ حالانکہ آپ فرماتے ہیں " اِنِّیْ لَا اُبْعَثُ لَعَّانًا : **جواب** : یہ کہ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ وَكُلُّ نَبِيٍّ يُجَابُ کہ پہلے اللہ نے لعنت کی، پھر نبیؐ نے آمین کہی۔ اور آمین دعا ہے اور ہر نبی کی دعا قبول ہوتی ہے اس لیے میں لَعَنْتُهُمْ کہ رہا ہوں۔

قولہٗ اَلزَّائِدُ فِي كِتَابِ اللّٰهِ - ان چھ شخصوں میں سے پہلا شخص کتاب اللہ میں زیادتی کرنے والا ہے۔ اور زیادتی سے مراد تحریف ہے۔ تحریف فی کتاب اللہ کی تین صورتیں ہیں۔ (۱) تحریف لفظی یعنی غیر متواتر لفظ زیادہ کردے یہ کفر ہے۔ (۲) معنیٰ میں ایسی تاویل کرے جس کا خود الفاظ قرآن انکار کرتے ہوں یہ بدعت ہے۔ (۳) قرأت شاذہ کو بحیثیت قرآن ظاہر کرے یہ حرام ہے۔ مثلاً "وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ" کو وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالصُّوْفِ الْمَنْفُوْشِ" اور سورۃ فاتحہ میں اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کو اِهْدِنَا صِرَاطًا مُسْتَقِيْمًا پڑھے۔ الخ۔

قولہٗ وَالْمُكَذِّبُ بِقَدَرِ اللّٰهِ - دوسرا شخص تقدیر کی تکذیب کرنے والا۔ کیونکہ تقدیر کا اعتقاد رکھنا وجود ایمان کے لیے ضروری ہے اس لیے جو شخص تقدیر کا انکار کرتا ہے وہ لعنت ہی کا مستحق ہے۔

قولہٗ وَالْمُتَسَلِّطُ بِالْجَبَرُوْتِ - اس کا معنیٰ زوری زور حکومت کرنے والا۔

خواہ وہ اپنے قہر و غلبہ سے حکومت حاصل کرے، یا باہر کی طاقت کے ذریعہ حکومت پر قابض ہو، دونوں مراد ہیں۔ یعنی لوگوں کی مرضی کے خلاف ان کے حاکم بننے والے۔ جیسا کہ آج کل علی العموم ہو رہا ہے۔

قولہٗ لِيُذِلَّ مَنْ اَعَزَّهُ اللهُ ۔ یہ تسلّط و جبروت کی عِلّت ہے۔ کہ جب ان لوگوں کی حاکمیّت قہر اور ظلم پر مبنی ہو گی تو لازمًا ان سے افعال بھی ایسے سرزد ہوں گے کہ ایسے آدمیوں کو معزز بنائیں گے جن کو اللہ تعالیٰ نے ذلیل کر رکھا ہو گا، اور معزز کو ذلیل کریں گے اور یہ ذلت اور عزّت والا مُعاملہ دینی اعتبار سے ہو گا۔ کہ وہ ظالم حاکم اپنے اغراض و مقاصد کی بنا پر حکومت و دولت کے نشہ میں خدا کے ان صالح بندوں اور مُسلمانوں کو ذلیل و خوار کرے گا۔ جو خدا کے نزدیک بڑی عزّت و عَظَمَت کے مالک ہوں گے اور ایسے کافروں، جاہلوں اور بدکاروں کو عزیز رکھے گا جو خدا کی نظر میں سخت ذلیل و بدکار ہوں گے۔

قولہٗ وَالْمُسْتَحِلُّ لِحَرَمِ اللهِ ۔ چوتھا وہ شخص جو ان چیزوں کو حلال سمجھتا ہے جو خدا کی جانب سے حرام کر دی گئی ہیں مثلاً بیتُ اللہ شریف (مکہ مکرمہ) میں جن باتوں کو خدا نے ممنُوع قرار دیا ہے جیسے کسی جانور کا شکار کرنا، درخت وغیرہ کا کاٹنا، یا بغیر احرام کے مکّہ مکرمہ میں داخل ہونا، ان کو وہ حلال سمجھتا ہو۔

قولہٗ وَالْمُسْتَحِلُّ مِنْ عِتْرَتِیْ مَا حَرَّمَ اللهُ : عِترت سے مراد قریبی رشتہ دار یعنی اولادِ فاطمہؓ جن کو سادات کہا جاتا ہے اس جملہ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں

مَطلبِ اوّل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں جن چیزوں کو خدا نے حرام کیا ہے ان کو حلال جانتا ہو، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد کی تعظیم کرنا ضروری ہے لیکن کوئی شخص نہ کرنے کو جائز سمجھے یا ان کو تکلیف پہنچانا حرام قرار دیا گیا ہے ان کو تکلیف پہنچانا حلال جانے تو اس پر بھی لعنت فرمائی گئی۔

مطلب دوم دوسرا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص میری اولاد سے ہونے کے باوجود ان افعال کو حلال جان کر کرتا ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے۔ اسی طرح مطلب ثانی کا مقصد سیّدوں کو تنبیہ کرنا ہے کہ یہ لوگ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد ہونے کے ناطے گناہ و معصیّت سے بچتے رہیں۔ اس لیے کہ دوسری

قوموں کے مقابلہ میں اس قوم کی معیت زیادہ تباہی کا باعث ہے کہ یہ [illegible] حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے۔ جیسا کہ مقولہ مشہور ہے۔ ع

چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

قولہ وَالتَّارِكُ لِسُنَّتِي ۔ چھٹا ملعون اس شخص کو قرار دیا گیا ہے جو سنت نبوی کا تارک ہو۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جو شخص سستی اور کسل کی بناء پر سنت کو ترک کرتا ہے تو وہ گناہ گار ہے اور جو شخص سنت کو نعوذ باللہ ناقابل اعتناء سمجھ کر چھوڑتا ہو تو وہ کافر ہے۔ لیکن اس لعنت میں دونوں شریک ہیں۔ مگر یہ کہا جائے گا کہ جو شخص از راہ کسل وسستی سنت کو چھوڑتا ہے اس پر لعنت کرنا زجر وتوبیخ کے لیے ہے۔ اور جو شخص ناقابل اعتناء سمجھ کر سنت کو ترک کرتا ہے اس پر حقیقتاً لعنت ہوگی۔

وَعَنْ مَطَرِ بْنِ عُكَامِسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا قَضَى اللهُ لِعَبْدٍ اَنْ يَمُوْتَ بِاَرْضٍ جَعَلَ لَهُ اِلَيْهَا حَاجَةً۔

ترجمہ: روایت ہے مطر بن عکامس سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے متعلق کسی زمین میں مرنے کا فیصلہ فرما دیتے ہیں تو اس کے لیے وہاں ضروری کام ڈال دیتے ہیں۔

قولہ إِذَا قَضَى اللهُ ۔ اس کا تعلق عند البعض ازل میں ہے یعنی إِذَا قَضَى اللهُ فی الازل۔ عند البعض دنیا میں اس وقت جب اس کو مارنا مقصود ہوتا ہے۔ یہ حدیث خلاصہ ہے یا اس میں اشارہ ہے قرآن پاک کی اس آیت کی طرف " وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ۔

قولہ عُكَامِسٍ ۔ بضم العین وکسر المیم: ان کا شمار کوفیوں میں ہوتا ہے ان سے صرف یہی حدیث ایک ہی منقول ہے اور ان کے صحابی ہونے میں بھی اختلاف ہے۔ ولہذا حدیث پر کلام ہوئی۔

وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَرَارِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ

ترجمہ: روایت ہے حضرت عائشہ سے فرماتی ہیں میں نے عرض کیا یا رسول اللہ مسلمانوں کے بچے کہاں جائیں گے

اس حدیث کی مکمل بحث مشکوٰۃ شریف ج ۱ باب الایمان بالقدر فصل اول حدیث عائشہ میں ہو چکی ہے۔ مگر یہاں ایک سوال ہے:

سوال حدیث پاک کی جزو اول اور جزو ثانی میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے کیونکہ جزو اول میں فرمایا اطفال مومنین اور اطفال مشرکین اپنے آباء کے تابع ہوں گے اور جزو ثانی میں فرمایا ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں کوئی یقینی بات نہیں بتائی گئی۔

جواب جزو اول احکام دنیا سے متعلق ہے۔ مثلاً میراث، صلوٰۃ جنازہ وغیرہ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تفصیل کے ساتھ نہیں فرمایا ان پہلے ہی بی بی عائشہ کو سوال پیدا ہوا کہ کیا بغیر عمل کے آباء کے تابع ہوں گے تو آپ نے ... امر دوسری کو اللہ کے حوالہ کر دیا۔

وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْوَائِدَةُ وَالْمَوْءُوْدَةُ فِي النَّارِ

ترجمہ: روایت ہے حضرت ابن مسعود سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زندہ دفن کرنے والی ماں اور زندہ دفن کی ہوئی بچی دونوں دوزخ میں ہیں۔

اگر وائدہ سے مراد والدہ ہو اور موؤدہ سے مراد زندہ درگور کی جانے والی بچی ہو تو اس صورت میں والدہ کا دوزخی ہونا تو ظاہر ہے کہ وہ کافرانہ عمل کر رہی ہے لیکن بچی تو مظلوم ہے ... کا سامان تیار کرنا چاہیے

سوال: یہ کہ اسے آگ میں کیوں ڈالا جائے گا؟ تو اس کے دو جواب ہیں۔

جواب : مَوْءُودہ اپنے والدین کے تابع ہوکر نار میں جائے گی۔

یقول ابوالاسعاد : جن علماء کے نزدیک مشرکین کی اولاد دوزخ میں جائیگی ان کے مذہب پر تو کوئی اشکال نہیں۔ البتہ جن حضرات کے نزدیک اولاد مشرکین کی بھی نجات ہوگی تو ان کے مذہب پر اشکال ہے اور یہ جواب ان کے خلاف ہے تو علماء حضرات نے اس کے مختلف جواب دیے ہیں۔

جواب اوّل : مَوْءُودَہ کے بارے میں یہ حدیث منسوخ ہے۔ ناسخ وہ حدیث ہے جس میں وَالوَئِيدُ فِي الجَنَّةِ آتا ہے۔ (مشکوٰۃ شریف ص۳۲۵ ج ۲)

جواب دوم : بعض حضرات نے حدیث کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ وائدہ سے مراد قابلہ (یعنی دائی) ہے اور الموؤدہ کا صلہ محذوف ہے یعنی المَوءُودَۃُ لَھَا والدہ یعنی وہ عورت مراد ہے جس نے جنا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ بچی کی والدہ اور قابلہ دونوں آگ میں جائیں گے کیونکہ ظلم کے کام میں معاون ہوئی تھی۔ عرب میں رواج تھا کہ ولادت کے وقت عورت کو ایک گڑھے میں بٹھا دیتے تھے۔ اگر بچہ ہوتا تو اسے رکھ لیتے، اگر بچی ہوتی تو اسے گڑھے میں پھینک کر اوپر سے مٹی ڈال دیتے تو چونکہ قابلہ برابر کی شریک ہوتی تھی اس لیے اس کو بھی عذاب ہوگا۔

اَلفَصلُ الثَّالِثُ

یہ تیسری فصل ہے۔

عَنْ اَبِی الدَّرْدَآءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ عَزَّوَجَلَّ فَرَغَ اِلٰی کُلِّ عَبْدٍ مِّنْ خَلْقِہٖ مِنْ خَمْسٍ مِّنْ اَجَلِہٖ وَعَمَلِہٖ وَمَضْجَعِہٖ وَاَثَرِہٖ وَرِزْقِہٖ :

ترجمہ : روایت ہے حضرت ابو الدرداءؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ یقیناً اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں ہر بندہ کے متعلق پانچ چیزوں سے فارغ ہو چکا ہے ۱ اس کی موت سے ۲ اس کے عمل سے ۳ اس کے رہنے کی جگہ سے۔ ۴ اس کی واپسی کی جگہ سے ۵ اور اس کے رزق سے۔

قولہٗ فَرَغَ اِلٰی ۔ اس مقام پر ایک سوال ہوتا ہے ۔
سوال : یہ کہ فَرَغَ کا باب لام کے ساتھ مُتعدّی ہوتا ہے مثال : سَنَفْرُغُ لَکُمْ اَیُّھَا الثَّقَلٰنِ : جبکہ یہاں اِلٰی ہے۔
جواب اوّل : یہ کہ اِلٰی بمعنیٰ لام ہے ۔
جواب دوّم : اِلٰی کو اپنے معنیٰ پر رکھو اور فراغ مُتضمّن ہے معنیٰ انتہا کو ۔ مطلب یہ ہے کہ فارغ ہو چکا ہے ہر بندے کی پیدائش سے ۔
قولہٗ مِنْ خَلْقِہٖ : یہ بدل ہے عبد سے ۔
قولہٗ مِنْ خَمْسٍ : یہ بدل ہے خلقہٖ سے ۔
قولہٗ مِنْ اَجَلِہٖ : یہ بدل ہے خَمْسٍ سے یا بیان ہے خمس کا ۔
قولہٗ مضجعہ : بمعنیٰ سکون وقرار ۔
قولہٗ اثرہٖ ۔ : بمعنیٰ حرکت ونشانِ قدم ۔ اور مراد کل حرکات وسکنات ہیں اور یہ بھی احتمال ہے کہ مَضجعہ سے مراد جائے قبر اور اَثرہٖ سے مُراد ثواب وعذاب اور جنّت ونار ہے ۔ یہ اشیاءِ خمسہ انسان کی پیدائش سے قبل ازل میں لکھ دی گئی تھیں گویا یہ تقدیری مسئلہ ہے ۔ یہ تشبیہ اس آیتِ قرآنی کے ساتھ دی " اِنَّ اللّٰہَ عِنْدَہٗ عِلْمُ السَّاعَۃِ وَیُنَزِّلُ الْغَیْثَ وَیَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ الخ (پ۲۱ لُقمان)

اسمائے رِجال

حضرت ابی الدرداءؓ کے حالات

آپ کا نام عُویمر ہے لیکن اس میں بہت اختلاف ہے ۔ بعض نے کہا ہے کہ اصل نام عامر ابن مالک ہے اور عویمر لقب ہے لیکن یہ اپنی کُنیّت ابُوالدرداءؓ سے مشہور ہیں ۔ درداء ان کی بیٹی کا نام ہے ۔ انصاری خزرجی ہیں یہ اپنے گھر والوں میں سب سے بعد میں ایمان لائے ، فقیہ ، عابد صحابی ہیں ۔ شام میں قیام فرمایا ۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت سے دو سال قبل ۳۲ھ میں دمشق میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہیں ۔

وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ تَكَلَّمَ فِيْ شَيْءٍ مِّنَ الْقَدَرِ سُئِلَ عَنْهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَمَنْ لَّمْ يَتَكَلَّمْ فِيْهِ لَمْ يُسْئَلْ عَنْهُ ۔

ترجمہ: روایت ہے بی بی عائشہ سے فرماتی ہیں میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ جو مسئلہ تقدیر میں بحث کرے گا اس سے قیامت میں اس کی باز پرس ہوگی، اور جو اس میں بحث نہ کریگا اس سے باز پرس نہ ہوگی۔

قولہ، مَنْ تَکَلَّمَ ۔ بعض حضرات نے مطلقاً کلام سے منع کیا ہے لیکن یہ غیر صحیح ہے کیونکہ مطلقاً منع سے کتمان لازم آتا ہے۔ دراصل جس کلام سے منع کیا گیا ہے وہ کلام بالعقل ہے یعنی عقلاً ممنوع ہے نہ کہ نقلاً۔ اب اس حدیث کا مقصد تقدیر کے مسئلہ میں غور وفکر اور تحقیق وتجسس سے منع کرنا ہے کہ خدا کے راز ہیں جو بندوں پر ظاہر نہ کرنا ہی مصلحت خداوندی ہے۔ اور یہ غور وفکر آخرت کے لیے کوئی کارآمد نہیں بلکہ اس مسئلہ میں تجسس خسران آخرت اور قیامت میں باز پرس کا باعث ہے۔ تو فلاح اسی میں ہے کہ تقدیر پر ایمان لائے اور عمل کرے۔

وَعَنِ ابْنِ الدَّيْلَمِيِّ قَالَ اَتَيْتُ اُبَيَّ بْنَ كَعْبٍ فَقُلْتُ لَهٗ قَدْ وَقَعَ فِيْ نَفْسِيْ شَيْءٌ مِّنَ الْقَدَرِ فَحَدِّثْنِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ اَنْ يُّذْهِبَهٗ مِنْ قَلْبِيْ ۔

ترجمہ: ابن دیلمی رض فرماتے ہیں کہ میں حضرت ابی بن کعب رض کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میرے دل میں تقدیر کے بارے میں کچھ شبہات پیدا ہو رہے ہیں اس لیے آپ کوئی حدیث بیان کیجیے شاید اللہ تعالی میرے دل کو اس شبہ سے پاک کر دے۔

قولہ وَقَعَ فِیْ نَفْسِیْ ۔ ای عقلاً لا نقلاً، کیونکہ ان کو عقلی اشکال پیش آئے۔

نقلاً نہیں - جب کہ نقلاً تقدیر میں کلام کرنے سے روک دیا گیا ہے -

قولہ اَن یَّاْتِیَ هٰذَا - اس سے معلوم ہوا کہ علماء و صالحین کی خدمت میں جانا اور ان سے مسائل پوچھنا اور اپنے شکوک دفع کرنا سنتِ صحابہؓ ہے " کما فی قولہ تعالیٰ فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ "

قولہ وَهُوَ غَیْرُ ظَالِمٍ - غیر ظالم کی وجہ یہ ہے کہ وہ ذات پاک سارے جہان کی مالک ہے - اور مالک اپنے مِلک میں جس طرح چاہے تصرف کر سکتا ہے -

قولہ کَانَتْ رَحْمَتُہٗ خَیْرًا لَّهُمْ - رحمت کو خیر اس لیے کہا کہ اعمال سبب ہیں مؤثر حقیقی نہیں، مؤثر حقیقی رحمتِ الٰہی ہے -

قولہ اَنَّ مَا اَصَابَکَ لَمْ یَکُنْ لِیُخْطِئَکَ - اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں جو کچھ حاصل ہوا اس کے بارہ میں یہ نہ کہو کہ اسے میں نے اپنی سعی و کوشش سے حاصل کیا ہے اور اگر کوئی چیز تمہیں نہ ملے تو یہ مت کہو کہ اگر یہ کوشش و جد و جہد کرتا تو ضرور اسے حاصل کر لیتا اس لیے کہ جو کچھ تم تک پہنچا ہے اس میں تمہاری سعی و کوشش کو دخل نہیں بلکہ وہ نوشتۂ تقدیر ہے - اور جو چیز تمہیں ملی تو وہ تمہارے مُقدر میں تھی جو نہیں ملی وہ تمہارے مُقدر میں نہ تھی یہ سب تقدیرِ الٰہی ہیں -

فائدہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو جہنم میں اور کفار کو جنت میں داخل کرنا عقلاً ممکن و جائز اور تحت القدرت ہے - اور حضرت عیسٰی علیہ السلام کے قول " اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُکَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ (پ۷) سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے لیکن شرعاً اس کا وقوع ناممکن ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اس کے خلاف اطلاع اور وعدہ دے چکے ہیں - اور خلافِ وعدہ و اخبار ناممکن ہے یہی مسئلہ امکانِ کذب کا حاصل ہے جو دراصل عموم قدرت کا مسئلہ ہے

وَعَنْ نَافِعٍ اَنَّ رَجُلًا اَتٰی اِبْنَ عُمَرَ فَقَالَ اِنَّ فُلَانًا یَقْرَاُ عَلَیْکَ السَّلَامَ فَقَالَ اِنَّہٗ بَلَغَنِیْ

ترجمہ روایت ہے حضرت نافعؒ سے کہ ایک شخص حضرت ابن عمرؓ کے پاس آیا بولا کہ فلاں آپ کو سلام کہتا ہے فرمایا

اَنَّهٗ قَدْ اَحْدَثَ فَاِنْ كَانَ قَدْ اَحْدَثَ فَلَا تُقْرِئْهُ مِنِّى السَّلَامَ ۔

میں نے سنا ہے کہ وہ بدعتی ہو گیا ہے اگر واقعی وہ بدعتی ہو گیا ہے تو اسے میرا سلام نہ کہنا ۔

قولہٗ قَدْ اَحْدَثَ ۔ عندالبعض حدث سے مطلق بدعت مراد ہے ۔ مگر صحیح قول کے مطابق تقدیر کے انکار کی بدعت مراد ہے یعنی وہ تقدیر کا منکر ہے اور قدریہ بن گیا ہے ۔ معلوم ہوا کہ قدریہ مذہب بڑا پرانا ہے ۔ صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں پیدا ہو چکا تھا۔

قولہٗ فَلَا تُقْرِئْهُ مِنِّى السَّلَامَ ۔ اس کا ایک معنیٰ تو یہ ہے کہ میں سلام قبول نہیں کرتا اگر میں قبول کر لوں تو وہ بدعتی ہے پھر مجھے جواب دینا پڑے گا ۔ عندالبعض معنیٰ ہو گا کہ مطلق میرا سلام نہ کہنا ۔ محدثینؒ نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کو کس طریق سے معلوم ہوا ہو گا کہ یہ شخص تقدیر میں بدعات کا موجد ہے ۔ اس لیے ان لوگوں سے میل جول اور تعلقات وغیرہ قائم کرنے سے حضرت نے روک دیا ہے ۔ چنانچہ علماء حضرات نے اس حدیث کی بناء پر اس بات کا حکم لگاتے ہیں کہ فاسق فاجر اور اہلِ بدعت پر اوّلاً سلام ہی نہ پڑھا جائے ۔ اگر اہلِ بدعات خود بخود سلام پڑھیں تو ان کے سلام کا جواب دینا واجب نہیں بلکہ سنت بھی نہیں ہے ۔ کیونکہ سلام اور جوابِ سلام ایک قسم کے دعائیہ کلمات ہیں جو صرف مؤمن مخلص کے لیے خاص ہیں نہ کہ منافق اور مبتدعین کے لیے ، اور ان دعائیہ کلمات میں ربِّ ذوالجلال نے مؤمن مخلص کی تعظیم اور محبت کا پہلو بھی مدِّنظر رکھا ہے تو تعظیم کے قابل اہلِ ایمان ہیں نہ کہ اہلِ بدعات ۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جس نے بدعتی کی تعظیم کی گویا اس نے خدا کو ناراض کر دیا ۔ یا فرمایا ۔ فَقَدْ هَدَمَ الدِّيْنَ یعنی اس نے میرے دین کو گرا دیا ۔

قولہٗ قَذْفٌ ۔ اَیْ مَطَرُ الْحِجَارَةِ : یعنی پتھروں کی بارش ۔

قولہٗ وَفِىْ حَدِيْثِ نَافِعٍ قَالَ التِّرْمِذِىُّ حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ غَرِيْبٌ ۔ مصنف علیہ الرحمۃ کے ان کلمات پر محدثین حضرات سے سوال کیا ہے ۔

سوال : حافظ جلال الدین سیوطیؒ نے قوت المغتذی میں لکھا ہے کہ ابن صلاحؒ سے

منقول ہے کہ ترمذی کے اس قول پر اشکال ہے کہ غریب حسن سے قاصر ہے پھر حسن صحیح سے قاصر ہے لیکن یہ سب جمع کس طرح ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ " لِاَنَّ فِی الْجَمْعِ بَیْنَهُمَا فِی حَدِیْثٍ وَاحِدٍ جَمْعَ بَیْنَ نَفِیْ ذَالِكَ الْقُصُوْرِ وَاِثْبَاتِہٖ "۔

جواب اوّل : یہ دو قسم کا حکم باعتبار دو اسناد کے ہے کہ حدیث واحد جب دو اسناد سے مروی ہو۔ ایک اسناد حسن، دوسری اسناد صحیح۔ تو وہاں حَدِیْثٌ حَسَنٌ صَحِیْحٌ کہنا بجا ہوگا۔

جواب دوّم : یہاں دونوں سے اصطلاحی معنیٰ مراد نہیں کہ جس سے تعارض ہو بلکہ حسن سے معنیٰ لغوی " اَیْ مَا تَمِیْلُ اِلَیْهِ النَّفْسُ وَلَا یَأْبَاهُ الْعَقْلُ " مراد ہے اور صحیح سے معنیٰ اصطلاحی مُراد ہے " اَیِ الصَّحِیْحُ هُوَ الْحَدِیْثُ الَّذِیْ یَکُوْنُ مُتَّصِلَ الْاِسْنَادِ مِنْ اَوَّلِہٖ اِلٰی مُنْتَهَاهُ بِنَقْلِ الْعَدْلِ الضَّابِطِ عَنْ مِّثْلِہٖ وَلَا یَکُوْنُ شُذُوْذًا وَلَا عِلَّةً "

جواب سوم : غریب دو قسم ہے۔ (۱) غَرِیْبٌ مِنْ جِهَةِ الْمَتْنِ (۲) وَغَرِیْبٌ مِنْ جِهَةِ الْاِسْنَادِ فَبِحَسْبِ الْمَتْنِ حَسَنٌ اَوْ صَحِیْحٌ وَبِحَسْبِ الْاِسْنَادِ غَرِیْبٌ فَالْمُرَادُ هٰهُنَا هُوَ الْقِسْمُ الثَّانِیْ مِنَ الْغَرِیْبِ۔

وَعَنْ عَلِیٍّ رضی اللہ عنہ قَالَ سَأَلَتْ خَدِیْجَةُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَنْ وَلَدَیْنِ مَاتَا لَهَا فِی الْجَاهِلِیَّةِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ هُمَا فِی النَّارِ:

ترجمہ : روایت ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرماتے ہیں کہ بی بی خدیجہ رضی اللہ عنہا نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے بچوں کے متعلق پوچھا جو زمانہ جاہلیت میں فوت ہو چکے تھے۔ حضور نے فرمایا کہ وہ دونوں آگ میں ہیں۔

قَوْلُهٗ لَاَبْغَضْتَهُمَا ۔ تمہیں ان سے محبت اور ان کے عذاب پر غم جبھی تک ہے کہ جب تک تم نے ان کا ٹھکانا نہیں دیکھا اگر دیکھ لیتیں تو البغض فی اللہ کے تحت تم بھی ان سے برأت کا اعلان کر دیتی۔ معلوم ہوا کہ جنتی ماں باپ اور دوزخی اولاد میں قطعًا محبت نہ ہوگی۔ وہاں محبت رشتہ ایمان سے ہوگی نہ کہ رشتۂ جان سے۔ باقی ذرار المشرکین کی بحث ہو چکی ہے۔

وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا خَلَقَ اللّٰهُ اٰدَمَ مَسَحَ ظَهْرَهٗ فَسَقَطَ عَنْ ظَهْرِهٖ کُلُّ نَسَمَةٍ هُوَ خَالِقُهَا مِنْ ذُرِّیَّتِهٖ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ [illegible]

ترجمہ: روایت [illegible] سے فرماتے ہیں فرمایا رسول [illegible] وسلم نے کہ جب [illegible] تعالیٰ نے [illegible] علیہ السلام کو پیدا کیا تو ان کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا چنانچہ ان کی پشت سے وہ تمام جانیں [illegible] جن کو آدم علیہ السلام کی اولاد میں [illegible] قیامت تک پیدا کرنے والا تھا۔

قولہ مسح ظہرہ — [illegible]

قولہ کل نسمۃ — [illegible] ہے۔

قولہ فسقط — [illegible] سے ظاہر ہوا [illegible] داخل نہیں کیونکہ [illegible] میں روح [illegible] ہوگی جب [illegible] روح [illegible] پیدا کیا گیا۔ یہ تمام کاروائی حضرت آدم علیہ السلام کو مطلع فرمانے کے لیے کی گئی تھی یہ بیان [illegible] سے [illegible]

قولہ وبیصا من نور — چمک: محدثین حضرات نے لکھا ہے کہ اس سے [illegible] مراد ہے یا فطری نور یعنی فطرۃ سلیمہ کا نور چہرے پر نمودار ہوا۔

قولہ فرأی رجلا منهم فاعجبہ: ان میں سے ایک شخص کو دیکھا تو ان کی آنکھوں کے درمیان کی چمک پسند آئی۔ [illegible] اتفاق ہے کہ رجل سے مراد سیدنا داؤد علیہ السلام ہیں۔

سوال — [illegible] ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے داؤد علیہ السلام کو پسند فرمایا [illegible] صلی اللہ علیہ وسلم کو کیوں نہیں پسند کیا، اس سے تو داؤد علیہ السلام کی فضیلت لازم آتی ہے جب کہ افضل البشر بعد الانبیاء ہمارے حضرت ہیں۔

جواب اول — اس موقع پر حق تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے [illegible] داؤد علیہ السلام کو ایک طرح کی امتیازی شکل وصورت میں ظاہر کیا تاکہ

اس کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السّلام سوال کریں اور اس سوال پر وہ صورت حال مُرتّب ہو جو آگے پیش آئی۔ حضرت آدم علیہ السّلام کا حضرت داؤد علیہ السّلام کو اپنی عمر میں ساٹھ سال دینا تو حضرت داؤد علیہ السّلام کے روشن ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ تمام صفات کمالیہ میں سب سے ترجیح رکھتے تھے۔

جواب دوم سوال بالکل وارد بھی نہیں ہوتا کیونکہ حدیث پاک میں یہ الفاظ ہیں " فَاَعْجَبَهٗ تو اعجاب (پسند) میں حسن کا ہونا ضروری نہیں حسن اور چیز پسند آنا کچھ اور لیلیٰ سے بڑھ کر حسینہ عورتیں اور بھی تھیں۔ مگر مجنوں کی آنکھ کا انتخاب اعجاب وہی ٹھہری، نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی۔ بعض دفعہ حبشی بھی اعجاب میں شامل ہو جاتے ہیں۔

یقول ابوالا سعاد : حضرت آدم علیہ السّلام میں خلافت و نبوّت دونوں جمع تھیں اور آدم علیہ السّلام کے بعد سب سے پہلے پیغمبر جو دونوں صفات کے جامع تھے وہ حضرت داؤدؑ ہیں۔ اس لیے حضرت داؤدؑ، حضرت آدمؑ کے زیادہ مشابہ تھے۔ اسی بنا پر نظر انتخاب ٹھہرے یہی وجہ ہے کہ ان دونوں ہستیوں کا لقب خلیفۃ الارض ہے۔ کما فی قولہٖ تعالیٰ " وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً (پ۱) يَا دَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ ۔ (پ۲۳ ص)

قولہٗ قَالَ رَبِّ زِدْهُ مِنْ عُمُرِيْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۔ عرض کیا مولا میری عمر میں سے چالیس سال انہیں بڑھا دے۔

سوال : یہ تو علمِ الٰہی میں ترمیم ہے۔

جواب : یہ ترمیم نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ داؤد علیہ السّلام کی عمر سو سال ہو گی۔ لیکن یہ مذکور شدہ درخواست کی صورت میں ہو گی۔ رہی آیۃ کریمہ " اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ (پ۱)، وہ اس حدیث کے خلاف نہیں۔ کیونکہ آیت میں تقدیرِ مُبرم یعنی علمِ الٰہی کا ذکر ہے اور یہاں تقدیرِ مُعلّق کی تحریر کا ذکر یا آیت کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے اختیار سے اپنی عمر کم و بیش نہیں کر سکتا۔

قولہٗ اَرْبَعُوْنَ سَنَةً : یعنی چالیس سال ابھی باقی ہیں۔

سوال مشکوٰۃ شریف ص۴۰۱ ج ۲ بابُ السّلام کتابُ الادب فصلِ ثالث میں روایت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السّلام کی اپنی عمر چالیس سال تھی۔

آدم علیہ السلام نے اپنی عمر میں سے ان کو ساٹھ سال دیے "وقال یا رب فانی قد جعلت لہ من عمری ستین سنۃ" لیکن حدیثِ باب میں اس کے برعکس ہے کہ داؤد علیہ السلام کی اپنی عمر ۶۰ سال تھی۔ پھر حضرت آدم علیہ السلام نے ان کو ۴۰ سال عطا کیے۔ لہٰذا دونوں میں تعارض ہے۔

جواب حضرت آدم علیہ السلام نے اولاً بیس سال اور پھر مزید چالیس سال کل ۶۰ سال دیے۔ اور حضرت داؤد علیہ السلام کی اپنی اصلی عمر چالیس سال تھی۔ نقص روایت میں جو اصلی عمر ۶۰ سال وارد ہوئی ہے۔ وہ آدم علیہ السلام کے عطا کیے ہوئے بیس سال سمیت ہے۔ فاندفع التعارض۔

قولہٗ فَجَحَدَ اٰدَمُ۔ یعنی حضرت آدم علیہ السلام انکاری ہوئے۔ اس بات پر محدثین کا اتفاق ہے کہ آدم علیہ السلام نے صریحاً یہ بات نہیں کہی تھی کہ میں نے اپنی عمر سے داؤد علیہ السلام کو کچھ نہیں دیا اور صریحاً انکار ممکن بھی نہ تھا کیونکہ انبیاء علیہم السلام کی زبان سے کوئی جھوٹ قصداً اور صریحاً صادر نہیں ہوتا۔ لہٰذا کہا جائے گا کہ حضرت آدم علیہ السلام کا انکار بطور تعریض تھا۔ جیسا کہ بعض صورتیں اس طرح دیگر انبیاء کرامؑ سے ثابت ہیں " کما فی قصۃ سیدنا ابراھیم علیہ السلام "فَلَمَّا جَنَّ عَلَیْہِ الَّیْلُ رَاٰ کَوْکَبًا قَالَ ھٰذَا رَبِّیْ الخ رپ انعام)

قولہٗ فَجَحَدَتْ ذُرِّیَّتُہٗ۔ کیونکہ "اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیْہِ" جو صفت والدین تھی وہی اولاد میں بھی رہے گی گویا کہ یہ سب واقعات تقدیری ہیں ایمان لانا ضروری ہے۔

وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَآءِ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ خَلَقَ اللّٰہُ اٰدَمَ حِیْنَ خَلَقَہٗ فَضَرَبَ کَتِفَہُ الْیُمْنٰی فَاَخْرَجَ ذُرِّیَّۃً بَیْضَآءَ کَاَنَّھُمُ الذَّرُّ وَضَرَبَ کَتِفَہُ الْیُسْرٰی فَاَخْرَجَ ذُرِّیَّۃً سَوْدَآءَ کَاَنَّھُمُ الْحُمَمُ

ترجمہ: روایت ہے حضرت ابوالدرداءؓ سے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو ان کے داہنے کندھے پر دستِ قدرت لگایا جس سے سفید رنگ کی اولاد چیونٹیوں کی طرح نکالی، اور ان کے بائیں کندھے پر دستِ قدرت مارا تو کالی اولاد کوئلہ کی طرح نکالی۔

قولہٗ حِیْنَ خَلَقَہٗ ۔ یہ ظرف ہے اور خَلَقَ اللہُ کے متعلق ہے۔ اور یہ اشارہ ہے، حضرت کے عدم علم کی طرف کہ مجھے پتا نہیں کہ مخلوق کب پیدا ہوئی۔ دوئم: یا حِیْنَ خَلَقَہٗ متعلق ہے فَضَرَبَ مؤخر کے۔

سوال: یہ کہ فاء کا مابعد ماقبل میں عمل نہیں کرتا یہاں پر کیسے عمل کر رہا ہے۔

جواب: حِیْنَ خَلَقَہٗ ظرف ہے اور ظروف میں وسعت ہوتی ہے "اَلظُّرُوْفُ یتوسّع فیہ مالا یتوفی غیرہ:

قولہٗ کتفہ الیمنیٰ: یہ از قبیلِ متشابہات ہے۔ کیونکہ رب تعالیٰ مٹھی کے ظاہری معنیٰ سے پاک ہیں۔

قولہٗ ذُرِّیَّۃً بَیْضَآءَ ۔ ای نورانیۃ: اس سے مؤمنین مُراد ہیں؛ کما فی قولہٖ تعالیٰ " یَوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْہٌ "۔

قولہٗ کَاَنَّھُمُ الذَّرُّ ۔ ذال کے فتحہ کے ساتھ۔ عند البعض ذر بمعنیٰ صغار النحل و عند البعض نمل۔ مگر تشبیہ جسامت و صِغر یعنی چھوٹا ہونے میں ہے کیونکہ ہیئت تو انسانی تھی کچھ حضرات نے لَون میں بھی تشبیہ دی ہے۔

قولہٗ سَوْدَآءَ ۔ ای الظلمۃ اس سے کافر مُراد ہیں۔ کما فی قولہٖ تعالیٰ " وَتَسْوَدُّ وُجُوْہٌ "۔

قولہٗ کَاَنَّھُمُ الحُمَمُ: بمعنیٰ جمرہ یعنی انگارا جو زیادہ جَل کر سیاہ ہو چکا ہو جیسے کوئلہ ہوتا ہے یہ تشبیہ بھی رنگت میں ہے۔

سوال: حضرت ابوہریرہؓ کی سابق روایت میں ہے " وَجَعَلَ بَیْنَ عَیْنَیْ کُلِّ اِنْسَانٍ وَبِیْضًا مِنْ نُوْرٍ ؛ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام بنی آدمؑ خواہ دائیں مونڈھے سے نکالے گئے یا بائیں مونڈھے سے، سب کے چہرے کے سامنے چمک تھی۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بائیں مونڈھے سے جو نکالے گئے وہ سیاہ تھے۔ لہذا دونوں روایتیں متعارض ہیں۔

جواب: اس میں تطبیق یوں ہے کہ پہلی روایت میں فطرت سلیمہ کی طرف اشارہ ہے، جس میں کافر مسلم سب مشترک ہیں۔ جب کہ حدیثِ باب میں ذُرِّیَّۃً بَیْضَآءَ

سے ایمان کا نور، ذُرِیَّۃً سَوْدَآءَ سے کفر کی ظلمت مراد ہے فَلَا تَعَارُضَ۔

قولہٗ وَلَا اُبَالِیْ ۔ مجھے اس بات کی پرواہ نہیں کہ کون کیسے اعمال کرے، کون کہاں جائے میں غَنِیٌّ عَنِ الْعَالَمِیْنَ ہوں۔ عند البعض وَلَا اُبَالِیْ کا تعلق دخول جنّت ونار سے ہے یعنی مخلوق کے جنّتی ہونے سے ہمارا کچھ نفع نہیں، اور جہنّمی ہونے سے کچھ نقصان نہیں خود ان کا ہی نفع ونقصان ہے۔ ثانیًا اس بات کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں اعمال امارات ہیں جنت کے لیے نہ کہ موجبات اور جنّت میں جانا فضل ہے نار میں داخل کرنا عدل ہے۔

وَعَنْ اَبِی النَّضْرَۃَ رض اَنَّ رَجُلًا مِّنْ اَصْحَابِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُقَالُ لَہٗ اَبُوْ عَبْدِ اللّٰہِ دَخَلَ عَلَیْہِ اَصْحَابُہٗ یَعُوْدُوْنَہٗ وَھُوَ یَبْکِیْ فَقَالُوْا مَا یُبْکِیْكَ اَلَمْ یَقُلْ لَّكَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خُذْ مِنْ شَارِبِكَ ثُمَّ اَقِرَّہٗ حَتّٰی تَلْقَانِیْ قَالَ بَلٰی۔

ترجمہ: روایت ہے حضرت ابی نضرہؓ سے کہ حضور علیہ السّلام کے صحابہؓ میں سے ایک صاحب جنہیں ابو عبد اللہؓ کہا جاتا تھا ان کی بیمار پرسی کے لیے ان کے ہاں گئے وہ رو رہے تھے۔ تو یہ حضرات بولے کیوں روتے ہو کیا تم سے حضور علیہ السّلام نے یہ نہ فرمایا تھا کہ اپنی مونچھیں کٹواؤ، پھر اس کے پابند رہو۔ یہاں تک کہ تم مجھے ملو وہ بولے ہاں۔

خُلَاصَۃُ الْحَدِیْث

مختصرًا عرض ہے کہ حضرت ابو عبد اللہ صحابیؓ بیمار ہوئے، ان کے کچھ دوست واحباب مزاج پرسی کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو دیکھا کہ وہ رو رہے ہیں۔ ان لوگوں نے یہ کیفیت دیکھ کر کہا کہ آپ کو سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحابیت کا شرف حاصل ہے۔ اور پھر مزید یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ سے یہ فرمایا تھا کہ تم اپنی مونچھوں کو پست یعنی ہلکی کراتے رہنا اور اسی پر قائم رہنا۔ یہاں تک کہ حوض کوثر پر یا جنّت میں مجھ سے تم ملاقات کرو تو گویا

آپ کو جنت میں سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی بشارت دی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ جنت میں داخل ہونا اور اس عظیم سعادت سے بہرہ ور ہونا بغیر اسلام کے نہیں ہو سکتا تو معلوم ہوا کہ آپ کا خاتمہ بالخیر ہوگا اور آپ ایمان و اسلام کے ساتھ اس دنیا سے کوچ کریں گے۔ لہذا پھر روتا کیوں ہے، اور یہ فکر و غم کیسا۔ اس کا جواب مَردِ حق آگاہ نے یہ دیا کہ تمہارا کہنا صحیح و بجا ہے اور اس بشارت کی صداقت کا اعتقاد بھی ہے۔ لیکن پروردگارِ عالم بے نیاز ہے وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اس کی مرضی میں کسی کا دخل نہیں ہے۔ اور پھر خدا تعالیٰ نے خود یہ فرمایا ہے کہ میں جسے چاہتا ہوں جنّت کی سعادت سے نوازتا ہوں، اور جسے چاہوں دوزخ کے حوالہ کر دوں، اور مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے تو مجھے یہ خوف کھائے جا رہا ہے کہ نا معلوم میرا کیا حشر ہوا اور دل اس خوف سے لرزاں اور آنکھیں ڈر سے اشک بار ہیں کہ نہ جانے خدا تعالیٰ نے میرے مقدّر میں کیا لکھ رکھا ہے۔

قولہٗ وَهُوَ يَبْكِي ۔ مَوت کے خوف یا بیماری کی تکلیف سے نہیں بلکہ خوفِ خدا سے رو رہے تھے۔ جیساکہ اگلے مضمونِ حدیث سے ظاہر ہے۔ اس وقت یہ حالت اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت ہے۔

قولہٗ خُذْ مِنْ شَارِبِكَ ۔ مونچھیں کٹوانے کی بحث فطرت والے امور میں آئے گی۔ اتنا عرض ہے کہ قص کروانا امامِ اعظمؒ کے نزدیک سنّت مؤکدہ ہے۔ باقی مقدار یہ ہے کہ اوپر کے ہونٹ کا سارا کنارہ کھل جائے اور صاف نظر آنے لگے۔ اِس سے معلوم ہوا کہ اتباعِ سنّت جنّت کی کنجی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قرب کا ذریعہ ہے۔ جیساکہ ترکِ سنّت کی عادت حضور علیہ السلام سے دوری و بُعد کا سبب ہے۔ اَللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا مِنْهُمْ۔

قولہٗ ثُمَّ أَقِرَّهُ ۔ بفتح الهمزة وكسر القاف وتشديد الراء: اى دم عليه۔ یعنی پھر اس قص (مونچھیں کاٹنے) پر مواظبت کر اور مستقل رہنا۔

قولہٗ حَتّٰى تَلْقَانِي ۔ اى على الحوض : اب اس مقام پر سوال ہوتا ہے۔

سوال ، یہ کہ اس صحابیِ رسول کو قیامت کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مل جانے کی بشارت بھی مل گئی تھی۔ اس کے باوجود وہ رو رہے ہیں اس کی کیا وجہ ہے ؟

جواب اوّل ۔ خود حدیثِ پاک میں ہے کہ " اِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ قَبَضَ بِيَمِيْنِهٖ قَبْضَةً

کہ مجھے اس بشارت کی صداقت کا اعتقاد ہے لیکن پروردگار بے نیاز ہے وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اس کی مرضی میں کسی کو دخل نہیں چاہے تو دوزخ میں ڈال دے، چاہے تو جنّت میں داخل کرے۔ نہ جانے خدا نے میرے مقدّر میں کیا لکھ رکھا ہے۔

جواب دوّم حضرت صحابیٔ رسول کا رونا غلبہ خشیت کی وجہ سے تھا۔ چنانچہ جب حق تعالیٰ کی ہیبت اور خوف کا غلبہ ہوتا ہے تو ایسی بشارتیں یاد نہیں رہتیں جیسے کوئی جج کسی ملزم سے کہدے کہ میں تمہیں بری کردوں گا، پھر بھی عدالت میں جاکر وہاں کا خاص رعب اور ڈر ہوتا ہے۔ کما فی مقولۃ الصُّوفیۃ : ع عشق است ہزار بدگمانی۔
یعنی اللہ پاک کے مُقرّب بندوں کو ہر وقت اپنے اوپر بدگمانی رہتی ہے۔ ع مُقرّباں را بیش بود حیرانی
بلکہ حضرت خود فرمارہے ہیں" ولا ادری فی ایّ القبضتین "۔

سوال : یمین کا مقابل یسار ہے تو یہاں پر یسار کیوں نہیں فرمایا ؟

جواب : اللہ پاک یسار سے پاک ہیں۔ حدیث شریف میں ہے" کلتا یدیہ یمین ھذ؟

وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَخَذَ اللّٰهُ الْمِيْثَاقَ مِنْ ظَهْرِ اٰدَمَ بِنُعْمَانَ يَعْنِيْ عَرَفَةَ فَاَخْرَجَ مِنْ صُلْبِهٖ كُلَّ ذُرِّيَّةٍ ذَرَأَهَا فَنَثَرَهُمْ بَيْنَ يَدَيْهِ كَالذَّرِّ۔

ترجمہ : حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے وہ مروی ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے پشتِ آدمؑ سے نعمان یعنی عرفات میں عہد لیا۔

قولہٗ نُعْمَانَ ۔ نعمان پہاڑ مکہ معظمہ اور طائف کے درمیان سے شروع ہوکر عرفات تک پہنچتا ہے اس پہاڑ پر یہ واقعہ ہوا۔ لہذا یہ حدیث بھی درست ہے کہ عرفات میں عہد لیا گیا اور طائف کے قریب لیا گیا۔

قولہٗ قُبُلاً ۔ یعنی بلا واسطہ ملائکہ مُشافہۃً روبروان سے بات چیت کی اور قُبُلاً

بضمتین ہے اور اس میں چار لغات اور بھی ہیں جو بروزان عِنَبٌ ، قُفْلٌ ۔ صُرَدٌ ۔ جَبَلٌ
ہیں اس حدیث کی مکمل بحث مشکوٰۃ شریف ص۲۱ ج۱ بابُ الایمان بالقدر فصل ثانی میں ہو چکی ہے
مگر یہاں ایک فائدہ ملاحظہ فرمادیں ۔

فائدہ اس حدیث کے اندر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ یہاں آیۃ ہذا میں اللہ پاک نے مشرکوں اور کافروں کو خبردار کیا ہے کہ تم قیامت میں یہ دلیل نہیں دے سکتے کہ چونکہ ہمارے باپ دادا نے شرک کیا تھا اس لیے ہم بھی ان کے ساتھ ہے ۔ یا ہم اپنے باپ دادوں کے تابع ہیں جیسے انہوں نے مذہب اختیار کیا ہم بھی وہی کرنے کے پابند تھے ۔ اس لیے ہم عذابِ دوزخ کے مستحق نہیں ہو سکتے ۔ پس اے کافرو جان لو قیامت کے دن یہ حجّت تمہارے لیے کار آمد نہیں ہو سکے گی کیونکہ تم سے ہم نے توحید کا اقرار کرالیا ہے ، اور اسی اقرار کو مضبوط کرنے کے لیے انبیاء کرام ؑ تشریف لائے تاکہ وہ پرانے عہد کو یاد دلائیں ۔

سوال : حدیثِ پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ میثاق پہلے لیا ، بعد میں مخلوق کو نکالا ۔ حالانکہ میثاق بعد میں تھا " اَخَذَ اللّٰہُ الْمِیْثَاقَ مِنْ ظَھْرِ اٰدَمَ بِنَعْمَانَ فَاَخْرَجَ مِنْ صُلْبِہٖ

جواب : مقامِ ہذا میں میثاق کا عہد مراد نہیں بلکہ میثاق کا ارادہ مراد ہے ۔

وَعَنْ اُبَیِّ بْنِ کَعْبٍؓ فِیْ قَوْلِ اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ وَاِذْ اَخَذَ رَبُّکَ مِنْۢ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُھُوْرِھِمْ ذُرِّیَّتَھُمْ قَالَ جَمَعَھُمْ فَجَعَلَھُمْ اَزْوَاجًا ثُمَّ صَوَّرَھُمْ فَاسْتَنْطَقَھُمْ فَتَکَلَّمُوْا ثُمَّ اَخَذَ عَلَیْھِمُ الْعَھْدَ وَالْمِیْثَاقَ وَاَشْھَدَھُمْ عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوْا بَلٰی "

ترجمہ : روایت ہے حضرت اُبَیّ بن کعبؓ سے رب تعالیٰ کے اس فرمان کے متعلق جب آپ کے رب نے اولادِ آدمؑ کی پشت سے ان کی اولاد نکالی فرمایا انہیں جمع کیا ، انہیں جوڑے بنایا پھر انہیں صورت و گویائی دی تو وہ بولے ۔ پھر ان سے عہد میثاق لیا ، اور انہیں خود ان کی ذات پر گواہ بنایا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں بولے ہاں ۔

قولہٗ فِیْ قَوْلِ اللّٰہِ ۔ یہ اصل میں تھا " فِی تفصیلِ قولِ اللّٰہِ عزّوجلّ ۔
قولہٗ جَمَعَھُمْ ۔ اس سے پہلے اقتضاء النص کے طور پر یہ الفاظ نکالیں گے " ان اَخْرَجَھم فجَمَعَھُمْ ۔
قولہٗ ۔ فَا سْتَنْطَقَھُمْ ۔ " ای خلق فیھم العقل و طلب منھم النطق" یعنی عقل دے کر تکلّم کروایا ۔
قولہٗ السّمٰوٰتِ السَّبْعِ ۔ یعنی آسمان وزمین کی مخلوق کو " ای اھل السّمٰوٰت وَالاَرْضِ " یا خود آسمان و زمین کو دوسرے معنیٰ زیادہ قوی ہیں ۔
قولہٗ اَنْ تَقُوْلُوْا ۔ یہ ماقبل کے لیے علت نہیں بن سکتا ۔ اصل میں لِئَلاَّ اَنْ تَقُوْلُوْا تھا ۔ مگر صحیح یہ ہے کہ اس سے قبل کراھیۃ کا لفظ مُقدّر کریں گے ۔
قولہٗ وَاَنْزَلَ عَلَیْکُمْ کُتُبِیْ ۔ رَبّ نے اپنا یہ وعدہ پورا فرمایا کہ از آدم علیہ السّلام تا روزِ قیامت دنیا ایک آن نبوت سے خالی نہ رہی ۔ خیال رہے کہ زمانہ نبی اور ہے زمانہ نبوّت کچھ اور پیغمبر کی ظاہری زندگی کا زمانہ زمانہ نبی ہے اور ان کے دین کی بقاء کا زمانہ زمانہ نبوّت ہے چنانچہ قیامت تک ہمارے حضور علیہ السّلام کا زمانہ ہے ۔
قولہٗ شَھِدْنَا ۔ یہاں شہادت بمعنیٰ علم ہے یعنی ہم نے مشاہدہ سے تیری رُبُوبیّت اور معبُودیّت جان پہچان لی یا شہادت بمعنیٰ گواہی یعنی ہم ایک دوسرے کے اس اقرار توحید پر گواہ بن گئے ۔
قولہٗ قَالَ اِنِّیْ اَحْبَبْتُ اَنْ اَشْکُرَ ۔ غنی ، دولت مندی کی وجہ سے شکر کرے گا اور فقیر فراغت اور غمِ مال سے نجات پر شکر کرے گا ۔ علیٰ ہذا خوب صورت اپنے حسن پر اور بدصورت فتنۂ حسن سے نجات پر شکر بجالائے گا ۔ دراصل یہ آدم علیہ السّلام کو جواب دیا جارہا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان میں فرق پیدا کرنے کی حکمت و مصلحت یہ ہے کہ اگر میں سب کو یکساں پیدا کرتا تو یہ شکر ادا نہ کرتے ۔ اور جب ایک انسان میں وہ صفات و خصائل پیدا کر دیے جائیں گے ۔ جو دوسرے انسانوں میں نہیں ہوں گے تو وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر شکر ادا کریں گے ، اور رحمت کے مستحق بن جائیں گے ۔
سوال ۔ آدم علیہ السّلام کو کیا حق تھا کہ انہوں نے سوال کیا ۔

جواب اوّل : اولاد کی محبت میں آکر سوال کیا کہ ہیں تو میرے بیٹے مگر یہ فرق مجھے پسند نہیں۔

جواب دوّم : سوال بطور اعتراض نہیں بلکہ بطور استفسار کے ہے یعنی حکم کے لیے سوال کر رہے ہیں۔

قولہٗ عَلَيْهِمُ النّور ۔ تمام روحوں پر فطرت والا نور تھا۔ مگر انبیاء کرام پر دو نور تھے۔ فطرتؐ والا نور اور نبوّتؐ والا نور۔

قولہٗ خصّوا بِمِيْثَاقٍ اٰخر : انبیاء کرام سے خصوصیت کے ساتھ خاص عہد و پیمان لیے گئے یعنی مزید اہتمام کے لیے عام میثاق کے بعد انبیاء کرام سے تبلیغ رسالت میں ثابت قدم رہنے اور باہمی ایک دوسرے کی مدد کرنے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النّبیین ہونے وغیرہ کے متعلق خاص میثاق بھی لیا گیا۔ یہ میثاق تو سب پیغمبروں سے لیا اور احزاب کی آیت ۵ میں پانچ پیغمبروں کے نام جو خصوصیّت سے ذکر کیے گئے اس کی وجہ یہ ہے کہ اولوا العزم پیغمبر ہیں۔

قولہٗ تَبَارَكَ وَتَعَالیٰ ۔ تَبَارَكَ اور تَعَالیٰ جہاں بھی ہوگا حال بنے گا صفت نہیں بنے گا کیونکہ اضمار نہ موصوف ہوتے ہیں اور نہ صفت۔ دوسرا یہ کہ تعالیٰ اور تبارک جملہ ہیں اور جملہ نکرہ کے حکم میں ہوتا ہے اور ضمیریں معرفہ ہیں اس لیے حال بنیں گے صفت نہیں۔

قولہٗ كَانَ فِيْ تِلْكَ الْاَرْوَاحِ فَاَرْسَلَهٗ اِلیٰ مَرْيَمَ : اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السّلام کی طرف بھیج دی۔ حضرت اُبَیؓ بیان کرتے ہیں کہ یہ روح حضرت مریم علیہا السّلام کے منہ کی طرف سے ان کے جسم میں داخل ہوگئی، یعنی ارواح انبیاءؑ سے خاص میثاق لے کر ان ارواح کو پشتِ آدمؑ میں واپس لوٹا دی گئیں۔ لیکن روحِ عیسٰیؑ کو باقی رکھا گیا حتّٰی کہ جب بی بی مریمؑ پیدا ہوئی تو ان کے مُنہ میں رُوح پھونک دیا گیا کیونکہ آپ کی ولادت بغیر والد کے ہونے والی تھی۔

قولہٗ مَنْ فِيْهَا ۔ ای فِیْ فَمِهَا فِیْهِ اشارۃ الی قولہٖ تعالیٰ " فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا ۔

وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِؓ قَالَ بَيْنَمَا نَحْنُ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَتَذَاكَرُ مَا يَكُوْنُ اِذْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا سَمِعْتُمْ بِجَبَلٍ زَالَ عَنْ مَكَانِهٖ فَصَدِّقُوْهُ وَاِذَا سَمِعْتُمْ بِرَجُلٍ تَغَيَّرَ عَنْ خُلُقِهٖ فَلَا تُصَدِّقُوْا بِهٖ فَاِنَّهٗ يَصِيْرُ اِلٰى مَا جُبِلَ عَلَيْهِ

ترجمہ: روایت ہے حضرت ابوالدرداءؓ سے فرماتے ہیں کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں تھے، اور جو کچھ ہوتا ہے اس کا تذکرہ کر رہے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم سنو کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل گیا تو مان لو، اور اگر یہ سنو کہ کوئی آدمی جبلی عادت سے بدل گیا تو نہ مانو وہ پھر اسی طرف لوٹ جائے گا جس پر پیدا ہوا۔

قولہٗ نَتَذَاكَرُ مَا يَكُوْنُ ۔ کہ واقعاتِ عالم گذشتہ فیصلہ کے مطابق ہو رہے ہیں، یا اتفاقاً مگر یہ تذکرہ مناظرانہ رنگ میں نہ تھا بلکہ تحقیق کے لیے تھا۔ اسی لیے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سنتے رہے منع نہ فرمایا۔ بلکہ ایک مسئلہ کی وہ تحقیق فرما دی۔ معلوم ہوا کہ علمِ کلام پڑھنا ممنوع نہیں مسئلہ تقدیر میں جھگڑنا منع ہے جیسا کہ گذشتہ احادیث سے معلوم ہوا۔

قولہٗ فَلَا تُصَدِّقُوْهُ ۔ کیونکہ ہر چیز مقدر ہے جس میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ یعنی قضاء و قدر کے دوسرے شعبوں میں جس طرح تبدیلی و ترمیم نہیں ہو سکتی اسی طرح اخلاق و عادات میں بھی تغیرُ و تبدُّل نہیں ہو سکتا، مثلاً بہادر، بزدل، اور ذکی غبی نہیں بن سکتا۔

قولہٗ يَصِيْرُ اِلٰى مَا جُبِلَ ۔ ای ما خلق : یعنی جبلّی خلقت، انسانی اوصاف دو قسم پر ہیں

اوّل صفات مُبْرَمہ جو تبدیل نہیں ہو سکتے۔ حدیث پاک میں جو فرمایا جبل ممکن الزوال ہے۔ عادات و صفات ممکن الزوال نہیں وہ عادات و صفات مُبْرَمہ ہیں۔

دُوُم عارضہ : یہ صفات تبدیل ہو جاتے ہیں۔ مثلاً کسی بری صحبت میں پڑ کر چور بن گیا پھر بزرگوں کی صحبت میں آکر نیک بن گیا۔

سوال : یہ ہے کہ اس حدیث میں بتایا گیا ہے کہ انسان کی عادت تبدیل نہیں ہوتی پھر تہذیب اخلاق کا حکم کیوں دیا گیا یہ تو تکلیف مالا یطاق ہے۔

جواب : یہ سوال دراصل اصلاحِ اخلاق کے معنیٰ نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے اصلاحِ اخلاق کا معنیٰ ازالہ اخلاق رذیلہ سمجھ لیا جاتا ہے۔ حالانکہ اصلاح اخلاق کا یہ معنیٰ نہیں بلکہ اصلاحِ اخلاق سے مراد امالہ اخلاق ہے۔ ازالہ اخلاق کا معنیٰ ہے کسی کے فطری خُلق کو تبدیل کرکے بالکل ختم کر دیا جائے۔ یہ ناممکن ہے اور نہ ہی اس کا حکم ہے۔ البتہ امالہ اخلاق کا حکم ہے جو صوفیاءِ کرام کرتے رہتے ہیں۔ امالہ کا مطلب یہ ہے کہ ان خصلتوں کا رخ و مصرف بدل دیا جائے۔ جیسے بعض صحابہؓ میں اسلام سے پہلے غضب تھا اسلام لانے سے یہ خصلت زائل نہیں ہوئی بلکہ اس کا رخ بدل گیا، پہلے غضب ناحق تھا اب حق کے لیے ہے۔

وَعَنْ اُمِّ سَلْمَةَ قَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لَا يَزَالُ يُصِيْبُكَ فِيْ كُلِّ عَامٍ وَجْعٌ مِّنَ الشَّاةِ الْمَسْمُوْمَةِ الَّتِيْ اَكَلْتَ قَالَ مَا اَصَابَنِيْ شَيْئٌ مِّنْهَا اِلَّا وَهُوَ مَكْتُوْبٌ عَلَيَّ وَآدَمُ فِيْ طِيْنَتِهٖ۔

ترجمہ : روایت ہے بی بی ام سلمہؓ سے انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ کو ہر سال اس زہریلی بکری کی تکلیف ہوتی ہے جو آپ نے (خیبر میں کھائی تھی فرمایا مجھے اس کے سوا کوئی شئی نہیں پہنچتی جو میرے مقدر میں اس وقت لکھ دی گئی جب حضرتِ آدمؑ اپنے خمیر میں تھے۔

اس حدیث کی مکمل بحث مشکوٰۃ شریف ص۵۴۲ ج ۲ باب المعجزات فصل ثانی میں دیکھی جا سکتی ہے۔ مگر مختصراً عرض ہے کہ یہ تقدیر کی طرف اشارہ ہے کہ تقدیر کے مسئلہ میں نبی غیر نبی برابر ہیں ان میں کوئی فرق نہیں۔ لہذا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خیبر نہ جاتے تو زہر نہ کھاتے۔ خیبر جانا، وہاں زہر آلود گوشت کھانا سب کچھ لکھا جا چکا تھا۔
ثانیًا یہ حدیث قرآن پاک کی اس آیت کی تشریح ہے :۔

مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتَابٍ

مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَءَهَا ـ ای نَخْلُقُهَا : (پ۲۷ الحدید)

اسمائے رِجال

حالاتِ اُمِّ سلمہؓ

آپ کا نام ھند بنت ابی اُمیّہ ہے پہلے ابوسلمہ کے نکاح میں تھی ۴ھ میں بیوہ ہوئیں۔ اور اسی ۴ھ کے اواخر ماہِ شوال المکرم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں۔ ۵۹ھ میں مدینہ پاک میں وفات ہوئی، اور جنت البقیع میں دفن ہوئیں۔ بہت سے صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ نے آپ سے احادیث روایت کیں۔

بَابُ اِثبَاتِ عَذَابِ القَبرِ

باب ہٰذا میں مُصنّف علیہ الرحمت عذابِ قبر کے ثبُوت پر اَحادیث ذکر فرمائیں گے

سوال قبر میں جس طرح عذاب ہوتا ہے اسی طرح ثواب بھی ہوتا ہے لیکن حضرت مُصنّف علیہ الرحمت نے عُنوانِ باب میں صرف عذابُ القبر کا ہی ذکر کیا ہے یہ ترتیب ذکری کیوں اختیار فرمائی ؟

جوابِ اوّل چونکہ اکثر افراد کافر یا فاسق ہیں (قَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ) تو گویا عذاب کا وقوع ثواب کے وقوع سے زیادہ ہوتا ہے۔ اس لیے ترجمۃُ الباب میں عذاب کے لفظ کو زیادہ اہمیت دی ہے۔

جوابِ دوّم عَذَابُ القبرِ کا لفظ بول کر مُراد مُطلق احوالِ قبر ہیں خواہ تکلیف ہو، خواہ راحت۔ تغلیبًا سب کو عَذابُ القبر کہدیا گیا ہے۔
تائید کے طور پر حوالہ مُلاحظہ کریں یہ

سُمِّيَ عَذَابُ القَبرِ وَنَعِيمُهُ وَإِنَّهُ رَوضَةٌ اَوحُفرَةُ نَارٍ بِاعتِبَارِ غَالِبِ الخَلقِ۔ (کتاب الروح ص۱ ، عینی ص۱۹۹ ج ۸)

جوابِ سوّم صالحین کو اگر عذاب معروف نہ بھی ہو تو کچھ نہ کچھ وحشت اور دہشت وہاں جاکر ضرور ہوتی ہے یہ بھی ایک قسم کا عذاب ہی ہے۔ مقام ہٰذا پر مباحث ثلاثہ ہیں مُلاحظہ فرماویں۔

اَلبحثُ الاوّلُ ــــ فی اِثباتِ عذابِ القبرِ

واضح ہو کہ مجموعی طور پر عالم تین ہیں :۔

اوّل عالمِ دُنیا جس میں عذاب وراحت بلا واسطہ بدن پر ہوتے ہیں، اور اس عالم میں ارواح بدن کے تابع ہیں اس لیے احکامِ شرعی بھی اعضاء و جوارح کے ظاہری حرکات پر مُرتّب ہوتے ہیں۔

دوم عالمِ برزخ اس عالمِ برزخ میں عذاب وراحت کا تعلّق اوّلاً بلا واسطہ ارواح سے ہے اور بدن اس کے تابع ہے اور یہ عالمِ برزخ دنیا و آخرت کا درمیانی عالم ہے جس کا دونوں سے تعلّق ہے۔

سوم عالمِ آخرت جو قیامت سے شروع ہوگا لیکن اس کی انتہاء نہیں کہ بعث بعد الموت سے شروع ہو کر لاالیٰ نہایہ زمانہ کا نام ہے۔ وہاں عذاب وراحت بدن و روح میں سے ہر ایک پر بلا واسطہ جاری ہوگا۔

یقول ابوالاسعاد : چونکہ ہر عالم کے احکام الگ الگ ہیں۔ بناء بریں ایک عالم کو دوسرے عالم پر قیاس کرنا صحیح نہ ہوگا۔ عالمِ آخرت میں احکام کا تعلّق جو جسم و روح کے ساتھ ہوگا۔ اس کی مثال یوں سمجھو کہ دو آدمیوں نے ایک درخت کے پھل چوری کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر ایک ان میں سے لنگڑا ہے اور دوسرا اندھا ہے دونوں نے یہ مشورہ کیا کہ اندھے کے کندھے پر لنگڑا سوار ہو اور وہ اس کو درخت کے نیچے لے جائے اور وہ دیکھ کر پھل توڑتا رہے تو ہمارا کام بن جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا تو مالک نے آکر دونوں کو پکڑ لیا، اور سزا دی کیونکہ دونوں سبب ہوئے۔ اسی طرح آخرت میں جسم و روح کو برابر سزا ہوگی۔

تمام صحابہ کرامؓ و تابعین عظامؒ اور جمہور اہلُ السُّنّۃ والجماعۃ عالمِ برزخ کے عذاب و نعمت کے قائل ہیں۔ مگر فرقہ مبتدعہ میں سے خوارج و اکثر معتزلہ و بعض روافض نے عذابِ قبر کا بالکلیۃ انکار کیا ہے وہ کسی طرح بھی عذابِ قبر کے قائل نہیں ہیں۔ معتزلہ میں انکار

عذابِ قبر میں زیادہ پیش پیش دو شخص ہیں۔ ضرار بن عمرو اور بشر مریسی۔

دلائلِ فِرَق مُبتدِعہ در نفی عذاب و نعمتِ قبر

اختصاراً چند دلائل پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

دلیل اوّل فِرق مبتدعہ برزخی احوال کا انکار کرتے ہیں اور اس کی بناء صرف ان کا وہم و عقل ہے وہ کہتے ہیں کہ اگر عذابِ قبر ہوتا تو ہمیں نظر آتا، حالانکہ بہت سے مُردوں کی قبر کھود کر ہم دیکھتے ہیں مگر کچھ نظر نہیں آتا بلکہ مردہ ویسے کا ویسا ہی دیکھتے ہیں چیخنا چلانا کچھ نظر نہیں آتا نہ سانپ نہ بچھو وغیرہ اور اسی طرح نہ کسی قسم کی راحت و آرام جو مؤمن کے لیے ہونا چاہیے۔

جواب اوّل اہلِ سنّت والجماعت کی طرف سے اس کا اجمالی جواب یہ دیا جاتا ہے کہ جب قرآن کریم وحدیثِ مشہور (جیسا کہ مسلک اہل السنۃ والجماعۃ کے دلائل کے بیان میں آئے گا) سے اس کا ثبوت موجود ہے تو اس کے مقابلہ میں قیاس آرائی کرنا خود عقلِ سلیم کے خلاف ہے اور نہ اس کا کوئی اعتبار ہے۔

جواب دوم یہ کہ ہم پہلے بتلا چکے ہیں کہ عالمِ برزخ کو عالمِ دنیا پر قیاس کرنا درست نہیں، اور پھر دنیا کی آنکھ سے اُس عالم کے احوال کو دیکھنا ممکن نہیں جب کہ فِرق مبتدعہ دنیا کی آنکھ سے دوسرے عالم کا نظارہ کرنا چاہتے ہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے بعدہٗ ایک چیز کا نہ دیکھنا اور نظر نہ آنا اس کے عدمِ وجود کی دلیل نہیں خود دنیا میں بہت سے نظائر ہیں جو ہمیں نظر نہیں آتے مگر واقع میں وہ سب کے نزدیک مسلّم ہیں چند نظائر ملاحظہ فرمائیں۔

نظیر اوّل موت کے وقت فرشتے آتے ہیں اور قریب الموت آدمی کے ارد گرد بیٹھتے ہیں حتّٰی کہ سلام بھی کرتے ہیں اور بعض دفعہ وہ شخص سلام کا جواب بھی دیتا ہے مگر پاس بیٹھنے والوں کو کچھ احساس نہیں ہوتا۔

نظیر دوم[۲]

حضرت جبریل علیہ السلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وحی لے کر آتے ہیں، اور بعض اوقات قرآن کریم کا تکرار کرتے تھے حالانکہ قریب بیٹھنے والے صحابہ کرامؓ کو کچھ پتا نہیں چلتا تھا۔

نظیر سوم[۳]

جنّات کسی پر سوار ہوتے ہیں اور اسے دوڑا رہے ہوتے ہیں مگر نظر نہیں آتے اسی طرح عذابِ قبر کو اگرچہ ہم نہیں دیکھتے مگر اَصْدَقُ الصَّادِقِیْنَ اللہ و رسولؐ کی خبر سے یقین کیوں نہ ہو، اور اس میں شبہ کیوں کریں۔

دلیل دوم[۲]

بعض مُردوں کو جلا کر راکھ بنا کر اڑا دیا جاتا ہے یا بعض کو شیر وغیرہ کھا لیتا ہے حتّٰی کہ اس کا جزء بن جاتا ہے پھر اس کو عذاب دیا جائے تو شیر وغیرہ کو تکلیف ہوتی اور وہ دوڑتا بھاگتا۔ مگر یہاں دکھائی نہیں دیتا لہٰذا اتنی بدیہی بات کے خلاف عالمِ برزخ کے احوال کی تصدیق کیسے کی جائے؟ بنا بریں معلوم ہوا کہ سوائے عالمِ آخرت کے درمیان میں کوئی عالم نہیں ہے۔

جواب

تمہارا یہ کہنا کہ آگ سے جل کر راکھ ہو جائے یا شیر کھا کر اس کا جزء بن جائے تو عذاب کس طرح ہوگا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ مردہ کے اجزاء جہاں کہیں بھی ہوں روح کا تعلق ان کے ساتھ ہوگا اور روح پر اصل عذاب ہوتا ہے اور اس کے واسطہ سے ہر ہر جزء پر عذاب ہوگا۔ باقی شیر وغیرہ کو ان کے واسطہ سے عذاب نہیں ہوگا کیونکہ شیر تو اس کا جزء نہیں ہے اور دنیا میں اس کی نظیر موجود ہے کہ کسی کے گوشت کے اندر جزء لائیفک کے اعتبار سے کیڑے ہو جائیں تو دوا کے ذریعہ ان کو مارا جاتا ہے جس سے کیڑوں کو تو بہت تکلیف ہوتی ہے مگر اس شخص کو کچھ پتا نہیں چلتا۔ اسی طرح شیر کے اندر مُردہ کے اجزاء کو عذاب ہوگا مگر شیر کو پتا نہیں چلتا۔ لہٰذا اب عالمِ برزخ کے عذاب و نعمت کے ثبوت میں کسی قسم کا شک و شبہ باقی نہیں رہا۔

دلیل سوم[۳]

سورۃ یٰسٓ پ۲۳ میں ربِّ ذوالجلال کا ارشاد ہے کہ کافروں کو جب قبروں سے اٹھایا جائے گا تو کہیں گے "قَالُوْا یٰوَیْلَنَا مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا الخ" جب کہ مَرقد آرام گاہ یا آرام کی جگہ کو کہتے ہیں تو معلوم ہوا کہ کافر آرام میں ہوں گے نہ کہ عذاب میں۔

جواب قیامت کا منظر ایسا ہولناک اور دہشت انگیز ہوگا کہ کفّار قبروں کے عذاب کو بھول جائیں گے اور سمجھیں گے کہ ہم اب تک سوئے رہے ہیں اس لیے جب قبروں سے اٹھیں گے تو ایک دوسرے سے پوچھیں گے کہ ہمیں نیند سے کس نے جگایا ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ قبر کے اندر عذاب نہیں ہوا۔

یقول ابوالاسعاد : بات وہی ہے جو حضرت شیخ جاجروی رحمۃ القوی نے جواب میں عرض فرمادی ہے لیکن یہ احقر ذرا تشریح سے الفاظوں کو ایک نئے قالب میں ڈھال رہا ہے۔ مِنْ مَّرْقَدِنَا کا لفظ اس لیے بولیں گے کہ اس وقت انہیں یہ احساس نہ ہوگا کہ وہ مر چکے تھے اور اب ایک مدّت دراز کے بعد دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے گئے ہیں بلکہ وہ اسی خیال میں رہیں گے کہ ہم سوئے پڑے تھے۔ اب یکایک کسی خوفناک حادثہ کی وجہ سے ہم جاگ اٹھے ہیں اور بھاگے جارہے ہیں۔ مگر شبہ ہوسکتا ہے کہ ان کی برزخی زندگی بھی دکھوں بھری ہوگی (کما قالہ الجمہور) پھر اس کو مرقد اور آرامگاہ سے کیسے تعبیر کر رہے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ قیامت کی ہولناکیوں کے آگے تو عذاب قبر غنیمت اور ایک طرح سے نیند و آرام گاہ معلوم ہوگی، مثال کے طور پر ایک آدمی کو چیونٹی کے کاٹنے سے درد ہو معًا اسے چاقو کا وار کر کے زخمی کر دیا جائے تو مجروح چاقو والے زخم کی وجہ سے چیونٹی کے کاٹنے والی تکلیف کو بھول جائے گا یہی حال کافروں کا ہوگا، قبر کا عذاب تو ہوگا مگر حشر اور قیامت کے دن والے عذاب کے مقابلہ میں چیونٹی کے کاٹنے والے درد کی طرح محسوس ہوگا۔

دلائل اہل السُّنت والجماعت بر اثبات عذاب و نعمت قبر

مختصرًا چند دلائل پر اکتفا کیا جارہا ہے۔ —— آیات قرآنیہ ——

دلیل اوّل : قرآن مقدس میں ہے :-

وَحَاقَ بِآلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا

غُدُوًّا وَّعَشِيًّا وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ:

(پ۲۴) اس آیت میں پہلے تو یہ ارشاد فرمایا کہ متعلقین فرعون کو سخت عذاب نے گھیر لیا صبح وشام ان پر آگ پیش کی جاتی ہے اس کے بعد ارشاد فرمایا" وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ : یعنی قیامت کے دن ان کو اس سے سخت عذاب میں داخل کیا جائے گا وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ سے معلوم ہوا کہ اس سے پہلے جس عذاب کا ذکر ہے وہ قیامت سے پہلے کا ہے۔ اور وہ عذابِ قبر اور عذاب برزخ ہی ہو سکتا ہے۔

چنانچہ حافظ ابن کثیرؒ اس آیت کے ماتحت ارشاد فرماتے ہیں :۔

هٰذِهِ الْاٰيَةُ اَصْلٌ كَبِيْرٌ فِى اِسْتِدْلَالِ اَهْلِ السُّنَّةِ عَلٰى عَذَابِ الْبَرْزَخِ فِى الْقُبُوْرِ (ابن کثیر ص۸۱ ج ۴)

دلیل دوم : سورۃ نوح پ۲۹ میں اللہ پاک فرماتے ہیں :۔

مِمَّا خَطِيْئٰتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا : (پ۲۹ نوح)

فار تعقیب مع الوصل کے لیے آتی ہے فَاُدْخِلُوْا کا مطلب یہ بنا کہ قوم نوح کے ڈوب جانے کے فوراً بعد آگ میں داخل کیا گیا تو یہ آگ برزخ ہی کی ہوسکتی ہے۔ اس لیے کہ نارِ آخرت تو بہت صدیوں کے بعد آئے گی "اُدْخِلُوْا نَارًا" میں نار سے مراد نار البرزخ ہے۔

دلیل سوم : سورۃ انعام آیت ۹۳ میں اللہ رب العزت فرماتے ہیں :۔

اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ :

یعنی فرشتے کافروں کو مار مار کر جان نکال لیتے ہیں اور یہ کہتے جاتے ہیں کہ آج تم کو ذلت کی سزا دی جائیگی۔ یہ عذاب قبر ہے کیونکہ قیامت کا عذاب تو کافی مدت کے بعد ہوگا، اور اگر اس سے عذابِ قبر مراد نہ ہو تو اَلْيَوْمَ کا ترتب ماقبل کے ساتھ صحیح نہ ہوگا۔

احادیث نبویہ

دلیل چہارم : احادیث میں تو عذاب القبر اور ثواب القبر کا تذکرہ نہایت صراحت اور تواتر کے ساتھ وارد ہوا ہے اور عذاب قبر اور ثواب قبر کے ثبوت پر صحابہؓ اور تابعینؒ کا اجماع بھی ہے اس لیے اس کے انکار کی گنجائش نہیں ہے بہت سے فقہاء اور متکلمین نے منکر عذاب قبر

کی تکفیر کی ہے جیساکہ عالمگیریہ وغیرہ میں ہے۔ محقق ابن الہمامؒ شارح ہدایہ ارشاد فرماتے ہیں:

لَا تَجُوْزُ الصَّلٰوۃُ خلف مُنکر الشَّفَاعَۃِ وَالرُّؤْیۃِ وعذاب القبر والکرام الکاتبین لانہ کافر لتوارث ھٰذہ الاُمور عَنِ الشَّارِعِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم (فتح القدیر ص۳۰۴ ج۱ باب الامامۃ)

علامہ نوویؒ عذاب قبر کے بارے میں وارد ہونے والی احادیث کے متعلق فرماتے ہیں:

وَالاَحَادِیْث فِی ذَالِكَ لَا تُحْصٰی کَثِیْرَۃً : بطور نمونہ ان میں سے صرف دو احادیث یہ ہیں:۔

حدیث عبداللہ بن عمرؓ مرفوعًا : " اِنَّ اَحدکُم اذا مَاتَ عُرِضَ عَلَیْہِ مَقْعَدُہٗ بِالْغَدَاۃِ وَالْعَشِیِّ الخ مُتفق عَلَیْہِ (مشکوٰۃ شریف ص۲۵ ج۱)

حدیث عائشہؓ : انَّ یَھُودِیّۃ دَخلت عَلَیْھَا فَذکرت عَذَابَ القبر فَقَالَتْ لَھَا اعاذكِ اللّٰہُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ فسألت عَائِشَۃُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہ علیہ وَسَلَّمَ عَنْ عَذَابِ الْقَبْرِ فَقَالَ نَعَمْ عَذَابُ الْقَبْرِ حَقٌّ :(متفق علیہ بحوالہ مذکورہ)

اَلبحثُ الثَّانِیْ ــــ فی بیان مُرادِ قبر

جاننا چاہیئے کہ احادیث میں جو قبر کا ذکر آتا ہے اس سے مٹی کا معروف گڑھا مراد نہیں ہے بلکہ اس سے مُراد عالم برزخ یعنی مرنے کے بعد سے بعثت سے پہلے تک کی حالت مراد ہے خواہ مٹی میں مدفون ہو، یا دریا میں غرق ہو، یا جلا کر ہوا میں اُڑا دیا جائے، یا جہاں کہیں بھی ہو وہیں مُعذب یا منعم ہوگا۔ لیکن چونکہ اکثر لوگ مٹی میں مدفون ہوتے ہیں۔ اس لیے اکثریت کی بناء پر قبر کا ذکر آتا ہے۔ باقی اس عالم کی وسعت کا ہم کوئی اندازہ نہیں کر سکتے۔ بعض عارفین کا قول ہے کہ عالمِ دنیا، اس عالم برزخ کے سامنے ایسا ہے جیسے ایک ماں کا پیٹ تمام عالم دنیا کے سامنے ہے جس طرح حالت نوم موت وحیات کے درمیان ایک حالت ہے اسی طرح برزخ دنیا و آخرت کے مابین ایک عالم ہے اس کا ثبوت قرآن مُقدس میں اس طرح ہے:۔

" وَمِنْ وَّرَآئِھِمْ بَرْزَخٌ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ط (پ۱۸ المؤمنون)

قبر کے دو اطلاق ہیں ۱ قبر عُرفی ۲ قبر شرعی - قبر عُرفی سے مراد یہ معروف زمین اور گڑھا ہے جس کا بیان سابق میں گذرا ہے - اور قبر شرعی سے مراد عالم برزخ ہے - یہ زمینی معروف گڑھا مراد نہیں - کیونکہ پھر سوال ہوگا کہ وہ آدمی جو حریق یا غریق ہے، یا ماکول فی بطن الحیوانات ہے - اسے تو اس معروف زمینی گڑھے میں دفن نہیں کیا جاتا، پھر چاہیے کہ اس کو بھی عذاب ونعمت راحت نہ ہو - کیونکہ وہ معروف قبر میں مدفون نہیں ہے - جبکہ باتفاق جمہور جیسے ہو، جہاں ہو مُعذّب ومُنعم ہوگا - ولہٰذا شریعت مُقدّسہ کے اندر قبر سے مراد یہ معروف زمینی گڑھا نہیں بلکہ عالم برزخ ہے - حوالہ جات ملاحظہ ہوں :-

اوّل : علامہ ہروی المعروف بمُلّا علی قاریؒ مرقات شرح مشکوٰۃ صـ۲۱۳ ج ا میں فرماتے ہیں :-

كلّ مَا اسْتقرّ فيه بَعدَ المَوتِ فهُوَ قبره :

تو اب اِسْتَقرّ میں تعیم ہے جہاں ہو وہی اس کی قبر ہے -

دوم : عقیدۃ الطحاوی جس میں امام طحاویؒ نے احناف کے عقائد ذکر فرمائے ہیں صـ۲۳۰ پر فرماتے ہیں :-

وَاعْلَم اَنَّ عَذَابَ القبرهُوعذابُ البَرْزَخ فكلّ مَن مَّاتَ وَهُوَ مُسْتحقٌّ لِلعَذَابِ نَالَه نَصِيبُه مِنْهُ قبرا ولم يقبر :

سوم ؛ وَالمُراد بالقَبرههُنا عَالَمُ البَرزَخِ قال تعالىٰ " وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلىٰ يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ " وهُوعالم بين الدنيا والآخرة لهٗ تعلّق بكلّ منهما وليس به الحفرة التى يدفن فيها الميّت فربّ ميّت لايدفن كالغريقِ وَالحَرِيقِ وَالمأكول فى بطنِ الحيوانات يعذّب وينعم ويسأل (التعليق صـ۱۰۲ ج ۱)

چہارم ؛ علامہ مُحدّث عبدالحق دہلویؒ لکھتے ہیں :-

ومراد بقبر عالم برزخ است کہ واسطہ است میان دنیا وآخرت وتعلّق دارد بہر دو مقام نہ آں گورے کہ مردہ را در گور کنند - (اشعۃ اللّمعات صـ۱۱۴ ج ۱ باب اثبات عذاب القبر)

ان حوالہ جات سے روز روشن کی طرح واضح ہوا کہ قبر سے معروف زمینی گڑھا مراد نہیں بلکہ عالم برزخ ہے -

اَلبَحثُ الثّالِث ۳ ــــ فی تحقیقِ کیفیّتِ عذابِ القبرِ

عرضِ حال

یقول ابوالاسعاد : انسان پیدا ہوتے ہی شارعِ موت پر اپنا سفر شروع کر دیتا ہے۔ وہ اپنی پہلی منزل پر مَوت سے ہمکنار ہو کر عالمِ برزخ میں داخل ہو جاتا ہے اور عالمِ برزخ میں اسے پیش کیا جاتا ہے۔ یہ ہمارے فہم و ادراک سے ماورای ہے۔ ہمارے حواسِ خمسہ، آنکھ کی بصارت، کان کی سماعت، زبان کا ذائقہ، ناک کا سونگھنا، ہاتھ کا لمس بھی حیات بعدالممات کے واقعات کا احساس و ادراک نہیں رکھتے۔ موت کے بعد قیامت تک کے زمانہ کا نام برزخ ہے۔ یہ دنیا و آخرت کی زندگی کے درمیان ایک وقفہ اور ایک پردہ ہے یعنی برزخ ایک ایسا حجاب ہے کہ اس کے حالات کا مشاہدہ ہماری نگاہ نہیں کر سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو یہ قوت ہی عطا نہیں فرمائی کہ وہ اہلِ برزخ کے حالات دیکھ سکے یا سن سکے۔

حدیثِ پاک میں ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم خچر پر سوار ایک قبرستان سے گذر رہے تھے کہ خچر بدکا، آپؐ نے اپنے ہمراہیوں سے فرمایا کہ اس قبرستان میں یہودیوں کو عذاب ہو رہا ہے۔ اور میں جو کچھ سن رہا ہوں اگر اللہ تعالیٰ سے دعا کروں وہ تمہیں بھی سنا دے تو تم اپنے مردے دفن کرنا چھوڑ دو۔ (مشکوٰۃ شریف ص۲۵ ج ۱ بابُ اثباتِ عذابِ القبر فصل اوّل)

عالمِ برزخ کا عذاب و ثواب اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت و مصلحت کے تحت انسان کی نظروں سے پسِ پردہ رکھا ہے۔ اس جہان رنگ و بو میں ایک لاکھ سے زائد انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام جلوہ افروز ہوئے۔ یہ ایسا سلسلۂ رشد و ہدایت تھا کہ لوگ ایمان نہ لانے کے باوجود انکی پاک بازی، راست گوئی اور بلندئ اخلاق کے مُعترف تھے۔ اور ان کی پاکدامنی پر کسی بد اخلاقی کا داغ لگانے کی جرأت نہیں کر سکے۔ اس مُقدّس گروہ کا عقیدہ و اعلان ہے کہ مرنے کے بعد عالمِ برزخ میں انسان کے اعمال کے مُطابق جزا اور سزا کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے،

جو کہ قیامت تک رہتا ہے۔ مقام ہذا پر استدلال حدیث کی روشنی میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ میّت کسی حالت میں بھی ہو وہ قبر کے اندر ہو یا باہر اس کا جسم آگ میں جلا کر اس کی راکھ دریا میں بہادی گئی ہو یا ہوا میں اڑا دی گئی ہو۔ یا جانور کھا گئے ہوں ان تمام صورتوں میں برزخ کا عذاب و ثواب میت کو ہوتا ہے مگر آگے یہ کہ محل عذاب کیا ہے ؟ روح پر فقط، روح مع الجسد عنصری پر، یا جسد مثالی پر۔ یہی تشریح مقام ہذا پر مطلوب ہے۔ بندۂ نااہل ابو الاسعاد اپنی کم علمی کا اعتراف کرتے ہوئے حسب توفیق ایزدی کوشش کی ہے جو مفہوم جمہور سلف وخلف کے ہاں معتبر وغیر معتبر ہے اسے بیان کردیا جائے۔ مگر یہ بندہ اس میں کہاں تک کامیاب رہا۔ یہ ناظرین وقارئین باتمکین کے عقل سلیم پر موقوف ہے کہ وہ جو فیصلہ فرمادیں۔ بقول علامہ شاطبیؒ ؎

وَإِنَّمَا هِيَ أَعْمَالٌ بِنِيَّتِهَا　　　خُذْ مَا صَفَا وَاحْتَمِلْ بِالْعَفْوِ مَاكَدَرَ

ترجمہ: اور یہ مجموعہ تو صرف ایسے اعمال ہیں جو اپنی نیّت کے مؤافق ہیں پس جو مضمون صاف اور صحیح ہو اس کو تو لے لے۔ جو گدلا (غلط) ہو اس کو معافی کے باعث برداشت کرے۔

آمدم برسرِ مطلب۔ اس بات میں کہ محل عذاب کیا ہے ؟ صرف روح پر ہوتا ہے، یا صرف جسم پر ہوتا ہے ؟ یا دونوں پر ہوتا ہے۔ اس میں فرق اسلامیہ کے مذاہب مختلف ہیں۔ یہاں صرف اہم اور مشہور مذاہب کے بیان پر اکتفاء کر رہا ہوں۔

مذہب اوّل عبد اللہ بن کرام اور ابو الحسن صالحی وغیرہ کا مذہب یہ ہے کہ عذاب صرف جسم پر ہوتا ہے۔ لیکن جس جسم پر عذاب ہو رہا ہے اس میں کسی قسم کی بھی حیات نہیں ہے اس سے روح کا کوئی تعلق نہیں۔ بالکل بے جان ہونے کے باوجود جسم پر عذاب مانتے ہیں یہ اتنا احمقانہ مذہب ہے کہ قابل تردید بھی نہیں مشہور متکلم علامہ خیالیؒ شرح عقائد کے ص۱۱۹ حاشیہ نمبر۵ پر ارقام فرماتے ہیں

وَجَوَّزَ بَعْضُهُمْ تَعْذِيْبَ غَيْرِ الْحَيِّ وَلَا شَكَّ اَنَّهُ سَفْسَطَةٌ

مذہب دوم علامہ ابن حزم ظاہریؒ اور ابن میسرہؒ، ابن قیمؒ ان لوگوں کا مذہب یہ ہے کہ برزخ میں عذاب وثواب صرف روح کو ہوتا ہے جسم کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ یہ مذہب احادیث صریحہ ظاہرہ کے خلاف ہے،

کیونکہ عذاب قبر کی روایات اس پر دال ہیں کہ یہ معاملہ جسم پر ہو رہا ہے۔ مشکوٰۃ شریف ص۴۲ ج۱ باب آداب الخلاء کی فصل اول میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دو قبروں کے پاس سے گذرے اور فرمایا کہ ان دونوں کو عذاب ہو رہا ہے ان دونوں پر ٹہنی گاڑی ہے۔ یہ حدیث صراحۃً اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ عذاب اسی گڑھے میں ہو رہا ہے۔ نیز احادیث میں تصریح ہے۔ يُقَالُ لِلْاَرْضِ التَئِمِيْ عَلَيْهِ فَتَلْتَئِمُ عَلَيْهِ فَتَخْتَلِفُ اَضْلَاعُهٗ یہ الفاظ صراحۃً عذابِ جسم پر دلالت کر رہے ہیں۔

مذہب سوم صوفیاء کرام کا مذہب یہ ہے کہ روح مع الجسد المثالی پر عذاب ہوتا ہے نہ کہ جسدِ عنصری پر یعنی یہ حضرات جسدِ مثالی پر وقوع عذاب کے قائل ہیں۔ چنانچہ علامہ محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ فرماتے ہیں:۔

" وذهب الصوفية الى انه جسد المثالی وهو اكشف عن علم الارواح واللطف من علم الاجساد (فيض الباری ص۴۹۲ ج ۲ "

نیز فرماتے ہیں:۔

" قال الصوفية انه بالجسد المثالی دون الترابی (فيض الباری ص۱۸۶ ج۱)

مذہب چہارم توقیف وتفویض محض، یعنی کیفیتِ عذاب رب ذوالجلال ہی بہتر جانتے ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ عذاب ہوتا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن الہمام مسامرہ میں فرماتے ہیں:۔

العذاب حق والكيف مُفَوَّضٌ اِلَى الله جَلَّ شانهٗ ومنهم اى من الحنفية من اوجب التصديق بذالك اى العذاب القبر ونعيمه ومنع من الاشتغال بالكيفية اى بكيفية عود الروح والادراك بل طريقه هو التفويض اى تفويض علم كيفيته ذالك الى الخالق عزّوجلّ كما هو شان السّلف فى تفويض علم ما يشكل ظاهرهٗ اليه سبحانه وتعالى (مسامرہ ص۲۱۳)

مذہب پنجم اہل السنۃ والجماعۃ کے نزدیک عذاب وثواب جسدِ عنصری مع الروح پر ہوتا ہے اور جسم میں نوع مِنَ الحیات ہوتی ہے۔ لیکن یہ

حیات ایسی نہیں ہوتی جس میں کھانے پینے وغیرہ کی ضرورت ہو اور جس میں رُوح جسم کے اندر تصرُّف اور تدبیر کرتی ہو اس وقت جو دنیا میں ہماری حیات ہے اس میں روح کا جسد سے تدبیر و تصرف کا تعلّق ہے اور ایسے تعلّق سے جسم کی حرکات محسوس ہوتی رہتی ہیں اور اسے کھانے پینے کی احتیاج ہوتی ہے۔ قبر میں رُوح کا جسد سے تعلّق تو ہے جس سے نوع من الحیات پیدا ہو جاتی ہے لیکن یہ تعلّق تدبیر و تصرُّف کا نہیں ہے وہ دنیا میں تھا اور ختم ہو گیا ایسا تعلّق دوبارہ صرف آخرت میں ہوگا۔

موقفِ اہلُ السُّنّۃ والجماعۃ کے دلائل

اہلُ السّنّۃ والجماعۃ نے عذابِ قبر کے بارہ میں جو موقف اختیار کیا ہے یہ بالکل احادیث صحیحہ صریحہ کے مطابق ہے چند دلائل مُلاحظہ فرماویں۔

مُستدل اوّل ۔ مشکوٰۃ شریف ص۲۴ ج ا فصل اوّل باب اثبات عذاب القبر میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے "اِنَّ العَبدَ اِذَا وُضِعَ فِی قَبرِہٖ اَتَاہُ مَلَکَانِ" اس سے معلوم ہوا کہ جس قبر میں اس بندہ کو دفن کرنے والوں نے رکھا ہے وہیں فرشتے آتے ہیں سوال و جواب وہیں ہوتا ہے۔ پھر اسی روایت میں ہے یُقعِدَانِہٖ یہ بٹھانا بھی جسم کی کیفیت ہے "یسمعھا من یلیہ غیرا لثقلین" یہ لفظ صراحۃً بتاتے ہیں کہ یہ معاملات اس قبر میں ہوتے ہیں۔

مُستدل دوم ۔ مشکوٰۃ شریف ص۲۴ ج ا فصل اوّل باب اثبات عذاب القبر حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی روایت ہے "فَقَالَ اِنَّ ھٰذِہٖ الامّۃ تبتلی فی قبورھا" اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ جس گڑھے میں یہ جسم خاکی رکھا گیا ہے وہیں عذاب ہو رہا ہے اس لیے تو انہیں قبروں کے پاس پہنچ کر سواری بدکی ہے۔

مُستدل سوم ۔ مشکوٰۃ شریف ص۴۲ ج ا باب آداب الخلاء فصل اوّل میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دو قبروں کے پاس سے گزرے اور فرمایا کہ ان دونوں کو عذاب ہو رہا ہے "قال مرّ النبیّ ﷺ بقبرین فقال انّھما لیُعذّبَانِ" پھر ان دونوں پر ٹہنیاں گاڑیں۔ یہ روایت صراحۃً اس بات پر دلالت

کرتی ہے کہ یہ عذاب اسی گڑھے میں ہو رہا ہے جس کے پاس سے حضورؐ گذرے تھے۔

مُستدل چہارم ۔ مشکوٰۃ شریف ص۲۵ ج ۱ باب اثبات عذاب القبر فصل ثانی حضرت براءؓ بن عازب کی طویل روایت ہے اس میں تصریح ہے " ویعاد روحه فی جسدہٖ " کہ روح کا جسم میں اعادہ کیا جاتا ہے اس سے تو بات اور واضح ہوجاتی ہے کہ جسم مع الروح پر عذاب و ثواب ہو رہا ہے اور روح کا جسد کے ساتھ تعلق ہے۔

یقول ابوالاسعاد : حضرت براءؓ بن عازب کی روایت پر بہت اعتراضات کیے گئے ہیں (خصوصًا علامہ ابن حزم ظاہری نے روایت براء بن عازب کو لیسَ بِشیئٍ ثابت کرنے کی بڑی کوشش کی ہے) تو ان سب کے شافی، کافی وافی جوابات علماء نے دے دیئے ہیں۔ مَنْ شَآءَ فلیطالع کتابَ الروح للحافظ ابن القیمؒ۔

ثانیًا : اگر روایت براء بن عازب سے دلیل نہ بھی پکڑی جائے تو بھی کوئی مُضر نہیں کیونکہ ہمارا مقصد صحیحین کی حدیثوں (بحوالہ مشکوٰۃ شریف) سے ہی واضح ہو جاتا ہے۔

ثالثًا : اس بندہ ناکارہ نے حسب توفیق ایزدی حضرت براءؓ بن عازب کی روایت پر ہونے والے چند اعتراضات کے مختصرًا جوابات دینے کی کوشش کی ہے جو معتبر کتابوں کے حوالے نقل کرنے کے بعد پیش خدمت ہوں گے

کتب مُعتبرہ سے چند حوالہ جات

حوالہ جات میں عربی عبارت سے متن کا مکمل اردو ترجمہ کرنے کے بجائے صرف مفہومًا اور منطوقًا اشارہ کردیا گیا ہے تاکہ طوالتِ کلام سے بچا جاسکے۔ فافهم یا ایّها التالی

حوالہ اوّل محقق و مدقق علّامہ ابن الہمام رقم طراز ہیں :-

" ولذا کان الحقّ انّ المیّت المعذّب فی قبرہٖ توضع فیه الحیاۃ بقدر ما یحسّ بالالم والبنیة لیست لبشرطٍ عند اهل السنة حتی لوکان مُتفرّق الاجزاء بحیث لا تتمیّز الاجزاء بل هی مختلطة بالتراب فعذّب جعلت الحیاۃ فی تلك الاجزاء التی لا یأخذها البصر وانّ الله علیٰ ذالك لقدیر۔ " فتح القدیر ص۱۰۶ ج ۲

مطبوعہ احیاء التراث العربی بیروت)

علامہ ابن الہمامؒ کی عبارت کا مفہوم واضح ہے کہ جسم پر عذاب ہونے کے لیے یا رُوح کا جسم سے تعلّق ہونے کے لیے بقاء البنیہ شرط نہیں ہے یعنی اس کے لیے جسم کے ڈھانچہ کا محفوظ رہنا شرط نہیں ہے۔ حق تعالیٰ کی قدرت میں ہے کہ جسم کے کل یا بعض اجزاء جو مٹی میں مل چکے ہوں کہ جن کی تمیز مشکل ہو۔ رُوح کا تعلّق قائم کر کے ان میں نوع من الحیاۃ پیدا کر کے عذاب و ثواب دے۔ فافہم وتدبّر ایھا التالی۔

حوالہ دوم[۲] امام نوویؒ شارح صحیح مسلم ص۳۸۵ ج ۲ و ص۳۸۶ باب عرض مقعد المیت من الجنّۃ والنّار علیہ۔ میں اس مسئلہ پر بحث فرمائی ہے۔ مذاہب نقل کرنے کے ساتھ ساتھ شُبہات کے بھی جوابات ارشاد فرمائے ہیں اور مسلک اہل السنّۃ والجماعۃ کو واضح کیا ہے فرماتے ہیں:۔

"ثمّ المعذّب عند اهل السنة الجسد بعينه او بعضه بعد اعادة الروح اليه اوالى اجزاء منه"

اعادۃ الروح کے الفاظ دال بر مسلک اہل السُنّۃ والجماعۃ ہیں۔

حوالہ سوم[۳] حافظ ابن حجر عسقلانی رح فرماتے ہیں:۔

" وذهب ابن حزم وابن هبيرة الى انّ السوال يقع على الروح فقط من غير عود الى الجسد وخالفهم الجمهور فقالوا تعاد الروح الى الجسد او بعضه كما ثبت فى الحديث ولو كان على الروح فقط لم يكن للبدن بذالك اختصاص"

(فتح البارى شرح صحيح بخارى باب ماجاء فى عذاب القبر ص۲۳۵ ج ۳ مطبوعہ دار المعرفت بیروت)

عبارت مذکورہ کے الفاظ "تعاد الروح الى الجسد او بعضه" واضح طور پر دال بر مسلک اہل السنۃ والجماعۃ ہیں خصوصًا کما ثبت فی الحدیث کے الفاظ۔

حوالہ چہارم[۴] فِقہ اکبر میں ہے:۔

سؤال منكر ونكير حقٌّ فى القبر واعادة الروح

الى الجسد فى قبره حقٌ و ضغطة القبر حقٌ و عذابه حقٌ للكافرين كلهم اجمعين وبعض عصاة المؤمنين ۔ ص۶۶)

اسی عبارت کی شرح کرتے ہوئے مُلّا علی قاریؒ فرماتے ہیں "

اعلم ان اهل الحق اتفقوا على ان الله تعالىٰ يخلق فى الميت نوعًا حياة فى القبر بقدر ما يتألم و يلتذ (شرح فقہ اکبر ص۱۲۲ مطبوعہ مطبع مجتبائی دھلی)

حوالہ پنجم⁵

ملا علی قاریؒ باب اثبات عذاب القبر کی دوسری حدیث کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

وفيه دلالة على حياة الميت فى القبر لان الاحساس بدون الحياة ممتنع عادةً۔ (مرقاة شرح مشكوٰة ص۱۹۸ ج ۱۔ باب اثبات عذاب القبر۔)

حدیث براءؓ بن عازب پراعتراضات اوراُن کے جوابات

جن احادیث صحیحہ سے جمہور اہل السُّنّة والجماعة نے اپنے مسلک پر دلیل پکڑی ہے ان میں ایک حدیث حضرت براء بن عازب بھی ہے اس میں یہ لفظ ہیں " يعاد روحه فى جسده "، اس کی سند پر کچھ اعتراضات کیے گئے ہیں اور معترضین میں سرفہرست حافظ ابن حزمؒ ہیں۔ انہوں نے بڑی کوشش کی ہے اس حدیث کو گرانے کی ۔ یہاں ان اعتراضات کو نقل کر کے مختصرًا جواب دیں گے ۔ مزید تشریح من شاء فليطالع كتاب الروح للحافظ ابن القيمؒ۔

اعتراض اوّل¹

اس حدیث پر پہلا اعتراض یہ ہے کہ اس کو حضرت براءؓ سے نقل کرنے والے زاذان ہیں اور وہ " يُعاد روحه إلى جسده " والی زیادتی نقل کرنے میں متفرد ہیں۔ لہٰذا منفرد کی زیادتی غیر مقبول ہے۔

جواب اوّل یہ ہے کہ زاذان ثقہ ہیں بہت سے ائمہ حدیث نے ان کی توثیق کی ہے۔ یحیٰ بن معینؒ نے ان کی توثیق کی ہے۔ حمیدؒ بن بلال نے ان کے بارے میں کہا ہے " ھو ثقۃ لا تسئل عن مثل ھؤلاء " (کتاب الروح ص۵۹) یحیٰ بن معین کا قول حافظؒ نے نقل کیا ہے " ثقۃ لا یسئل عن مثلہ (تہذیب التہذیب ص۳۰۳ ج ۳)

محدثینؒ کا یہ متفقہ قاعدہ ہے کہ ثقہ اگر کسی حدیث میں کوئی زائد بات نقل کرے جس کو دوسرے نقل نہیں کرتے تو یہ زیادتی مقبول ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر زاذان متفرد بھی ہوں اس زیادتی کے نقل کرنے میں تب بھی قواعد محدثینؒ کی روشنی میں اسے قبول کرنا پڑے گا۔

جواب دوم حضرت براءؓ سے اس حدیث کو نقل کرنے میں زاذان متفرد نہیں ہے بلکہ ان کے اور بھی متابعات ثقات ملتے ہیں۔

چنانچہ حافظ ابن القیمؒ کتاب الروح میں فرماتے ہیں " وقد رواہ عن البراء بن عازب جماعۃ غیر زاذان منھم عدی بن ثابت و محمد بن عقبۃ و مجاھد (کتاب الروح ص۵۶)

اس کے بعد متابعت والی روایات پیش کی ہیں :

متابع اوّل حافظ ابن مندہ کی کتاب کتاب الروح والنفس میں اس سند سے یہ حدیث ہے :۔

اخبرنا محمد بن یعقوب بن یوسف قال حدثنا محمد بن السفار انا ابوالنضر ھاشم بن القاسم ثنا عیسٰی بن المسیب عن عدی بن ثابت عن البراء بن عازب قال خرجنا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی جنازۃ رجل من الانصار (کتاب الروح ص۵۶ بحوالہ کتاب الروح والنفس للحافظ ابن مندہ)

اس طویل حدیث میں " تعاد روحہ " کے لفظ کے بجائے " فترد روحہ الی مضجعہ " کے لفظ ہیں۔ اس سند میں حضرت براءؓ سے نقل کرنے والے

زاذان نہیں بلکہ عدی بن ثابت ہیں۔ اور عدی سے نقل کرنے والے منہال نہیں بلکہ عیسی بن مُسیّب ہیں۔

مُتابع دوم ابن مُندہ نے ایک اور سند پیش کی ہے: من طریق بن سلمة عن خصیف الجزری عن مجاهد عن البراء بن عازب) اس میں براءؓ سے نقل کرنے والے مجاہد ہیں اور مجاہد سے نقل کرنے والے منہال نہیں بلکہ خصیف جزری ہیں۔ غرضیکہ نہ زاذان مُتفرد ہے نہ منہال متفرد ہے، دونوں پر تفرد کا الزام غلط ہے۔

اعتراض دوم: اس حدیث پر یہ کیا گیا ہے کہ زاذان کو حضرت براءؓ سے سماع حاصل نہیں۔ لہذا یہ روایت منقطع ہوئی۔

جواب: یہ الزام بھی غلط ہے اوّلاً اس لیے کہ رجال کی تمام کتابوں میں اس کی تصریح موجود ہے کہ زاذان جن صحابہ کرامؓ سے روایت کرتے ہیں وہ حضرت براءؓ بن عازب ہیں (کما فی تہذیب التہذیب ص۳۰۲ ج ۳)۔ ثانیاً: صحیح ابو عوانہ میں سماع کی تصریح موجود ہے (کتاب الروح ص۵۹ ج ۳) یعنی زاذان اس کو سَمِعْتُ البراء کہ کر نقل کرتے ہیں اس کے بعد کسی قسم کا خلجان باقی نہیں رہنا چاہیئے۔

اعتراض سوم۔ اس حدیث کو زاذان سے نقل کرنے والے منہال بن عمرو ہیں اور منہال ضعیف ہیں۔ لہذا یہ حدیث قابل قبول نہیں کیونکہ یہ حدیث ضعیف ہوگی۔

جواب: منہال کو ضعیف کہنا غلط ہے اس لیے کہ بہت سے ائمہ رجال نے ان کی توثیق کی ہے۔ حافظ ابن القیمؒ اپنی کتاب، کتابُ الروح میں فرماتے ہیں:۔

فالمنهال احد الثقات العدول قال ابن معين المنهال ثقة وقال العجل كوفى ثقة (کتابُ الروح ص۵۹) اسی طرح حافظ ابن حجرؒ نے بھی ان کی توثیق فرمائی ہے (تہذیبُ التہذیب ص۳۲۰ ج ۱۰)

حقیقت جرح بر منہال

منہال بن عمرو پر جو جرح کی گئی ہے وہ مفصلاً تہذیب التہذیب میں موجود ہے۔

مختصراً عرض ہے کہ منہال بن عمرو کے گھر سے کسی نے گانے کی آواز سنی ۔ حافظ ابن حجرؒ ارشاد فرماتے ہیں :۔

ولیس علی المنهال جرح فی ما حکی ابن ابی حاتم فذکر حکایة المتقدمة

آخر میں حافظ ابن القیمؒ فرماتے ہیں :۔

وجرحه بهذا تعسف ظاهر (تهذیب التهذیب ص۳۲۰ ج۱۰)

یعنی اس بنا پر ان پر جرح کرنا کھلی بے انصافی ہے اس لیے کہ اولاً تو یہ متیقن نہیں کہ انہی کے گھر سے آواز آرہی تھی ہو سکتا ہے کہ پڑوس کے گھر سے یہ آواز آئی ہو۔ ثانیاً اگر انہی کے گھر سے آئی تھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ وہاں موجود نہ ہوں۔ یا یہ بات ان کے علم میں نہ ہو۔ اس لیے اس بنا پر جرح بعید از انصاف ہے ۔ حافظ ابن حجرؒ نے یہ بھی نقل کیا ہے ۔

قال وهب بن جریر عن شعبة اتیتُ منزل المنهال فسمعت منه صوت الطنبور فرجعت ولم اسئله قلت فهلا سألته عسیٰ کان لا یعلم (تهذیبُ التهذیب ص۳۲۰ ج۱۰)

اس سے ثابت ہوا کہ شعبہ کو اس بات کی ہرگز اور بالکل تحقیق نہیں ہوئی کہ واقعی یہ آواز ان کے اختیار میں تھی اور ان کے علم میں تھی ۔

یقول ابوالاسعاد : اگر علی سبیل التنزّل تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ زیادتی "یعاد روحه الی جسده" منہال بن عمرو کی وجہ سے ضعیف ہے تب بھی اس کو تسلیم کیے بغیر چارہ کار و فرار ممکن نہیں ۔ اس لیے کہ عند المحدثینؒ حدیث ضعیف کو اگر تلقی بالقبول کا شرف حاصل ہو جائے تو وہ حدیث صحیح کے حکم میں ہوتی ہے ۔ آپ کو بہت سے مسائل کی احادیث ایسی نظر آئیں گی کہ جن کی سند پر کلام ہے لیکن اس سے جو مسئلہ نکلتا ہے اس کو اکثر تسلیم کرتے ہیں ۔ سنن ترمذی شریف میں ان کی بہت سی مثالیں آسانی سے مل سکتی ہیں ۔ امام ترمذیؒ حدیث کی سند پر کلام فرماتے ہیں اس کے بعد یوں گویا ہوتے ہیں " والعمل علیه عند اهل العلم"

آخر میں حدیث مذکورہ کی صحت کے بارہ میں ائمہ حدیث سے دو شہادتیں پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں :۔

شہادت اُولیٰ

حدیث کے مشہور امام حافظ ابو عبد اللہ الحاکم اپنی کتاب "المُستدرک" میں فرماتے ہیں :-

هٰذا حدیثٌ صحیحٌ علی شرط الشیخین وقد احتجا جمیعًا بالمنهال بن عمرو وزاذان ابی عمر الکندی وفی هٰذا الحدیث فوائدُ کثیرةٌ لاهل السنة وقمع للمُبتدعة - (مُستدرک حاکم ص۳۹ ج۱ مطبوعہ دار الفکر بیروت)

شہادت ثانیہ

حافظ ابنُ القیمؒ اس حدیث کے مُتعلق ارشاد فرماتے ہیں " هٰذا حدیثٌ ثابتٌ مشهورٌ مُستفیضٌ صححه جماعةٌ من الحُفّاظ ولا نعلم احدًا من ائمة الحدیث طعن فیه بل رووه فی کتبهم وتلقّوه بالقبول وجعلوه اصلاً من اصول الدین فی عذاب القبر ونعیمه وسؤاله منکرٍ ونکیرٍ وقبض الارواح وصعودها الی بین یدی الله ثم رجوعها الی القبر (کتابُ الروح ص۵۹)

اِختتامیہ

اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ احادیث کثیرہ، صحیحہ، صریحہ کے مُطابق اہلُ السُّنّة والجماعة کے نزدیک عذاب اسی دفن کیے ہوئے جسم پر ہوتا ہے اور روح کے تعلّق سے اس میں ایک گونہ حیات ہوتی ہے۔ اور اس میں جو اہم اشکالات تھے۔ ان کے جوابات کا خُلاصہ حسبِ توفیق ایزدی پیش کر دیا ہے۔ مزید مَنْ شاء فلیطالع الی کتب المُطوّل - واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم!

سُبحَانَكَ لَاعِلمَ لَنَا اِلّا مَا عَلَّمتَنَا اِنَّكَ اَنتَ العَلِیمُ الحَکِیمُ ط

ابو الاسعاد یوسف حجاجروی

نزیل جامعہ اسلامیہ بدر العلوم حمادیہ

رحیم یار خان - ۲۶/۶/۱۴۲۳ھ

الفصل الاوّل

یہ پہلی فصل ہے۔

عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْمُسْلِمُ اِذَا سُئِلَ فِي الْقَبْرِ يَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ فَذٰلِكَ قَوْلُهٗ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ

ترجمہ : روایت ہے حضرت براءؓ بن عازب سے وہ نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم سے راوی ہیں فرمایا کہ مسلمان سے جس وقت قبر میں سوال کیا جاتا ہے تو گواہی دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں، بلاشبہ محمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم اللہ کے رسول ہیں، اور یہی مطلب ہے اس ارشادِ ربّانی کا کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ثابت و قائم رکھتا ہے جو ایمان لاتے ہیں مضبوط اور محکم طریقہ پر ثابت رکھنا دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں۔

قولہٗ اَلْمُسْلِمُ : مقام ہذا پر ایک سوال ہوتا ہے :

سوال : لفظ مُسْلِمٌ مذکّر مؤمن پر بولا جاتا ہے حالانکہ قبر میں سوال مذکر و مؤنث دونوں سے ہوگا مگر حضرتؐ نے مذکّر کی تخصیص کیوں فرمائی ؟

جواب اوّل ، اَلْمُسْلِمُ کی الف لام جنس کی ہے اور مُسلم کا معنیٰ ہے مَنْ اَسْلَمَ جو بھی اسلام لائے خواہ وہ مذکّر ہو یا مؤنّث ہو لہذا عمومیّت کی وجہ سے مذکّر مؤنث دونوں کو شامل ہے۔

جواب دوم : یہ کہ مُسلم سے مذکّر مراد ہے۔ مگر ذاتِ باری تعالیٰ کی عادتِ مبارکہ ہے کہ

احکام کے اندر جوانوں کو خطاب فرماتے ہیں۔ لیکن عورتیں تبعاً آجاتی ہیں۔ کما فی قولہ تعالیٰ "کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ"، جب کہ فرضیتِ صیام میں رجال و نساء دونوں برابر ہیں مگر خطاب رِجال کو ہے۔

قولہٗ اِذَا سُئِلَ فِی الْقَبْرِ : یعنی جب قبر میں سوال کیا جاتا ہے۔

سوال : یہ سوال تو ہر میت سے ہوتا ہے قبر میں دفن ہو یا نہ ہو پھر قبر کی تخصیص کیوں کی گئی۔

جواب : شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اشعۃ اللّمعات میں فرماتے ہیں کہ یہاں قبر سے اصطلاحی قبر یعنی معروف زمینی گڑھا مراد نہیں بلکہ قبر سے مراد عالمِ برزخ ہے یعنی جہاں میت موجود ہو جس حالت و جس کیفیت میں ہو کما مرّ انفاً۔

فائدہ قبر کے دو اطلاق ہیں ایک فقہاء حضرات کا دوسرا متکلمین حضرات کا۔ فقہاء حضرات کے نزدیک قبر کا اطلاق اس گڑھے پر ہے جس میں لاش رکھی ہوئی ہے کیونکہ فقہاء حضرات بحث کرتے ہیں احکام کی اور احکام اس گڑھے کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ متکلمین حضرات کے نزدیک قبر اس گڑھے کا نام نہیں بلکہ برزخ کا نام قبر ہے اس لیے ان کی بحث عذاب و تنعیم سے ہے اور عذاب و تنعیم کا تعلق اس گڑھے کے ساتھ نہیں کیونکہ اس گڑھے میں عذاب قبر نہیں ہوتا بلکہ برزخ میں عذاب ہوتا ہے تو اس سے یہ سوال دفع ہو گیا جیسا کہ سابق میں گذرا کہ ایک آدمی کو آگ میں جلا دیا جاتا ہے یا پانی میں ڈبو دیا جاتا ہے اور اس کو مچھلیاں وغیرہ کھا جاتی ہیں اور اس کو قبر میں دفن نہیں کیا گیا تو پھر اس کو عذاب کیسے ہو رہا ہے کیونکہ یہ دفن نہیں کیا گیا تو متکلمین حضرات یہی جواب دیتے ہیں کہ قبر سے مراد برزخ ہے اور برزخ میں ہر ایک پہنچ جاتا ہے یہ گڑھا مراد نہیں۔ اب اس برزخ کی تشریح ہو جائے کہ برزخ کا کیا معنیٰ ہے۔

تشریحِ برزخ

برزخ کے دو معنیٰ ہیں ۱ لغوی ۲ اصطلاحی۔

لغوی معنیٰ : آڑ اور حدِ فاصل کے ہیں ; کَمَا فِی قَوْلِہٖ تَعَالیٰ "وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ط (پ۱۸ المؤمنون)

اِصطلاحی معنیٰ : دنیا کے بعد اور آخرت سے پہلے " هُوَ مَا بَيْنَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ (کتابُ الرّوح ص۹) " واسطہ است میانِ دنیا و آخرت " (اشعۃ اللمعات) بعض صوفیاء اس کو عالمِ مثال بھی کہتے ہیں۔

سوال تم کہتے ہو کہ عذابِ قبر سے عذابِ برزخ مُراد ہے۔ حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم عذابِ قبر فرماتے ہیں۔ دوسرے محدّثین حضرات بھی عذابِ قبر کہتے ہیں نہ کہ عذابِ برزخ۔

جواب عذابِ برزخ کو عذابِ قبر کہنا باعتبار غالبیت کے ہے کیونکہ اکثر طور پر مُردوں کو قبروں میں دفن کیا جاتا ہے یہ شاذونادر ہے کہ کسی کو آگ میں جلایا جائے تو غالبیّت کی بناء پر عذابِ قبر کہا "

وَسُمِّيَ عَذَابُ الْقَبْرِ وَنَعِيْمُهُ وَانَّهُ رَوْضَةٌ اَوْحُفْرَةُ نَارٍ بِاِعْتِبَارِ غَالِبِ الْخُلُقِ (کتابُ الرّوح ص۹)

قولہٗ نَزَلَتْ فِي عَذَابِ الْقَبْرِ : یہ آیت عذابِ قبر کے بیان میں نازل ہوئی۔

سوال اس آیت میں مؤمن کو عذاب ہونے کا کوئی ذکر نہیں بلکہ مؤمن کے ثابت رہنے کا ذکر ہے۔ پھر یہ کیسے فرمایا کہ عذابِ قبر کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس سوال کو یوں بھی پیش کیا جا سکتا ہے کہ سورۃ ابراہیم کی آیت ۲۷ ہے اور سورۃ ابراہیم تو مکّی ہے اور احادیث صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور علیہ السّلام کو عذابِ قبر کا علم مدینہ منوّرہ میں ہوا۔ اب یہ آیت عذابِ قبر کے لیے کیسے ہو سکتی ہے؟

جوابِ اوّل ۔ سورۃ ابراہیم کی اس خاص آیت کو مدنی مانا جائے لیکن یہ کہیں طُرقِ صحیحہ سے منقول نہیں۔

جوابِ دوم مُفسّرین حضرات فرماتے ہیں کہ " بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ " سے مراد کلمہ شہادت ہے اور حضرت ابو سعید خدری فرماتے ہیں کہ " فِي الْآخِرَةِ سے مراد قبر ہے اور قبر سے مراد عالمِ برزخ ہے۔

جوابِ سوم آیت میں لفظ فِي الْآخِرَةِ وارد ہوا ہے۔ اور آخرت دو ہیں ۱ آخرت قریبہ یعنی عالمِ برزخ ۲ آخرت بعیدہ یعنی عالمِ حشر۔

لفظ آخرت اپنے عموم کی وجہ سے دونوں کو شامل ہے۔ پس حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کو مؤمنین کے متعلّق ثابت قدم رکھنے اور کافروں کے متعلق ثابت قدم نہ رہنے کا وہ حصّہ جو قیامت کے متعلّق تھا وہ مکّہ معظّمہ ہی میں منکشف ہوگیا، اور دوسرا حصّہ یعنی عذابِ قبر اور نعیم قبر مدینہ منوّرہ میں منکشف ہوا۔ پس آیت کے کلّی ہونے اور آیت کے عذابِ قبر کے بارہ میں نازل ہونے میں کوئی تنافی نہیں رہی۔

قولہٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيَ اللهُ ۔ قبر میں تین سوال ہوں گے۔ ۱ رب کے متعلق ۲ رسول کے متعلق ۳ مذہب کے متعلق۔

سوال : ان تین کی تخصیص کیوں ہے ؟

جواب : انسان دنیا میں تین تعلّق قائم کرنے کے لیے آیا ہے :۔

اوّل مالک سے جس کا سوال مَنْ رَبُّكَ سے ہوگا۔

دوّم رسول سے جس کا سوال مَنْ نَبِيُّكَ سے ہوگا۔

سوّم مذہب سے جس کا سوال مَنْ دِيْنُكَ سے ہوگا۔

تخصیص کی وجہ بھی یہی تین تعلّق ہیں اور یہی مدارِ نجات ہیں۔

قولہٗ وَنَبِيِّيْ مُحَمَّدٌ :

سوال : یہ ہے کہ سوال تو صرف یہ تھا مَنْ رَبُّكَ تو جواب میں نبی کا اضافہ کیوں کیا گیا۔

جواب اوّل : دراصل سوال میں مَنْ رَبُّكَ وَمَنْ نَبِيُّكَ تھا لیکن راوی نے اختصار کردیا جس پر دوسری روایت دال ہے۔

جواب دوّم : چونکہ مؤمن کو یقین ہوگا کہ دوسرا سوال نبوّت ہی کے بارہ میں ہوگا اس لیے خوشی ومسرّت میں سوالوں سے قبل ہی جواب دے گا۔ خلاصہ یہ کہ غایتِ سرور کی وجہ سے جواب میں اضافہ کردیا۔

وَعَنْ اَنَسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا وُضِعَ فِيْ قَبْرِهٖ وَ

ترجمہ : روایت ہے حضرت انسؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے کہ جب بندے کو قبر میں رکھا جاتا ہے،

تَوَلّٰی عَنْهُ اَصْحَابُهٗ اَنَّهٗ لَيَسْمَعُ قَرْعَ نِعَالِهِمْ اَتَاهُ مَلَكَانِ فَيُقْعِدَانِهٖ فَيَقُوْلَانِ مَاكُنْتَ تَقُوْلُ فِيْ هٰذَا الرَّجُلِ لِمُحَمَّدٍ

اور اس کے ساتھی لوٹتے ہیں تو وہ ان کی جوتیوں کی آواز سنتا ہے اور اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں اور بٹھاتے ہیں، پھر کہتے ہیں کہ تو اس صاحب کے متعلق کیا کہتا تھا یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں۔

قولہٗ تَوَلّٰی : تَوَلّٰی کی تشریح خود حدیثِ پاک میں ہے جیساکہ مسلم شریف کی روایت کے الفاظ ہیں اِذَا انْصَرَفُوْا تو گویاکہ تَوَلّٰی سے پھرنا مراد ہے

قولہٗ لَيَسْمَعُ : یہ بفتح اللام ہے للتاکید۔

قولہٗ قَرْعَ نِعَالِهِمْ : قَرْعَ بمعنیٰ صوت نِعال بکسر النون جمع نَعْل بمعنیٰ جوتے یعنی جوتیوں کی کھڑکھڑاہٹ یہ جملہ حالیہ ہے اس سے پہلے واو مُقدر ہے۔ وَاِنَّهٗ اور اَتَاهُ جزا ہے اِذَا وُضِعَ کی یا اِنَّهٗ لَيَسْمَعُ جزاء ہے اور اَتَاهُ جملہ حالیہ ہے، اس سے قبل قَدْ مقدر ہے اَیْ قَدْ اَتَاهُ۔

فائدہ جوحضرات سماعِ مُوتیٰ کے قائل ہیں وہ روایت مذکورہ سے دلیل پکڑتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایاکہ مُردہ دفن کرکے واپس ہونے والے آدمیوں کی جوتیوں کی آہٹ سنتا ہے تومعلوم ہواکہ سماع ثابت ہے۔ بندہ ابوالاسعاد عرض گذار ہے کہ اس کی مکمل بحث "اَلْمَذْهَبُ الْمَاثُوْرُ فِيْ بَيَانِ عَدَمِ سِمَاعِ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ"، (زیرطبع) میں مُلاحظہ کی جاسکتی ہے۔

ثانیاً جوحضرات سماعِ مُوتیٰ کے قائل ہیں وہ سماعِ کلّی کے قائل ہیں۔جب کہ حدیث مذکورہ میں سماعِ جُزئی کا اثبات ہے کیونکہ حدیث پاک کے الفاظ ہیں اَصْحَابُهٗ اور نِعَالِهِمْ کی ضمیر اَصْحَاب کی طرف لوٹ رہی ہے۔ لہٰذا صرف ان کی جوتیوں کی آواز سُن رہا ہوتا ہے نہ کہ ہر آواز۔

ثالثاً یہ حدیث خبرِ واحد ہے جب کہ قرآن مُقدّس کے اندر نص قطعی آچکی ہے:

"وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِی الْقُبُوْرِ" اور حضرت امام اعظمؒ کے نزدیک نص قطعی کے مقابلہ میں جب خبر واحد آجائے تو نص قطعی کو اپنے مورد پر بند کرتے ہوئے خبر واحد میں تاویل کریں گے۔ چنانچہ اب خبر واحد (حدیث قرع نعال) میں تاویل کریں گے، اور یہ تاویل فقیہ اُمت حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ رحمۃً واسعۃً نے کوکب الدری صـ۳۱۹ و تقریر البخوہی صـ۱۳۲ میں یہ کی ہے کہ یہ کنایہ ہے سُرعتِ اِتیانِ ملکین سے کہ فرشتے اتنی جلدی نازل ہوتے ہیں کہ ابھی آپ مٹی ڈال کر فارغ ہو رہے ہوتے ہو کہ فرشتوں کی آمد شروع ہو جاتی ہے۔

قولہٗ اَتَاہُ مَلَکَانِ : اور اس کے پاس قبر میں دو فرشتے آجاتے ہیں۔ یہ دو فرشتے کون ہیں۔ اس میں دو قول ہیں :۔

اوّل : بعض علماء کے نزدیک کراماً کاتبین کی طرح ایک جماعت کثیرہ ہے وہ حساب لیتی ہے لہٰذا ملکان سے وہی مراد ہیں۔

دوم : جمہور حضرات کے نزدیک ملکان سے مراد منکر نکیر ہیں۔ منکَر (بفتح الکاف بصیغہ اسم مفعول) دوسرا نکیر بروزن فعیل سیاہ رنگ، نیلی آنکھوں والے ہوتے ہیں چونکہ ان کی شکل وصورت بالکل اوپری ہوتی ہے نہ تو آدمیوں کے مشابہ اور نہ فرشتوں کے اور نہ حیوانوں کے، بالکل نئی مخلوق ہوتی ہے۔ اس لیے ان فرشتوں کا نام منکر ونکیر ہے۔

عند البعض یہ فرشتے سائلین کفار ہوتے ہیں۔ اور مؤمنین کے لیے سوال کرنے والوں کا نام مبشر وبشیر ہے۔

سوال : ہوتا ہے کہ دو فرشتے وقتِ واحد میں تمام مُردوں سے مختلف مقامات میں کیسے سوال کرسکتے ہیں۔

جواب اوّل : یہ دو گروہوں کا نام ہے جن کے تحت بہت سے افراد ہوتے ہیں۔

جواب دوم : اللہ پاک نے ان کو اتنی قوتِ سماعت دے رکھی ہے کہ دو فرشتے وقت واحد میں تمام مردوں سے مختلف مقامات میں سوال کرسکتے ہیں جیسا کہ اللہ پاک نے ہزاروں کی بستیوں کو فرشتوں کے پَروں پر اٹھا کر اور الٹا کر تباہ کرا دیا۔ کما فی واقعۃ قوم لوطؑ

سوال۔ ہر مُردے سے سوال کرنے کے لیے دو فرشتے مقرر کرنے کی حکمت کیا ہے؟

جواب : یہ دو فرشتے بمنزلہ دو گواہوں کے ہیں یا یہ کہ دونوں کراماً کاتبین کے قائم مقام ہیں۔

قولہٗ فَیُقْعِدَانِہٖ : یہاں پر دو چیزیں ملاحظہ فرماویں ۱؎ قعود : یہ مقابلِ قیام ہے ۲؎ جلوس یہ مقابلِ اضطجاع (بمعنیٰ لیٹنا) ہے۔

سوال : حدیث پاک کے الفاظ ہیں کہ اس کو اٹھلاتے ہیں حالانکہ قعود مقابلِ قیام ہے یہاں پر جلوس ہونا چاہیے تھا۔ قعود کہنا صحیح نہیں ہے اس لیے کہ میّت کھڑا نہیں ہوتا بلکہ لیٹا ہوا ہوتا ہے۔

جواب اوّل : بعض دفعہ عرف میں مطلق بیٹھنے کے معنیٰ پر بھی لفظ قعود کا اطلاق ہوتا ہے۔ ھٰکذا فی ھٰذا المقام :

جواب دوم : یہ روایت بالمعنیٰ ہے کیونکہ بعض روایت فَیُجْلِسَانِہٖ ہے اوّل سے ثانی اولیٰ ہے۔

قبر کے سوال وجواب میں مؤمن وکافر برابر ہیں یا فرق ہے

اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے کہ یہ سوال وجواب مؤمن اور کافر سب سے ہوگا یا صرف کافر سے ہوگا یا صرف مؤمن سے ہوگا اس بارے میں دو قول ہیں۔

قول اوّل حافظ ابن القیمؒ اور علامہ ابن عبد البر فرماتے ہیں کہ سوال مؤمن اور منافق سے ہوگا، کافر سے سوال نہیں ہوگا کیونکہ سوال تو امتیاز کے لیے ہوگا جبکہ یہاں امتیاز کی ضرورت نہیں اس لیے کہ کافر مجاہر میں التباس نہیں ہے۔

سوال : بعض حدیث پاک میں کافر کا ذکر صراحۃً آتا ہے۔

جواب : کافر سے مراد بھی منافق ہے۔

قول دوم جمہور اہل السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ ہے کہ مؤمن کافر سب سے سوال ہوگا جیسے آیات قرآنیہ واحادیث سے ثابت ہوتا ہے۔ باقی قول اوّل والوں کی یہ دلیل کہ سوال امتیاز کے لیے ہوگا جب کہ کافر کے لیے تو امتیاز کی ضرورت نہیں یہ تو

سہو محض ہے کیونکہ سوال صرف امتیاز کے لیے نہیں ہوگا۔ بلکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اظہار شرافت اور کافروں پر الزام بھی مقصود ہوگا۔ جو یہاں مطلوب ہے۔

قولہ فیقولان ما کنت تقول فی ھذا الرجل لمحمد : اور اس کو بٹھا کر پوچھتے ہیں تم اس شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کیا کہتے تھے۔

یقول ابوالاسعاد : ھذا الرجل کے بعد لفظ لمحمد یہ راوی کی طرف سے ھذا الرجل کا بیان ہے۔ محدثینؒ نے لکھا ہے کہ فرشتے مختصر اور عام سے لفظ کے ساتھ اس لیے سوال کریں گے تاکہ مسئول عنہ کا پورا امتحان ہو سکے۔ تعظیمی الفاظ و القاب سے مسئول عنہ کو جواب کی طرف تلقین ہو سکتی تھی۔ جب کہ یہ امتحان کے مقصد کے خلاف ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ رجل سے تعبیر کرنا مسئول کے امتحان کے لیے ہے تاکہ وہ سائل فرشتہ کے الفاظ سے جواب نہ سمجھ لے۔

سوال ھذا اشارہ قریب کے لیے آتا ہے اور دنیا کے مختلف گوشوں میں ایک ہی وقت میں بہت سے اموات دفن ہوتے ہیں تو معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر جگہ ہر قبر میں حاضر ہوتے ہیں۔ لہذا اس سے حاضر و ناظر کا مسئلہ ثابت ہوا۔

جواب اول قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت مثالی قبر میں پیش کی جاتی ہے۔ چنانچہ شیخ محدث عبدالحق دہلویؒ فرماتے ہیں " با حضار ذات شریف وے در اعیان بایں طریق کہ در قبر مثالے از حضرت وے صلی اللہ علیہ وسلم حاضر می ساختہ باشند (اشعۃ اللمعات ص۱۱۵ ج ۱)

یقول شیخ جاجروی رحمہ القوی : جمہور حضرات نے محدثؒ کے اس قول کو ضعیف کہا ہے۔ چنانچہ علامہ قسطلانیؒ شرح بخاری ص۲۹ ج ۳ میں فرماتے ہیں "ولا نعلم حدیثا صحیحا مرویا فی ذالك۔

جواب دوم میت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان حجابات اٹھا دیے جاتے ہیں جس سے میت خود ذات مبارکہ کا مشاہدہ کر لیتی ہے لیکن یہ توجیہ بھی جمہور کے نزدیک ضعیف ہے۔ چنانچہ علامہ ہرویؒ حافظ ابن حجرؒ سے نقل کرتے ہیں :-

وَلَا یَلْزَمُ مِنَ الْاِشَارَۃِ مَا قِیْلَ مِنْ رفع الحجب بین المیّت وَ بَیْنَہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حتّٰی یراہ وَیَسْئَلُ عَنْہ لِاَنّ مثل ذالک لا یثبت بالاحتمال (مرقاۃ ص۱۹۹ ج۱)

علامہ جلال الدین سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ حافظ ابن حجرؒ سے سوال کیا گیا کہ " ھَلْ یکشف لہ حتّٰی یَرَی النّبیّ صلی اللہ علیہ وسلم فاجاب انہ لم یرد حدیث وانما ادعاہ بعض من لا یحتج بہ بغیر مستند (شرح الصدور ص۴۰)

جوابِ سوم | بسا اوقات کوئی چیز مشہور و معروف ہونے کی وجہ سے ذہنوں میں متعین ہوتی ہے تو اس کی طرف اشارہ قریب کر دیا جاتا ہے۔ اگرچہ حسًا وہ چیز غائب ہوتی ہے چنانچہ مُطوّل ص۱۳۱ میں ہے :۔

" ویجوز علی قلّۃٍ لفظ الحاضر نحو قاتل ھٰذا الرَّجُلِ وان کان غائبًا"

تو چونکہ حضور علیہ السّلام اپنی شہرت کی وجہ سے معہود ذہنی ہیں اس لیے بقول علامہ قسطلانیؒ اسی معہود ذہنی کی طرف اشارہ قریب کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ علامہ سیوطیؒ شرح الصّدور میں فرماتے ہیں :۔

"ولان الاشارۃ الی الحاضر فی الذھن"

اور مُلا علی قاریؒ فرماتے ہیں :۔

" واللّام للعھد الذّھنی " (مرقاۃ ص۱۹۹ ج۱)"

کلام فصیح اور بلیغ میں اس کی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں۔

مِثالِ اوّل : مسلم شریف ص۲۹۷ ج۲ میں ہے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ مکّہ سے بہت دور تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات سنے تو تحقیقِ حال کے لیے اپنے بھائی کو بھیجتے ہوئے کہا " اِرْکَبْ اِلٰی ھٰذَا الْوَادِیْ" بخاری شریف ص۵۴۴ ج۱ جب کہ ھٰذَا الْوَادِیْ کا مُشار الیہ مکہ ہے جو وہاں سے بہت دُور تھا۔

مِثالِ دوم : حضرت امیر معاویہؓ علاقہ شام سے مدینہ طیّبہ میں حضرت حسنؓ کے پاس دو قاصد بھیجتے ہوئے فرمایا " اِذْھَبَا اِلٰی ھٰذَا الرَّجُلْ" بخاری شریف ص۳۷۳ ج۱"

مثال سوم ۔ وفد عبد القیس ۵ھ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوتا ہے اور اپنے راستہ میں کفارِ مضر کا واقع ہونا ان الفاظ میں بیان کرتا ہے :۔

وَ بَيْنَا وَبَيْنَكَ هٰذَا الْحَيّ مِنْ كُفَّارِ مُضَرَ : (بخاری شریف ص۱۳ ج۱) جب کہ کفارِ مضر ان سے کوسوں میل دور تھے۔

قولہٗ قَدْ اَبْدَلَكَ اللّٰهُ بِهٖ مَقْعَدًا مِّنَ الْجَنَّةِ : تحقیق بدل دیا اللہ تعالیٰ نے جنّت کے ٹھکانے سے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر بندے کے دو ٹھکانے رکھے ہیں ایک جنت میں ایک دوزخ میں کافر اپنے ٹھکانے پر بھی قبضہ کرتا ہے اور مؤمن کے دوزخی ٹھکانے پر بھی اور مؤمن جنّت میں اپنا اور کافر کا جنتی ٹھکانا سنبھالتا ہے۔ رب فرماتا ہے :۔ " اِنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ پ۱۷ یہاں زمین سے جنّت کی زمین مراد ہے (جلالین شریف) وَفِیْ مَقَامٍ اٰخَر " وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ (پ۲۴ زمر) اور وراثت سے کافر کے حصّہ کی ملکیّت مراد ہے وہی اس حدیث کا مقصد ہے یعنی اگر تو جناب محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو نہ پہنچانتا تو دوزخ میں یہاں رہتا یہ اس لیے کہا جاتا ہے تاکہ مؤمن کی خوشی دوبالا ہو جائے۔

قولہٗ كُنْتُ اَقُوْلُ مَا یَقُوْلُ : اس جملہ کا قائل کون ہے اس میں دو قول ہیں

اوّل : النّاس سے مراد مؤمن ہے اور قال کا قائل منافق ہے کیونکہ وہ دنیا میں مسلمان کے ساتھ مل کر کلمہ پڑھتا تھا۔

دوم : یہ قائل کافر ہوگا لیکن کافر کا کہنا دفع عذاب کے لیے ہوگا۔ عند البعض فرق ہے کہ " لَا اَدْرِیْ صرف کافر کہے گا اور منافق لَا اَدْرِیْ کے ساتھ كُنْتُ اَقُوْلُ مَا یَقُوْلُ النَّاسُ بھی کہے گا۔

قولہٗ لَا دَرَیْتَ وَلَا تَلَیْتَ ۔ دَرَیْتَ یہ درایت سے ہے جس کا معنیٰ ہے سمجھنا۔ تَلَیْتَ یہ تلو سے مأخوذ ہے بمعنیٰ پیروی کرنا یعنی اس سے کہا جاتے گا کہ نہ تو نے عقل سے پہچانا اور نہ تو نے جاننے والوں کی پیروی کی، یا تَلَیْتَ تلاوت سے مأخوذ ہے یعنی نہ تو نے قرآن پاک کی تلاوت کی اس سے معلوم ہوا کہ ایمان کی دو قسمیں ہیں۔ ۱ تحقیقی ۲ تقلیدی۔

اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ایمان تحقیقی کی طرح ایمان تقلیدی بھی معتبر ہے جیسے بعض عوام کا ایمان۔

قولہٗ بمطارق : مَطارِق ، مِطرقۃ کی جمع ہے بمعنی لوہار کا ہتھوڑا اور گرز:

قولہٗ یَسْمَعُهَا مَنْ یَلِیْہِ : جو قریب ہوں یعنی دوآبّہ و ملائکہ وغیرہ اس کی چیخ کو سنتے ہیں لیکن یہاں مفہوم مخالف مراد نہیں کیونکہ ص۲۶ پر حضرت براءؓ بن عازب کی حدیث میں ہے کہ مشرق و مغرب کی تمام کائنات اس چیخ کو سنتی ہے۔

قولہٗ غَیْرَ الثَّقَلَیْنِ : سوائے جن اور انسانوں کے ثقلین سے مراد جن و انس ہیں محدثین حضرات نے انس و جن کو ثقلین کہنے کی مختلف توجیہات لکھی ہیں :۔

۱۔ ثقلین ان دونوں کو اس لیے کہا جاتا ہے کہ زمین پر ان کا دبدبہ اور ہیبت ہے۔

۲۔ یا اس لیے کہ ثقل سے مراد تکلیفِ شرع ہے یعنی انسان اور جن کو مکلّف با شرع ہونے کی حیثیت سے ثقلین کہا جاتا ہے۔ کما قال تعالیٰ " وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ " (پ۲۲ الاحزاب)

سوال ۔ اس میں کیا حکمت ہے کہ ثقلین کو سماعت سے محروم کر دیا گیا ہے۔؟

جوابِ اوّل کیونکہ انس و جن غیب کی چیزوں پر ایمان لانے کے مکلّف ہیں اگر ان کو آواز سنائی دے یا وہاں کے حالات کا علم ہو تو پھر ایمان بالغیب جاتا رہے گا۔

جوابِ دوم اگر قبر کے حالات کا احساس انسانوں کو ہونے لگے تو خوف کی وجہ سے دنیا کے کاروبار میں ہل چل مچی رہے گی اور سلسلۂ کفن و دفن و معیشت منقطع ہو جائے گی ولہٰذا ربِّ ذوالجلال کا کرم ہے کہ انہوں نے ایک پردہ قائم کر دیا ہے جس طرح انس و جن مُردوں کے حالات سے من کُلِّ الوجوہ ناآشنا ہیں اسی طرح وہ بھی ہمارے اَلَم و راحت سے ناواقف ہیں۔

یقول ابوالاسعاد : بعض محدثین حضرات نے لکھا ہے کہ یسمعها من یلیہ "غیر الثقلین عادی طور پر فرمایا ہے کہ عادت یہی ہے کہ انس و جن کے علاوہ سب سنتے ہیں کیونکہ انسانی قویٰ اس کے سننے پر قادر نہیں۔ ہاں اگر خلافِ عادت کسی کو سنا دیا جائے تو یہ اور بات ہے۔ دوسروں کو اس پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے۔

فائدہ : اس حدیث میں مؤمن کامل اور کافر و منافق کا حکم مذکور ہے۔ باقی مؤمن فاسق کا حکم

یہ ہے کہ وہ جوابات دینے میں تو مؤمن کامل کے ساتھ شریک ہے۔ لیکن بہشت کا دروازہ کھلنے میں اور بشارت وغیرہ میں اس کے ساتھ شریک نہیں لیکن اس کا درجہ بمقابلہ مؤمن کامل کمتر ہے اور اس کو اپنے اعمال سیئہ کی کچھ سزا بھی ملے گی "اِلَّا مَنْ شَآءَ رَبُّكَ۔ لقولہٖ "وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (پ۵)

وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَحَدَكُمْ اِذَا مَاتَ عُرِضَ عَلَيْهِ مَقْعَدُهٗ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ وَاِنْ كَانَ مِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ فَمِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ وَاِنْ كَانَ مِنْ اَهْلِ النَّارِ فَمِنْ اَهْلِ النَّارِ :

ترجمہ : روایت ہے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے کہ تم میں سے جب کوئی مرجاتا ہے تو صبح و شام اس پر اس کا ٹھکانا پیش کیا جاتا ہے۔ اگر جنتی ہے تو جنت کا ٹھکانا اور اگر دوزخیوں میں سے ہے تو دوزخ کا ٹھکانا۔

قولہٗ عُرِضَ عَلَيْهِ : عروض سے کیا مراد ہے اس میں دو قول ہیں۔

اوّل۔ کہ بہشتی ٹھکانا اٹھا کر اس کے قریب برزخ میں لے آتے ہیں مگر یہ قول کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔

دوم : عروض بمعنی ظہور ہے یعنی ٹھکانا ظاہر کر دیا جاتا ہے برزخ میں پس وہ وہاں سے دیکھتا رہتا ہے کہ یہ میرا ٹھکانا ہے۔

قولہٗ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ ۔ اس کی مرادیں بھی دو قول ہیں۔

اوّل : غداۃ سے مراد صبح اور عشی سے مراد شام ہے۔

دوم : غداۃ عشی سے مراد دوام و استمرار ہے۔ کما فی قولہ تعالیٰ "اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا (پ۲۴) یہ عذاب قبر کی بیّن دلیل ہے۔

وَعَنْ عَائِشَةَ رضی اللہ عنہا اَنَّ یَهُوْدِیَّةً دَخَلَتْ عَلَیْهَا فَذَكَرَتْ عَذَابَ الْقَبْرِ فَقَالَتْ اَعَاذَكِ اللّٰهُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ فَسَاَلَتْ عَائِشَةُ رضی اللہ عنہا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَنْ عَذَابِ الْقَبْرِ فَقَالَ نَعَمْ عَذَابُ الْقَبْرِ حَقٌّ۔

ترجمہ : حضرت عائشہؓ راوی ہیں کہ ایک یہودی عورت ان کے پاس آئی اور اس نے عذابِ قبر کا ذکر کیا پھر اس نے بی بی عائشہؓ سے کہا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں عذابِ قبر سے بچائے۔ پس بی بی عائشہؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عذابِ قبر کا حال پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ ہاں عذابِ قبر حق ہے۔

قولہ اَنَّ یَهُوْدِیَّةً دَخَلَتْ : یہاں پر ایک سوال ہے۔

سوال : بی بی عائشہ صدیقہؓ یہودیہ کافرہ عورت کے سامنے کس طرح آئیں کیونکہ مسلمہ عورت کا کافرہ اور بدکارہ عورتوں سے پردہ لازم ہے۔ کما فی قولہٖ تعالیٰ "وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنَاتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ الخ اَوْ نِسَآئِهِنَّ۔

جواب : حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ قرآن مقدس میں ایسی کافرہ عورت کے سامنے جانے سے ممانعت فرمائی۔ جو اس کے حسن و جمال کو کسی کافر کے پاس بیان کرے اور اس سے فتنہ کا اندیشہ ہو۔

سوال : مرأۃ یہودیہ کو عذابِ قبر کا کس طرح پتا چلا۔؟

جواب اوّل : اس نے تورات کے اندر پڑھا تھا کہ عذابِ قبر حق ہے۔

جواب دوّم : اس نے خود تو نہیں پڑھا تھا لیکن علماءِ یہود سے براہِ راست سنا تھا۔

سوال : مسلم شریف صہ اور مسند احمد ص۹ باب عذاب القبر میں آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیہ کی بات سنکر فرمایا کہ یہود جھوٹ بولتے ہیں قیامت سے پہلے کوئی عذاب نہیں ہوگا۔ البتہ یہود کو قبر میں عذاب ہوگا۔ (کذب یهود ولا عذاب دُوْنَ عَذَابِ یَوْمِ الْقِیَامَةِ وَاِنَّمَا تفتن الیهود) جب کہ باب کی روایت میں ہے

کہ عذابِ قبر حق ہے۔ فتعارضا۔

جوابِ اوّل علامہ نوویؒ تبعاً للطحاوی فرماتے ہیں کہ یہاں حقیقت میں دو واقعات ہیں پہلا واقعہ یہ ہے کہ یہودیہ عورت آئی اور عذابِ قبر کا تذکرہ کیا تو آپ نے اپنے عدمِ علم کی بناء پر انکار فرمایا پھر حضور علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اطلاع دے دی گئی کہ عذابِ قبر حق ہے لیکن بی بی عائشہؓ اس وقت حاضر نہ تھیں۔

دوسرا واقعہ: پھر جب اس یہودیہ نے آکر کہا تو بی بی عائشہؓ نے انکار میں جواب دیا۔ تب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بی بی عائشہؓ سے فرمایا کہ اثباتِ عذابِ قبر کے بارہ میں وحی نازل ہوئی ہے۔ ولہذا عَذَابُ القبرِ حقٌ، تو تقریر وانکار علیحدہ علیحدہ واقعہ کے متعلق ہیں تو فاندفع التعارض۔

جوابِ دوم حافظ ابنِ حجرؒ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاً عموماً عذاب سے انکار نہیں فرمایا بلکہ صرف مؤمنین پر عذابِ قبر کا انکار فرمایا پھر جب وحی آئی " کہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے عذاب دے خواہ مُوحّد ہی کیوں نہ ہو تو پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جزم بر عذابِ قبر ہوا تو فرمایا عَذَابُ الْقَبْرِ حَقٌّ۔

سوال حدیث میں عذابِ قبر کا اثبات اور آمد یہودیہ مدینہ منورہ کا واقعہ ہے جبکہ عذابِ قبر والی آیت " اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا۔ مکہ میں نازل ہوئی ہے اور مکہ میں عذابِ قبر کا اثبات ثابت ومعین ہو چکا تھا تو پھر بی بی عائشہؓ کو عذابِ قبر کا کیوں نہ پتا چلا؟

جوابِ اوّل اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا والی آیت میں خاص طور پر فرعونیوں کا ذکر ہے کہ فرعونیوں کو پیش کیا جاتا ہے تو بی بی عائشہؓ نے یہ سمجھ لیا کہ یہ فرعونیوں کے متعلق خاص ہے۔ اُمّتِ محمدیہ اس سے مستثنیٰ ہے اس لیے سوال کیا۔

جوابِ دوم ۔ جس کو حافظ ابن کثیرؒ نے نقل کیا ہے کہ آیتِ عذاب رُوح کے متعلّق ہے۔ اور بی بی صاحبہؓ نے ان اجساد کے متعلّق سوال کیا جو قبروں میں ہیں۔

قولہٗ اِلَّا تَعَوَّذَ بِاللّٰہِ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ: اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے آپ سرًّا تعوّذ کیا کرتے تھے بعد میں تعلیمِ اُمّت کے لیے عذابِ قبر کے بارے میں لوگوں

کے تعجّب کو زائل کرنے کے لیے جہراً شروع کر دیا، اور یہ بات بھی واضح ہوئی کہ تعوّذ اپنی ذاتِ اقدس انور کے لیے نہیں تھا بلکہ تعلیمِ اُمّت مقصود تھی۔

وَعَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ قَالَ بَيْنَا رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي حَائِطٍ لِبَنِي النَّجَّارِ عَلٰى بَغْلَةٍ لَهُ وَنَحْنُ مَعَهُ إِذْ حَادَتْ بِهِ فَكَادَتْ تُلْقِيهِ وَإِذَا أَقْبُرٌ سِتَّةٌ أَوْ خَمْسَةٌ فَقَالَ مَنْ يَعْرِفُ أَصْحَابَ هٰذِهِ الْأَقْبُرِ:

ترجمہ: روایت ہے حضرت زید بن ثابتؓ سے فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بنی نجار کے باغ میں اپنے خچر پر سوار تھے اور ہم حضورؐ کے ساتھ تھے کہ اچانک آپ کا خچر بدکا اور قریب تھا کہ آپ کو گرا دیتا۔ ناگاہ وہاں پانچ چھ قبریں تھیں حضورؐ نے فرمایا کہ ان قبروں کو کوئی پہچانتا ہے۔

قولہٗ حَائِطٍ۔ بمعنیٰ بستان یعنی باغ۔

قولہٗ لِبَنِي النَّجَّارِ: قَبِيلَةٌ مِنَ الْأَنْصَارِ۔

قولہٗ إِذْ حَادَتْ: مشہور قرأت حاء کے ساتھ ہے بمعنیٰ بدکنا، بعض نسخوں میں جَادَتْ ہے بمعنیٰ گرنا مگر صحیح بالحاء ہے۔

قولہٗ فَقَالَ مَنْ يَعْرِفُ أَصْحَابَ هٰذِهِ الْأَقْبُرِ: ذات اور صفات ولادت، وفات وغیرہ۔

قولہٗ قَالَ فَمَتٰى مَاتُوا۔ قَالَ سے پہلے یہ جملہ مقدر ہے إِذَا كُنْتَ تَعْرِفُهُمْ جب تو پہچانتا ہے تو بتلاؤ کہ یہ کب فوت ہوئے ہیں، زمانہ جاہلیت میں یا میری بعثت کے بعد۔

قولہٗ إِنَّ هٰذِهِ الْأُمَّةَ۔ اُمّت سے اُمّتِ اجابت و دعوت مُراد نہیں بلکہ جنس انسانیّت کی طرف اشارہ ہے۔

قولہٗ تُبْتَلٰى۔ بعض حضرات نے تُبْتَلٰى کا معنیٰ تُمْتَحَنُ کیا ہے یعنی ان کا امتحان لیا جا رہا ہے۔ مگر جمہور حضرات نے تُبْتَلٰى بمعنیٰ عذاب کیا ہے کہ قبروں کے اندر

ان کو عذاب دیا جارہا ہے یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے آگاہی فرمادی۔

قولہٗ فَلَوْلَا ۔ اس سے پہلے عبارت مُقدّر ہے اصل عبارت تھی " اَیْ لَوْلَا مَخَافَۃُ عَدَمِ التَّدَافُنِ ۔ یعنی مجھے تمہارے دفن کرنے کا اگر خوف نہ ہوتا۔

قولہٗ اَنْ لَا تَدَافَنُوْا ۔ یعنی اگر مجھ کو یہ خوف نہ ہوتا کہ تم مُردوں کو دفن کرنا چھوڑ دوگے تو میں ضرور اللہ تعالیٰ سے یہ دُعاء کرتا کہ تم کو بھی اس عذابِ قبر کی آواز سنادے جس کو میں سن رہا ہوں۔

سوال یہ کہ عذابِ قبر تو دفن پر موقوف نہیں جیسا کہ بالتفصیل گذر چکا کہ عالم برزخ کا عذاب بعد الموت قبل القیامت میت جہاں بھی ہو جس کیفیت میں ہو یُذْرِکُکُمُ الْعَذَابُ الْقَبْرِ لہٰذا یہاں کس طرح فرمایا کہ عذاب کو تم اگر سنتے تو دفن نہ کرتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عذاب دفن پر موقوف ہے۔

جوابِ اوّل حدیث کی مراد یہ ہے کہ اگر تم عذابِ قبر کو سنتے تو تم پر ایسا خوف لاحق ہوتا کہ تم بے ہوش و بے عقل ہوجاتے کہ مُردوں کے قریب نہ جاتے اور دفن پر قوت و فرصت نہ پاتے۔ اس لیے میں دعاء نہیں کرتا کہ خدا تم کو سنائے۔

جوابِ دوم چونکہ مُقابر میں زیارت کے لیے لوگوں کا اجتماع ہوتا ہے اب اگر عذابِ قبر سنتے تو لوگ اپنے مُردوں کو مکانوں سے دور صحراء اور جنگل میں ڈال دیتے (تاکسے آنجا نرود و نشنود عذاب ایشاں را و مطلع نگردد بر عیب ہائے ایشاں) تاکہ لوگ مقابر میں نہ جائیں اور ان کے عیوبات پر مُطلع نہ ہوں۔ ایضًا قال علیہ السلام اُذْکُرُوْا مَوْتَاکُمْ بِالْخَیْرِ :

قولہٗ تَعَوَّذُوْا بِاللّٰہِ مِنْ عَذَابِ النَّارِ ۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے عذابِ نار کی پناہ پکڑو۔

سوال حدیثِ پاک میں تقلیب کیوں ہے یعنی عذابِ قبر مقدم ہے عذابِ نار سے کہ عذابِ قبر پہلے ہے اور عذابِ دوزخ بعد میں لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر میں عذابِ نار کو مُقدّم اور عذابِ قبر کو مُؤخّر یہ کیوں ہے ؟

جواب : اگرچہ عذابِ قبر پہلے ہے اور عذابِ دوزخ بعد میں لیکن چونکہ عذابِ دوزخ سخت ہے اور عذابِ قبر ہلکا کہ دوزخ میں آگ ہے اور قبر میں آگ کا اثر اس لیے دوزخ کا ذکر پہلے فرمایا اور قبر کا بعد میں۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

یہ دوسری فصل ہے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اُقْبِرَ الْمَیِّتُ اَتَاهُ مَلَكَانِ اَسْوَدَانِ اَزْرَقَانِ یُقَالُ لِاَحَدِهِمَا الْمُنْكَرُ وَلِلْاٰخَرِ النَّكِیْرُ :

ترجمہ : روایت ہے حضرت ابوہریرہؓ سے فرماتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جب میّت دفن کی جاتی ہے تو اس کے پاس دو سیاہ رنگ نیلی آنکھوں والے فرشتے آتے ہیں ایک کو منکر دوسرے کو نکیر کہا جاتا ہے۔

قولہٗ اِذَا اُقْبِرَ : ای اُدْفِنَ یعنی قبر دفن کے معنیٰ میں ہے۔ کَمَا جَاءَ فی حدیثِ ابی داؤد شریف ج۲ ص۹۹ بابُ الدفنِ عندطلوعِ الشمس وعندغروبها عُقبہ بن عامر کی روایت ہے:

قال ثلٰث ساعاتٍ کانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ینهانا ان نصلّی فِیْهِنَّ او نقبر فیهنّ موتانا الخ ۔

یہاں قبر سے مراد دفن ہے۔ نیز دفن کا ذکر اتفاقی ہے یا یہ قید تغلیبی ہے کیونکہ عرب میں اکثر اوقات مُردوں کو قبر میں دفن کیا کرتے تھے۔

قولہٗ اَسْوَدَانِ : باعتبار جسم کے اسود ہوں گے۔

قولہٗ اَزْرَقَانِ : باعتبار آنکھوں کے نیلگوں ہوں گے عند البعض یہ کنایہ ہے کہ ان کی شکل اتنی خوفناک ہوگی۔

قولہٗ اَلْمُنْكَرُ : یہ انکار بمعنیٰ نہ جاننے سے اسم مفعول ہے۔

قولہٗ اَلنَّکِیْرُ : یہ نکور باب سَمِعَ بمعنیٰ نہ پہنچاننا سے صفت کا صیغہ بمعنیٰ مفعول ہے مطلب یہ ہے کہ دونوں فرشتے میّت کے اعتبار سے ناآشنا غیر مانوس، اور اجنبی ہونگے۔ علامہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ یہ کفّار کے سوال کنندگان کا نام ہے۔ یعنی مؤمنوں کے ممتحنوں کا نام مبشّر و بشیر ہے۔

سوال : کفار کے مُمتحنوں کو یہ شکل کیوں دی جاتی ہے جب کہ ملائکہ تو نورانی مخلوق ہیں۔

جواب : ملائکہ کو یہ ہیبت ناک اور خوفناک شکل اس لیے دی جاتی ہے تاکہ ان کے خوف سے کافروں پر ہیبت طاری ہو جائے اور وہ جواب دینے میں بدحواس ہو جائیں لیکن مؤمنوں کے لیے یہ آزمائش اور امتحان ہوتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ ان کو ثابت قدم رکھتا ہے جس کی وجہ سے وہ صحیح صحیح جواب دیتے ہیں اس بنا پر وہ کامیاب بھی ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ دنیا میں خوفِ خدا رکھتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قبر میں ہر قسم کے خوف و ہراس سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔

قولہٗ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ : ضروری جواب تو هٰذَا عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ سے آچکا۔ لیکن یہ تطویلِ کلام نشاط اور سرور کی بنا پر ہے۔ ع۔ لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم۔

قولہٗ فَيَقُوْلَانِ قَدْ كُنَّا نَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْلُ هٰذَا ۔ اور وہ دونوں فرشتے کہیں گے کہ ہم جانتے تھے کہ تو یقیناً یہی کہے گا۔

سوال : فرشتوں کو یہ کس طرح علم ہوا کہ یہی جواب دیں گے اس سے تو ملائکہ کے لیے علم غیب کا ثبوت ملتا ہے۔

جوابِ اوّل ۔ فرشتوں کا یہ کہنا کہ ہم جانتے تھے کہ تو یقیناً یہی کہے گا) اس بنا پر ہوگا کہ پروردگار عالم کی جانب سے ان کو خبر دی جائے گی کہ فلاں مُردہ یہ جواب دیگا اور فلاں مردہ وہ جواب دے گا۔

جوابِ دوم ۔ یہ ہے کہ مردہ کی پیشانی اور اس کے آثار سے یہ معلوم کر لیتے ہیں کیونکہ مؤمن کی پیشانی پر نورِ ایمانی کی چمک اور سعادت و نیک بختی کا نشان ہوتا ہے جب کہ کافر و منافق کے چہرہ پر پھٹکار برستی ہے اس لیے وہ کہتے ہیں " قَدْ كُنَّا نَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْلُ هٰذَا "

قولہٗ ثُمَّ یُفسحُ لَہٗ فِیْ قَبْرِہٖ سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا۔ اس کے بعد اس کی قبر لمبائی اور چوڑائی میں ستّر گز کشادہ کردی جاتی ہے۔

سوال : حدیث براءؓ بن عازب میں یہ الفاظ ہیں " وَیُفْسَحُ لَہٗ فِیْھَا مَدَّ بَصَرِہٖ کہ جتنی اس کی نظر پڑتی ہے۔ یہاں ستّر گز کے الفاظ ہیں۔ فَتَعَارَضَا۔

جواب اوّل : سَبْعُوْنَ سے تخصیص مُراد نہیں کیونکہ کتابُ الایمان میں یہ بات گذرچکی ہے کہ سَبْعُوْنَ کا عدد اہلِ عرب تکثیر کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ قبر بہت فراخ کردی جائے گی چنانچہ مَدَّ بَصَرِہٖ اس کی تفسیر بن جائے گی۔

جواب دوم : اختلافِ اشخاص سے وسعت میں بھی اختلاف ہوگا کہ میّت اگر اعمال کثیر والا ہوگا تو اس کے ساتھ مَدَّ بَصَرِہٖ والا معاملہ ہوگا۔ اگر اعمال قلیل ہیں تو سَبْعُوْن ذِرَاعًا پر عمل ہوگا۔

قولہٗ فِیْ سَبْعِیْنَ : یعنی چار ہزار نو سو گز جو ستّر کی ضرب ستّر میں دینے سے حاصل ہے۔ یعنی ستّر گز لمبی، ستّر گز چوڑی کُل رقبہ چار ہزار نو سو بنتا ہے۔ سَبعون کے بعد سَبْعِین ضرب بیان کرنے کے لیے لائے ہیں۔

قولہٗ فَیَقُوْلُ اَرْجِعُ اِلٰی اَھْلِیْ ۔ مؤمن جب صحیح جواب دیتا ہے اور اس پر خدا کی رحمت اور اس کی نعمتوں کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں تو اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے اہل و عیال کو اس اچھے معاملہ اور عظیم نعمتوں کی خبر دے جیسا کہ جب کوئی مسافر کسی جگہ راحت و سکون پاتا ہے اور وہاں عیش و آرام کے سامان اسے ملتے ہیں تو اس کی تمنا یہی ہوتی ہے کہ کاش اس وقت میں اپنے اہل و عیال کے پاس پہنچ جاتا تاکہ انہیں اپنے آرام و عیش سے مطلع کرتا۔ اسی لیے مؤمن مُردہ اپنے اہل و عیال کے پاس واپس جانے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے۔

قولہٗ نَمْ کَنَوْمَۃِ الْعُرُوْسِ ۔ یہاں سونے سے مُراد آرام کرنا ہے یعنی یہ برزخی زندگی آرام سے گذار کہ تجھ تک سوائے خدا کی رحمت کے کوئی آفت یا بلا نہیں پہنچ سکے گی۔ جیسا کہ عروس دلہن کے پاس دلہا کے سوا کوئی نہیں پہنچ سکتا یہ غفلت والی نیند مراد نہیں۔ ثانیًا حدیث پاک کی یہ عبارت تائید کررہی ہے۔ قرآن مقدس کی اس

آیت مُبارکہ کی یُرْزَقُوْنَ فَرِحِیْنَ بِمَآ اٰتٰاھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ وَیَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِیْنَ لَمْ یَلْحَقُوْا بِھِمْ الخ (پ۴ ال عمران)

قولہٗ فَتَلْتَئِمُ عَلَیْہِ ۔ اِلتِئام بمعنیٰ اِنضمام واجتماع کے ہے یعنی دائیں پسلیاں بائیں طرف اور بائیں پسلیاں دائیں طرف لیکن اس کی یہ حالت انسانی حس سے بالا ہے۔ اگر ہم کافر کی لاش دیکھیں ویسے ہی صحیح معلوم ہوگی۔ خیال رہے کہ اگر ایک ہی قبر میں کافر ومؤمن دفن ہوگئے تو وہی قبر مؤمن کے لیے فراخ ہوگی اور کافر کے لیے تنگ، مؤمن کے لیے روشن اور کافر کے لیے اندھیری، مؤمن کے لیے ٹھنڈی، کافر کے لیے گرم۔ جیسا کہ ایک بستر میں دو آدمی سو رہے ہوں ایک اچھا اور دل خوش کن خواب دیکھے، دوسرا پریشان کن اور ہیبت ناک خواب دیکھے، بستر ایک ہے مگر دونوں کی حالتیں مختلف خواب برزخ کی ایک ادنیٰ سی تمثیل ہے۔ خواب اکثر خیال ہوتے ہیں جب کہ برزخ میں حقیقت ہوگی۔

فَتَخْتَلِفُ اَضْلَاعُہٗ فرمانا سمجھانے کے لیے ہے ورنہ جن کفّار کی پسلیاں راکھ بنادی گئیں یا جانوروں نے ہضم کرلیا ان کی روح پر بھی تنگی ایسی ہی ہوگی اس لیے قبر ایک شکنجہ ہے۔

وَعَنْ بَرَآءِ بْنِ عَازِبٍ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ یَاْتِیْہِ مَلَکَانِ فَیُجْلِسَانِہٖ فَیَقُوْلَانِ لَہٗ مَنْ رَّبُّکَ فَیَقُوْلُ رَبِّیَ اللّٰہُ فَیَقُوْلَانِ لَہٗ مَا دِیْنُکَ فَیَقُوْلُ دِیْنِیَ الْاِسْلَامُ ؛

ترجمہ : حضرت براء بن عازبؓ نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ مردے کے پاس دو فرشتے آتے ہیں اسے بٹھاتے ہیں پھر اس سے کہتے ہیں کہ تیرا رب کون ہے وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ تیرا دین کیا ہے وہ کہتا ہے کہ میرا دین اسلام ہے۔

قولہٗ مَنْ رَّبُّکَ وَمَادِیْنُکَ : یہ سوال وجواب سب عربی زبان میں ہونگے کیونکہ بعد الموت سب کی زبان عربی ہوجائے گی۔ اگر میّت غیر عربی بھی کیوں نہ ہو۔

قولہ مَا هٰذَا الرَّجُلُ ۔ کبھی مَا سے وصف کا سوال بھی کیا جاتا ہے معنیٰ ہوگا کہ کیا صفت ہے اس جوان کی جو بھیجا گیا ہے آیا وہ رسول ہے یا نہیں۔

قولہ وَمَا يُدْرِيكَ : کہ کونسی چیز تجھ کو بتلا رہی ہے کہ تیرا رب اللہ تعالیٰ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ پاک کے رسول ہیں وہ جواب دے گا "قرأتُ کتابَ اللہِ میں نے اللہ تعالیٰ کی مقدس کتاب میں پڑھا تھا"

سوال ؛ قرآن پاک ہر شخص تو پڑھا ہوا نہیں ہوتا پھر قَرَأْتُ کِتَابَ اللّٰهِ کیسے کہے گا۔

جواب ؛ قرأت عام ہے بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ ہو کہ خود پڑھا یا عالموں سے سنا۔

قولہ قَالَ : اس کا ضمیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے۔

قولہ مِنْ رَوْحِهَا ۔ بالفتح بمعنی نسیم الریح یعنی ہوا۔

قولہ وَطِيبِهَا ۔ اور خوشبو یہ دونوں جنت کی صفتیں ہیں ۔ کہ جنت کی خوشبوئیں اور ہوائیں جو معطر شدہ ہوتی ہیں وہ اس کو پہنچنا شروع ہو جاتی ہیں ۔

قولہ هَاهْ هَاهْ : هَاهْ هَاهْ ایک لفظ ہے جو عربی میں دہشت زدہ اور متحیر شخص بولتا ہے جیسے اردو میں حیرت و دہشت کے وقت آہ ، ھائے اور وائے وائے بولا جاتا ہے مطلب یہ ہے کہ اس وقت کافر اتنا خوف زدہ ہو جاتا ہے کہ اس کی زبان سے ہیبت ناکی کیوجہ سے خوف و حسرت کے الفاظ نکلتے ہیں اور وہ صحیح جواب نہیں دے پاتا اور وہ کہتا ہے کہ میں نہیں جانتا گویا کہ لَا اَدْرِیْ اس ھاہ ھاہ کی تفسیر ہے۔

قولہ فَيُنَادِي مُنَادٍ مِّنَ السَّمَاءِ اَنْ كَذَبَ ۔ تب ایک پکارنے والا آسمان سے یہ فرمان سناتا ہے کہ یہ جھوٹا ہے اس لیے کہ دینِ اسلام کی آواز مشرق سے لے کر مغرب تک پہنچی اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا مشن چار دانگ عالم میں پھیلایا اور تمام دنیا اس آفاقی و آسمانی مذہب سے باخبر تھی اس کے باوجود اس کا یہ کہنا کہ میں کچھ نہیں جانتا یا مجھے کچھ معلوم نہیں ہوا سراسر کذب و جھوٹ ہے ۔

قولہ مِنْ حَرِّهَا ۔ ای حَرِّ النَّارِ ۔ سَمُوْمِهَا ۔ بمعنی ریح الحارۃ یعنی گرم ہوا۔

قولہ يُقَيَّضُ ۔ ای يُسَلَّط : یعنی اس پر مسلط کر دیا جاتا ہے۔

قولہٗ اَعْمٰی وَاَصَمُّ : مُحدثینؒ حضرات نے لکھا ہے کہ یا تو وہ فرشتے حقیقتاً اندھے اور بہرے ہوتے ہیں یا اندھے اور بہرے سے مراد سخت دل بے رحمی اور لاپرواہی ہے کہ اس کی تکلیف دیکھ کر رحم نہیں کرتے ۔ آہ و پکار سنکر کان نہیں دھرتے ورنہ اندھا اور بہرہ ہونا عیب ہے جس سے فرشتے پاک ہیں ۔ رب ذوالجلال قیامت میں کافر سے فرمائیں گے وَکَذٰلِکَ الْیَوْمَ تُنْسٰی حالانکہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک بھول سے پاک ہیں ۔

وَعَنْ عُثْمَانَؓ اَنَّهٗ كَانَ اِذَا وَقَفَ عَلٰى قَبْرٍ بَكٰى حَتّٰى يُبَلَّ لِحْيَتُهٗ فَقِيْلَ لَهٗ تَذْكُرُ الْجَنَّةَ وَالنَّارَ فَلَا تَبْكِيْ وَتَبْكِيْ مِنْ هٰذَا فَقَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ الْقَبْرَ اَوَّلُ مَنْزِلٍ مِّنْ مَّنَازِلِ الْاٰخِرَةِ ۔

ترجمہ : روایت ہے حضرت عثمانؓ سے کہ آپ جب کسی قبر پر کھڑے ہوتے تو اتنا روتے کہ آپ کی ڈاڑھی مبارک تر ہو جاتی ۔ عرض کیا گیا کہ آپ جنّت اور دوزخ کا ذکر کرتے ہیں تو نہیں روتے ۔ اس سے روتے ہیں تو فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قبر آخرت کی منزلوں سے پہلی منزل ہے ۔

سوال ۔ کیا وجہ تھی کہ وقوفِ قبر سے یہ کیفیت ہو جاتی تھی ؟

جواب ؛ یہ ہے کہ قبر پر کھڑے ہو کر انسان عیش و عشرت کو بھول جاتا ہے اور دنیا کی بے ثباتی پر اس کا ایمان مضبوط ہو جاتا ہے ۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خوفِ خدا سے اپنے قلب کو لرزاں پاتا ہے اور آخرت سے لگاؤ محسوس کرتا ہے اور ما قبل کے حالات اس کے سامنے آجاتے ہیں اور خوف سے رونا شروع کر دیتا ہے اس لیے وقوف سے یہ کیفیت طاری ہوتی تھی ۔

سوال ؛ حضرت عثمانؓ کو تو دنیا میں جنّت کی بشارت دے دی گئی تھی پھر کیوں روتے ہیں ؟

جوابِ اوّل ؛۔ یہ کہ جنّت کی بشارت ان کے سامنے نہیں دی اور نہ ان تک

پہنچی بلکہ ان کی غیبت میں دیدی تھی اسی وجہ سے رو رہے ہیں اگر ان کے سامنے ہوتی تو پھر نہ روتے۔

جواب دوم : یہ ہے کہ ضغطہ قبر کی وجہ سے رو رہے ہیں جو انبیاءؑ کے علاوہ سب لوگوں کو ہوتا ہے۔

جواب سوم : اس طرف اشارہ ہے کہ جب میں بشارت کے باوجود اس قدر خائف ہوں تو دوسروں کو بطریق اولیٰ یہ خوف پیدا کرنا چاہیے۔

قولہٗ مَنَازِلِ الآخِرَةِ : میدان محشر میں حساب کے لیے پیشی، پل صراط وزنِ اعمال، جنّت و نار یہ سب منازلِ آخرت میں سے ہیں۔

وَعَنْهُ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا فَرَغَ مِنْ دَفْنِ الْمَيِّتِ وَقَفَ عَلَيْهِ فَقَالَ اسْتَغْفِرُوا لِأَخِيكُمْ ثُمَّ سَلُوا لَهُ بِالتَّثْبِيتِ فَإِنَّهُ الْآنَ يُسْأَلُ۔

ترجمہ : روایت ہے انہی سے فرماتے ہیں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم میت کے دفن سے فارغ ہوتے تو وہاں کچھ ٹھہرتے اور فرماتے اپنے بھائی کے لیے دعائے مغفرت کرو، پھر اس کے لیے ثابت قدم رہنے کی دعا کرو کہ اب اس سے سوالات ہو رہے ہیں۔

قولہٗ ثُمَّ سَلُوا لَهُ بِالتَّثْبِيتِ : تثبیت سے مراد يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ ہے اور اس دعاء کو تلقینِ میت کی دعاء بھی کہتے ہیں۔ اکثر شوافعؒ اور حنفیہؒ کے نزدیک مستحب ہے۔ دعاء یہ ہے:۔

يَا فُلَانُ بْنُ فُلَانٍ اُذْكُرُوا الْعَهْدَ الَّذِيْ خَرَجْتَ عَلَيْهِ مِنَ الدُّنْيَا شَهَادَةَ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ وَأَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا وَأَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ قُلْ رَضِيْتُ بِاللّٰهِ رَبًّا وَّبِالْإِسْلَامِ دِيْنًا

وَبِمُحَمَّدٍ نَبِيًّا وَّرَسُوْلاً وَبِالْكَعْبَةِ قِبْلَةً وَّبِالْقُرْاٰنِ اِمَامًا وَّبِالْمُسْلِمِيْنَ اِخْوَانًا رَبِّیَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ :

یہ حدیث ابو اُمامہؓ سے مروی ہے جسے علامہ سیوطیؒ جمع الجوامع میں طبرانی سے ذکر کیا ہے نیز تلقین میّت کے سلسلہ میں اس کے علاوہ قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر سورۂ بقرہ کا پہلا رکوع مُفْلِحُوْنَ تک اور بقرہ کا آخری رکوع اٰمَنَ الرَّسُوْلُ سے پڑھنا بھی منقول ہے۔ (کما فی سُنن البیھقی)

وَعَنْ اَبِیْ سَعِيْدٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيُسَلَّطُ عَلَی الْكَافِرِ فِیْ قَبْرِهٖ تِسْعَةٌ وَّتِسْعُوْنَ تِنِّيْنًا تَنْهَسُهٗ وَتَلْدَغُهٗ حَتّٰی تَقُوْمَ السَّاعَةُ لَوْاَنَّ تِنِّيْنًا مِّنْهَا نَفَخَ بِالْاَرْضِ مَا اَنْبَتَتْ خَضِرًا۔

ترجمہ: روایت ہے حضرت ابو سعیدؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ کافر پر اس کی قبر میں ننانوے سانپ مُسلّط کیے جاتے ہیں۔ جو اسے قیامت تک نوچتے اور ڈستے رہیں گے اگر ان میں سے ایک سانپ زمین پر پھونک مار دے تو کبھی بھی زمین سبزہ نہ اُگائے۔

قولہٗ تِنِّيْنًا : بمعنی سانپ جو زہر سے پُر ہو۔

قولہٗ تَنْهَسُهٗ ۔ اَیْ اَخْذُ اللَّحْمِ بِاَطْرَافِ الْاَسْنَانِ۔ یعنی دانتوں سے کاٹنا

قولہٗ تَلْدَغُهٗ ۔ ای ضَرْبُ السِّنِّ بِلَا قَطْعٍ یعنی ڈسنا۔ عند البعض دونوں ایک دوسرے کی تاکید ہیں۔

سوال۔ تِسْعَةٌ وَّتِسْعُوْنَ کی تخصیص کیوں ہے؟

جواب اوّل۔ یہ مُبالغہ کے لیے ہے باقی اس کا فائدہ شارع علیہ السلام کو معلوم ہے۔

جواب دوم۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ اخلاقِ ذمیمہ کی تعداد ننانوے ۹۹ ہے تو

ان اخلاقِ ذمیمہ کو سانپ کی شکل بنا کر قبر میں بھیجا جاتا ہے اور وہ ڈستا رہے گا۔

جواب سوم۔ مُلّا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام معروف ہیں تو ہر نام کے انکار پر ایک سانپ مُسلّط کیا جائے گا۔ اس لیے یہ عدد مُعیّن فرمایا۔

قولہٗ قَالَ سَبْعُوْنَ بَدَلَ تِسْعَةٌ وَّ تِسْعُوْنَ ۔ مقام ہذا پر سوال ہے۔

سوال۔ یہ ہے کہ روایات میں بظاہر تعارض ہے کہیں ستّر ہیں، کہیں ننانوے ہیں۔

جواب اوّل۔ علامہ بدرُالدین عینیؒ فرماتے ہیں کہ سَبْعُوْنَ والی روایت ضعیف ہے۔ صحیح روایت تِسْعَةٌ وَّ تِسْعُوْنَ ہے۔ فَلَا تَعَارُضَ۔

جواب دوم۔ حافظ ابن حجرؒ نے بین الرّوایات میں تطبیق دی ہے۔ تِسْعَةٌ وَّ تِسْعُوْنَ والی روایت کافر متبوع کے لیے ہے۔ اور سَبْعُوْنَ والی روایت تابع کافر کے لیے ہے۔ یا تِسْعَةٌ وَّ تِسْعُوْنَ والی روایت غنی کافر اور سَبْعُوْنَ والی روایت فقیر کافر کے لیے ہے۔ فَانْدَفَعَ التَّعَارُضُ۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ — یہ تیسری فصل ہے۔

عَنْ جَابِرٍؓ قَالَ خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلٰى سَعْدِ بْنِ مُعَاذٍؓ حِيْنَ تُوُفِّيَ فَلَمَّا صَلّٰى عَلَيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَوُضِعَ فِيْ قَبْرِهٖ وَسُوِّيَ عَلَيْهِ سَبَّحَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَبَّحْنَا طَوِيْلًا ثُمَّ كَبَّرَ فَكَبَّرْنَا۔

ترجمہ: روایت ہے حضرت جابرؓ سے فرماتے ہیں کہ جب حضرت سعد ابن معاذؓ نے وفات پائی تو ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی طرف گئے۔ جب حضور علیہ السّلام نے ان پر نماز پڑھ لی اور وہ اپنی قبر میں رکھے گئے اور ان پر مٹی برابر کر دی گئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت دراز تسبیح پڑھی اور ہم نے بھی پڑھی، پھر تکبیر کہی اور ہم نے بھی تکبیر کہی۔

قولہٗ وَسُوِّیَ : اَیِ التراب یعنی قبر وغیرہ کی تیاری سے فارغ ہوئے۔
قولہٗ سَبَّحَ : تسبیح وتکبیر سے خدا کا غضب رحمت میں اور اس کا غصہ شفقت میں بدل جاتا ہے۔ اور وہاں مُقدّس کلموں کی بدولت اپنی رحمت ونعمت کے دروازے کھول دیتا ہے۔ چنانچہ اسی لیے خوف ودہشت کے موقعہ پر یا کسی خوفناک چیز کو دیکھ کر تکبیر کہنا مستحب ہے۔
قولہٗ فَکَبَّرْنَا : پھر آپ نے تکبیر کہی، ہم نے بھی تکبیر کہی۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کا تسبیح کرنا قبر کی تنگی کے وقت تھا، اور تکبیر کہنا کشادگی قبر کے وقت تھا کیونکہ عبدِ صالح پر قبر کی تنگی کا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مشاہدہ فرمایا تو اللہ تعالیٰ کی عظمت وجلالت شان بیان کرنا مناسب سمجھا کیونکہ وہ محل تسبیح تھا۔ جبکہ تکبیر کشادگی قبر کے بعد تھی کیونکہ تکبیر عمومًا خوشی کے وقت پڑھی جاتی ہے۔ ثانیًا تکبیر کے ساتھ طویلاً نہیں فرمایا۔ محدثین حضراتؒ نے لکھا ہے کہ تسبیح طویل تھی تکبیر طویل نہیں تھی۔ وَلٰہذا لَا یُذْکَرُ۔
قولہٗ العبد الصالح : صالح کی قید لگا کر اشارہ فرمایا کہ حضرت سعدؓ بن معاذؓ گناہ گار نہیں تھے۔ یعنی اشارہ تعظیم وتخویف کے لیے ہے۔ ثانیًا یہ بھی اشارہ کیا کہ جب ایسا نیک بندہ صغطہ قبر میں مبتلا ہے تو دوسروں کا کیا حال ہوگا۔

اسمائے رجال

حضرت سعدؓ بن معاذؓ کے حالات

آپ قبیلہ انصار میں اوس کے سردار ہیں بیعت عقبہ اولیٰ کے بعد مدینہ مُنوّرہ میں ایمان لائے۔ آپ کے ایمان سے عبدالاشہل بھی ایمان لائے۔ حضور پُرنور ﷺ نے ان کا نام سید الانصار رکھا۔ جلیل القدر صحابی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بدر واحد میں شریک رہے۔ غزوہ خندق کے دن کندھے میں تیر لگا جس سے خون جاری ہوا۔ اور ٹھیک ایک ماہ کے بعد ذی قعدہ ۵ھ میں وفات پائی۔ ۳۷ سال عمر ہوئی۔ حضورؐ کے ہاتھوں جنّتُ البقیع میں دفن ہوئے۔

وَعَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هٰذَا الَّذِىْ تَحَرَّكَ لَهُ الْعَرْشُ وَفُتِحَتْ لَهُ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَشَهِدَهُ سَبْعُوْنَ اَلْفًا مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ لَقَدْ ضُمَّ ضَمَّةً ثُمَّ فُرِّجَ عَنْهُ۔

ترجمہ: روایت ہے حضرت ابن عمرؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ یہ وہ ہیں جن کیلئے عرش رحمان ہل گیا اور ان کے لیے آسمان کے دروازے کھول دیے گئے اور ان پر ستّر ہزار فرشتے حاضر ہوئے اور ان کی قبر تنگ کی گئی پھر یہ تنگی دور ہوئی اور پھر ان کی قبر کشادہ ہوگئی۔

حدیثِ پاک کا شانِ وُرُود

مختصراً عرض ہے کہ بنو قریظہ مدینہ منورہ کے یہودیوں کے ایک قبیلہ کا نام ہے۔ ۵ھ میں غزوۂ خندق کے دوران ان یہودیوں نے جو منافقانہ کردار ادا کیا اور باوجودیکہ سابقہ معاہدہ کے تحت مدینہ مُنوّرہ کے اس دفاعی مورچہ پر ان یہودیوں کو بھی مسلمانوں کے شانہ بشانہ کفارِ عرب کی جارحیّت کا مقابلہ کرنا چاہیے تھا لیکن انہوں نے اپنی روایتی بدعہدی اور شرارت کا مظاہرہ کیا اور مختلف قسم کی سازشوں کے ذریعہ اس دفاعی مورچہ کو توڑنے کے لیے کفارِ عرب کے آلہ کار بن گئے۔ ان کی اس بدعہدی اور سازشی کارروائیوں کی بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ خندق کی فتح سے فارغ ہوتے ہی ان (بنو قریظہ) کے ساتھ اعلانِ جنگ کردیا۔ اور ان سب یہودیوں کو ان کے قلعہ میں محصُور ہونے پر مجبور کردیا۔ مسلمانوں کی طرف سے بنو قریظہ کے قلعہ کا محاصرہ ۲۵ دن تک جاری رہا۔ آخرکار انہوں نے یہ تجویز رکھی کہ ہمارا معاملہ حضرت سعد بن معاذؓ کے سپرد کردیا جائے جو قبیلہ اوس کے سردار تھے۔ اور قبیلہ اوس بنو قریظہ کا حلیف تھا ان یہودیوں نے کہا کہ ہم حضرت سعد بن مُعاذؓ کو حَکَم (فیصل) تسلیم کرتے ہیں۔ وہ ہمارے بارے میں جو بھی فیصلہ کریں گے ہم اس کو بے چون وچرا مان لیں گے یہودیوں کا خیال تھا کہ حضرتِ سعدؓ چونکہ ہمارے حلیف قبیلہ کے سردار ہیں چونکہ ان کے اور ہمارے درمیان تعلقات کی ایک خاص نوعیّت ہے اس لیے حضرت سعدؓ یقیناً ہمارے ہی حق میں فیصلہ دیں گے۔ چنانچہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعدؓ کو بُلا بھیجا کہ وہ آکر اس مُعاملہ میں اپنا فیصلہ دیں۔ بہرحال حضرت سعدؓ بن معاذ آئے اور انہوں نے

پورے معاملہ کے مختلف پہلوؤں پر غور کر کے اور ان کے جرمِ بدعہدی و غداری کی بناء پر انہی کی شریعت کے مطابق جو فیصلہ دیا اس کا حاصل یہ تھا کہ ان کے لڑاکے مرد قتل کر دیے جائیں، عورتیں اور بچے غلام بنا لیے جائیں، اور ان کے مال و اسباب کو تقسیم کر دیا جائے چنانچہ اس فیصلہ پر کسی حد تک عمل بھی ہوا۔ چنانچہ حضرت سعدؓ بن معاذ جب فوت ہوئے تو یہودیوں نے کہا کہ اس نے ہمارے خلاف فیصلہ دیا تھا اس لیے ان کا جنازہ ہلکا ہے۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعدؓ بن معاذ کے فضائل بیان فرمائے کہ اصالۃً ملائکہ نے ان کا جنازہ اٹھا رکھا ہے۔ (مظاہر حق ج۴ ص۲۸۷ باب القیام)

قولہ تَحَرَّكَ لَهُ الْعَرْشُ ۔ محدثین حضراتؒ نے عرشِ رحمٰن کی تحریک کے مختلف وجوہات بیان فرمائی ہیں:-

اوّل: تحریکِ عرش خوشی کی بناء پر تھی کہ ایک پاک روح ہماری طرف آ رہی ہے۔

دوم: نیک لوگوں کے اعمال صالحہ اوپر جاتے ہیں ان کی وفات سے وہ اوپر آنا بند ہو گئے اس افسوس میں عرش نے حرکت کی یعنی رنج و غم کی وجہ سے۔ کما فی قولہ تعالیٰ "فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ۔ (پ۲۵ الدخان)

سوم: بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہاں مضاف محذوف ہے۔ عرش سے مراد حملۃ العرش ملائکہ ہیں، یعنی عرش کو اٹھانے والے فرشتوں نے حرکت کی۔ کیونکہ عرش غیر ذی روح ہے اس کیلئے طرب و نشاط رنج و غم نہیں ہو سکتا۔ لیکن جمہور حضرات نے حرکتِ عرش کو اصل قرار دیا ہے۔

سوال: اتنے عظیم الشان صحابیؓ کو عذابِ قبر میں کیوں مبتلا کیا گیا۔؟

جواب اوّل: ربِّ ذوالجلال مختارِ کل ہیں جس کو چاہیں عذاب دیں جس کو چاہیں بچا دیں۔ لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ ۔ (پ۱۷ الانبیاء)

جواب دوم: صحابہ کرامؓ معصوم تو نہیں ہیں ہو سکتا ہے ان کا کوئی معمولی گناہ ہو اور اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہو کہ آخرت میں ان کا درجہ تھوڑی سی تکلیف دے کر بلند کیا جائے۔

جواب سوم: دوسروں کو تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ جب اتنی بڑی ہستی پر آثار عذابِ قبر نمودار ہو سکتے ہیں تو دوسروں کو مامون نہ رہنا چاہیے بلکہ ہمیشہ بچنے کا سامان تیار کرنا چاہیے۔

وَعَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ اَبِيْ بَكْرٍ قَالَتْ قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَطِيْبًا وَذَكَرَ فِتْنَةَ الْقَبْرِ الَّتِيْ يَفْتَتِنُ فِيْهَا الْمَرْءُ فَلَمَّا ذَكَرَ ذَالِكَ ضَجَّ الْمُسْلِمُوْنَ ضَجَّةً ۔

ترجمہ : روایت ہے اسماء بنت ابی بکرؓ سے فرماتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم وعظ کے لیے کھڑے ہوئے تو آپ نے فتنہ قبر کا ذکر فرمایا جس میں انسان مبتلا ہوتا ہے تو جب یہ ذکر کیا تو مسلمانوں نے چیخ ماری۔

قَوْلُهٗ قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَطِيْبًا : قیام مسجد نبوی شریف میں تھا جہاں مردوں اور عورتوں کا اجتماع تھا مرد آگے تھے، عورتیں پردہ کے ساتھ پیچھے جیساکہ اس زمانہ میں عام مروج تھا بلکہ عورتوں کو حکم تھا کہ وعظ کی مجلس میں شرکت کیا کریں۔ تاکہ انہیں احکام و مسائل معلوم ہوں۔ خیال رہے کہ خطبہ اور وعظ کھڑے ہوکر کرنا سنت ہے۔ شامی میں ہے کہ خطبہ نکاح بھی کھڑے ہوکر پڑھا جائے۔

قولہ فَلَمَّا ذَكَرَ ذَالِكَ ۔ اس کا مشار الیہ ما ذکر من الافتنان ہے یہ اس لیے نکالا کہ ذَالِكَ مذکر ہے اور فِتْنَةٌ مؤنث ہے۔ تو ان دونوں میں تطبیق نہیں ہوتی تھی اس سے تطبیق ہوجائے گی۔

قولہ ضَجَّةً : بمعنی رونا چلّانا۔ اس کی تنوین تعظیم کی ہے کہ بہت روئے اور چلائے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان مبارک سے ہیبت طاری ہوئی اور ہیبت سے گھبرا کر رو پڑے اور بے اختیار چیخ نکل گئی۔ اس میں ریا کی گنجائش نہ تھی خیال رہے کہ خوف الٰہی میں صرف آنسوؤں سے رونا بہت بہتر ہے۔ کما فی قولہ تعالیٰ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ (پ ۷) لیکن اگر بے اختیاری میں لوگوں کے سامنے چیخ نکل جائے تو بھی عبادت ہے۔

قولہ قَرِيْبٍ مِّنِّيْ : یا تو قرب مکانی یا قرب نسبی تھا۔ ای اس کا منادیٰ محذوف ہے ای فُلَانٌ۔

قولہ قَالَ قَالَ ۔ پہلے قَالَ کا فاعل قریب والا جوان ہے، دوسرے قَالَ کا فاعل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

قولہٗ قَرِیْبًا مِّنْ فِتْنَةِ الدَّجَّالِ ۔ فتنہ دجّال کی طرح قبر کے فتنہ میں بھی مبتلا کیے جاؤ گے۔

سوال : یہ کہ قبر کے فتنہ کے ساتھ دجّال کے فتنہ کا ذکر کیوں کیا اس کی تو بحث بھی نہیں؛

جواب اوّل یہ کہ دجّال کے فتنہ کو اس لیے ذکر کیا کہ اس کے فتنہ کا اثر قبروں پر بھی پڑے گا۔ چنانچہ علامہ سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ خاص کر لبغیضِ عثمانؓ کی قبر پر ضرور اثر پڑے گا۔

جواب دوم یہ کہ دجّال کے فتنہ کا ذکر ہلاکت وخسران کے اعتبار سے ہے کہ جس طرح فتنہ دجّال اپنی تباہی وبربادی اور نقصان وخسران کی بناء پر سخت ہلاکت آفریں اور تباہ کن ہوگا، اسی طرح فتنہ قبر بھی ہول ودہشت وسختی کی بناء پر بہت زیادہ خوفناک ہوگا۔ لہٰذا تمہیں چاہیے کہ اس سے پناہ پکڑو۔

وَعَنْ جَابِرٍؓ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِذَا اُدْخِلَ الْمَيِّتُ الْقَبْرَ مُثِّلَتْ لَهُ الشَّمْسُ عِنْدَ غُرُوْبِهَا فَيَجْلِسَ يَمْسَحُ عَيْنَيْهِ وَيَقُوْلُ دَعُوْنِىْ اُصَلِّىْ :

ترجمہ : روایت ہے حضرت جابرؓ سے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں فرماتے ہیں کہ جب میّت قبر میں داخل کی جاتی ہے تو اسے سورج ڈوبتا ہوا معلوم ہوتا ہے تو وہ آنکھیں ملتا ہوا بیٹھتا ہے اور کہتا ہے مجھے چھوڑ دو میں نماز پڑھ لوں۔

قولہٗ مُثِّلَتْ لَهُ الشَّمْسُ ۔ اَیْ صُوِّرَتْ وَخُيِّلَتْ یعنی خیال کرتا ہے یا اس کے سامنے غروبِ آفتاب کی تصویر پیش کی جاتی ہے۔

قولہٗ يَمْسَحُ عَيْنَيْهِ ۔ اى على هَيْئَةِ الْمُسْتَيْقِظِ : کیونکہ نوم موت کی بھائی ہے۔ کما وَرَدَ فِى الْحَدِيْثِ " اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ اَحْيَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ "

سوال : قبر میں سوال وجواب کے وقت میّت کو غروبِ آفتاب کا وقت دکھایا جاتا ہے

اس میں کیا حکمت ہے ؟

جوابِ اوّل اس میں اشارہ ہے نمازِ عصر کی تاکید پر کہ مؤمن نمازِ عصر کا بہت اہتمام کرتا ہے اور منافق اہتمام نہیں کرتا۔ دیکھو مؤمن کو قبر میں بھی نمازِ عصر کی فکر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عموماً تمام نمازوں، خصوصاً نمازِ عصر کی بڑی تاکید ہے۔ کما فی قولہ تعالیٰ "حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى" (پ۲) حضرت عمارہؓ بن رویبہ کی روایت ہے "قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَا يَلِجُ النَّارَ رَجُلٌ صَلّٰى قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ اَنْ تَغْرُبَ الخ (ابوداؤد شریف ص۶۱ ج۱ بابٌ فی المحافظۃ علی الصلوات)

جوابِ دوم ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ غروبِ شمس، دنیا سے نکلنے کی طرف اشارہ ہے کیونکہ دنیا بمنزلہ دن کے ہے اور برزخ بمنزلہ رات کے ہے اور آخرت بمنزلہ دوسرے دن کے ہے تو میّت کو یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ ایک عالم سے نکل کر دوسرے میں جو بمنزلہ رات کے ہے داخل ہو رہے ہو۔

جوابِ سوم دراصل غروبِ آفتاب کا وقت پیش کرنا اس کی حالتِ مسافرت اور تنہائی کی مناسبت کی وجہ سے ہے چنانچہ جب کوئی مسافر کسی شہر میں شام کو پہنچتا ہے تو حیرانی و پریشانی کے عالم میں چاروں طرف دیکھتا ہے کہ کہاں جاؤں اور کیا کروں جیسا کہ شامِ غریباں مشہور ہے۔ ؎

تو زلف را کشادی تاریک شد جہاں	اکنوں فتاد شامِ غریباں کجا روند
نمازِ شامِ غریباں چوں گریہ آغازم	بہ ہائے ہائے غریبانہ گر بہ پردازم

وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَؓ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ الْمَيِّتَ يَصِيْرُ اِلَى الْقَبْرِ فَيُجْلَسُ الرَّجُلُ فِيْ قَبْرِهٖ غَيْرَ فَزِعٍ وَلَا مَشْغُوْبٍ ثُمَّ يُقَالُ

ترجمہ: روایت ہے حضرت ابوہریرہؓ سے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے، فرماتے ہیں کہ مُردہ قبر میں پہنچتا ہے، پھر اپنی قبر میں بٹھایا جاتا ہے نہ گھبرایا ہوا نہ پریشان، پھر اس سے کہا جاتا ہے تو کس دین میں تھا وہ کہتا ہے کہ

فِيْمَ كُنْتُ فَيَقُوْلُ كُنْتُ فِي الْاِسْلَامِ فَيُقَالُ مَا هٰذَا الرَّجُلُ فَيَقُوْلُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ !

اِسلام میں تھا، پھر کہا جاتا ہے کہ یہ کون صاحب ہیں، وہ کہتا ہے مُحمّد رسُول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ہیں۔!

قولہٗ يُصِيْرُ : یہاں پر يُصِيْرُ بمعنٰی يَدْخُلُ فِي الْقَبْرِ کے ہے۔

قولہٗ فَزَع : گھبرناک ہونا۔

قولہٗ مَشْغُوْب : خوف زدہ ہونا۔

قولہٗ هَلْ رَأَيْتَ اللّٰهَ : یعنی تو جو کہتا ہے کہ وہ اللّٰہ تعالیٰ کے پاس سے نشانیاں لائے۔ کیا تو نے ربّ ذوالجلال کو انہیں نبی بنا کر بھیجتے ہوئے اور نشانیاں دیتے ہوئے دیکھا تھا وہ جواب میں کہتا ہے کہ خود تو نہیں دیکھا دیکھنے والے محبُوب سے سنا تھا مجھے ان کے کلام پر اپنی آنکھوں سے زیادہ اعتماد ہے۔ میری آنکھیں جھوٹی ہوسکتی ہیں لیکن ان کا کلام غلط نہیں ہوسکتا۔ خیال یہ ہے کہ یہ گفتگو امتحان کے علاوہ ہے، فرشتے خوش ہوکر اس سے یہ باتیں کرتے ہیں۔

قولہٗ يَحْطِمُ : اي يأكل بَعْضُهَا بَعْضًا۔

قولہٗ زَهْرَتِهَا : بفتح الزاء اي حسنها۔ اس کی بہجت اور خوبصورتی۔

قولہٗ وَمَا فِيْهَا : اي مِنَ الْحُوْرِ وَالقصُوْر :

قولہٗ هٰذَا مَقْصَدُكَ : اَيْ بَعْدَ الْحَشْرِ فِي الْعُقْبٰى۔

قولہٗ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ۔ : یہ بطور تبریک کے ہے یا تحقیق کے ہے۔ کما فی قولہ تعالیٰ " اِنْ شَاءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ۔

قولہٗ السُّوْءَ ۔ سُوء سے مراد رجل کافر ہے جو ضدِّ صالح ہے، فاسق فاجر مراد نہیں۔

يقول ابوالاسعاد : آخر میں حدیث کا خلاصہ پیشِ خدمت ہے۔

خُلَاصَہ: یہ ہے کہ والکلّ بقضائه وبقدره وبهٰذا تحصل المُناسبة بين هٰذا الباب وما قبله۔

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَعُوْذُبِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَنَعُوْذُبِكَ مِنْ
فِتْنَةِ الْمَسِيْحِ الدَّجَّالِ وَنَعُوْذُبِكَ
مِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَ
الْمَمَاتِ : اٰمِيْن
بِرَحْمَتِكَ يَآاَرْحَمَ
الرَّاحِمِيْنَ
يَا ذَاالْجَلَالِ
وَالْاِكْرَام

بَابُ الْاِعْتِصَامِ بِالْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ

سوال ۔ اس باب کا ماقبل سے کیا ربط ہے ؟

جواب ۔ ماقبل سے ربط یہ ہے کہ عذاب قبر اور تقدیر کے لیے صرف دلائل عقلیہ کافی نہیں بلکہ دلائل نقلیہ کی بھی ضرورت ہے اور وہ قرآن وسُنّت ہیں۔

فائدہ ۔ ترجمۃ الباب میں تین لفظ ہیں ہر ایک کی علیحدہ لفظی تشریح مطلوب ہے

قولہٗ اَلْاِعْتِصَامُ ۔ بمعنیٰ اَلْاِسْتِمْسَاکُ ہے ۔ کما فی قولہٖ تعالیٰ " وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا (ای تَمَسَّکُوْا بِالْقُرْاٰنِ وَالسُّنَّۃِ) اعتصام بصلہ مِنْ بمعنیٰ پناہ لینا۔ کما فی قولہٖ تعالیٰ " سَاٰوِیْٓ اِلٰی جَبَلٍ یَّعْصِمُنِیْ مِنَ الْمَآءِ " لیکن اس مقام پر اعتصام بمعنی اَلْاِسْتِمْسَاکُ بِالْقُرْآنِ وَالسُّنَّۃ ہے۔ چنانچہ علّامہ محدّث عبدالحق دہلویؒ اعتصام کا معنیٰ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں ۔

واعتصام بہ کتاب وسنت اعتقاد آوردن بحقیقت آں وعمل کردن است بآنچہ دراں واقع شدہ ودور بودن از بدعت ومذاہب اہل ہوا۔ (اشعۃ اللمعات ص۱۲۵ ج ۱)

ترجمہ : اور کتاب وسُنّت کے ساتھ اعتصام اس کی حقیقت کے ساتھ اعتقاد رکھنا اور جو کچھ اس میں واقع ہے اس پر عمل کرنا ہے ۔ بدعت اور اہلِ ہوا کے مذاہب سے دور رہنا ہے۔

قولہٗ اَلْکِتَابُ : اس پر الف لام عہد کا ہے اس سے مراد قرآن مقدس ہے ۔

قولہٗ السُّنَّۃ ۔ : سُنّت کے دو معنیٰ ہیں ۔

اوّل لغوی ۔ لغت کے اندر سنّت بمعنٰی طریقہ کے ہیں کما فی قولہٖ تعالیٰ " سُنَّۃَ اللّٰہِ فِی الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا " (فتح پ۲۶)

دوم اصطلاحی ۔ محدّثین حضرات نے سُنّت کے معانی مختلفہ بیان فرمائے ہیں ۔ مگر

جمہور محدثین نے سنت کا اصطلاحی معنیٰ بیان فرمایا ہے یعنی المراد بالسنۃ اقوالہ وافعالہ واحوالہ علیہ السّلام : یہ کہ سنّت سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور افعال ہیں جن کے مجموعہ کا نام حدیث ہے ۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ ______ یہ پہلی فصل ہے ۔

عَنْ عَائِشَۃَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ اَحْدَثَ فِیْٓ اَمْرِنَا ھٰذَا مَا لَیْسَ مِنْہُ فَھُوَ رَدٌّ ۔

ترجمہ : روایت ہے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے فرماتی ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے کہ جو ایجاد کرے ہمارے دین میں وہ طریقہ جو اس دین سے نہیں وہ مردود ہے ۔

قولہٗ اَحْدَثَ : ای اخترع وابتدع اپنی طرف سے گھڑتا ہے یا پیدا کرتا ہے ۔ پھر یہ احداث عام ہے خواہ بطور عقیدہ ہو یا بطور عمل وقول سب کو شامل ہے ۔

قولہٗ اَمْرِنَا ۔ جمہور علماءِ امّت کے نزدیک اَمْرِنَا سے مراد دینِ اسلام والا امر ہے ۔ علامہ ہرویؒ لکھتے ہیں " ای فی دین الاسلام "، مرقات ج۱ ص۲۱۵ ۔ محدّث عبدالحق دہلویؒ لکھتے ہیں " کسے کہ نو پدید کرد در دینِ ما "، اشعۃ اللمعات ج۱ ص۱۲۵ ۔ لہٰذا اَمْرِنَا سے مُراد دینی امر ہے ۔

یقول ابوالاسعاد : لفظ اَمْرِنَا سے حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلّم نے دو باتوں کی طرف اشارہ فرمایا ۔ اوّلاً اس طرف اشارہ ہے کہ جو چیز نئی ایجاد ہوئی لیکن اسے امر دین میں شمار نہیں کیا گیا تو وہ بدعت کے زمرے میں نہیں آئے گی ۔ ثانیاً اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ مسلمانوں کا کام صرف اور صرف دین ہی ہونا چاہیئے ۔

قولہٗ ھٰذَا : اسم اشارہ ہے جو محسوس کے لیے موضوع ہے ۔ اس کو لاکر یہ بتلانا مقصود ہے کہ دین اسلام کی حقانیت ایسی واضح ہے کہ وہ کالمحسوس ہے اس کا انکار گویا بداہت کا انکار ہے ۔

قولہٗ مَا لَیْسَ مِنْہُ : یعنی ایسی کسی چیز کا دین میں اضافہ کرنا جس کی سند کتاب وسنت میں ظاہرًا وباطنًا ملفوظًا ومستنبطًا کسی طرح بھی نہ ہو ۔

قولہٗ فھو مَرْدُوْدٌ ۔ رَدّ مصدر بمعنیٰ اسم مفعول ہے یعنی مَرْدُوْدٌ مبالغہ کے لیے مصدر

سے تعبیر کر دیا گیا جیسے خَلق بمعنی مخلوق، اور ھُوَ ضمیر کے مَرجَع میں دو احتمال ہیں۔

اوّل: اَحدَثَ سے جو محدَث (یعنی گھڑی ہوئی چیز) مفہوم ہوتا ہے اس کی طرف راجع ہے یعنی ای ھٰذا المحدَث مَردودٌ۔

دوم: یا ضمیر مَنْ موصولہ کی طرف راجع ہے (یعنی ایجاد کرنے والا) "ای ھٰذا الرّجل الّذی احدث ردٌّ ای مطرودٌ عن جناب اللّٰہ تعالیٰ" بعض حضرات کے نزدیک رَدٌّ بمعنیٰ واجب الردّ ای عدم الاتباع۔

فائدہ: اس حدیث پاک میں بدعت کی مذمت کے ساتھ بدعت کی تعریف بھی واضح ہوجاتی ہے۔

بدعت کی تعریف ۔ مُحدّثین حضرات نے بدعت کے دو معنیٰ بیان کیے ہیں:۔

بدعت کا لغوی معنیٰ ۔ لغۃً بدعت کہتے ہیں بلا مثال سابق کسی چیز کو از سرِ نو ایجاد کرنا خواہ اچھی ہو یا بُری۔

بدعت کا شرعی معنیٰ

شریعت کے اندر بدعت کہتے ہیں کہ مَالَیْسَ مِنَ الدِّین کو دین میں داخل کرنا۔ جب کہ اس کی اصل اور نظیر قرونِ ثلاثہ مشہود لہا بالخیر اور اجماعِ امت میں نہ ملے نہ ظاہرًا نہ کنایۃً اور نہ کسی سے مستنبط ہو یہ چند قیودات ہیں تو پہلی قید سے وہ امور بدعت سے نکل گئے جن کا نمونہ قرون ثلاثہ میں موجود ہیں، یا ان سے مستنبط ہیں۔ جیسے مسائل فقہیہ و کلامیہ۔ دوسری قید سے وہ اُمور نکل گئے جن کو ثواب سمجھ کر نہ کیا جائے جیسے توسُّع فی اللذائذ والمآکل والمشارب اور ذرائع آمدورفت، تیسری قید سے وہ امور نکل گئے جن کی ضرورت صحابہ کرامؓ کو نہ پڑی تھی اس لیے نہیں کیا اور بعد والوں کو ضرورت پیش آئی اس لیے کیا۔ جیسا کہ خاص انتظام سے دینی درسگاہیں بنانا وغیرہ۔ اس تعریف سے بدعت کی تقسیم حَسَنہ وسیئہ کرنے کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔ کیونکہ تقسیم کرنے سے حَسَنہ وسیئہ کے درمیان حدِّ فاصل مقرر کرنا بہت مشکل ہوگا کیونکہ جس کو ہم سیئہ کہیں گے بدعتی لوگ اس کو حَسَنہ کہیں گے۔ اور حدیث کُلُّ بِدْعَۃٍ ضَلَالَۃٌ بغیر تاویل کے صحیح ہوجائیگی۔

الغرض بدعت سب کی سب سیئہ ہے حَسَنہ کچھ بھی نہیں۔ اس لیے مکتوبات میں حضرت مُجدد الف ثانی فرماتے ہیں کہ "ہیچ از بدعت بدعت حَسَنہ نیست"

سوال - حضرت عمرؓ نے تراویح بالجماعت کو نعمۃ البدعۃ ہٰذہٖ فرمایا ہے اس سے معلوم ہوا کہ بدعۃ حسنہ ہے؟

جواب اوّل - نِعْمَتُ الْبِدْعَۃِ ھٰذِہٖ فرمانا وہاں بدعت سے لغوی بدعت مراد ہے کیونکہ صحابہ کرامؓ کا فعل بدعت شرعی نہیں ہو سکتا۔

جواب دوّم - یا مُراد یہ ہے کہ اگر بدعت کوئی اچھی ہوتی تو یہ ہوتی اور یہ بدعت نہیں ہے لہٰذا بدعت کا کوئی فرد حسنہ نہیں ہے۔

فائدہ اُولیٰ بعض سلفؒ سے جو تقسیم منقول ہے اس سے بدعت لغوی مراد ہے شیخ عزّ الدین عبدالسّلام فی آخر کتاب القواعد لکھتے ہیں کہ بدعۃ لغویہ پانچ قسم ہیں:-

اوّل واجب: مثلاً فِرَق باطلہ قادیانیت وغیرہ کی تردید کرنا۔ کیونکہ شریعت مُقدسہ کی ایسی بدعات سے حفاظت کرنا واجب ہے اور یہ چیزیں اس کا مُقدمہ ہیں، اور واجب کا مقدمہ بھی واجب ہوتا ہے۔

دوّم حرام - مثلاً جبریہ اور معتزلہ کے عقائد وغیرہ۔

سوّم مُستحب - مثلاً مدارس دینیہ اور تزکیہ نفوس کے لیے خانقاہوں کی تعمیر یا تراویح با جماعت ادا کرنا۔ حضرت عمرؓ اس کے متعلق فرماتے ہیں نِعْمَتِ الْبِدْعَۃُ ھٰذِہٖ۔ تو یہاں بھی بدعۃ لغویہ مراد ہے جو درحقیقت سنّۃ حسنہ ہے۔

چہارم مکروہ - مثلاً عقیب الصّلوٰۃ الصبح والعصر مُصافحہ کرنا۔ عند الاحناف مکروہ اور عند الشوافع مُباح ہے۔ لانّ الصّحابۃ ما صافحوا بعد اداء الصّلوٰۃ ولانّھا مِنْ سُنَنِ الرّوافض (شامی بحوالہ امداد الاحکام ص۱۰۳ ج ۱) وعلیٰ ہٰذا میّت کا سوئم اور چہلم بھی بدعت مکروہ ہے۔ چنانچہ شامی ص۶۶۴ ج ۱ میں ہے" ویکرہ اتخاذ الطّعام فی الیوم الاوّل والثّالث وبعد الاسبوع۔

پنجم مُباح - مثلاً کھانے پینے اور مکان بنانے میں توسّع کرنا جب کہ مال حرام سے نہ ہو اور اسی طرح مساجد اور قرآنِ پاک کے نسخوں میں نقش و نگار کرنا، عند الاحناف مباح و عند الشوافع مکروہ ہے۔ اور پیٹ بھر کے کھانا۔ چنانچہ امام غزالیؒ فرماتے ہیں" اَوّلُ بِدْعَۃٍ فِی الْاِسْلَامِ

شبع البطنِ۔

فائدہ ثانیہ جس چیز کی نسبت دین کی طرف کی جائے اس کی دو قسمیں ہیں۔
اوّل مَا مِنَ الدِّيْنِ۔ دوّم مَا لَيْسَ مِنَ الدِّيْنِ مَا مِنَ الدِّيْنِ سے مُراد یہ ہے کہ اس شئی کے دین میں سے ہونے پر کوئی شرعی دلیل قائم ہو اور مَا لَيْسَ مِنَ الدِّيْنِ وہ چیز ہے جس کے دین میں سے ہونے پر کوئی شرعی دلیل قائم نہ ہو۔

کسی چیز کے بدعت ہونے کی کیا دلیل ہے؟

محدثین حضرات نے تقسیم کے بعد کسی چیز کے بدعت ہونے کے لیے دو شرطیں لگائی ہیں۔
اوّل : مَا لَيْسَ مِنَ الدِّيْنِ کے قبیل سے ہو۔
دوّم : اس کو دین میں سمجھا جائے۔ مثلاً ایصال ثواب کا جواز دلیل شرعی سے ثابت ہے اگر کوئی شخص ایصال ثواب کو مشروع سمجھتا ہے اور اس کو کرتا ہے تو اس نے مَا مِنَ الدِّيْنِ کو دین سمجھا ہے اس لیے یہ بدعت نہیں کیونکہ یہاں بدعت کا پہلا رکن یعنی مَا لَيْسَ مِنَ الدِّيْنِ ہونا مفقود ہے لیکن اگر کوئی شخص سمجھتا ہے کہ فلاں مہینہ کی فلاں تاریخ کو ایصال ثواب کرنے کا زیادہ ثواب ہے تو اس دن کی تخصیص کی یہ بدعت ہے اس لیے کہ اس پر کوئی دلیل شرعی قائم نہیں۔ یہ مَا لَيْسَ مِنَ الدِّيْنِ کے قبیل سے ہے۔ اس لیے اس شخص نے اس کو دین میں داخل کر دیا اور موجب ثواب سمجھا یہ بدعت ہو گی۔

مذمّتِ بدعت اَحادیث نبویہ میں بدعت کی بہت مذمت کی گئی ہے۔ چند احادیث پیش خدمت ہیں :۔

① وَعَنْ اِبْرَاهِيْمَ بْنِ مَيْسَرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ وَقَّرَ صَاحِبَ بِدْعَةٍ فَقَدْ اَعَانَ عَلٰى هَدْمِ الْاِسْلَامِ (مشکوٰۃ شریف ص۳۱ ج۱) یعنی جو بدعتی کی تعظیم کرے گا وہ اسلام کی بیخ کنی میں اعانت کرے گا۔

② حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ حُجِبَتِ التَّوْبَةُ عَنْ صَاحِبِ كُلِّ بِدْعَةٍ

کیونکہ بدعتی آدمی بدعت کو گناہ نہیں سمجھتا اور توبہ گناہ سے ہوتی ہے۔

(۳) بدعتی پر سلام پڑھنے اور سلام کا جواب دینے سے منع کیا گیا ہے جب کہ سلام شعائرِ اسلامی ہے۔

(۴) بعض محققین کا قول ہے کہ بدعتی جو دین میں نیا امر شامل کرتا ہے وہ مخفی طور پر مدعی نبوت ہے کیونکہ دین میں اضافہ و کمی بتلانا اور کرنا یہ تو فعلِ نبی ہے جب کہ اس نے اسلام کی عدمِ تکمیل کا مُدعی بن کر اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ الخ (مائدہ آیت ۳) کی تکذیب کی ہے۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بدعت کی جتنی مذمت فرمائی ہے شاید کفر و شرک کے بعد کسی اور چیز کی اتنی برائی بیان نہیں فرمائی۔ (وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذَالِكَ)

وَعَنْ جَابِرٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَّا بَعْدُ فَاِنَّ خَيْرَ الْحَدِيْثِ كِتَابُ اللّٰهِ وَخَيْرَ الْهَدْىِ هَدْىُ مُحَمَّدٍ وَشَرَّ الْاُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ

ترجمہ: روایت ہے حضرت جابرؓ سے فرماتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حمد و صلوٰۃ کے بعد یقیناً بہترین بات اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور بہترین طریقہ محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰؐ کا ہے اور بدترین چیز دین کی بدعتیں ہیں اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

قولہٗ اَمَّا بَعْدُ: اصل میں تھا "بَعْدَمَا تَقَدَّمَ مِنَ الْحَمْدِ وَالصَّلٰوۃِ" حضرت نبی کریم علیہ السلام کوئی خطبہ ارشاد فرما رہے ہوں گے کہ اَمَّا بَعْدُ فرمایا اس کی تشریح آ چکی ہے اور یہ اَمَّا بَعْدُ بطور فصل الخطاب کے نقل کیا جاتا ہے۔

قولہٗ اَلْحَدِیْثَ: حدیث کے معنیٰ مطلقاً بات اور کلام کے ہیں۔ لہٰذا اس معنیٰ سے قرآن بھی حدیث ہے اور لوگوں کی کلام بھی، مگر اصطلاح میں صرف حضورؐ کے فرمان اور کلام کو حدیث کہا جاتا ہے۔ مگر یہاں لغوی معنیٰ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا کلام تمام کلاموں پر ایسا ہی بزرگ ہے جیسے خود پروردگار اپنی مخلوق پر۔

قولہٗ ھَدْیُ : لفظ مشہور ھَدْیَ ہے لیکن بعض حضرات ھُدٰی بھی پڑھتے ہیں دونوں کے معنیٰ سیرت طیبہ اور اچھی خصلت کے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اچھی ہے کیونکہ یہ رب کی طرف سے ہے جب کہ ہمارے کام اور ہماری کلام نفسانی اور شیطانی بھی ہوتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر قول وفعل رحمانی ہے اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی فعل پر اعتراض کفر ہے کیونکہ وہ رب پر اعتراض ہے۔ لوگوں نے آپ کے نکاح پر اعتراض کیا تو ربِّ ذوالجلال کو کہنا پڑا "وَزَوَّجْنٰكَهَا" ہم نے آپ کا نکاح کرایا۔

قولہٗ مُحْدَثَاتُهَا : یہ مُحْدَثٌ سے ہے مُحْدَثٌ بمعنیٰ جدید اور نو پیدا چیز کمافی قولہٖ تعالیٰ "بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (بقرہ پ۱)

اس سے عمومی بدعات مراد ہیں قولی ہوں یا فعلی ہوں یا اعتقادی ہوں۔

سوال ۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بدعت کو شرّالامور کہا حالانکہ شرّالامور تو اور بھی بہت ہیں مثلاً زنا، چوری، قتل وغیرہ اس کی تخصیص کی کیا وجہ ہے ؟

جواب اوّل ۔ مقام اور مجلس کے اعتبار سے تخصیص فرمائی ہے کہ جہاں یہ خطبہ ارشاد فرمایا ہوگا وہاں کے لوگوں میں بدعات کا رواج ہوگا۔

جواب دوم ۔ مریض دو قسم ہیں ۱ مریض جو اپنے آپ کو بیمار سمجھے اور علاج بھی کرائے۔ ۲ وہ مریض جو فی الواقع بیمار تو ہے لیکن اپنے آپ کو بیمار نہیں سمجھتا جب بیمار ہی نہیں سمجھتا تو علاج کہاں سے کرائے گا۔ یہی حال چوری زنا وغیرہ کا ہے کہ ان کا مرتکب اپنے آپ کو گناہگار سمجھتا ہے اور کسی وقت بھی اس کو توبہ نصیب ہو سکتی ہے جب کہ بدعتی ایک ایسا مجرم ہے جو اوّلاً بدعت کو جرم ہی نہیں سمجھتا بلکہ نیکی کا درجہ دیتا ہے۔ ثانیاً توبہ بھی نہیں کرتا۔ تو قانون ہے کہ جب کسی فعل کو نیکی سمجھ کر کیا جائے تو اس کا ترک ناممکن ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ گناہگار کو تو توبہ نصیب ہو سکتی ہے۔ بدعتی کو نہیں۔ اسی بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شرّالامور فرمایا۔

قولہٗ كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ ۔ یہ قاعدہ کلیہ ہے فلا مخصص لہٗ۔

سوال ۔ جب حدیث پاک کے مطابق ہر بدعت ضلالت ہے تو پھر اس کی تقسیم کیسے صحیح ہے کہ ہر بدعت لغوی و شرعی، کیونکہ حدیث کے اس جملہ سے تقسیم کی تردید ہوتی ہے۔

جواب اوّل ۔ اس جملہ میں بدعت شرعی کی تقسیم کی نفی ہے یعنی كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ

سے مراد بدعت شرعیہ واصطلاحیہ ہے جو مطلقاً مذموم ہے اور جو حرام ہے وہ حرام رہے گا۔ البتہ بدعت لغویہ کی تقسیم ہے۔ چنانچہ علامہ ابن رجب حنبلیؒ لکھتے ہیں :۔

وَاَمَّا مَا وَقَعَ فِی کَلَامِ السَّلَفِ مِنْ اِسْتِحْسَانِ بَعْضِ الْبِدَعِ فَاِنَّمَا ذَالِكَ فِی الْبِدَعِ اللُّغْوِیَۃِ لَا فِی الشَّرْعِیَّۃِ : (جامع العلوم والحکم ص۱۹۳)

جواب دوم ۔ حدیث پاک کے اندر ضلالۃ کی قید احترازی نہیں بلکہ اتفاقی اور واقعی ہے قرآن مقدس اور حدیث پاک میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں :۔

مثال اوّل اللہ پاک فرماتے ہیں " یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوا الرِّبٰوا اَضْعَافًا مُّضَاعَفَۃً (آل عمران پ۴) اے ایمان والو ربا دوگنا در دوگنا نہ کھاؤ ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوگنا در دوگنا نہ کھاؤ۔ ایک حصہ یا تھوڑا کھاؤ تو جائز ہے ۔ حالانکہ ربا قلیل وکثیر من کل الوجوہ حرام ہے تو یہاں بھی قید احترازی نہیں بلکہ اتفاقی ہے ۔

مثال دوم وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْتَرِیْ لَھْوَ الْحَدِیْثِ لِیُضِلَّ عَنْ سَبِیْلِ اللہِ (لقمان پ۲۱) لَھْوَ الْحَدِیْثِ کی شراء ممنوع ہے کیونکہ اس سے لوگ گمراہ ہوتے ہیں ۔ حالانکہ مطلقاً آلات مزامیر کی شراء ممنوع ہے خواہ نیت گمراہی کی ہو یا نہ ہو تو یہاں بھی قید اتفاقی ہے ۔

سوال ۔ ترمذی شریف ص۹۶ ج۲ بَابُ الْاَخْذِ بِالسُّنَّۃِ وَاجْتِنَابِ الْبِدْعَۃِ میں اور مشکوٰۃ شریف ص۳۰ ج۱ بَابُ الْاِعْتِصَامِ بِالْکِتَابِ وَالسُّنَّۃِ فصل ثانی میں بھی یہی روایت ہے ۔ بلال بن الحارث مزنی کی روایت جس کے الفاظ ہیں " ومن ابتدع بدعۃ ضلالۃ اس میں بدعۃ ضلالۃ کی قید مذکور ہے ۔

جواب ۔ ترمذی شریف کی یہ روایت ضعیف ہے ۔ کیونکہ اس میں کثیر بن عبداللہ راوی ہے اس کے متعلق امام شافعیؒ اور امام ابوداؤدؒ فرماتے ہیں " رکن من ارکان الکذب بعض حضرات نے متروك واہٍ کہا ہے ۔ لہٰذا یہ روایت ضعیف ہے ۔

وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

ترجمہ : روایت ہے حضرت ابن عباسؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اَبْغَضُ النَّاسِ اِلَى اللّٰهِ ثَلَاثَةٌ مُلْحِدٌ فِي الْحَرَمِ وَمُبْتَغٍ فِي الْاِسْلَامِ سُنَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ وَمُطَّلِبُ دَمِ امْرِءٍ مُسْلِمٍ بِغَيْرِ حَقٍّ لِيُهْرِيْقَ دَمَهٗ۔

نے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں تین شخص سب سے زیادہ مبغوض ہیں، حرم میں بے دینی کرنے والا اسلام میں جاہلیت کے طریقہ کا متلاشی مسلمان کے خون ناحق کا طلب گار تاکہ اس کی خون ریزی کرے۔

قولہ اَبْغَضُ النَّاسِ ۔ اَلنَّاسُ کی الف لام عہد کی ہے المراد عصاۃ المسلمین یعنی گناہگار اب معنیٰ ہوگا کہ گناہگار لوگوں میں سے زیادہ مبغوض اللہ پاک کی طرف تین شخص ہیں۔

قولہٗ ثَلَاثَةٌ ۔ اصل میں ثَلَاثَةُ اَشْخَاصٍ تھا۔

قولہ مُلْحِدٌ فِي الْحَرَمِ : مُلْحِدٌ الحاد سے ہے الحاد کے معنیٰ ہیں میلان اور جھکنا۔ شریعت میں باطل کی طرف جھکنے والے کو مُلحد کہتے ہیں۔ اور مراد یہاں ہے کہ بے دینی پھیلانے والا حرم میں۔ یعنی پہلا شخص وہ ہے جسے خدا نے اپنے گھر کی زیارت نصیب فرمائی۔ مگر اس کے باوجود ایسی چیزیں اختیار کرتا ہے جو ایک طرف تو اس مقدس جگہ کی شان وعظمت کے منافی ہیں اور دوسری طرف احکام شریعت کی کھلی خلاف ورزی کے مترادف ہیں مثلاً وہاں لڑائی جھگڑا کرنا، شکار کرنا یا کوئی مطلق گناہ کرنا۔

قولہٗ مُبْتَغٍ فِي الْاِسْلَامِ ۔ ای طالب فی الاسلام دوسرا شخص وہ ہے جس کو خدا نے ایمان واسلام کی دولت سے نوازا اور اس کے قلب کو یقین واعتقاد کی روشنی سے منور کیا مگر وہ اسلام میں ان چیزوں کو اختیار کرتا ہے جو خالص زمانہ جاہلیت کا طریقہ اور غیر اسلامی رسمیں تھیں۔ جیسے نوحہ کرنا یا مصائب وتکلیف کے وقت گریبان چاک کرنا، بُرے شگون لینا نذر ونیاز کرنا وغیرہ وغیرہ۔

قولہٗ سُنَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ ۔ سنّت کے لغوی معنیٰ طریقہ کے مراد ہیں یعنی طریقہ جاہلیت جس کی تفصیل آچکی ہے تو اس سوال کا بھی دفعیہ ہوگیا کہ سنّت کا اطلاق تو حضور علیہ السلام کے اُسوۂ حسنہ پر ہوتا ہے جو محمود ہی محمود ہے جب کہ جاہلیت کا طریقہ تو مذموم ہے لہٰذا سنت کا لغوی معنیٰ مُراد ہے ای طریقۃ الجاهلیۃ۔

قولہٗ ومُطلّبُ دَمِ امْرِءٍ مُسْلِمٍ : مُطلّب بمعنیٰ انتظار بھی ہے، یا طلبگار کے معنیٰ میں بھی ہے، یعنی تیسرا شخص وہ ہے جو کسی مُسلمان کا ناحق خون بہانے کا طلب گار ہو یعنی کسی مسلمان کو قتل کرنے کا مقصد محض خون ریزی ہو اور کوئی مقصد نہ ہو۔

سوال۔ شارع علیہ السلام نے ان تین کی تخصیص کیوں فرمائی، اس میں کیا حکمت ہے؟

جواب اوّل۔ حکمت موقع محل ہے کہ وہ موقعہ محل ایسا تھا بلکہ ان کا رواج تھا اس لیے ان کی تردید فرمائی۔

جواب دوم۔ ان کے مبغوض ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ہر ایک گناہ میں اس کے ساتھ ساتھ مزید قباحت کے لیے ایک امر بھی ہے جس کی وجہ سے یہ مبغوض ہو رہے ہیں۔

مثال جُرم اوّل : اِلحاد مطلقاً ممنوع ہے، پھر وہ بھی حرم پاک میں۔

مثال جُرم دوم : ہر غلط راستہ بُرا ہے لیکن وہ بھی جاہلیت والا جس کو قرآن مُقدس نے ضَلال نہیں بلکہ ضَلال مُبِین فرمایا۔

مثال جُرم سوم : قتل ویسے بُرا ہے پھر قتل بھی ناحق، یعنی قتل برائے قتل اور وہ بھی خون ریزی کے لیے۔

وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کُلُّ اُمَّتِیْ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ اَبٰی قِیْلَ مَنْ اَبٰی قَالَ مَنْ اَطَاعَنِیْ دَخَلَ الْجَنَّةَ وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ اَبٰی۔

ترجمہ : روایت ہے حضرت ابوہریرہؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے کہ منکر کے سوا میری ساری امت جنت میں جائے گی۔ عرض کیا گیا کہ منکر کون ہے فرمایا جس نے میری فرمانبرداری کی بہشت میں گیا، جس نے میری نافرمانی کی منکر ہوا۔

قولہٗ کُلُّ اُمَّتِیْ۔ حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کی اُمّت دو قسم ہے۔

اُمّتِ اِجابت۔ جنہوں نے نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و شریعت کو قبول کیا

جیسے اہل ایمان۔
اُمّتِ دعوت ۔ جنہوں نے حضرت کی دعوت کو قبول نہیں کیا جیسے غیر ملّتِ اسلامیہ اب اگر اُمّت سے امتِ دعوت مُراد ہے تو اِلاَّ مَنْ اَبٰی کی استثنار مُتّصل ہوگی اور اگر اُمّت سے اُمّتِ اجابت مُراد ہے تو پھر استثنار منقطع ہوگی ۔ اسی طرح اگر اُمّت سے اُمّتِ دعوت مُراد ہو تو اَبٰی سے مراد کافر ہیں۔ اگر امتِ اجابت ہے تو اَبٰی سے مراد عاصی و گنا ہگار لوگ ہیں تو اس صورت میں حدیث تغلیظ پر محمول ہے یا اس سے دخول اولی کی نفی مراد ہے۔ اور مَنْ اَبٰی کا معطوف علیہ مقدر ہے اصل میں عبارت تھی " عَرَفْنَا الَّذِیْنَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّۃَ وَمَنْ اَبٰی ۔

تشریحِ مَنْ اَبٰی

اباء اور انکار کی دو صورتیں ہیں ۔ اوّل اباءِ اعتقادی : یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی بات پر (نعوذ باللہ) پورا اِعتقاد نہیں تو ایسا شخص خالد فی النار ہوگا۔ حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ میری امتِ دعوت جنّت میں ضرور جائیگی ۔ سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے اباءِ اعتقادی یعنی کفر کیا یہ جنّت میں کبھی نہیں جائیں گے ۔ دوم اباءِ عملی : یعنی اعتقادًا تمام ضروریاتِ دین کو مانتا ہے ۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض باتوں پر عمل کرنے میں سستی کرتا ہے ایسے شخص کے دخول فی النار کا خطرہ ہے ۔ حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ میری امتِ اجابت کو جنّت کا دخول اوّلی ضرور حاصل ہوگا ۔ سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے بدعملی کی ہوگی ۔

سوال ۔ یہ ہے کہ مَنْ اَبٰی کی تفسیر تو مَنْ عَصَانِیْ ہے لیکن مَنْ اَطَاعَنِیْ کیوں فرمایا اور یہ کس کی تفسیر ہے ؟

جوابِ اوّل ۔ بعض حضرات کے نزدیک توافق بین العبارت کے لیے فرمایا ہے اور مَنْ اَطَاعَنِیْ یہ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّۃَ کی تفسیر ہے ۔

جوابِ دوم ۔ یہ زیادتی علی الجواب ہے اور یہ لغتِ عرب میں شائع و ذائع ہے ۔

وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ جَاءَتْ مَلٰٓئِکَۃٌ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

ترجمہ : روایت ہے حضرت جابرؓ سے فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی

وَهُوَ نَائِمٌ فَقَالُوْا اِنَّ لِصَاحِبِكُمْ هٰذَا مَثَلًا فَاضْرِبُوْا لَهٗ مَثَلًا قَالَ بَعْضُهُمْ اِنَّهٗ نَائِمٌ وَقَالَ بَعْضُهُمْ اِنَّ الْعَيْنَ نَائِمَةٌ وَالْقَلْبُ يَقْظَانِ -

بارگاہ میں فرشتے حاضر ہوئے جب کہ آپ سو رہے تھے تو بولے کہ تمہارے ان صاحب کی کہاوت ہے ان سے بیان کر دو تو بعض بولے کہ وہ سو رہے ہیں اور بعض نے کہا کہ ان کی آنکھیں سو رہی ہیں اور دل مبارک بیدار ہے۔

قولہ جَاءَتْ مَلٰئِكَةٌ : ملائکہ سے مراد فرشتوں کی جماعت ہے جن میں حضرت جبریلؑ و میکائیلؑ بھی داخل ہیں۔ حضرت جبریلؑ آپ کے سرہانے تھے اور میکائیلؑ پائنتی کی جانب تھے۔ جیسا کہ ترمذی شریف کی روایت ہے حضرت جابرؓ سے " قَالَ خَرَجَ عَلَيْنَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا فَقَالَ اِنِّيْ رَأَيْتُ فِي الْمَنَامِ كَاَنَّ جِبْرَئِيْلُ عِنْدَ رَأْسِيْ وَمِيْكَائِيْلُ عِنْدَ رِجْلَيَّ الخ (مرقاۃ)

اور یہ واقعہ حضرت جابرؓ سے خود حضور علیہ السلام نے بیان فرمایا جیسا کہ ترمذی شریف کی روایت میں ہے یا حضرت جابرؓ نے خود یہ واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو اور یہ گفتگو اپنے کانوں سے سنی ہو جیسا کہ ترمذی شریف اور صحیح بخاری شریف میں حضرت ابن مسعودؓ کی روایت ہے :-

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَوَسَّدَ فَخِذَهٗ فَرَقَدَ وَكَانَ اِذَا نَامَ نَفَخَ فَبَيْنَا اَنَا قَاعِدٌ اِذَا اَنَا بِرِجَالٍ عَلَيْهِمْ ثِيَابٌ بِيْضٌ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَهُمْ مِنَ الْجَمَالِ فَجَلَسَتْ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ عِنْدَ رَأْسِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَطَائِفَةٌ عِنْدَ رِجْلَيْهِ الخ (مرقاۃ)

قولہ اِنَّ لِصَاحِبِكُمْ : اى لمُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عليه وسلم۔ یعنی صاحب سے حضرتؐ کی ذات پاک مراد ہے۔

قولہ فَاضْرِبُوْا لَهٗ مَثَلًا : اى بَيِّنُوْا لَهٗ مثلًا یعنی ان کو مثال بیان کر دو تاکہ وہ سن کر اپنی اُمت کو پہنچا دیں کیونکہ نبی کا خواب بھی وحی ہوتا ہے۔

قولۂ مَأْدُبَۃ ۔ بضم الدال مأدبۃ اَدَبٌ سے بمعنیٰ کھانے کی دعوت مگر اصطلاح میں عام کھانے کو مأدُبۃ کہا جاتا ہے جیسے ولیمہ وغیرہ۔

قولۂ اَوِّلُوھَا ۔ ای فسّروا الحکایۃ یعنی وضاحت سے مثال کو بیان کرو۔

قولۂ یفقھھا ۔ ای یفہمہا تاکہ تمہارے ساتھی اس کو وضاحت سے سمجھیں۔

قولۂ وَقَالَ بَعْضُھُمْ اِنَّ الْعَیْنَ نَائِمَۃٌ : یہاں پر ایک سوال ہے۔

سوال ۔ یہ کہ فرشتوں نے سوال کو مکرر کیوں کیا ؟

جواب ۔ اس مسئلہ کی تاکید و اہتمام کے لیے مکرر سوال کیا تاکہ یہ مسئلہ ذھن نشین ہو جائے۔ عند البعض عظمتِ شان بیان کرنے کے لیے بھی دوبارہ ذکر کیا گیا ہے۔

بیانِ فوائد

فائدہ اُولیٰ اس مضمون کی ایک اور حدیث تھوڑے اختلاف کے ساتھ آگے ص ۲۹ فصل ثانی میں آرہی ہے۔ ان حدیثوں کا حاصل دو باتیں ہیں۔ اولاً یہ بات امّت کو بتلانا مقصود ہے کہ فلاحِ آخرت اور جنّت حضور صلّی اللہ علیہ وسلم کی اتباع ہی سے حاصل ہوسکتی ہے۔ کما قیل ؎

پندارِ سعدی کہ راہِ صفا ——— تواں رفت جز بر پئے مصطفےٰ

ثانیًا : اس حدیث کی تشبیہ کا حاصل یہ ہے کہ ذات باری تعالیٰ بمنزلہ رجل کریم کے ہیں۔ یا گھر بنانے ولے، یا دسترخوان چننے والے ہیں اور جنّت بمنزلہ دار کے ہے اور نعمائے جنّت بمنزلہ مَأْدُبَۃٌ (سالن) کے ہیں اور آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم بمنزلہ داعی کے ہیں۔

فائدہ ثانیہ نیند آنکھ کو ہوتی ہے اور دل بیدار ہوتا ہے۔ عالم بالا کے لحاظ سے دنیا کے لحاظ سے نہیں۔ حضرت علامہ رومیؒ نے مثنوی کے اندر اسی حدیث کا معنیٰ بیان کیا ہے ؎

گفت پیغمبر کہ عَیْنِی تَنَامُ ——— لَایَنَامُ الْقَلْبُ عَنْ رَبِّ الْاَنَامِ

حضرت کی دل مبارک بیدار تھی عالم بالا کے اندر اور فرشتے بھی عالم بالا کے تھے۔ اس لیے

حضرتؐ کی ذاتِ مبارک یہ کلام سُن رہی تھی۔

قولہٗ وَ مُحَمَّدٌ فَرقٌ بَیْنَ النَّاسِ۔ ای فَارِقٌ بَیْنَ المُؤمِنِ وَالکَافِرِ وَالصَّالِحِ وَالفَاسِقِ۔ یعنی کفر و ایمان، کافر و مؤمن میں فرق صرف حضور علیہ السلام کی ذاتِ پاک سے ہے کہ ان ہی کا ماننے والا مؤمن ہے اور ان کا مُنکر کافر۔

اِنَّ العَینَ نَائِمَۃٌ وَالقَلبُ یَقظَانٌ کی بحث

اسی مضمون کی اور روایت بھی ہے جس کو امام ابوداؤدؒ نے اپنی سُنن ابی داؤد ص۳۰ ج ا باب فِی الوُضُوءِ مِنَ النَّوْمِ میں نقل فرمایا ہے: " قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ تَنَامُ عَیْنَایَ وَلَا یَنَامُ قَلْبِی الخ عام لوگوں کی نیند صرف ظاہری اعضاء پر ہی اثر انداز نہیں ہوتی بلکہ ان کا دل بھی اس سے متأثر ہوتا ہے لیکن انبیاء کرامؑ کی نیند سے صرف ظاہری اعضاء ہی متأثر ہوتے ہیں دل پر ان کی نیند کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ متعدد احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السّلام کے دل نہیں سوتے چنانچہ ابن سعدؒ کی ایک روایت میں جو عطاء سے مُرسلاً مروی ہے، اس میں اس طرح ہے " اِنَّا مَعَاشِرَ الاَنْبِیَاءِ تَنَامُ اَعْیُنُنَا وَلَا تَنَامُ قُلُوبُنَا (منہل) کیونکہ نبی کی ذاتِ پاک کو ہر وقت عالمِ بالا سے علم حاصل کرنے کے لیے تیار رہنا ہوتا ہے۔ اس طرح ان کے قلوب مبارکہ بھی ہر وقت نوم اور یقظہ میں حصولِ علومِ وحی کے لیے تیار رہتے ہیں۔ اگر اس غلط نظریہ کو درست تسلیم کر لیا جائے کہ اعضاءِ ظاہری کے سونے سے نبی کا دل بھی سوجاتا ہے، تو وحی کی اس قسم پر سے اعتماد اٹھ جاتا ہے اس لیے جہاں اس بات پر اُمّت کا اجماع و ایمان ہے کہ انبیاء کرام کا خواب وحی کا درجہ رکھتا ہے تو لازمی طور پر یہ ماننا جائے کہ نیند کی حالت میں بھی انبیاء کرام علیہم السّلام کے قلوب مبارک بیدار رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کا خواب وحی کی ایک مستقل قسم ہے اور وحی کی دوسری اَقسام کی طرح قطعی اور حجّت ہے۔

مثال قتلِ اولاد جس کی حرمت قطعیہ ہے لیکن نبی کے خواب سے اس کا نسخ ہو سکتا ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے خواب دیکھا کہ میں اپنے پیارے بیٹے کو ذبح کر رہا ہوں۔ حضرت ابراہیم علیہ السّلام اس کو وحی قطعی سمجھ کر اس پر عمل کرنے کے لیے

تیار ہوجاتے ہیں۔ پھر اپنے پیارے بیٹے سے امتحاناً پوچھتے ہیں اور وہ جواباً عرض گویا ہیں:۔ یٰاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ، حضرت اسماعیل علیہ السلام نے بھی اس خواب کو حق تعالیٰ کا حکم قرار دیا۔ معلوم ہوا کہ وہ بھی نبی کے خواب کو حجت سمجھتے تھے ورنہ کون اپنی جان دینے پر تیار ہوتا ہے۔ ثانیاً قرآن مقدس نے بھی ان دونوں مقدس ہستیوں (ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ) کی مدح سرائی کرتے ہوئے اس نظریہ کو بلا انکار نقل کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ قرآن مقدس کی نظر میں بھی نبی کا خواب وحی قطعی اور حجت ہوتا ہے چونکہ نیند کی حالت میں بھی نبیؑ کا دل نہیں سوتا۔ اس لیے انبیاء علیہم السلام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کی نیند ناقض وضو نہیں ہوتی۔ یہ مضمون متعدد احادیث سے بھی ثابت ہے۔ اور علمائے امت کا بھی یہی نظریہ ہے بعض اوقات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سو جاتے اور اٹھ کر نیا وضو کیے بغیر نماز پڑھ لیتے (مسلم شریف ص۲۶۱ ج ۱ باب صلوٰۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ودعائہ باللیل۔) حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے جس کے الفاظ ہیں " فَصَلّٰی ثُمَّ اضْطَجَعَ فَنَامَ حَتّٰی نَفَخَ ثُمَّ اَتَاهُ بِلَالٌ فَاٰذَنَهٗ بِالصَّلٰوةِ فَخَرَجَ فَصَلَّى الصُّبْحَ وَلَمْ يَتَوَضَّأْ - قَالَ سُفْيَانُ وَهٰذَا لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَاصَّةً لِاَنَّهٗ بَلَغَنَا اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَنَامُ عَيْنَاهُ وَلَا يَنَامُ قَلْبُهٗ -

سوال - ایک حدیث مشکوٰۃ شریف ص۶۷ باب فضل الاذان کتاب الصلوٰۃ میں آئے گی جس کو حدیث لیلۃ التعریس کہتے ہیں اس میں ہے کہ ایک مرتبہ سفر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح صادق کے قریب سونے کے لیے پڑاؤ ڈالا۔ حضرت بلالؓ کو حکم دیا کہ صبح صادق کے وقت جگا دینا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ سو گئے اتفاق سے حضرت بلالؓ کو بھی نیند آگئی اور فجر کے وقت کسی کو بھی جاگ نہیں ہوئی۔ جب سورج نکل آیا تو جاگ ہوئی۔ اس وقت آپ نے کوچ کا حکم دیا بعدہٗ نماز قضا فرمائی۔ اسی پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ تو کہتے ہیں کہ نبی کا دل ہر وقت بیدار ہوتا ہے۔ اگر یہی بات ہے تو پھر نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو صبح صادق کا علم کیوں نہ ہوا؟

جواب اوّل بعض حضرات نے اس اشکال کا یہ جواب دیا ہے کہ نبی کے دل کا ہر وقت بیدار رہنا کلی نہیں اکثری ہے کبھی کبھار نبی کا دل بھی نیند سے متأثر ہو جاتا ہے ایسے مواقعات میں سے ایک موقعہ لیلۃ التعریس کا واقعہ بھی پیش آیا ہے۔ لیکن جمہور حضرات نے اس جواب کو مردود کہا ہے کیونکہ نبی کا ہر خواب وحی ہے اگر یہ کہہ دیا جائے

کہ نبی کا دل بھی بعض اوقات نیند سے متاثر ہوجاتا ہے تو وحی کی اس مستقل قسم پر اعتماد نہیں رہ سکتا اس لیے کہ ہر خواب میں یہ احتمال موجود ہے کہ اس وقت نبی کا دل سویا ہوا ہو اس لیے یہ جواب مردود محض ہے۔

جوابِ دوم اکثر شارحینؒ نے یہ جواب دیا ہے کہ اس حدیث کا لیلۃ التعریس سے کوئی تعارض ہی نہیں۔ ہر عضو کے وظائف الگ الگ ہیں۔ صبح صادق کا معلوم کرنا دل کا نہیں آنکھوں کا کام ہے۔ صبح صادق مُدرکاتِ بصریں سے ہے یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص آنکھیں بند کرلے اور دل جاگ رہا ہو تو اس کو صبح صادق کا اِدراک بالکل نہیں ہوگا۔ لیلۃ التعریس میں صبح کے علم نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اُن کی آنکھیں سوئی ہوئی تھیں اور ادراکِ صبح ان کا کام تھا۔

جوابِ سوم بقول شیخ جاجروی رحمہ القوی مصالح شرعیہ کے پیشِ نظر خلافِ معمول آپ پر ایسی نیند طاری کی گئی جس کی وجہ سے صبح صادق کا ادراک نہ ہوا تاکہ لوگوں کو ایسی صورت میں قضا نماز کا مسئلہ معلوم ہوجائے جیسا کہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ کبھی کبھی میں بھلا دیا جاتا ہوں تاکہ تمہیں طریقہ معلوم ہوجائے۔

وَعَنْ اَنَسٍؓ قَالَ جَآءَ ثَلٰثَۃُ رَهْطٍ اِلٰی اَزْوَاجِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَسْئَلُوْنَ عَنْ عِبَادَۃِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا اُخْبِرُوْا بِهَا کَاَنَّهُمْ تَقَالُّوْهَا فَقَالُوْا اَیْنَ نَحْنُ مِنَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَقَدْ غَفَرَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ وَمَا تَاَخَّرَ۔

ترجمہ: روایت ہے حضرت انسؓ سے فرماتے ہیں کہ تین شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کی خدمت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت معلوم کرنے کے لیے حاضر ہوئے جب انہیں عبادات کی خبر دی گئی تو غالباً انہوں نے اُسے کم سمجھا

قولہٗ ثَلَاثَۃُ رَھْطٍ : ای جماعۃ ثلاثۃ اشخاص کیونکہ رہط دس سے کم کی جماعت کو کہا جاتا ہے۔ یہاں غالبًا بمعنیٰ فرد ہے یعنی تین صحابہ کرام حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ بن مظعون اور حضرت عبداللہؓ بن رواحہ، یا مقدادؓ ابن اسود۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی عبادت کے متعلق معلومات لینے کے لیے کسی زوجہ مطہرہ کے ہاں تشریف لے گئے۔

سوال : یہ کہ ازواج مطہرات سے کیوں سوال کر رہے ہیں جب کہ صحابہ کرامؓ موجود تھے ان سے سوال کرتے۔

جواب : سوال عام عبادت کا نہیں تھا بلکہ عبادت فی البیوت کا سوال تھا جن کا تعلق لامحالہ ازواج مطہرات سے ہے ورنہ دن کی عبادت تو وہ جانتے ہی تھے۔

قولہٗ کَاَنَّھُمْ تَقَالُّوْھَا - ای وَجَدُوْھَا قَلِیْلًا یعنی صحابہ کرامؓ نے اس عبادت کو کم خیال کیا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ حضورؐ ساری رات جاگتے ہی ہوں گے اور سوائے عبادت کے کوئی کام نہ کرتے ہوں گے مگر انہیں بتایا گیا کہ شب میں سوتے بھی ہیں، جاگتے بھی ہیں۔ جاگنے میں عبادت بھی کرتے ہیں۔

قولہٗ فَقَالُوْا اَیْنَ نَحْنُ - اس کے تین مطلب ہیں :-

اوّل : یہ کہ حضور پُرنُور تو مغفور و معصوم ہیں ہماری ان سے کیا نسبت! ہمیں تو اپنا انجام معلوم نہیں کہ کیا ہوگا۔

دوّم : یا یہ مطلب ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کا اللہ تعالیٰ سے تو ایسا تعلّق ہے کہ ان کی معمولی عبادت بھی ان کو کافی ہے ہمیں اپنی نسبت سے عبادت کی فکر کرنی چاہیئے۔

سوّم : یا یہ مطلب ہے کہ آپ کی ظاہری عبادت اگرچہ کم ہے لیکن باطنی یا قلبی عبادت زیادہ ہے۔ چنانچہ وارد ہے " تفکّرُ ساعۃٍ خیرٌ من عبادۃ ستّین سَنَۃً وکان رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم دائم الفکر متواصل الاحزان۔

قولہٗ : فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ - ای اَعْرَضَ عَنْ سُنَّتِیْ - اعراض عن السنۃ دو قسم پر ہے۔ اوّل اعراض عن السنۃ للتّھاون والکاھلیۃ ایسے اعراض سے انسان خارج از اسلام نہیں ہوتا۔ دوّم اعراض عن السنۃ تحقیرًا ایسے اعراض سے انسان خارج از اسلام ہو جاتا ہے۔

یقول ابوالاسعاد : اس حدیث میں ان لوگوں کا ردّ ہے جو بدعۃ حسنہ کے قائل ہیں۔ اس لیے کہ تینوں صحابہؓ نے جن چیزوں کو اپنے اوپر لازم کرنے کا ارادہ کرلیا تھا وہ عبادت کی قسم سے تھیں لیکن یہ طریقہ سنۃ نبویہ کے خلاف تھا اس لیے حضرتؐ نے تردید فرمادی۔

مَسلکُ العُلماء فِی مسئلۃ عصمۃ الانبیاء ؑ

وَقَدْ غَفَرَاللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ وَمَا تَأَخَّرَ

اس حدیث اور اس قسم کی دوسری نصوص میں نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم یا دوسرے انبیاء علیہم السّلام کی طرف ذنب یا اس قسم کے دوسرے الفاظوں کی نسبت کی گئی ہے۔ اس قسم کے نصوص لے کر ملحدین مسئلہ عصمت انبیاء کرام علیہم السّلام میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کی کوشش کیا کرتے ہیں اس لیے اس مقام پر قدرے تفصیلاً اس اہم مسئلہ کی وضاحت کی جارہی ہے (سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا) مسئلہ کی وضاحت سے قبل چند فوائد کا جاننا ضروری ہے۔

فائدہ اُولیٰ عصمت انبیاء کا مسئلہ دین کے بنیادی اور اہم مسائل میں سے ہے بلکہ اس کو سب مسائل کی بنیاد ہی کہا جاسکتا ہے اس لیے کہ پوری شریعت مطہرہ انسانیت کو نبی کے واسطے سے ہی ملتی ہے نبی کی ہر بات دین میں حجت ہوتی ہے قرآن کریم میں ہے:۔

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا (النسآء پ۵)

اس آیت میں نبیؑ کی ہر قسم کی مخالفت کو گمراہی اور دخولِ جہنم کا سبب قرار دیا ہے۔

فائدہ ثانیہ آیت کے اطلاق اور عموم سے معلوم ہوا کہ نبیؑ کا ہر قول وفعل اور اس کی ہر تقریر حجت اور تشریعی مقام رکھتی ہے۔ اگر نبیؑ سے بھی تقاضائے بشریت سے مغلوب ہونے کی وجہ سے گناہ کا صدور ہوسکتا ہے تو یہ اس

آیت کے منافی ہوگا۔ کیونکہ اس صورت میں اس کے ہر قول، فعل اور تقریر کو حجت کہنا اور اس کی مخالفت کو دخولِ نار کا سبب قرار دینا صحیح نہ ہوگا۔ اگر نبی کی زندگی میں کچھ باتیں غلط ہوتیں تو حق تعالیٰ یہ اعلانات کبھی نہ فرماتے کہ ان کی ہر بات ماننا ضروری ہے اگر نہ مانو گے تو جہنّم کی سزا ہوگی۔ غلط بات کے نہ ماننے پر دوزخ کی سزا کیسے ہوسکتی ہے۔

فائدہ ثالثہ نبی کی طبیعت مبارک شریعت کا سانچہ ہوتی ہے جس میں سے شریعت ڈھل ڈھل کر نکلتی اور اُمّت کے سامنے آتی ہے جس طرح کسی اینٹ کے درست ہونے کے لیے ضروری ہے کہ جس سانچہ سے وہ بن کر آئی ہے وہ بھی درست ہو ایسے ہی شریعت پاک وصاف اور پوری انسانیّت کے لیے واجبُ العمل تب ہی ہوسکتی ہے جب کہ نبی کی طبیعت اور فطرت کو پاک وصاف تسلیم کیا جائے اور کہا جائے کہ نبی کے طبعی میلانات اور رُجحانات اتنے صاف ہوتے ہیں کہ وہ کبھی گناہ کے قریب بھی نہیں بھٹک سکتا۔ اسی بات کا دوسرا عُنوان عصمتِ انبیاء ہے۔ اور عصمتِ انبیاء کا انکار دراصل پوری شریعت سے ہی اعتماد اٹھانے کی ایک ناکام کوشش ہے۔

فائدہ رابعہ (۱) مُحدّثین حضرات نے لکھا ہے کہ ذَنب سے خلافِ شانِ نُبوّت یا خطاء اجتہادی مُراد ہے مثلاً اساریٰ بدر سے فدیہ قبول کرنا غزوۂ تبوک میں متخلّفین کو تخلُّف کی اجازت دے دینا اور رئیسُ المنافقین عبدُ اللّٰہ بن اُبَیّ کے جنازہ میں شریک ہونا۔ ان کاموں کے مقاصد تو صحیح تھے لیکن فعل خلافِ اولیٰ تھا۔ جب کہ گناہ کی قدرت واختیار موجود ہوتے ہوئے بالفعل گناہ سے محفوظ رہنے کو عصمت کہا جاتا ہے اسی لیے امام ابو منصور نے فرمایا کہ عصمت مُکلّف ہونے کو زائل نہیں کردیتی بلکہ وہ معصوم ہونے کے باوجود مُکلّف ہی رہتا ہے۔

(۲) حضرت انور شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ معصیّت اور ذنب میں فرق یہ ہے کہ معصیّت عدول عنِ الحکم وَانحراف عنِ الطّاعۃ کا نام ہے۔ جس کو اُردو میں نافرمانی سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کے مُترادف خطاء ہے جو ضد ثواب ہے۔ جس کو اُردو میں نادرست سے بھی تعبیر کرتے ہیں جب کہ ذنب اَخفُّ المراتب ہے۔ مَحنَاہُ العیب۔

سوال ۔ بعض نصوص میں انبیاء علیہم السّلام کی طرف ذنب یا اس جیسے دوسرے الفاظ کی

نسبت کی گئی ہے ایسے ہی بعض انبیاء کا استغفار کرنا مذکور ہے ۔ استغفار تب ہی ہو سکتا ہے جب کوئی گناہ سرزد ہوا ہو۔

جوابِ اوّل انبیاء علیہم السّلام کے ذنب کا وہ مفہوم نہیں جو عام لوگوں کے ذنب کا ہوتا ہے، بعض دفعہ مضاف الیہ کے بدلنے سے لفظ کے مفہوم میں فرق پڑجاتا ہے جیسے لفظ محبّت اس کی نسبت کئی قسم کے لوگوں کی طرف کی جاسکتی ہے ۔ مثلاً اس کی نسبت ماں کی طرف بھی کی جاسکتی ہے مگر محبّت کے تصوّرات میں زمین آسمان کا فرق ہے ۔ محبّتِ زوجہ کا جو تصوّر ہے وہ محبّت مادر میں ہرگز نہ ہوگا۔ ایسے ہی ذنب کا مفہوم مضاف الیہ کے بدلنے سے بدل جاتا ہے ۔ جب اس کی نسبت انبیاء علیہم السلام کی طرف کی جاتی ہے تو اس کا یہ مفہوم نہیں جو عام لوگوں کی طرف نسبت کرنے کی صورت میں ہوتا ہے لہٰذا یہاں ذنب کے حقیقی معنیٰ گناہ مُراد نہیں بلکہ (حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَیِّئَاتُ الْمُقَرَّبِیْنَ) ذنب سے تعبیر کیا گیا ہے۔

جوابِ دوم کبھی ایک کام کے دو طریقہ ہوتے ہیں ۱ فاضل ۲ افضل۔ بعض اوقات نبیؑ افضل کو چھوڑ کر فاضل پر عمل کر لیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ زیادہ فضیلت والا عمل چھوڑ کر کم فضیلت والا اختیار کرنا کوئی گناہ نہیں ہے لیکن نبیؑ کی ذات پاک اس کو اپنا قصور سمجھتے ہیں اور اس پر اتنا استغفار کرتے ہیں جتنا کوئی دوسرا واقعی غلطی سرزد ہونے پر بھی نہیں کرتا اس کو ذنب سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ اور نبیؑ کے ذنب کی یہی صورت ہے۔

جوابِ سوم نبیؑ کی ذات پاک کا ذوقِ طاعت جتنا بلند ہوتا ہے کسی اور کا نہیں ہوتا خواہ وہ کتنا اونچا مقام ہی کیوں نہ رکھتا ہو۔ اور قانون ہے کہ جتنا کسی کا ذوقِ طاعت بلند ہوگا اتنا ہی اس کو معمولی باتوں پر گناہ کا احساس اور ندامت زیادہ ہوگی ۔ کتنے لوگ ہیں جن کو کبھی قیامُ اللّیل کی توفیق نہیں ہوتی بلکہ ساری رات گناہوں میں گذر جاتی ہے اور ان کو کبھی توبہ و استغفار کا خیال تک نہیں آتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے بعض نیک بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جو ساری رات عبادت میں گذار دیتے ہیں ۔ اور سمجھتے ہیں کہ ہماری عبادت بھی گناہوں کی فہرست میں شمار ہونے کے قابل ہے ۔ کما فی قولہٖ تعالیٰ " کَانُوْا قَلِیْلًا مِّنَ اللَّیْلِ مَا یَهْجَعُوْنَ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ یَسْتَغْفِرُوْنَ ۔ (الذّاریات پ۲۶)

ان لوگوں کا اپنے آپ کو گناہگار سمجھنا اور استغفار کرنا اس وجہ سے نہیں کہ انہوں نے واقعی کوئی معصیت کی ہے بلکہ اس کی وجہ ان کے ذوقِ طاعت کی بلندی ہے ایسے ہی انبیاء علیہم السلام کا اپنے بعض افعال یا احوال کو ذنب سمجھنا ان کی عدمِ عصمت کی دلیل نہیں بلکہ یہ تو ان کے ذوقِ طاعت کی انتہائی بلند ہونے کی دلیل ہے۔

سوال ۔ یہ کہ نبیؐ کی ذات پاک جس چیز کو گناہ سمجھ کر استغفار کرتی ہے اگر وہ واقعی گناہ نہیں ہے تو ہونا یہ چاہیے تھا کہ حق تعالیٰ یہ فرماتے کہ تم سے کوئی غلطی ہی نہیں ہوئی معافی کی کیا ضرورت ہے حالانکہ نصوص میں اس قسم کے مواقع پر اس طرح نہیں فرمایا گیا بلکہ ہر جگہ اعلانِ توبہ ہی مذکور ہے

جواب ۔ حق تعالیٰ انبیاء کے مزاج شناس بلکہ اس مزاج کے خالق ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ اس طرح کہدینے سے ان کی تشفی نہیں ہوگی بلکہ ان کی تشفی کے لیے فرمادیتے ہیں کہ مان لیا کہ تم سے گناہ ہوگیا لیکن کیا ہوا ہم نے معاف کر دیا ہے۔

سوال ۔ انبیاء کرامؑ تو سب معصوم ہیں مگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تخصیص کیوں کی گئی ؟

جواب ۔ یہ کہ نفسِ مغفرت جو ہر نبی کے لیے عام ہے اس کو یہاں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے خاص نہیں کیا گیا۔ ہاں اعلانِ مغفرت حضور علیہ السلام کے لیے خاص ہے اور اعلانِ مغفرت کے خاص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ آپؐ کے لیے کچھ خصوصیات ہیں شفاعتِ کبریٰ مقامِ محمود وغیرہ اگر اعلان نہ کرتے تو دیگر انبیاء کرامؑ کی طرح اپنے ذنوب کو یاد کر کے قلبی گھبراہٹ کی وجہ سے اپنے خصوصی حق کی طرف پیش قدمی نہ کرتے۔ اب اعلانِ مغفرت کر کے آپ صلعم کو مطمئن کر دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب دیگر انبیاء کرامؑ پر شفاعتِ کبریٰ کو پیش کیا جائے گا تو فرمائیں گے :۔

اِیْتُوْا مُحَمَّدًا صلی اللہ علیہ وسلم فَاِنَّہٗ قَدْ غَفَرَلَہٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ وَمَا تَأَخَّرَ۔

وَفِیْ مَقَامٍ اٰخَرَ :۔

قال ابن عبد السلام لم یخبر اللہ احدًا من الانبیاء علیہم السلام بالمغفرۃ ولذا قالوا فی الموقف نفسی نفسی اذھبوا الی محمدٍ فقد غفر اللہ ما تقدم من ذنبہٖ وما تأخر۔

سوال - مغفرت کے لیے گناہ کا وجود ضروری ہے لہذا مَا تَأَخَّرَ کا کیا مطلب ہے؟
جواب - ذنوب ماتأخر اگرچہ وجود میں نہیں آئے مگر علمِ خداوندی میں سب موجود ہیں۔ لہذا سب کی مغفرت دفعۃً کردی گئی۔

وَعَنْ عَائِشَةَ رضی اللہ عنہا قَالَتْ صَنَعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْئًا فَرَخَّصَ فِيْهِ فَتَنَزَّهَ عَنْهُ قَوْمٌ فَبَلَغَ ذَالِكَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَخَطَبَ فَحَمِدَ اللّٰهَ ثُمَّ قَالَ مَا بَالُ اَقْوَامٍ يَتَنَزَّهُوْنَ عَنِ الشَّيْئِ اَصْنَعُهُ فَوَاللّٰهِ اِنِّيْ لَاَعْلَمُهُمْ بِاللّٰهِ وَاَشَدُّهُمْ لَهٗ خَشْيَةً۔

ترجمہ: روایت ہے حضرت عائشہؓ سے فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی کام کیا پھر اس کی اجازت ہوگئی مگر ایک گروہ نے اس سے پرہیز کی۔ یہ خبر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو آپ نے خطبہ پڑھا اور اللہ تعالیٰ کی حمد کی، پھر فرمایا کہ ان لوگوں کا کیا حال ہے کہ ان چیزوں سے بچتے ہیں جو میں کرتا ہوں اللہ کی قسم میں ان سب سے اللہ کو زیادہ جانتا ہوں اور سب سے زیادہ اللہ سے خوف والا ہوں۔

قولہٗ صَنَعَ شَيْئًا - محدثین حضرات نے بحث کی ہے کہ وہ کام کیا تھا جو آپ نے کیا۔ اس میں مختلف اقوال ہیں:-

قولِ اوّل - علامہ ابن بطّال نے کہا ہے کہ حالتِ صوم میں اپنی زوجہ مطہرہ منورہ کو بوسہ دیا تھا۔

قولِ دوم - عند البعض حالتِ سفر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ نہیں رکھا تھا

قولِ سوم - محی الدین ابن العربیؒ سے جب اس بارے میں دریافت کیا تو فرمایا لَا اَدْرِیْ

قولہٗ فَرَخَّصَ - معلوم بھی ہے اور مجہول بھی اگر مجہول (رُخِّصَ) پڑھا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے کرنے کی اجازت مل گئی یعنی رخصت دی گئی۔

رخصت وعزیمت کی تعریف

رخصت کی تعریف یہ ہے کہ کسی حکم شرعی کو باقتضاءِ احوال مکلف سختی سے آسانی کی طرف منتقل کردیا جائے۔ اور اسی پر عمل نہ کرکے اصل حکم پر عمل کرنا عزیمت ہے۔

صحابہ کرامؓ کا قیاس

صحابہ کرامؓ نے خیال کیا کہ عزیمت میں درجہ زیادہ ہے اور رخصت میں کم، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ بلند ہے۔ اور آپ کی ذاتِ پاک بابرکات شارع ہے خواہ عزیمت پر عمل کریں یا رخصت پر آپ کا درجہ بلند ہوتا رہے گا جب کہ ہم تو گناہگار ہیں۔ ہمیں عزیمت پر عمل کرنا چاہیئے تاکہ کمالات زیادہ حاصل ہوں۔ اسی لیے صحابہ کرامؓ اس رخصت سے بچے۔ تو آپ نے تنبیہ کردی کہ کبھی کبھی رخصت پر بھی عمل کرنا چاہیئے تاکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی عبدیّت وانکساری کا اظہار ہو۔

قولہٗ فَتَنَزَّہ - ای تَبَعَّدَ وَاجْتَنَبَ عَنْہُ یعنی اجازت کے باوجود بچتے تھے عمل نہیں کرتے تھے۔

صحابہؓ کرام کی مُراد

صحابہ کرامؓ کا اجتناب ازراہ اعراض نہیں تھا بلکہ ازروئے احتیاط تھا کیونکہ یقین کے باوجود بوسہ لینا، یا سفر میں روزہ رکھنا یہ رخصت ہے۔ شریعت نے اختیار دے دیا ہے۔ مگر اس وقت رخصت پر عمل کرنا ضروری تھا تاکہ جواز کے طور پر لوگوں کو معلوم ہو کہ شریعت نے فلاں کام کے اندر آسانی دے رکھی ہے۔ اور مقام پر حضرت کا ارشادِ گرامی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے پسند کرتے ہیں جو رخصتوں پر عمل کرتا ہے جیسے اولیٰ پر عمل کرنے کو پسند کرتا ہے۔

سوال ۔ حدیث پاک میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کو خشیّت پر مقدم فرمایا ہے اس میں کیا حکمت ہے؟

جواب

خشیۃ اللہ نتیجہ علم ہے یعنی علم آنے کے بعد خشیۃ اللہ آتا ہے اور قانون بھی یہی ہے کہ نتیجہ آخر میں ہی آتا ہے اس لیے ترتیب بیانی میں بھی علم کو مقدم اور خشیۃ اللہ کو مؤخر فرمایا کما فی قولہ تعالیٰ "اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمَاءُ" (پ۲۲ الفاطر)

وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيْجٍ قَالَ قَدِمَ نَبِيُّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَدِيْنَةَ وَهُمْ يَأْبُرُوْنَ النَّخْلَ فَقَالَ مَا تَصْنَعُوْنَ قَالُوْا كُنَّا نَصْنَعُهُ قَالَ لَعَلَّكُمْ لَوْ لَمْ تَفْعَلُوْا كَانَ خَيْرًا فَتَرَكُوْهُ فَنَقَصَتْ قَالَ فَذَكَرُوْا ذَالِكَ لَهُ فَقَالَ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ اِذَا اَمَرْتُكُمْ بِشَيْئٍ مِنْ اَمْرِ دِيْنِكُمْ فَخُذُوْا بِهٖ وَاِذَا اَمَرْتُكُمْ بِشَيْئٍ مِنْ رَّائِيْ فَاِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ۔

ترجمہ: روایت ہے رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو اہل مدینہ کھجور کے درختوں میں تأبیر کیا کرتے تھے تو فرمایا کہ یہ کیا کرتے ہو تو وہ بولے ہم پہلے سے ایسا کرتے آئے ہیں فرمایا ممکن ہے کہ تم یہ نہ کرو تو اچھا ہو لوگوں نے یہ تأبیر چھوڑ دی تو پھل کم ہو گئے۔ فرماتے ہیں کہ انھوں نے یہ واقعہ آپ سے عرض کیا تو فرمایا کہ میں ایک بشر ہوں جب تم کسی کو دینی کام کا حکم دوں تو اسے لے لو اور جب اپنی رائے سے کچھ کہوں تو میں بشر ہوں۔

قولہ یَأْبُرُوْنَ النَّخْلَ ۔ یأبرون بمعنی یشققون طلع الاناث و یذرون فیہ طلع الذکر: یعنی تأبیر نخل یہ ہے کہ مادہ کھجور کا شگوفہ (در ہندی سپ) چیر کر نر کھجور کا شگوفہ اس پر ڈالیں۔ چنانچہ طلحہ بن عبید اللہ کی روایت میں یُلَقِّحُوْنَ بمعنی یجعلون الذکر فی الانثیٰ کے لفظ ہیں (مفاتیح) یہ اہل عرب کی عادت تھی اس سے ایک تو کھجور مقدار میں زیادہ آتی تھیں۔ ثانیاً جید اور عمدہ بھی ہوتی تھیں۔

فائدہ محدثین حضرات نے لکھا ہے کہ کھجور بنی آدم کی اس مٹی سے بنائی گئی تھی جو آدم علیہ السلام کی پیدائش کے وقت بچ گئی تھی اس سے اس کو بنایا گیا تو چونکہ بنی آدم میں سلسلہ توالد و تناسل جماع کے ذریعہ ہے اس لیے یہ بھی ایک قسم کا جماع بین النخلین ہے حتیٰ کہ بعض کاشتکاروں سے میٹھے کدو میں بھی اس کا تجربہ ثابت ہے۔

سوال۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تأبیر نخل سے کیوں روکا؟

جواب اوّل۔ آپ کا منع فرمانا اس بنا پر تھا کہ یہ رسم جاہلیت اور خرافات و غیر مفید

جواب دوم[۲]

یہ لوگ تأبیر نخل کو علت سمجھتے تھے اور مسبّبُ الاسباب کی طرف سے نظر پھیر لیتے تھے۔ بنا بریں آپ نے ابتداءً ان کو منع فرمایا تاکہ وہ اس کو سبب محض سمجھیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف نظر مبذول ہو جائے کیونکہ اسباب کو من حیث الاسباب اختیار کرنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں تو جب یہ عقیدہ ان کے دلوں میں راسخ ہو گیا تو تأبیر نخل کی اجازت دے دی:۔

وَاِذَا اَمَرْتُکُمْ بِشَیْئٍ مِّنْ اُمُوْرِ دُنْیَاکُمْ بِرَأْیِیْ وَاَخْطَئْتُ فِیْہِ فَلَا تَسْتَبْعِدُوْا فَاِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ اَخْطِئُ کَمَا تُخْطِئُوْنَ۔

قولہٗ فَاِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ۔ یعنی میں بھی ایک آدمی اور انسان ہوں چونکہ نبی کی ذات بابرکات تشریعات کی حامل ہوا کرتی ہے۔ اور امور اخرویہ کی تعلیم کے لیے اس ذات مبارکہ کی بعثت ہوتی ہے اور امور تکوینیات جو معاشیات کے قبیل سے ہوتے ہیں۔ ان سب کو انسان کی عقل پر چھوڑ دیا کیونکہ عموماً یہ عقل سے سمجھے جاتے ہیں اور جہاں عقل تھک جاتی ہے وہاں سے وحی کا آغاز ہوتا ہے۔ بنا بریں شریعت نے ذرائع معاش میں کوئی پابندی نہیں لگائی۔ انسان جونسا طریقہ چاہے اختیار کرے کوئی ممانعت نہیں۔ البتہ اس کا طریقۂ استعمال بتلا دیا کہ جائز طریقہ سے کرے اسی لیے آپ نے فرمایا کہ امورِ دین میں میری بات حجّت ہے کیونکہ وہ وحی خداوندی سے ہوتی ہے اس پر عمل کرنا فرض ہے۔ اور امورِ دنیا میں کچھ کہوں تو یہ میری رائے ہوتی ہے اس میں خطاء ہو سکتی ہے تمہاری مانند اس کا ماننا ضروری نہیں یہ صرف ایک مشورہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری حدیث میں یہ الفاظ بھی منقول ہیں " اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْیَاکُمْ (مرقاۃ) رواہ مسلم ص۲۲۳ ج۱۔

ثانیاً ربّ ذوالجلال کا علم محیط لکلّ شیئٍ ہے۔ انسان خواہ کتنا ہی اونچا ہو جائے اس کا علمِ محیط نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ علامہ ہرویؒ شارح مشکوٰۃ " اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ " کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں " ای فَلَیْسَ لِیْ اِطْلَاعٌ عَلَی الْمُغَیَّبَاتِ " (مرقاۃ ص۲۲۳ ج۱)

اسمائے رجال

رافع بن خدیج رضؓ کی کنیّت ابو عبداللہ ہے حارثی انصاری ہیں جنگِ احد میں ان کو تیر آکر لگا جس پر

وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّمَا مِثْلِیْ وَمَثَلُ مَا بَعَثَنِیَ اللّٰہُ بِہٖ کَمَثَلِ رَجُلٍ اَتٰی قَوْمًا فَقَالَ یَا قَوْمِ اِنِّیْ رَأَیْتُ الْجَیْشَ بِعَیْنَیَّ وَاِنِّیْ اَنَا النَّذِیْرُ الْعُرْیَانُ فَالنَّجَاءَ النَّجَاءَ فَاَطَاعَہٗ طَائِفَۃٌ مِّنْ قَوْمِہٖ فَادَّلَجُوْا فَانْطَلَقُوْا عَلٰی مَہْلِہِمْ فَنَجَوْا۔

(ترجمہ) روایت ہے حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے فرماتے ہیں فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ میری اور جو کچھ مجھے اللہ نے دیکر بھیجا اس کی کہاوت اس شخص کی سی ہے جس نے کسی قوم کے پاس آکر کہا کہ میں نے اپنی آنکھوں سے ایک لشکر دیکھا ہے۔ میں کھلا ڈرانے والا ہوں بچو بچو اس کی قوم سے ایک ٹولہ نے اس کی بات مان لی اور اندھیرے منہ اٹھے اور بروقت نکل گئے تو بچ گئے۔

قولہٗ کَمَثَلِ رَجُلٍ ۔ یہ تشبیہ مرکب کی مثال ہے۔ پورے واقعہ کو پورے واقعہ کے ساتھ مشابہت دی گئی ہے۔ اور اس رجل سے مراد امین اور سچا آدمی ہے جس کی بات پر لوگوں کو اعتماد ہو جو وہ کہے اسے بغیر دیکھے تسلیم کر لیا جائے۔

قولہٗ جَیْشَ ۔ اس سے لشکرِ کثیر مراد ہے اس سے مقصود ڈرا دے میں شدت پیدا کرنا ہے کیونکہ اتنے لشکرِ عظیم کا مقابلہ کرنا قدرے مشکل ہوتا ہے۔

قولہٗ بِعَیْنَیَّ : رؤیت بصری تو رَأَیْتُ سے سمجھی جا رہی تھی مگر عَیْنَیَّ کو علیحدہ ذکر کرنے سے رَأَیْتُ الْجَیْشَ کی تاکید کرنی مقصود ہے اور عَیْنَیَّ کو تخفیف و تشدید دونوں طرح پڑھا جا سکتا ہے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن میں تمہارے اس تیر کا گواہ ہوں ان کا زخم عبدالملک بن مروان کے زمانہ تک چلا سوائے غزوہ بدر کے کہ اس وقت آپ بچہ تھے۔ باقی تمام غزوات میں حضور علیہ السلام کے ساتھ رہے ۷۴ھ میں مدینہ طیبہ میں وفات پائی ان کی عمر چھیاسی سال کی ہوئی ایک بڑی جماعت نے ان سے روایت کی ہے (خدیج) خائے معجمہ کے فتحہ، دال کے کسرہ اور آخر میں جیم معجمہ کے ساتھ ہے۔

قولہٗ اَنَا النَّذِیْرُ الْعُرْیَان ۔ اس کی مُراد میں دُو قول ہیں :۔

قول اوّل بعض مُحدِّثینؒ حضرات کے نزدیک اَنَا النَّذِیْرُ الْعُرْیَان سے مراد وہ معجزات نبویہ ہیں جو خوارق عادات ظہور پذیر ہورہے ہیں مثلاً شَقُّ القمر وسیر الی السمٰوٰتِ کما فی واقعۃ المعراج وغیرھم۔ باقی ان پر عریان کی تخصیص اس بناء پر ہے کہ " لِاَنَّہٗ اَبْیَنُ فِی العین۔

قول دوّم یہ ایک مثل مشہور ہے جو سخت ناگہانی خطرے کے موقعہ پر بولی جاتی ہے مگر اس کی تشریح سننے سے حدیث کا مطلب واضح ہو جائے گا ۔ دورِ جاہلیت میں عرب کے اندر غارت گری کا عام رواج تھا ۔ اکثر حملے اچانک ہوا کرتے تھے۔ بعض دفعہ دشمن سر پر آجاتا اور اس کا پتہ صرف آدھ ایک کو چلتا ایسی صورت میں وہ قبیلہ کو دشمن کی آمد کی فوری اطلاع کرنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کرتا کہ اپنے کپڑے اتار کر چھڑی وغیرہ پر لٹکا لیتا اور اس کو ساتھ لے کر قبیلہ وغیرہ میں اعلان کرتا ، اسی طرح ننگا ہو کر اعلان کرنا انتہائی خطرہ کی علامت سمجھا جاتا تھا تو گویا کہ " اَنَا النَّذِیْرُ الْعُرْیَان کے دو معنیٰ ہوئے :۔

اوّل :۔ کہ یہ بے غرض ڈرانے والا ہے ۔ دوّم : یہ شخص بالکل سچا ہے ۔

یقول ابوالاسعاد : یہی دونوں معنیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس میں علیٰ وجہ الاتم موجود ہیں ۔ جس کو علامہ محدث عبدالحق دہلویؒ نے ان الفاظوں میں نقل کیا ہے "

" وایں ہر دو معنیٰ در انذار آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بر وجہ اتم پیدا و ہویدا است از جہتِ ظہور صدق در خبر وے و وجود کمال خوف از وقوع عذاب کہ خبر می دہد بداں ۔ (اشعۃ اللمعات ص۱۳۰ ج ۱) "

لہٰذا جو مانے گا وہ ہلاکت سے محفوظ رہے گا جس کو حدیث پاک میں " مَنْ عَطَانِیْ فَاتَّبِعْ سے تعبیر فرمایا اور جو نافرمانی کرے گا وہ ہلاک ہوگا جس کو مَنْ عَصَانِیْ وَکَذَّبَ سے تعبیر کیا۔

قولہٗ فالنجاءَ النجاءَ ۔ نجاء سے پہلے فعل محذوف ہے ای الزموا النجاء کہ نجات اور بچ جانے کو لازم کرو ۔ یا منصوب علی الاغراء ہے اور نجاء بمعنیٰ اسرع کا مصدر ہے کما یقال ناقۃ ناجیۃ ای سرعۃ) ای اطلبوا النجاء اور تکرار

تاکید کے لیے ہے یعنی نجات کی راہ ڈھونڈو (من قبیل الطریق لاعینہ بل بشابھہ۔

قولہٗ فادّلجوا ۔ ادلاج باب افعال ای ساروا اوّل اللیل یعنی جب ان کو اطلاع ملی تو انہوں نے تاخیر نہیں کی بلکہ رات کے اندھیرے میں چل پڑے ۔ الدّلج و الدّلجۃ رات کے آخری حصّہ کا وقت یعنی قوم کے کچھ لوگ اپنے گھروں سے راتوں رات نکل کھڑے ہوئے (کسی محفوظ مقام پر) پہنچ کر نجات حاصل کرلی۔

قولہٗ علیٰ مَھلِھم ۔ اِمھال بمعنیٰ تحریك الھیئۃِ والسکونِ۔ یعنی سکون وآرام سے چلنا۔ اس میں دونوں اعراب ہیں تسکین اور تحریک ۔

قولہٗ فَنَجَوْا ۔ نجات کا تعلق اس بات پر ہے کہ سننے والے دو ٹولے بن گئے ایک ٹولہ نے اس نذیر کا اعتبار کیا اور دشمن ، لشکر کے حملہ سے قبل اندھیرے ہی میں بھاگ گئے یہ نفع میں رہے اور نجات پا گئے ۔

قولہٗ فصبّحھم الجیش ۔ ای اتاھم الجیش العدوّ فی وقت الصُّبح کیونکہ عرب میں غارت گری کے لیے بیشتر صبح کا وقت ہی مُقرر تھا۔ قال اللہ تعالیٰ :۔ فَالْمُغِیْرَاتِ صُبْحًا۔ اسی لیے عادت کے مطابق جسے دعاء دیتے تو یہی دعاء دیتے صَبَّحَكَ اللّٰہُ بِخَیْرٍ اللہ تیری صبح اچھی رکھے۔

قولہٗ وَاجْتَاحَھُم ۔ ای استاصلھم واھلکھم بالکلیّۃ یعنی ان کو جڑ ہی سے ختم کردیا۔

قولہٗ فَذٰلِكَ مِثْلُ مَنْ اَطَاعَنِیْ ۔ یہاں وجہ تشبیہ کا بیان ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جیسے نجات و ہلاکت کی مدار اس اعلان کرنے والے کی تصدیق یا تکذیب ہے ایسے ہی آخرت کے عذاب سے بچنے نہ بچنے کی مدار حضور علیہ السّلام کے ماننے اور نہ ماننے پر ہے۔

یقول ابوالاسعاد : عذاب الٰہی گویا لشکر ہے موت سے پہلے توبہ کرلینا گویا بروقت خطرناک جگہ سے نکل جانا ہے اور آخر تک گناہوں میں ڈٹا رہنا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کو جھٹلانا گویا خطرناک جگہ میں رہ کر دشمن کے ہاتھوں مارا جانا ہے ۔

وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَثَلِیْ كَمَثَلِ رَجُلٍ اِسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا اَضَاءَتْ مَا حَوْلَهَا جَعَلَ الْفَرَاشُ وَهٰذِهِ الدَّوَابُّ الَّتِیْ تَقَعُ فِی النَّارِ یَقَعْنَ فِیْهَا وَجَعَلَ یَحْجُزُهُنَّ وَیَغْلِبْنَهُ فَیَتَقَحَّمْنَ فِیْهَا فَاَنَا اٰخِذٌ بِحُجَزِكُمْ عَنِ النَّارِ وَاَنْتُمْ تَقَحَّمُوْنَ فِیْهَا۔

ترجمہ: روایت ہے حضرت ابوہریرہؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ میری مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ روشن کی جب آگ نے اردگرد کو روشن کر دیا تو پروانے اور وہ جانور جو آگ میں گرا کرتے ہیں اس میں گرنے لگے اور وہ انہیں روکنے لگا اور وہ جانور اس پر غالب آجاتے ہیں، آگ میں گرے جاتے ہیں۔ چنانچہ میں تمہاری کمر پکڑ کر آگ سے بچاتا ہوں اور تم اس میں گرے جاتے ہو۔

قولہ كَمَثَلِ رَجُلٍ۔ یہاں سے بھی تشبیہ مرکب ہے کہ ایک پورے واقعہ کو پورے

اسمائے رجال

حالات حضرت ابوموسیٰ عبداللہ بن قیس رضی اللہ عنہ

یہ ابوموسیٰ ہیں نام عبد اللہ قیس کے بیٹے اور اشعری ہیں مکہ میں مسلمان ہوئے اور سرزمینِ حبشہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ پھر اہل سفینہ کے ساتھ آئے۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خیبر میں تھے۔ ۲۰ھ میں حضرت عمر بن الخطاب نے ان کو بصرہ کا حاکم مقرر فرمایا۔ حضرت ابوموسیٰؓ نے اہواز کو فتح کیا۔ ابتدائے خلافتِ عثمانؓ تک بصرہ ہی کے حاکم رہے۔ پھر وہاں سے معزول ہو گئے اور کوفہ کی طرف منتقل ہوئے اور وہاں قیام پذیر ہو گئے۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت تک کوفہ کے والی رہے۔ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان اختلافات طے کرنے کے لیے حضرت علیؓ کی طرف سے حکم بنائے گئے اس کے بعد اپنے سالِ وفات ۵۲ھ تک مکہ ہی میں رہے۔ بروز خمیس دارِ فانی سے کوچ فرما کر راہیٔ ملکِ بقا ہوئے اور جنت البقیع کی مقدس زمین میں آسودہ آرام فرما ہیں۔

واقعہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔

حاصلِ تشبیہ مرکّب بالحدیث

اس حدیث کی تشبیہ کا حاصل یہ ہے کہ محرّمات اور مُہلکات بمنزلہ آگ کے ہیں۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کا ان کو بیان فرمانا بمنزلہ آگ روشن کرنے کے ہے۔ اور جاہلوں کا بے انجام سوچے ان محرّمات کا ارتکاب کرنا بمنزلہ ان پروانوں و دیگر جانوروں کے گرنے کے ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا پوری قوّت سے روکنا بمنزلہ پکڑنے کے ہے۔

یقول ابوالاسعاد۔ اس تشبیہ کو یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا مطلب یہ ہے کہ میں نے حرام اور ممنوع چیزوں کو تمہارے سامنے کھول کھول کر بیان کر دیا ہے لیکن جس طرح کوئی شخص آگ جلائے اور اس شخص کے روکنے کے باوجود پروانے آگ میں گرتے ہیں وغیرہ۔ اسی طرح باوجودیکہ میں تمہیں بُرے راستہ سے ہٹاتا ہوں اور بُرے کام سے روکتا ہوں۔ لیکن تم اسی ممنوع اور غیر پسندیدہ چیزوں کو کرتے ہو، اور دوزخ کی آگ میں گرنے کی کوشش کرتے ہو۔

وفی الحدیث بیان ما کان فیہ صلی اللہ علیہ وسلم من الرأفۃ والرحمۃ والحرص علی نجاۃ الامۃ۔ کما قال تعالیٰ "لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ" (پ۱۱ التوبہ)

قولہٗ اَلْفِرَاشُ۔ اَلطَّيْرُ الصَّغِيْرُ تساقط فی النار یقال لہٗ فی الفارسی پروانہ۔

قولہٗ هٰذِهِ الدَّوَآبُّ : یہ عطف تفسیری ہے یا اس سے مراد دوسرے جانور ہیں مثلاً کالْبَقِّ وَالْبَعُوْضِ باقی فِرَاش اور دَابّہ کی تخصیص بیان جہل کی وجہ سے ہے کہ ان کو اپنے انجامِ بد یا جل کر نیست و نابود ہونے کی خبر تک نہیں۔ کما فی قولہٖ تعالیٰ "اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ" (پ۹ الانفال)

قولہٗ يَحْجِزُهُنَّ۔ بِضَمِّ الْجِيْمِ ای يَمْنَعُهُنَّ مِنَ الْوُقُوْعِ فِيْهَا کہ وہ شخص جس نے آگ جلائی وہ روکتا ہے کہ یہ داخل نہ ہوں۔

قولہ یَغْلِبْنَہٗ ۔ ای لِلْوُقوعِ فِیْھَا ۔ یعنی وہ پروانے اور دوابّہ داخل ہونے میں غالب آجاتے ہیں اور داخل ہوکر رہتے ہیں۔

قولہٗ فَیَتَقَحَّمْنَ فِیْھَا ۔ ای یَدْخُلْنَ فِیْھَا ۔

قولہٗ لِحُجَزِکُمْ ۔ بضم الحاء وفتح الجیم جمع حجزۃ وھی مقدار الازار من السراویل : کہ چادر کی وہ جگہ جو مقعد پر ہوتی ہے۔ اس مقام کی تخصیص کیوں کی اس میں حکمت یہ ہے کہ یہ جگہ پکڑنے میں مضبوط ہوتی ہے۔ اور روکنے میں مؤثر ہوتی ہے

قولہٗ ھَلُمَّ عَنِ النَّارِ ۔ یہ اسم فعل بمعنی اِیْتُوْا قَالَ اللّٰہُ تعالیٰ :۔ "وَالْقَآئِلِیْنَ لِاِخْوَانِھِمْ ھَلُمَّ اِلَیْنَا (پ۲۱ احزاب) اس سے پہلے حَالَ کَوْنِیْ قَآئِلاً محذوف ہے۔ اور ھَلُمَّ عَنِ النَّارِ کی تقدیر عبارت یوں ہے :" اِسْرَعُوْا اِلَیَّ ۔ یا ۔ اِیْتُوْا اِلَیَّ وابعدوا انفسکم عن النار۔

یقول ابوالاسعاد : دنیا کے ناسمجھ انسانوں اور رسول خدا کی محبت اور خیر خواہی کا جو نقشہ اس مثال میں کھینچا گیا ہے اس سے زیادہ سچے اور مؤثر انداز میں کھینچنا ناممکن ہے۔ نہ پروانے کو اپنے انجام کا ہوش ہوتا ہے ، نہ آج دنیائے کفر کو فردائے قیامت کی فکر ہے ۔ بے رحمی اور نادانی سے ان قربان کرنے والوں پر سب سے زیادہ رحم کرنے والا پکار رہا ہے، کہ تم آگ میں جا رہے ہو کوئی نصیب والا ہوگا جو اس کی آواز کو سنے گا۔

وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰیؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَثَلُ مَا بَعَثَنِیَ اللّٰہُ بِہٖ مِنَ الْھُدٰی وَالْعِلْمِ کَمَثَلِ الْغَیْثِ الْکَثِیْرِ اَصَابَ اَرْضًا فَکَانَتْ مِنْھَا طَآئِفَۃٌ طَیِّبَۃٌ قَبِلَتِ الْمَآءُ فَاَنْبَتَتِ الْکَلَاءَ وَالْعُشْبَ الْکَثِیْرَ ۔

ترجمہ : روایت ہے حضرت ابوموسیٰؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اس ہدایت وعلم کی مثال جو رب نے مجھے دے کر بھیجا اس بہت سی بارش کی طرح ہے جو کسی زمین پر پہنچی اس کا کچھ حصّہ اچھا تھا جس نے پانی چوسا اور گھاس اور بہت سا چارہ اُگا دیا۔

قولہٗ مِنَ الْھُدٰی ۔ ہدایت سے مُرادمُطلق دلالت علی الخیر بھی ہے ۔ کَمَا فی قولہٖ تعالیٰ " وَاَمَّا ثَمُوْدَ فَھَدَیْنٰاھُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰی عَلَی الْھُدٰی " (پ۲۴ حٰمٓ) اور موصول الی الحق کے معنیٰ میں بھی مستعمل ہے "کما فی قولہٖ تعالیٰ: اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ (پ۲۰ قصص)

قولہٗ وَالْعِلْمَ ۔ اور اس علم سے مراد ظاہر و خفی ہے ۔ تقدیم ہدایت علی العلم اس بنار پر ہے کہ یہ ہدایت وسیلہ علم ہے نہ کہ ذاتِ ہدایت ۔

قولہٗ اَلْغَیْثَ : غیث کا معنیٰ ہے اَلْمَطَرُ الْکَثِیْرُ یَأْتِیْ بِاِضْطِرَارِ الْخَلْقِ یعنی ایسی بارش جو بہت دن قحط مطر کے بعد ہو کہ لوگ بارش کے لیے بہت پریشان و محتاج ہوں " کَمَا فی قولہٗ تعالیٰ : وَھُوَالَّذِیْ یُنَزِّلُ الْغَیْثَ مِنْ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا " (پ۲۵ حٰمٓ شوریٰ)

سوال ۔ بعثت نبوی کو غیث کثیر کے ساتھ کیوں تشبیہ دی گئی ہے ؟

جواب ۔ غیث اس بارش کو کہا جاتا ہے جو بہت دنوں بعد برسے ۔ جب کہ لوگ نہایت پریشان اور محتاج ہوں اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت بھی ایسے وقت ہوئی ۔ جب کہ پوری دنیا علم وہدایت سے بالکل خالی تھی ۔ لوگ اس کے محتاج تھے ۔

قولہٗ طَائِفَۃ ۔ طائفۃ بمعنیٰ قطعۃ الارض لا جماعۃ ۔

قولہٗ طَیِّبَۃ ۔ بمعنیٰ عُمدہ وجیّد (کما جاء فی البخاری نقیۃ) ۔

قولہٗ قبلت المَاءَ ۔ یہ طَیِّبَۃ کی صفت ہے ۔

قولہٗ الکلأَ ؛ گھاس ۔

قولہٗ وَالْعُشْبَ ۔ بمعنیٰ سبزہ و تر گھاس ، ان دونوں میں قدرے فرق ہے ۔

والعشب والکلاء والحشیش کلھا اسمٌ لِلنَّبَاتِ لٰکِنَّ الحَشِیْشَ مُختصٌ بالیابس ، وَالعُشْبُ مُختصٌ بالرّطب والکلاء یقع علی الیابس والرُّطبِ ۔ (کذا فی التعلیق)

قولہٗ اَجَادِبَ ۔ وھی الارض الصّلبۃ الّتی تمسّک الماء اجادب اَجْدَبْ کی جمع ہے یعنیٰ وہ سخت زمین جو پانی کو چوس کر ختم نہ کردے ۔ اسی لیے قحط کو جَدْبْ

کہتے ہیں یہاں مراد نشیبی زمینیں ہیں جو تالاب بن جاتے ہیں۔

قولہٗ اَمْسَکَتِ الْمَاءَ۔ یہ صفت اَجَادِبُ ہے۔

قولہٗ وَسَقَوْا فَشَرِبُوْا۔ فَشَرِبُوْا کا تعلق ذات انسان سے ہے۔ اور سَقَوْا کا تعلق دَوَآبِّھِمْ کے ساتھ ہے یعنی خود بھی پیا اور اپنے جانوروں کو بھی پلایا۔

قولہٗ قِیعَانٌ۔ جس کا واحد قَاعٌ ہے یعنی وہ چٹیل میدانی زمین جو نہ خود نفع حاصل کرے اور نہ دوسروں کو نفع پہنچائے یعنی غیر نافع غیر منتفع۔

قولہٗ فَعَلِمَ وَعَلَّمَ: یعنی خود بھی سیکھا اور دوسروں کو بھی سکھایا۔

یقول ابوالاسعاد: یہ بھی ایک تشبیہ ہے اور اس تشبیہ سے دو فائدہ حاصل ہوئے۔

۱۔ ایک یہ کہ کوئی شخص کسی درجہ پر پہنچ جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت مبارکہ سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ زمین کیسی اعلیٰ ہو اور کتنا ہی اچھا تخم بویا جائے مگر بارش کی محتاج ہے اور دین و دنیا کی ساری بہاریں اس شریعت مقدسہ کے دم سے ہیں جس کی بنیاد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود مبارک مطہر و منور ہے۔ ؎

شکرِ فیض تو چمن کند اے ابرِ بہار　　　که اگر خار و گر گل همه پروردهٔ تست

۲۔ دوسرے یہ کہ تاقیامت مسلمان کلھم فی الآفاق علماءِ صالحین کے محتاج ہیں کہ ان کی کھیتوں کو پانی انہیں تالابوں سے ملے گا۔ حضور علیہ السلام کی رحمت ان ہی کے ذریعہ نصیب ہو گی۔

قولہٗ من لم یرفع۔ عدمِ رفع رأس کنایہ ہے تکبر سے کہ اس محروم شخص نے میری لائی ہوئی شریعت و ہدایت کو قبول نہیں کیا اور نہ اس طرف توجہ کی۔ کیونکہ متکبر انسان اپنے تکبر کی وجہ سے ہمیشہ محروم رہتا ہے لہذا عرف میں جس چیز کی اہمیت نہ ہو اس طرف سر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا جاتا یعنی لم یرفع کنایۃ عن عدم الانتفاع والاعراض۔ یہ تیسرے قطعۂ زمین کے مشابہ یعنی کا فر و جاہل محروم انسان ہے۔

خُلَاصَۃُ الْحَدِیْث۔ اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے علومِ وحی کو اور ان سے استفادہ کرنے والوں کو ایک مثال اور تشبیہ دے کر سمجھایا ہے کہ علوم کی مثال بارانِ رحمت کی سی ہے اور ان سے استفادہ کرنے والوں کی مثال مختلف زمینوں کی سی ہے۔

تشبیہ کا حاصل ۔

اس میں دو تقسیمیں ہیں:۔

تقسیم اوّل انسان تین قسم ہیں ۱ جس نے نفع لیا بھی اور دیا بھی، جیسے فقہاء مجتہدین باعمل محدثین و مصنفین ۲ جس نے خود نفع نہ لیا لیکن دوسروں کو نفع پہنچایا جیسے بے عمل معلمین، بے عمل محدثین غیر مجتہدین۔ ۳ وہ جس نے نہ خود نفع لیا اور نہ دوسروں کو نفع پہنچایا یعنی جاہل محروم مشرک وغیرہما۔

تقسیم دوم زمین کی بھی تین قسمیں ہیں ۱ جو پانی کو جذب کر کے اس میں پھل پھول اُگاتی ہے یعنی نافع و منتفع ۲ وہ جو سخت اور نشیبی ہے وہ پانی کو جذب تو نہیں کرتی لیکن پانی کو روک رکھتی ہے اور اس پانی سے دوسرے استفادہ کرتے ہیں یعنی نافع غیر منتفع۔ ۳ وہ زمین جس میں نہ پانی رکتا ہے نہ پیداوار ہوتی ہے یعنی غیر نافع غیر منتفع۔

مُشَبَّہ اور مُشَبَّہ بہ کی تطبیق

تطبیق کی دو تفسیریں نقل کر رہا ہوں ایک حضرت شیخ جاجروی رحمہ القوی کی فرمودہ ہے اور دوسری بندہ کی حاصل مطالعہ ہے۔

اوّل یقول شیخ جاجروی رحمہ القوی ۔ میرے نزدیک مُشبّہ اور مُشبّہ بہ کے درمیان اس طرح انطباق دیا جا سکتا ہے کہ ایک شخص عالم بھی ہے اور عامل و معلّم بھی۔ یہ تو زمین کی پہلی قسم کی مثل ہے کہ خود سیکھا اور عمل کر کے نفع اٹھایا، دوسروں کو بھی سکھا کر نفع پہنچایا اور دوسری زمین کی مثال اس شخص پر منطبق ہوتی ہے جو عالم تو ہے مگر عمل کی توفیق نہیں یعنی دوسروں کو فائدہ پہنچاتا ہے لیکن عمل نہ کر کے خود اس نفع سے محروم ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی اس سے پڑھے اور دعا کرائے کرے اسی طرح کچھ فائدہ حاصل ہو جائے۔ مقصد یہ کہ اپنی ذات سے اپنے لیے کچھ نفع نہ ہو۔ تیسرا وہ شخص ہے کہ اس میں نہ قابلیت حفظ علم کی ہے اور نہ خود منتفع ہونے کی صلاحیت ہے۔ تو ایسا علم وبال ہے۔ یہ زمین کی تیسری قسم کی مثال ہوئی۔

دوم یقول ابو الاسعاد : جو علم و ہدایت میں لے کر آیا ہوں اس کی مثال کثیر

بارش کی ہے جب نازل ہوتی ہے تو تین طرح کی زمینوں پر پڑتی ہے۔ اوّل ایک وہ زمین جس میں نرمی بہت ہے کہ بارش ہوئی اور اس نے پانی چوس لیا۔ اور پھر گھاس، سبزہ، پھل پھول اگائے۔ یہ ائمہ مجتہدین امام اعظمؒ، امام شافعیؒ وغیرہم کی مثال ہے۔ ان لوگوں نے احادیث کو پی لیا۔ پھر اصول وفروع کے پھل پھول اگائے اور مسائل کے بیل بوٹے لگائے۔ اب ان سے حَدَّثَنَا کا سوال ہی نہ کرنا چاہیے۔ انہوں نے سب کچھ تمہارے سامنے سنوار کر رکھ دیا ہے اور ترتیب دے دی ہے۔ دوم: دوسری وہ زمین ہے جو کہ نرم تو نہیں بلکہ سخت ہے مگر اس میں نشیب ہے جیسے تالاب وغیرہ کہ اس میں پانی جمع ہوگیا لوگ اس سے منتفع ہوئے۔ یہ مثال محدثینؒ کی ہے کہ وہ احادیث کے ذخائر جمع کر دیتے ہیں اور مجتہدین ان کو پی کر مسائل کا استنباط کرتے ہیں جیسے امام بخاریؒ وامام نسائی وغیرہم۔ سوم: تیسری زمین ایسی ہے کہ نہ تو پانی چوس کر پھل پھول اگاتی ہے اور نہ ہی پانی روکتی ہے بلکہ چٹیل میدان ہے۔ یہ ان دونوں کے علاوہ کی مثال ہے جو نہ خود علمِ حدیث میں مشغول ہوا اور اس علم کو پھیلایا جیسے کافر جاہل لوگ!

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ ۔ سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَآ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۔

سوال ۔ حدیثِ باب پر ایک اہم اشکال یہ ہوتا ہے کہ بظاہر مثال میں تین قسم کی اراضی کا ذکر ہے۔ قبلت الماء ۔ امسکت الماء ۔ وقیعان لا تمسك الماء اور ممثل لہٗ میں صرف دو قسم کے لوگوں کا ذکر ہے۔ مَنْ وَفَقُهَ فِي دِيْنِ اللّٰهِ ۔ وَمَنْ اَبٰى ۔ تو مثال اور ممثل لہٗ میں مطابقت نہ ہوئی۔

جواب اوّل علامہ عینیؒ اور علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ مثال میں تقسیم ثنائی ہے یعنی زمین کی بھی دو قسمیں ہیں وہ اس طرح کہ زمین کی پہلی اور دوسری منتفع بہ ہونے کی حیثیت سے ایک قسم کی طرح ہے لہٰذا زمین مجموعی طور پر دو قسم کی ہوئی منتفع بہ اور غیر منتفع بہ۔ ایسے ہی انسان کی دو قسمیں ہیں احدھما مما ینتفع بہ یعنی مجتہد اور معلم غیر مجتہد۔ والثانی لا ینتفع بہ یعنی جاہل۔

یقول ابوالاسعاد ۔ اس جواب کو اس انداز سے بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ زمین کی دو قسمیں ہیں ۱۔ محمود ۲۔ مذموم ۔ پھر محمود کی دو شاخیں ہیں (۱) نافع منتفع، (۲) نافع غیر منتفع

اور مُشبّہ بہ دو چیزیں ہیں۔ انسان ۱ محمود، انسان ۲ مذموم، پھر انسان محمود کی دو شاخیں ہیں۔ مُعلّم مجتہد مُعلّم غیر مجتہد۔ اور ان میں سے دوسری شاخ کو قیاسًا علی المشبّہ بہ ذکر نہیں کیا۔ الحاصل یہ تشبیہ ثنائی ہے نہ کہ ثلاثی۔ اس پر قرینہ یہ ہے کہ حدیث میں لفظ اَصَابَ اور لفظ طَائِفَۃٌ صرف دو جگہ آرہا ہے نہ کہ تین جگہ۔

جوابِ دوم ۲ یہ کہ لوگ بھی تین قسم پر ہیں ۱ جو اس قدر علمِ دین قبول کرتے ہیں کہ جس سے خود عمل کرسکیں لیکن وہ فتویٰ اور تدریس کے قابل نہیں ہوتے ۲ جو فتویٰ، تدریس اور تعلیم کے بھی قابل ہیں ۳ جو علمِ دین کو قبول ہی نہ کریں۔

جوابِ سوم ۳ مشبّہ کی جانب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری قسم یعنی عالم غیر عامل مُعلّم کو صراحتًا بیان نہ فرما کر ایک اہم بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے وہ اہم بات یہ ہے کہ ایسا غیر نافع غیر مُنتفع ہونا عالم کے شایانِ شان نہیں اور بے عمل عالم جاہل کے مرتبہ میں ہے جو اس قابل نہیں کہ اس کا ذکر کیا جائے۔

حدیث کا ماحصل حدیث کا ماحصل یہ ہے کہ جس طرح بارش ہر قسم کی زمین کو پہنچتی ہے مگر زمین کی استعداد مُتفاوت ہونے کی وجہ سے قبولیّت میں تفاوت ہوتا ہے۔ اس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علمِ وحی ہر قسم کے انسان کے پاس پہنچا ہے مگر اپنی استعداد کے تفاوت کی حیثیّت سے انسان میں بھی تفاوت ہوا۔ (کما فی قولہ تعالیٰ "فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيدٌ" (پ ۱۲ ھود) (فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرَاتِ بِإِذْنِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيرُ (پ ۲۲ فاطر)

وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ تَلَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هُوَ الَّذِيْ أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ وَقَرَأَ إِلٰى وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُوا

ترجمہ: روایت ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت تلاوت کی کہ رب وہ ہے جس نے تم پر کتاب اتاری جس میں واضح آیات ہیں اور وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُوا

الْاَلْبَابِ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاِذَا رَأَيْتَ وَعِنْدَ مُسْلِمٍ رَأَيْتُمُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ سَمَّاهُمُ اللّٰهُ فَاحْذَرُوْا هُمْ۔

الْاَلْبَاب تک پڑھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم (اور مسلم شریف میں ہے) لوگ انہیں دیکھو جو متشابہات کے پیچھے پڑتے ہیں تو یہی وہ لوگ ہیں جن کا اللہ نے ذکر فرمایا ان سے بچو۔

قولہٗ سَمَّاهُمُ اللّٰهُ ۔ ای سمّیتم اللّٰہ یعنی اللہ پاک نے نام رکھا ہے اللہ پاک نے کیا نام رکھا ہے قرآن پاک میں ہے " وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ الخ (پ۳ آل عمران) یعنی اہل زیغ۔

قولہٗ فَاحْذَرُوْهُمْ : ان سے بچو اَیْ لَا تُجَالِسُوْهُمْ۔

یقول ابوالاسعاد : آیات متشابہات سے بحث کرنا اور ان سے غلط استدلال کرنا ہر دور کے اہل زیغ و باطل کا معمول رہا ہے۔ اس لیے اس حدیث کی تشریح قدرے تفصیل سے لکھی جاتی ہے۔

هُنَّ اُمُّ الْكِتَابِ کی تشریح

آیات کی تقسیم سے قبل هُنَّ اُمُّ الْكِتَابِ کی تشریح ہو جائے کیونکہ محکمات کو قرآن پاک میں اُمُّ الْكِتَابِ کہا گیا ہے۔ لغتِ عرب میں لفظ اُمّ کے معنیٰ اصل اور بڑے کے آتے ہیں۔

مثال (قال اللہ تعالیٰ " وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا پ انعام) اُمّ القریٰ سے مراد مکۃُ المکرمہ ہے اور مکۃ المکرمہ کو اُمّ القریٰ اس لیے کہا جاتا ہے کہ زمین کا مرکزی نقطہ اور اس کی اصل یہی ہے۔ یہیں سے زمین اطراف و جوانب میں پھیلائی گئی ہے۔ سورۃ فاتحہ کو بھی اُمّ الْکِتاب اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اصولِ کتاب پر حاوی ہے۔ اس لحاظ سے مُحْکَمَات

کے اُمّ الکتاب ہونے کا یہ مطلب ہو گا کہ یہ قرآن مُقدس کے لیے اصل ہیں۔

قرآن کریم کی آیات مُبارکہ کی تقسیم

اختصاراً عرض ہے کہ قرآن کریم کی آیتیں تین قسم کی ہیں :۔

اوّل مُحکمات : جن آیات میں ایسی مضبوطی ہو کہ لفظاً و معنیً و دلالۃً اس میں شبہ کی گنجائش نہ ہو۔

دوم مُتشابہ مطلقہ : وہ یہ ہے کہ جس کے یقینی معنیٰ بالکل معلوم نہ ہوں۔ جیسے حروف مقطعات اس میں ظنی معنیٰ بیان کر سکتے ہیں بشرطیکہ مُحکَمات سے تعارض نہ ہو۔

سوم مُشابہ من وجہ : جس کے لفظ و معنیٰ میں کوئی اشتباہ نہیں ہے۔ مگر دلالت اور معنیٰ اور مراد میں اشتباہ ہو جیسے یَدُ اللّٰہِ ۔ وَجْہُ اللّٰہِ ۔ اِسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ اس کی تأویل کی جا سکتی ہے جو محکمات کے ساتھ معارض نہ ہو۔

سوال حدیث الباب کی آیت (هُوَالَّذِیْ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْکِتَابَ) سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض قرآن محکم اور بعض مُتشابہ ہے۔ لیکن اس آیت مُبارک "الٓرٰ کِتٰبٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُہٗ (پ ۱۱ ھود) سے معلوم ہوتا ہے کہ پورا قرآن حکیم محکم ہے جب کہ اس کے برخلاف " اَللّٰہُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ کِتٰبًا مُّتَشَابِھًا" (پ ۲۳ زمر) سے معلوم ہوتا ہے کہ پورا قرآن پاک مُتشابہ ہے فَکَیْفَ التَّوْفِیْقُ ۔

جواب علیحدہ علیحدہ اعتبار سے الگ الگ حکم لگایا گیا۔ پہلی آیت میں دلالت و معانی کے اعتبار سے بعض کو محکم کہا گیا اور بعض کو متشابہ۔ اور دوسری آیت میں مضبوطی اور عدم تغیّر و تبدّل کے اعتبار سے سب کو محکم کہا گیا، اور تیسری آیت میں بلاغت و فصاحت، نظم و نسق کے اعتبار سے پورے قرآن کریم کو متشابہ کہا گیا لہٰذا کوئی تعارض نہیں۔

وَعَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو رضی اللہ عنہ قَالَ ھَجَرْتُ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ

ترجمہ : روایت ہے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے فرماتے ہیں کہ ایک دن دوپہر کو

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا قَالَ فَسَمِعَ اَصْوَاتَ رَجُلَيْنِ اِخْتَلَفَا فِيْ اٰيَةٍ فَخَرَجَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعْرَفُ فِيْ وَجْهِهِ الْغَضَبُ فَقَالَ اِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِاخْتِلَافِهِمْ فِي الْكِتَابِ۔

میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے دو شخصوں کی آوازیں سنیں جو کسی آیت میں جھگڑ رہے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے تو چہرہ انور میں غصہ معلوم ہوتا تھا فرمایا تم سے پہلے لوگ کتاب اللہ میں جھگڑوں کی وجہ سے ہلاک ہوگئے۔

قولہ هَجَّرْتُ ۔ یہ تَهْجِيْر سے مشتق ہے بمعنیٰ الظَّهِيْرَة دوپہر کا وقت اس کو ہاجرہ اور ہجیرہ بھی کہتے ہیں معنی چھوڑنا۔ چونکہ اس وقت شدت گرمی کی وجہ سے لوگ سفر کرنا چھوڑ دیتے ہیں اس لیے اس کو ہجیرہ کہتے ہیں۔ حضرت ابن عمرؓ کا مقصد یہ تھا کہ شاید اس وقت حضرتؐ کی ذات مبارکہ مسجد میں تشریف رکھتے ہوں یا حجرہ مبارک میں آرام کرنے کیلئے جا رہے ہوں اور فَلَا يَفُوْتُهُ شَيْئٌ مِنْ اَقْوَالِهٖ وَاَفْعَالِهٖ کچھ نہ کچھ حاصل ہو جائے گا ثانیًا اس سے حضرت ابن عمرؓ کا طلب علم کے لیے مشقت اختیار کرنا بھی ثابت ہو رہا ہے کہ اس وقت ہر ذی روح آرام میں ہے اور آپؓ حصول علم کے لیے گرمی کی مشقت برداشت کر رہے ہیں۔

قولہ فِيْ اٰيَةٍ ۔ ای فی اٰیۃٍ مُتَشَابِهَةٍ یعنی آیات متشابہات میں اختلاف کر رہے ہیں نہ کہ محکمات میں۔

قولہ بِاخْتِلَافِهِمْ فِي الْكِتَابِ ۔ علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ مذموم اختلاف وہ ہے جو کفر و بدعت تک پہنچا دے۔ مثلاً قرآن کے لفظ میں اختلاف کرنا یا ایسے معنیٰ میں اختلاف کرنا جو محل اجتہاد نہ ہو۔ جیسے متشابہات کے قطعی معنیٰ یا ایسا اختلاف جس سے فتنہ اور شک و شبہ پیدا ہوتا ہو یہاں یہ اختلاف مراد ہے باقی مسائل اجتہادیہ میں آئمہ مجتہدین کا اختلاف مذموم نہیں کیونکہ وہ مسائل محل اجتہاد ہیں بلکہ یہ اختلاف محمود اور دین میں وسعت کا باعث ہے۔ اور حدیث "اِخْتِلَافُ اُمَّتِيْ رَحْمَةٌ" میں اسی طرف اشارہ ہے۔

وَعَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَعْظَمَ فِی الْمُسْلِمِیْنَ جُرْمًا مَنْ سَاَلَ عَنْ شَیْئٍ لَمْ یُحَرَّمْ عَلَی النَّاسِ فَحُرِّمَ مِنْ اَجْلِ مَسْئَلَتِہٖ :

ترجمہ : روایت ہے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ مسلمانوں میں بڑا مجرم وہ ہے جو کسی غیر حرام چیز کے بارے میں سوال کرے تو اس کے سوال کی وجہ سے وہ چیز حرام کر دی جائے ۔

قولہ مَنْ سَاَلَ عَنْ شَیْئٍ ۔ سوال سے مراد وہ سوال ہے جو کسی مُباح چیز کے متعلق ہو اور بلا ضرورت ہو کیونکہ اگر اس کی وجہ سے قیودات آجائیں تو وہ گنہگار ہوگا اس لیے اس قسم کے سوالوں میں کبر کی بُو ہوتی ہے اور خود کے لائق ، فائق وعقل کل ہونے کا دعوٰی مُضمر ہوتا ہے کہ میں اس کو کر سکتا ہوں جب کہ ربّ ذوالجلال والاکرام کے ہاں دعوٰی کام نہیں کرتا بلکہ عجز وانکساری کارگر ہوتی ہے ۔

یقول ابوالاسعاد : یہ وعید " اِنَّ اَعْظَمَ الْمُسْلِمِیْنَ " الخ آپ نے ان لوگوں کے متعلق بیان فرمائی جو آپ سے ازراہِ سرکشی سوالات کرتے تھے یا ان کا سوال کرنا محض تصنّع کی وجہ سے ہوتا تھا جیسا کہ بنی اسرائیل نے بقرہ کے بارے حضرت موسٰی علیہ السلام سے سوال کیا تھا جس کو قرآن پاک میں کہا گیا " اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا " (پ بقرہ) ہاں جن لوگوں کا سوال کرنا واقعۃً علم حاصل کرنے یا کسی ضرورت کی بناء پر ہوتا تھا وہ اس میں داخل نہیں کیونکہ اس کو اپنے صحیح سوال پر ثواب ملتا ہے " قَالَ اللّٰہُ تعالٰی " فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ " (پ)

اسمائے رجال

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے حالات

آپ کا اسم شریف سعد بن ابی وقاص اور کنیت ابو اسحٰق ہے ۔ آپ کے والد کا نام مالک ابن وہیب ہے اور کنیت ابو وقاص ہے ۔ آپ زہری قبیلہ قریش میں سے ہیں اور عشرہ مبشرہ میں سے ہیں ، قدیم الاسلام ہیں چنانچہ آپ تیسرے مسلمان ہیں ۔ بوقتِ اسلام آپ کی عمر شریف سترہ برس

وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَکُوْنُ فِیْ اٰخِرِ الزَّمَانِ دَجَّالُوْنَ کَذَّابُوْنَ یَاْتُوْنَکُمْ مِنَ الْاَحَادِیْثِ بِمَا لَمْ تَسْمَعُوْا اَنْتُمْ وَلَا اٰبَاءُکُمْ فَاِیَّاکُمْ وَاِیَّاهُمْ لَا یُضِلُّوْنَکُمْ وَیُفْتِنُوْنَکُمْ۔

ترجمہ: روایت ہے حضرت ابوہریرہؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ آخری زمانہ میں جھوٹے دجّال ہوں گے جو تمہارے میں وہ احادیث لائیں گے جو نہ تم نے سنیں نہ تمہارے باپ دادوں نے ان کو اپنے سے دور رکھو وہ تمہیں گمراہ نہ کردیں اور فتنہ میں نہ ڈال دیں۔

قولہٗ دَجَّالُوْنَ۔ دَجَّال دَجل کی جمع ہے بمعنیٰ التباس ای مُلتبِسُوْنَ وَ خَدَّاعُوْنَ دھوکا کرنے والے، حق و باطل کو ملانے والے۔ چنانچہ دجّال کو بھی دجال اس لیے کہتے ہیں کہ وہ حق و باطل کو ملا دے گا۔ مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دجّال کی صفت کذاب بیان کی ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ کُلُّ دَجَّالٍ فَهُوَ کَذَّابٌ

قولہٗ فَاِیَّاکُمْ۔ ای ابعدوا انفسکم عنھم۔

قولہٗ وَاِیَّاهُمْ۔ عند البعض یہ اِیَّاکُمْ کی تاکید ہے جب کہ بعض حضرات کے

تھی۔ بڑے مُستجابُ الدّعوات تھے اس بات کی لوگوں میں بڑی شہرت تھی۔ ان کی بددُعاء سے لوگ ڈرتے تھے اور ان سے دعائے خیر کی تمنار کھتے تھے اور یہ بات اس لیے تھی کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں یہ دعاء کی تھی اے اللہ ان کے تیر کو سیدھا پہنچادے اور ان کی دعاء کو قبول فرمالے۔ ان کے لیے اور حضرت زبیرؓ کے لیے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ماں باپ دونوں کو جمع کرکے اس طرح فرمایا "اِرْمِ فِدَاكَ اَبِیْ وَاُمِّیْ"۔ ایسے الفاظ ان دونوں کے علاوہ کسی اور سے نہیں فرمائے۔ یہ کوتاہ قامت اور جھکے ہوئے بدن والے تھے، گندمی رنگ تھا اور جسم پر بال زیادہ تھے۔ مقامِ عقیق سے جو مدینہ منورہ سے قریب ہے اپنے گھر میں وفات پائی اور لوگوں کے کندھوں پر مدینہ لے جائے گئے۔ مروان بن حکم نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔ مروان اس زمانہ میں مدینہ کے گورنر تھے۔ مقام بقیع میں دفن کیے گئے۔ یہ واقعہ ۵۵ھ میں پیش آیا ان کی عمر مبارک کچھ اوپر ستّر سال ہوئی۔

نزدیک اس کا معنیٰ ہے" ای بعدُ وھُمْ عنکُمْ۔

قولہٗ لا یُضِلُّونکُمْ۔ یہ استیناف ہے جو جواب ہوگا کہ کیوں ابعدُ وھُمْ کہ ان سے کیوں دور رہیں جواب دیا لِئَلَّا یُضِلُّونکُمْ تاکہ تمہیں گمراہ نہ کردیں" کما فی قولہٖ تعالیٰ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَا اھْتَدَیْتُمْ (پ)

قولہ وَلَا یُفْتِنُوْنَکُمْ۔ "ای لَا یُوقِعُوْنَکُمْ فِی الْفِتْنَۃِ وَھِیَ الشِّرْکُ" وہ فتنہ شرک ہے۔" قَالَ تعالیٰ: وَالْفِتْنَۃُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ"۔ یا عذابِ آخرت مُراد ہے۔ قَالَ تعالیٰ" ذُوْقُوْا فِتْنَتَکُمْ۔

خُلاصۃُ الحدیث : یہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو باتیں بیان فرمائی ہیں۔ اوّل ؛ اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ حضرتؐ نے پیشگوئی فرمادی ہے کہ قیامت کے قریب دینِ متین میں تلبیسات پیدا کرنے والے لوگ پیدا ہوں گے۔ لہٰذا خیال کرنا ہر مدعی علم وفضل سچا نہیں ہوتا، ہر تجدید واحیاءِ دین کی تحریک حقیقت نہیں ہوتی۔ ہر نظامِ مصطفٰے کے مُدعی مخلص نہیں اگر کہیں نادانستہ طور پر ابتلاء ہوجائے تو سلف صالحین کی ہدایت کو دیکھنا اگر ان میں نہیں تو ردّ کردینا جس کو فرمایا لَمْ تَسْمَعُوْا اَنْتُمْ وَلَا اٰبَائُکُمْ۔

دوّم ؛ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عامی کے لیے باطل لوگوں کا لٹریچر (یعنی کتابیں) پڑھنا جائز نہیں ہے۔ بعض لوگ کہدیتے ہیں کہ ہم ع خُذْ مَا صَفَا وَدَعْ مَا کَدَرَ پر عمل کرتے ہوئے اچھی باتوں کو لے لیں گے اور بُری باتوں کو چھوڑ دیں گے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہر آدمی صحیح اور غلط میں تمیز کرسکے گا۔ ہر آدمی کے اندر تمیز کا سلیقہ کہاں ہوتا ہے صرف دعوٰی کردینے سے تو سلیقہ نہیں آتا بلکہ اس کے لیے ماہر کی تصدیق ضروری ہے کہ واقعی یہ شخص حق وباطل میں تمیز کرسکتا ہے ؎

بنما بصاحب نظرِ گوہر خود را ——— عیسٰی نتواں گشت بتصدیق خرے چند

البتہ جس کے بارے میں علماء ومشائخ کی رائے یہ ہو کہ یہ صحیح اور غلط میں تمیز کرسکتا ہے اور اس کا اپنا رنگ پختہ ہوچکا ہے اس کو باطل کی کتابیں تردید اور غلطی واضح کرنے کی نیت سے پڑھنا جائز ہے۔

وَعَنْهُ قَالَ كَانَ اَهْلُ الْكِتَابِ يَقْرَءُوْنَ التَّوْرَاةَ بِالْعِبْرَانِيَّةِ وَيُفَسِّرُوْنَهَا بِالْعَرَبِيَّةِ لِاَهْلِ الْاِسْلَامِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُصَدِّقُوْا اَهْلَ الْكِتَابِ وَلَا تُكَذِّبُوْهُمْ وَقُوْلُوْآ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا الآیہ۔

ترجمہ : روایت ہے انہی سے فرماتے ہیں کہ اہل کتاب مسلمانوں کے سامنے عبرانی زبان میں تورات پڑھ کر عربی میں ترجمہ کرتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہلِ کتاب کو نہ سچا کہو نہ جھوٹا۔ یہ کہہ دو کہ ہم اللہ پر اور اس پر ایمان لائے جو ہماری طرف اُتارا گیا ہے۔

قولہ بِالْعِبْرَانِيَّةِ ۔ بکسر العین یہ یہودیوں کی زبان ہے اور بنی اسرائیل کی بھی یہی زبان تھی۔ تورات کا نزول بھی اسی زبان میں ہوا تھا۔

سوال ۔ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس کو مُطلق ذکر کیا کہ نہ ان کی تصدیق کرو اور نہ تکذیب کرو حالانکہ بہت سے اُمور میں ان کی تصدیق و تکذیب موجود ہے۔

جواب ۔ یہ حکم مُطلق نہیں بلکہ مُقیّد ہے۔

لَا تُصَدِّقُوْا اور لَا تُكَذِّبُوْا کی تفصیل

جو باتیں اہل کتاب اپنی کتابوں سے نقل کریں گے وہ کئی قسم کی ہوسکتی ہیں۔ اوّل بعض باتیں ایسی ہوں گی جن کی ہماری شریعت مُقدّسہ نے بھی تصدیق کی ہو گی جیسے موسیٰ علیہ السّلام کا نبی ہونا اور ان پر تورات کا نازل ہونا ایسی باتوں میں ان کی تصدیق کی جائے گی اس حیثیت میں کہ یہ باتیں ہماری شریعت مُقدّسہ میں بھی ثابت ہیں۔

دوم : بعض باتیں ایسی ہونگی جن کی تکذیب کتاب وسُنّت میں موجود ہے جیسے عزیر ع کا یا مسیح علیہ السّلام کا ابنُ اللہ ہونا ایسی باتوں میں ان کی تکذیب کی جائے گی۔

سوم : تیسری قسم کی وہ باتیں جن کے بارہ میں کتاب وسُنّت ساکت ہیں ایسے اُمور کے متعلق

حکم ہے کہ نہ ان کی تصدیق کرو اور نہ ہی ان کی تکذیب کرو۔

خُلاصَۃُ الحَدِیث : علی الاطلاق تصدیق سے منع کر دیا تاکہ ان کی غلط باتوں کی تصدیق نہ ہو جائے اور علی الاطلاق تکذیب سے بھی تاکہ سچی باتوں کی تکذیب نہ ہو۔

یقول ابو الاسعاد : لَا تُصَدِّقُوا اَهْلَ الْكِتَابِ وَلَا تُكَذِّبُوهُمْ والا حکم اوّلاً تھا بعد میں تو حضور علیہ السّلام نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسے صحابی کو تورات پڑھنے سننے سے ہی منع فرمایا اور فرمایا کہ میرے پاس کیا نہیں ہے جو تم تورات میں ڈھونڈتے ہو۔ اگر موسیٰ علیہ السّلام بھی موجود ہوتے تو میری شریعت کی پیروی کرتے۔

وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا اَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ۔

ترجمہ : روایت ہے انہی سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ انسان کے جھوٹا ہونے کو یہی کافی ہے کہ ہر سُنی بات بیان کر دے۔

قولہٗ بِالْمَرْءِ : بِالْمَرْءِ میں بار زائدہ کَفٰی کا مفعول ہے اور مفعول پر با زائدہ خلافِ قیاس بطور شاذ کے ہے۔ کما فی شعر الانصاری ؎

وَكَفٰى بِنَا فَضْلًا عَلٰى مَنْ غَيْرِنَا حُبُّ النَّبِيِّ مُحَمَّدٍ اِيَّانَا

قولہٗ كَذِبًا ۔ بفتح الکاف وکسر الذال۔ یا بکسر کاف وسکونِ ذال۔ مصدر ہو تو تمیز ہے یا بالتاویل حال ہے اور ایک روایت میں كَذِبًا کے بجائے اِثْمًا ہے۔

قولہٗ اَنْ يُّحَدِّثَ ۔ یہ کَفٰی کا فاعل ہے۔

خُلاصَۃُ الحَدِیث : اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی آدمی خود جھوٹ نہیں بولتا مگر ہر سُنی سُنائی بات بغیر تحقیق کے نقل کر دیتا ہے تو وہ بھی جھوٹا ہی ہے۔ لہٰذا پہلے تولو پھر بولو۔ بالخصوص حدیث نقل کرنے میں تو اور زیادہ احتیاط کرو۔ اور اس حدیث کو باب الاعتصام میں لانے کی غرض بھی یہی ہے۔ ثانیاً محدثین رحمہم اللہ نے لکھا ہے کہ حدیث میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جس چیز کی حقیقت معلوم نہ ہو اور اس کی صداقت کا علم نہ ہو اُسے

بیان کرنا یا اس کی تشہیر کرنا منع ہے۔

وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ نَبِیٍّ بَعَثَہُ اللّٰہُ فِیْ اُمَّتِہٖ قَبْلِیْ اِلَّا کَانَ لَہٗ فِیْ اُمَّتِہٖ حَوَارِیُّوْنَ وَاَصْحَابٌ یَّاْخُذُوْنَ بِسُنَّتِہٖ وَیَقْتَدُوْنَ بِاَمْرِہٖ ۔

ترجمہ: روایت ہے حضرت ابن مسعودؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے پہلے ایسا کوئی نبی نہیں بھیجا جس کی امت میں سے کچھ لوگ ان کے خاص مددگار اور وہ صحابہ نہ ہوں جو ان کی سنت لیں اور ان کے احکام کی پیروی کریں۔

قولہ حَوَارِیُّوْنَ ۔ یہ حور بمعنیٰ خالص سفید سے مشتق ہے اور مخلص دوست اور معاون کو صفائی نیت کی وجہ سے حواری کہتے ہیں، یا دھوبی کو حواری کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی کپڑا کو میل کچیل سے صاف کرتا ہے۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے حواریین دھوبی ہونے کے ساتھ ساتھ مخلص و معاون بھی تھے۔ پھر حواریین کی کثرت اکثر انبیاء علیہم السلام کے اعتبار سے ہے ورنہ حدیث کے اعتبار سے بعض انبیاء علیہم السلام کا صرف ایک حواری اور بعض کا بالکل نہ ہونا ثابت ہے۔ کما جاء فی حدیث انسؓ "وَاِنَّ مِنَ الْاَنْبِیَاءِ نَبِیًّا مَا صَدَّقَہٗ مِنْ اُمَّتِہٖ اِلَّا رَجُلٌ وَاحِدٌ" (مشکوٰۃ شریف ص۵۱۱ ج۲ باب فضائل سید المرسلین صلوات المرسلین۔ کتاب الفتن)

قولہ اَصْحَابٌ : اصحاب عام ساتھی کو کہا جاتا ہے اور حواری خاص ساتھی کو۔ تو اصحاب کا عطف تفسیری ہے یا عطف العام علی الخاص ہے۔

قولہ بِسُنَّتِہٖ ۔ ای بھدیہ و سیرتہ ۔

قولہ وَیَقْتَدُوْنَ بِاَمْرِہٖ : ای یَتَّبِعُوْنَ فِیْ اَمْرِہٖ وَنَھْیِہٖ اس سے اوامر و منہیات مراد ہیں۔

قولہ تَخْلُفُ ۔ بِضَمِّ اللَّامِ ای تحدث یعنی ان کے بعد پیدا ہوئے۔

قولہ خُلُوْفٌ ۔ بِضَمِّ الْخَاءِ اَمْ بِفَتْحِ الْخَاءِ بِسُکُوْنِ اللَّامِ کَعُدُلٍ وَعُدُوْلٍ

اس کا معنیٰ ہے "هُوَالرَّدِی مِنَ الْأَعْقَابِ" جو ایڑیوں کے پیچھے چلے۔ یا ولد سوء، یعنی نالائق جانشین۔ قولہ تعالیٰ "فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ (پ ۱۶ مریم)

قولہٗ فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهٖ - ہاتھ سے جہاد کا مطلب تو ظاہر ہے زبان سے جہاد کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے غلط عقائد و اعمال کی بنا پر ان کو تنبیہ کرے اور منع کرے اور ان کی برائی بیان کرتا رہے۔ اسی طرح دل سے جہاد کا مقصد یہ ہے کہ ایسی چیزوں کو بُرا جانے جو دین و شریعت کے خلاف ہوں، اور دل میں ان کے کرنے والوں سے بغض و نفرت رکھے۔

یقول ابوالاسعاد : یعنی ایسے بدعقیدہ اور بدعمل لوگوں کی اصلاح تین جماعتیں تین طریقوں سے کریں :۔

۱۔ حُکّام طاقت سے مجرموں کو سزائیں دیں۔
۲۔ اہلِ علم زبان سے انہیں وعظ کریں۔
۳۔ عوام مؤمن دل سے ان لوگوں سے نفرت کریں اور دور رہیں۔

قولہٗ وَلَيْسَ وَرَاءَ ذٰلِكَ مِنَ الْاِيْمَانِ : وَرَآءَ، لَيْسَ کی خبر ہے۔ اور حَبَّةُ خَرْدَلٍ اسم ہے۔ مِنَ الْاِيْمَانِ حَبَّةٌ کی صفت ہے لیکن بوجہ تقدیم کے حال بن رہا ہے۔ اس جملہ کا مقصد یہ ہے کہ جس شخص کا احساس اتنا مردہ ہو جائے کہ وہ غلط چیزوں کو دل سے بھی برا نہ جانے تو اس کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ اس کے دل میں ایمان کی ہلکی سی روشنی بھی نہیں کیونکہ کسی غلطی کو غلطی نہ کہنا یا غلط عقیدہ کو برا نہ جاننا اس بات کا اظہار ہے کہ وہ اس برائی پر خوش و راضی ہے اور یہ کفر کا خاصہ ہے۔

بحث اَمر بالمعرُوف ونہی عَنِ المُنکَر

یہ بحث وَيُقْتَدُوْنَ بِاَمْرِهٖ پر ہو رہی ہے۔ اسلام میں اَمر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی جتنی اہمیت ہے اس سے زیادہ اہمیت مواقع انکار جاننے کی ہے۔ بسا اوقات بے محل

انکار خود ایک منکر کی صورت میں بن جاتا ہے ۔ چنانچہ حافظ ابن قیمؒ نے اس کی چار صورتیں تحریر فرمائی ہیں :۔

اوّل : منکر اور برائی کو روکنے سے اصلاح کی توقع ہو اور اس کے بجائے نیکی پیدا ہونے کی اُمید ہو۔

دوم : اگر اس کے ازالہ کی توقع نہ ہو تو کم ازکم اس میں خفت کی اُمید ہو۔

سوم : یا اس کے ہم وزن دوسری برائی پیدا ہونے کا خطرہ ہو۔

چہارم : یا اس سے برتر برائی کا خطرہ ہو۔

صرف پہلی دو صورتوں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ضروری ہے ۔ تیسری صورت خود انسان کے احساس وتمیز پر موقوف ہے ۔ اور چوتھی صورت حرام ہے ۔ اس تفصیل کے مطابق اگر ایک جماعت شطرنج کھیل رہی ہے اور امید یہ ہے کہ اگر اس کو روکا گیا تو وہ کسی اور بہتر کھیل میں لگ جائے گی تو اس کو منع کرنا ضروری ہوگا ورنہ نہیں۔ اسی طرح اگر ایک شخص ناول پڑھتا ہے اور خطرہ یہ ہے کہ اس کو روکا گیا تو وہ اور بد دین اور فاسد العقیدہ مصنفین کی کتابوں کے دیکھنے میں مشغول ہو جائے گا تو اس کو ناول پڑھنے سے منع نہ کرنا ضروری ہوگا ایسے شخص کو ان مشاغل میں رہنے دینا مناسب ہے۔

وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ دَعَا اِلٰى هُدًى كَانَ لَهٗ مِنَ الْاَجْرِ مِثْلُ اُجُوْرِ مَنْ تَبِعَهٗ لَا يَنْقُصُ ذٰلِكَ مِنْ اُجُوْرِهِمْ شَيْئًا ۔

ترجمہ : روایت ہے حضرت ابو ہریرہؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم نے جو ہدایت کی طرف بلائے اس کو تمام عاملین کی طرح ثواب ملے گا۔ اور اس سے ان کے اپنے ثوابوں سے کچھ کم نہ ہوگا۔

قولہٗ مَنْ دَعَا اِلٰى هُدًى : دعوت الی الهدایت دینے والے کو ثواب اس کی دعوت تبلیغ کی وجہ سے دیا جارہا ہے اور مَنْ تَبِعَهٗ کو سزا عمل کی وجہ سے ۔

سوال ۔ دعوت الی الہدایت اور دعوت اِلی الضّلالت کا فرق نہیں کیونکہ اس کے بارے میں ہے " لَا یَنقصُ ذَالِكَ مِنْ اُجُوْرِهِمْ شَیْئًا " اسی طرح ضلالت کے بارے میں " لَا یَنقصُ ذَالِكَ مِنْ آثَامِهِمْ شَیْئًا "

جواب ۔ نقص دو قسم ہے ۔ اوّل حسّی : کہ اجر دس نیکیاں ہوں اس کو کم کر کے پانچ کر دی جائیں ۔ دوم معنوی : یہ کہ اصول تو یہی ہے کہ اجر دس نیکیاں ہونگی مگر عادت یہ ہے کہ دس میں بڑھاوا ہو جاتا ہے " وَاللّٰهُ یُضَاعِفُ لِمَنْ یَّشَاءُ (پ۳) یہاں پر نقص حسّی ہے کیونکہ قانون ہے کہ نیکی کے اجر کی تضعیف ہوتی ہے اور اثم کے اجر کی تضعیف نہیں ہوتی ۔ تو اس مقام میں نقص حسّی مراد ہے نہ کہ معنوی ۔

سوال ۔ یہ تعبیر کا اختلاف کیوں ہے کہ ہدایت پر فرمایا لا ینقص ذالك من اجورهم شیئًا اور ضلالت پر فرمایا لَا یَنْقُصُ ذَالِكَ مِنْ آثَامِهِمْ شَیْئًا وہاں اجور فرمایا اور یہاں آثام فرمایا ۔

جواب : ہدایت کے عوض جو جزاء ہوتی ہے اس کو اجر کہتے ہیں ۔ ضلالت کے عوض جو سزا ہوتی ہے اس کو آثام کہتے ہیں " کما فی قولہ تعالیٰ : اِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ (پ۱۱) محسنین کے لیے اجر فرمایا یہی تعبیر یہاں اختیار کی ۔

سوال : یہ قانون " مثل آثام من تبعہ الخ) قرآن مقدس کی آیت کے معارض ہے ۔ کما فی قولہ تعالیٰ " لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی " (پ۲۲)

جواب ۔ یہ دوسروں کا وزر نہیں بلکہ اس گمراہی کا وبال ہے جو اس کے ذریعہ پھیلا ہے ۔

یقول ابو الاسعاد : ایک مسئلہ ہے جو اس حدیث مبارک سے مستنبط ہے ۔ جس کا بیان خالی از فائدہ نیست ۔

مسئلہ ۔ تائب ہونے کے بعد اضلال کے گناہ کی معافی ہے

اگر کوئی ضلالت کا داعی تائب ہو جائے لیکن اس کے اضلال کے آثار سے لوگ گناہ کرتے رہیں تو آیا وہ داعی اس اضلال کے گناہ سے بری ہو گا یا نہیں ؟ تو ملّا علی قاری برأت

کو ترجیح دیتے ہیں ورنہ توبہ کی صحت کے کیا معنیٰ ہیں چنانچہ بہت سے صحابہ کرامؓ پہلے ضلالت وگمراہی کے مُبلّغ تھے اور بعدہٗ وہ مُشرّف باسلام ہوئے اور وہ اس اِضلال کے گناہ سے بَری سمجھے گئے۔

وَعَنْـهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَدَءَ الْاِسْلَامُ غَرِیْبًا وَّسَیَعُوْدُ کَمَا بَدَءَ فَطُوْبٰی لِلْغُرَبَآءِ۔

ترجمہ: روایت ہے انہی سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام غریبی سے شروع ہوا، اور جیسا شروع ہوا تھا ویسا ہی پھر ہوجائے گا غرباء کو خوشخبری ہو۔

قولہٗ بَدَأَ۔ بَدَءَ میں دو لغتیں ہیں۔ ۱؎ بَدَءَ ہمزہ کے ساتھ بمعنیٰ شروع، یعنی اسلام شروع ہوا۔ ۲؎ بَدَا بغیر الہمزۃ بمعنیٰ ظَھَرَ یعنی ظاہر ہوا۔

قولہٗ غَرِیبًا۔ غَرِیْبًا۔ بمعنیٰ کالغریب۔ یہ بدء کی ضمیرِ فاعل سے حال واقع ہورہا ہے۔ اور غربت کے لفظی معنیٰ ہیں تنہائی اور بیکسی۔ اسی لیے مسافر اور تنگ دست کو غریب کہا جاتا ہے کہ مُسافر سفر میں اکیلا ہوتا ہے۔

قولہٗ فَطُوْبٰی: اَیْ فَرْحَۃٌ وَّقُرَّۃُ عَیْنٍ۔

قولہٗ لِلْغُرَبَاءِ۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کی تفسیر یوں کی ہے:

"اَلَّذِیْنَ یُصْلِحُوْنَ مَا اَفْسَدَ النَّاسُ بَعْدَہٗ مِنْ سُنَّتِہٖ"۔ یعنی اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو غربتِ اسلام اور زورِ گمراہی کے زمانہ میں بھی اسلام کو تھامے ہوئے ہوں اور لوگوں کی اصلاح میں اور سُنّت کے احیاء میں سرگرمِ عمل ہوں۔

خُلَاصَۃُ الْحَدِیْث: خلاصہ یہ ہے کہ ابتداء میں اسلام مسافر کی طرح اجنبی بے یار و مددگار اور غریب وقلیل الاتباع تھا اور اس کے ماننے والے لاچاری اور بے بسی وقلت کی حالت میں تھے حتیٰ کہ ان کو ظاہرًا بھی مسافر ومہاجر بننا پڑا لیکن پھر خلافتِ راشدہ کے دور میں اسلام اپنی پوری شان وشوکت اور آب وتاب سے مشرق ومغرب میں پھیل گیا اور پھر کچھ عرصہ کے بعد اپنی اصل حالت کی طرف لوٹ آیا۔

وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْاِيْمَانَ لَيَأْرِزُ اِلَى الْمَدِيْنَةِ كَمَا تَأْرِزُ الْحَيَّةُ اِلٰى جُحْرِهَا۔

ترجمہ: روایت ہے انہی سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ یقیناً ایمان مدینہ کی طرف ایسا سمٹ آوے گا جیسے سانپ اپنے سوراخ کی طرف۔

قولہٗ لَيَأْرِزُ ۔ بِكَسْرِ الرَّاءِ، عِنْدَ الْاَكْثَرِ وَرُوِيَ بِالْفَتْحِ وَحُكِيَ بِالضَّمِّ: ای یأوی وینضم بمعنی ٹھکانا بنانا۔

قولہٗ جُحْرِهَا ۔ ای نقبها یعنی سوراخ۔

سوال: دشمنانِ اسلام کے مصائب اور مظالم سے اہل ایمان کے بھاگنے اور ایمان پر ثابت قدم رہنے کی مثال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سانپ سے دی ہے اس میں کیا حکمت ہے؟

جواب: اس میں متعدد حکمتیں ہیں:۔

اوّل: دوسرے جانوروں کے مقابلہ میں سانپ تیز بھاگتا ہے۔

دوم: اور یہ جانور بہت جلدی سمٹ کر بل میں جاتا ہے۔

سوم: اور پھر مشکل ہی سے وہ بل سے نکالا جاتا ہے۔

یہی وجوہ اسلام کے مدینہ منوّرہ میں داخل ہونے کے وقت ہوں گے۔

خلاصۃ الحدیث: یہ کہ اہل ایمان مدینہ منوّرہ کو پناہ گاہ سمجھ کر اس میں آکر ٹھہریں گے۔ بعض نے کہا کہ یہ ہجرت کے متصل کا زمانہ ہے اور بعض نے کہا کہ یہ دجّال کے زمانہ کا وقت ہے جیسا کہ دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ پھر مدینہ مع اپنے حوالی وجوانب کے مراد ہے جیسا کہ دوسری روایت میں لفظ حجاز آیا ہے (مرقاۃ ص ۲۲۴ ج ۱)

قولہٗ وَسَنَذْكُرُ حَدِيْثَ اَبِيْ هُرَيْرَةَ ؓ یعنی وہ تینوں حدیثیں (ابی ہریرہ ؓ معاویہ ؓ، جابر ؓ) مصابیح میں یہاں ہی تھیں لیکن ہم نے مناسبت کی وجہ سے ان بابوں میں ذکر کیا ہے۔

اَلفَصلُ الثَّانِیْ

یہ دوسری فصل ہے۔

عَنْ رَبِیْعَةَ الْجُرَشِیِّ قَالَ اُتِیَ نَبِیَّ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقِیْلَ لَہٗ لِتَنَمْ عَیْنَیْکَ لِتَسْمَعْ اُذُنُکَ وَلِیَعْقِلْ قَلْبُکَ قَالَ فَنَامَتْ عَیْنَیَّ وَسَمِعَتْ اُذُنَایَ وَعَقَلَ قَلْبِیْ

ترجمہ: روایت ہے حضرت ربیعہؓ جرشی سے فرماتے ہیں حضورؐ کی خدمت میں آنے والا آیا اور حضورؐ سے کہا گیا کہ مناسب ہے، آپ کی آنکھیں سو جائیں، آپ کے کان سنتے اور دل سمجھتا رہے۔ فرماتے ہیں کہ میری آنکھیں سوگئیں اور کان سنتے رہے، دل سمجھتا رہا۔

قولہٗ اُتِیَ۔ مجہول ہے ای الملائکۃ اس سے فرشتہ مراد ہے۔

قولہٗ فَقِیْلَ لَہٗ۔ ای النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم

قولہٗ لِتَنَمْ۔ یعنی چاہیے کہ نیند کریں تمہاری دو آنکھیں، یہاں ذکر انشار کا ہے اور مراد خبر ہے کہ تمہاری آنکھیں نیند کرتی ہیں اور کان و دل جاگتے ہیں۔ اور اس سے مراد اِمتثالِ امر اور حضور دل اور توجہ کامل کے ساتھ مثال کو سننا ہے۔ مطلب یہ تھا کہ خوب غور وخوض اور حضورِ دل کے ساتھ اس مثال کو سنیے جو ہم پیش کرنے والے ہیں تاکہ یہ خوب اچھی طرح ذہن نشین ہوجائے۔ اس پر آنحضرت صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ "فَنَامَتْ عَیْنَایَ یعنی میری آنکھیں سوئیں لیکن کان اور دل بیدار ہے اور میں پورا متوجہ ہوں اور بیدار شخص کی طرح دل پورا بیدار ہے۔

قولہٗ مَأْدُبَۃ۔ عام دعوت کا کھانا مراد ہے۔

قولہٗ وَالدَّارُ الْاِسْلَامُ۔ یعنی دار سے مراد اسلام ہے۔

سوال۔ پہلی حدیث رباب الاعتصام فصلِ اوّل بروایت جابرؓ میں گذرا کہ دار سے مراد جنت ہے۔ اور یہاں فرماتے ہیں کہ دار سے مراد اسلام ہے فتعارضا۔

جواب: اسلام دخولِ جنت کا سبب ہے تو اس حدیث میں سبب کو اور پہلی حدیث

میں مُسبّب کو ذکر کیا۔ فائدہ دفع التعارض۔ اس روایت کی مکمل بحث مشکوٰۃ شریف ص۲۷ ج۱ فصل اوّل بابُ الاعتصام حدیث جابرؓ میں گذر چکی ہے۔

وَعَنْ اَبِیْ رَافِعٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا اُلْفِیَنَّ اَحَدَکُمْ مُتَّکِئًا عَلٰی اَرِیْکَتِہٖ یَاْتِیْہِ الْاَمْرُ مِنْ اَمْرِیْ مِمَّا اَمَرْتُ بِہٖ اَوْ نَھَیْتُ عَنْہُ فَیَقُوْلُ لَا اَدْرِیْ مَا وَجَدْنَا فِیْ کِتَابِ اللّٰہِ اِتَّبَعْنَاہُ۔

ترجمہ: روایت ہے حضرت ابو رافعؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ نہ پاؤں تم میں سے کسی ایک کو کہ مسہری پر تکیہ لگائے ہوئے ہو کہ اس کے پاس میرے احکام میں سے جس کا میں نے حکم دیا یا جس میں نے منع کیا کوئی حکم پہنچے اور وہ کہدے کہ ہم نہیں جانتے جو قرآن شریف میں پائیں گے ہم اس کی پیروی کریں گے۔

قولہٗ لَا اُلْفِیَنَّ۔ یہ نفی بمعنیٰ نہی کے ہے اور اس قسم کی نہی بہت زور دار اور مؤثر ہوتی ہے۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ نفی ایسی ہے جیسے باپ اپنے بیٹے کو کہتا ہے کہ تم کو بازار میں نہ دیکھوں۔

قولہٗ مُتَّکِئًا۔ ای مُسْتَنِدًا یعنی ٹیک لگانے والا، سہارا کرنے والا۔ اور یہ احدکم سے حال ہے۔

قولہٗ علیٰ اَرِیْکَتِہٖ۔ بمعنیٰ مُزیّن تخت۔ محدّثین حضرات نے متکئًا علیٰ اریکتہ کے دو مطلب بیان فرمائے ہیں۔

اوّل کنایہ ہے عیش وعشرت وراحت سے اور اس سے انکارِ حدیث کی طرف اشارہ ہے کہ جس وقت یہ لوگ ترفّع وتنعّم میں ہوں گے تو انکارِ حدیث کریں گے کیونکہ حدیث نبوی ان پر قیودات لگاتی ہے جب کہ وہ لوگ تو ہر چیز میں آسانی وسہولت پسند کرتے ہیں اور حدیث پر عمل کرنے سے ان پر تنگی ہوگی۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس سے آرام طلب لوگ مراد ہیں کیونکہ حدیث حاصل کرنے میں بہت مشقّت برداشت کرنا پڑتی ہے۔

اور دور دراز کا سفر کرنا پڑتا ہے۔ تو جو ان مشقتوں سے کنارہ کشی کرتا ہے وہ آرام سے بیٹھے بیٹھے کہتا رہتا ہے اب حدیث کی ضرورت نہیں ہے قرآن ہی کافی ہے۔

دوم: مذکورہ جملہ کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص ازراہِ غرور و تکبر بے فکر ہو کر بیٹھا نہ رہے اور نہ طلبِ علم و حصولِ حدیث میں کوتاہی کرے، اور نہ دینی علوم کو ترک کرے اور ازراہِ جہالت و نادانی میرے کسی ایسے حکم کے بارے میں جو قرآن مقدس میں صراحت کے ساتھ موجود نہ ہو یہ نہ کہنے لگے کہ کتاب اللہ کے علاوہ میں اور کچھ نہیں جانتا اور نہ اس کے سوا کسی دوسری چیز کی پیروی کرتا ہوں۔ لہٰذا اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان جاہل اور متکبر و بے فکرے لوگوں کے بارے میں پیش گوئی فرمادی ہے۔

قولہ لا ادری۔ ای غیر القرآن اصل عبارت تھی" ای لا الفین احدکم والحال انہ متکئ ویأتیہ الامر فیقول لا ادری۔

یقول ابوالاسعاد: ظاہراً یہ نعرہ بہت اچھا و دلفریب ہے مگر حقیقت میں اس کے اندر زہر بھرا ہوا ہے۔ کیونکہ حدیث کے انکار سے قرآن کا انکار لازم آتا ہے۔

خلاصۃ الحدیث: حدیث پاک کے مذکورہ جملہ کا مقصد یہ ہے کہ وہ لوگ یہ خیال کریں گے کہ دین و شریعت کے احکام و مسائل صرف قرآن ہی میں منحصر و مذکور ہیں۔ حالانکہ وہ عقل کے اندھے یہ نہیں جانتے کہ بہت سے مسائل و احکام قرآن مجید میں موجود نہیں ہیں وہ صرف حدیث میں صراحت کے ساتھ ذکر کیئے گئے ہیں۔ اسی لیے علماء اہلِ سنت والجماعۃ کا عقیدہ یہ ہے کہ جس طرح احکام شرائع کے لیے قرآن دلیل و حجت ہے اسی طرح حدیث بھی دلیل و حجت ہے کیونکہ جس طرح قرآن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ہے اسی طرح احادیث کے علوم و معارف بھی بارگاہِ الوہیت ہی سے نازل ہوئے ہیں اور دونوں وحی ہیں۔

وَعَنِ الْمِقْدَادِ بْنِ مَعْدِيكَرِبَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلَا اِنِّيْ اُوْتِيْتُ

ترجمہ: روایت ہے حضرت مقدام بن معدیکرب سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آگاہ ہو کہ مجھے قرآن

الْقُرْآنَ وَمِثْلَهُ مَعَهُ اَلَا يُوْشِكُ رَجُلٌ شَبْعَانُ عَلٰى اَرِيْكَتِهٖ يَقُوْلُ عَلَيْكُمْ بِهٰذَا الْقُرْآنِ

بھی دیا گیا اور اس کے ساتھ اس کا مثل بھی خبردار قریب ہے کہ ایک پیٹ بھرا اپنی مسہری پر کہے کہ صرف قرآن کو تھام لو۔

قَوْلُهٗ اَلَا اِنِّیْ ۔ اَلَا حرفِ تنبیہ اور اِنَّ حرف تحقیق ہے اور جملہ اسمیہ لاکر اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مابعد میں جو بات بتائی جارہی ہے وہ نہایت اہم اور مہتم بالشان ہے اس میں سُننے اور عمل کرنے پر پوری توجہ چاہیئے۔

قَوْلُهٗ وَمِثْلَهُ مَعَهُ ۔ قرآن کا مثل حدیث ہے یعنی جس طرح قرآن مجھ پر نازل کیا گیا ہے اسی طرح حدیث بھی مجھے بارگاہِ الوہیت سے عطا ہوئی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ قرآن وحی ظاہر ہے جو متلو بھی ہے اور حدیث وحی باطن ہے جو وحی غیر متلو ہے مگر واجب العمل دونوں ہیں۔ حدیثِ پاک کی تائید قرآن مُقدس کی اس آیت سے ہوتی ہے " وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (پ۱ بقرہ)

سوال : قرآن مُقدس قطعی ہے اور حدیث پاک ظنی ہے تو مثل کس طرح فرمایا؟

اس کے مختلف جوابات بیان فرمائے گئے ہیں :۔

جواب اوّل : یہ ہے کہ یہاں مثل اثبات حکم کے اعتبار سے کہا گیا کہ جس طرح قرآن سے احکام ثابت ہوتے ہیں۔ حدیث پاک سے بھی اسی طرح ثابت ہوتے ہیں۔

جواب دوّم : مثل بعض احادیث کے اعتبار سے کہا گیا ہے نہ کہ کل کے اعتبار سے اور احادیث ہیں سے بعض احادیث متواترہ ہیں اس کا منکر کافر ہے جس طرح قرآن کریم کا منکر کافر ہے۔

جواب سوم ۔ یقول ابوالاسعاد : امام غزالیؒ نے مستصفیٰ میں فرمایا ہے کہ صحابہ کرامؓ کے لیے کل حدیثیں قطعی ہیں کیونکہ وہ حضرات بالمشافہ حضور پرنور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے سنتے تھے اس لیے کسی قسم کا شک وشبہ نہ تھا جب کہ ہمارے لیے کثرت وسائط کی وجہ سے ظنی ہوگئیں تو مثل صحابہ کرامؓ کے اعتبار سے کہا گیا۔

قَوْلُهٗ يُوْشِكُ : بکسر الشین ای یَقْرُبُ یعنی قریب ہے۔

قولہٗ شَبْعَانُ ۔ بغیر تنوین شبع کا اطلاق کثرت اکل پر ہوتا ہے اور کثرت اکل تنعُّم اور غرور مال وجاہ سے پیدا ہوتا ہے تو گویا کہ کنایہ ہے بدفہمی سے ۔ چنانچہ کثرتِ اکل بدفہمی وبلادت کا سبب ہوتی ہے ۔

قولہٗ عَلٰی اَرِیْکَتِہٖ ۔ کنایہ ہے تکبّر اور غرور و مال وجاہ سے جو طلبِ علم سے مانع اور انکارِ حدیث کا باعث ہوتا ہے ۔

یقول ابو الاسعاد : نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دو لفظوں " شبعان علٰی اَرِیْکَتِہٖ " سے انکار حدیث کی طرف اشارہ فرمایا ہے کیونکہ موصوف بالصفت پر حکم لگانے سے وہی صفت اس حکم کی عِلت ہوا کرتی ہے کیونکہ کثرت طعام سے سیر شکم آدمی مراد ہے ۔ جو مانع عن العلم ہے اس لیے کہ حدیث پاک کے لیے محنت عظیمہ اٹھانی پڑتی ہے جب کہ کثرتِ طعام سے سُستی اور کاہلی پیدا ہوتی ہے ۔

لہٰذا شَبْعَانُ عَلٰی اَرِیْکَتِہٖ والا محنت نہیں کر سکتا ۔ عند البعض اس سے بڑے بطن والا مراد ہے اور وہ ترفع وتنعم میں کرسی پر متکبرانہ بیٹھے گا ، اور عموماً بڑے پیٹ والا بلید و کند ذہن ہوتا ہے ۔ حدیث سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی ۔ بنا بریں انکارِ حدیث کرتا ہے جیسا کہ مقولہ مشہور ہے " اَلنَّاسُ اَعْدَاءٌ لِمَا جَهِلُوْا "۔

قولہٗ عَلَیْکُمْ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ ۔ ای اَلْزِمُوْا وَاعْمَلُوْا بِهٖ وَلَا تَلْتَفِتُوْا اِلٰی غَیْرِہٖ یعنی بس قرآن ہی کافی ہے ہمیں کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ۔ بظاہر یہ نعرہ بڑا دلفریب ہے ۔ لیکن حقیقۃً دینی لحاظ سے تباہ کن ہے ۔

قولہٗ مَا وَجَدْتُّمْ فِیْهِ ۔ ای فی القرآنِ ۔

قولہٗ اَلَا لَا یَحِلُّ ۔ یہاں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور مثال کے ایسے شرعی مسائل بیان فرمائے ہیں جو قرآن مُقدس میں صراحۃً مذکور نہیں اور نہ ان کی حرمت مذکور ہے ۔ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی آکر ان کی حرمت بیان کی ہے اور اس حرمت پر امت کا اتفاق ہے ۔ یعنی ثابت بالسُّنۃ ہیں ۔

قولہٗ حِمَارُ الْاَهْلِیِّ ۔ یہ مثالِ اوّل ہے ۔ ان میں پہلا حمار اھلی ہے یعنی اہلی گدھا اور اہلی گدھا اسے کہتے ہیں جو گھر میں رہتا ہے اور اسے کام کاج میں استعمال کیا جاتا ہے اور

یہ حرام ہے۔ اس کے مقابل حمارِ وحشی ہے یعنی وحشی گدھا جسے گورخر کہتے ہیں یہ حلال ہے۔ یعنی منکرینِ حدیث کو چاہیے کہ گدھوں پر ہاتھ صاف کریں کیونکہ انہیں قرآن مقدس نے حرام نہیں کیا بلکہ حدیث پاک نے کیا ہے۔

قولہٗ وَلَا کُلُّ ذِیْ نَابٍ مِنَ السَّبَاعِ ۔ نَاب اَنیاب سے بمعنی ڈاڑھ ۔ سباع بمعنی جانور یعنی کچلی رکھنے والے جانور۔ مقصد یہ ہے کہ ایسے جانور جو ڈاڑھ سے شکار کرتے ہیں اور شکار کو پھاڑتے ہیں جیسے بھیڑیا، شیر، کتا وغیرہ یہ بھی حرام ہیں ان سب کی حرمت حدیث پاک سے ثابت ہے۔ یہ مثال ثانی ہے۔

قولہٗ وَلَا لُقْطَۃُ مُعَاھِدٍ ۔ بضم اللام وفتح القاف ای مِمَّا ضَاعَ مِنْ شخصٍ بسقوطٍ اَوْ غفلۃٍ ۔ یعنی کوئی چیز غفلت کی وجہ سے گر جائے یا ضائع ہو۔ مُعاھِد اس کافر کو کہتے ہیں کہ جس کے ساتھ مسلمانوں کا معاہدہ صلح وامان ہو خواہ وہ کافر ذمی ہو یا غیر ذمی اس کے بارے میں فرمایا کہ اس کی گری ہوئی چیزیں بھی استعمال کرنا حرام ہے۔

سوال ۔ مُعاہد کی تخصیص کیوں کی یہ تو ہر ایک کے نزدیک مُسلّم بات ہے کہ دوسرے کے ملک میں بغیر اجازت تصرُّف ممنوع ہے مُسلم ہو یا غیر مسلم؟

جواب اوّل : لفظ معاہد میں اضافت للتخصیص کافر حربی کے اعتبار سے ہے مسلمانوں سے تخصیص کرنے کے لیے نہیں ہے کیونکہ مسلمانوں کا لقطہ تو بطریق اولیٰ حرام ہونا چاہیے۔

جواب دوم : یہ تخصیص احوال مخاطبین کے اعتبار سے ہے کیونکہ اس وقت مسلمانوں کے لقطہ کو لوگ حرام قرار دیتے تھے اور معاہدوں اور ذمیوں کے لقطہ کو غنیمت قرار دے کر حلال سمجھتے تھے اس لیے تاکید فرمائی کہ وہ بھی مسلمانوں کے لقطہ کی طرح حرام ہے۔

اشیاءِ ملقوطہ کا شرعی حکم

یقول ابوالاسعاد : مختصراً عرض ہے کہ عام طور پر اشیاءِ ملقوطہ کا یہ حکم بیان کیا گیا ہے کہ ایک سال تک اعلان کیا جائے مگر یہ اس زمانے کے لیے ہے جب کہ خبر رسائی کے ذرائع دشوار تھے۔ اب جب کہ ذرائع مواصلات کے ذریعہ خبر رسائی آسان ہوگئی ہے تو اب ایک

سال تک اعلان کرنا ضروری نہیں بلکہ اتنے دن اعلان کرے کہ اس کو یقین ہو جائے کہ اگر کوئی مالک ہوتا تو ضرور آنکلتا۔ اب اگر کوئی مالک نہ نکلے تو شوافعؒ کے نزدیک ملتقط کو اختیار ہے چاہے خود استعمال کرے یا کسی کو دیدے خواہ غریب ہو یا تونگر۔ احنافؒ کے نزدیک اگر خود فقیر ہو تو کھا سکتا ہے ورنہ کسی فقیر کو صدقہ کردے ہاں اگر لقطہ ایسی چیز ہے جس سے اس کا مالک بے نیاز و بے پرواہ ہو۔ جیسے گٹھلی چھلکا، گاجر، مولی یا ایسی ہی کوئی حقیر چیز ہو تو اس کو لے لینا جائز ہے۔ مزید تفصیل کتاب اللقطہ میں آئے گی۔

قولہ اِلَّا اَنْ یَّسْتَغْنِیَ عَنْهَا صَاحِبُهَا : جب اس کا مالک اس سے مستغنی ہو جاوے۔ استغناء کی تین صورتیں ہیں۔ ۱ اعلان کے بعد کوئی مالک نہ نکلے ۲ مالک خود اس کو دیدے یعنی ہبہ کی شکل ہو ۳ اتنی حقیر چیز ہو کہ مالک اس کی تلاش میں نہ ہو۔

قولہ وَمَنْ نَزَلَ بِقَوْمٍ فَعَلَيْهِمْ اَنْ يَّقْرُوْهُ ۔ جو شخص کسی قوم کا مہمان ہو اس قوم پر لازم ہے کہ اس کی مہمانی کریں اگر وہ مہمانی نہ کریں تو اس شخص کے لیے یہ اجازت ہے کہ وہ بغیر اذن مہمانی کے مانند ان سے وصول کرے۔

قولہ اَنْ يُّعْقِبَهُمْ : ای یأخذھم کہ زور سے چھین لے۔

خُلاصۃ الجملہ : یعنی یہ مسئلہ بھی قرآن مقدس میں نہیں ہے۔ حدیث میں ہے خیال رہے کہ اس زمانہ میں دیہاتی کفار سے یہ عہد لیا تھا کہ اگر لشکرِ اسلام یا کوئی مسلمان تمہارے گاؤں پر گزرے تو تم اسے ایک دو وقت کا راشن دینا۔ اس معاہدہ کے ماتحت لشکرِ اسلام کو اپنا راشن ان سے وصول کرنے کا حق تھا۔ حدیث میں اس کا ذکر ہے اب بھی بعض ہنگامی حالت میں لشکر یا پولیس کا خرچ اہل شہر پر ڈال دیا جاتا ہے اس صورت میں یہ حدیث غیر منسوخ ہے۔ اب بھی اگر کفار سے یہ معاہدہ ہو جائے تو ان پر اس کی پابندی لازم ہوگی۔

ضیف کی ضیافت کا مسئلہ

اس بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے کہ مہمان کی مہمانی واجب ہے یا مستحب ہے؟ چنانچہ اس بارے میں فقہاء کے دو مسلک ہیں۔ اوّل: امام احمد بن حنبلؒ اور امام لیثؒ کے

نزدیک ضیف کی ضیافت واجب ہے۔
دلیل حنابلہ : حدیث باب ہے جسے بزورِ طاقت بھی اپنے حقے وصول کرنے کا حکم ہے۔
دوم : جمہور حضرات کے نزدیک مہمان کی مہمانی سنت یا مستحب ہے۔
دلائلِ جمہور : دلیل اوّل : قال اللہ تعالیٰ عزّوجلّ فی الکلام المجید
" یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوْا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّا اَنْ تَکُوْنَ تِجَارَۃً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْکُمْ (پ۵ نساء)
دلیل دوم : حدیثِ مشہور:
" لَا یَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ مُّسْلِمٍ اِلَّا عَنْ طِیْبِ نَفْسٍ (نہیں حلال مالِ مسلم کا استعمال مگر برضاء ورغبت) مرقات ص۲۳۸ ج ا)
دلیل سوم : وَعَنْ اَبِیْ شُرَیْحٍ الْکَعْبِیْ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ کَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْیُکْرِمْ ضَیْفَہٗ جَائِزَتُہٗ یوم ولیلۃ (مشکوٰۃ شریف ص۳۶۸ ج ۲ باب الضیافۃ)
اور جائزہ کے معنیٰ ہدیہ کے ہیں اور ہدیہ واجب نہیں ہوتا۔
جہاں تک حنابلہؒ کے مستدل حدیث باب کا تعلق ہے تو محدثین حضراتؒ نے اس کے مختلف جواب دیے ہیں۔
جواب اوّل : یہ حدیث اہلِ ذمہ کے متعلق ہے جن پر اہلِ اسلام کی مہمانی بمقتضائے معاہدہ ضروری ہے۔
جواب دوم : یہ حدیث مضطر کے بارے میں ہے جو شدتِ بھوک کی وجہ سے موت کے قریب پہنچ چکا ہو۔
جواب سوم : یہ حدیث منسوخ ہے اور ناسخ اس سے آئندہ حدیث ہے۔
" وَلَا اُکُلُ ثَمَارَھُمْ اِذَا اَعْطُوْکُمُ الَّذِیْ عَلَیْھِمْ "
یقول ابوالاسعاد : نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی قوم سے معاہدہ فرماتے تو اس وقت یہ شرط ہوتی کہ میرے مجاہدین تمہارے پاس سے گذریں اور تمہارے مہمان ہوں تو تم پر ان

کی مہمان داری ضروری ہو گی اگر نہ کرو گے تو تمہارے ساتھ یہ سلوک کیا جائے گا۔ پھر جب مسلمانوں کی حالت اچھی ہو گئی اور اطراف و اکناف میں بہت سے افراد مسلمان ہو گئے اور ذمیوں کے پاس مہمان ہونے کی ضرورت نہ رہی تو یہ حکم منسوخ ہو گیا۔

وَعَنِ الْعِرْبَاضِ بْنِ سَارِيَةَ قَالَ قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَيَحْسَبُ اَحَدُكُمْ مُتَّكِئًا عَلٰى اَرِيْكَتِهٖ يَظُنُّ اَنَّ اللّٰهَ لَمْ يُحَرِّمْ شَيْئًا اِلَّا مَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ۔

ترجمہ: روایت ہے حضرت عرباض بن ساریہ سے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام فرما کر فرمایا کیا تم میں سے کوئی تخت پر تکیہ لگا کر یہ گمان کر سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بجز ان چیزوں کے کوئی چیز حرام نہ کی جو قرآن میں ہیں۔

قولہٗ قَامَ: حدیث پاک میں لفظ قام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مراد وعظ و تقریر کے لیے قیام مراد ہے۔

قولہٗ يَظُنُّ۔ يَظُنُّ کا عطف يَحْسَبُ پر عطف تفسیری ہے۔

قولہٗ كَمِثْلِ الْقُرْاٰنِ: اِنَّهَا کا ضمیر اشیاء مذکورہ کی طرف ہے جن کا بیان ہو رہا ہے قرآن کے مثل یا مقدار میں ہے یا قابل عمل ہونے میں۔ مزید بحث قد مر انفاً۔

قولہٗ اَوْ اَكْثَرُ: اکثر اس لیے فرمایا کہ بعض دفعہ قرآن پاک کی کسی آیت میں اجمال ہوتا ہے، تفصیل حدیث پاک میں ہوتی ہے۔ جیسے واقعہ ہے۔ باقی حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا " اَوْ اَكْثَرُ " فرمانا شک کے لیے نہیں بلکہ تيقّن پر محمول ہے۔ کیونکہ حضور علیہ السلام کا علم وقتاً فوقتاً ترقی پذیر تھا، کبھی مکاشفہ ہو رہا ہے کبھی الہام، کبھی وحی۔ ولہذا یہ الفاظ زیادتی والے درست ہیں۔

قولہٗ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمْ يُحِلَّ لَكُمْ: وَاِنَّ اللّٰهَ لَمْ يُحِلَّ الخ سے آخر تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چند احکام بیان فرمائے ہیں۔ اور یہ احکامات قرآن مقدس میں نہیں ہیں میں ہی تمہیں بتلا رہا ہوں اور ان پر عمل کرنا ضروری ہے۔ ان احکامات سے یہ کہ کر اعراض نہیں کیا جا سکتا کہ یہ چونکہ قرآن میں موجود نہیں ہیں اس لیے واجب العمل بھی نہیں۔

قولہٗ اَنْ تَدْخُلُوْا بُیُوْتَ اَھْلِ الْکِتَابِ : یہاں ایام جاہلیت کی بری عادتوں سے پرہیز کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے کیونکہ عرب کی عام عادت تھی کہ اپنے ماتحت لوگوں کے گھروں میں بغیر اجازت داخل ہو کر ان کی عورتوں کے ساتھ بدسلوکی کرتے اور ان کے مالوں میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کرتے تھے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بری عادتوں کو دور کرنے کے لیے فرمایا کہ ذمیوں کی عزت و آبرو اور ان کے حقوق مسلمانوں کی عزت و آبرو و حقوق کے مانند ہیں۔

سوال ۔ یہ حکم تو عام ہے مسلم ہو یا غیر مسلم کسی کے گھر میں بغیر اجازت داخل ہونا شرعاً منع ہے

جواب اوّل ۔ اہل کتاب کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ عموماً مسلمانوں کے دلوں کے اندر ان کی نفرت ہے شاید اس بنا پر ان کا خیال نہ کریں اور گھر میں داخل ہو کر ایذا پہنچائیں۔

جواب دوم : عند البعض اہل کتاب کی قید اس لیے لگائی کہ مشرکین عرب سے جزیہ قبول نہیں کیا جاتا ان کے لیے دو صورتیں ہیں۔ (۱) قتال (۲) اسلام۔

قولہٗ وَلَا ضَرْبَ نِسَآئِھِمْ ۔ ای ضَرْبًا شَدِیْدًا ، خفیف کی اجازت ہے اگر اصلاح کے لیے ہو۔ نساء سے اہل کتاب کی نساء مراد ہیں۔ ان کی تخصیص کی وجہ بھی وہی ہے جو اہل کتاب کے لفظ کی ہے۔

قولہٗ رواہ ابوداؤد : آخر روایت میں لفظ رواہ کے بعد مشکوٰۃ شریف کے اصل نسخہ میں جگہ خالی ہے اس لیے کہ صاحب مشکوٰۃ کو اس حدیث کے راوی کا علم نہ ہو سکا ہو گا لیکن بعد میں میرک شاہ (جو شارح مشکوٰۃ ہے) نے مذکورہ عبارت لکھ دی ہے۔

اسمائے رجال

حالات حضرت عرباض بن ساریہؓ

آپ صحابی ہیں آپ کے والد ساریہ کی کنیت ابو نجیح تھی۔ حضرت عرباض اصحاب صفہ میں سے تھے، شوق الٰہی اور خوف الٰہی اپنے دل میں بہت رکھتے تھے۔ شام میں قیام کیا اور ۷۵ھ میں وہیں وفات پائی۔ آپ سے ۳۱۔ احادیث مروی ہیں حمص میں آپ کا مزار پر انوار ہے ان سے ابو امامہؓ اور ایک تابعینؒ کی جماعت روایت کرتی ہے (نجیح نون کے زبر جیم کے زیر اور حائے مہملہ کے ساتھ ہے)

وَعَنْہُ قَالَ صَلّٰی بِنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ذَاتَ یَوْمٍ ثُمَّ اَقْبَلَ عَلَیْنَا بِوَجْہِہٖ فَوَعَظَنَا مَوْعِظَۃً بَلِیْغَۃً ذَرَفَتْ مِنْہَا الْعُیُوْنُ وَوَجِلَتْ مِنْہَا الْقُلُوْبُ :

ترجمہ : روایت ہے انہی سے فرماتے ہیں کہ ایک دن ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی پھر ہماری طرف چہرہ کیا اور نہایت بلیغ وعظ فرمایا جس سے اشک رواں ہوگئے دل ڈر گئے۔

قولہٗ ذَاتَ یَوْمٍ : اس روایت میں مطلقاً یوم کا ذکر ہے اور نماز کے وقت کا ذکر نہیں مگر دوسری روایت میں ہے کہ وہ عصر کی نماز تھی اور اس وقت کے انتخاب کی وجہ کیا تھی صراحۃً معلوم نہیں۔

یقول ابوالاسعاد : البتہ یہ وجہ ممکن ہے کہ اس وقت آپ پر ایک خاص کیفیت طاری ہوئی تھی کہ یہ دن کا آخری حصہ ہے فرشتے یومیہ اعمال آسمان پر لے جا رہے ہیں۔ بناء بریں آپ نے آخری وصیت فرمائی۔ یہی وجہ ہے کہ آذان صلوٰۃ مغرب کی مخصوص دعا کی آپ نے تعلیم دی جس میں خصوصی طور پر ادبار نہار اور اقبال لیل پر مغفرت کا سوال ہے :۔

"عَنْ اُمِّ سَلَمَۃَ قَالَتْ عَلَّمَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ علیہ اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْ اَقُوْلَ عِنْدَ اٰذَانِ الْمَغْرِبِ اَللّٰھُمَّ اِنَّ ھٰذَا اٰلَا ذَانُ اِقْبَالُ لَیْلِكَ وَ اِدْبَارُ نَهَارِكَ وَاَصْوَاتُ دُعَائِكَ فَاغْفِرْلِیْ (ابوداؤد شریف ص۷۸ ج۱ باب مَایقول عِنْدَ اٰذانِ المغرب)

قولہٗ اَقْبَلَ عَلَیْنَا بِوَجْہِہٖ : اقبال سے وجہ والی بات سمجھ آرہی تھی بس تاکید کے لیے بوجہہ کو ذکر کیا۔

قولہٗ بَلِیْغَۃً : محدثین حضرات نے اس کے دو معنیٰ ذکر فرمائے ہیں :۔

اوّل : بَلِیْغَۃً بمعنٰی اشد فی الانذار والتخویف۔

دوم : قلیلۃ اللفظ وکثیر المعنٰی الفاظ مختصر مگر معانی بہت تھے، انذار کے تمامی پہلو موجود تھے کما فی قولہٖ تعالیٰ " (وَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا بَلِيْغًا پ۵) نساء :

یوں تو حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کے تمامی وعظ ہی مؤثر ہوتے تھے لیکن خصوصیت سے یہ وعظ بہت پر تاثیر تھا جس میں عشقِ خدا خوفِ کبریا کا دریا موجیں مار رہا تھا۔

قولہٗ ذَرَفَتْ مِنْهَا الْعُيُوْنُ : ذرفت بفتح الراء ای دَمَعَتْ وسالت دموع العیون اور یہ کلام مبالغۃً فرمائی ہے۔ کیونکہ آنکھ تو نہیں بہتی بلکہ آنسو ہی بہتے ہیں۔ (کما فی قولہٖ تعالیٰ" تَرٰی اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا")

قولہٗ وَوَجِلَتْ مِنْهَا الْقُلُوْبُ وَجِلَتْ بکسرِ الجیم ای خافت یعنی دلوں میں خوف پیدا ہوگیا اور دل ڈر گئے۔ کما فی قولہٖ تعالیٰ" اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ" پ۹ انفال)

سوال ۔ یہ ہے کہ ذَرَفَتْ مِنْهَا الْعُيُوْنُ والا جملہ بعد میں ہونا مناسب تھا اور وَجِلَتْ مِنْهَا الْقُلُوْبُ پہلے ہونا چاہیے تھا کیونکہ اثر پہلے دل پر ہوتا ہے اور آنکھ پر بعد میں اثر ظاہر ہوتا ہے جب کہ یہاں تقلیب ہے۔

جواب ۔ یہ ہے کہ دل کی خبر تو کسی کو نہیں آنکھ کے آنسو سے اس کے اثر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اس لیے اس کو مقدم کیا۔

قولہٗ مَوْعِظَةُ مُوَدِّعٍ ۔ اس کو دو طریقوں سے پڑھا گیا ہے۔

اوّل : مُوَدِّعٍ ۔ بکسر الدال بمعنی الوداع کہنے والے کے کہ ایسا بلیغ وعظ کیا کہ لگتا ہے کہ آپ ہمیں چھوڑ کر جا رہے ہیں۔

دوّم : مُوَدَّعٍ ۔ بفتح الدال بمعنی امانت رکھا ہوا کہ ایسا بلیغ وعظ فرمایا کہ واقعی امانت کے قابل ہے کہ اس کو محفوظ کر کے رکھیں۔

سوال ۔ تشبیہ کس بات میں ہے ؟

جواب ۔ جب کوئی رخصت ہونے والا نصیحت کرتا ہے تو جتنی ضروری باتیں ہوں اور دارین میں فائدہ مند ہوں تو ان کو نہایت اخلاص کے ساتھ مختصر الفاظ میں بیان کرتا ہے اور بیان میں یہ کوشش کرتا ہے کہ کوئی پہلو تشنہ نہ رہ جائے۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وعظ بھی ایسا تھا۔ اس لیے اس کے ساتھ تشبیہ دی۔

قولہٗ اُوْصِيْكُمْ بِتَقْوَى اللّٰهِ : یہ جملہ جوامع الکلم میں سے ہے اس لیے کہ اس

ایک کلمہ میں دین کے تمامی مأمورات ومنہیات آگئے کیونکہ تقویٰ کی اجمالی تعریف یہ ہے :-
امتثال المأمورات واجتناب المنہیات : اسی لیے حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں :-
رأس الدین التقوٰی۔ وللتقوٰی مراتب۔ ۱ الاتقاء عن الشرك ۲ الاتقاء عن الکبائر ۳ الاتقاء عن السیئات ۴ الاتقاء عن الشبہات ۵ الاعراض عمّا سوی اللہ تعالٰی۔

درجہ ۵ عام لوگوں کے لیے نہیں بلکہ خواصِ امّت انبیاء وصدّیقین کے لیے ہے۔

یقول ابوالاسعاد : حافظ ابن کثیرؒ نے حضرت اُبَیّ بن کعبؓ سے تقوٰی کی جو تعریف نقل کی ہے وہ سب سے جامع ہے وہ یہ کہ ایک دن حضرت عمرؓ نے اُبَیّ بن کعبؓ سے تقوٰی کے بارے میں دریافت فرمایا تو حضرت ابی بن کعبؓ نے فرمایا کہ جب تم کسی کانٹے دار جنگل میں چلو گے تو کس طرح چلو گے تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اس طرح دامن سمیٹ کر چلوں گا کہ ایک کانٹا بھی نہ لگے تو حضرت اُبَیّ بن کعبؓ نے فرمایا کہ تقوٰی یہی ہے کہ دین پر اس طرح چلا جائے کہ غیرِ دین کا ایک کانٹا بھی نہ لگنے پائے۔

قولہٗ والسّمع : اس کا تعلّق خلیفہ کی کلام کے ساتھ ہے۔

قولہٗ والطاعۃ : اس کا تعلق خلیفہ کی فرمانبرداری کے ساتھ ہے۔

قولہٗ وَاِنْ کَانَ عَبْدًا حَبَشِیًّا : یہ حقارت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ عرب میں عبد کی کوئی قدر وقیمت نہ تھی، پھر عبد بھی حبشی یہ اور زیادہ قباحت ہے۔

سوال : یہ کہ خلیفہ بننے کے لیے تو حریت شرط ہے جب کہ آپ عبد حبشی فرما رہے ہیں۔

جواب : یہ کہ مبالغہ کے طور پر فرمایا ہے یعنی عبد سے نفس عبد نہیں بلکہ عبد سے نالائق کم فہم اور کم عقل مراد ہے اور حبشی سے بد شکل اور بد صورت سیاہ مراد ہے مطلب یہ کہ اگر امیر بد صورت وبد شکل اور نالائق ہو یعنی نہ ظاہری کمال ہے اور نہ باطنی کمال، تب بھی فتنہ وفساد نہ کرکے مان لینا چاہیے تاکہ مسلمانوں کی اجتماعیت برقرار رہے لیکن واضح ہو کہ یہ اطاعت اس وقت ہے جب کہ اللہ تعالیٰ کی معصیت نہ ہو اگر معصیت کا پہلو ہو تو پھر اطاعت ضروری نہیں بلکہ جائز ہی نہیں (کما فی قولہ علیہ السلام "لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق")

سوال : حدیث پاک میں ہے "اَلْاَئِمَّۃُ مِنْ قُرَیْشٍ یا الخِلَافَۃُ للقریش کہ امامت

وخلافت قریشیوں کا حق ہے، پھر یہاں کیسے فرمایا" وَاِنْ کَانَ عَبْدًا حَبْشِیًّا "

جواب : یہ مُکْرَہٗ کے حق میں ہے یعنی غلام کو امیر نہیں بنانا چاہیے جیساکہ ابھی حدیث گذری ہے" الائمۃ من قریش " لیکن اگر زبردستی بن جائے تو مان لینا چاہیے۔

قولہٗ فَسَیَرٰی اِخْتِلَافًا کَثِیْرًا ۔ ای من ملل کثیر یعنی بہت مذہب پیدا ہوجائیں گے ہرایک کے اعتقادات دوسرے کے خلاف ہوں گے اس سے اشارہ فرمایا اہل بدعت اوراہل ہوا کے ظہور کی طرف۔

قولہٗ : عَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّۃِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ : جملہ مذکورسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خاص جماعت کی پہچان کے لیے ضابطہ بیان فرمایاہے۔ بیانِ ضابطہ سے قبل خلفاءِ راشدین کی وضاحت ضروری ہے کہ خلفاءِ راشدین سے کونسی مبارک ہستیاں مراد ہیں۔

ترتیب خُلفاءِ راشدین

یقول ابوالاسعاد : جمہوراہل السنۃ والجماعۃ کے نزدیک خلفاءِ راشدین سے خلفاءِ اربعہ مراد ہیں۔ جن کی ترتیب یوں ہے :۔

افضل الناس بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکرن الصدیقؓ ثم عمرؓ بن الخطاب ثم عثمانؓ بن عفان ثم علیؓ بن ابی طالب لکن واکثرالمعتزلۃ یفضلون علیًّا علی ابی بکرن الصدیقؓ ھٰذا غلطٌ لیس بصحیحٍ :

کیونکہ معتزلہ کا یہ نظریہ حدیث مبارک کے خلاف ہے حدیثِ پاک میں ہے صحابہ کرامؓ فرماتے ہیں کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک کے بعد مقام اور رتبہ میں سیدنا ابوبکر صدیقؓ کو سمجھتے تھے اوران کی ذات کے مقابلہ میں کسی کو شمار نہیں کرتے تھے (عن ابن عمرؓ) قال کنا نقول فی زمن النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا نعدل بابی بکر احدًا ثم عمرؓ الخ وایضًا قال سالمؒ بن عبداللہؓ ان ابن عمرؓ قال کنا نقول

و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حجی افضل امۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعدہ ابوبکرؓ الخ وایضاً عن محمدؒ بن الحنفیۃ قال قلت لابی ای الناس خیر؟ بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ابوبکرؓ الخ :
(ابوداؤد شریف ص۲۸۸ ج۲ باب فی التفضیل) وفی شرح العقائد علی ھذا الترتیب وجدنا السلف کما فی الفقہ الاکبر وشرحہ ص۷۶)

سوال : آپ نے اپنی سنت کے ساتھ خلفاءِ اربعہ کی سنت کو کیوں ملایا یعنی خلفاءِ اربعہ کی سنت کو اپنی سنت کے مقابلہ میں کیوں ذکر فرمایا ؟

جواب اوّل : حضور علیہ السلام کو معلوم تھا کہ یہ خلفاءِ اربعہ میری سنت سے استنباط کرکے جو اجتہاد کریں گے اس میں خطاء نہیں ہوگی اور ان کی رائے بالصواب ہوگی ۔ ومن ھذا الباب قتال ابی بکر بمانعی الزکوٰۃ ۔

جواب دوم : حضور علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اطلاع دی گئی تھی کہ آپؐ کی بعض سنتیں آپؐ کے زمانہ مبارک میں اتنی شائع نہیں ہونگی ۔ جس قدر خلفاء اربعہ کے زمانہ میں ہونگی ۔ ومن ھذا الباب منع عمرؓ عن بیع امہات الاولاد :

سوال : وَرَدَ فِی الحَدِیث انہ علیہ السلام قَالَ یَکون فی اُمتی اِثنا عَشَرَ خَلِیفَۃً جب کہ مقام ہذا پر چار کو کیوں خاص کیا گیا ؟

جواب : تخصیص کی وجہ ان کی تفخیم شان وتصویب رائے وتفوّق کو بیان کرنا ہے اسی وجہ سے تو راشدین المھدیین کی خاص صفت لائے ۔

یقول ابوالاسعاد : علی منہاج النبوت خلافت ان تک خاص رہی ہے اور تخصیص کی وجہ بھی یہی ہے ۔ بعد میں تمام خلافتیں اسلامی خلافت تو کہی جاسکتی ہیں لیکن علی طریقۃ منہاج النبوت نہیں کہی جاسکتیں ۔

قولہٗ عَضُّوا عَلَیْھَا بِالنَّوَاجِذِ ۔ یہ جملہ تَمَسَّکُوا بِھَا کی تاکید ہے عض کا معنیٰ ہوتا ہے منہ میں کوئی چیز داخل کرکے اسے مضبوطی سے پکڑنا ۔ نواجذ جمع ناجذہ ھی الضرس الاخیر ، یعنی آخری داڑھیں اگر ان کے نیچے کوئی چیز آجائے تو بمشکل چھوٹتی ہے ۔ عَضُّوا عَلَیْھَا بالنواجِذِ کو دو باتوں میں تشبیہ دی ہے ۔

اوّل: عمل کرنے میں تشبیہ ہے اس لیے کہ جب کوئی کسی چیز کو مضبوطی کے ساتھ پکڑتا ہے تو دانت کاٹتا ہے۔

دوم: مشقت و تکلیف میں تشبیہ دی ہے کہ اگر سنت پر عمل کرنے میں بہت زیادہ مشقت و تکلیف ہو تب بھی سُنّت پر عمل کرنا مت چھوڑو اور تکلیف برداشت کرو کیونکہ تکلیف کے وقت انسان دانت کاٹتا ہے" كَمَا فِي قَوْلِهٖ تعالىٰ: وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يَا لَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا (پ۱۹ الفرقان)

قولهٗ مُحْدَثَاتُ: بدعت وغیرہ کی مکمل بحث باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ میں ہو چکی ہے۔ مختصراً عرض ہے کہ مُحدثات یعنی ہر نئی چیز سے مراد نئے عقائد ہیں جو اسلام میں حضور علیہ السّلام کے بعد ایجاد ہوئے یا کیے جائیں گے۔ اس لیے کہ یہاں اسے گمراہی کہا گیا۔ گمراہی تو عقیدہ میں ہوتی ہے نہ کہ اعمال میں۔ لہٰذا یہ حدیث اپنے عموم پر ہے اور اگر اس سے نئے اعمال مراد لیے جائیں تو یہ حدیث عام مخصوص منہ البعض ہوگی۔

قولهٗ ولم يذكر الصّلوٰة: اس جملہ کا مقصد یہ ہے کہ اس روایت میں امام ترمذیؒ اور امام ابن ماجہؒ نے نماز پڑھنے کا ذکر نہیں کیا یعنی ان کی روایت میں حدیث کے الفاظ " صَلّٰى بِنَا رسول الله صلّى الله عليه وسلّم مذکور نہیں ہیں بلکہ حدیث وَعَظَنَا مَوْعِظَةً سے شروع ہوتی ہے۔

وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ خَطَّ لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَطًّا ثُمَّ قَالَ هٰذَا سَبِيْلُ اللّٰهِ ثُمَّ خَطَّ خُطُوْطًا عَنْ يَّمِيْنِهٖ وَعَنْ شِمَالِهٖ:

ترجمہ: روایت ہے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے فرماتے ہیں کہ نبی کریم علیہ السّلام نے ہمارے سامنے ایک خط کھینچا پھر فرمایا کہ یہ اللہ کا راستہ ہے پھر اس کے دائیں بائیں اور لکیریں کھینچیں۔

قولهٗ خَطَّ لَنَا: ای خَطًّا مُّسْتَقِيْمًا۔ نبی کریم علیہ السّلام کا خط کھینچنا بطور تمثیل یا بطور تعلیم کے تھا کیونکہ مثال دے کر سمجھانا یہ بہترین طریقہ ہے تفہیم و تعلیم کا۔ چنانچہ قرآن مقدس

امم سابقہ کی مثالوں سے پُر ہے جس کو فارسی میں کہتے ہیں :۔

ع عبارت از نظیر بے نظیر می شود۔

قولہٗ ثُمَّ قَالَ هٰذَا سَبِيْلُ اللهِ : یعنی یہ اللہ تعالیٰ کی راہ ہے۔

سوال : کہ یہ خط تو اللہ پاک کا راہ نہیں ہے۔ حضور علیہ السلام کیسے فرما رہے ہیں " هٰذَا سَبِيْلُ اللهِ :

جواب : مضاف مقدر ہے۔ ای هٰذا مثل سبیل اللہ۔

قولہٗ وَقَرَأَ : قرأت کا تعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات با برکات سے ہے کہ آپ نے بطور استشہاد کے یہ آیت مبارک تلاوت فرمائی " وَيَحْتَمِلُ أَنْ يَرْجِعَ الضمير الى ابن مسعودؓ لیکن بطور حکایت عَنْ قَوْلِ اللهِ تعالیٰ ہوگا۔

یقول ابوالاسعاد : حدیث باب سے دو باتیں سمجھ میں آرہی ہیں :۔

اوّل : خط مستقیم جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے کھینچا تھا وہ راہِ خدا کی مثال ہے جس سے صحیح عقائد اور نیک وصالح اعمال مراد ہیں۔ اور دوسرے چھوٹے اور ٹیڑھے خطوط راہِ شیطان ہیں جن سے گمراہی وضلالت کے راستے مُراد ہیں۔

دوم : اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حق کی راہ صرف ایک راہ ہے جس میں کوئی ناہمواری اور نشیب وفراز نہیں ہے اور گمراہی کی راہیں بہت ہیں اور وہ بھی پُرخم اور پُرپیچ ہیں۔ صرف نفسانی حرص ان کو سیدھا دکھلاتا ہے۔ راہِ مستقیم پر گامزن ہونے میں اگر کوئی اندرونی اضطراب محسوس ہو تو وہ راہ کی ناہمواری نہیں بلکہ چاروں طرف سے دعوت شیطانی کے اثرات ہیں جتنا ادھر کان لگاؤ گے اس اضطراب میں اضافہ ہوتا رہے گا اور جتنا ان سے غافل رہو گے اس قدر اپنے قلب میں اطمینان اور سکون دیکھو گے۔

وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ

ترجمہ : روایت ہے حضرت عبد اللہ بن عمروؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ تم میں سے کوئی اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتا

بِہٖ : | جب تک کہ اس کی خواہش میرے لائے ہوئے کے تابع نہ ہو۔

قولہٗ هَوَاهُ : ای میل نفسہ یعنی میلانیّتِ نفس یا خواہشاتِ نفسانیہ (کما فی قولہ تعالیٰ " اَرَاَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا (پ۱۹ فرقان)

قولہٗ لِمَا جِئْتُ بِهٖ : ای القرآن والحدیث۔

لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ میں کونسی نفی مراد ہے؟

مُحدّثینؒ کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ میں نفی اصل الایمان ہے یا نفی کمال الایمان ہے۔ اس میں دو قول ہیں۔

قولِ اوّل بعض حضرات کے نزدیک نفی اصل الایمان مراد ہے کہ دل سے حضور علیہ السلام کے لائے ہوئے احکامات پر یقین کرے منافقین کی طرح اکراہ وقتل وتلوار کی بناء پر نہ بلکہ کامل اعتقاد کے ساتھ مَا جِئْتُ بِهٖ کے تابع ومقتدی ہو ورنہ وہ مؤمن نہیں لہٰذا اصل ایمان کی نفی ہوئی۔

قولِ دوم علامہ حافظ تورپشتیؒ فرماتے ہیں کہ یہاں اصل الایمان کی نفی مراد نہیں بلکہ کمال ایمان کی نفی مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جیسے اپنی مرغوبات و مألوفات اشیاء سے محبت ہوتی ہے اس طرح نبی کریم علیہ السّلام کے لائے ہوئے دین کو دل وجان سے قبول کرے اور قبول کرتے وقت کسی قسم کی تنگی محسوس نہ کرے بلکہ عمل کرتے وقت دل میں فرحت وخوشی محسوس کرے اور یہ مقام اللہ تعالیٰ کے خاص ومقرب بندوں کو حاصل ہوتا ہے جسے صوفیاء کی اصطلاح میں ولایتِ کبریٰ کہا جاتا ہے ذَالِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ۔ اور یہ مقام اس وقت حاصل ہوتا ہے جب کہ دل میں انجلاء ونورانیّت ہو اور بہیمیّت اور آلائش نفسانیہ ختم ہو جائے تو پھر اعمال شرعیہ کھانے پینے کی طرح مرغوب

ہو جاتے ہیں۔

سوال ۔ نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے خواہش کو مَا جِئْتُ بِہٖ کے تابع ہونے کے مُتعلّق تو کہا بالکل معدُوم و زائل کرنے کے متعلق نہیں فرمایا یعنی تبعًا فرمایا عدمًا کیوں نہیں فرمایا؟

جواب : یقول ابوالاسعاد : تبعًا کے مقابلہ میں عدمًا ممکن نہیں آخر اس جہاں آرار کو بھی تو زیب آرائش بخشی ہے ، ثانیًا عدمًا میں کوئی کمال بھی نہیں ۔ مزا تو تب ہے۔

ع گداخت جاں کہ شود کارِ دل تمام و نشُد ۔ بسُوختیم دریں آرزوئے خام و نشُد

قولہٗ وَقَالَ النَّوَوِیُّ فِی اَرْبَعِیْنِہٖ : بعض روایات میں آیا ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جو کوئی میری اُمّت تک چالیس حدیثیں پہنچا دے ۔ قیامت میں اس کی بخشش ہو گی اسی لیے علمارِ مُحدّثین نے چہل حدیثیں لکھیں ۔ امامِ نوویؒ شارح مُسلم شریف نے بھی حدیثیں جمع فرمائیں جس کا یہاں ذکر ہے تو یہ حدیث بھی اسی میں ہے ۔

وَعَنْ بِلَالِ بْنِ الْحَارِثِ الْمُزَنِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ اَحْیٰی سُنَّۃً مِّنْ سُنَّتِیْ قَدْ اُمِیْتَتْ بَعْدِیْ فَاِنَّ لَہٗ مِنَ الْاَجْرِ مِثْلُ اُجُوْرِ مَنْ عَمِلَ بِھَا مِنْ غَیْرِ اَنْ یَّنْقُصَ مِنْ اُجُوْرِھِمْ شَیْئًا

ترجمہ : روایت ہے بلالؓ بن حارث مُزنی سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جو میری مُردہ سنّت کو جو میرے بعد فنا کر دی گئی زندہ کرے اسے ان تمام کے برابر ثواب ہو گا جو اس پر عمل کریں اس کے بغیر کہ ان عاملوں کے ثواب سے کچھ کم ہو۔

قولہٗ اَحْیٰی : سُنّت کا احیار تو عمل کے ذریعہ ہوتا ہے یا اشاعتِ حدیث کے ذریعہ ہوتا ہے ۔ دونوں طریقوں سے زندہ کرتا ہے۔

قولہٗ اُمِیْتَتْ ۔ ای ترکت تلک السنۃ عن العمل : مرنے کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں نے اس سنّت کو چھوڑ دیا ہے۔

یقول ابوالاسعاد : احیاء کی تین صورتیں ہیں :۔

اوّل : خود عمل کرے اور دوسروں کو بھی عمل کرنے کی ترغیب دے یہ سب سے اعلیٰ وافضل صورت ہے۔

دوّم : دوسری صُورت یہ ہے کہ خود عمل کرے لیکن دوسروں کو کچھ ترغیب نہ دے۔

سوّم : تیسری صُورت یہ ہے کہ خود عمل نہ کرے مگر دوسروں کو عمل کرنے کی ترغیب دے۔ یہ سب سے ادنیٰ صُورت ہے۔

سوال : یہ کہ حدیث پاک کے پہلے جملہ میں کوئی نیا فائدہ نہیں ہے کہ حضرت صلعم فرماتے ہیں کہ جس نے میری سنت زندہ کی یعنی اس پر عمل کیا اس کا اجر اتنا ہے جتنا اس پر عمل کرنے والے کا ہے تو اس میں کونسا فائدہ ہوا۔ کیونکہ جو زندہ کر رہا ہے اس کا حق بھی یہی ہے کہ اس کو اَجر ملے جس طرح عمل کرنے والا ہے تو پھر ان دونوں میں کیا فرق ہوا۔

جواب : اَحیٰ سے مُراد حث الغیر علی العمل ہے کہ صرف دلالت علی الخیر کرتا ہے اور لوگوں کو برانگیختہ کرتا ہے مگر خود عمل نہیں کرتا مگر عمل کرنے کا ثواب مل جائے گا۔

قولہ بِدْعَۃٍ ضَلَالَۃٍ : جب یہ معلوم ہوا کہ ہر بدعت ضلالت ہے پھر علیحدہ ضلالت کی قید کیوں لگائی۔ اشارہ فرمایا کہ شاید بدعتی کسی بدعت کو نیکی سمجھ کر کریں یا حسنات شمار کریں تو ان کا اخراج ہو جائے۔ نیز یہاں بدعت کی جتنی صفتیں لائی گئیں یہ سب صفات کاشفہ ہیں کہ بدعت سرتا پا گمراہی ہے۔ جس پر اللہ ورسول راضی نہیں ہیں اگرچہ بعض نے بدعت حسنہ کو نکالنے کے لیے صفت مقیدہ قرار دیا ہے مگر وہ مجروح ہے۔ باقی اس حدیث کی مکمل بحث مشکوٰۃ شریف صـ ٢٩ ج ا فصل اوّل باب الاعتصام حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں ہوچکی ہے۔

وَعَنْ عَمْرِوؓ بْنِ عَوْفٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ الدِّیْنَ لَیَأْرِزُ اِلَی الْحِجَازِ کَمَا تَأْرِزُ الْحَیَّۃُ اِلٰی جُحْرِھَا۔

اس حدیث کی تشریح مع ترجمہ مشکوٰۃ شریف ص۲۹ ج ا فصل اول کے آخر میں گذر چکی ہے۔

قولہ اِلَی الْحِجَازِ : حجاز عرب کا وہ صوبہ ہے جس میں مکۃ معظمہ، مدینہ منورہ طائف وغیرہ ہیں۔

سوال : فصلِ اول کی آخری حدیث میں لَیَأْرِزُ اِلَی الْمَدِیْنَۃِ جب کہ اس حدیث پاک میں حجاز کا ذکر ہے ؟

جواب : اِنضمام دو قسم ہے ۱ اِنضمام عام۔ انضمام عام تو یہ ہے کہ سارے ملکوں سے نکل کر حجاز میں آئے گا۔ انضمام خاص یہ ہے کہ پھر حجاز بھی نکل کر صرف مدینہ منورہ میں آجائے گا۔ کیونکہ ابتداءً دین کا درخت وہاں سے ہی پیدا ہوا تھا جیسے سانپ سارا دن اور جگہ پھرتا رہتا ہے اور شام کو اپنے سوراخ میں آبیٹھتا ہے۔ (ھٰکذا فی معاملۃ الدین)

قولہ وَلَیَعْقِلَنَّ ۔ ای یَلْتَجِئَنَّ : یعنی پناہ پکڑے گا دین۔

قولہ اُرْوِیَّۃ : بمعنی معز جبلی۔ یعنی پہاڑی بکری جو پہاڑ کی چوٹی پر پناہ پکڑے۔ مثال دینے کا مقصد یہ ہے کہ پہاڑی بکریاں دن بھر ہر جگہ پھرتی ہیں اور شام کو اپنے تھان یعنی پہاڑ کی چوٹی پر باندھ دی جاتی ہیں جہاں وہ درندوں سے محفوظ ہو جاتی ہیں۔ حجاز خصوصًا مدینہ منورہ اسلام کا تھان ہے۔ اس میں اشارۃً یہ فرمایا گیا کہ اسلام حرمین شریفین سے کبھی نہ نکلے گا اور سب مسلمانوں کا تعلق اسی سے قائم رہے گا جیسے سانپ کا تعلق اپنے سوراخ سے اور بکری کا تعلق اپنے تھان سے ہر وقت رہتا ہے۔

قولہ اَفْسَدُ النَّاسِ : فساد سے ترک عمل بالسنۃ بھی مراد ہو سکتا ہے۔ عند البعض فساد کنایہ ہے بدعت کے ایجاد سے سُنّت کے مقابلہ میں بدعات کثیرہ رواج پکڑ چکی ہونگی تو بدعت و رواج پر عمل ہوگا نہ کہ سُنّت پر تو یہی غرباء عامل بالسُّنّۃ ہوں گے۔

وَعَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَیَاْتِیَنَّ عَلٰی اُمَّتِیْ کَمَا

ترجمہ : روایت ہے حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ بن عمرو سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ میری امت پر یقینًا

أُتِيَ عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَائِيْلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ حَتّٰى اِنْ كَانَ مَنْ اَتٰى اُمَّهٗ عَلَانِيَةً لَكَانَ فِيْ اُمَّتِيْ مَنْ يَّضَعُ ذَالِكَ :

ویسے حالات آئیں گے جیسے بنی اسرائیل پر آئے جیسے جوتے کی جوتے سے برابری حتیٰ کہ اگر کسی نے اپنی ماں سے اعلانیہ زنا کیا تو میری امت میں بھی وہی ہوگا جو ایسا کریگا۔

قولہٗ لَيَاْتِيَنَّ : یہ اتیان سے ہے بمعنی اَلْمَجِيئُ بِسُهُوْلَةٍ کما فی قولہٖ تعالیٰ " مَا تَذَرُ مِنْ شَيْئٍ اَتَتْ عَلَيْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيْمِ (پ۲۶ ذاریات)

ثانیاً لفظ اَتٰى کے بعد جب علیٰ آتا ہے اور زمانہ اس کا فاعل ہوتا ہے تو ہلاکت کے معنیٰ پر دلالت کرتا ہے۔ اب عبارت یوں بنے گی " ای لَيَاْتِيَنَّ عَلٰى اُمَّتِيْ زَمَانٌ اِتْيَانًا مِثْلَ الْاِتْيَانِ عَلٰى بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ "

قولہٗ اُمَّتِيْ : اُمت سے مُراد اُمّتِ اجابت ہے جو مسلمان سمجھے جاتے ہیں۔

قولہٗ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ ۔ یہ استعارہ فی التساوی ہے اور منصوب علی المصدر ہے۔ ای يَحْذُوْنَهُمْ حَذْوًا مثل حذو النعل بالنعل ؛ معنیٰ ہوگا يوافقونهم مثل موافقة النعل بالنعل يعملون مثل اعمالهم " گویا تشبیہ بداعمالی اور بداعتقادی میں ہے کہ جیسے وہ مبتلائے عصیاں ہوئے تم بھی اسی طرح ہونگے مثل دو جوتیوں کے کہ ان میں سرمو تفاوت واختلاف نہیں ہوتا یہی حال امت محمدیہ کا ہوگا۔

سوال ؛ فان قيل قد وقع فيما مضى قتل الانبياء و تحريف الكتب ولم يقع فى هذه الامة فكيف يصح قوله عليه السلام حذو النعل بالنعل

قلت ؛ لعل ما وقع فى ايام بنى اُميّة من قتل علماء التابعين مثل سعيد بن المسيب ونحوه هذا القبيل فعلماء امته كانبيائهم ولكنه كذب على بنى امية هذا السوال من قبيل السائل كالاعمى النظر الى البداية والنهاية للتحقيق والتدقيق۔

قولہٗ حَتّٰى اِنْ كَانَ مِنْهُمْ مَنْ اَتٰى اُمَّهٗ عَلَانِيَةً : یہاں تک کہ اگر ان (بنی اسرائیل) میں کوئی ایسا شخص گندا ہوگا جو علانیہ اپنی ماں پر (بدکاری کے لیے) آیا تھا

تو یقیناً میری اُمّت میں بھی ایسا شخص ہوگا جو ایسا ہی کرے گا۔ یعنی امّتِ محمّدیہ پر بھی ایسی نفسانی خواہش غالب ہوگی کہ ماں اور غیر ماں کی تمیز نہ رہے گی۔ بعض حضرات کے نزدیک اُمَّہٗ سے حقیقی ماں مراد نہیں بلکہ سوتیلی ماں مراد ہے اگرچہ حقیقی ماں کے ساتھ بدکاری کا ارتکاب بالکل محال بھی نہیں ہے (العیاذ باللہ) کیونکہ دورِ حاضر میں بعض انسانوں پر ایسی حیوانیت اور بہیمیت طاری ہوگئی کہ اپنی حقیقی بیٹی سے منہ کالا کیا تاہم یقیناً ماں کی طرف جنسی رغبت میں بغیر شرعی رکاوٹ کے طبعی رکاوٹ بھی ہوتی ہے۔ اس لیے سوتیلی ماں ہی مراد لینا اَنسب ہے۔

قولہٗ تَفتَرِقُ عَلیٰ ثِنْتَیْنِ وَسَبْعِیْنَ : مُحدّثینؒ حضرات نے بحث کی ہے کہ تفریق سے کونسی تفریق مراد ہے۔ چنانچہ جمہور علماءِ اُمّت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حدیث پاک میں جس افتراق کا ذکر ہے یا جس کی مذمت ہے اس سے فروعی اختلاف مراد نہیں بلکہ اس سے وہ افتراق مراد ہے جو عقائد و نظریات کی بنیاد پر ہو یہی وجہ ہے کہ حدیث پاک میں بہتر۷۲ فرقوں کو جہنمی قرار دیا گیا ہے اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ یہ لوگ اپنی بداعتقادی کی وجہ سے دوزخ میں نہیں جائیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی بدعملی کی وجہ سے ان میں سے کوئی دوزخ میں چلا جائے۔ بہر حال اصولی اختلاف مراد ہیں نہ کہ فروعی۔

قولہٗ ثَلَاثٌ وَّسَبْعِیْنَ مِلَّۃً : یقول ابوالاسعاد : اَلْاِیْمَانُ بِضْعٌ وَّسَبْعُوْنَ شُعْبَۃً کے تحت تفصیل سے عرض کر چکا ہوں کہ کلامِ عرب میں یہ عدد محض کثرت بیان کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ نیز امثلہ سے بھی واضح کر دیا تھا اور پھر وہاں یہ بھی بتا دیا تھا کہ اس کو تکثیر کے لیے مخصوص کرنے کی کیا وجہ ہے؟ یہاں بھی میری رائے یہی ہے کہ یہ لفظ کثرت بیان کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے یعنی اس امت میں بہت سے فرقے ہوں گے۔ خاص کر تہتر۷۳ کی تعداد مراد نہیں اور ہے بھی حقیقت کیونکہ اگر سوچا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرقہ ہائے مختلفہ کی تعداد بے شمار ہے اور نہ جانے آگے مزید کتنے فرقے پیدا ہوں گے لہٰذا ان کو تہتر۷۳ کی تعداد میں بند کرنا تکلّف سے خالی نہیں۔

ثَلٰثٌ وَّ سَبۡعِیۡنَ کی تعیین (یعنی تہتر کی تعیین)

بعض حضرات نے ثَلَاثٌ وَّ سَبۡعِیۡنَ (یعنی تہتر) کی تعیین کی ہے وہ اس طرح کہ اہلِ ھَوٰی کے اصولی فرقے چھ ہیں: (۱) خوارج (۲) شیعہ (۳) معتزلہ (۴) جبریہ (۵) مُرجیہ (۶) مُشبہ — شیعہ — خوارج — معتزلہ — جبریہ — مُرجیہ — مشبہ

جمع ۳۲ — جمع ۱۵ — جمع ۱۲ — جمع ۳ — جمع ۵ — جمع ۵

مگر مرقات میں یہ تعیین اس طرح کی گئی ہے :۔

معتزلہ — شیعہ — خارجی — مُرجیہ — بخاریہ — جبریہ — مشبہ

جمع ۲۰ — جمع ۲۲ — جمع ۲۰ — جمع ۵ — جمع ۳ — جمع ۱ — جمع ۱

مَا اَنَا عَلَیۡہِ وَاَصۡحَابِیۡ کی تشریح

اس جملہ کی تشریح ان الفاظ سے ہوگی

فرقہ ناجیہ کو مَا اَنَا عَلَیۡہِ وَاَصۡحَابِیۡ سے تعبیر کرنے کی حکمت

یقول ابوالاسعاد : بظاہر صحابہ کرامؓ کے سوال مَنۡ ھِیَ کے جواب میں یوں ارشاد فرمانا چاہیے تھا اَنَا وَ اَصۡحَابِیۡ یعنی وہ جماعت میں ہوں اور میرے صحابہ ہیں اور بلاشبہ اس وقت فرقہ ناجیہ کا مصداق یہی جماعت تھی اس سے بڑھ کر کوئی آئین کلی بتانا مقصود تھا تو یہ فرما دیا جاتا کہ "کِتَابُ اللّٰہِ وَسُنَّتِیۡ" لیکن اس کے بجائے مَا اَنَا عَلَیۡہِ وَ اَصۡحَابِیۡ سے تعبیر کرنے میں حکمت یہ ہے کہ سائل کا مقصد اس دور کی جماعتِ حقہ کو مُتعیّن کرانا نہیں تھا بلکہ وہ یہ پوچھنا چاہتے تھے کہ اس دورِ فتن میں حق اور اہلِ حق کی تعیین کیسے ہوگی۔ اب اگر آپ جواب میں صرف کتاب وسنت بتلاتے تو یہ دورِ فتن کے مناسب

نہ تھا کیونکہ دورِ فتن میں باطل سے باطل فرقہ کا دعویٰ بھی یہی ہوتا ہے کہ ہم حق پر ہیں۔ اور ہم ہی کتاب وسُنّت کے عامل ہیں۔ دیکھئے معتزلہ اپنے آپ کو اھل العدل والتوحید کہتے ہیں۔ آج کل کے مُنکرینِ حدیث اپنے آپ کو اہلِ قرآن کہتے ہیں تو آپ نے فرمایا مَاۤ اَنَا عَلَيْهِ وَاَصْحَابِيْ ظاہر ہے کہ آپ اور آپ کے صحابہ کرامؓ کتاب وسُنّت کے عمل پیرا تھے لیکن اس تعبیر سے یہ واضح فرما دیا کہ راہِ ہدایت صرف کتاب وسُنّت نہیں بلکہ کتاب وسُنّت کی وہ عملی تصویر ہے جو آپ نے صحابہ کرامؓ کے سامنے پیش فرمائی اور صحابہ کرامؓ نے اسے مِن وعَن اُمّت کے سامنے نقل کر دیا۔ یعنی فرقہ ناجیہ کی تعیین کے لیے یہ علامت قیامت تک کے لیے کار آمد ہے۔

سوال : اس موقعہ پر ایک خاص اشکال کی طرف اشارہ کر دینا بھی ضروری ہے کہ ایک ایسا شخص جو جاہل تھا اسلام کی دولت سے مشرف ہوا۔ اس کے سامنے اہل السنۃ والجماعۃ بھی، شیعہ بھی دونوں اس کے سامنے اپنے حق پر ہونے کے دلائل پیش کرتے ہیں وہ نومسلم حیران ہے کہ وہ کس جانب رجوع کرے جب کہ وہ علم سے بے بہرہ ہے۔

جواب : اس کا سیدھا حل یہ ہے کہ بعض چیزیں ایسی ہیں جو صراحت کے ساتھ اہل السنۃ والجماعۃ کے حق پر ہونے کی دلیلیں ہیں جو کہ اہل السنۃ والجماعۃ کی حقانیت پر دلائل کے عنوان سے پیشِ نظر ہیں۔

اہلُ السُنّۃ والجماعۃ کی حقّانیّت پر دلائل

دلیل اوّل سب سے بڑی دلیل قرآن پاک کا حفظ کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی عظیم نعمت ہے وہ سُنّیوں کے حصہ میں ہے کسی شیعہ کو حافظ نہیں دیکھا گیا ہو سکتا ہے کہ لاکھوں میں سے ایک ہو جو شاذ و نادر کالمعدوم ہے۔

دلیل دوم جتنے اولیاء اللہ و بزرگان وصلحاءِ امت جو شریعت مُقدّسہ کے ستون مانے گئے ہیں وہ سب بحمد اللہ و بفضل اللہ سنّی ہی تھے۔

دلیل سوم جتنے شعائرِ اسلام ہیں مثلاً حج بیت اللہ الحرام، جمعہ کی نماز، عیدین کی نماز وغیرہ ان کو علی الاعلان جس طرح سنّی ادا کرتے ہیں۔ دوسرے اس طرح ادا کرنے سے قاصر ہیں۔

دلیل چہارم مہبطِ وحی مکہ مکرمہ و مدینہ منورہ زادھما اللہ شرفاً وکرماً میں اہل السنۃ والجماعۃ ہی کا مسلک دائمی طور پر رائج رہا اور ہے اور تا قیامت رہے گا۔ انشاء اللہ

الغرض اس مسلک صادقہ کی حقانیت پر بے شمار دلائل ہیں جو شخص بھی نفسانیت سے الگ ہوکر قلب صادق کے ساتھ حق کو جاننا چاہتا ہو اس کے لیے مذکورہ دلیلیں کافی ہیں لیکن مَا يَتَذَكَّرُ إِلَّا مَنْ يُنِيبُ (پ۲۴ حٰمٓ مؤمن)

قولهٗ كُلُّهُمْ فِي النَّارِ إِلَّا مِلَّةً وَاحِدَةً : سارے کے سارے جہنمی ہونگے مگر ایک جماعت جنتی ہوگی۔

سوال ۔ دخول فی النّار سے دخول اَبدی مراد ہے یا غیرابدی۔ اگر دخول اَبدی مراد ہو تو مستثنیٰ منہ کے اعتبار سے صحیح نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ تمام علماء کا اجماع ہے کہ یہ تمامی فرق باطلہ کافر نہیں ہیں لہٰذا یہ ابدالآباد کے لیے دوزخی نہیں ہوں گے، اور اگر دخول غیرابدی مراد ہو تو مستثنیٰ کے اعتبار سے صحیح نہیں ہوتا کیونکہ نصوص قرآنیہ وحدیثیہ سے ثابت ہے کہ اہل السنۃ والجماعۃ کے گنہگاروں کا بھی ایک دفعہ دوزخ میں داخل ہونے کا احتمال ہے اگرچہ بعد میں ناجی ہوں گے۔

یقول ابوالاسعاد : جواباً تلاش بسیار کے بعد بندہ کو شافی کافی کوئی جواب نہیں ملا کیونکہ اکثر شارحین نے اس طرف توجہ نہیں فرمائی۔ البتہ حضرت علامہ محدّث عبدالحق دہلویؒ نے اشعۃ اللمعات ص۱۴۲ میں اس طرف اشارہ فرمایا ہے لکھتے ہیں:۔

ہمہ ایشاں مستحق در آمدن دوزخ باشند بجہت سوءِ اعتقاد و الابجہت عمل شاید کہ فرقۂ ناجیہ نیز در آیند، قول بآنکہ ذنوب فرقۂ ناجیہ مطلق مغفور است سخن بے دلیل است۔

اس عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ دخولِ نار دو اعتبار سے ہوگا (۱) خرابیٔ اعتقاد کی بناء پر (۲) یا خرابیٔ اعمال کی بناء پر۔ جب کہ اہل السنۃ والجماعۃ کے عُصاۃ خرابیٔ اعمال کی بناء پر

داخل ہوں گے۔ فلا اشکال فیہ فافہمہ واحفظہ ودعائہ لنجاتہ :

سوال ۔ حدیث مذکورۃ الذیل میں ہے "کلھم فی النار الا ملۃ واحدۃ" جب کہ الایضاح ص۲۳ ج ا میں روایت ہے "کلھم فی الجنۃ الا ملۃ واحدۃ"، فکیف التوفیق۔؟

جواب اوّل : بعض نے اس کو موضوع کہا بعض نے اس کو ضعیف کہا ہے فلا ضرورۃ للجواب :

یقول ابوالاسعاد جوابًا : بالفرض اگر اس روایت کو صحیح مانا جائے تو کلھم فی النار کی روایت اُمّتِ دعوت کے متعلق ہے اور "کلھم فی الجنۃ" اُمّتِ اجابت کے متعلق ہے۔ فی النار سے مراد صرف دخولِ نار ہے نہ کہ خلود اور کلھم فی الجنۃ سے مراد جنہوں نے حضور علیہ السلام کی دعوت کو قبول کیا وہ جنتی ہونگے خواہ دخول اوّلی ہو یا ثانوی اور الا ملۃ واحدۃ سے مراد کفار ہیں جنہوں نے دعوتِ رسول پر لبیک نہیں کہا وہ دوزخ میں جائیں گے ان کو جنت میں دخول ثانوی بھی نصیب ہوگا۔ الا ان یشآء

قولہ وفی روایۃ احمد وھی الجماعۃ : جماعت سے مراد وہ لوگ ہیں جو کتابُ اللہ اور سُنّت رسول اللہ اور فقہ کا صحیح علم رکھتے ہوں جو فقہاء، علماء اور مجتہدین کی جماعت ہے جس کو اہل السنۃ والجماعۃ سے تعبیر کرتے ہیں باقی ان کو جماعت اس اعتبار سے فرمایا گیا ہے کہ یہ لوگ کلمہ حق پر جمع اور متفق ہیں۔

قولہ تتجارٰی ۔ بالتائین ای تتدخل وتجری وتسری ۔

قولہ تلک الاھوآء : جمع ھواء ای البدعۃ : یہاں سبب ذکر کرکے مُسبّب مراد لیا گیا ہے یہ خواہشات ہی بدعات اور افتراق وانتشار پیدا کرتی ہیں۔

قولہ الکلب : بفتح الکاف واللام : اور کلب سے مراد نفسِ کلب نہیں بلکہ وہ مرض مراد ہے جو دیوانہ کتّے کے کاٹنے سے ہو جاتی ہے جس کو ہڑک کہتے ہیں اور یہ مالیخولیا کے مشابہ ہوتی ہے اور اس کا اثر مریض کے ہر رگ واعضاء میں سرایت کر جاتا ہے ایسے مریض کو پانی سے سخت نفرت ہوتی ہے وہ پانی کو دیکھ کر چلّاتا اور بھاگتا ہے حتّٰی کہ وہ شدّت پیاس سے تڑپ تڑپ کر جان دے دیتا ہے۔

اَهلُ الهَوٰی کی ہڑک کے مریض کے ساتھ تشبیہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل ہوٰی کو ہڑک کے مریض کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔
اس کی وجہ یہ ہے کہ ہڑک کی بیماری میں دو چیزیں ہوتی ہیں :۔
اوّل : جب یہ مرض کسی کو لاحق ہوتی ہے تو اس بیماری کا اثر مریض کے رگ وریشہ اور ہر ہر جوڑ میں سرایت کرجاتا ہے اس لیے یہ لاعلاج مرض ہے۔ ایسے ہی ھوٰی جب انسان کے رگ وریشہ میں سرایت کرجائے تو پھر وہی انسان کو بشکل ہدٰی نظر آنے لگتی ہے اور توبہ کی توفیق باقی نہیں رہتی " کما فی قولہٖ تعالیٰ " اَفَرَأَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَہٗ ھَوَاہُ (پ ۱۹ فرقان)
دوم : دوسری چیز اس مرض میں یہ ہے کہ یہ مرض مُتعدّی ہوتی ہے جس کو وہ مریض کاٹے اس کو بھی وہ مرض لگ جاتی ہے۔ یہی حال ھوٰی وبدعت کا ہے کہ اس کا اثر دوسرے پر جلدی ہوتا ہے یعنی بدعتیں اَمراض متعدّیہ ہیں اور بدعتیوں میں ہوائے نفسانی اس طرح سرایت کیے ہوئے ہوتی ہے کہ وہ حق تک پہنچنے سے ڈرتے ہیں حتّٰی کہ بدعت کی موت مَرجاتے ہیں " کما فی قول ابن مسعودؓ قال مَنْ احبّ ان یکرم دینہ فلیعتزل مخالطۃ الشیطان ومجالسۃ اصحاب الاھواء فان مجالستھم الصق من الجرب "
قولہ عِرْق : بکسر العین بمعنیٰ رگیں۔
قولہٗ مُفْصَلٌ : مُلتقی العظمین یعنی دو ہڈیوں کے ملنے کی جگہ جسے جوڑ کہتے ہیں۔

وَعَنْ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَجْمَعُ

ترجمہ : روایت ہے ابن عمرؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ یقیناً اللہ تعالیٰ میری

اُمَّتِیْ اَوْ قَالَ اُمَّۃُ مُحَمَّدٍ عَلٰی ضَلَالَۃٍ وَیَدُ اللہِ عَلَی الْجَمَاعَۃِ وَ مَنْ شَذَّ شُذَّ فِی النَّارِ:

اُمّت کو یا فرمایا امّت محمّد مصطفیٰ کو گمراہی پر مُتّفق نہ ہونے دے گا جماعت پر اللہ کا دستِ کرم ہے جو جماعت سے الگ رہا وہ دوزخ میں الگ ہی جائے گا۔

قولہٗ اَوْ قَالَ اُمَّۃُ مُحَمَّدٍ : جملہ مذکورہ میں اَوْ شک کے لیے ہے یعنی راوی کو شک ہے۔ یا تو آپ نے اُمَّتِیْ فرمایا، یا اُمَّۃُ مُحَمَّدٍ فرمایا۔ لا تنویعیہ، کہ نوع وقسم بیان کرنا مقصود نہیں۔ اور اُمّت سے اُمّتِ اجابت مراد ہے یعنی حضور علیہ السلام پر ایمان لانے والے لوگ یہ حدیث پچھلی حدیث کی گویا تفسیر ہے۔ یعنی اگرچہ میری اُمّت میں بنی اسرائیل سے زیادہ فرقہ ہونگے لیکن فرق یہ ہے کہ وہ سارے گمراہ ہو گئے تھے جب کہ میری اُمّت ساری گمراہ نہ ہو گی بلکہ قیامت تک ایک فرقہ اس میں حق پر رہے گا۔

قولہٗ وَیَدُ اللہِ عَلَی الْجَمَاعَۃِ : دستِ کرم سے مراد حفاظت، مدد اور رحمت ہے یعنی اللہ تعالیٰ جماعت کو غلطی اور دشمنوں سے ایذاء سے بچائے گا اور ان پر سکینہ اتارے گا۔" کما فی قولہٖ تعالیٰ: یَدُ اللہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ (پ فتح)

قولہٗ مَنْ شَذَّ : ای انفرد عن الجماعۃ۔ اعتقادًا، قولاً، فعلاً تینوں مراد ہیں۔

قولہٗ شُذَّ ۔"ای اُلْقِیَ فِی النَّارِ"۔

خُلَاصَۃُ الْحَدِیْثِ

اس حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا کہ اُمّت محمّدیہ علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسلام پر اللہ پاک نے جہان اور احسان فرمائے ہیں ان میں ایک احسان یہ بھی ہے کہ وہ کبھی گمراہی اور ضلالت پر اجماع نہیں کریں گے کیونکہ اُمّت کے ایک فرد کی رائے تو غلط ہو سکتی ہے لیکن جس بات پر تمام عُلماء و مجتہدین جمع ہو جائیں وہ غلط نہیں ہو سکتی۔ نیز حدیث باب میں یہ بحث ہے کہ اجماعِ اُمّت حُجّت ہے یا نہیں۔

بحث حُجیّتِ اِجماع

اجماع کے دو معنیٰ ہیں لغوی و اصطلاحی۔

اجماع کا لغوی معنیٰ : لغت میں اجماع کا معنیٰ ہے اتفاق رائے۔

اجماع کا اصطلاحی معنیٰ : اصطلاح شریعت میں اجماع کا معنیٰ ہے کہ ایک زمانہ میں مجتہدین اور علماء ربّانیّین اور راسخین فی العلم کا کسی دینی امر پر اتفاق رائے کر لینے کا نام اجماع ہے۔ حُجّتِ اجماع کی بحث کو فوائد کی شکل میں بیان کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

فائدہ اُولیٰ جس طرح قرآن وحدیث حُجّت ہیں اسی طرح اجماع بھی حُجّت ہے۔ حضرت امام شافعیؒ سے کسی نے سوال کیا کہ کیا اجماع اُمّت کے حجت ہونے کی دلیل قرآن مجید میں ہے۔ آپ نے قرآن پاک سے دلیل معلوم کرنے کے لیے تین روز تک مسلسل تلاوت قرآن کو معمول بنا لیا۔ بالآخر آیۃ کریمہ "وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى (پ۵ نساء) ذہن میں آئی اور اس کو علماء کے سامنے بیان کیا تو سب نے اقرار کیا کہ اجماع کے حُجّت ہونے پر یہ دلیل کافی ہے۔

فائدہ ثانیہ اجماع شرعی کے لیے یہ شرط ہے کہ رائے دینے والے علماء وصُلحاء واتقیاء ہوں کس وناکس کو رائے دینے کا اختیار نہیں دنیا کا مسلّم اصول ہے کہ علاج کے متعلق اطبّاء، تعمیر کے متعلق انجینئروں کا متّفقہ فیصلہ کارآمد ہوتا ہے تو علماء شریعت کا متّفقہ اجماع کیسے حُجّت نہ ہوگا "مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ"

فائدہ ثالثہ اجماع کے حُجّت ہونے میں حکمت یہ ہے کہ دین میں اختلافات اور رخنہ اندازیوں کی صورت میں اس کو محفوظ رکھنے کے لیے کسی قوت معصومہ کی ضرورت ہے جس کی بات حرف آخر ہو اور اس میں غلطی کا احتمال نہ ہو۔ اصل میں ایسی قوت معصومہ محافظہ تو نبوت ہی ہے۔ پہلی امتوں میں جب کوئی نبی رخصت ہو جاتے اور بعد میں دین کے اندر رخنے واقع ہونے لگتے تو حق تعالیٰ

نئے نبی مبعوث فرما دیتے چونکہ نبی کریم علیہ السلام پر نبوت ختم ہو چکی ہے۔ لیکن اس دین مقدس کو قیامت تک باقی رہنا ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنے طویل عرصہ میں اختلافات پیدا ہوں گے، رخنہ اندازیاں ہوں گی اور نئے نئے مسائل درپیش ہوں گے ان کے آخری فیصلہ کے لیے قوت معصومہ کی ضرورت ہے ایسی قوت محافظہ معصومہ ظاہر ہے کہ اب نبوت کی صورت میں نہیں ہوسکتی۔ اس لیے کہ نبوت ختم ہو چکی ہے اور نبی کے علاوہ اُمت کے کسی فرد کی رائے کو تو قوت محافظہ قرار نہیں دیا جا سکتا اس لیے کہ ہر امتی کی رائے میں غلطی کا احتمال ہوتا ہے اس لیے حق تعالیٰ نے اس امت کو یہ خصوصی شان دے دی کہ اس امت کے تمام علماء کسی غلط بات پر جمع نہیں ہوسکتے جس بات پر ان کا اجماع ہو جائے وہ فیصلہ کن اور آخری ہوگی۔ اجماع کا حجت ہونا اس امت کے خصوصی امتیازات میں سے ہے۔ اس اُمت کو یہ نعمت ختم نبوت کے صدقہ میں ملی ہے، اُمت نے بھی شکریہ کے طور پر سب سے پہلا اجماع ختم نبوت پر ہی کیا ہے۔

وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِتَّبِعُوا السَّوَادَ الْاَعْظَمَ فَاِنَّهُ مَنْ شَذَّ شُذَّ فِي النَّارِ

ترجمہ: روایت ہے انہی سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ بڑے گروہ کی پیروی کرو کیونکہ جو الگ رہا وہ الگ ہی آگ میں جائے گا۔

قولہ اَلسَّوَادَ: سواد بمعنیٰ سیاہی اور یہ لفظ جماعت پر بھی بولا جاتا ہے یعنی مسلمانوں کی بڑی جماعت۔ سواد کا اطلاق بڑی جماعت پر ہوتا ہے اس لیے کہ سواد بمعنیٰ سیاہی، تو جہاں بہت لوگ جمع ہوں اِزدہام اور رش کی وجہ سے زمین کالی ہو جاتی ہے یا زمین کو کالا کر دیتے ہیں اس لیے اس کو سواد سے تعبیر کرتے ہیں۔

تشریح سوادِ اعظم

تشریح سواد اعظم میں عُلماء کے متعدد اقوال ہیں۔ قول اوّل: العدد الکثیر۔

قول دوم : سَوَادُ النَّاسِ عَامَّتُهُم -

قولِ سوم : مَا اَنَا عَلَيْهِ وَاَصْحَابِیْ : یعنی اس سے مراد جمہور علماء اہل السنۃ ہیں جو اہل حق ہیں اگرچہ عدداً کم ہیں اس لیے حدیث پاک میں اعظم فرمایا اکثر نہیں فرمایا لیکن یہ حکم اصول عقائد کا ہے باقی فروعی مسائل میں ہر مجتہد کی تقلید شخصی درست ہے - حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ اصول وعقائد میں جمہور اہل السنۃ والجماعۃ کے ساتھ رہو وہی حق پر ہونگے کیونکہ یہ ان کا خاصہ ہے کہ وہ گمراہی پر مجتمع نہیں ہو سکتے -

یقول ابوالاسعاد : بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ سوادِ اعظم سے صرف افراد کی کثرت مراد ہے لیکن یہ خیال احمقانہ ہے - غور کرنا چاہیے کہ اس دورِ فتن میں اہلِ حق کی کثرت کہاں ہو سکتی ہے پھر اس اکثریت کو ہر حق وباطل کے فیصلہ کا شرعی معیار قرار دینا اور بھی بیوقوفی ہے - اگر آج ایک طرف بے دینی دہریت، مذہبی حریت، فواحش ومنکرات کی اکثریت موجود ہے تو کیا یہ اس کا حق ہے کہ وہ اپنے آپ کو سوادِ اعظم کا معزز لقب دیکر فرقہ ناجیہ کا مصداق ٹھہرالے - لہٰذا ہر بحث وجدل کے مواقع پر اس حدیث کو پڑھنا دراصل حدیث پاک کی توہین ہے -

قولہٗ رواہ ابن ماجۃ من حدیث انسٍ وابنُ عاصمٍ فی کتاب السنۃ : مشکوٰۃ شریف کے موجودہ نسخہ میں عبارت "مِنْ اَنَسٍ" تک ہے حالانکہ مکمل عبارت "کتابُ السنۃ" تک ہے جو کہ مظاہر حق ص۲۱۷ ج ا باب الاعتصام اسی حدیث کے تحت مذکور ہے - اس کا مقصد یہ ہے کہ اس حدیث میں لفظ "رواہ" کے بعد اصل مشکوٰۃ شریف میں جگہ خالی تھی - اس لیے کہ صاحب مشکوٰۃ کو اس کتاب کا نام معلوم نہیں ہوا تھا جس سے یہ حدیث نقل کی گئی ہے بعد میں میرک شاہ نے مذکورہ عبارت نقل کی ہے -

ترجمہ : حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے میرے بچے اگر تم یہ کر سکو کہ صبح	وَعَنْ اَنَسٍؓ قَالَ قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَا بُنَیَّ اِنْ قَدَرْتَ

اَنْ تُصْبِحَ وَتُمْسِیَ وَلَیْسَ فِیْ قَلْبِكَ غِشٌّ لِاَحَدٍ فَافْعَلْ:	اور شام ایسے گزارو کہ تمہارے دل میں کسی کی طرف سے کھوٹ (کینہ) نہ ہو تو کرو۔

قولہ یٰبُنَیَّ : بضمّ الباء تصغیر ابن ہے اور شفقت کے لیے ولد فرمایا۔

قولہٗ تُصْبِحُ وَتُمْسِیْ : محدّثین حضرات نے لکھا ہے کہ نبی کریم علیہ السّلام نے تصبح وتمسی فرما کر پورا دن اور رات مراد لیا ہے کیونکہ قلب کا مصفیٰ ہونا خصائل رذیلہ سے ہر وقت معتبر ہے نہ کہ احیاناً۔

قولہٗ غِشٌّ : غش کا معنیٰ ہوتا ہے ملاوٹ کرنا "مَنْ غَشَّ فَلَیْسَ مِنَّا"، مگر یہاں غِش نصح کی ضد ہے معنیٰ ہے کسی کے مُتعلق برائی سوچنا، اس سے دل پاک ہو اور اس غِش سے مراد دنیوی اور ذاتی بغض وکینہ ہے نہ کہ شرعی یعنی شریعت مُقدّسہ کی خاطر کسی بدعتی وفاسق فاجر سے بغض وکینہ رکھنا تو عین ایمان ہے "کَمَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ علیہ وسلّم: مَنْ رَأٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ الخ - قَالَ اللّٰہُ تعالیٰ "لَا تَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَادُّوْنَ مَنْ حَادَّ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ (پ ۲۸ س مجادلہ)

قولہٗ لِاَحَدٍ : اَحَدٍ میں مسلمان تو ویسے ہی داخل ہیں مگر کافر بھی اَحَدٍ میں داخل ہیں کیونکہ کافر کی خیر خواہی بھی بعض امور میں اس کے ایمان لانے کی کوشش ہے ہاتھ سے، زبان سے، مالی تعاون سے۔

قولہٗ مَنْ اَحَبَّ سُنَّتِیْ : محبّت کی علامت سُنّت پر عمل کرنا ہے عمل کے بغیر محبّت محبّت ہی نہیں بلکہ نِفاق ہے۔

سوال : یہ ہے کہ حدیث پاک کے الفاظ ہیں "مَعِیْ فِی الْجَنَّۃِ کہ اس شخص کو معیّت فی الجنّۃ نصیب ہوگی۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت نبی کریم علیہ السّلام کی شان ومرتبہ میں اُمّت برابر ہے۔ حالانکہ حضرتؐ کے ہم شان کوئی ہستی نہ آج ہے نہ ہو گی تا قیامت ؎ بعد از خدا بزرگ توئی قصّۂ مختصر!

جواب : معیّت دو قسم ہے۔ اوّل معیتِ قرب، دوم معیت فی الدرجہ کَانَ مَعِیْ فِی الْجَنَّۃِ سے معیتِ قرب مُراد ہے نہ کہ اتحاد فی الدّرجہ۔

خُلَاصَۃُ الحَدِیْث

اس حدیث مبارک میں اس طرف اشارہ ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت کو پسند کرنا اور اسے محبوب رکھنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے محبّت رکھنے کا سبب اور جنّت میں رفاقت کے حصول کا ذریعہ ہے تو یہ سوچنا چاہیے کہ جب آپ کی سنت کو پسند کرنے پر یہ خوش خبری ہے تو سُنّت نبوی پر عمل کرنا کتنی بڑی سعادت کی بات ہے کیونکہ "فَاِنَّ الْمَرْءَ مَعَ مَنْ اَحَبَّ"؛

وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَمَسَّكَ بِسُنَّتِیْ عِنْدَ فَسَادِ اُمَّتِیْ فَلَهٗ اَجْرُ مِائَةِ شَهِیْدٍ؛

ترجمہ : روایت ہے حضرت ابو ہریرہؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جس نے میری اُمّت کے بگڑتے وقت میری سُنّت کو مضبوطی سے تھاما تو اسے سو شہیدوں کا ثواب ہے

قولہ فَسَادِ اُمَّتِیْ : فساد سے مراد بدعت وجہل کا غلبہ ہے جس کی وجہ سے وہ سُنّت متروک ہو (کما فی زمننا فی سُنّۃ اللحیۃ)

سوال : ایک سنت کے احیاء پر اتنے اجرِ عظیم کی خوشخبری چہ معنیٰ دارد۔

جواب : شہید دین اسلام کو زندہ رکھنے اور اس کی شان وشوکت بڑھانے کے لیے دنیا کی تمام مصیبتیں جھیلتا ہے یہاں تک کہ اپنی جان بھی قربان کر دیتا ہے لیکن شہید تو ایک بار تلوار کا زخم کھا کر پار ہو جاتا ہے اپنا مطلوب حاصل کر لیتا ہے مگر یہ اللہ کا بندہ عمر بھر لوگوں کے طعنے اور زبانوں کے گھاؤ کھاتا رہتا ہے اللہ اور اس کے رسول کی خاطر سب کچھ برداشت کرتا ہے اس کا جہاد جہادِ اکبر ہے جیسے اس زمانہ میں ڈاڑھی رکھنا، سود سے بچنا وغیرہ اس لیے اس کو سو شہیدوں کا اجر ملتا ہے۔

یقول ابوالاسعاد : اس حدیث کا حکم اس سُنّت کے بارہ میں ہے جس کے مقابلہ میں بدعت ہو، اگر سُنّت کے مقابلہ میں دوسری سُنّت ہو جیسے رفع یدین ترک رفع یدین تو اس کا یہ حکم نہیں بلکہ امام کی تقلید ضروری ہے۔

وَعَنْ جَابِرٍؓ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِيْنَ اَتَاهُ عُمَرُؓ فَقَالَ اِنَّا نَسْمَعُ اَحَادِيْثَ مِنْ يَهُوْدٍ تُعْجِبُنَا اَفَتَرٰى اَنْ نَكْتُبَ بَعْضَهَا فَقَالَ :

ترجمہ : روایت ہے حضرت جابرؓ سے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں کہ جب حضور علیہ السلام کی خدمت میں حضرت عمرؓ آئے فرمایا کہ ہم یہودیوں کی کچھ باتیں سنتے ہیں جو ہمیں بھلی لگتی ہیں کیا آپؐ اجازت دیتے ہیں کہ کچھ لکھ بھی لیا کریں۔

قولہٗ اِنَّا نَسْمَعُ : چونکہ حضرت عمرؓ کا گھر شہرِ مدینہ منورہ سے دو تین میل کے فاصلہ پر تھا۔ حضور علیہ السلام کی خدمت میں آتے وقت درمیان میں اہل کتاب کے مکانات آتے تھے تو کبھی کبھی حضرت عمرؓ ان کی مجلس میں بیٹھ جاتے تھے یہ ان کا علمی شوق تھا اور یہ خیال فرماتے کہ جہاں سے بھی علم دین میسر ہو جائے لینا بہتر ہے۔

قولہٗ مِنْ يَهُوْدٍ : علامہ زمخشریؒ نے لکھا ہے کہ یہود سے لام کو ترک کیا گیا ہے یعنی مِنَ الْيَهُوْدِ نہیں کہا کیونکہ یہ قوموں کے علم ہیں (کما اجری یھودیًا و یھود مجری شعیرۃ و شعیر) مگر علامہ ابہری کے نزدیک یہود غیر منصرف علمیت اور تانیث ہے والاصح قول الاول کہ علمیت اور وزن فعل ہے اس لیے کہ اسمائے قبائل میں تانیث لفظی نہیں ہوتی۔

قولہٗ تُعْجِبُنَا : بضم التاء وکسر الجیم ای تحسن عندنا وتمیل قلوبنا الیھا۔ یعنی ہمیں ان کی باتیں پسند آتی ہیں اور دل کو بھلی لگتی ہیں جس کی وجہ سے ہمارا میلان قلبی ان کی طرف ہو جاتا ہے۔

قولہٗ اَفـتَرٰی ای فتأذن لنا : ہمیں اجازت دیں ہم ان کو لکھ لیا کریں ۔

قولہٗ اُمتَھوِّکُوْنَ ، ھُوَالتَّحَیُّرُ وعدم القرار وَالاستقامَۃِ علی شَیْئٍ

کسی ایک امر پر قرار نہ ہو اور آدمی تذبذب کا شکار ہو۔ ملّا علی قاریؒ معنیٰ کرتے ہیں :۔

" اَیْ مُتَحَیِّرُوْنَ فِیْ دِیْنِکُمْ حَتّٰی تَاْخُذُوا الْعِلْمَ مِنْ غَیْرِکِتَابِکُمْ وَنَبِیِّکُمْ " کہ کیا تم متردد ہو کر دوسرے ادیان وکتب سے دین سیکھنا چاہتے ہو حالانکہ میرا دین مکمل ہے جس میں ہر قسم کا حکم موجود ہے ۔ دوسرے ادیان سے لے کر اضافہ کی ضرورت نہیں کیونکہ دوسرے ادیان والوں کا دین مکمل نہیں خصوصًا یہود کیونکہ وہ کتاب اللہ کو چھوڑ کر احبار و رہبان کی اتباع کرتے ہیں تم بھی ایسے بن جاؤ گے اگر اس میں قرار و استقامت نہ ہو۔

قولہٗ بَیْضَاءَ : ای وَاضِحَۃٌ :

قولہٗ نَقِیَّۃً : یہ بیضاء کی صفت ہے اس کے متعدد معانی ہیں :۔

اوّل : خَالِصَۃٌ وَخَالِیَۃٌ عَنِ الشِّرْکِ وَالشُّبْھَۃِ ۔

دوم : مَحفوظۃٌ عن التبدیل وَالتحریفِ والاغلال ۔

سوم : خَالِیَۃٌ عَنِ التَّکَالِیْفِ الشَّاقَۃِ ۔

تینوں اپنے مقام پر صحیح ہیں یعنی میری شریعت واضح روشن اور تحریف و شک اور شبہ سے محفوظ وخالص ہے تو کیا تم افضل کو چھوڑ کر مفضول کو اختیار کرنا چاہتے ہو۔

حافظ تورپشتیؒ فرماتے ہیں کہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کی دو صفتیں بیان فرمائی ہیں :۔

۱۔ بیضاء سے اشارہ ہے اس کے افضل و اکرم کی طرف کیونکہ اہل عرب کے نزدیک سفید رنگ تمام الوان سے افضل و اکرم سمجھا جاتا تھا۔

۲۔ نقیۃ سے اشارہ ہے اس کے صاف ستھرے ہونے کی طرف کہ ہر قسم کی تحریف و تغیر سے پاک وصاف ہے اور نہ اس میں اضافہ ہو سکتا ہے ۔

قولہٗ لَوْکَانَ مُوْسٰی حَیًّا مَاوَسِعَہٗ اِلَّا اتِّبَاعِیْ : حضرت نبی کریم علیہ السلام کا جملہ مذکورہ بیان فرمانا دو وجوہ سے ہو سکتا ہے :

اوّل : ماقبل کے اوصاف کی تحقیق کے لیے یہ وصف لائے کہ اگر حضرت موسیٰؑ

اس وقت زندہ ہوتے تو میری اتباع کے بغیر چارہ کار نہ ہوتا کیونکہ ان کے زمانے کے احکام اس زمانہ کے لیے مناسب نہیں ہیں تو تم کیسے اس کے احکام سیکھتے ہو۔

دوم : اللہ تعالیٰ نے سارے نبیوں سے حضور علیہ السلام کی اتباع کا عہد لے لیا تھا (لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ) پھر تم ان کی اُمّت سے میرے ہوتے ہوئے ہدایت لینے کیوں جاتے ہو۔ آفتاب کے ہوتے ہوئے چراغوں سے روشنی نہیں لی جاتی آج مسلمان اپنے کو بھول گئے اس لیے دوسری قوموں کے اخلاق اور امانت داری کی تعریفیں کرتے ہیں یہ ہماری جیب کے گرے ہوئے موتی ہیں جو غیروں نے اٹھا لیے۔

سوال : ماقبل میں حضور علیہ السلام نے دونوں فرقوں (یہود و نصاریٰ) کا نام ذکر کیا مگر نبیوں کے تذکرے میں صرف موسیٰ علیہ السلام کا نام ذکر فرمایا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام کیوں نہیں ذکر فرمایا۔

جواب اول : بطور زجر کے ذکر فرمایا ہے کیونکہ یہودی بہ نسبت نصاریٰ کے زیادہ خبیث النفس موذی ہیں۔

جواب دوم : زیادہ تر مقابلہ اہل کتاب میں سے یہود کے ساتھ تھا اس لیے ان کی تخصیص کی کہ دیکھو تمہارے نبی کا یہ حال ہے کہ وہ میری اتباع کر رہے ہیں لیکن تم کیوں نہیں کرتے۔

خُلاصۃ الحدیث : آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح یہود و نصاریٰ حیران ہیں کہ انہوں نے کتاب اللہ اور اپنے نبی کی سچی تعلیم کو چھوڑ کر اپنے خود غرضی لالچی علماء کی خواہشات کے مطیع ہو گئے۔ کیا تم بھی اسی طرح متحیّر ہو کر اپنے دین کو ناقص و نکمل سمجھ کر دوسروں کے دین کے محتاج ہو رہے ہو۔ حالانکہ میری لائی ہوئی شریعت اتنی مکمل اور واضح ہے کہ جس دین کی تم تمنا کر رہے ہو اگر وہ زندہ ہوتے تو میری اتباع کرتے۔ آدم وَمَنْ دُوْنِهٖ تَحْتَ لِوَائِیْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ۔

وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ اَکَلَ طَیِّبًا وَعَمِلَ فِیْ سُنَّۃٍ وَّاَمِنَ النَّاسُ بَوَائِقَہٗ دَخَلَ الْجَنَّۃَ :

ترجمہ : روایت ہے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جو پاک و حلال کھائے اور سنّت پر عمل کرے اور لوگ اس کے فتنوں سے محفوظ رہیں تو وہ جنّت میں جائے گا۔

قولہٗ مَنْ اَکَلَ طَیِّبًا : حلال رزق کا مطلب یہ ہے کہ خواہ تجارت ہو یا ملازمت یا کوئی دوسرا ذریعہ معاش ہو ہر جگہ ایمان داری، دیانت داری کے دامن کو پکڑے رہے، اور حدودِ شریعت سے تجاوز نہ کرے۔ شرعی نقطۂ نظر سے تجارت میں حلال کمائی کے لیے یہ شرط ہے کہ کسی مال کو فروخت کرتے وقت نہ تو عقد بیع سے پہلے نہ عقدِ بیع کے وقت اور نہ عقدِ بیع کے بعد کوئی ایسی شکل اختیار کی جائے جو شرعی طور پر مفسد ہو۔

قولہٗ وَعَمِلَ فِیْ سُنَّۃٍ : فِیْ سُنَّتِہٖ میں فِیْ استغراق کے لیے ہے۔ جیسے مِنْ استغراق کے لیے آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے سارے اعمال سنت کے موافق ہوں اور پوری زندگی سنت میں گذارے، جو بھی کام کرے یا جو بھی بات کہی جائے وہ سب سنت نبوی کے مطابق ہو گویا انسانی زندگی کا کوئی بھی پہلو ہو خواہ عبادات یا معاملات یا معاشرات سب میں سنتِ نبوی ﷺ کی جھلک ہو اور اتباعِ رسول ﷺ کا جذبہ ہو۔

سوال : نبی کریم علیہ السلام نے اکل طیب کو عمل بالسنۃ پر کیوں مقید فرمایا؟

جواب : اکل طیب کو عمل بالسنۃ پر اس لیے مقید فرمایا کہ اعمال صالحہ کی توفیق بغیر اکل حلال ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں انبیاء علیہم السلام کو پہلے اکل طیبات کا حکم دیا، پھر اس پر عملِ صالح کو عطف کیا (یٰۤاَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا (پ۱۸ مؤمنون)

قولہٗ بَوَائِقَہٗ : ای شرورہٗ تعمیم ہے دینی ہوں یا دنیوی اسلام میں دو قسم کے حقوق ہیں ۱ حقوق اللہ ۲ حقوق العباد۔ اس حدیث میں دونوں کی ادائیگی

کی طرف اجمالاً اشارہ فرمایا یعنی مَنْ عَمِلَ فِیْ سُنَّتِہٖ حقوق اللہ کی طرف اور امن الناس سے حقوق العباد کی طرف اشارہ فرمادیا اور ظاہر بات ہے کہ جو دونوں حقوق ادا کرے گا اس کے جنتی ہونے میں کیا شک ہے۔

قولہٗ فَقَالَ رَجُلٌ : بطور تعجب کے سوال کر رہے ہیں کہ صفت مذکورہ کے موصوف تو تمہارے زمانہ مبارک میں بہت ہیں مستقبل میں ہونگے یا نہیں؟ اس کے جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہمارے بعد بھی ایسے لوگ ہوں گے یعنی اس امّت سے خیر و بھلائی بالکل ختم نہیں ہو گی۔ البتہ فتنہ و فساد کی وجہ سے کم ہو جائے گی۔ یعنی ان صفات سے موصوف لوگ میرے زمانہ کے ساتھ خاص نہیں بلکہ مستقبل میں بھی ہوں گے اگرچہ قلت وکثرت کا فرق ہو گا کہ بعد والے بہ نسبت پہلے کے کم ہوں گے لیکن فی ذاتہ بہت ہونگے۔

قولہٗ فِیْ قُرُوْنٍ بَعْدِیْ : یہ اشارہ ہے اس حدیث کی طرف :۔
خَیْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِیْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ

وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّکُمْ فِیْ زَمَانٍ مَنْ تَرَکَ مِنْکُمْ عُشْرَ مَا اُمِرَ بِہٖ ھَلَکَ ثُمَّ یَاْتِیْ زَمَانٌ مَنْ عَمِلَ مِنْھُمْ بِعُشْرِ مَا اُمِرَ بِہٖ نَجَا :

ترجمہ : روایت ہے حضرت ابوہریرہؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ تم ایسے زمانہ میں ہو کہ جو احکام شرعیہ کا دسواں حصّہ چھوڑ دے وہ ہلاک ہو جائے پھر وہ زمانہ آئے گا کہ جو احکام کے دسویں حصّہ پر عمل کرے نجات پاوے گا۔

سوال ؛ مَا اُمِرَ سے کیا مراد ہے کیونکہ اگر مَا اُمِرَ سے فرائض مراد لیے جائیں تو حصّہ اوّل " مَنْ تَرَکَ مِنْکُمْ عُشْرَ مَا اُمِرَ بِہٖ ھَلَکَ " صحیح ہوتا ہے کہ عشر عشیر بھی ترک کر دیں تو نجات نہیں ہو گی مگر دوسرے حصّہ " مَنْ عَمِلَ مِنْھُمْ بِعُشْرِ مَا اُمِرَ بِہٖ

نجا ،، کا مطلب صحیح نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ فرائض کا ایک جزو بھی ترک کرنے سے ہلاکت یقینی ہے۔ چہ جائیکہ نو حصّہ ترک کرنے سے نجات ہو، اور اگر مَا اُمِرَ سے سنن و مستحبات مراد لیے جائیں تو دوسرے حصّہ کا مطلب صحیح ہوتا ہے کہ دسویں حصّہ پر عمل کرنے سے نجات ہوگی۔ کیونکہ سنن و مستحبات بالکل نہ کرنے سے بھی نجات ہوگی۔ چہ جائیکہ کچھ کیا۔ مگر پہلے حصّہ کا مطلب ٹھیک نہیں ہوتا۔ کیونکہ صحابہ کرامؓ پر بھی سُنن و مستحب پر عمل کرنا ضروری نہیں کہ عشر عشیر کو چھوڑ دینے سے ہلاکت ہوتی ہو۔

جوابِ اوّل مَا اُمِرَ بِہٖ سے مُراد امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہے تمام اُمورات شرعیہ مراد نہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ اس حدیث میں عہدِ رسالت اور ما بعد کے فرق کا پتہ چلتا ہے کہ عہدِ نبویؐ میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا چرچا اتنی شدّت وکثرت کے ساتھ تھا کہ ذراسی لغزش بھی ہلاکت وتباہی کا باعث بن سکتی تھی۔ لیکن آخر زمانہ میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں کمی واقع ہوجائے گی۔ تو اس وقت اتنا فرق ہوگا کہ اس وقت دسویں حصہ پر عمل کر لینے سے (یعنی امر بالمعروف ونہی عن المنکر پر) تو نجات ہوجائے گی۔

جوابِ دوّم : مَا اُمِرَ بِہٖ سے مراد اخلاص ہے یعنی اس زمانہ میں جتنا اخلاص ضروری ہے قیامت کے قریب اگر اس کا دسواں حصّہ بھی کسی میں موجود ہوگا تو کافی ہے۔

وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا ضَلَّ قَوْمٌ بَعْدَ ھُدًی کَانُوْا عَلَیْہِ اِلَّا اُوْتُوا الْجَدَلَ ثُمَّ قَرَءَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ھٰذِہِ الْاٰیَۃَ " مَا ضَرَبُوْہُ لَکَ اِلَّا جَدَلًا بَلْ

ترجمہ : روایت ہے حضرت ابو امامہؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے کہ کوئی قوم ہدایت پر رہنے کے بعد گمراہ نہیں ہوتی مگر اس میں جھگڑے پیدا ہوگئے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی کہ وہ لوگ آپ کے لیے مثال نہیں بیان کرتے مگر جھگڑنے کے لیے بلکہ وہ

هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ ؔ	قوم جھگڑالو ہے ۔

قولہٗ اَلْجَدَلُ : جدال کے متعدد معانی ہیں ۱؎ هُوَ الْخُصُوْمَةُ بِالْبَاطِلِ مَعَ نَبِيِّهِمْ ۲؎ اَلْمُقَابَلَةُ الْحُجَّةُ بِالْحُجَّةِ ۳؎ اَلْمُرَادُ بِالْجَدَلِ اَلْعِنَادُ : یعنی ضد۔ تینوں معانی اپنے مقام پر صحیح ہیں۔ جدال دو قسم ہے :۔

اوّل : جدال بالحق یہ حرام اور کفّار کی عادت تھی ۔

دوم : جدال للحق حق کے لیے اور حق کے دفاع کے لیے لڑنا یہ مستحسن ہے اور مؤمنین کا کام ہے یہاں پر جدال بالحق مراد ہے ۔

خُلَاصَةُ الْحَدِيث

یہ ہے کہ دینی معاملات اور شرعی مسائل میں جدال کرنا جائز نہیں کیونکہ زمانہ ماسبق میں ہدایت یافتہ اقوام کی گمراہی کا بیشتر سبب یہی تھا کہ لوگ دینی معاملات میں جھگڑتے رہتے تھے اور یہ حرکت علماء سوء اور نفسانی خواہشات کے تابع لوگ کیا کرتے تھے ۔

آیت کا شانِ نزول

یقول ابوالاسعاد : آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مثال کے طور پر جو آیت تلاوت فرمائی اس کا شانِ نزول یہ ہے کہ جب آیت " اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ اَنْتُمْ لَهَا وَارِدُوْنَ ﴿﴾ اے مشرکین تم اور غیر اللہ جنہیں تم پوجتے ہو دوزخ کے ایندھن ہیں " نازل ہوئی تو مشرکین مکہ بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ جتنے غیر اللہ معبود ہیں وہ سب دوزخ میں جائیں گے اور حضرت عیسٰی علیہ السلام نصارٰی کے معبود ہیں جن کی وہ عبادت کرتے ہیں لہٰذا وہ بھی اس آیت کے مطابق دوزخ میں جائیں گے ۔ اور ہمارے بت حضرت عیسٰی علیہ السلام سے بہتر نہیں ہیں اس لیے ہم اس پر راضی ہیں کہ ہمارے بت بھی حضرت عیسٰی علیہ السلام کے ساتھ دوزخ میں جائیں گے ۔

مُشرکین کے اس غلط نظریہ کے رد میں آیت مذکورہ " مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا (پ ۲۵ زُخرف) نازل ہوئی جس کا مطلب یہ ہے کہ اے محبوبِ خدا سیدنا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم یہ مشرک لوگ اس آیت کو سن کر تم سے جو بحث کرتے ہیں اور اپنی طرف سے غلط معنیٰ مراد لیتے ہیں وہ محض ان کی ضد اور ہٹ دھرمی ہے۔ حالانکہ یہ صاحبِ زبان ہیں اور عربی زبان کے قواعد ان کو معلوم ہیں اگر ان قواعد ہی کو معلوم کرلیں تو ان کو اس کا جواب مل سکتا ہے۔ مگر "میں نہ مانوں" کا کیا حل ہے۔ مختصرًا دو جواب پیشِ خدمت ہیں :۔

جوابِ اوّل مَا غیر ذوالعقول کے لیے استعمال ہوتا ہے یعنی جہنم میں بُت ڈالے جائیں گے، پھر یہ اعتراض کہ ان کو تکلیف تو نہیں ہوگی تو عرض ہے کہ ان کا جہنم میں ڈالا جانا بطور توہین و تذلیل کے ہوگا کہ دیکھو جو معبود ہوتا ہے اُسے تو نفع ہی نفع ہوتا ہے دوسروں کی مدد تو کجا آج اپنا یہ حال ہے کہ جہنم میں پڑے ہوئے ہیں۔

جوابِ دوم اس کا جواب خود قرآن مُقدس نے بیان فرما دیا ہے کہ :۔
اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰۤى اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ۝ (پ ۱۷ الانبیاء) یہ کہ جن لوگوں نے ان کی عبادت کی اور وہ اس عبادت کرانے پر راضی تھے ان کو ایندھن بنائیں گے جو راضی نہیں تھے وہ نہیں جائیں گے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام عبادت کرانے پر راضی نہ تھے اور نہ انہوں نے حکم دیا تھا ان کا حال تو یہ ہے "

"وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسَى ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قَالَ سُبْحٰنَكَ الخ پ مائدہ)

وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ كَانَ یَقُوْلُ لَا تُشَدِّدُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ فَیُشَدِّدُ اللّٰهُ عَلَیْكُمْ ؛

ترجمہ : روایت ہے حضرت انس رضی سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ اپنی جانوں پر سختی نہ کرو ورنہ اللہ تم پر سختی کرے گا۔

قولہٗ لَا تُشَدِّدُوْا عَلیٰ اَنْفُسِکُمْ : اس جملہ کے محدثین حضرات نے دو مطلب بیان فرمائے ہیں :-

اوّل : یہ کہ تم اپنی جانوں کو خواہ مخواہ محنت و مشقت کا عادی نہ کرو یعنی ریاضت میں ایسے طریقے اختیار نہ کرو جن کو تمہارے قوای برداشت کرنے کے اہل نہ ہوں کَصِیَامِ الدَّھْرِ ہمیشہ روزہ رکھنا ساری رات عبادت کرنا، عورتوں سے مِنْ کلِّ الوجوہ اعتزال کرنا وغیرہ یہ کام نہ کرو۔ دوم : اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی چیزوں کو اپنے اوپر حرام نہ کرو جو خدا نے تمہارے لیے مباح قرار دی ہیں اگر تم سختی کرو گے تو خدا تمہارے اوپر ایسی چیزوں کو فرض کر دے گا لیکن تمہارے اندر اتنی طاقت نہیں کہ تم ان کا حق ادا کر سکو تو نتیجہ ہلاکت و تباہی ہوگا جیسے بنی اسرائیل کا حال تھا، انہوں نے بھی سختی کی اور اللہ نے بھی سختی کر دی۔

یقول ابو الاسعاد : بعض حضرات نے لَا تُشَدِّدُوْا عَلَی اَنْفُسِکُمْ سے مراد ایسے سوال لیے ہیں جن کا تعلق تعمّق فی الدین سے ہوگا یعنی دین اور شریعت مقدسہ میں بے مواقع سوال نہ کرو۔ جیسے یہود نے بقرہ کے متعلق مختلف سوال کیے آخر مشقت میں پڑ گئے کہ گائے کی کھال بھر سونا دینا پڑا۔

قولہٗ فَاِنَّ قَوْمًا شَدَّدُوْا ۔ مثلاً نصاریٰ نے رہبانیت اور یہود نے احباریت کو ایجاد کیا اور پھر مشقت کی وجہ سے پورا نہ کیا۔

قولہٗ فَتِلْکَ بَقَایَاھُمْ : الفاء لِلتَّعْقِیْبِ یہ اشارہ ہے ذہن کی طرف جو جماعت کا تصور ہے۔

قولہٗ اَلصَّوَامِعَ : صوامع صومعۃ کی جمع ہے صومعہ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں عیسائی عبادت کیا کرتے ہیں جسے گرجا گھر کہا جاتا ہے۔

قولہٗ الدِّیَارَ : دیا دیر کی جمع ہے یعنی یہودیوں کی عبادت گاہ جسے کلیسا بھی کہتے ہیں۔

قولہٗ رَھْبَانِیَّۃً : رھبانیّت کہتے ہیں کہ عبادت و ریاضت بہت زیادہ کی جائے اور اپنے نفس کو مشقتوں اور تکلیفوں میں ڈالا جائے دنیا سے بالکل بے تعلق ہو جائے، ٹاٹ کے پیراہن استعمال کرے، گردن میں زنجیر باندھ لے، قوت مردمی ختم

کرڈالے - چنانچہ اہل کتاب نے رہبانیت اپنے اوپر لازم کر رکھی تھی اور ان کے عابد وزاہد لوگ ایسا کرتے تھے - چنانچہ نبیٔ کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تشریف لاتے ہی اعلان فرمایا "لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ"

قولہ وَرَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ :

یہ قرآن مقدس کی آیت کا حصہ ہے یہاں رَهْبَانِيَّةً مفعول بہ کی بناء پر منصوب ہے۔ مفعول بہ کے عامل جن چار جگہ میں حذف کرنا واجب ہے ان میں سے ایک "مَا اُضْمِرَ عَامِلُهُ عَلٰى شَرِيْطَةِ التَّفْسِيْرِ" ہے اس قاعدہ کی بناء پر ابتدعوا عامل کو یہاں حذف کریں گے کیونکہ ابْتَدَعُوهَا سے اس قول کی تفسیر کی جارہی ہے اور وہ مفعول بہ کی ضمیر کے ساتھ مشغول ہوا ہے اب عبارت بنے گی "ابتدعوها رهبانيّة مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ اي مَا اَمَرْنَاهُمْ بِهَا"، (جلالین شریف صـ۴۵۱ ج ۲) رہبانیت ہم نے شروع نہیں کی اور نہ ہم نے اس کا امر کیا خود انہوں نے ابتداء کی ہے۔

وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَزَلَ الْقُرْاٰنُ عَلٰى خَمْسَةِ اَوْجُهٍ حَلَالٍ وَحَرَامٍ وَمُحْكَمٍ وَمُتَشَابِهٍ وَاَمْثَالٍ فَاَحِلُّوا الْحَلَالَ وَحَرِّمُوا الْحَرَامَ :

ترجمہ : روایت ہے حضرت ابو ہریرہؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ قرآن پاک پانچ قسموں پر اترا - حلال، حرام، محکم اور متشابہ اور مثالیں - لہٰذا حلال کو حلال جانو اور حرام کو حرام مانو !

قولہ اَوْجُهٍ : اَوْجُه بمعنٰی قسم بھی ہے کہ قرآن پاک کے مضامین باعتبار اقسام کے پانچ ہیں یا بعض حضرات کے نزدیک اَوْجُه بمعنٰی بیان کے ہے کہ قرآن مقدس اپنے اسلوب بیان کے اعتبار سے پانچ طرح کی آیات پر مشتمل ہے۔

اوّل : ایسی آیات جن میں حلال کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کے احکام بتائے گئے ہیں

دوئم : ایسی آیات جن میں حرام کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کے احکام بتائے گئے ہیں
سوئم : ایسی آیات جن کے معانی و مطالب میں کوئی ابہام و اشتباہ نہیں ہے بلکہ وہ اپنے مقصد و مُراد کو صاف اور واضح کرتی ہیں۔ جیسے اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ (پ۱) اس حدیث میں ایسی ہی آیات کو محکم کہا گیا ہے۔

چہارم : ایسی آیات جن کی مُراد واضح نہیں ہے اور نہ ان کے معنیٰ و مطالب کسی پر ظاہر کیے گئے ہیں جیسے " یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ پ۲۶ " حدیث پاک میں ایسی ہی آیات کو متشابہ کہا گیا ہے ان کے بارے میں حکم یہ ہے کہ " نُؤْمِنُ بِہٖ وَلَا نَسْئَلُ عَنْ مَعَانِیْہِ وَمَطَالِبِہٖ " مزید تشریح محکم و متشابہ کی مشکوٰۃ شریف صـ۲۸ ج ۱ باب الاعتصام فصل اوّل حدیث عائشہؓ میں ہو چکی ہے۔

پنجم : ایسی آیات جن میں سابقہ امتوں کے حالات و واقعات کا ذکر کیا گیا ہے یعنی نیک اقوام کی فلاح و کامرانی اور بد اقوام کی تباہی و بربادی کے واقعات بتائے گئے ہیں ان کے بارہ میں حکم یہ ہے کہ ان اَمثلہ سے عبرت حاصل کرو کہ ایمان والوں کا انجام بخیر ہوا، نجات ملی، مگر نافرمان سرکش لوگوں کا انجام باعثِ عبرت ہوا کہ آج بھی ان کے واقعات داستان عبرت ہیں۔

قولُہٗ وھٰذا لفظ المصابیح وروی البیھقی : یہ صاحبِ مصابیح پر ایک قسم کا اعتراض ہے کہ مجھے ان کے الفاظ نہیں مل سکے۔

وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْاَمْرُ ثَلَاثَۃٌ اَمْرٌ بَیِّنٌ رُشْدُہٗ فَاتَّبِعْہُ وَاَمْرٌ بَیِّنٌ غَیُّہٗ فَاجْتَنِبْہُ وَاَمْرٌ اُخْتُلِفَ فِیْہِ فَکِلْہُ اِلَی اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ :

ترجمہ : روایت ہے حضرت ابنِ عباسؓ سے فرماتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چیزیں تین طرح کی ہیں ایک وہ جس کا ہدایت ہونا ظاہر ہے اس کی پیروی کرو ایک وہ جس کا گمراہ ہونا ظاہر ہے اس سے بچو، ایک وہ جو مختلف ہے اسے اللہ کے حوالہ کرو۔

قولہٗ اَلْاَمْرُ ثَلَاثَۃٌ : ثَلَاثَۃٌ کی تنوین مضاف الیہ کے عوض ہے
" ای ثلاثۃُ اقسامٍ یا ثَلَاثَۃُ اَنْوَاعٍ ۔
قولہٗ اَمْرٌ ۔ اَیْ مِنْھَا اَمْرٌ اَوْاَحَدُھَا اَمْرٌ :
قولہٗ بَیِّنٌ رُشْدُہٗ : ای ظَاھِرٌ ثوابہٖ ۔ جس کی ہدایت واضح ہے یہ پہلی قسم ہے یہ ایسی چیزیں ہیں جن کا حق ہونا واضح طور پر احادیث سے ثابت ہے (جیسے نماز روزہ حج زکوٰۃ وغیرہ) ان کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ ان کی پیروی کرو۔
قولہٗ اَمْرٌ بَیِّنٌ غَیُّہٗ : ای ضَلَالتُہٗ یعنی وہ امر جس کی گمراہی واضح ہے یعنی ایسی چیزیں جن کا باطل و فاسد ہونا ظاہر ہو جیسے کفار کی رسموں اور ان کے طور طریقوں پر عمل کرنا یہ گمراہی ہے ان سے بچنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔
قولہٗ اَمْرٌ اُخْتُلِفَ فِیْہِ : اختلاف کے مصداق میں تین قول ہیں :۔
اوّل : اس سے آیات متشابہ مراد ہیں۔
دوم : اس سے وہ مسائل مراد ہیں جن کے بارہ میں دلائل مختلف ہیں ۔ جیسے سؤر حمار ، اطفال مشرکین وغیرہ ۔
سوم : وہ امور مراد ہیں جن کے بارہ میں شریعت نے کچھ نہ کہا ہو اور اس میں اختلاف کرتے ہوں تو انہیں اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنا چاہیئے کما فی تعیین اوقات القیامۃ
چنانچہ علامہ ہروی المعروف بہ مُلّا علی قاریؒ لکھتے ہیں :۔
ای فوّض اَمْرہٗ الی اللہ تعالیٰ فلا تقل فیہ شیئًا من نفی او اثباتٍ (مرقات ص۲۵۴ ج۱)
علامہ محدّث عبدالحق دہلویؒ فرماتے ہیں :۔
پس بسپار او را بخدا و توقف کن دراں وطلب کن رشد و ہدایت دراں (اشعۃ اللمعات ص۱۴۶ ج۱)

اَلفَصلُ الثّالِث — یہ تیسری فصل ہے۔

عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ الشَّیْطَانَ ذِئْبُ الْاِنْسَانِ کَذِئْبِ الْاِنْسَانِ کَذِئْبِ الْغَنَمِ یَاْخُذُ الشَّاذَّۃَ الْقَاصِیَۃَ وَالنَّاحِیَۃَ :

ترجمہ : روایت ہے حضرت معاذ بن جبل سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ شیطان آدمی کا بھیڑیا ہے جیسے بکریوں کا بھیڑیا الگ اور دور اور کنارے والی کو پکڑتا ہے۔

قولہٗ ذِئْبُ الْاِنْسَانِ : ذئب انسان کی صفت حقیقیہ نہیں بلکہ یہ صفت مُستعار یہ ہے عاریۃً لی گئی ہے فساد اور ہلاکت کے لیے جس طرح ذئب غنم کو ھلاک بھی کرتا ہے اور خراب کرتا ہے بعینہٖ شیطان انسان کو گمراہ بھی کرتا ہے اور برباد بھی کرتا ہے۔

قولہٗ کَذِئْبِ الْغَنَمِ : بکریوں کے ذئب میں دو چیزیں ہوتی ہیں ۱ عداوت ۲ ہلاکت۔ کما فی قولہٖ تعالیٰ " اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَکُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْہُ عَدُوًّا۔ (پ ۲۲ فاطر)

قولہٗ اَلشَّاذَّۃَ : غنم تین قسمیں ہیں ان میں پہلی شاذہ ہے۔ شاذّۃ بتشدید الذال اس کا معنیٰ ہے " ھِیَ النَّافِرَۃُ الَّتِیْ لَمْ تُؤْنَسْ بِاَخَوَاتِھَا وَلَمْ تَخْتَلِطْ بِھِنَّ " وہ اکیلی بکری جو وحشت کی وجہ سے ریوڑ سے بھاگ جائے اور مُتنفّر ہو جائے۔

قولہٗ وَالْقَاصِیَۃَ : ابعد عَنْھُنَّ قاصیہ وہ بکری ہے جو مُتنفّر تو نہ ہو لیکن گھاس کھانے کے لیے ریوڑ سے الگ ہو جائے۔

قولہٗ اَلنَّاحِیَہ : ناحیہ وہ بکری ہے جو ریوڑ سے الگ تو نہ ہو مگر کنارے کنارے چلے۔

یقول العبد سعاد : خلاصہ تشبیہ یہ ہے کہ دنیا ایک جنگل ہے جس میں ہم لوگ مثل بکریوں کے ہیں، شیطان بھیڑیا ہے جو ہر وقت ہماری تاک میں ہے جو جماعۃ المسلمین سے الگ رہا شیطان کے شکار میں آگیا۔

قولہٗ اِیَّاکُمْ وَالشِّعَابَ : شِعَابٌ شُعْبَۃٌ کی جمع ہے، دو پہاڑیوں کے درمیان تنگ راستہ کو شعبہ کہتے ہیں۔ یعنی کتاب وسُنّت کے سیدھے راستہ کو چھوڑ کر پر خطر بدعت کے راستے اختیار کرنا بمنزلہ پہاڑی درّوں اور گھاٹیوں کے ہے اور اجماعِ امّت کی شاہراہ سے مُنفرد ہونا یہ سبب ہلاکت ہے۔

قولہٗ وَعَلَیْکُمْ بِالْجَمَاعَۃِ الْعَامَّۃِ : عامۃ جماعۃ کے لیے تاکید در تاکید ہے مطلب یہ ہے کہ جمہور علماء اہل السنّۃ کے ساتھ رہو۔

مطلوب حدیث

حدیث مذکورہ کے مُحدّثین حضرات نے دو مطلب بیان فرمائے ہیں:۔

اوّل: کہ جس طرح بھیڑیا جب کسی ایسی بکری کو پا لیتا ہے جو ریوڑ سے الگ ہو گئی ہو تو وہ اس بات پر دلیر ہو جاتا ہے اور اسے اٹھا کر لے جاتا ہے یہی حال اس آدمی کا ہے جو عُلماء صالحین کی جماعت سے الگ ہو جاتا ہے اور اپنے عقل وفہم کے بل بوتہ پر نئے نئے مذاہب نکالتا ہے اور نئے مسلک پیدا کرتا ہے تو اس پر شیطان کو پوری طرح تسلّط ہو جاتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسا شخص شیطان کے چُنگل میں پوری طرح آکر گمراہی کی انتہائی گہری گھاٹیوں پر جا گرتا ہے۔

دوم: دوسرا مطلب یہ ہے کہ جنگلوں، پہاڑوں میں راہبوں کی طرح نہ رہو کہ درندوں، ڈاکوؤں، جنّوں وغیرہ کا خطرہ ہوتا ہے۔

وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

ترجمہ: روایت ہے حضرت ابوذرؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم

مَنْ فَارَقَ الْجَمَاعَةَ شِبْرًا فَقَدْ خَلَعَ رِبْقَةَ الْإِسْلَامِ مِنْ عُنُقِهِ :	نے جو جماعت سے بالشت بھر بچھڑا اس نے اسلام کی رسّی اپنی گردن سے اتار دی۔

قولہٗ فَارَقَ : تفریق سے مراد تو جدائی وغیرہ ہوتی ہے مگر یہاں مفارقۃ الجماعۃ کنایہ ہے ترکِ السُّنۃ واتباع البدعۃ سے (کما قال الابھری)

قولہٗ شِبْرًا : شبر کا معنیٰ ہوتا ہے ایک بالشت۔ محدثین حضرات نے لکھا ہے کہ مقام ہذا پر شِبْرًا سے ساعۃ قلیلہ مراد ہے یعنی کنایہ ہے قلّت سے کہ تھوڑے وقت میں اور تھوڑے احکام میں بھی اجماع اور جمہور کی خلاف ورزی کرنا قابل وعید ہے۔

قولہٗ خَلَعَ : ای نزع (فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ : پ طٰہٰ)

قولہٗ رِبْقَۃَ الْاِسْلَامِ : بعض محدثین حضرات نے ربقہ کا معنیٰ ذمہ بھی لیا ہے کہ جو آدمی جماعت سے ایک بالشت بھی دور ہوا تو اس نے اسلام کی ذمہ داری گردن سے اتار دی۔ مگر جمہور حضرات کے نزدیک ربقہ بمعنیٰ پٹہ، حلقہ، رسی جو جانوروں کے گلے میں ڈالا جاتا ہے پھر اس سے باندھا جاتا ہے مگر استعیرت لانقیاد الرجل:

سوال ۔ فارق الجماعۃ سے مراد بدعتی ہے حالانکہ اہل السنۃ والجماعۃ کے نزدیک بدعتی کافر نہیں ۔جب کہ حضور علیہ السلام فرما رہے ہیں " فَقَدْ خلع ربقۃ الاسلام " تو وہ مسلمان نہ رہا۔

جواب اوّل : سلام سے مراد کمالِ اسلام ہے یعنی کمالِ اسلام کی رسّی نکال دی نہ کہ مطلق اسلام کی۔

جواب دوم : حلقہ اسلام کے گردن سے نکال دینے کا یہ حکم بطور تغلیظ اور تشدید کے ہے کہ یہ رویہ آہستہ آہستہ دائرۂ اسلام سے خارج کر دے گا۔

یقول ابو الاسعاد خُلاصَۃً : جو آدمی ایک ساعۃ کے لیے اہل السنۃ والجماعۃ کے عقیدہ سے الگ ہوا یا کسی معمولی عقیدہ میں بھی ان کا مخالف ہوا تو آئندہ اس کے اسلام کا خطرہ ہے بکری وہی محفوظ رہتی ہے جو منخ سے بندھی رہے مالک کی قید سے آزاد ہوجانا

بکری کی ہلاکت ہے مسلمانوں کی جماعت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسی ہے جس میں ہرشی بندھا ہوا ہے ۔ یہ نہ سمجھو کہ فرض کا انکار ہی خطرناک ہے کبھی مستحبات کا انکار بھی ہلاکت کا باعث بن جاتا ہے ۔ سیدنا عبداللہؓ بن سلام نے صرف اونٹ کے گوشت سے بچنا تھا کہ رب نے فرمایا " یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّیْطٰنِ (پ۲ بقرہ)

وَعَنْ مَالِكِ بْنِ اَنَسٍؓ مُرْسَلاً قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ تَرَکْتُ فِیْکُمْ اَمْرَیْنِ لَنْ تَضِلُّوْا مَا تَمَسَّکْتُمْ بِھِمَا کِتَابُ اللّٰہِ وَسُنَّۃُ رَسُوْلِہٖ :

ترجمہ : حضرت انسؓ بن مالک (مُرْسَلاً) فرماتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ میں نے تم میں دو چیزیں چھوڑی ہیں جب تک انہیں مضبوطی سے تھامے رہو گے ہرگز گمراہ نہ ہو گے ، اللہ کی کتاب اور اس کے پیغمبر کی سنّت ۔

قولہٗ مُرْسَلاً : مرسل کی تعریف یہ ہے " اعلم ان المرسل ھو ان یقول التابعی قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ھذا ھو المشھور عند اھل الحدیث " ، محدثینؒ کے نزدیک مرسل وہ حدیث ہے جس میں صحابی کا ذکر نہ ہو ، تابعی یہ کہہ دیں کہ حضورؐ نے یہ فرمایا مگر فقہاء کے نزدیک وہ حدیث بھی مرسل ہے جس میں تابعی اور صحابی دونوں کا ذکر نہ ہو ۔ تبع تابعی فرما دیں کہ حضور علیہ السلام نے یہ فرمایا یہاں فقہی مرسل مراد ہے کیونکہ امام مالکؒ تابعی نہیں تبع تابعی ہیں فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا ۔

قولہٗ اَمْرَیْنِ : امرین کے دو معنیٰ ہیں ۱ امرین ای شیئین عظیمین ۲ امرین بمعنی حکمین بفتحھما ۔

خُلاصۃ الحدیث : حدیث باب میں تمسک قرآن وحدیث پر مسلمانوں کو برانگیختہ کرنا ہے کہ جب تک یہ دو چیزیں قابلِ عمل ہونگی تو گمراہی بالکل نہیں ہوگی جب یہ دونوں ناقابلِ عمل سمجھی جائیں گی (نعوذ باللہ من ذٰلک) اور علماء اپنے مزاج کے مطابق غلط فیصلے کریں گے تو گمراہی گمراہی ہوگی ضلّوا واضلّوا۔

وَعَنْ غُضَیْفِ ابْنِ الحَارِثِ الثُّمَالِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا اَحْدَثَ قَوْمٌ بِدْعَۃً اِلَّا رُفِعَ مِثْلُھَا مِنَ السُّنَّۃِ فَتَمَسُّکٌ بِسُنَّۃٍ خَیْرٌ مِنْ اِحْدَاثِ بِدْعَۃٍ:

ترجمہ: حضرت غضیفؓ بن حارث ثمالی فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ کوئی قوم بدعت نہیں ایجاد کرتی مگر اسی قدر سُنّت اٹھالی جاتی ہے لہٰذا سنّت کو پکڑنا بدعت کی ایجاد سے بہتر ہے۔

قولہٗ مِثْلُھَا : طیبیؒ نے لکھا ہے یہاں ضدّین ایک دوسرے کے مثل ہیں۔ کما فی قولہٖ تعالیٰ " جَاءَ الْحَقُّ وَزَھَقَ الْبَاطِلُ (پ۱۵ الاسراء) پس یہاں بھی ایسا ہے کہ احداث سُنّت رفع بدعت کو اور احداث بدعت رفع سُنّت کو لازم ہے۔

قولہٗ خَیْرٌ : یہاں خیر معنیٰ تفضیل سے مجرّد ہے کما فی قولہٖ تعالیٰ " فَتَبَارَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ (پ۱۸ مؤمنون) ورنہ یہ لازم آئے گا کہ بدعت فی نفسہٖ خیر ہو گو کم درجہ کیوں نہ ہو۔

خُلاصۃُ الحدیث سُنّت پر عمل کرنا اگرچہ وہ معمولی درجہ کی کیوں نہ ہو بدعت پیدا کرنے اور بدعت پر عمل کرنے سے بہتر ہے اگرچہ وہ بدعت حسنہ ہو۔ اس لیے سنت نبویؐ کی اتباع سے روح میں جلا پیدا ہوتا ہے جس کے نور سے قلب و دماغ منوّر ہوتے ہیں اس کے برخلاف بدعت ظلمت وگمراہی کا سبب ہے۔

وَعَنْ حَسَّانٌ قَالَ مَاتبدع قَوْمٌ بِدْعَةً فِيْ دِيْنِهِمْ اِلَّا نَزَعَ اللّٰهُ مِنْ سُنَّتِهِمْ مِثْلَهَا ثُمَّ لَا يُعِيْدُهَا اِلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ

ترجمہ: روایت ہے حضرت حسان رضی اللہ عنہ سے فرمایا کوئی قوم اپنے دین میں بدعت نہیں ایجاد کرتی مگر اللہ تعالیٰ اسی قدر ان کی سنت اٹھا لیتا ہے پھر اسے تا قیامت ان میں نہیں واپس کرتا۔

یقول ابوالاسعاد: اس حدیث شریف میں کوئی بحث نہیں یہ سابقہ روایت کی توثیق کر رہی ہے جو غضیف رضی اللہ عنہ کی روایت ہے۔ محدثین رحمہم اللہ نے لکھا ہے کہ اس سُنّت کا واپس نہ آنا اس کی مثال اس درخت کی ہے جس کو جڑ سے کاٹ دو پھر جتنی کوشش کرو کہ یہ دوبارہ لگ جائے اور پھل پھول دینے لگے یہ ناممکن ہے یہی حال سُنّت کا ہے جو گئی وہ قیامت تک واپس نہ ہو گی یعنی سُنّت درخت ہے اور یہ بدعتیں اس کا پھاوڑا ہیں۔

اسمائے رجال

حالات حضرت غضیف رضی اللہ عنہ بن الحارث

(نام غضیف (غضیف میں غین معجمہ پر ضمہ ضاد معجمہ پر فتحہ اور یار ساکن آخر میں فا ہے)

حارث ثمالی کے بیٹے ہیں (ثمالی میں ثا ۳ نقطوں والی مضموم اور میم بغیر تشدید ہے) ابو اسمار کنیت اور وطن شام ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا۔ ان کے صحابی ہونے میں اختلاف ہے لیکن خود ان کا بیان ہے کہ میری پیدائش آپ کے زمانہ مبارک میں ہوئی ہے میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے مصافحہ فرمایا هٰکذا قالہ ابن حبان فی کتاب الثقات۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ابوذر رضی اللہ عنہ و عائشہ رضی اللہ عنہا سے حدیث کی سماعت فرمائی اور ان سے مکحول اور سلیم بن عامر نے روایت کی۔

وَعَنْ اِبْرَاهِيْمَ بْنِ مَيْسَرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ وَقَّرَ صَاحِبَ بِدْعَةٍ فَقَدْ اَعَانَ عَلٰى هَدْمِ الْاِسْلَامِ :

ترجمہ : روایت ہے حضرت ابراہیم بن میسرہؒ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جس نے بدعتی کی تعظیم کی یقیناً اس نے اسلام ڈھانے پر مدد دی۔

قولہٗ مَنْ وَقَّرَ : بِالتَّشْدِيْدِ : اى عَظَّمَ وَنَصَرَ : حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ توقیر یہ ہے کہ بدعتی کے لیے کھڑا ہو جائے یا اس کو صدر مجلس بنائے یا بلا عذر اس کی خدمت کرے۔

قولہٗ صَاحِبَ بِدْعَةٍ : چاہے وہ بدعت کا داعی ہو یا نہ یا صرف عامل ہے۔

قولہٗ هَدْمِ الاسلام : علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ " وَهُوَ مِنْ باب التغليظ. عند البعض حقیقت پر محمول ہے۔ اور اسلام سے مُراد سنّت ہے۔

سوال : اس میں کیا حکمت ہے کہ بدعتی کی تعظیم کرنے سے اھدام اسلام لازم آتا ہے۔

جواب : اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی بدعتی کی تعظیم و عزت کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے مقابلہ میں اسے سُنّت کی عزت و احترام کا کوئی خیال نہیں تو یہ سنّت کی تحقیر کا باعث بنا اور ظاہر ہے کہ سنّت کی تحقیر اسلام کی عمارت کو اجاڑنے کے مُترادف ہے اور اسی پر اہل السنۃ کی تحقیر کو قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی پابند شرع و سنّت کی توہین کرتا ہے۔ تو وہ بھی اس وعید میں شامل ہے کہ اس نے دین کی عمارت یا سُنّت کی عمارت کو نقصان پہنچایا۔

ف : قولہٗ مَيْسَرَةَ : بفتح السین آپ تابعی ہیں طائف شریف کے رہنے والے تھے، بڑے متّقی اور پرہیز گار تھے یہ حدیث مُرسَل ہے کہ اس میں صحابی کا ذکر نہیں۔

وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ مَنْ تَعَلَّمَ كِتَابَ اللّٰهِ ثُمَّ اِتَّبَعَ مَا فِيْهِ هَدَاهُ اللّٰهُ مِنَ الضَّلَالَةِ فِي الدُّنْيَا وَوَقَاهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ سُوْءَ الْحِسَابِ

ترجمہ : روایت ہے حضرت ابن عباسؓ سے فرماتے ہیں جس نے قرآن سیکھا پھر اس کی اتباع کی اللہ تعالیٰ اسے دنیا میں گمراہی سے بچائے گا اور قیامت کے دن سخت عذاب سے محفوظ رکھے گا۔

قولہٗ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ : یہ موقوفاً ہے لا مرفوعاً۔

قولہٗ - مَنْ تَعَلَّمَ كِتَابَ اللّٰهِ - تعلیم میں تعمیم ہے "نظراً حِفظاً اَوْ عِلْماً

قولہٗ : ثُمَّ اتَّبَعَ : اتباع میں بھی عموم ہے " اِعْتِقَادًا اَوْ عَمَلاً

قولہٗ : مَا : اس سے مراد اوامر و نواہی ہیں۔

سوال : هُدٰى کا صلہ مَنْ تو نہیں آتا فکیف فی ھٰذا المقام :

جواب : هُدٰى متضمن ہے معنیٰ اَمَنَهٗ کو یا ثَبَّتَهٗ کو اس لیے صلہ مَنْ آیا ہے اب تقدیر عبارت یوں ہوگی " مَنْ تَعَلَّمَ کتاب اللہ ثم اتبع ما فیہ امنہ اللہ من ان ارتکاب المعاصی مادام لیعیش۔ اور بطور استشہاد یہ آیت تلاوت فرمائی " فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَىٰ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَىٰ (پ ۱۶ طٰہٰ)

قولہٗ وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ : ای ابن عباسؓ :

قولہٗ مَنِ اقْتَدٰى : ای فی الاعتقادات والعبادات۔

خُلاصَةُ الحَدِيث : قرآن پاک کا پڑھنا باعث سعادت اور اس پر عمل کرنا ذریعہ نجات ہے یعنی دین و دنیا دونوں جگہ سعادت حاصل ہوتی ہے۔ دنیا کے اندر خدا کی جانب سے اس پر یہ سعادت ہوگی کہ وہ گنہ سے بچ جائے گا کیونکہ اس نے اپنا رہبر قرآن کو بنایا ہے آخرت میں یہ سعادت ہوگی کہ حساب و کتاب کی سختی سے محفوظ رہے گا۔ چنانچہ قرآن پاک میں بھی یہی دو چیزیں ہیں " فَلَا يَضِلُّ ای فِی الدُّنْیا اور وَلَا يَشْقَىٰ نہ بدبخت ہوگا ای فی الآخرۃ۔

وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا وَعَنْ جَنْبَتَیِ الصِّرَاطِ سُوْرَانِ فِیْھِمَا اَبْوَابٌ مُّفَتَّحَۃٌ وَعَلَی الْاَبْوَابِ سُتُوْرٌ مُّرْخَاۃٌ وَعِنْدَ رَأْسِ الصِّرَاطِ دَاعٍ۔

ترجمہ : روایت ہے حضرت ابن مسعودؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اللہ نے سیدھے راستہ کی مثال قائم فرمائی اور اس راستہ کے دو طرف دو دیواریں ہیں جن میں کھلے ہوئے دروازے ہیں، دروازوں پر پردے لٹکے ہیں، راستہ کے کنارہ پر پکارنے والا کہہ رہا ہے۔

قولہٗ ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا : یہ حدیث قدسی ہے کیونکہ یہ مضمون قرآن میں نہیں آیا۔ حضور علیہ السّلام پر وحی ہوا جسے آپؐ نے رب تعالیٰ کی نسبت سے اپنے الفاظ میں بیان فرمایا اسی کو حدیث قدسی کہتے ہیں۔

قولہٗ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا۔ سیدھے راستہ سے مُراد نبوّت کا راستہ ہے ربّ تک پہنچانے والا! اب وہ قرآنی راستہ ہے اور یہ مثلاً سے بدل واقع ہوا ہے۔

قولہٗ جنبتی : بفتح الجیم وسکون النون ای جانبیہ وطرفیہ : اور یہ جُملہ صِراطًا سے حال واقع ہوا ہے۔

قولہٗ سُوْرَانِ : ای جداران یعنی دیواریں ہیں

قولہٗ فیھما ابوابٌ مُّفتّحۃٌ : سُوران کی صفت ہے۔

قولہٗ ستورٌ : جمع السِتر بکسر السّین۔ یعنی پردے۔

قولہٗ مُرْخَاۃٌ : ای مُرسلۃٌ ومُسْبلۃٌ یعنی لٹکے ہوئے۔

قولہٗ وَلَا تَعْوَّجُوا۔ بتشدید الواو من الاعواج ای لاتمیلوا الی الاطراف : ادھر اُدھر نہ جاؤ سیدھی لائن پر چلو۔

قولہٗ تَلِجْہ ای تَدْخُلْہٗ : کہ تو کھولنے سے اس میں داخل ہو جائے گا۔

قولہٗ وَاَنَّ السُّتُوْرَ الْمُرْخَاۃَ : حدیث پاک کے اندر ستور مرخاۃ کی تفسیر

حُدُوْدُ اللہِ سے کی گئی ہے ۔ مگر علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ لٹکے ہوئے پردے وہ اُمور ہیں جن میں دلائل کے تعارض یا کسی ابہام کی وجہ سے کوئی شبہ رہ جاتا ہے ۔ چُنانچہ شرعی ہدایت یہ ہے کہ ان سے دُور ہی رہنا چاہیے تاکہ اشتباہ کی مضرّت سے بچا جا سکے " کما فی قولہٖ تعالیٰ " تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا (پ۲ بقرہ)
یہ خدا کی حدود ہیں ان کے قریب بھی نہ آؤ۔

قولہٗ وَهُوَ وَاعِظُ اللّٰهِ : اوپر بُلانے والے کے تفسیر وَاعِظُ اللّٰہِ سے (یعنی خُدا واعظ) کی ہے اس سے مُراد وہ فرشتہ ہے جو انسان کو نیکی کے راستہ پر گامزن کرنے کی کوشش کرتا ہے اور بُرائی سے رُوکتا ہے مگر یہ اس وقت ہے جب تائید و توفیق الٰہی ہوگی جیسے قرآن مُقدّس کو رہبر کہا گیا ہے مگر یہ رہبر اس وقت ہے جب مشیّتِ ایزدی ہو۔

خُلاصَۃُ الحَدِیث

اس حدیث میں ایک تشبیہ کو بیان کیا گیا ہے تشبیہ کا حاصل یہ ہے کہ اسلام بمنزلہ راستہ کے ہے اور مُحرّماتِ الٰہیہ بمنزلہ ابواب مفتوحہ کے ہے اور احکام وحدود جو بندوں کو ان مُحرّمات سے روکنے والی ہیں وہ بمنزلہ پردوں کے ہیں اور قرآن بمنزلہ اس داعی کے ہے جو راستہ کے سروں پر بیٹھا ہے اور یوں کہتا ہے " اسْتَقِيْمُوْا عَلَى الصِّرَاطِ وَلَا تَعْوَجُّوْا اور اِلقاء مَلکی جو دل میں اچھا خیال آتا ہے یہ بمنزلہ اس داعی کے ہے جو راستہ کے اوپر بیٹھا ہے اور پکار رہا ہے وَيْحَكَ لَا تَفْتَحْهُ خیال کر افسوس ہے دروازہ نہ کھول کما قال البُسطامیؒ ؎

خواہی کہ رسی بکام برادر دو گام	یک گام ز دنیا و یکے گام ز کام
نیکو مثلے زدہ است پیر بسطام	ز دانۂ طمع ببر کہ رستی ز دام

وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ مَنْ كَانَ مُسْتَنًّا فَلْيَسْتَنَّ بِمَنْ قَدْ مَاتَ فَاِنَّ الْحَيَّ لَا تُؤْمَنُ عَلَيْهِ الْفِتْنَةُ اُولٰٓئِكَ

ترجمہ : روایت ہے حضرت ابن مسعودؓ سے فرماتے ہیں جو سیدھی راہ جانا چاہے وہ وفات یافتہ بزرگوں کی راہ چلے کہ زندہ پر فتنہ سے امن نہیں

اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کانوا افضل هذه الامة :	وہ بزرگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ ہیں جو اس امت کے افضل ترین لوگ ہیں۔

قولہ ابن مسعودؓ قال : یہ حدیث موقوف ہے نہ کہ مرفوع یعنی حضرت ابن مسعودؓ صحابی کا اپنا فرمان ہے صحابی کے قول وفعل حدیث موقوف کہلاتے ہیں اور حضور علیہ السلام کا قول وفعل حدیث مرفوع ہے۔

قولہ مستنا : ای مقتدیا

قولہ فلمستن : ای فلیقتد یعنی جو آدمی کسی کی اقتدار کرنا چاہیے تو اس کو چاہیے کہ وہ ان لوگوں کی اقتدار کرے جو فوت ہو چکے ہیں اسی طرح مستنا بمعنیٰ اتباع اور فلمستن بمعنیٰ فلیتبع بھی ہے یہ معنیٰ نہایت اعلیٰ ہے اس معنیٰ کو علامہ محدث عبدالحق دہلویؒ نے اپنی میٹھی زبان (فارسی) میں یوں ادا فرمایا ہے۔ من کان مستنا : کسیکہ می خواہد کہ برود راہ راست را۔

قولہ فلیستن بمن قد مات : پس باید کہ برود راہ را واقتدا کند بہ کسانیکہ بتحقیق از عالم گذشتہ اند (اشعۃ اللمعات ص۱۴۸ ج ۱)

قولہ قد مات : مرے ہوئے لوگوں سے مراد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں اور زندوں سے۔ ابن مسعودؓ کے زمانہ کے لوگ اور تابعینؒ مراد ہیں۔

سوال : حضرت ابن مسعودؓ کے ارشاد سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو صحابہ کرامؓ انتقال فرما گئے ہیں ان ہی کی پیروی اور اطاعت کرنی چاہیے حالانکہ یہ بات تو صحیح نہیں۔ کیونکہ اتباع کے لائق صحابہ کرام کی پوری جماعت ہے خواہ زندہ ہوں یا اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہوں۔

جواب اول : مات کی تخصیص اس لیے کی کہ اکثر صحابہ کرام حضرت ابن مسعودؓ کے دور میں انتقال فرما چکے ورنہ یہاں زندہ اور مردہ دونوں مراد ہیں۔

جواب دوم : موت کی قید اس لیے لگائی کہ زندوں کے خاتمہ بالخیر پر یقین نہیں اس سے اپنے نفس کی طرف تعریض ہے اور تواضع کی بنا پر اپنے آپ کو اس سے

نکالنا مقصود ہے۔

سوال : حضرت ابن مسعودؓ نے یہ بات کیوں کہی اور کہنے کی وجہ کیا ہے؟

جواب اوّل : سیّدنا ابن مسعودؓ نے یہ بات تابعینؒ کے سامنے ازراہِ نصیحت فرمائی تھی ان کو وعظ فرمارہے تھے تو یہ مضمون بھی بیان کردیا۔

جواب دوم : یہ کہ اس دور میں باطل فرقے جنم لینے لگے تھے جو صحابہ کرامؓ کی ذاتِ اقدس پر اعتراضات کرتے تھے جیساکہ رافضین اور ملحدین کے گروہ اس ناپاک مشغلہ میں لگے ہوئے تھے اس لیے ابن مسعودؓ نے ان کے غلط الزامات اور صحابہؓ پر باندھے گئے بہتان کے رد میں صحابہؓ کی عظمت وبزرگی اور ان کی فضیلت کا اظہار فرمایا۔

قولہ اُولٰئِكَ اَصْحَابُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : جماعت صحابہؓ کی طرف تعظیماً اشارہ حسّیہ کیا کہ ان کے اعمال واخلاق ایسے مشہور ومعروف ہیں گویا کہ وہ حضرات خود مشہور ہیں۔

قولہ كَانُوا اَفْضَلَ هٰذِهِ الْاُمَّةِ : اُمّت سے مراد امتِ اجابت ہے جو تمام اُمتوں سے افضل ہے کما قال اللّٰہ تعالیٰ "كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (پ۴ آل عمران) اس خطاب کے مخاطب بالذات صحابہ کرامؓ ہیں۔ لہٰذا ان کا مقام بجز انبیاء علیہم السلام کے تمام انسانوں سے افضل ہوا۔ ثانیاً خود حضرت ابن مسعودؓ بھی شہادت دے رہے ہیں کہ صحابہ کرامؓ اُمّت کے بہترین لوگ تھے۔

قولہ اَبَرَّهَا قُلُوْبًا : اَبَرّھا کے دو معنی ہیں ۱۔ اَحْسَنُهَا قُلُوْبًا کہ وہ نیک تھے از روئے قلوب کے۔ درفارسی "ونیک ترین اُمّت از روئے دلہا" (اشعۃ اللمعات) کما فی قولہٖ تعالیٰ "وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ" کیونکہ ایمان کا تعلق بھی دل کے ساتھ ہے۔ ۲۔ اَبَرّھا بمعنی اَخْلَصُهَا قُلُوْبًا کہ ان کے دل خالص تھے نفاق وغیرہ نہیں تھا۔ "اُولٰئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى (پ۲۶ حجرات)

قولہ وَاَعْمَقَهَا عِلْمًا : اس کے کئی معنی بیان کیے گئے ہیں:۔

اوّل : اَعْمَقَهَا عِلْمًا ای اکثرھا غورًا مِنْ جِهَةِ الْعِلْمِ : یعنی علم کے اعتبار سے بہت غور کرنے والے تھے۔

دوم : اعمقها ای اوفرھا حظًّا مِنَ العُلوم المُختلفۃ یعنی دینی علوم کے اندر زیادہ حصّہ رکھنے والے تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، فرائض، تصوّف، گویا ہر صحابی جامعًا للشمائل السنیۃ والفضائل البھیۃ کا مصداق تھا۔ درفارسی " وددر اندلیشہ تراز روئے علم

قولہٗ واقلھا تکلّفًا : تکلّف میں قلیل یعنی صحابہ کرامؓ کا طرزِ معاشرت تصنّع وبناوٹ سے بالکل پاک وصاف تھا۔ علامہ محدّث عبدالحق دہلویؒ تکلّف کا معنیٰ کرتے ہیں " تکلّف در لغت بخود گرفتن کارے بے فرمودن ورنج برخود نہادن (اشعۃ اللّمعات) بے کار کاموں میں اپنے آپ کو مشغول کرنا اور مفت کی مصیبت اٹھانا۔

لیکن اقلھا تکلّفًا : کی جامع تشریح ملّا علی قاری ہرویؒ نے فرمائی ہے رقم طراز ہیں:۔

" فانھم کانوا یمشون حُفاۃ ویصلّون علی الارض ویأکلون مِنْ کلّ آنیۃٍ ویشربون من سُورالناس : وایضًا قال ولا یجتمعون للغِناء والمزامیر ولا یتحلّقون للاذکار والصّلوات برفع الصوت فی المسَاجد ولا فی بیوتھم بل کانوا فرشیین بأبدانھم عرشیین بارواحھم وایضًا وکانوا یلبسون ما تیسرلھم من الصُّوف والقطن وغیرذالك وایضًا وکلّ ھٰذا بتربیۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم المُربی الکامل المکمل۔

(مرقات ص ۲۶۰ ج ۱ باب الاعتصام فصل ثالث)

قولہٗ اختارھم اللہ لصُحبۃ نبیّہٖ ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو امامُ الانبیاء علیہم الصّلوٰۃ والسّلام کی صُحبت اور رفاقت کے لیے پسند کیا کیونکہ وہ اس کے اہل تھے۔ کما فی قولہٖ تعالیٰ " وَاَلْزَمَھُمْ کَلِمَۃَ التَّقْوٰی وَکَانُوْا اَحَقَّ بِھَا وَاَھْلَھَا (پ ۲۶ فتح)

اس سے معلوم ہوا کہ نبوّت کی طرح صحابیّت بھی وہبی چیز ہے نہ کہ کسبی، وہبی چیزوں میں جرح وقدح کرنا جائز نہیں لہٰذا اصحابِ رضوانؓ کے متعلق طعن وتشنیع جائز نہیں ہوگی۔

قولہٗ ولاقامۃِ دینہٖ : اور دین کی اقامت کے لیے ان کو منتخب کیا تھا یعنی صحابہ کرامؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مکمل دین حاصل کیا اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے

بے انتہا قربانیاں دیں، اور جہاد کے ذریعہ ممالک فتح کر کے ان میں حکومتِ الٰہیہ قائم کی اس لیے وہ قبلہ اقوامِ عالم ہوئے۔

سوال ۔ حضرت ابن مسعودؓ تو صحابہ کرامؓ کی تقلید کا حکم فرما گئے لیکن ائمہ کرام کی تقلید کیسے جائز ہو گی؟

جواب ۔ صحابہ کرامؓ کی آرائیں منتشر تھیں۔ عام لوگ ان کو جمع کر کے فیصلہ نہیں کر سکتے۔ جب کہ ائمہ کرامؒ نے ان کو جمع کر کے منقح کر دیا۔ لہٰذا ائمہ کی تقلید کرنا ضروری ہوا۔ تو ان کی تقلید کرنا گویا صحابہ کرامؓ کی تقلید کرنا ہے۔

قولہ فَاعْرِفُوْا لَهُمْ فَضْلَهُمْ : اس کا تعلق یا تو غیر سے ہے کہ عام امتی سے ان کو فضیلت ہے۔ یا پھر بعض صحابہ کرامؓ مراد ہیں کیونکہ بعض کو بعض پر فضیلت حاصل تھی علم میں انفاق میں، سخاوت میں، جہاد میں " لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوْا الخ

(پ ٢٧ الحدید)

وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ اَتٰى رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِنُسْخَةٍ مِّنَ التَّوْرَاةِ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ هٰذِهٖ نُسْخَةٌ مِّنَ التَّوْرَاةِ فَسَكَتَ فَجَعَلَ يَقْرَأُ وَوَجْهُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَغَيَّرُ :

ترجمہ : روایت ہے حضرت جابرؓ سے کہ حضرت عمرؓ بن الخطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تورات کا نسخہ لائے اور عرض کیا یا رسول اللہ یہ تورات کا نسخہ ہے حضورؐ خاموش رہے آپ پڑھنے لگے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ انور بدلنے لگا۔

قولہ فَسَكَتَ : رحمت و نرم مزاجی کی وجہ سے سکوت فرمایا۔

قولہ فَجَعَلَ يَقْرَأُ : حضرت عمرؓ نے سمجھا کہ آپ کی خاموشی علامتِ

اجازت ہے اس لیے پڑھنا شروع کردیا ورنہ حقیقۃً خاموشی ناراضگی کی وجہ سے تھی کہ حضرت عمرؓ یہود کے پاس کیوں جاتے ہیں اور توراۃ میں کیا ڈھونڈھتے ہیں مگر شفقت کی وجہ سے خاموش رہے۔ لہٰذا فاروقِ اعظمؓ کے اس فعلِ شریف پر کوئی اعتراض نہیں کیونکہ خطاء اجتہادی ہے جو قابلِ معافی و عدمِ مؤاخذہ ہے۔

قولہٗ فَقَالَ اَبُوبَکرؓ ثَکِلَتْكَ الثَّوَاكِلُ : بکسر الکاف ای فقدتك الفواقد۔ گم کریں تمہیں گم کرنے والیاں یکتك البواکی روئیں تمہیں رونے والیاں۔ اس سے مراد اُمّہات و البنات و الاخوات ہیں کیونکہ یہ فراق میں زیادہ روتی ہیں۔ مگر جُملہ مذکورہ " ثکلتك الخ) اپنے معنیٰ ومفہوم کے اعتبار سے موت کے لیے بد دُعا ہے۔ لیکن یہ ایک اہل عرب کا محاورہ ہے جو اپنے اصلی معنیٰ میں استعمال نہیں ہوتا بلکہ ایسے مواقع پر بولا جاتا ہے جب اپنے کسی بے تکلف دوست سے کسی تعجب کا اظہار مقصود ہوتا ہے جیسے کوئی شخص اپنے بے تکلف مخاطب سے ایسے موقع پر جب کہ وہ کسی ظاہری بات کو بھی نہیں سمجھ رہا ہوتا یہ کہے کہ مجھے بڑا تعجب ہے کہ یہ کھلی ہوئی بات بھی تم نہیں سمجھ رہے " کتربت یمینہ ورغم انفہ "

قولہٗ فَنَظَرَ عُمَرؓ : ای فعرف آثار الغضب فیہ فقال "

قولہٗ لَوْبَدَ الکم : ای ظھر لکم۔ یعنی بالفرض والمحال اگر آج بھی موسیٰ علیہ السلام کا ظہور ہو۔

خُلاصَۃ الحَدِیث : یہ کہ کتاب وسنّت کو چھوڑ کر یہود و نصاریٰ اور حکماء، فلاسفہ کی کتابوں کی طرف بے ضرورت رجوع کرنا مناسب نہیں بلکہ گمراہی ہے۔

وَعَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَلَامِیْ لَایَنْسَخُ کَلَامَ اللّٰہِ وَ کَلَامُ اللّٰہِ یَنْسَخُ کَلَامِیْ وَکَلَامُ اللّٰہِ یَنْسَخُ بَعْضُہٗ بَعْضًا :

ترجمہ : روایت ہے انہی سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا کلام اللہ کے کلام کو منسوخ نہیں کرتا اور اللہ کا کلام میرے کلام کو منسوخ کرتا ہے اور اللہ کا کلام بعض بعض کو منسوخ کرتا ہے۔

بحث ناسخ ومنسوخ

اَلبَحثُ الاوّل ۔ تعریفِ نسخ

نسخ کے دو معنیٰ ہیں : ۱۔ لغوی ۲۔ اصطلاحی

نسخ کا لُغوی معنیٰ لغت کے اندر نسخ کا معنیٰ ہے مٹانا، ازالہ کرنا ۔ کمایقال " نسخت الریح آثار القوم " کہ ہوا نے لوگوں کے پاؤں کے نشان مٹا دیے ۔ یا نسخ انتقال کے معنیٰ میں بھی مستعمل ہے ۔" کمایقال نسخ الکتاب الی الکتاب "، ایک جگہ سے دوسری طرف کتاب کو منتقل کیا ۔

نسخ کا اِصطلاحی معنیٰ اصطلاح میں اس کی تعریف یہ ہے :۔ رَفعُ الحُکمِ الشرعی بدلیلٍ شرعی "
کسی شرعی حکم کو کسی شرعی دلیل سے ختم کر دینا ۔

یقول ابوالسعاد : مطلب یہ ہے کہ بعض مرتبہ اللہ تعالیٰ کسی زمانے کے حالات کے مناسب ایک شرعی حکم نافذ فرماتے ہیں پھر کسی دوسرے زمانہ میں اپنی حکمت بالغہ کے پیشِ نظر اس حکم کو ختم کر کے اس کی جگہ کوئی نیا حکم عطا فرماتے ہیں اس عمل کو نسخ کہا جاتا ہے اور اس طرح جو پرانا حکم ختم کیا جاتا ہے اسے منسوخ اور جو نیا حکم آتا ہے اسے ناسخ کہتے ہیں ۔

اَلبَحثُ الثّانی ۔ حقیقتِ نسخ

دنیا کی حکومتوں اور اداروں میں کسی حکم کو منسوخ کر کے دوسرا حکم جاری کر دینا مشہور و معروف ہے لیکن انسانوں کے احکام میں نسخ کی تین صورتیں ہیں :۔

صُورت اوّل ۔ نسخ کبھی اس لیے ہوتا ہے کہ پہلے کسی غلط فہمی سے ایک حکم جاری کر دیا بعد میں حقیقت معلوم ہوئی تو حکم بدل دیا۔

صُورت دوم ۲ کبھی اس لیے ہوتا ہے کہ جس وقت یہ حکم جاری کیا گیا اس وقت کے حالات کے مناسب تھا اور آگے آنے والے واقعات اور حالات کا اندازہ نہیں تھا۔ جب حالات بدلے تو حکم بھی بدلنا پڑا، یہ دونوں صورتیں اُحکامِ خداوندی میں نہیں ہو سکتیں۔

صُورت سوم ۳ یہ ہے کہ حکم دینے والے کو اوّل ہی سے معلوم تھا کہ حالات بدلیں گے، اور اس وقت یہ حکم مناسب نہیں ہوگا۔ دوسرا حکم دینا ہوگا۔ یہ جانتے ہوئے آج ایک حکم دے دیا، اور جب اپنے علم کے مطابق حالات بدلے تو حکم بھی بدل دیا۔

مِثال مریض کے موجودہ حالات کو دیکھ کر حکیم ایک دوا، تجویز کرتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ دو روز اس دوا، کے استعمال کرنے کے بعد مریض کا حال بدلے گا اس وقت مجھے دوسری دوا، تجویز کرنا ہوگی۔ اللہ جل شانہٗ کے احکام میں اور اس کی نازل کی ہوئی کتابوں میں صرف یہی آخری صورت نسخ کی ہو سکتی ہے اور ہوتی رہی ہے ہر آنے والی صورت اور نازل ہونے والی کتاب نے پچھلی نبوت و کتاب کو منسُوخ کر کے نئے احکامات جاری کیے اور یہی حال شریعت محمدیہ میں بھی ہے۔
(صحیح مُسلم شریف صفحہ ۴۰۹ جلد ۲ - کتابُ الزّهد) "لم تكن نبوة قط الا تناسخت"۔

البحثُ الثالث ۔ نسخ کی مُمکنہ صورتیں مع اَمثلہ

عقلاً نسخ کی چار صورتیں ممکن ہیں :

صورت اوّل
نسخ القراٰن بالقراٰن

مثال
پہلے یہ حکم تھا کہ ایک مسلمان کے مقابلہ میں دس کافر ہوں تو مقابلہ ضروری ہے بھاگنا جائز نہیں پھر اسے آیت کریمہ اَلْاٰنَ خَفَّفَ اللّٰہُ عَنْکُمْ الخ سے منسوخ کر دیا گیا۔
اب ایک مسلمان کے مقابلہ میں دو کافر ہوں تو بھاگنا جائز نہیں۔

صورت دوم
نسخ الحدیث بالحدیث

مثال
قال النبیُّ صلی اللہ علیہ وسلم کنتُ نھیتکم عن زیارۃ القبور فزوروھا (الحدیث: مشکوٰۃ شریف ص۱۵۴ ج۱ باب زیارۃ القبور) اس میں ناسخ و منسوخ دونوں مذکور ہیں۔

صورت سوم
نسخ الحدیث بالقراٰن

مثال
حدیث کی رو سے بیتُ المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے جسے "فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ" سے منسوخ کر دیا گیا۔

صورت چہارم
نسخ القراٰن بالحدیث

مثال
آیت قرآنی "كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ" حدیث پاک لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ سے منسوخ ہوگی

اَلبحثُ الرَّابِعُ ۔ صُوَرِ مذکُورہ میں کونسی صُورتیں مُمکن ہیں

بحث یہ ہے کہ ان صُوَرِ مذکورہ میں شرعًا کونسی کونسی صورتیں ممکن ہوسکتی ہیں اس میں اختلاف ہے اور دو مسلک ہیں ۔ مسلک کی وضاحت سے قبل ایک فائدہ ملاحظہ فرمائیں ۔

فائدہ یہ کل چار صورتیں بنتی ہیں ان میں دو مُتفقہ ہیں ان میں کسی کا اختلاف نہیں نہ ان کی یہاں بحث ہے (یعنی نسخ القرآن بالقرآن ونسخ الحدیث بالحدیث) اختلاف آخری دو صورتوں یعنی ۳ اور ۴ میں ہے ۔

مسلک اوّل : شوافع حضرات کے نزدیک آخری دو صورتیں ۳، ۴ جائز نہیں ان کی دو دلیلیں ہیں ۔

دلیل اوّل نقلی ۔ حدیث باب سے استدلال کرتے ہیں جس میں ہے "کلامی لا یَنْسِخُ کَلَامَ اللّٰہِ"

دلیل دوم عقلی ۔ صُورت سوم (نسخ قرآن بالحدیث) اس لیے جائز نہیں کہ شبہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو رسولؐ نے تبدیل کردیا، یا رسولؐ نے قرآن کی تکذیب کردی اور صُورت چہارم (نسخ حدیث بالقرآن) اس لیے جائز نہیں کہ شبہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی بات کو رد کردیا ۔

مسلک دوم ۔ احناف ؒ و مالکیہ ؒ کے نزدیک آخری دو صُورتیں (یعنی قرآن کا حدیث سے اور حدیث کا قرآن سے نسخ) بھی جائز اور واقع ہے ہر ہر صُورت کے دو دو دلیلیں ملاحظہ فرمائیں :-

دلیل اوّل ۔ صُورت سوم نسخ قرآن بالحدیث آیتِ وصیّت " کُتِبَ عَلَیْکُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ الخ پ۲ بقرہ) کو حدیث " لَا وَصِیَّۃَ لِوَارِثٍ " نے منسوخ کردیا، رواج یہ تھا یا حکم یہ تھا کہ جمیع مال میں آدمی وصیت کرتا مگر اس حدیث نے آکر اس حکم کو ختم کرکے ورثاء کے حصّے تقسیم کردیے کہ باپ کو اتنا، بیٹے کو اتنا اس کو کہا جائے گا نسخ قرآن بالحدیث ۔

سوال - آیتِ وصیّت آیتِ میراث سے منسوخ ہے نہ کہ حدیث "لَاوَصِیَّۃَ لِوَارِثٍ" سے۔

جواب : آیتِ میراث سے میّت کے وُرثاء کے صرف حقوق و حصص متعین ہو رہے ہیں وصیت باطل نہیں ہو رہی۔ لہٰذا وصیت کا نسخ حدیث لَاوَصِیَّۃَ لِوَارِثٍ سے ہی ہوا ہے۔

دلیل دوم، صورت سوم نسخ قرآن بالحدیث

قرآن مقدس میں ہے (یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ فِیْ اَوْلَادِکُمْ الخ پ نساء) اس میں نبی وغیر نبی سب شامل ہیں سب کو خدا حکم دے رہا ہے اور سیدنا محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس میں شامل ہیں مگر "نَحْنُ مَعَاشِرُ الْاَنْبِیَاءِ لَا نَرِثُ وَلَا نُوْرِثُ وَمَا تَرَکْنَاہُ صَدَقَۃً - اِنَّا مَعَاشِرُ الْاَنْبِیَاءِ لَا نُوْرِثُ مَا تَرَکْنَاہُ صَدَقَۃٌ (رواہ النسائی) یہ حدیث پاک انبیاء علیہم السّلام کے بارہ میں آیت میراث کو منسوخ کر رہی ہے۔

دلیل سوم، صورت سوم نسخ قرآن بالحدیث

ملائکہ نے حضرت آدمؑ کو سجدہ تحیہ کا " فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِکَۃُ کُلُّھُمْ اَجْمَعُوْنَ (پ۲۳ ص)" اور یوسفؑ کو اخوین مع ابوینؑ نے سجدہ تحیہ کا کیا۔ " وَرَفَعَ اَبَوَیْہِ عَلَی الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَہٗ سُجَّدًا" (پ۱۳ یوسف) لیکن شریعت محمدیہ میں یہ حکم حدیث سے منسوخ ہے اور حدیث کے الفاظ یہ ہیں " لَوْکُنْتُ اٰمِرًا اَحَدًا اَنْ یَّسْجُدَ لِاَحَدٍ لَاَمَرْتُ الْمَرْاَۃَ اَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِھَا (مشکوٰۃ شریف ص۲۸۳ ج ۲)

دلیل اول، صورت چہارم نسخ حدیث بالقرآن

حدیث لَاوَصِیَّۃَ لِوَارِثٍ ہے جو کہ آیت وصیت کے لیے ناسخ ہے۔

دلیل دوم : صورت چہارم نسخ حدیث بالقرآن

آیت تحویل قبلہ نے بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کو منسوخ کردیا جو کہ وحی خفی اور حدیث سے ثابت تھا اس سے نسخ حدیث بالقرآن ثابت ہوا۔

شوافع حضرات کے دلائل کے جوابات

دلیل دوم عقلی کا جواب : یہ کہ یہ دلیل درست نہیں کیونکہ یہ دلیل تب ہوتی اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ان کی اپنی طرف سے کہی ہوئی بات ہوتی۔

دلیل اول نقلی کا جواب اول کلام اللہ سے مراد وہ کلام ہے جو آپ اپنی رائے واجتہاد سے فرمائیں معنیٰ ہوگا کہ یعنی میں اپنی رائے سے قرآن کریم میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کرسکتا۔ کما فی قولہ تعالیٰ " قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ (پ ۱۱ یونس)

جواب دوم حدیث کا مطلب یہ ہے کہ کلام نبوی کلام الٰہی کے الفاظ کی تلاوت منسوخ نہیں کرسکتی اور اس کے ہم بھی قائل ہیں چنانچہ آیت وصیت اور آیات سجدہ تحیہ کی تلاوت باقی ہے اور حکم منسوخ ہے۔

جواب سوم - یہ حدیث جبرون بن واقد افریقی کی وجہ سے سنداً ضعیف ہے۔ جبرون پر وضع حدیث کا طعن موجود ہے (کذا فی المیزان ص۳۸۷ ج۱)

نتیجۂ بحث

یقول ابوالاسعاد : مذکورہ بالا بحث سے ہمارا مقصد دراصل یہ حقیقت واضح کرنا ہے کہ کلام الٰہی اور کلام نبوی میں نسخ کا وجود (معاذ اللہ) کوئی عیب ونقص نہیں ہے بلکہ

یہ حکمتِ الٰہی کا عین منشاء وتقاضا ہے۔ لہٰذا کسی آیت وحدیث کو محض اس بناء پر ردّ کرنا کہ اس سے قرآن مقدس میں نسخ لازم آتا ہے کوتاہ علمی اور علومِ قرآنیہ سے عدم واقفیت ہے۔ وَاللّٰہُ سُبْحَانَہٗ اَعْلَمُ وَاَجَلُّ:

وَعَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَحَادِیْثَنَا یَنْسَخُ بَعْضُھَا بَعْضًا کَنَسْخِ الْقُرْاٰنِ

ترجمہ: روایت ہے حضرت ابنِ عمرؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم نے کہ ہماری بعض حدیثیں بعض کو قرآن کی طرح منسوخ کرتی ہیں۔

قَدْ مَرَّ تَحْقِیْقُہٗ اٰنِفًا:

یقول ابوالاسعاد: یہ حدیث بھی احناف کے خلاف نہیں کیونکہ سندی لحاظ سے یہ حدیث بھی ضعیف ہے کیونکہ وفی اسنادہٖ ایضًا محمّد بن الحارث وھو ضعیفٌ اشدّ الضّعف (کذا فی التعلیق)

وَعَنْ اَبِیْ ثَعْلَبَۃَ الْخُشَنِیِّؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ فَرَضَ فَرَائِضَ فَلَا تُضَیِّعُوْھَا وَحَرَّمَ حُرُمَاتٍ فَلَا تَنْتَھِکُوْھَا

ترجمہ: روایت ہے حضرت ابی ثعلبہ خشنیؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم نے کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ فرائض لازم فرمائے انہیں ضائع نہ کرو، کچھ محرمات حرام کیے ان کی حرمت نہ توڑو۔

قولہٗ فَرَضَ۔ بمعنیٰ اَوْجَبَ۔

قولہٗ فَرَائِضَ۔ ای اَحْکَامًا یعنی اللہ پاک نے تمہارے اوپر احکامات واجب فرمائے ہیں۔ باقی فرض کی تعریف مَا ثَبَتَ بِدَلِیْلٍ قَطْعِیٍّ جو دلیل قطعی سے ثابت ہو، یا جس کے ترک پر عقاب ہو اور کرنے پر ثواب ہو۔

قولہٗ فَلَا تُضَيِّعُوْهَا : ای بترکھا۔ یعنی اسے ضائع نہ کرو محدثین حضرات نے اس کے دو معنیٰ بیان فرمائے ہیں :۔

اوّل فَلَا تُضَيِّعُوْهَا۔ ای بالریاء والعجب والغرور یعنی ان امور میں ریا، کبر وغیرہ کرنا یہ بھی ایک قسم کا ضیاع ہے۔ کماجاء فی الحدیث المبارک " وَعَنْ محمودؓ بن لبید اَنّ النبیّ صلّی اللہ علیہ وسلّم قال ان اخوف ما اخاف علیکم الشرکُ الاصغر قالوا یا رسول اللہ وما الشرکُ الاصغر قال الریاء۔

(مشکوٰۃ شریف ص۴۵۶ ج ۲) باب الریاء والسمعۃ)

دوم : دوسرا معنیٰ یہ ہے کہ فرائض کے بعد ارکان کو چھوڑ دیا جائے فلا تنتھکوھا ای لا تقربوھا یعنی حرام کے قریب بھی نہ جاؤ کرنا تو کجا۔

قولہٗ وَحَدَّ حُدُوْدًا ۔ ای تعیین حُدودًا مِنَ القتل والضّرب

قولہٗ وَسَكَتَ عَنْ اَشْيَاءَ مِنْ غَيْرِ نِسْيَانٍ ۔ کتنی احکامات شریعت کے تھے جن کے بارے میں وضاحت نہیں فرمائی۔ وضاحت نہ فرمانے کا مقصد یہ نہیں کہ آپ کو نسیان ہو گیا بلکہ عمدًا مصلحت خداوندی کے پیشِ نظر ان کو چھوڑ دیا " بَلْ مِنْ رحمۃ احسان وفی الاربعین رحمۃ لکم غیر نسیان :

قولہٗ وَلَا تَبْحَثُوْا عَنْهَا : ای لَا تَتَفَكَّرُوا فيها ۔ کیونکہ اس ذات پاک کی معرفت " کُنہُ الذات مَرْدُوْدٌ والطّریق الیٰ کنہ الصّفات مَسْدُوْدٌ ۔

؎ العجز عن درک الادراک ادراکٌ :
والبحث عن سرّ ذات الرّبّ اشراکٌ :

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدَانَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَا اَنْ هَدَانَا اللّٰهُ ۔

کِتابُ العِلم

ای ھٰذا کتابُ العِلم یعنی بیان فضل العلم وتعلیمہ وتعلّمہ ۔ اس کتاب میں علم اور تعلیم و تعلّم کی فضیلت اور علم شرعی کی حقیقت کا بیان ہے ۔

سوال : کتابُ العلم پر کتاب الایمان کی تقدیم کیوں ہے ؟

جواب : تقدیم اس لیے فرمائی کہ تمام امور شرعیہ خواہ من قبیل اعتقاد ہوں یا من قبیل عمل و اخلاق ہوں ۔ سب کا موقوف علیہ ایمان ہے اس کے علاوہ سب کے سب بیکار ہیں ۔ بنا بریں ایمان کی بحث کو مُقدّم کیا اور ایمان کے بعد اعمال کا درجہ ہے اور اعمال خواہ من قبیل عبادات ہوں یا مُعاملات یا مُعاشرات ہوں سب علم پر موقوف ہیں لہذا سب پر علم کو مُقدّم کیا۔

کتابُ العلم کا ماقبل سے ربط

کتابُ العلم کا ماقبل سے ربط یہ ہے کہ علم عام اور کتاب وسُنّت خاص ہے تو بابُ الاعتصام کے بعد کتابُ العلم لانا تعمیم بعد از تخصیص ہے ۔

فائدہ : کتابُ العلم کا عنوان قائم کرنے سے مُصنّف علیہ الرحمۃ کا مقصد اس کی تعریف اور حقیقت بیان کرنا نہیں ہے کیونکہ یہ اہل لغات یا معقولین کا کام ہے محدّثین کا کام نہیں ہے اور نہ شریعت مُقدّسہ کا مقصود ہے بلکہ یہاں عُنوان رکھنے کا منشاء علم کی فضیلت اور اس کی تعلیم وتعلّم کی فضیلت بیان کرنا ہے ۔

یقول ابوالاسعاد : مقام ہذا پر مباحث ثلاثہ کا جاننا ضروری ہے ۔

اَلبَحثُ الاَوّل ، علم کا لُغوی واِصطلاحی معنیٰ

عِلم کے دو معنیٰ ہیں ۱ لغوی ۲ اصطلاحی۔

علم کا لُغوی معنیٰ ۔ علم ضد ہے جہل کی ، اور اس کا لغوی معنیٰ دانستن ہے۔

علم کا اصطلاحی معنیٰ اصطلاحی معنیٰ میں بہت اختلاف ہے کیونکہ بعض حضرات علم کو قابل تحدید نہیں مانتے ۔ ھکذا قال امام الحرمینؒ والغزالیؒ کیونکہ جنس وفصل کے لیے جامع عبارت سے تعریف محسوسات میں بھی مشکل ہوتی ہے تو غیر محسوسات میں بطریق اولیٰ مشکل ہو گی۔ لہٰذا علم کی شناخت تحدید سے نہیں ہو گی بلکہ اس کی اقسام وامثال سے ہو گی۔ جب کہ علامہ فخرالدین رازیؒ فرماتے ہیں کہ علم مِنْ اجلِ البدیہات ہونے کی بناء پر قابل تحدید نہیں لیکن جمہور حضرات کے نزدیک علم قابل تحدید ہے پھر اس کی تعریف میں مختلف اقوال ہیں۔

قول اوّل فلاسفہ فلاسفہ کے نزدیک علم کہا جاتا ہے " ھو حُصول الصُّورۃ اوالصُّورۃ الحاصلۃ فی الذّھن کیونکہ ان کے نزدیک امر معدوم سے علم کا تعلق نہیں ہو سکتا ۔ اس لیے اس معدوم کی صورت کو علم کے لیے واسطہ بنایا کہ اولاً وہ صورت حاصل ہو گی، پھر اس صورت کے واسطہ سے معدوم کا علم حاصل ہوگا۔

قول دوم ماتُریدیہ ان حضرات کے نزدیک علم کی تعریف یہ ہے کہ" العلم صِفۃٌ مُودعۃٌ فی القلب تنکشف بھا الاُمور (کالقوۃ الباصرۃ فی العین والقوۃ السامعۃ فی الاُذُن)"

قول سوم علامہ عینیؒ کے نزدیک علم کی تعریف یہ ہے" العلمُ صفۃٌ من صفاتِ النفس توجب تمیزًا لا یحتمل النقیض فی الامور المعنویۃ لیکن جمہور حضرات نے ماتریدیہ کی تعریف کو ترجیح دی ہے۔

علم کا شرعی معنیٰ ۔ شرعًا علم کی تعریف یہ ہے " ھُوَ نورٌ فی قلب المؤمن مقتبسٌ

من نور النبوة من الاقوال المحمدية والافعال الاحمدية والاحوال المحمودية يهتدى به الى الله تعالىٰ وصفاته وافعاله واحكامه

(انوار المحمود)

۲ اَلبَحثُ الثّانِی ۔ اقسامِ علم

یہاں کتابُ العلم کا جو عنوان قائم کیا گیا ہے اس علم سے مراد علمِ دین ہے جو شریعت کی نظر میں بنیادی اور ضروری حیثیت رکھتا ہے ۔ علمِ دین جو کتابُ اللہ وسنّتِ رسول اللہ پر مشتمل ہے اس کی دو قسمیں ہیں :۔

اوّل کسبی ۔ جو کسی بشر کے واسطہ سے حاصل ہوتا ہے ۔

دوّم لدُنی یا علم ربّانی : جو بغیر واسطہ بشر حاصل ہوتا ہے وہ علم جو بواسطہ بشر حاصل ہو اس کی دو صورتیں ہیں :

صُورت اوّل : کہ وہ علم بواسطہ وحی حاصل ہو تو اس کو علم نبوّت کہا جاتا ہے ۔ جو انبیاء کرامؑ کے ساتھ خاص ہے ۔

صُورت دوّم : وہ علم بصورت القاء والہام فی القلب یا فراست سے حاصل ہوتا ہے جو نبی وولی دونوں کے لیے عام ہے ۔ کما کان للخضر علیہ السلام فی قولہ تعالیٰ "وَعَلَّمۡنٰهُ مِنۡ لَّدُنَّا عِلۡمًا (پ۱۵ کھف) پھر کسبی علم دو قسم ہے :۔

اوّل از قبیلِ مبادی : جس پر علم دین کی معرفت موقوف ہے مثلاً لغت، نحو، صرف بلاغت وغیرہ ۔

دوّم از قبیلِ مقاصد : جن کے سوا اللہ ورسول کی اطاعت ممکن نہیں یعنی وہ علوم جو عقائد واحکام سے متعلق ہیں اور اسی کو علوم شرعیہ کہا جاتا ہے ۔

۳ اَلبَحثُ الثّالِث ۔ تحصیلِ علم کا حکم

بلوغ کے بعد جن امور کا انسان مکلّف ہے ان کا علم حاصل کرنا فرض عین ہے تقلید سے

ہویا دلیل سے مثلاً توحید، رسالت، نماز اور صاحب نصاب ہو تو زکوٰۃ اور رمضان میں روزہ اور تاجر ہو تو بیع و شراء کے احکام و مسائل، اور شادی کرے تو حیض و نفاس اور طلاق و نکاح کے مسائل، علیٰ ہذا معاصی کا علم تاکہ ان سے اجتناب کر سکے۔ یہ سب چیزیں فرض عین ہیں اور اس مقدار سے زائد تبحر علمی حاصل کرنا محض فرض کفایہ ہے۔

یقول ابوالاسعاد : وہ علوم جن کا تعلق از قبیل مقاصد ہے ان کا ایک قسم جس کو علم باطن یا علم مکاشفہ بھی کہتے ہیں۔ علم باطن یا علم مکاشفہ دراصل وہ نور ہے جو علم ظاہر پر عمل کرنے سے پیدا ہوتا ہے جس کی روشنی سے حق تعالیٰ کی ذات وصفات کی معرفت پیدا ہوتی ہے اور اسی کو علم وراثت بھی کہتے ہیں جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مَنْ عَمِلَ بِمَا عَلِمَ وَرَثَہُ اللّٰہُ مَالَمْ یَعْلَمْ" جو شخص علم پر عمل کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو اس چیز کا علم نصیب کرتا ہے جو نہ جانا جاتا ہے اور نہ پڑھا جاتا ہے۔ بہر حال یہ دونوں علم لازم و ملزوم ہیں۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ ——— یہ پہلی فصل ہے

عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً :

ترجمہ : روایت ہے حضرت عبداللہ بن عمرو سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ مجھ سے لوگوں کو پہنچاؤ اگرچہ ایک ہی آیت ہو۔

قولہ بَلِّغُوْا : فعل بَلِّغُوْا کا مفعول کُلَّ مَا اَخَذْتُمُوْہُ محذوف ہے یعنی جو کچھ تم نے مجھ سے حاصل کیا دوسروں کو پہنچا دو۔

قولہ وَلَوْ اٰیَۃً : اٰیَۃً خبر ہے کَانَ محذوف کی کَانَ اور اس کا اسم محذوف ہے تقدیر عبارت یوں ہے "وَلَوْ کَانَ الْمُبَلَّغُ اٰیَۃً"۔

آیۃ سے کیا مُراد ہے؟

حدیث تو مُراد نہیں ہوسکتی اس لیے کہ آیت کا اطلاق حدیث پر نہیں ہوتا آیۃ سے کتابُ اللہ مُراد لینا بھی بعید ہے اس لیے کہ اس کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لے لی ہے۔ اسی لیے نبیؐ کریم علیہ السّلام کو یہ حکم دیا جارہا ہے "لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ (پ۲۹ القیامہ) وفی مقامٍ اٰخر" اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔ (پ۱۴ حجر) تو پھر اس سے کیا مُراد ہے اس میں دو قول ہیں۔

قولِ اوّل

ابن ایوب کے نزدیک آیت سے مراد وہ احادیث ہیں جو بظاہر تو چھوٹی چھوٹی ہیں لیکن افادت کے اعتبار سے علوم و معارف کے بحرِ بیکراں اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں جیسے ایک چھوٹی سی حدیث ہے "مَنْ صَمَتَ نَجَا"، اب اس جملہ وَلَوْ كَانَ آیۃ کا یہ مطلب ہوا کہ اگر تم میری کسی ایسی حدیث کو پاؤ جو جملہ کے اعتبار سے یا الفاظ کے اعتبار سے بہت چھوٹی اور مختصر ہو مگر دوسروں تک ضرور پہنچاؤ۔ یہی وجہ ہے کہ محدثین حضرات نے لکھا ہے کہ اس حدیث کا اصل علم کو پھیلانے اور دوسروں کو علم کی روشنائی سے منوّر کرنے کی ترغیب دلانا ہے۔

سوال ۔ آیت کا اطلاق حدیث پاک پر کیوں کیا گیا ہے؟

جواب ؛ یہ ہے کہ قرآن کریم کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ کے لینے کے بوجود جب اس کی تبلیغ کی تاکید کی گئی "يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الخ (پ۶ مائدہ)

تو حدیث کی تبلیغ بطریقِ اولیٰ ضروری ہوگی جس کی ذمہ داری خود نبیؐ نے کر اُمّت کے حوالے کردی۔

قولِ دوم

عند البعض آیت سے اصطلاحی آیت مراد نہیں بلکہ لغوی معنیٰ مراد ہیں یعنی علامت۔ مطلب یہ ہے کہ اگر میں نے اشارۃً کوئی بات کہی اسے بھی دوسروں تک پہنچاؤ۔

قولہ حَدِّثُوْا عَنْ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ وَلَا حَرَجَ ۔ ای بَيِّنُوْا عَنْ بَنِيْ اسرائیل القِصَصَ وَالآيَاتِ العَجِيْبَةَ وَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ۔ اس جملہ کا مقصد یہ ہے کہ اگر تم بنی اسرائیل سے کوئی قصہ سنو یا تمہیں ان سے کوئی واقعہ معلوم ہو تو تم اس کو بیان کرسکتے ہو

اس لیے کہ کسی واقعہ یا قصہ کو محض خبر کے طور پر بیان کرنا شرعی امور میں کوئی نقصان پیدا نہیں کرتا مگر ان کے احکام وغیرہ کو نقل نہ کیا جائے کیونکہ شریعت محمدی کا نفاذ ہو چکا ہے بس اس کی اشاعت کرو۔

سوال ۔ مشکوٰۃ شریف صـ۳۲ ج ۱ باب الاعتصام فصل ثالث حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے تورات کی باتیں آپ کے سامنے بیان کیں تو آپ کو سخت ناگوار گذریں جب کہ اس حدیث سے جواز معلوم ہوتا ہے۔

جواب اوّل ۔ حدیث الباب میں حکایات ونصائح (کحکایۃ عوج بن عُنق) بطور عبرت نقل کرنے کا حکم ہے جبکہ پہلی حدیث میں ان کی کتابوں کے احکام نقل کرنے سے منع فرمایا کیونکہ وہ منسوخ ہیں ۔ فلا تعارضا۔

جواب دوم شروع اسلام میں ممانعت تھی جب اسلام صحابہؓ کرام کے دلوں میں راسخ ہو گیا تو شریعت کی حدود وقیود متعین ہو گئیں ۔ اور صحابہ کرامؓ کو یہ بھی علم ہو گیا کہ بنی اسرائیل نے اپنے دین وا پنی کتب میں تغیرّ وتبدّل کر دیا ہے تو اب صرف قصص وحکایات کو نقل کرنے کی اجازت دے دی گئی ۔جب کہ انہیں عبرت وتذکیر کی نیّت سے نقل کیا جائے۔

قولہ مَنْ کَذَبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّدًا فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَہٗ مِنَ النَّارِ۔

ای فلیتخذ منزلۃ مِنَ النَّارِ یہ امر "فَلْیَتَبَوَّأْ" بمعنی خبر ہے۔

یقول ابوالاسعاد : پہلے جملہ میں تبلیغ حدیث کی تاکید کی گئی تو ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص جوش خطابت میں آکر غلط روایت کرنا شروع کر دے اس لیے بعد میں آپ نے یہ جملہ ارشاد فرمایا تاکہ حدیث بیان کرنے میں احتیاط سے کام لیا جائے ۔علامہ فضل اللہ بن حسین تورپشتی فرماتے ہیں کہ میں نے اس حدیث کی مانند اور کوئی حدیث نہیں دیکھی تقریبًا ستّر صحابہ کرامؓ جن میں عشرہ مبشّرہ بھی ہیں انہوں نے روایت کی ہے۔

حدیث پاک کا شانِ ورُود

حدثنا ابو اُمیۃ حدثنا زکریا بن عدی قال بُریدۃ کان حیٌّ من بنی لیث من المدینۃ علی میلین وکان رجلٌ قد خطب امرأۃً منهم فی الجاھلیۃ فابوا ان یزوجوھا فجاءھم وعلیه حُلّۃٌ فقال انّ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کسانی ھٰذہ الحُلّۃ امرنی ان احکم فی دمائکم واموالکم بما اریٰ وانطلق فنزل علی المرأۃ فارسل الی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقال کذب عدُوُّ اللّٰہ، ثم ارسل رسولاً وقال ان انت وجدته حیًّا فاضرب عنقہ ولا اراک تجدہ حیًّا وان وجدته میّتًا فحرقه بالنار فجاءہ فوجدہ قد لدغته افعی فمات فحرقه بالنار فذالک قول رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم " من کذب علیّ متعمّدًا فلیتبوّأ مقعدہ من النار" (مُشکل الآثار ص۱۶۴ ج۱ باب بیان مُشکل ما روی عن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من کذب علیّ متعمّدًا فلیتبوّأ مقعدہ من النار)

ترجمہ: ہمیں ابو اُمیّہ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں ہمیں زکریا ابن عدی نے بیان کیا کہ حضرت بریدہؓ نے فرمایا بنی لیث کا ایک قبیلہ مدینہ سے دو میل دور رہتا تھا۔ ایک آدمی نے جاہلیت کے زمانہ میں ان کی کسی عورت سے خطبہ کیا پھر قبیلہ والوں نے اس عورت کے ساتھ اس آدمی کے نکاح کا انکار کردیا۔ پھر وہ ان کے پاس اس حالت میں آیا کہ اس کے اوپر خاص قسم کی پوشاک تھی کہنے لگا یہ لباس مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہنایا ہے مجھے حکم فرمایا ہے کہ میں تمہارے خونوں اور مالوں کے بارے میں اپنے علم کے مطابق فیصلہ کروں اور جاکر اس عورت کے پاس اُتر پڑا۔ پھر قبیلہ والوں نے نبی علیہ السّلام کی طرف ایک آدمی کو بھیج دیا حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کے دشمن نے جھوٹ بولا ہے پھر آپؐ

نے ایک قاصد بھیجا اور فرمایا اگر تو اس کو زندہ پائے تو اس کی گردن کاٹ دے اور میں تجھے ایسے نہ دیکھوں کہ تو اسے زندہ چھوڑ دے اور اگر تو اس کو مردہ پائے تو پھر اس کو آگ سے جلا دینا۔ پھر وہ قاصد اس کے پاس آیا اور اس کو سیاہ سانپ کا کاٹا ہوا پایا کہ وہ مر چکا تھا پھر اس کو آگ کے ساتھ جلا دیا تو یہ مصداق ہے رسول اللہ ﷺ کے فرمان کا۔ جو آدمی میرے اوپر عمداً جھوٹ بولے وہ اپنا ٹھکانا آگ میں بنائے (مشکل الآثار ص۱۶۴ ج ۱) یہ باب اس مشکل کے بیان میں ہے جو نبی علیہ السلام سے منقول ہے۔ (مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ

وضع حدیث کا حکم

اس وضع حدیث پر وعید بیان کی گئی ہے۔ وضع حدیث کا کیا معنیٰ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ایسی بات کی نسبت کی جائے جو آپ نے بیان نہ فرمائی ہو، وضع حدیث کے متعلق علماء کے تین مذہب ہیں

مذہب اول ۔ امام الحرمین کے والد ابو محمد جوینی نے وضع حدیث کو کفر قرار دیا۔

مذہب دوم ۔ جمہور علماء امت کے نزدیک وضع حدیث اگر جائز سمجھ کر نہ کرے تو کفر تو نہیں البتہ بہت بڑا گناہ کا کام ہے۔

مذہب سوم ۔ بعض صوفیاء کی رائے یہ ہے کہ ترغیب و ترہیب کے لیے وضع حدیث جائز ہے اور احکام میں ناجائز ہے۔ یہ لوگ ترغیب و ترہیب کے لیے یا اس کے جواز پر دو دلیلیں پیش کرتے ہیں:۔

دلیل اول

یہ ہے کہ حدیث پاک میں عَلَیَّ کا لفظ مستعمل ہے " مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ "، اور علی ضرر کے لیے آتا ہے مطلب یہ ہوا کہ ایسی وضع حدیث ناجائز ہے جس سے میرے دین کا ضرر ہوتا ہو۔ جب کہ ترغیب و ترہیب میں حدیث وضع کرنے سے دین کا نقصان نہیں ہوتا بلکہ فائدہ ہوتا ہے کہ لوگ اعمال صالحہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

جواب

یہ استدلال ان کا جہالت پر مبنی ہے کیونکہ علیٰ کا استعمال جہاں ضرر کے لیے ہوتا ہے وہاں استعلاء کے لیے بھی ہوتا ہے اگر آپ ضرر کے لیے بناتے ہیں تو فریق ثانی استعلاء کے لیے بھی بنا سکتا ہے۔ ما هو جوابكم فهو جوابنا۔ تو مواقع کی مناسبت سے معنیٰ کیا جاتا ہے۔ لہٰذا کذب کا صلہ جب علیٰ آتا ہے تو اس کا مطلب وہ نہیں جو ان لوگوں نے سمجھا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ کسی کی طرف

ایسی بات منسوب کرنا جو اس نے نہ کہی ہو اور حدیث کی مُراد بھی یہی ہے۔

دلیل دوّم: اس حدیث کی بعض روایات میں یہ لفظ بھی ہیں " لِیُضِلَّ بِهِ النَّاسَ (حاشیہ مُسلم شریف ص۸ ج۱ بابُ النهی عَنِ الحَدیث بِکُلِّ مَا سَمِعَ) اس قید سے معلوم ہوا کہ وضع حدیث پر وعید اس وقت ہے جب کہ اس کا مقصد لوگوں کو گمراہ کرنا ہو حالانکہ ترغیب وترھیب میں وضع حدیث لوگوں کو گمراہ کرنا نہیں بلکہ دین پر لگانے کے لیے ہے۔

جواب اوّل: لِیُضِلَّ کی قید احترازی نہیں بلکہ واقعی اور اتفاقی ہے یہ قید مزید قباحت بیان کرنے کے لیے لگادی گئی ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ اگر گمراہ کرنا مقصد نہ ہو تو وضع حدیث جائز ہے۔ یہ قید ایسی ہے جیسے قرآن پاک میں ہے:

" وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَکُمْ خَشْیَةَ اِمْلَاقٍ (پ۱۵ الاسراء)

یہاں خشیہ املاق کی قید لگا کر یہ بتانا مقصود نہیں کہ اگر افلاس کا ڈر نہ ہو تو قتل اولاد منہی عنہ میں نہیں ہے حالانکہ قتلِ اولاد تو اس قید کے بغیر بھی برا ہے اصلاً یہ قید لگا کر یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر قتل اولاد کا سبب خشیہ املاق ہو تو اس فعل کی قباحت میں اور اضافہ ہو جاتا ہے ایسے ہی اس حدیث میں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ وضع حدیث ویسے بھی برا کام ہے لیکن جب اس کا مقصد لوگوں کو گمراہ کرنا ہو تو اس کی قباحت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

جواب دوّم: یہ ہے کہ لِیُضِلَّ میں لام کَی کی نہیں بلکہ یہ لام عاقبت کی ہے جیسے قرآن مقدس کی اس آیت میں ہے " فَالْتَقَطَهٗ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِیَکُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا (پ۲۰ قصص)

اس کا یہ مطلب نہیں کہ موسیٰ علیہ السّلام کو اٹھانے سے فرعونیوں کی غرض یہ تھی کہ وہ ان کے لیے دشمن ہو بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان کو اٹھانے کا نتیجہ اور انجام یہ ہوا۔ ایسے ہی اس حدیث میں لِیُضِلَّ کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص وضع حدیث کرے جس کا انجام ونتیجہ یہ ہو گا کہ لوگ اس کی وجہ سے گمراہ ہوں گے ایسا شخص اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنالے۔

یقول ابوالاسعاد جوابًا: لِیُضِلَّ النَّاسَ والی زیادتی غیر صحیح ہے۔ حافظ ابن حجرؒ وعلامہ بدرالدین عینیؒ، اور امام طحاویؒ سب نے اس زیادتی کو غلط کہا ہے۔ چنانچہ

علامہ نوویؒ شارح مسلم فرماتے ہیں :۔

قولہ لِيُضِلَّ النَّاسَ زیادۃٌ باطلۃٌ اتفق الحفاظ علی ابطالها وَانّها لا تُعرفُ صحیحۃ (ص۸ ج۱)

وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ وَالْمُغِيرَةِ بْنِ شُعْبَةَ قَالَا قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ حَدَّثَ عَنِّيْ بِحَدِيْثٍ يَرَىٰ اَنَّهٗ كَذِبٌ فَهُوَ اَحَدُ الْكَاذِبِيْنَ :

ترجمہ : حضرت سمرہؓ ابن جندب اور مغیرہؓ ابن شعبہ فرماتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو میری طرف ایسی بات نقل کرے جسے جھوٹ جانتا ہے تو وہ جھوٹوں میں سے ایک ہے ۔

قولہٗ يَرَىٰ اَنَّهٗ كَذِبٌ : لفظ یَرٰی کو دو طریقوں پر پڑھا گیا ہے ۔
اوّل معروف : یَرٰی اگر معروف پڑھا جائے تو حدیث موضوع کے نقل کرنے کی مذمت اس وقت ہوگی جب اس کے موضوع ہونے کا یقین ہو۔
دوم مجہول : یُرٰی اگر مجہول پڑھا جائے تو یہ یُظَنُّ کے معنٰی میں ہوگا اب موضوع حدیث کو نقل کرنے کی مذمت اس وقت بھی ہوگی جب کہ اس کے موضوع ہونے کا ظن (غالب) ہو۔ لیکن مشہور طریق مجہول ہے ۔

قولہٗ احد الکاذبین : قال الطیبیؒ قولہٗ ع احد الکاذبین من باب قولهم القلم احد اللسانين والخال احد الابوين : لفظ کاذبین کو بھی دو طریقوں پر پڑھا گیا ہے تثنیہ اور جمع اگر تثنیہ ہو (کَاذِبَیْنِ) تو مطلب یہ ہوگا کہ یہ شخص دو جھوٹوں میں سے ایک ہے ۱ جھوٹا حدیث وضع کرنے والا اور دوسرا اس کو روایت کرنے والا ، اور اگر جمع ہو (کَاذِبِیْنَ) تو مطلب ہوگا کہ یہ شخص بھی جھوٹوں میں سے ایک ہے، اور یہی مشہور ہے ۔

یقول ابوالاسعاد خلاصۃً : بعض گفتہ اند کہ باحتمال کذب و شک و شبہ

روایت نیز روا نباشد وصواب آنست کہ بمجردِ احتمال ترک نتواں کرد وتفصیل این است کہ اگر ظن غالب در جانبِ صدق باشد جائز است واگر در جانب کذب بود ناجائز در صورت شک جواز وعدم جواز ہر دو برابر (کما فی الاشعۃ)

ترجمہ : روایت ہے حضرت معاویہؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اللہ تعالیٰ جس کا بھلا چاہتا ہے اسے دین کا فقیہ بنا دیتا ہے میں بانٹنے والا ہوں اللہ دیتا ہے۔	وَعَنْ مُعَاوِيَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِى الدِّيْنِ وَاِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَّاللّٰهُ يُعْطِىْ ؛

قولہٗ خَیْرًا : یہاں خَیْرًا کی تنوین تفخیم اور تعظیم کے لیے ہے ای خَیْرًا کَثِیْرًا۔

قولہٗ یُفَقِّھْہُ فِی الدِّیْنِ : فقہ کی اصطلاحی تعریف کیا ہے۔ چنانچہ علامہ فضل اللہ بن حسین تورپشتیؒ فرماتے ہیں کہ " الفقہ ھو التوصل من علم شاھدٍ الی علمٍ غائبٍ " ایسا ملکہ جس کے ذریعہ انسان قرآن وحدیث سے ایسے نکات نکالے کہ اس کا دل روشن ہو جائے اور کسی قسم کا شک باقی نہ رہے لیکن حدیث ہٰذا میں فقہ سے اصطلاحی فقہ مراد نہیں بلکہ اس سے احکام شرعیہ والحقیقۃ والطریقہ یعنی پورے دین کی سمجھ مراد ہے۔ کما فی قولہٖ تعالیٰ " مَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا (پ۳ بقرہ) یا جیسا کہ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں " الفقیہ الزاھد فی الدُّنیا الرَّاغبُ فِی الاٰخرۃِ البصیر فی امر دینہ المُداوم علیٰ عبادۃ ربّہ (مرقاۃ)

سوال ۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کسی سے بھلائی کرنا چاہتے ہیں اسے تفقّہ فی الدّین عطا فرما دیتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ خیر صرف فقہاء میں بند ہے حالانکہ تفقّہ فی الدّین کے علاوہ بھی بہت سے امور خیر ایسے ہیں جو غیر فقہاء میں بھی پائے جاتے ہیں جیسے ایک بندہ کافر مسلمان ہوا تو ظہر کا وقت تھا اس نے نماز ظہر ادا کی، اور راہی ملک بقاء ہوا تو

اس کے لیے بھی خیر ہے کیونکہ اسے گناہ کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔

جواب اوّل: خَیْرًا پر تنوین تنکیر کے لیے نہیں بلکہ تعظیم کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ جس کو خیر عظیم دینا چاہتے ہیں اس کو تفقہ فی الدین کی صفت عطا فرما دیتے ہیں۔

جواب دوم۔ بعض محدثین حضرات یہ جواب بھی دیتے ہیں کہ یہاں مبالغۃً فقیہ کی بہ نسبت غیر فقیہ سے ارادہ خیر کی نفی کی گئی ہے۔

جواب سوم۔ یہاں تنوین تنکیر کے لیے ہے لیکن یہ کلام تنزیل الناقص بمنزلۃ المعدوم کے قبیل سے ہے۔

تشریح تنزیلُ النّاقص بمنزلۃِ المعدُوم

بلاغت کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ ایک چیز میں اس کے حسنات عالیہ اور صفات کمالیہ موجود نہیں ہیں اگر ہیں بھی تو وہ حد درجہ ناقص ہیں تو ایسی چیز کے ناقص اوصاف کو بمنزلہ معدوم (یعنی نہ ہونے کے برابر) سمجھا جاتا ہے اور اسی کو تنزیل ناقص بمنزلۃ المعدوم کہتے ہیں۔ کلامِ عرب میں یا حدیث پاک میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں ''لَا فَتٰی اِلَّا عَلِیٌّ لَا سَیْفَ اِلَّا ذُوالْفَقَارِ'' گویا دیگر جوانوں کی طاقت اور قوت حضرت علیؓ کے مقابلہ میں ناقص ہے اس لیے اس کو معدوم سمجھا گیا۔ اسی طرح اور بھی تلواریں ہیں مگر اتنی تیز نہیں جتنی ذوالفقار ہے۔ اس لیے بقیہ کو معدوم سمجھا گیا۔ ''لَا صَلٰوۃَ لِجَارِ الْمَسْجِدِ اِلَّا فِی الْمَسْجِدِ''، اب جواب کا خلاصہ یہ نکلا کہ اگرچہ غیر فقہاء کے پاس بھی خیر ہے تو وہ خیر فقہاء کے مقابلہ میں اتنی ناقص ہے کہ گویا کالعدم ہے۔

قولہٗ وَاِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰہُ یُعْطِیْ۔ قَاسِم بانٹنے والے اور مُعْطِیْ عرف میں مالک کو کہتے ہیں اس سے مراد یہ ہے کہ اصل مالک تو اللہ تعالیٰ ہے میں تو صرف تقسیم کرنے والا ہوں یعنی نعمت ہائے خداوندی میرے ذریعہ سے بندوں کو ملتی ہیں۔

ربط مابین الجملتین

اَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰہُ یُعْطِیْ کے مابین ربط کیا ہے تو اس ربط کو ایک سوال کی شکل میں پیش کیا جارہا ہے۔

سوال: یہ ہے کہ نبی کریم علیہم السلام کی تعلیم تو تمام صحابہ کرامؓ کے لیے برابر تھی یعنی سب کو برابر علم سکھاتے تھے اس کے باوجود فقاہت میں سب یکساں نہیں کوئی فقیہ ہوتا ہے اور کوئی نہیں ہوتا۔

جواب۔ تو جواب میں ارشاد فرمایا کہ میں تو صرف قاسم ہوں معطی تو اللہ تعالیٰ ہے۔ جس کے متعلق خیر کا ارادہ فرماتے ہیں اسے فقاہت فی الدین عطاء فرما دیتے ہیں۔ مگر ہر ایک اپنی اپنی استعداد کے مطابق فقیہ ہوتا ہے۔

یقول شیخ جاجروی رحمہ القوی: بعض لوگ "اَنَا قَاسِمٌ سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کو سب اختیارات ہیں جس کو وہ چاہیں اور جو چاہیں دے سکتے ہیں کیونکہ خود آپ اپنی زبان مبارک سے فرمارہے ہیں "اَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰہُ یُعْطِیْ" کما قالہ البریلویۃ"۔ ع

ڈیندا خدا ہے وڈ یندے محمدؐ

اور حدیث باب میں لفظ رزق مقدر کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ساری دنیا کے روزی رساں ہیں لیکن علماء اہل السنۃ والجماعۃ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ساری مخلوقات کی روزی رساں ربّ ذوالجلال کی ذات پاک ہے۔

اَللّٰہُ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ لَہٗ (پ ۲۱ عنکبوت)

نَحْنُ قَسَمْنَا بَیْنَہُمْ مَّعِیْشَتَہُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَرَفَعْنَا بَعْضَہُمْ فَوْقَ بَعْضٍ (پ ۲۵ زخرف)

یہاں حصر ہے کہ ہم ہی تقسیم کرتے ہیں نہ کہ کوئی اور ذات۔ جہاں تک اس فرقہ کا لفظ رزق مقدر کرنا ہے یہ سراسر دجل وفریب ہے۔ اور دو وجوہ سے حدیث پاک کے ظاہر کے بھی خلاف ہے۔ اوّلاً حدیث پاک کا سیاق صاف بتارہا ہے کہ یہاں قاسم سے مراد صرف علوم وحی کا تقسیم کرنے والا ہے کیونکہ اس سے پہلے بات بھی علم کی چل رہی ہے۔ "مَنْ یُّرِدِ اللّٰہُ بِہٖ خَیْرًا یُّفَقِّہْہُ فِی الدِّیْنِ" چنانچہ سب شارحینؒ نے بھی

تشریح کی ہے کہ اس سے علوم تقسیم کرنے والا مراد ہے۔

ثانیاً : امام بخاریؒ نے بھی اس حدیث کو باب العلم میں ذکر فرمایا ہے اگر تقسیم سے تقسیم رزق مراد ہوتا تو رزق کی بحث میں ذکر فرماتے۔

سوال ۔ اگر حدیث مذکورہ کا تعلق رزق سے نہیں بلکہ تقسیم علم سے ہے تو بعض محدثینؒ نے حدیث مذکورہ کو کتاب الغنائم اور کتاب الزکوٰۃ میں کیوں ذکر فرمایا ہے کیونکہ غنائم اور زکوٰۃ کا تعلق بھی تو رزق سے ہے (کما فی صحیح المسلم ص۳۳۳ ج ا کتاب الزکوٰۃ باب النھی عن المسئلۃ بروایۃ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف) مشکوٰۃ شریف ص۳۲۷ ج ۲ باب رزق الولاۃ وھدایاھم بروایۃ حضرت ابوھریرہؓ)

جواب : مال کے ساتھ جن محدثینؒ نے اس کا تعلق لگایا ہے تو ان کے نزدیک بھی تقسیم ماتحت الاسباب ہے مافوق الاسباب کسی محدثؒ کے ہاں نہیں ہے اس لیے کہ منافقین تقسیم مال کے وقت اعتراض کرتے تھے کہ کسی کو زیادہ کسی کو کم یہ صحیح نہیں ہے تو آپ نے ان کی تردید فرمائی چنانچہ مشکوٰۃ شریف کی روایت کے الفاظ ہیں "ما اعطیکم ولا امنعکم انا قاسم اضع حیث امرت)

اسمائے رجال

حالات حضرت معاویہؓ

آپ کا نام شریف معاویہ ابن ابوسفیان ابن حرب ابن امیہ ابن عبدالشمس ابن عبدمناف ہے۔آپ پانچویں پشت یعنی عبدالمناف میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتے ہیں۔آپ کی والدہ ہند بنت عتبہ ابن ربیعہ ابن عبدالشمس ابن عبدمناف ہیں۔آپ صلح حدیبیہ کے سال اسلام لائے مگر فتح مکہ کے دن اسلام ظاہر کیا۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سالے ہیں اور کاتب وحی ہیں، عہدِ فاروقی میں شام کے حاکم بنے چالیس سال وہاں کے ہی حاکم رہے۔امام حسن ابن علی رضی اللہ عنہما نے آپ کے حق میں خلافت سے دست برداری فرماکر صلح فرمالی۔آپ کی وفات ۴ رجب المرجب ۶۰ھ میں لقوہ کی بیماری سے ہوئی ۷۸ سال عمر شریف پائی۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں کہا کرتے تھے کاش کہ میں وادی ذی طوی میں

وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلنَّاسُ مَعَادِنٌ کَمَعَادِنِ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ خِیَارُهُمْ فِی الْجَاهِلِیَّةِ خِیَارُهُمْ فِی الْاِسْلَامِ اِذَا فَقِهُوْا۔

ترجمہ : روایت ہے حضرت ابوہریرہؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ لوگ سونے چاندی کی کانوں کی طرح مختلف کانیں ہیں۔ جو کفر میں اعلیٰ تھے وہ اسلام میں بھی اعلیٰ ہیں جب کہ عالم بن جائیں۔

فائدہ : حدیث باب کی دو جزئیں ہیں ہر ایک کی علیحدہ تشریح ہوگی۔

جزءِ اوّل : " اَلنَّاسُ مَعَادِنٌ کَمَعَادِنِ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ " جزء اوّل کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح کان میں جواہر اور خزائن ہوتے ہیں ایسے ہی حق تعالیٰ نے انسانی طبائع میں بھی مختلف قسم کے جواہر اور خوبیاں رکھی ہیں پھر جس طرح مختلف کانوں میں مختلف نوعیت کے خزائن ہوتے ہیں کسی میں سونا، کسی میں چاندی کسی میں کوئی اور چیز ایسے ہی مختلف انسانوں میں مختلف خوبیاں ہوتی ہیں کسی میں کوئی خوبی، کسی میں کوئی خوبی۔

خلاصہ جملہ اولیٰ : کہ لوگ مکارمِ اخلاق میں مختلف استعدادیں رکھتے ہیں جیسے کانیں مختلف ہوتی ہیں کوئی لعل وزمرد کی کوئی طلاء ونقرہ کی، اسی طرح انسان من حیث المادہ سب برابر ہیں مگر استعداد کے تفاوت کی بناء پر ان کے مراتب میں تفاوت ہوتا ہے کوئی عالم فقیہ ہوتا ہے اور کوئی جاہل رہتا ہے،

قریش کا ایک آدمی ہوتا اور یہ حکومت وغیرہ کچھ نہ جانتا۔ ان کے پاس آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کی چادر، قمیص اور ازار اور کچھ موئے مبارک اور ناخن مبارک موجود تھے۔ انہوں نے وصیت فرمائی تھی کہ مجھے آپ کی قمیص ازار اور چادر مبارک میں کفن دیا جائے اور میری ناک اور منہ ان ان اعضاء میں جن سے سجدہ کیا جاتا ہے آنحضرت ؐ کے بال مبارک اور ناخن مبارک بھر دیے جائیں اور مجھے ارحم الراحمین کے سامنے تنہا چھوڑ دیا جائے وہ میرے ساتھ جو معاملہ مناسب سمجھیں گے کریں گے۔

کوئی مکارم اخلاق کے ساتھ متّصف ہوتا ہے اور کوئی رذیل اخلاق کے ساتھ متّصف ہوتا ہے۔

سوال : دوسرے جواہرات کو چھوڑ کر صرف سونا وچاندی کے ساتھ انسان کو تشبیہ دی ہے اس میں کیا حکمت ہے ؟ حالانکہ مشبہ بہ اور بھی بہت ہیں۔

جواب اوّل ۔ سونا وچاندی کو بار بار آگ میں ڈال کر نکھارا جاتا ہے بخلاف دوسرے معادن کے کہ ان کو آگ میں نہیں ڈالا جاتا۔ علیٰ ہٰذا انسان کو بھی مجاہدہ وریاضت کی بھٹی میں بار بار ڈالا جاتا ہے کہ ایک عبادت سے فارغ ہو کر دوسری عبادت میں مشغول ہو جاتا ہے۔

جواب دوّم : جیسے سونے وچاندی کی صفائی بھٹی میں ڈالنے سے بڑھتی ہے ایسے ہی عبادت وریاضت کی زیادتی سے انسان کی صفائیِ باطن بھی ترقی کرتی ہے۔

جواب سوّم : سونا وچاندی اکثر باقی دھاتوں سے زیادہ قیمتی ہے اور انسان بھی باقی حیوانات سے زیادہ قیمتی ہے۔

یقول ابوالاسعاد جوابًا : اَلذَّهَبُ والفِضَّةُ مَحَلّانِ لتوقیع السلطان فکذالك قلب المؤمنِ محلّ توقیع الرحمٰن " قَالَ اللهُ تعالیٰ کَتَبَ فِیۡ قُلُوۡبِهِمُ الۡاِیۡمَانَ (پ ٢٨ س مُجادلہ)

جزء دوّم : خِيَارُهُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُهُمْ فِي الْإِسْلَامِ ۔

محدثین حضرات نے اس کے دو مطلب بیان فرمائے ہیں :

اوّل یہ کہ جو لوگ ایمان لانے سے پہلے حالت کفر میں بہترین خصائل وعادات کے مالک تھے (مثلاً سخاوت، شجاعت، دیانت داری، محبّت وغیرہ) وہ اسلام لانے کے بعد بھی ان صفات کی بناء پر بہترین قرار دیے گئے ہیں۔

خُلاصہ جُملہ ثانیہ

جو فطری جواہر کے اعتبار سے جاہلیت میں افضل تھا وہ اسلام لانے کے بعد بھی افضل رہے گا البتہ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ دین کی فہم پیدا کرے وگرنہ ہو سکتا ہے کہ جو مفضول تھا وہ دین کی فہم پیدا کر کے افضل بن جائے۔ اور افضل دین سے دوری کی وجہ سے مفضول بن جائے اس کو کہا گیا ہے اِذَا فَقِهُوْا ۔

دوم : دوسرا مطلب یہ ہے کہ جو جاہلیت میں سردار تھا اسلام میں بھی اس کی حیثیت کا اعتبار کیا جائے گا۔ بشرطیکہ دینی علوم حاصل کرلے۔ ولنعم ما قیل ؎

اَلعِلمُ یَنہَضُ بِالخَسِیسِ اِلَی العُلٰی وَالجَہلُ یَقعُدُ بِالفَتَی المَنسُوبِ

سوال ۔ اس حدیث پاک کے دونوں جملوں میں بظاہر کوئی ربط نظر نہیں آتا کیونکہ پہلے جملہ میں "اَلنَّاسُ مَعَادِنُ الخ" کا تذکرہ ہے جب کہ جملہ ثانی میں یہ کہا گیا کہ جو زمانہ جاہلیت میں خیار تھے وہ مستقبل میں بھی خیار ہیں بشرطیکہ دین کو سمجھیں۔

جواب ۔ دونوں میں ربط ہے اور وہ ربط وجہ تشبیہ سے ہے یعنی ذہب اور فِقہ میں کیفیت ربط یہ ہے کہ پہلے جملہ میں فرمایا کہ انسان استعداد کے لحاظ سے مختلف ہیں جس طرح معادن مختلف ہوتی ہیں۔ جب کہ جملہ ثانیہ میں بھی ذہب وفِقہ کو مدنظر رکھا کہ دیکھو سونا اور چاندی جب تک کان میں پڑے رہتے ہیں تو پڑے رہنے کی وجہ سے اپنی اصلی حالت میں نہیں ہوتے مگر جب انہیں کان سے نکالا جاتا ہے اور بھٹی میں ڈال کر تپایا جاتا ہے تو وہ اپنی اصلی حالت میں نظر نہیں آتے بلکہ ان کی آب وتاب میں اور اضافہ ہوجاتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی شخص کفر کی ظلمت میں چھپا رہتا ہے تو وہ کتنا ہی با اخلاق ہو اسے برتری حاصل نہیں ہوتی مگر جب اسلام کی دولت اسے نصیب ہوجائے تو اس کے اوصاف مذکورہ میں اور اضافہ ہوجاتا ہے۔

قولہٗ اِذَا فَقُہُوْا ۔ فَقِہَ باب سَمِعَ سے بمعنیٰ عالم ہونا۔ اور فَقُہَ باب کَرُمَ سے بمعنیٰ فقیہ ہونا دونوں صورتیں صحیح ہیں کیونکہ فقاہت کے لیے علمیت اور علمیت کے لیے فقاہت لازم ہے۔

وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَاحَسَدَ اِلَّا فِی اثْنَتَیْنِ رَجُلٌ اٰتَاہُ اللّٰہُ مَالًا فَسَلَّطَہٗ عَلٰی ھَلَکَتِہٖ فِی الْحَقِّ

ترجمہ : روایت ہے حضرت ابن مسعودؓ سے فرماتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو کے سوا کسی میں رشک جائز نہیں۔ ایک شخص جسے اللہ مال دے تو اسے اچھی جگہ خرچ پر لگائے

قولہٗ اثنین ۔ یہ صفت ہے اس کا موصوف رَجُلَین مُقدّر ہے بعض روایت میں (کما فی الحاشیۃ) اثنتین یا اثنتان کے لفظ ہیں پھر یہ صفت خصلتین یا خصلتان کی بنے گی۔

قولہٗ رَجلٌ ۔ اس میں دو اعراب ہیں ۱؎ رَجُلٌ مرفوع ہو تو مبتداء محذوف کی خبر بنے گا۔ ای ھُوَ رَجلٌ ۲؎ مجرور پڑھیں تو اثنین سے بدل ہوگا۔

قولہٗ فَسَلّطَہٗ ۔ ای وفّقہ اللّٰہ تعالیٰ او وکلہ اللّٰہ تعالیٰ ۔

قولہٗ علیٰ ھلکتہٖ ۔ ای انفاقہٖ ۔

سوال ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ھلکتہ والی تعبیر کیوں اختیار فرمائی ؟ یوں فرماتے " انفقتہٗ فی الحق فھلکتہ کہنے میں کیا حکمت ہے ؟

جواب ۔ فھلکتہ کی تعبیر ذکر کرکے مبالغہ کی طرف اشارہ کیا کہ وہ رجل مال کو جمع نہیں رہنے دیتا جونہی آتا ہے طریقِ خیر میں خرچ کر ڈالتا ہے ۔ اگر انفقتہ کی تعبیر ہوتی تو اشارہ ہوتا کہ خرچ تو کیا مگر بعض مال جب کہ ھلکت سے مکمل مال ہلاک کیا ۔ اس وجہ سے یہ انوکھی تعبیر اختیار کی ۔

قولہٗ فی الحقِ ۔ اس قید سے اعراض مقصود ہے اِسراف سے ۔ کہ راہِ خدا میں مال خرچ کرنا مقصود نہیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ مال خرچ کرنے کا مصرف صحیح ہو ۔

قولہٗ الحکمۃ ۔ حکمت یہ علم صحیح ، عمل صالح ، قول صادق ، عقلِ سلیم ، تفقہ فی الدین ، اصابت رائی ، خشیۃ اللہ وغیرہم تقریبًا تیس ۳۰ معنوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے لیکن بعض روایات میں بجائے حکمت کے لفظ قرآن آیا ہے ۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ یہاں فہم قرآن مراد ہے یعنی جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کی فہم عطا فرمائی ، اور پھر وہ شخص اپنے معاملہ اور دوسروں کے معاملہ میں بھی اسی کے مطابق فیصلہ کرتا ہے اور تعلیم دیتا ہے تو اس میں تین باتیں جمع ہوگئیں ۔

خُلاصۃُ الحدیث : یہ ہے کہ حسد کرنا ہے تو ان دو قسم کے لوگوں پر کرو یعنی غنی اور عالم ، ان کے علاوہ کسی پر حسد نہ کرو ۔

سوال ۔ یہ ہے کہ دوسری نصوص میں حسد کی مطلقاً مذمت کی گئی ہے " وَلَا تَحَاسَدُوْا وَلَا تَبَاغَضُوْا الخ (ابن ماجہ شریف ص۲۸۲ ج ۱ بابُ الدُّعاءِ بالعفو والعافیۃ) ۔ وفی مقامٍ اٰخر:۔

" عَنْ اَنَسٍؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلْحَسَدُ یَاْکُلُ الْحَسَنَاتِ کَمَا تَاْکُلُ النَّارُ الْحَطَبَ (ابن ماجہ شریف ص۳۲۰ ج ۲ بابُ الحسد)

جب کہ اس حدیث میں دو قسم کے لوگوں پر حسد کا جواز معلوم ہوتا ہے ۔ تو دونوں میں بظاہر تعارض ہے ۔

جواب اوّل : حسد یہاں اپنے معنیٰ میں نہیں بلکہ اس سے مُراد یہاں غبطہ اور رشک ہے ۔ اب حسد اور غبطہ کی تشریح ہو جائے ۔

حسد کی تعریف هُوَ تمنّی زوال نعمۃ الغیر سواءٌ حصل لہٗ اَم لاَ ۔ حسد کہا جاتا ہے کہ کسی کی نعمت کے زوال کی تمنا کرتے ہوئے اپنے لیے حصول کی تمنّا کرنا ۔

غبطہ کی تعریف هی تمنّی الرّجل حصول مثلها لہٗ من غیر ان یتمنّی زوالها عن الغیر: غبطہ کہا جاتا ہے کہ دوسرے کی نعمت کی مانند نعمت حاصل ہونے کی تمنا کرنا، اور اس کے زوال کی تمنا نہ کرنا ۔

اوّل بالاتفاق حرام ہے اور رأس الاٰثام ہے ۔ اس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پناہ پکڑی ہے " مِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ "

دوّم جائز ہی نہیں بلکہ مُستحسن و مرغوب ہے ۔ اب حدیث ہٰذا میں جو حسد کہا گیا اس سے غبطہ مُراد ہے ۔ چونکہ نفس حصول نعمت کی تمنّا دونوں میں مشترک ہے اس لیے ایک کا اطلاق دوسرے پر جائز ہے ۔ چنانچہ امام بخاریؒ نے بابُ الاِغْتباط کے تحت اس حدیث کو لاکر اشارہ کر دیا کہ حسد غبطہ کے معنیٰ میں ہے ۔

جوابِ دوّم یہ کہ حسد اپنے حقیقی معنیٰ پر محمول ہے لیکن یہ کلام علیٰ سبیل الفرض والتقدیر کے ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ اگر بالفرض حسد کرنا جائز

ہوتا تو ان دو پر جائز ہوتا لیکن فی الواقع یہ ممنوع ہے۔ لہٰذا اب ان پر حسد کی اجازت نہیں

سوال آپ نے کہا کہ غبطہ جائز ہی نہیں بلکہ مستحسن و مستحب ہے۔ حالانکہ علامہ قاضی بیضاوی ؒ نے غبطہ کو ناجائز کہا ہے۔ لقولہ تعالیٰ

"وَقَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ قَارُوْنُ۔ (پ۲۰ القصص ع)

یہاں مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ قَارُوْنُ سے غبطہ ہی مفہوم ہوتا ہے کہ جس پر یہ آیت ہے "وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ"۔ اب اہلِ علم نے جو غبطہ کرنے پر بھی وَیْل کہا حق تعالیٰ نے انکار نہیں کیا۔ اور یہ بات خود حدیثِ پاک سے ثابت ہے کہ لفظ وَیْل ہلاکت اور تباہی کے لیے مستعمل ہے" کما فی واقعۃ ویل للاعقاب مِنَ النَّارِ" معلوم ہوا کہ غبطہ بھی حسد کی طرح تباہی ہے۔

جواب ہر غبطہ مستحسن و مستحب غبطہ نہیں بلکہ جو غبطہ مفضی الی الحسد ہو وہ بھی حسد کی طرح ناجائز ہے اور قاضی بیضاویؒ کا بھی یہی مقصد ہے کہ غبطہ مفضی الی الحسد ناجائز ہے "کما فی واقعۃ قارون" لیکن جو مفضی الی الحسد نہ ہو تو وہ مستحسن و مستحب ہے۔

سوال : غبطہ تو دوسری صفات میں بھی جائز ہے صرف ان دو کی تخصیص کیوں کی گئی؟

جواب : مبالغہ کے لیے تخصیص کی گئی کہ غبطہ تو ویسے ہر صفات محمودہ میں شائع ہے لیکن خصوصًا یہ دو صفتیں غبطہ کے لائق ہیں۔

وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ رضؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا مَاتَ الْاِنْسَانُ اِنْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهٗ اِلَّا مِنْ ثَلَاثَةٍ اِلَّا مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ اَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهٖ اَوْ وَلَدٍ

ترجمہ : روایت ہے حضرت ابو ہریرہؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جب آدمی مرجاتا ہے تو اس کے عمل بھی ختم ہو جاتے ہیں سوائے تین اعمال کے ایک دائمی خیرات، یا وہ علم جس سے نفع پہنچتا رہے یا وہ بچہ جو اس

صَالِحٍ يَدْعُوْ لَهٗ ۔	کے لیے دعائے خیر کرتا ہے۔

قولہ ثَلٰثَۃٍ : تقدیر عبارت یوں ہے " اِلَّا مِنْ ثَلَاثَۃِ اَعْمَالٍ یا ثَلَاثَۃِ اَشْیَآءٍ ۔

تقسیمِ اَعمال

اعمال صالحہ دو قسم ہیں :۔

اوّل اعمال عارضی ۔ ایسے اعمال جن کا تعلّق دنیوی زندگی سے ہوتا ہے ان اعمال کے اثرات مرنے کے بعد دنیا ہی میں ختم ہوجاتے ہیں ۔ مثلاً نماز، روزہ وغیرہ ۔ کیونکہ جب زندگی ختم ہوگئی تو یہ اعمال بھی ختم ہوگئے اور جب یہ اعمال ختم ہو گئے تو اس پر جزاء وسزاء کا ترتّب بھی ختم ہو گیا ۔

دوّم اعمال دائمی ۔ جن کے ثواب کا سلسلہ صرف زندگی میں ہی نہیں ملتا ۔ بلکہ مرنے کے بعد بھی جاری رہتا ہے جسے اعمال دائمیہ کہتے ہیں ایسے ہی اعمال کے بارہ میں اس حدیث میں ارشاد فرمایا جا رہا ہے ۔

قولہٗ اِلَّا مِنْ صَدَقَۃٍ جَارِیَۃٍ ۔ یہ ثَلَاثَۃٍ سے بدل ہے پہلی چیز صدقہ جاریہ ہے یعنی اگر کوئی شخص خدا کی راہ میں زمین وقف کر گیا ہے، یا کنواں و تالاب بنوا گیا ہے یا ایسے ہی مخلوقِ خدا کے فائدہ کے لیے کوئی دوسری چیز اپنے پیچھے چھوڑ گیا ہے تو جب تک یہ چیزیں قائم رہیں گی اور لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے تو اس کو برابر ثواب ملتا رہے گا ۔

قولہٗ اَوْ عِلْمٍ یُنْتَفَعُ بِہٖ : دوسری چیز علم نافع ہے یعنی کسی ایسے عالم نے وفات پائی جو اپنی زندگی میں لوگوں کو اپنے علم سے فائدہ پہنچاتا رہا اور اپنے علوم و معارف کو کسی کتاب کے ذریعہ محفوظ کر گیا جو ہمیشہ لوگوں کے لیے فائدہ مند اور رشد و ہدایت کا سبب بنی ہے ۔ یا کسی ایسے شخص کو اپنا شاگرد بنا گیا جو اس کے علم کا صحیح وارث ہے ۔

جس سے لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ یہ سب چیزیں ایسی ہیں جو زندگی ختم ہونے کے بعد اس کے لیے سرمایہ سعادت ثابت ہوں گی اور جن کا ثواب اسے وہاں برابر ملتا رہے گا۔

قولہٗ اَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ ۔ تیسری چیز اولاد صالح ہے ظاہر ہے کہ کسی انسان کے لیے سب سے بڑی سعادت اور وجہ افتخار اس کی اولاد صالح ہی ہوتی ہے۔ اس لیے کہ صالح اولاد نہ صرف ماں باپ کے لیے دنیا میں سکون وراحت کا باعث بنتی ہے بلکہ ان کے مرنے کے بعد ان کے لیے وسیلۂ نجات اور ذریعۂ فلاح بھی بنتی ہے۔

سوال ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وَلَدٍ فرمایا اِبْن کیوں نہیں فرمایا۔ حالانکہ وَلد میں تعمیم ہے جبکہ ابن میں تخصیص ہے۔

جواب ۔ وَلَد فرماکر تعمیم کی طرف اشارہ فرمایا۔ اور تعمیم سے مُراد تعمیم وصفی ہے نہ کہ جنسی یعنی بیٹے بیٹیاں، مذکر، مؤنث سب کو شامل ہو جاتے۔

قولہٗ صَالِحٍ : صَالِحٍ کی قید لگا کر صالح کو ترغیب دی دعا رکی۔ ورنہ اگر کوئی فاجر فاسق وَلد اپنے والدین کے لیے دعاء کرتا ہے تو وہ بھی مفید ہے۔

قولہٗ یَدْعُوْا ۔ اس طریقہ پر یَدْعُوْا کی قید بھی ترغیبًا ہے کہ وَالِدَین کے لیے انسان دعاء کرتا رہے ورنہ اگر دعاء نہ بھی کرے ثواب تو پھر بھی ملے گا۔

یقول ابوالاسعاد : حدیث پاک میں ہے کہ جس آدمی سے والدین یا دونوں میں سے کوئی ایک ناراض ہو کر فوت ہو جائے اور یہ ان کے لیے دُعاءِ مغفرت کرتا رہے تو اللہ تعالیٰ اس کو فرمانبرداروں میں لکھ دیتے ہیں (مشکوٰۃ شریف ص۴۲۱ ج۲ کتابُ الآداب بابُ البرِّ والصِّلۃ)

سوال ۔ یہ ہے کہ پہلے دونوں (صدقہ جاریہ وعلم نافع) میں تو ظاہر ہے کہ ان کا عمل تھا اس لیے ثواب مل رہا ہے۔ مگر تیسرے (وَلد صالح) کے بارے میں اشکال ہے کہ یہاں تو اس کا کوئی عمل نہیں ہے کہ ثواب ملتا رہے۔

جواب ۔ سببیّت کی بناء پر ولد کے عمل میں وَالِدَین کا دخل ہے جیسے حدیث پاک میں آتا ہے " اَنْتَ وَمَالُکَ لِاَبِیْکَ اِنَّ اَوْلَادَکُمْ مِنْ کَسْبِکُمْ "

(مشکوٰۃ شریف ص۲۹۱ ج۲ بابُ النفقات وحقّ المملوک)

اس لیے ولد صالح کو والدین کے عمل کا ثمرہ قرار دیا۔

سوال ۔ مشکوٰۃ شریف ص۲۳۲ ج ۲ کتاب الجہاد فصل ثانی میں حضرت فضالہؓ کی روایت ہے "کل میت یختم علی عملہ الا المرابط فی سبیل اللہ فانہ ینمو لہ عملہ الی یوم القیامۃ" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سرحدی محافظ کے عمل کا ثواب بھی اس کی وفات کے بعد جاری رہے گا۔ اسی طرح مَنْ سَنَّ سُنَّۃً حَسَنَۃً کے متعلق بھی یہی حکم ہے لہذا حصر علی الثلاثہ باطل ہوا۔

جواب اوّل ۔ مرابط کی اپنی زندگی والے عمل کا ثواب بڑھتا رہتا ہے دوسرے کے عمل سے مل کر اس کے ثواب میں اضافہ نہیں ہوتا اور حدیث باب میں ہے کہ دوسروں کے اعمال جو میّت کی وفات کے بعد وجود میں آتے ہیں۔ تو سبب کی بناء پر میّت کو بھی ان کا ثواب ملتا رہتا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ مرابط کا اپنا عمل بڑھتا ہے اور یہاں دوسروں کے اعمال کا ثواب ملتا ہے۔

جواب دوّم : مرابط کا عمل مسلمانوں کی نصرت ہے جو صدقہ جاریہ میں داخل ہے، اسی طرح اجرائے مَنْ سَنَّ سُنَّۃً حَسَنَۃً علم نافع میں داخل ہے۔

جواب سوّم ۔ عند البعض ثلاثہ کا حصر اضافی ہے حقیقی اور استغراقی نہیں۔

وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ نَفَّسَ عَنْ مُؤْمِنٍ كُرْبَةً مِّنْ كُرَبِ الدُّنْيَا نَفَّسَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِّنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ :

ترجمہ : روایت ہے انہی سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جو کسی مسلمان کو دنیوی تکلیف سے رہائی دے تو اللہ اس سے روزِ قیامت کی مصیبت دور کرے گا۔

قولہٗ نَفَّسَ : بالتشدید یہ تنفیس سے ہے ای فَرَّجَ زائل کرنے کے معنیٰ میں آتا ہے۔

قولہٗ مُؤمِنٍ : یہ نکرہ ہے اس میں مُتقی وغیر مُتقی دونوں آجائیں گے۔ چنانچہ بعض محدثینؒ یہاں پر وَلَوْکَانَ فَاسِقًا کی قید لگاتے ہیں۔

قولہٗ کُرْبَۃً ۔ بضم الکاف ای الحزن اس کی تنوین تحقیر وتقلیل کے لیے ہے۔ اور ثانی کربۃً کی تنوین تعظیم کے لیے ہے ای کربۃٌ عظیمۃٌ اب سوال وارد نہ ہوگا۔ کہ قرآن مُقدس میں تو ہے مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَۃِ فَلَہٗ عَشْرُ اَمْثَالِھَا رپ۸ ۔ یہاں تو کربۃ کے بدلہ ایک کربۃ کا ازالہ ہے۔ تو جواب واضح ہے کہ پہلی کُرْبَۃ سے مُراد کُرْبَۃ حقیرہ ہے اور کربۃ ثانی یعنی آخرت والی کربۃ سے مُراد کُرْبَۃ عظیمہ ہے تو عشر امثال کے بالکل برابر ہے۔ دراصل حدیث پاک کے یہ الفاظ ھَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَان کی تفسیر ہیں کیونکہ اَلْخَلْقُ عَیَالُ اللہِ۔

قولہٗ وَمَنْ یَسَّرَ عَلٰی مُعْسِرٍ : اس کا معنیٰ ہے ای سَھَّلَ عَلٰی فَقِیْرٍ مُعْسَرٍ ۔ بفتح السین بمعنیٰ مُصیبت زدہ۔ یہ عام ہے کیونکہ نکرہ لایا گیا ہے اس میں مؤمن کافر سب برابر ہیں۔ اس لیے محدثینؒ یہاں وَلَوْ کَافِرًا کی قید بھی لگاتے ہیں اس طرح تیسیر عام ہے کہ قرض خواہ کچھ مہلت دیدے یا بالکل بری کردے۔

قولہٗ وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا : ستر دو قسم ہے :۔

اوّل حسّی : مثلاً کوئی آدمی اپنی ناداری ومفلسی کی بناء پر لباس کی نعمت سے محروم ہے اور اتنا تنگدست ہے کہ اپنے ستر کو بھی نہیں چھپا سکتا اور یہ اپنے بھائی کی ستر پوشی کرتا ہے تو یہ بھی شریعت کو مطلوب ہے "کما فی روایۃ مُسلم" ای ستر بدنہ باللباس"

دوُم معنوی : عیوبات کی پردہ پوشی کہ کسی مؤمن سے گناہ سرزد ہوگیا ہے تو اُسے لوگوں کے سامنے ظاہر نہ کرے اور چھپائے تو یہ بھی مستحسن فعل ہے البتہ فساد کے سرغنہ کے حالات کو ظاہر کرنا اور اس کے عزائم سے ارباب انتظام کو آگاہ کرنا۔ یا وہ آدمی جو کسی کی چوری کرنے کا ارادہ کررہا ہو اور اس کو آگاہ کرنا یا قتل وغیرہ پر مطلع کرنا اس سے مستثنیٰ ہے۔

قولہٗ مَاکَانَ ۔ بمعنیٰ مَادَامَ

قولہٗ اَلْعَبْدُ : یہاں مَشْغُوْلاً کا لفظ مُقدّر کریں گے۔

قولہٗ اَخِیْہِ : فِی الدِّیْنِ کی قید مُقدر ہے کیونکہ بعض روایت میں مُسلم کے الفاظ ہیں۔ پھر عونیّت عام ہے۔ بدن سے ہو، قلب سے ہو، مال سے ہو۔

قولہٗ سَلَکَ : ای مَشٰی

قولہٗ طَرِیْقًا : طریق دو قسم ہے۔ اوّل حسّی یعنی راستے وغیرہ۔ دوّم معنوی مثلاً دینی کتابوں کا مُطالعہ کرنا، دونوں طریق داخل ہیں۔ کیونکہ علم کے حصُول کے لیے دونوں کی ضرورت ہوتی ہے پھر طَرِیْقًا کا کلمہ نکرہ ہے اس میں طریق صغیر وکبیر دونوں شامل ہیں۔

قولہٗ سَهَّلَ اللّٰهُ لَهٗ بِهٖ۔ تسہیل کا زمانہ کب ہے ؟ بعض حضرات کے نزدیک آخرت میں سہولت ہوگی۔ دوسرے حضرات کہتے کہ دنیا کی سہولت مراد ہے یعنی اس دنیا میں سچے عقیدے اور صحیح عمل کی توفیق نصیب ہوتی ہے۔

قولہٗ بُیُوْتُ اللّٰهِ : مَساجد کے بجائے بیت کی قید لگائی۔ تعمیم کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ وہ ہر مقام جو قربِ خداوندی کا ذریعہ بنے۔ مساجد والمدارس والرباط وغیرہ۔

قولہٗ یَتَدَارَسُوْنَهٗ : تلاوت اور درس کا فرق ہے تلاوت صرف انفرادًا ہوتی ہے جب کہ درس کا اطلاق قرأۃ بعض علیٰ بعض پر ہوتا ہے۔ اس لیے تلاوت کے بعد درس کا ذکر علیحدہ فرمایا۔

قولہٗ حَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ : اَی اَحَاطُوْا بِهِمْ اَوْطَافُوْا بِهِمْ یَسْمَعُوْا مِنَ الْقُرْاٰنِ۔ اور ملائکہ سے مراد سیاحین ملائکہ ہیں جو ذکر کی مجالس ڈھونڈتے پھرتے ہیں ورنہ اعمال لکھنے والے اور حفاظت کرنے والے فرشتے ہر وقت انسان کے ساتھ رہتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ جہاں مجمع کے ساتھ ذکر اللہ ہو رہا ہو وہاں یہ تینوں رحمتیں اترتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ تنہا ذکر سے جماعت کاہل کا ذکر کرنا افضل ہے جماعت کی نماز کا درجہ زیادہ ہے اگر ایک کی قبول سب کی قبول۔

قولہٗ مَن عِندَهٗ : اس سے مراد فرشتوں کی جماعت جو ملاء الاعلیٰ

کہلاتی ہے۔ اس کی شرح وہ حدیث ہے کہ فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جو رب کو اکیلے یاد کرے رب بھی ایسے ہی اُسے یاد کرتا ہے۔ جو جماعت میں یاد کرے تو رب اسے فرشتوں کی مبارک جماعت میں یاد کرتا ہے۔ کما فی قولہ تعالیٰ " فَاذْكُرُوْنِىْٓ اَذْكُرْكُمْ "۔

قولہٗ مَنْ بَطَّاَ ۔ بتشدید الطّاء یہ تعجیل کی ضد ہے۔

قولہٗ لَمْ يُسْرِعْ بِهٖ نَسَبُهٗ ای لم یقدمہ نسبہ یعنی لا یحصل التقرّب الی اللہ تعالیٰ بالنّسب بل بالاعمال الصّالحۃ" یعنی آخرت کی کامیابی وکامرانی عمل پر ہے نسب پر نہیں ہے۔ کما فی قولہ تعالیٰ "اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقَاكُمْ" وفی قولہ علیہ السلام "یا صَفِيَّةُ عَمَّةُ مُحَمَّدٍ یا فَاطِمَةُ بنت مُحَمَّدٍ ائتونی یوم القِيَامَةِ بِاَعْمَالِكُمْ لا بانسابکم فانّی لا اغنی عنکم مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا (مرقات)

بندہ عشق شدی ترک نسب کن جامی
کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَوَّلَ النَّاسِ يُقْضٰى عَلَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ رَجُلٌ اسْتُشْهِدَ فَاُتِىَ بِهٖ فَعَرَّفَهٗ نِعَمَهٗ فَعَرَفَهَا فَقَالَ فَمَا عَمِلْتَ فِيْهَا قَالَ قَاتَلْتُ فِيْكَ :

ترجمہ : روایت ہے انہی سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ پہلے جس کا فیصلہ قیامت میں ہوگا وہ شہید ہے۔ اسے لایا جائے گا تب رب اس سے اپنی نعمتوں کا اقرار کرائے گا فرمائیں گے کہ اس کے شکریہ میں تو نے کیا عمل کیا عرض کرے گا۔ تیری راہ میں جہاد کیا حتّٰی کہ شہید ہو گیا۔

قولہٗ اُسْتُشْهِدَ ۔ ای قُتِلَ فِى سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔
قولہٗ فَعَرَّفَهٗ ۔ بالتشدید ای ذکرہ تعالیٰ یعنی اللہ پاک اس کو یاد دلائیں گے

قولہ نعرفھا : بِالتَّخفِیفِ ؛ ای تذکرھا۔ جو دہشت کی وجہ سے بھول چکی ہونگی۔

قولہٗ فقال فما عمِلتَ فِیھا : اللہ پاک فرمائیں گے کہ تو نے کیا شکر کیا ہے۔ فِیكَ۔ فِی اجلہ تعلیلیہ ہے یعنی تیری خاطر۔

قولہٗ استشھِدتُ۔ جہاد کرتے ہوئے میں شہید ہوگیا۔ یہ مقولہ ان کے اپنے زعم میں ہے ورنہ شہادت ہے ہی نہیں۔ کیونکہ حقیقی شہادت وہ ہے جو خدا کی رضا کے لیے ہو" کما فی قولہ تعالیٰ " یَحۡسَبُوۡنَ اَنَّھُمۡ یُحۡسِنُوۡنَ صُنۡعًا" (پ۱۶ الکھف)

عند البعض ان کی عادت کے مطابق ہے جس طرح زندگی میں جھوٹ بولنے کی عادت تھی، خدا کے سامنے بھی جھوٹ بولے گا۔

" یَوۡمَ یَبۡعَثُھُمُ اللّٰہُ جَمِیۡعًا فَیَحۡلِفُوۡنَ لَہٗ کَمَا یَحۡلِفُوۡنَ لَکُمۡ وَ یَحۡسَبُوۡنَ اَنَّھُمۡ عَلٰی شَیۡءٍ اَلَآ اِنَّھُمۡ ھُمُ الۡکٰذِبُوۡنَ (پ۲۸ مجادلہ)

قولہٗ قال کَذَبتَ : بظاہر اس جملہ پر ہوتا ہے۔

سوال ؛ یہ ہے کہ یہ جملہ کیسے صحیح ہے حالانکہ شہادت تو ظاہری حاصل ہے۔

جواب : یہ ہے کہ عبارت یہاں مقدر ہے دراصل عبارت یوں تھی " کذبت فِی دَعوتِی الاِخلَاصِ اَم فِی رَضَاءِ اللہِ لَا فِی اصلِ الدعوۃِ۔

قولہٗ جَرِیٌّ۔ اصل میں اَنتَ جَرِیٌّ تھا۔

قولہٗ فقد قِیلَ : کہ جو تیری مراد تھی وہ حاصل ہوگئی۔

قولہٗ فَسُحِبَ۔ اَیۡ جَرَی عَلٰی وَجھِہٖ۔ یعنی نہایت ذلت کے ساتھ مرے ہوئے کتے کی طرح ٹانگ سے گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

سوال۔ حدیث پاک میں وَجھہٗ کی تخصیص کیوں کی ہے حالانکہ اعضاء اور بھی تو ہیں۔

جواب۔ چونکہ جھوٹ اس نے منہ سے بولا تھا اس وجہ سے منہ کے بل گھسیٹا جائیگا۔ یعنی جزاء بالمثل ہے۔

قولہٗ تعلّمتُ العِلمَ وَعلّمتُہ : درجہ اوّل تکمیل کا ہے کہ پہلے خود کامل ہو دوسرا درجہ علّمتہ الکمال کا ہے کہ دوسروں کو کامل کیا۔

قولهٗ قرأتُ القرآن ۔ یہ تخصیص بعد از تعمیم ہے اہتمامِ شان کے لیے ورنہ علم میں قرأت قرآن بھی شامل تھا۔

قولهٗ وَسَّعَ اللّٰهُ : ای کثر ماله۔

قولهٗ جَوَادٌ ۔ جمع جود بمعنیٰ سخی کریم۔

خلاصۃ الحدیث : اعمال میں نیت کا کیا درجہ ہے اور خلوص کی کتنی ضرورت ہے اس حدیث سے بخوبی واضح ہوتا ہے بندہ کتنا بڑے سے بڑا عمل خیر کرے، بڑی سے بڑی نیکی کر ڈالے۔ لیکن اگر اس کی نیت بخیر نہیں ہے تو اس کا وہ عمل اور نیکی کسی کام نہیں آئے گی۔ خدا کو وہی عمل پسند ہے جس میں محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کی رضاء مطلوب ہو اور جذبہ اطاعت سے بھرپور ہو۔ ورنہ جو بھی عمل بغیر اخلاص اور بغیر نیتِ خیر کیا جائے گا۔ چاہے وہ کتنا ہی عظیم عمل کیوں نہ ہو۔ بارگاہِ الوہیت سے ٹھکرا دیا جائے گا۔ اور اس پر کوئی مفید نتیجہ مرتب نہیں ہوگا۔ بلکہ الٹا عذابِ خداوندی میں گرفتار کیا جائے گا۔ کما فی ھٰذا الحدیث۔

وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَقْبِضُ الْعِلْمَ اِنْتِزَاعًا يَّنْتَزِعُهٗ مِنَ الْعِبَادِ وَلٰكِنْ يَّقْبِضُ الْعِلْمَ بِقَبْضِ الْعُلَمَآءِ

ترجمہ : روایت ہے حضرت عبداللہؓ بن عمروؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ علم کو کھینچ کر نہ اٹھائیگا کہ بندوں سے کھینچ لے بلکہ علماء کی وفات سے علم اٹھایا جائے گا۔

قولهٗ العلم : علم سے مراد دین کا علم یعنی کتاب اللہ وسنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہے۔

قولهٗ انتزاعًا : یقبض کا مفعول مطلق ہے تقدیر عبارت یوں ہے :۔

لا یقبض قبض انتزاعًا۔

قولہٗ بِقَبْضِ الْعُلَمَآءِ ۔ ای بموتھم ورفع ارواحھم۔

قولہٗ رؤسًا : اتخذ کا باب دو مفعولوں کو تقاضا کرتا ہے رؤسًا مفعول ثانی جُھَّالاً مفعول اوّل ہے۔ رُؤس بمعنیٰ خلیفۃً وقاضیًا و مُفتیًا اِمامًا وشیخًا جن کے ذمہ دینی کام ہوتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ دینی عہدے جاہل سنبھال لیں گے اور اپنی جہالت کا اظہار پسند نہیں کریں گے۔ مسئلہ پوچھنے پر یہ نہ کہیں گے کہ ہمیں خبر نہیں بلکہ بغیر علم غلط مسئلے بتائیں گے۔ اس کا انجام ظاہر ہے۔ بے علم طبیب مریض کی جان لیتا ہے جب کہ جاہل مفتی اور خطیب ایمان برباد کرتا ہے۔

قولہٗ فَضَلُّوْا ۔ ای صَارُوْا ضَالِّیْنَ : خود بھی گمراہ ہوئے۔

قولہٗ وَاَضَلُّوْا ۔ ای مُضِلِّیْنَ لِغَیْرِھِمْ : اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔ یعنی جہالت میں کتنی تعمیم ہے۔

قولہٗ فَاَفْتَوْا بِغَیْرِ عِلْمٍ : دین کا علم نہ رکھنے کے باوجود جب فتویٰ جاری کریں گے تو نتیجۃً گمراہی لازمی ہوگی۔ اس لیے امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ جب تک کسی میں پانچ چیزیں نہ ہوں تو وہ مسند افتاء کو زینت نہ بخشے۔

(۱) نیت صالحہ (۲) حلم و وقار (۳) مسائل میں بصیرت اور ان میں ثابت قدمی کی شان (۴) بقدر ضرورت ذرائع معاش (۵) لوگوں کے احوال کی معرفت۔

قبض علماء کی بحث

محدثینؒ حضرات نے قبض علماء کی متعدد صورتیں لکھی ہیں۔

صورت اوّل ۔ یہ کہ لوگ علوم دینیہ کا حصول ترک کردیں۔ جب حصولِ دین ہی نہیں ہوگا تو علماء کہاں سے پیدا ہوں گے یہ بھی قبض علماء کی صورت ہے۔

صورت دوم ۔ یہ کہ لوگ علوم دینیہ کی کتب ورسائل وغیرہ کی اشاعت بند کردیں اور اس کے مقابلہ میں الحادی وغیر شرعی علوم کی کتب کی اشاعت ہو۔ کیونکہ دنیا کے اندر علوم دینیہ کی اشاعت کا ذریعہ کتب ورسائل دینیہ ہیں۔

صورت سوم ۔ اللہ پاک آن واحد میں علماء کے قلوب سے علوم دینیہ کو اٹھالیں یا محو کردیں ۔

صورت چہارم ۔ اللہ پاک علماءِ ربّانییّن کو فوت کردیں ۔ نبیٔ کریم صلّی اللہ علیہ وسلم نے آخری صورت کو ترجیح دی ہے کہ قبضِ علم کی تمام صورتیں صحیح ہیں مگر ان کا وقوع نہیں ہوگا۔ جب کہ آخری صورت کا وقوع ضرور ہوگا۔

سوال : حدیثِ پاک میں ہے " وعن زیادؓ بن حبیب انه ینزع من الصدُور فی لیلۃٍ (ابن ماجہ ص ج)

اس سے تو قبض علماء والی صورت کی نفی ہوتی ہے اور انتزاعًا ینزعه کا اثبات ہوتا ہے ۔

جواب : قبض علماء کی دو حالتیں ہونگی :

حالت اوّل : اس طرح ہوگی قبض علماء کی شکل میں ۔ پھر جب جہل عام ہوگا اور قیامت کا قرب ہوگا اور علماء پیدا ہوں گے۔

حالت دوم : آنِ واحد میں علم اٹھ جائے گا رات کو علماء سوئیں گے اور صبح اٹھیں گے تو جاہل ہوں گے ۔ یُصْبِحُ عَالِمًا فَیُمْسِیْ جَاهِلًا۔

سوال ۔ قبض علم کی یہ تعبیر کیوں اختیار کی اس میں کیا حکمت ہے ؟

جواب : اللہ پاک کی مرضی کے مطابق قیامت تک اس مقدس دین نے باقی رہنا ہے اگر آن واحد میں علم کا ارتفاع ہو تو پھر مکمل طور پر ختم ہوجائے اس لیے علم کو معلّق کیا عُلماءِ ربّانیّین کے ساتھ کہ عُلماءِ ربّانیّین قیامت تک رہیں گے ان شاء اللہ۔ تو علم بھی باقی رہے گا۔

سوال : حدیثِ پاک میں ہے " لَا یَزَالُ طَائِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِیْ عَلَی الْحَقِّ مَنْصُوْرِیْنَ لَا یَضُرُّهُمْ مَنْ خَالَفَهُمْ حَتّٰی یَأْتِیَ اَمْرُ اللّٰهِ (ابن ماجہ شریف ص۳ ج۱ باب اتباع السّنّۃ) جب کہ حدیث سابق سے معلوم ہوتا ہے کہ قربِ قیامت میں علماء ختم ہوجائیں گے۔

جواب : یَأْتِیَ اَمْرُ اللّٰهِ سے قیامت مراد نہیں بلکہ اس سے ہَوا مراد ہے

اور یہ ہوا قرب قیامت میں چلے گی جس کی وجہ سے سب مؤمن مرجائیں گے اور باقی بُرے لوگ رہ جائیں گے جن پر قیامت قائم ہو گی۔

وَعَنْ شَقِيْقٍؒ قَالَ كَانَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مَسْعُوْدٍؓ يُذَكِّرُ النَّاسَ فِيْ كُلِّ خَمِيْسٍ فَقَالَ لَهٗ رَجُلٌ يَا اَبَا عَبْدِ الرَّحْمٰنِ لَوَدِدْتُّ اَنَّكَ ذَكَّرْتَنَا فِيْ كُلِّ يَوْمٍ قَالَ اَمَا اِنَّهٗ يَمْنَعُنِيْ مِنْ ذَالِكَ :

ترجمہ : روایت ہے حضرت شقیقؒ سے فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن مسعودؓ ہر جمعرات کو وعظ فرماتے تھے۔ ایک شخص نے عرض کیا کہ اے ابو عبدالرحمٰن میری تمنا یہ ہے کہ آپ روزانہ وعظ فرماتے تو فرمایا مجھے اس سے رکاوٹ یہ ہے کہ میں ناپسند کرتا ہوں کہ تمہیں ملال میں ڈال دوں۔

قولہٗ يُذَكِّرُ۔ بِالتَّشْدِيْدِ اى يعظ : یعنی وعظ و نصیحت فرماتے۔

قولہٗ فِيْ كُلِّ خَمِيْسٍ : یوم خمیس کی تخصیص وصول برکت یوم الجمعہ کی وجہ سے ہے یعنی خمیس کا دن جمعہ کا پڑوسی ہے اس کی برکت جمعہ تک پہنچے گی۔

قولہٗ لَوَدِدْتُّ۔ اى اَحْبَبْتُ وَتَمَنَّيْتُ۔

قولہٗ اَنْ اُمِلَّكُمْ : اى املا لکم یعنی ایقاعکم فی الملالۃ کہ کہیں تم ملال میں پڑ جاؤ۔

قولہٗ اَتَخَوَّلُكُمْ۔ مِنَ التَّخَوُّلِ۔ بمعنیٰ لحاظ کرنا اور خیال کرنا۔

قولہٗ السَّآمَةِ۔ اى الملالۃ حال یہ ہے کہ" یعظنا یومًا دون یوم ووقتًا دون وقت کراھیۃ الملالۃ۔ کیونکہ ملالت کے وقت وعظ کا اثر نہیں ہوتا۔

خُلاصۃ الحدیث اس حدیث سے یہ بات واضح ہے کہ وعظ و نصیحت اور تبلیغ کے معاملہ میں اعتدال سے کام لینا چاہیئے ہر وقت اور ہر موقعہ پر وعظ و نصیحت نہیں کرنی چاہیئے اس لیے کہ اس سے لوگوں کے دل اچاٹ ہوجاتے ہیں اور وہ اکتا جاتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے

کہ ان پر کوئی اچھا اثر نہیں ہوتا فائدہ کے بجائے الٹا نقصان ہوتا ہے لہذا جو نصیحت وقت پر ہو وہ قابلِ عمل ہوتی ہے اور قابلِ اثر ہوتی ہے۔

اسمائے رِجال

حضرت شقیق بن سلمہ رض کے حالات

یہ شقیق بن سلمہ رض ہیں، ابو وائل اسدی ان کی کنیت ہے انہوں نے اگرچہ حضور علیہ السلام کا زمانہ پایا لیکن آپ سے کچھ سُنا نہیں ہے کہا کرتے تھے کہ میری عمر بعثتِ نبوی کے وقت دس سال تھی۔ اس وقت میں اپنی بھیڑ بکریاں جنگل میں چراتا تھا۔ صحابہ رض کی ایک بڑی تعداد سے روایت کرتے ہیں ان میں حضرت عمر رض بن الخطاب اور ابن مسعود رض ہیں۔ ابن مسعود رض کے خاص لوگوں میں سے اور ان کے بڑے درجہ کے اصحاب میں سے تھے۔ ان سے بہت حدیثیں مروی ہیں ثقہ اور معتمد تھے۔ حجاج کے زمانہ میں انتقال ہوا۔ اور ایک قول کے مطابق سنہ ۹۹ھ میں ہوا تھا۔

وَعَنْ اَنَسٍ رض قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا تَكَلَّمَ بِكَلِمَةٍ اَعَادَهَا ثَلَاثًا حَتّٰى تُفْهَمَ عَنْهُ وَاِذَا اَتٰى عَلٰى قَوْمٍ فَسَلَّمَ عَلَيْهِمْ سَلَّمَ عَلَيْهِمْ ثَلَاثًا۔

ترجمہ: روایت ہے حضرت انس رض سے فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی لفظ بولتے تو اسے تین بار دہراتے تاکہ سمجھ لیا جائے۔ اور جب کسی قوم پر تشریف لاتے اور انہیں سلام کرتے تو تین بار سلام فرماتے۔

قولہٗ اَعَادَهَا۔ اعادھا بمعنی قالھا کے ہے ورنہ کلمہ چار مرتبہ ہو جائیگا۔

قولہٗ حَتّٰى تُفْهَمَ۔ محدثین حضرات نے لکھا ہے کہ اذا تکلم بکلمۃٍ اعادھا

ثَلَاثًا اپنے ظاہر پر محمول نہیں ۔ یعنی یہ مطلب نہیں کہ آپ ہر گفتگو کے موقع پر ایسا عمل اختیار فرماتے تھے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس کلمات کا اہتمام مقصود ہوتا یا جس کے سمجھنے میں تکلیف ہوتی اس کا اعادہ فرماتے تھے اور حدیث پاک سے بھی یہی سمجھا جارہا ہے حَتّٰى تُفْهَمَ عَنْهُ اسی پر دال ہے ۔

یقول ابوالاسعاد : در اصل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی اذہان کی طرف اشارہ فرمایا کہ جو بات اہم ہوتی اس کو تین بار دہراتے اس لیے کہ لوگوں میں تین درجے ہیں ۔ ۱ ذکی : جس کو اعلیٰ بھی کہہ سکتے ہیں وہ اوّل مرتبہ سے ہی سمجھ جاتا ۔ ۲ اوسط : دوسری مرتبہ سے سمجھ جاتا ۳ غبی : جس کو ادنیٰ بھی کہہ سکتے ہیں وہ تیسری مرتبہ سے سمجھتا ۔ اسی لیے کہا جاتا ہے " مَنْ لَمْ يَفْهَمْ فِي ثَلَاثِ مَرَّاتٍ لَمْ يَفْهَمْ أَبَدًا "

قولہ سَلَّمَ عَلَيْهِمْ ثَلَاثًا : تین مرتبہ سلام پڑھنے کے کئی مطلب بیان کیے جاتے ہیں :۔

اوّل : حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ تین سلام اس وقت کرتے جب کسی بڑے مجمع میں تشریف لے جاتے تو ایک سلام ابتداء مجمع میں ، دوسرا وسط میں ، تیسرا آخر میں ۔

دوم : سَلَّمَ عَلَيْهِمْ ثَلَاثًا ۔ اِستیذان پر محمول ہے ۔ اگر اجازت نہ ملتی تو تین مرتبہ سلام فرما کر لوٹ جاتے ۔

سوم : پہلا سلام استیذان کا ، دوسرا پاس جانے کے وقت تحیہ کا ، تیسرا رخصت کے وقت الوداع کا ۔

وَعَنْ اَبِي مَسْعُوْدٍ الْاَنْصَارِيِّ قَالَ جَآءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنَّهٗ اُبْدِعَ بِيْ فَاحْمِلْنِيْ فَقَالَ مَا عِنْدِيْ فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَنَا اَدُلُّهٗ عَلٰى مَنْ يَحْمِلُهٗ :

ترجمہ : روایت ہے حضرت ابی مسعود انصاریؓ سے فرماتے ہیں کہ ایک شخص حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا بولا کہ میرا اونٹ تھک گیا ہے مجھے سواری دیجئے ۔ آپ نے فرمایا کہ میرے پاس نہیں ۔ ایک نے کہا یا رسول اللہ میں اسے

قولہٗ اُبْدِعَ بِیْ : ای انقطعت عن السیر کہ میرا سواری والا جانور تھک چکا ہے اور سفر کرنے سے قاصر ہے۔ گویا سواری کا دائمی عادت کے خلاف چلنے سے رک جانا ایک قسم کا ابداع اور ایجاد ہے۔

قولہٗ فَاحْمِلْنِیْ ۔ اَیْ اِجْعَلْنِیْ مَحْمُوْلًا علی دابۃ غیرھا کہ برائے کرم مجھے کوئی سواری عنایت فرمائیں۔

قولہٗ فَقَالَ مَا عِنْدِیْ ۔ ای لا اجد ما احملکم علیہ۔ یعنی میرے پاس تو کوئی سواری نہیں جو میں تجھے دوں۔ دراصل یہ حدیث پاک اس آیۃ مبارکہ کی تفسیر ہے " وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۔ (پ۱۰ براۃ)

حدیث مذکورہ میں تو صرف یہ الفاظ ہیں مَا عِنْدِیْ کہ میرے پاس سواری نہیں ہے جب کہ دیگر حدیث میں ہے کہ کرایہ یا مزید ثمن بھی نہیں کہ تجھے دوں۔ علامہ محدث عبدالحق دہلویؒ معنیٰ کرتے ہیں :۔

نیست نزدِ من شتر یا چیزیکہ شتر بداں تواں خرید کرایہ کرد۔ (اشعۃ اللمعات ص۱۵۶ ج۱)

معلوم ہوا کہ آنحضرتؐ کی ذات مبارک خزانوں کی مالک نہ تھی۔

قولہٗ مَنْ دَلَّ : دلالت قولی ہو یا فعلی تعمیم ہے۔

سوال ۔ بحث تو علم کی چل رہی ہے جب کہ حدیث مذکورہ کا تعلُّق تو جہاد کے ساتھ ہے کیونکہ سائل مجاہد تھا جہاد کے لیے اسے سواری کی ضرورت تھی بظاہر دونوں میں ربط نہیں۔

جواب ۔ دَلَّ عَلٰی خَیْرٍ سے ربط ہے۔ کیفیت ربط یوں ہے کہ علم سے بھی دلالت علی الخیر ہوتی ہے، لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے یہاں پر بھی دلالت غیر الخیر ہو رہی ہے اہل جیود کی طرف ان کی رہنمائی کی جارہی ہے یہ بھی ایک قسم کی خیر ہے۔

وَعَنْ جَرِیْرٍؓ قَالَ کُنَّا فِیْ | ترجمہ : روایت ہے حضرت جریرؓ سے

صَدْرَ النَّهَارِ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَآءَهٗ قَوْمٌ عُرَاةٌ مُجْتَابِى النِّمَارِ اَوِ الْعَبَآءِ مُتَقَلِّدِى السُّيُوْفِ عَامَّتُهُمْ مِنْ مُضَرَ بَلْ كُلُّهُمْ مِنْ مُضَرَ :

فرماتے ہیں کہ ہم صبح سویرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر تھے کہ آپ کی خدمت میں ایک قوم آئی جو ننگی اور کمبل پوش تھی، تلواریں گلے میں ڈالی ہوئی تھیں۔ ان میں اکثر مضر سے تھے، بلکہ سارے ہی قبیلہ مضر سے تھے۔

قولہ صَدْرَ النَّهَارِ : صدر بمعنیٰ سینہ، یعنی دن کا سینہ نکل چکا تھا۔ لیکن یہاں صدر بمعنیٰ اوّل النہار ہے جس کا اطلاق دن کے دس گیارہ بجے کے وقت پر ہوتا ہے۔

قولہٗ عُرَاةٌ ۔ عُرَاة جمع عاری یعنی ان کا اکثر بدن ننگا تھا بالکل برہنہ مراد نہیں

قولہٗ مُجْتَابِی ۔ بالجیم ای لابسی بمعنیٰ پہننے والے لپیٹنے والے۔

قولہٗ النِّمَارِ : بکسر النون جمع نمرہ ھی کساءٌ مخططۃ من صوف یعنی وہ ادنی دھاری دار کمبل جس میں سفید و سیاہ دھاریاں ہوں۔

قولہٗ العَبَاءِ ۔ بالمد و بفتح العین جمع عِبَاءَۃٌ ۔ بمعنیٰ چوغہ۔ یہاں اَوْ شک راوی یا تنویع کے لیے ہے یعنی غربت کی وجہ سے ان کے پاس سوائے ایک کمبل وعباء کے تن ڈھانکنے کو کوئی کپڑا نہ تھا۔

سوال ۔ لفظ عُرَاة سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس کپڑے نہیں تھے۔ جب کہ لفظ مُجتَابِیُ النِّمَارِ سے مراد بعض حصّہ پر کپڑے تھے۔

جواب اوّل : عُرَاة سے مراد ہے کہ اکثر بدن برہنہ تھے اور مُجتَابی النمار سے مراد بعض حصّہ پر کپڑے تھے۔

جواب دوم : جو کپڑے تھے وہ اپنے نہیں بلکہ عاریۃً لائے تھے۔

قولہٗ مُتَقَلِّدُ السُّیُوْفِ : تقلید سُیوف گردن میں تھا اور تلواروں کا لٹکانا یا تو خوف کی وجہ سے تھا کیونکہ قبیلہ مُضَر کے اکثر عربی دشمن تھے۔ اس لیے کہ یہ لڑا کا قبیلہ تھا۔ یہ لوگ اگرچہ غریب تھے مگر بہادر تھے۔ جس پر لفظ متقلد السیوف دال ہے اور یہ وہی

لوگ ہیں جو وفد عبد القیس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے پاس آنے سے روکتے تھے۔

قولہٗ بَلْ کُلُّهُمْ مِنْ مُضَرَ : یہ مبالغہ کے طور پر فرمایا ہے۔

قولہٗ فَتَمَعَّرَ : ای ظَهَرَ عَلَیْهِ آثَارُ الحُزْنِ ان کی شکستہ حالی کو دیکھ کر حضور انور اقدس کو پریشانی لاحق ہوئی جس کی وجہ سے چہرہ انور مُتغیّر ہوگیا۔ اس لیے کہ آپ کے پاس ان کو دینے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ ؎

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم میرؔ ـــــ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

قولہٗ فَدَخَلَ : حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا گھر میں داخلہ یا تو تجدید طہارت کی وجہ سے تھا یا کوئی چیز لینے کے لیے تھا تاکہ ان کو دوں۔ اتفاق یہ ہوا کہ اس وقت دولت خانۂ اقدس میں کچھ نہ تھا۔

قولہٗ فَصَلّٰی۔ صلوٰۃ سے مکتوبہ مراد ہے بدلیل الآذان والاقامۃ، اور مکتوبہ سے بھی صلوٰۃ ظہر مراد ہے کیونکہ صدرُ النّہار کے بعد صلوٰۃ ظہر ہی ہوتی ہے۔

قولہٗ فَخَطَبَ : یہ خطبۂ وعظ تھا اور یہ وعظ لوگوں کو خیرات پر رغبت دینے کے لیے تھا۔

قولہٗ فَقَالَ یَا اَیُّهَا النَّاسُ : آپ نے اپنے ارشاد میں مذکورہ دو آیتیں تلاوت فرمائیں جو ابلغ فی الحث علی الصدقۃ ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے۔

خُلاصَۃُ الآیات

پہلی آیت کا خُلاصہ یہ ہے کہ لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ دوسروں پر احسان کریں۔ نیز اس میں یہ بھی مذکور ہے کہ تمام انسان ایک آدمؑ کی اولاد ہیں۔ لہٰذا ہر ایک کی تکلیف دوسروں کے لیے باعثِ تکلیف ہونی چاہیے اور اس کو دور کرنے کی کوشش کرے اور دوسری آیت میں یہ مذکور ہے کہ ہر انسان کو اپنی آخرت کا سامان تیار کرنا چاہیے۔ اور صدقہ ان میں سے بہت اہم سامان ہے۔

قولہٗ تَصَدَّقَ رَجُلٌ : اس کو دو طریقوں پر پڑھا گیا ہے :-

اوّل۔ تَصَدَّقْ۔ صیغۂ امر اصل میں لِیَتَصَدَّقْ لامِ امر تخفیفاً حذف کردی گئی ہے۔

دوم۔ ماضی بھی پڑھی جاسکتی ہے تو یہاں خبر بمعنیٰ انشاء ہے جیسے تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ

وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ بمعنیٰ اٰمَنُوْا وَجَاهِدُوْا کے ہے اس وقت لوگوں کو صدقہ پر برانگیختہ کرنے کے لیے بجائے امر کے ماضی استعمال کی گئی ہے۔

قولہ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ : شق بمعنیٰ ٹکڑا بھی ہے۔ یا نصف تمر بھی یعنی نصف خرما، کیونکہ رب تعالیٰ کے دربار میں خیرات کی مقدار نہیں دیکھی جاتی بلکہ دینے والے کا اخلاص دیکھا جاتا ہے۔

قولہ قَالَ : الراوی

قولہ بِصُرَّةٍ : بعض حضرات نے لکھا ہے کہ تھیلا تھا جو گندم سے پُر تھا لیکن صحیح یہ ہے کہ صُرَّة بمعنیٰ تھیلی جس میں درہم و دنانیر رکھے جاتے ہیں۔

قولہ عَجَزَتْ : عَجَزَ کا تعلق کثرت اور ثقل کے ساتھ ہے کہ وہ تھیلی بھاری تھی۔

قولہ كَوْمَيْنِ : بمعنیٰ المكانُ المُرْتَفِعُ درهندی (ٹیلہ) می گویند۔

قولہ يَتَهَلَّلُ : ای یستنیر ویظهر علیه امارت السرور۔

قولہ مُذْهَبَةٌ : ای مأموه بالذهب : یعنی سونے کا پانی پھرا ہوا جس کو سنہری بھی کہتے ہیں۔ اور چہرہ انور اقدس کے چمکنے کی دو وجوہ ہیں۔

اوّل : لوگوں کے صدقہ کی وجہ سے ان غریب آدمیوں کی شکستہ حالت اچھی ہو گئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پریشانی دور ہو گئی۔ بنا بریں چہرۂ انور چمکنے لگا۔

دوم : جب لوگوں نے بہت صدقہ دیا تو آپ کے قلب مبارک میں خوشی آئی کہ میری اُمت میں بھی ہمدردی کا جذبہ موجود ہے لہذا چہرہ انور چمکنے لگا۔

مَنْ سَنَّ فِي الْاِسْلَامِ سُنَّةً : اس سے وہ سنت مراد ہے جس کی اصل پہلے ہی سے موجود تھی مگر لوگوں نے اس پر عمل کرنا چھوڑ دیا اور اس شخص نے اس کا اظہار کر دیا یہ مُراد نہیں کہ اپنی طرف سے کوئی نئی سنت ایجاد کی جو بدعت ہے۔

سوال : اس حدیث کو باب سے کیا مناسبت ہے ؟

جواب : مَنْ سَنَّ سُنَّةً سے مناسبت ہے یہی حال علم کا بھی ہے۔

ترجمہ : روایت ہے ابن مسعودؓ	وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ

رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تُقْتَلُ نَفْسٌ ظُلْمًا اِلَّا کَانَ عَلَی ابْنِ اٰدَمَ الْاَوَّلِ کِفْلٌ مِّنْ دَمِهَا لِاَنَّهُ اَوَّلُ مَنْ سَنَّ الْقَتْلَ

سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ کوئی ظلماً قتل نہیں کیا جاتا مگر اس کے خون ناحق میں حضرت آدمؑ کے پہلے فرزند کا حصہ ضرور ہوتا ہے کہ اسی نے پہلے ظلماً قتل ایجاد کیا۔

قولہ ظُلْمًا - یہ قید لگا کر شرعی قتل کو خارج کر دیا مثلاً زانی محصن کا قتل یا قصاص کا قتل۔

قولہ اِبْنُ اٰدَمَ الْاَوَّلُ : اوّل کی قید لگا کر باقیوں کو خارج کر دیا کیونکہ کلّ مولود ابن آدم ہے اوّل قابیل وہابیل تھے۔

خُلاصَۃُ الحَدِیث

جو انسان بھی دوسرے کو قتل کرے گا اس کا گناہ قاتل کے علاوہ قابیل کو بھی ملے گا۔ جس نے اپنے بھائی کو قتل کر کے یہ بری عادت جاری کی۔

سوال : قرآن مقدس میں ہے " لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی پ۲۲ یعنی کوئی نفس کسی نفس کا بوجھ نہیں اٹھائے گا جب کہ حدیث کے مطابق قاتل کوئی اور ہے اور اس کا گناہ قابیل پر بھی ڈالا جارہا ہے فتعارضا :

جواب : یہ گناہ اس قتل کا نہیں بلکہ اس طریقہ کا ہے جو اس نے رائج کیا یعنی قتال انسانی۔

سوال : قرآن مقدس میں ہے فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِیْنَ اور حدیث پاک میں ہے اَلتَّوْبَۃُ النَّدَمُ یعنی ندامت توبہ ہی ہے جب اس نے توبہ کر لی پھر کس چیز کا گناہ اس کے کھاتے میں ڈالا جاتا ہے۔

جواب : ندامت کا تعلق اس فعل بد سے نہیں ہے بلکہ لوگوں کی شرمساری سے ہے کہ اس کو کہاں چھپاؤں گا کیسے دفن کروں گا۔ اسی لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے کوا کو بھیجا " لِیُرِیَہٗ کَیْفَ یُوَارِیْ سَوْءَۃَ اَخِیْہِ پ۶ تو معلوم ہوا کہ یہ ندامت

اور پشیمانی توبہ کی ندامت نہ تھی۔ جو ندامت خدا کے خوف سے ہو وہ توبہ ہے اور جو ندامت اور پریشانی، پشیمانی دنیا کی ذلت کے ڈر سے ہو وہ ایک امر طبعی ہے وہ شرعی توبہ نہیں۔

قولہٗ وَسَنَذْكُرُ حَدِيْثَ مُعَاوِيَةَؓ : یہ حدیث مصابیح میں اسی جگہ تھی مگر ہم نے مناسبت کے لحاظ سے اس باب میں بیان کی۔

قابیل و ہابیل کا قصۂ مختصر

یقول ابوالاسعاد اختصارًا : یوں تو سب آدمی اولادِ آدمؑ ہیں مگر جمہور مفسرین کے نزدیک یہاں حضرت آدمؑ کے دو صُلبی بیٹے ہابیل و قابیل مراد ہیں جن کا واقعہ مختصرًا بیان کیا جا رہا ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ نے باتفاق علماء لکھا ہے کہ حضرت آدمؑ وحوّاءؑ کے دنیا میں آنے کے بعد توالد و تناسل کا سلسلہ شروع ہوا جس کی صورت یہ تھی کہ ہر دو بچے توأم (یعنی اکٹھے) پیدا ہوتے تھے ایک لڑکا اور اس کے ساتھ دوسری لڑکی اور چونکہ اولاد میں بہن بھائیوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ اور پھر حقیقی بہن بھائی کا رشتہ اتنا قریبی تھا کہ ان میں نکاح کی اجازت نہیں ہو سکتی تھی۔ جب کہ دنیا کی آبادی بھی پیشِ نظر تھی۔ اس لیے حضرت آدمؑ کی شریعت کا خصوصی حکم یہ تجویز ہوا کہ ایک ہی بار پیدا ہونے والے دونوں بچے حقیقی بہن بھائی سمجھے جائیں ان کا باہم نکاح جائز نہیں ہوگا مگر ایک دفعہ پیدا ہونے والا لڑکا دوسری مرتبہ پیدا ہونے والی لڑکی کا حقیقی بھائی نہیں سمجھا جائے گا اس لیے ان میں باہم نکاح کی اجازت ہوگی کیونکہ اختلاط بطون کو اختلاف نسب کے قائم مقام قرار دے دیا گیا اس اصول پر قابیل کے ساتھ پیدا ہونے والی لڑکی کا نکاح ہابیل سے اور اس کے ساتھ پیدا ہونے والی لڑکی کا نکاح قابیل سے ہونا چاہیے تھا مگر ہابیل کے نکاح میں آنے والی لڑکی شکیل و حسین اور قابیل کے حصہ میں آنے والی لڑکی بدشکل نکلی جس سے قابیل اپنے بھائی ہابیل کا دشمن ہو گیا اور اپنی حقیقی بہن سے نکاح کرنے پر بضد ہوا مگر حضرت آدمؑ نے خلاف اصول ہونے کی وجہ سے اس کو

منظور نہ کیا جس سے بھائیوں میں اختلاف پڑ گیا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے رفع نزاع کی یہ صورت تجویز فرمائی کہ دونوں بھائی اپنی اپنی قربانی اور نیاز پیش کریں جس کی نذر قبول ہو جائے گی حسینہ لڑکی اسی کے عقد میں آجائیگی کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام کو یقین تھا کہ ہابیل حق پر ہے اسی کی قربانی قبول ہوگی۔

اس زمانہ میں قبولیت نذر کی علامت یہ تھی کہ غیبی آگ اس کو کھا جاتی تھی ہابیل کے پاس بھیڑ بکریاں رہتی تھیں اور قابیل کاشتکاری کیا کرتا تھا اس لیے ہابیل نے تو قربانی کے لیے بہترین دُنبہ پیش کیا اور قابیل نے کچھ اناج کے دانے نذر کر دیے دستور کے مطابق ہابیل کی قربانی قبول ہو گئی اور قابیل کی نیاز کو ویسے ہی چھوڑ گئی غرض یہ کہ ہابیل کی نیاز قبول ہوئی اور قابیل کی نیاز قبول نہ ہوئی تو قابیل کے دل میں حسد پیدا ہوا اور اپنے بھائی کے قتل کرنے کا ارادہ کیا یہاں تک کہ اس کو قتل کر ڈالا۔ چنانچہ قتال کے بانیین ہونے کی وجہ سے قتل کا گناہ اس کے کھاتے میں ڈالا جاتا ہے۔

(ہکذا فی انوار صـ۵۷ ج ۴)

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ — یہ دوسری فصل ہے

عَنْ کَثِیْرِ بْنِ قَیْسٍ قَالَ کُنْتُ جَالِسًا مَعَ اَبِی الدَّرْدَاءِ فِیْ مَسْجِدِ دِمَشْقَ فَجَاءَہٗ رَجُلٌ فَقَالَ یَا اَبَا الدَّرْدَاءِ اِنِّیْ جِئْتُكَ مِنْ مَدِیْنَۃِ الرَّسُوْلِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِحَدِیْثٍ بَلَغَنِیْ اَنَّكَ تُحَدِّثُہٗ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ

ترجمہ: روایت ہے کثیر بن قیس سے فرماتے ہیں کہ میں حضرت ابو درداء کے ساتھ دمشق میں جامع مسجد میں بیٹھا تھا کہ آپ کے پاس ایک آدمی آیا اور بولا کہ اے ابوالدرداء! میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ سے آپ کے پاس صرف ایک حدیث کے لیے آیا ہوں مجھے خبر لگی ہے کہ آپ حضورؐ سے روایت

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا جِئْتُ لِحَاجَةٍ	فرماتے ہیں اس کے سوا اور کسی کام کیلئے نہیں آیا۔

قولهٗ مِنْ مَّدِيْنَةِ الرَّسُوْلِ ۔ مدینہ کے ساتھ رسول کی قید لگائی اس لیے کہ بغداد کے اندر بھی ایک مدینہ تھا جس کو مدینۃ المنصور سے پکارتے تھے۔ اس قید سے اس کا اخراج مقصود ہے اور مدینۃ المنصور سے دمشق تک سواری اونٹ کا ایک ماہ کا سفر ہے۔

قولهٗ بَلَغَنِيْ : بلاغ دو قسم ہے :۔

اوّل بلاغ اجمالی ۔ یہ کہ کسی نے کہا ہو کہ حضرت ابو درداء کے پاس حدیث ہے، حدیث بتائی نہ ہو۔

دوم بلاغ تفصیلی ۔ یہ کہ حدیث بھی بیان کر دی کہ حدیث نبویؐ یہ ہے۔

سوال ۔ اگر بلاغ سے مراد بلاغ اجمالی ہو تو پھر سفر کرنا درست ہے اگر بلاغ تفصیلی ہے تو پھر سفر کرنے کا کیا مطلب ہے؟ کیونکہ جس مقصد کے لیے سفر کر رہے ہیں وہ تو حاصل ہے۔

جواب اوّل : سفر کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ بلا واسطہ حدیث حاصل کرنا تھی یعنی بالواسطہ تو سُن لی ہے بلا واسطہ بھی سن لوں۔

جواب دوم : پہلے صرف معنیٰ ہی سنے تھے اب الفاظ پوچھنا چاہتے ہیں:

سوال : بلا واسطہ حدیث پاک حاصل کرنے میں کیا فائدے ہیں۔

جواب : دو فائدے ہیں۔ اوّل: اطمینان قلبی اور ازدیاد یقین حاصل ہوگا۔ دوم راوی اگرچہ ثقہ ہیں مگر عُلو سند کے لیے سفر کیا تھا کیونکہ علماء نے لکھا ہے کہ "اِنَّ الْاِسْنَادَ مِنَ الدِّيْنِ" اور علماء و صالحین میں عُلو سند کے لیے سفر مروّج رہے ہیں۔

عُلوِ سَند کے لیے میر سیّد شریف کا طویل سَفر

میر سیّد شریف کو شوق ہوا کہ شرح مَطالع مُصنّف سے پڑھنی چاہیے چنانچہ ان کے

پاس پہنچ گئے وہ اس قدر ضعیف تھے کہ پلکوں کو اٹھا کر دیکھا اور پوچھا کہ کون ہے کہنے لگے میرا نام سید شریف ہے میں اگرچہ شرح مطالعہ پڑھ چکا ہوں لیکن صرف اس تمنا سے کہ آپ سے پڑھوں آیا ہوں۔ جواب دیا کہ میں تو بالکل ضعیف ہوں۔ روم میں میرا ایک شاگرد ہے جس کا نام مبارک شاہ ہے اس سے پڑھنا میرے پاس پڑھنا ہے۔ سید شریف نے روم پہنچ کر سارا قصہ بیان کیا۔ انہوں نے کہا کہ تمہارے داخلہ کی ایک شرط ہے۔ ایک اشرفی یومیہ ایک سبق کے لیے لوں گا۔

اب سید شریف ایک اشرفی یومیہ کہاں سے لاتے فرماتے ہیں میں نے سوچنے کے بعد کہا کہ ایک بات عرض کرتا ہوں۔ روزانہ کی شرط نہیں جب میرے پاس اشرفی ہوگی سبق پڑھ لوں گا فرمانے لگے منظور ہے۔

میر صاحب نے فیصلہ کیا کہ جھولی پھیلا کر بھیک مانگوں گا جب اشرفی یومیہ پوری ہوجائیگی سبق پڑھ لونگا۔ مگر نوبت نہیں آئی تھی کہ ایک رئیس کو معلوم ہوگیا اس نے بلا کر کہا کہ یومیہ اشرفی میں دوں گا سبق پڑھنا شروع کرو۔ سید شریف نے سبق شروع کر دیا ایک ہفتہ اسی حالت میں گذرا تو ایک روز استاذ نے بلا کر کہا میاں ہمیں اس کی کچھ پرواہ نہیں ہمارا مقصد تو صرف جانچنا تھا اور امتحان لینا تھا وہ ہوچکا اپنی اشرفی اپنے پاس رکھو۔ اب تم باقاعدہ سبق میں بیٹھا کرو مگر پھر دوسرا امتحان شروع ہوا کہ اگلی صف میں بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی پیچھے بیٹھتے تھے بولنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ آخر سید تھے تفتازانیؒ کو بھی ایسے شکست نہیں دی تھی۔ دل میں جوش اٹھتا، شکوک و شبہات اٹھتے، آخر خاموش ہونا پڑتا تھا کیونکہ اجازت نہ تھی۔ مگر ان کا دستور یوں تھا کہ حجرہ میں دیوار کو مخاطب کر کے یوں کہتے تھے کہ صاحب کتاب نے یوں کہا ہے اور استاذ نے یوں کہا مگر میں یوں کہتا ہوں۔

ایک روز استاذ گشت کرنے کے لیے نکلے جب ان کے کمرہ کے قریب آئے تو آوازیں سُن کر کھڑے ہوگئے جب سید شریف نے کہا وَاَقُوْلُ ھٰکَذَا خوب غور سے سنا بات بہت عمدہ تھی پسند آئی صبح آکر پوچھا۔ فلاں حجرہ میں کون رہتا ہے بتایا گیا سید شریف۔ بلایا گیا اور کہا گیا تم اگلی صف میں بیٹھو اور جی کھول کر پوچھو اتنی معمولی شرح

مطالع کے لیے اتنی مصیبتیں برداشت کیں تو حدیث نبویؐ کے لیے جس قدر بھی سفر اور اس کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑی ہوں تو کیا بعید ہے۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ نے حضرت عُقبہؓ بن عامر سے ایک حدیث کے لیے مدینہ طیبہ سے مصر تک کا سفر کیا جو ایک ماہ کی مسافت ہے۔

قولہٗ مَا جِئْتُ لِحَاجَتِہٖ ۔ سائل نے آتے ہی کہا کہ آپ کے پاس آنے سے میری غرض کوئی دنیوی منفعت یا محض ملاقات نہیں بلکہ علم دین کا طلب کرنا ہے۔

سوال : حضرت ابو الدرداءؓ نے سائل کے جواب میں جو حدیث بیان فرمائی ہے آیا سائل کی مطلوبہ حدیث ہے جس کا وہ طالب تھا یا کوئی اور ہے۔

جواب اوّل : طالب کی مطلوبہ حدیث یہی ہے جس میں طالب العلم کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔

جواب دوّم : حدیث جو یہاں نقل کی گئی ہے وہ طالب کا مطلوب نہیں تھی چونکہ طالب نہایت مشقت و پریشانی برداشت کر کے حصولِ علم کی خاطر آیا تھا اس لیے اس کی سعادت و خوش بختی کے اظہار کے طور پر اس کا ثواب بیان کیا اور اس کی مطلوبہ حدیث جو انہوں نے بیان کی وہ باب کے مناسب نہیں اس لیے مصنفِ کتاب نے اسے یہاں نقل نہیں کیا۔

قولہٗ سَلَکَ اللّٰہُ : ای سَھَّلَ اللّٰہُ طریقًا اور علمًا کی تنکیر سے معلوم ہوا کہ علم دین کا کوئی حصہ قلیل ہو یا کثیر اس کے لیے کوئی سا راستہ نزدیک ہو یا دور یہی فضیلت رکھتا ہے۔

یقول ابو الاسعاد : علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کو علم کی برکت سے نیک اعمال کی توفیق عطاء فرمائے گا جو دخولِ جنت کا سبب ہوگا۔

قولہٗ وَاِنَّ الْمَلٰٓئِکَۃَ لَتَضَعُ اَجْنِحَتَھَا ۔ فرشتے طالب العلم کی رضامندی کے لیے اپنے پَر بچھاتے ہیں۔ کیا یہ حقیقت پر محمول ہے اس میں چار قول ہیں:-

قول اوّل : حقیقی معنیٰ مراد ہیں کہ واقعی فرشتے طالب العلم کے اعزاز کے لیے اپنے پر بچھاتے ہیں اس پر بہت واقعات شاہد ہیں (کما فی المرقات)

قول دوم : لَتَضَعُ اَجْنِحَتَهَا کنایہ ہے طیران سے بمعنیٰ رکنا اور سماع ذکر کے لیے اترنا یعنی فرشتے اڑنے سے رک جاتے ہیں اور زمین پر اتر کر مجلس علمی میں شریک ہو جاتے ہیں جیساکہ حضرت ابو ہریرۃؓ کی حدیث میں گذرا ہے (وَحَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ)

قول سوم : وضع جناح کنایہ ہے تواضع سے کما فی قولہ تعالیٰ " وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ - (پ۱۵ بنی اسرائیل) تواضع کے معنیٰ مراد ہیں۔

قول چہارم : وضع جناح فرشتوں کی سلامی ہے جس طرح فوج شاہی مہمانان شاہان کو سلامی دیتی ہے اسی طرح فرشتے بھی مہمانانِ رسولؐ کے لیے اپنے پر جھکا کر سلامی دیتے ہیں۔

قولہٗ وَاِنَّ الْعَالِمَ يَسْتَغْفِرُ لَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ : آسمان اور زمین میں خدا کی جتنی مخلوق ہے حتّٰی کہ مچھلیاں بھی عالم کے لیے مغفرت کی دعار کرتی ہیں۔

سوال ۔ یہ کہ تعمیم بعد از تخصیص میں کیا فائدہ ہے کہ پہلے تعمیم کر کے کہا " مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ عالم کے لیے مغفرت کرتی ہیں پھر تخصیص کی گئی کہ پانی کے اندر رہنے والی مچھلیاں بھی اس کے لیے استغفار کرتی ہیں ظاہر ہے کہ زمین کی مخلوق میں مچھلیاں بھی شامل ہیں ان کو الگ کیوں ذکر کیا گیا۔

جواب اول : کہ دراصل عالم کی انتہائی فضیلت وعظمت کا اظہار مقصود ہے اور عظمت کے اظہار کا یہ ایک طریقہ ہے اسی وجہ سے یہ تعبیر اختیار کی گئی۔

جواب دوم : اس طرف اشارہ ہے کہ پانی کا برسنا جو رحمتِ خداوندی اور نعمتِ الٰہی کی علامت ہے۔ اور دنیا کی اکثر آسانیاں اور راحتیں اسی سے حاصل ہوتی ہیں اور تمام خیر وبھلائی جو اس کے علاوہ ہیں سب کی سب عالم ہی کی برکت سے ہیں یہاں تک کہ مچھلیوں کا پانی کے اندر زندہ رہنا جو قدرت خداوندی کی ایک نشانی ہے علماء ہی کی برکت کی بناء پر ہے حدیث شریف میں ہے " يُمْطَرُوْنَ وَبِهِمْ يُرْزَقُوْنَ "

سوال ۔ یہ سب چیزیں عالمِ دین کے لیے کیوں استغفار کرتی ہیں ؟

جواب : پورے عالم کا بقا بقائے عالِم پر موقوف ہے اس لیے کہ جب تک

اللہ اللہ کہنے والے اس دنیا میں رہیں گے تو دنیا باقی رہے گی۔ اور جب کوئی بھی اللہ اللہ کرنے والا باقی نہ رہے گا تو قیامت آجائیگی۔ اور اللہ اللہ سکھانے والا طبقہ علماءِ دین ہی کا ہے گویا علمائے دین دنیا کا تعویذ ہیں۔

قولہٗ وَاِنَّ فَضْلَ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ : نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے طالب علم کی فضیلت بیان کی، اب عالم کی فضیلت بیان فرما رہے ہیں۔ عالم اور عابد کی تعریف ملاحظہ فرماویں۔

تعریف عالم دین عالم سے مراد وہ شخص ہے جو فرائض و واجبات پورے کرتا ہو محرمات سے بچتا ہو اور نفل عبادت کی طرف بھی کچھ توجہ ہو لیکن اس کے زیادہ مشاغل تعلیمی ہوں یعنی وصفِ علم غالب ہو۔

تعریف عابد جس کو ضرورت کے مطابق علم بھی ہو مگر وصفِ عبادت غالب ہے کہ اکثر اوقات نوافل میں مصروف رہتا ہے علمی مشغلہ نہیں رکھتا

اس عالم کی فضیلت اس عابد پر بیان کی جارہی ہے۔ ورنہ بڑا عالم بے عمل اور عابد بے علم قابل ذکر بھی نہیں کیونکہ حدیث پاک میں آتا ہے "اَشَدُّ النَّاسِ عَذَابًا یوم القیامۃ عالمٌ لم ینفعہ اللّٰہُ بعلمہٖ لانہ یکون حینئذٍ ضَالًّا مُضِلًّا"

قولہٗ كَفَضْلِ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ : نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عالم کو قمر کے ساتھ تشبیہ دی اور عابد کو ستاروں کے ساتھ وجہ تشبیہ دو ہیں:۔

اوّل وجہ تشبیہ یہ ہے کہ جس طرح ستاروں کی روشنی متعدی نہیں بلکہ اپنی ذات پر منحصر ہے دوسروں تک متعدی نہیں بخلاف قمر کے کہ اس کی روشنی دوسروں تک متعدی ہے اسی طرح عالم کے علم کا فائدہ دوسروں تک متعدی ہے۔

دوم: جس طرح قمر کی روشنی اپنی ذاتی نہیں بلکہ مستفاد من الشمس ہے اسی طرح عالم کا علم مستفاد من شمس النبوّت ہے بخلاف عبادت کے کہ یہ مستفاد من شمس النبوّت نہیں ہے وہ حقیقت میں علم ہی نہیں بلکہ وہ ایک صفت ہے۔

سوال۔ یہ کہ عالم اور عابد میں کوئی فرق نہیں ہوتا کیونکہ اگر کوئی عالم محض علم پر بھروسہ کر بیٹھے اور علم پر عمل نہ کرے تو ظاہر ہے کہ اس کی کوئی فضیلت نہیں اسی طرح عابد

بغیر علم کے عابد نہیں ہو سکتا کیونکہ عبادت کی اصل روح علم میں پوشیدہ ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ جو عالم باعمل ہوگا وہی عابد بھی ہوگا جو عابد ہوگا وہی عالم بھی ہوگا تو دونوں میں کیا فرق ہوا؟

جواب : عالم سے مراد وہ شخص ہے جو تحصیل علم کے بعد عبادت میں مشغول رہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ عابد میں اس اعتبار سے فرق ہے۔ اور عابد پر عالم کو فوقیت حاصل ہے۔

قولہ وَاِنَّ الْاَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوْا دِيْنَارًا : مطلب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے اموال ان کی وفات کے بعد رشتہ داروں کو میراث میں نہیں ملتے بلکہ پوری امت کے لیے وقف ہوتے ہیں تاکہ یہ شبہ نہ ہو کہ انبیاء کرامؑ نے کنبہ پروری کے لیے مال جمع کیا تھا۔ یعنی نبی کریم علیہم السلام نے من کل الوجوہ دنیا کی نفی کر دی۔

سوال : آپ نے تو درہم دنانیر کی نفی فرما دی حالانکہ آپ کی کافی ملکیت تھی مثلاً صفا یا بنو نضیر، فدک، خیبر وغیرہ؟

جواب : حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسے مال کی نفی فرما رہے ہیں جو وراثت والا ہو جس میں وراثت جاری ہوتی ہو۔ یہ فدک، بنو نضیر صفایا وغیرہ۔ یہ ان کی زندگی مبارک میں تھا بعد میں یہ مال نوائب المسلمین کے حکم میں تھا۔ حضرت کی ذاتی ملکیت نہیں تھی۔ کہ حضرت ابو ہریرہؓ کا ایک واقعہ اس پر شاہد ہے۔

تقسیم میراثِ رسولؐ کا واقعہ

وَيُذْكَرُ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَؓ اَنَّهٗ مَرَّ يَوْمًا فِي السُّوْقِ بِقَوْمٍ مُشْتَغِلِيْنَ بِتِجَارَاتِهِمْ فَقَالَ اَنْتُمْ هٰهُنَا وَمِيْرَاثُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُقْسَمُ فِي الْمَسْجِدِ فَقَامُوْا سِرَاعًا اِلَيْهِ فَلَمْ يَجِدُوْا فِيْهَا اِلَّا الْقُرْاٰنُ وَالذِّكْرُ وَمَجَالِسُ الْعِلْمِ فَقَالُوْا اَيْنَ مَا قُلْتَ يَا اَبَا هُرَيْرَةَؓ فَقَالَ هٰذَا مِيْرَاثُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُقْسَمُ بَيْنَ وَرَثَتِهٖ وَلَيْسَ بِمَوَارِيْثِهٖ دُنْيَاكُمْ (مرقات ج۱ ص۲۸)

قولہٗ اَخَذَ بِحَظٍّ وَافِرٍ : بحظٍّ میں باء زائدہ ہے اَیْ اَخَذَ حَظًّا وَافِرًا یعنی نصیبًا تامًّا عند البعض اَخَذَ بمعنی الامر : اصل عبارت تھی "فَمَنْ اَرَادَ اَخْذَہٗ فَلْیَأْخُذْ بِحَظٍّ وَافِرٍ:

وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ الْبَاہِلِیِّ قَالَ ذُکِرَ لِرَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ رَجُلَانِ اَحَدُھُمَا عَابِدٌ وَالْاٰخَرُ عَالِمٌ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَی الْعَابِدِ کَفَضْلِیْ عَلٰی اَدْنَاکُمْ

ترجمہ : روایت ہے حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دو شخصوں کا ذکر ہوا جن میں سے ایک عابد دوسرا عالم ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عالم کی عابد پر فضیلت ایسی ہے جیسے میری فضیلت تمہارے ادنیٰ پر۔

قولہٗ رَجُلَانِ : رجلانِ سے کون سے رجلان مراد ہیں۔ محدثین رحمہم اللہ نے لکھا ہے کہ یہ تمثیل تھی یا واقع میں موجود تھے۔ خواہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یا اس سے پہلے سب احتمالات ہیں لیکن جمہور حضرات کے نزدیک خاص مرد مراد نہیں بلکہ عمومی سوال ہے یعنی اگر دو آدمیوں میں سے ایک عالم دوسرا عابد ہو تو درجہ کس کا زیادہ ہوگا ؟ ☆ عالم و عابد کی تحقیق گذر چکی ہے۔

قولہٗ : عَلٰی اَدْنَاکُمْ : حضرت رحمہ اللہ نے یہ جملہ استعمال فرماکر تواضع کے اندر مبالغہ فرمایا۔ اگر یوں فرماتے " کَفَضْلِیْ عَلٰی اَعْلَاکُمْ تب بھی صحیح تھا کیونکہ امت کا اعلیٰ سے اعلیٰ آدمی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ادنیٰ شان کا بھی مقابلہ نہیں کرسکتا جیسے اور مقام پر فرماتے ہیں " وَاحْشُرْنِیْ فِیْ زُمْرَۃِ الْمَسَاکِیْنِ "

رب تعالیٰ فرماتے ہیں " مَثَلُ نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ فِیْھَا مِصْبَاحٌ پ۱۸ اس آیت میں نور الٰہی کی مثال نورِ چراغ سے دی گئی۔ حالانکہ چراغ کے نور کو اس نور سے کیا نسبت اسی طرح یہ بھی تمثیل ہے۔

قولہٗ مَلَائِکَتُہٗ : حاملین عرش فرشتے مراد ہیں۔

قولہٗ اَهْلِ السَّمٰوٰتِ : مقام ہذا پر ایک سوال ہے۔
سوال : ملائکہ بھی اہل السمٰوات ہیں۔ جب ان کا ذکر ہو چکا پھر اہل السمٰوات کو کیوں بیان فرمایا؟
جواب اوّل : ملائکہ خاص فرشتے حاملینِ عرش مراد ہیں جب کہ اہلِ سمٰوات سے باقی فرشتے مراد ہیں۔
جواب دوّم : یہ تعمیم بعد از تخصیص ہے یعنی عطف العام علی الخاص کے قبیل سے ہے۔
قولہٗ وَالْاَرْضِ ۔ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالْحَیْوَانَاتِ حیوانات مراد لینے کا قرینہ حَتَّی النَّمْلَۃَ ہے۔ کیونکہ حتّٰی انتہاء غایت کے لیے آتا ہے اور غایت مغیا میں اس وقت ہوتی ہے جب شیٔ داخل ہو۔
قولہٗ حَتَّی النَّمْلَۃَ : حتّٰی کے اندر تین احتمال ہیں۔ اوّل، حتّٰی عاطفہ ہے تو نملہ منصوب ہوگی۔ دوّم، حتّٰی جارہ ہے تو نملہ مجرور ہوگی۔ سوّم : حتّٰی ابتدائیہ ہے تو نملہ پر رفع ہے لیکن نصب اصحّ ہے۔
سوال ۔ نَمْلَۃَ کی تخصیص کیوں کی حالانکہ ماقبل میں اهل الارض کا ذکر ہے جس میں نَمْلَۃَ نملہ بھی داخل ہے۔
جواب اوّل : نملہ واحد جانور ہے جو ذخیرہ بہت جمع کرتا ہے تو اس کو اپنے ذخیرہ کی برکت کے لیے علماء کی دعاؤں کی ضرورت ہے اس لیے یہ علماء کے لیے دعاءِ خیر کرتی ہے۔
جواب دوّم : نملہ اور حُوت کی تخصیص کر کے اشارہ کیا جنس الحلال والحرام کی طرف کہ بحر میں جنس حُوت حلال ہے اور برّ میں جنس نملہ حرام ہے۔
قولہٗ عَلٰی مُعَلِّمِ النَّاسِ الْخَیْرَ : جو تعلیم دیتا ہے لوگوں کو خیر کی خیر سے مراد عند البعض علمِ دین ہے عند البعض ما بہ النجاۃ ہے۔
یقول ابوالاسعاد : حضرت معلّم الناس الخیر کی تعبیر تو اختیار کی اور یوں کیوں نہ فرمایا المعلّم لیعلم یہ اشارہ ہے کہ دعاءِ خیر کا مستحق وہ عالم ہو سکتا ہے جو اشاعتِ دین میں معروف ہو جو بیکار ہے یا دنیوی کاروبار میں ہے۔ اس کیلئے یہ دعاء نہیں۔

قولهٗ عَنْ مَكْحُولٍ وَلَمْ يَذْكُرْ رَجُلَانِ : یہاں سے دو اختلاف تھے ان کو بیان کر رہے ہیں۔

اختلاف اوّل یہ کہ پہلے روایت متّصل تھی کیونکہ حضرت ابوامامۃ الباہلی صحابی ہیں اور انہوں نے یہ حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنی ہے جب کہ مکحولؒ تابعی ہیں انہوں نے براہِ راست نہیں سنی۔ جو مرسل بنے گی جس کو کہہ رہے ہیں عن مکحول مُرسَلاً۔

اختلاف دوم حضرت ابوامامۃ الباہلیؓ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں "رجلان احدھما عابدٌ والاٰخر عالمٌ" مگر مکحول کی روایت میں رجلان کا ذکر ہی نہیں جس کو یوں بیان کیا "ولم یذکر ای مکحولؒ رجلان قوله ثمّ تلا .... ای مکحولؒ و نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

قولهٗ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَآءُ : یہ آیت تلاوت فرما کر فضیلت عالم کی علت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ علمِ دین سے خشیت اور خشیت سے تقویٰ پیدا ہوتا ہے اور تقویٰ اکرمیّت اور افضلیت کا سبب ہے "اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقَاكُمْ"

قولهٗ وَسَرَدَ الْحَدِيْث : اَیْ ذَکَرَ وَاَوْرَدَ مَكْحُولٌ بِقِيَّةَ الْحَدِيْثِ۔

وَعَنْ اَبِیْ سَعِيْدِ الْخُدْرِیِّؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ النَّاسَ لَكُمْ تَبَعٌ وَاِنَّ رِجَالًا يَأْتُوْنَكُمْ مِنْ اَقْطَارِ الْاَرْضِ يَتَفَقَّهُوْنَ فِی الدِّيْنِ فَاِذَا اَتَوْكُمْ فَاسْتَوْصُوْا بِهِمْ خَيْرًا

ترجمہ: روایت ہے حضرت ابوسعید خدریؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ لوگ تمہارے تابع ہیں اور بہت لوگ اطراف زمین سے تمہارے پاس دینی فقہ سیکھنے آئیں گے جب وہ آئیں تو انہیں بھلائی کی وصیّت کرو۔

خلاصة الحديث : اس حدیث پاک کا خلاصہ یہ ہوا کہ صحابہ کرامؓ کو یہ

بتایا جا رہا ہے کہ میرے بعد چونکہ تمہاری ہی ذات دنیا کے لیے رہبر و راہنما ہو گی اور تم ہی لوگوں کے پیشوا اور امام بنو گے اس لیے تمام دنیا کے لوگ تمہارے پاس علم دین حاصل کرنے کے لیے آئیں گے تو تمہیں چاہیے کہ تم ان کے ساتھ بھلائی کرنا اور ان کی نگہداشت کے اندر کوتاہی نہ کرنا۔ نیز ان کے قلوب کو علم دین کی اس مقدس روشنی سے جس سے تمہارے قلوب براہِ راست فیض یاب ہو چکے ہیں منور کرنا۔

قولہٗ لَکُمْ تَبَعٌ ۔ تَبَعٌ تابع کی جمع ہے لفظ تابعی اس حدیث سے لیا گیا ہے یعنی صحابہؓ کے کامل متبعین اور یہ خطاب صحابہ کرامؓ اور علماء عظام کو ہے کہ تا قیامت مسلمان تمہارے اخلاق، افعال اور اقوال کی پیروی کریں گے کیونکہ تم نے بلا واسطہ مجھ سے فیض لیا ہے۔ شریعت میرے اقوال ہیں، طریقت میرے افعال، حقیقت میرے احوال ہیں۔ تم نے یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھے اور کانوں سے سنے۔

ثانیاً: اس میں پیشگوئی ہے علوم نبوّت کے پھیلنے کی۔

ثالثاً: اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دین سیکھنے کے لیے صرف مطالعہ کافی نہیں بلکہ تفقّہ پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ کسی کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیے جائیں خواہ اس کے لیے طویل سفر کی مشقت ہی برداشت کرنی پڑے۔

قولہٗ مِنْ اَقْطَارِ الْاَرْضِ : ای جوانبھا وافاقھا ۔ یعنی دور دراز کا سفر کرکے آپ کے ہاں پہنچیں گے۔

قولہٗ یَتَفَقَّهُوْنَ : ای یطلبون الفقہ مراد اس سے مطلقاً دینی مہارت حاصل کرنا ہے۔

قولہٗ فاستوصوا بھم خیرًا ۔ اس کی تشریح میں کئی اقوال ہیں:۔

(۱) ان کو خیر کی وصیّت کرو۔ وصیّت سے مراد پرسوز تاکیدی نصیحت ہے۔

(۲) ان کے بارہ میں خیر کی وصیّت قبول کرو یعنی میں تم کو ان کے ساتھ حسن معاملہ کی وصیّت کرتا ہوں۔ معلّمِ کائنات کی طرف سے امت کے تمام معلّمین کو وصیّت ہے متعلّمین کے ساتھ حسن معاملہ اور بھلائی کے ساتھ پیش آنے کی۔

(۳) تم ان کے بارہ میں (اپنے قلب سے) خیر کی وصیّت طلب کرو یعنی یہ سوچو اور مراقبہ کرو

کہ جو لوگ صرف علم دین کے لیے اتنے لمبے سفروں کی مشقت برداشت کرکے آئے ہیں ان کے ساتھ کس نوع کا معاملہ کرنا چاہیے۔

وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلْكَلِمَةُ الْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْحَكِیْمِ فَحَیْثُ وَجَدَهَا فَهُوَ اَحَقُّ بِهَا۔

ترجمہ: روایت ہے حضرت ابوہریرہؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے کہ علمی بات عالم کی اپنی گم شدہ چیز ہے جہاں پائے وہی اس کا حقدار ہے۔

قولہ كلمة الحكمة: حکمت سے کیا مراد ہے اس میں مختلف قول ہیں

اوّل: حکمت سے مراد تفقہ فی الدین ہے۔ کمانی قولہ تعالیٰ (یُؤْتِی الْحِكْمَةَ مَنْ یَّشَآءُ پ۳)

دوم: حکمت سے مراد کلمات حکیمانہ ہیں " کما فی قولہ تعالیٰ: یٰسٓ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِیْمِ"

سوم: جمہور حضرات کے نزدیک ہر امر خیر حکمت میں داخل ہے۔

قولہ ضالّة۔ گم شدہ چیز کو کہتے ہیں " کما فی قولہ علیہ السلام۔ مَنْ سَمِعَ رَجُلٌ ینشد ضالة فی المسجد فلیقل لا ادّا ها الله الیك (ابوداؤد شریف ج۱ باب کراهیة انشاد الضالة فی المسجد۔

قولہ الحكیم: تعریف حکیم در اصطلاح منطقیاں " الحكیم من اتقن فی العلم والعمل بقدر طاقة البشریة مگر اس جگہ حکیم بمعنیٰ عالم باعمل ہے۔

قولہ وجدها۔ ای الضالة۔

خلاصة الحدیث:

یہ حدیث دانشمند اور صاحب فہم انسان کو یہ احساس و شعور بخش رہی ہے کہ جب کسی سے دین کی کوئی فائدہ مند بات سنی جائے تو عقل کا تقاضا یہ ہونا چاہیے کہ فوراً اسے قبول کرکے اس پر عمل کرے یہ انتہائی بیوقوفی کی بات ہے کہ اگر فائدہ مند بات اپنے کمتر سے

سنے اور اسے ناقابلِ عمل سمجھ کر چھوڑ دے ۔ اسی وجہ سے علماء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص حق بات کو حضرت بایزید بسطامیؒ جیسے صاحبِ عقل سے سنے اور عمل کرے ۔ پھر وہی بات اپنی کسی کنیز سے سُنے اور عمل نہ کرے تو وہ مُتکبّر کہلائے گا ؎

مرد باید کہ گیرد اندر گوش ـــــ گر نوشتہ است پند بر دیوار

تشریح ضَالَّۃُ الحَکِیم

اس کی تشریح میں مُتعدّد قول ہیں :-

قول اوّل : دانا کو دانائی کی بات کسی ادنیٰ آدمی سے بھی حاصل ہو تو اس کے لینے میں عار نہ کرے کیونکہ یہ اس کا گمشدہ سامان ہے جس طرح کسی کی کوئی چیز گم ہو جائے اور اس کو دوسرا شخص پالے تو لے لیتا ہے اس کی طرف نہیں دیکھتا کہ وہ کیسا ہے اچھا ہے یا بُرا!
الحاصل : فَانْظُرْ اِلیٰ مَا قَالَ وَلَا تَنْظُرْ اِلیٰ مَنْ قَالَ ۔

قول دوّم : دانا آیت یا حدیث سے دقائق مسائل کا استنباط کرے تو ناقص فہم اس کا انکار نہ کرے ۔ جیسے صاحب ضالہ سے تنازع نہیں کیا جاتا جب کہ وہ اپنے گم شدہ سامان کو پالے ۔

قول سوّم : کسی کو کوئی علمی بات سمجھ میں نہ آئے تو اس کو حکیم کے حوالہ کر دے ضائع نہ کرے جیسے گم شدہ سامان کو اس کے مالک کے حوالہ کیا جاتا ہے ۔

قول چہارم : عالم سے اگر کوئی مسئلہ پوچھے تو بتانے میں بخل نہ کرے جیسے صاحب ضالہ سے ضالہ کو روکا نہیں جاتا ۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ جیسے اہل سے علم روکنا درست نہیں ، نااہل کو دینا بھی درست نہیں جیسا کہ آگے حدیث میں آرہا ہے ۔
"منع علم از اہل آں جائز نیست ، اعطائے آں بہ نااہل نیز روانباشد (اشعۃ اللمعات ج ۱)

؎ بے ادب را علم و فن آموختن ـــ دادن تیغے بدست راہزن

سوال : حدیث مذکورہ کا حدیث ثانی سے تعارض ہے ۔
" وَعَنِ ابنِ سِیْرِیْنَ قَالَ اِنَّ ھٰذَا العِلْمَ دِیْنٌ فَانْظُرُوْا عَمَّنْ تَأخُذُوْنَ

دینکم (مشکوٰۃ شریف ص۳۷ ج ۱)
اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ استاذ کے عمل و اخلاق دیکھ کر منتخب کرو۔

جواب یہ ہے کہ دونوں حدیثوں کی مراد الگ الگ ہے۔ حدیث الباب ایسے لوگوں کے متعلق ہے جن کو بصیرت اور تَفَقُّہ فِی الدِّین حاصل ہے جو خیر و شر میں تمیز کر سکتے ہیں۔ جب کہ حدیث ابن سیرینؒ ایسے لوگوں کے متعلق ہے جو عدیمُ البصارت ہوں اور جو کھرے اور کھوٹے میں خود فرق نہیں کر سکتے۔ اور جو بغیر تحقیق ہر نصیحت و حکمت کا اتباع ہی کر لیں گے ان کے لیے ہے کہ استاذ دیکھ کر انتخاب کریں۔

وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقِیْہٌ وَاحِدٌ اَشَدُّ عَلَی الشَّیْطٰنِ مِنْ اَلْفِ عَابِدٍ:

ترجمہ: روایت ہے حضرت ابن عباسؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک فقیہ شیطان پر ہزار عابدوں سے زیادہ بھاری ہے۔

قولہٗ فَقِیْہٌ: فقیہ سے مراد وہ شخص ہے جس کو فہم دین اور فطانت صادقہ عطا کی گئی ہو اور وہ نفس و شیطان کے مکر و فریب کو اچھی طرح جانتا ہو۔ بعض حضرات کے نزدیک فقیہ سے مراد عالِم بأحکام الدِّین ہے جو مواقع حلت و حُرمت کو خوب جانتا ہو۔

قولہٗ الف عابدٍ: الف کی قید احترازی نہیں بلکہ عدد تکثیر مراد ہے۔ محدثین حضرات نے بحث کی ہے کہ کیونکر فقیہ واحد الف عابد سے زیادہ سخت ہے شیطان پر اس میں دو قول ہیں:۔

قول اوّل فقیہ چونکہ شیطان کے مکر و فریب سے خوب آگاہ ہوتا ہے ایسا شخص نہ صرف یہ کہ خود شیطانی اغوار سے بچا رہتا ہے بلکہ اور بھی کئی لوگوں پر اس کے حملے ناکام بنا دیتا ہے بخلاف عابد کے کہ اس کو گمراہ کرنا شیطان کے لیے بہت آسان ہوتا ہے اس لیے ہزار عابد سے وہ اتنا نہیں ڈرتا جتنا ایسے فقیہ سے ڈرتا ہے۔

قول دوم مقابلہ کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ کامیابی اس شخص کے حصہ میں آتی ہے جو اپنے حریف و مدمقابل کے داؤپیچ سے بخوبی واقف ہو اور اس کا توڑ جانتا ہو یہی حال عالم وفقیہ کا ہے کہ وہ شیطانی حملوں کا توڑ جانتا ہے بخلاف عابد کے کہ عابد اس کے حملوں سے ناآشنا ہے۔ فبھذا قالَ

وَعَنْ اَنَسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ:	ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کی تلاش ہر مسلمان پر فرض ہے۔

قولہٗ طَلَبُ الْعِلْمِ: علم سے مراد کون سا علم ہے اس میں دو قول ہیں:۔

قول اوّل علم سے مراد اخلاص اور آفات نفس کی معرفت مراد ہے یعنی ہر مسلمان مرد وعورت کے لیے ضروری ہے کہ وہ نفس کی تمام برائیوں مثلاً حسد بغض کینہ اور کدورت کو پہنچانیں اور ان چیزوں کا علم حاصل کریں جو اعمال خیر کو فاسد کرتی ہیں۔

قول دوم جمہور حضرات کے نزدیک علم سے مراد علم دین ہے جس کی ضرورت زندگی کے ہر شعبہ میں پڑتی ہے۔

قولہٗ فَرِیْضَۃٌ: فرض کا معنی ہے مَا ثَبَتَ بِدَلِیْلٍ قَطْعِیٍّ جس کا انکار کفر ہے۔ اور فرض دو قسم ہے:۔

۱ فرض عین: ضروریات دین جس پر نجات موقوف ہے۔ ۲ فرض کفایہ۔

فَرِیْضَۃٌ کی تاء مبالغہ کی ہے ہر قسم کے فرائض مراد ہیں یعنی فرض عین وفرض کفایہ فرض عین میں کسی مسلم کی تخصیص نہیں۔ سوائے غیر بالغ کے کیونکہ بندہ جس چیز کا مکلف ہے اس کا علم فرض عین ہے مثلاً معرفت صانع ووحدانیت ونبوت، نماز وغیرہ یا جس خاص کام میں مبتلا ہو اس کا علم بھی فرض عین ہے فرض کفایہ میں جماعت

کی ضرورت نہیں اور اس سے مراد اجتہاد و فتوٰی وغیرہ کے درجات ہیں یہ سب فرض کفایہ ہیں۔

قولہٗ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ : یہاں پر اشکال ہے۔

سوال : مُسْلِمَۃٍ کیوں نہیں فرمایا حالانکہ حصولِ علم تو ان کے لیے بھی ضروری ہے

جواب : مُسْلِمٌ سے مراد کُلُّ مَنْ یَتَّصِفُ بِالْاِسْلَامِ سَوَآءٌ کَانَ ذَکَرًا اَوْ اُنْثٰی لہٰذا مُسْلِمٌ میں مذکر و مؤنث دونوں شامل ہیں۔

قولہٗ وَوَاضِعُ : وَضَعَ بمعنٰی یُعْرِضُ یعنی پیش کرنا۔ فی زمانہ اس کی شکل تعلیم کی ہے۔

قولہٗ غَیْرُ اَھْلِہٖ : غیر اھل سے کون مراد ہے؟ اس میں محدثینؒ کے متعدد اقوال ہیں :

قول اوّل ۔ غیر اھلہ سے مراد وہ شخص ہے کہ جس کی فہم و فراست سے یہ علم بالاتر ہو یعنی جو سمجھ نہ سکے۔

قول دوّم ۔ غیر اھل سے مراد وہ شخص ہے کہ جس کا مقصد تحصیلِ علم سے دنیا کا حصول ہو نہ رضائے باری تعالیٰ۔

قول سوّم ۔ جو اصحّ ما فی الاقوال ہے کہ جس کو دین کی تڑپ نہ ہو زور ی زور اس کو پڑھایا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علیؓ فرماتے ہیں "حدّثوا الناس بما یفھمون او یعرفون اتحبّون اَنْ یّکذب اللہ ورسولہ (مرقات ص۲۸۴ ج ۱)

قولہٗ ھٰذَا حَدِیْثٌ مَشْھُوْرٌ : یعنی یہ حدیث بہت سی ضعیف اسناد وں سے مروی ہے لہٰذا قوی ہے کیونکہ کثرت اسناد ضعیف کو حسن بنا دیتی ہے۔

وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خَصْلَتَانِ لَا یَجْتَمِعَانِ فِیْ مُنَافِقٍ حُسْنُ سَمْتٍ

ترجمہ : روایت ہے حضرت ابوہریرہؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو خصلتیں منافق میں جمع نہیں ہوتیں اچھے اخلاق اور نہ دینی فقاہت۔

وَلَا فِقْـهٌ فِی الدِّیْنِ :

قولہٗ خَصْلَتَانِ : ای صفتانِ جس کو وصف اور خصلت سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔

قولہٗ لَا یَجْتَمِعَانِ : اکثر حضرات اس کا معنیٰ کرتے ہیں کہ جمع نہیں ہوتیں مگر اس پر سوال ہوگا یہ دو خصلتیں جمع نہیں ہوسکتیں اکیلی اکیلی آسکتی ہیں حالانکہ اکیلی اکیلی بھی نہیں ہوتیں۔

جواب : یہ معنیٰ نہیں کہ جمع نہیں ہوسکتیں بلکہ یہ دونوں صفتیں نہیں آسکتیں یعنی نفی جمع کی نہیں بلکہ پیدائش وآمد کی نفی ہے کہ منافق میں یہ صفتیں پیدا ہی نہیں ہوتیں جب پیدا ہی نہیں ہوسکتیں تو اجتماع کیسے۔

سوال : پھر یہ تعبیر کیوں اختیار فرمائی یعنی لَا یجتمعان تو فرمایا لا یخلقان کیوں نہ فرمایا۔

جواب : اصلاً یہ تعبیر اختیار فرما کر دو باتوں کی طرف اشارہ فرمایا جو لَا یُخْلَقَانِ میں نہیں تھیں۔ اوّل : حضرت نبی کریم علیہم السّلام نے یہ تعبیر اختیار فرما کر مسلمانوں کو اس بات پر ابھارا ہے کہ وہ ان دونوں صفات کو حاصل کریں تحریص علی ہذا الصّفات کی طرف اشارہ ہے کما فی قولہ تعالیٰ " فَوَیْلٌ لِّلْمُشْرِکِیْنَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ بِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ کٰفِرُوْنَ (پ۲۴ حٰمٓ السجدہ) حالانکہ شرک کو زکوٰۃ کے ساتھ کیا تعلق ہے وہ تو اس کا مکلّف بھی نہیں بلکہ مسلمانوں کو زکوٰۃ پر ابھارنا ہے۔

دوُم : اس بات کی بھی رغبت دلانی مقصود ہے کہ یہ دو صفتیں ایسی ہیں کہ مسلمان ومؤمن مخلص کی شایانِ شان ہیں اور اسی کو زیب دیتی ہیں منافق کا کیا حق ہے کہ وہ اس کو حاصل کرے کما فی قولہٖ علیہ السّلام " الکلمۃ الحکمۃ ضالۃ الحکیم بحیث وجدھا فھو احق بھا۔

قولہٗ حُسْنُ سَمْتٍ : سَمْت بمعنی خلق وسیرت وطریقۂ حسنہ یعنی اچھے اخلاق کا مالک ہونا، اچھی سیرت کا مالک ہونا، اچھے طریقہ پر چلنا۔

قولہٗ فِقْـهٌ فِی الدِّیْنِ : علّامہ تورپشتیؒ فرماتے ہیں کہ تفقہ فی الدّین سے

مراد فہم دین ہے اور فہم دین کی حقیقت یہ ہے کہ دین کی معرفت پیدا ہوجائے زبان سے اس کا اظہار ہو اور اس کے مطابق عمل کرے جس کے سبب سے خوفِ خدا اور تقویٰ حاصل ہو

سوال : بہت منافق عالم ہوتے ہیں۔

جواب : علم اور چیز ہے فقاہت اور چیز ہے نفی فقاہت مقصود ہے علم کی نفی مقصود نہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن مقدس میں فرماتے ہیں " قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ بِهَا(پ) لَا یَعْلَمُوْنَ بِهَا نہیں فرمایا۔

وَعَنْ اَنَسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ خَرَجَ فِىْ طَلَبِ الْعِلْمِ فَهُوَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَرْجِعَ

ترجمہ : روایت ہے حضرت انسؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جو تلاشِ علم میں نکلا وہ واپسی تک اللہ کی راہ میں ہے۔

قولہٗ خَرَجَ : ای من بیتہٖ اوبلدہٖ : گھر اور شہر دونوں کا خروج مراد ہے کیونکہ بعض دفعہ بیت خود شہر میں ہوتا ہے وبالعکس۔

قولہٗ فِیْ طَلَبِ : ای لِحُصُوْلِ الْعِلْمِ ۔ فِیْ اجلیہ تعلیلیہ ہے کیونکہ علم ظرف تو نہیں بن سکتا۔

قولہٗ فَهُوَ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔ فِی سبیل اللہ سے مراد جہاد فی سبیل اللہ ہے یعنی وہ طالب علمِ دین، مجاہد کی طرح ہے جو ثواب مجاہد فی سبیل اللہ کو ملتا ہے وہی طالب علمِ دین کو ملتا ہے۔ فی سبیل اللہ کی قید لگا کر رضاءِ الٰہی کی طرف اشارہ فرمایا کہ حصولِ علم میں رضاءِ خداوندی ہو نہ کہ غرضِ دیگر۔

سوال : طالبِ علم کو مجاہد کے ساتھ کس بات میں تشبیہ ہے۔

جواب : تین باتوں میں تشبیہ ہے :۔

اوّل : اِذلالِ شیطان کہ جس طرح شیطان کا مقصد پورے عالم کی گمراہی ہے جبکہ مجاہد کا مقصد پورے عالم پر اللہ کی حکمرانی ہے یہی حال طالب علمِ دین کا ہے کہ

کہ پورے عالم میں اللہ تعالیٰ کے دین کی اشاعت ہو۔

دوئم عتابِ نفس : کہ نفس خواہشات وطویل زندگی کو پسند کرتا ہے جب کہ مجاہد ان دونوں کی نفی کرتا ہے۔ یہی حال طالب علمِ دین کا ہے کہ حصولِ دین میں جو مشقتیں ہیں نفس ان کو پسند نہیں کرتا۔ لیکن طالبِ علمِ دین نفس کی پرواہ کیئے بغیر اس کے حصول میں لگا رہتا ہے۔

سوئم احیاءِ دین : کہ مجاہد کا ایک مقصد جہاد سے دین نبوی کی اشاعت ہے اور کفر و ضلالت کا خاتمہ ہے۔ یہی حال طالب علم کا ہے کہ وہ بھی اپنے علم کے ذریعہ ضلالت وجہالت کو ختم کرکے دین کی اشاعت کا طالب ہے۔

قولہ حَتّٰی یَرْجِعَ : اَیْ فِیْ بَیْتِہٖ وَبَلَدِہٖ ۔ یعنی جب تک وہ واپس نہ آجائیں اپنے گھر یا اپنے شہر کی طرف۔

یقول ابوالاسعاد : تحصیل علم کے لیے خروج یہ بھی ایک درجہ ہے مگر اعلیٰ درجہ بعد حصول العلم تدریسی وتعلیمی مشاغل کا ہے۔ جس کو قرآن مقدس میں یوں بیان کیا گیا ہے "

" فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ۝ (پ۱۱ توبہ)

یعنی حَتّٰی یَرْجِعَ فرما کر اس بات کی طرف اشارہ فرمایا کہ جب وہ فارغ ہوجاتے ہیں اس وقت اس سے بھی بڑا درجہ پاتے ہیں کیونکہ اب وہ وارث الانبیاء بن کر دین کی تعلیم وترویج اور ناقصوں کو کامل بنانے کے کام میں مشغول ہوجاتے ہیں یعنی تعلّم کے بعد تدریسی مشاغل اختیار کرنے کی طرف ترغیب ہے۔

وَعَنْ سَخْبَرَةَ الْاَزْدِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ طَلَبَ الْعِلْمَ

ترجمہ : روایت ہے حضرت سخبرہ ؓ ازدی سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس نے تلاش علم کی تو

كَانَ كَفَّارَةً لِمَا مَضٰى	یہ تلاش اس کے گذشتہ گناہوں کا کفارہ ہوگئی۔

قولہٗ اَلْعِلْمَ : جمہور حضرات کے نزدیک شریعت مقدس کا علم مراد ہے جب کہ صوفیاء کرامؒ کے ہاں علم باطنی جس کو علوم طریقت بھی کہتے ہیں وہ مراد ہے۔

قولہٗ کَانَ : طلبیّتِ علم کی طرف مرجع ہے۔

قولہٗ کَفَّارَةً لِمَا مَضٰى : ایسے گناہوں کا کفارہ ہیں جو صغائر ہیں یعنی حقوق اللہ عند البعض علم کفّارہ نہیں بلکہ طلب العلم وسیلہ ہے ما یکفر به الذّنوب کے لیے۔

خُلاصَةُ الحَدِيث

طالب علم سے صغیرہ گناہ معاف ہوجاتے ہیں جیسے وضو، نماز، عبادات وغیرہ سے لہٰذا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ طالب علم جو گناہ چاہے کرے یا مطلب یہ ہے کہ اللہ تم نیتِ خیر سے علم طلب کرنے والوں کو گناہوں سے بچنے اور گذشتہ گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کی توفیق دیتا ہے۔

قولہٗ وَابوداؤد الراوی یُضَعَّفُ : یہ ابوداؤد داور ہیں سلیمانؒ ابن اشعث سجستانی نہیں ہیں جن کی مشہور کتاب سُنن ابی داؤد شریف ہے بلکہ ان کا نام نفیع ابن حارث ہے کوفہ کے رہنے والے ہیں۔ ہمدان کے قاضی تھے اور نابینا تھے حدیث میں ضعیف مانے جاتے ہیں۔

اسمائے رجال

حالات حضرت سنجرہؓ

یہ حضرت سنجرہؓ ہیں اور ان کی کنیت ابوعبداللہ الازدی ہے ان سے ان کے بیٹے عبداللہ روایت کرتے ہیں ان کی بھی ایک روایت ہے جو کتاب العلم میں ہے۔ سنجرہؓ میں سین پر فتحہ اور خاء معجمہ ساکن اور باء موحدہ مفتوح ہے۔

وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ نِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَنْ یَّشْبَعَ الْمُؤْمِنُ مِنْ خَیْرٍ یَّسْمَعُہٗ حَتّٰی یَکُوْنَ الْمُنْتَہَاہُ الْجَنَّۃَ :

ترجمہ : روایت ہے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مؤمن خیر کے سننے سے کبھی سیر نہ ہوگا تاکہ اس کی انتہاء جنّت ہو جائے۔

قولہٗ لَنْ یَّشْبَعَ : ای لن یملّ البطنُ : کہ اس کا پیٹ نہیں بھرے گا جب آدمی کھانا کھالے اور سیراب ہوجائے تو اس پر شبع البطن کا اطلاق ہوتا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مضارع کا صیغہ استعال فرمایا جو دال بر استمرار ہے معنیٰ ہوگا کہ کبھی بھی سیراب نہیں ہوتا۔

قولہٗ اَلْمُؤْمِنُ : مؤمن سے مراد کامل مؤمن ہے مطلق مراد نہیں مگر مؤمن کی قید لگا کر اشارہ فرمایا کہ علم دین کی حرص ایمان کی علامت ہے جتنا ایمان قوی ہوگا اتنی ہی یہ حرص زیادہ ہوگی بڑے بڑے علماء علم پر قناعت نہیں کرتے۔

قولہٗ مِنْ خَیْرٍ : خیر سے مراد علم ہے اور خیر بمعنیٰ نفی کے ہے یعنی مؤمن کو علم سے سیر نہیں ہونا چاہیے کیونکہ عالم کی یہ صفت ہے کہ وہ مرتے دم تک علم کی تلاش میں رہے۔صوفیاء فرماتے ہیں ”اطلبوا العلم من المھد الی اللحد“

قولہٗ منتھاہ الجنّۃ : یہاں عبارت بتقدیر عوض مضاف الیہ کے مقدر ہے دراصل عبارت تھی ”حَتّٰی یَمُوْتَ فَیَدْخُلُ الْجَنَّۃ“ طلبِ علم ایمان کا خاصہ ہے چونکہ ایمان نور ہی نور ہے اس لیے مؤمن علم کو نورِ الٰہی سمجھ کر پوری طرح سے جذب کر لیتا ہے اس لیے فرمایا کہ مؤمن کا پیٹ علم سے کبھی نہیں بھرتا جوں جوں علم کی بلندیوں پر پہنچتا جاتا ہے اس کی حرص تحصیل علم کے لیے بڑھتی جاتی ہے۔ اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوئیں :۔

اوّل : درحقیقت اس حدیث میں طالب علم اور اہل علم کے لیے عظیم بشارت ہے

کہ یہ لوگ اس دنیا سے ایمان کے ساتھ رخصت ہوتے ہیں اور رضاءِ الٰہی سے ان کا دامن پر ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ اکثر اہل اللہ اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک حصولِ علم میں منہمک رہے ہیں۔ باوجودیکہ ان کی علمی فضیلت وعظمت انتہائی درجہ کی تھی۔
دوّم: علماء فرماتے ہیں کہ کسی کو اپنے خاتمہ کی خبر نہیں سوائے عالم دین کے کہ ان کے لیے حضور علیہ السلام نے وعدہ فرما لیا کہ اللہ جس کی بھلائی چاہتا ہے اسے علم دین دیتا ہے۔

وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سُئِلَ عَنْ عِلْمٍ عَلِمَهٗ ثُمَّ كَتَمَهٗ اُلْجِمَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ بِلِجَامٍ مِّنْ نَّارٍ:

ترجمہ: روایت ہے حضرت ابوہریرہؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جس سے علمی بات پوچھی گئی جسے وہ جانتا ہے پھر اسے چھپائے تو قیامت کے دن اسے آگ کی لگام دی جائیگی۔

قَولُهٗ عَنْ عِلْمٍ: علم سے مراد وہ دینی فرائض وواجبات جس کی طرف سائل واقعی طور پر محتاج ہو۔
قَولُهٗ ثُمَّ كَتَمَهٗ: جملہ مذکورہ میں ثُمَّ استبعاد کے لیے ہے۔ یعنی کسی عالم کی شان کتمانِ علم ہونا بہت ہی بعید از عقل بات ہے۔
قَولُهٗ بِلِجَامٍ مِّنْ نَّارٍ: لجام معرب لگام ہے اور لگام اس رسّی (رجل) یا پٹے کو کہتے ہیں اَلَّتِیْ یَدْخُلُ فِیْ فَمِ الدَّابَّةِ هٰذَا جَزَاءٌ مِّنْ جِنْسِ الْعَمَلِ ہے۔ اور یہ لگام اس لیے لگائی جائے گی کہ مسئول نے بھی سائل کے سوال کے جواب کو چھپا کر اپنے منہ میں لگام لگائی تھی۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ بے زبان جانور جس طرح فیض تعلیم وتبلیغ سے محروم ہیں اسی طرح وہ آدمی بھی لہٰذا وہ بھی چوپائے کی طرح لگام کا مستحق ہے۔

بحث کتمانِ حق

کتمانِ علم کے پانچ اسباب ہوتے ہیں :۔

ا : کسی کے خوف و ڈر کی بنا، پر ہو۔

۲ : محض تکبر کی بنا، پر ہو۔

۳ : بتانے سے اس پر فوقیت ہو جائے گی ۔

۴ : کسی دنیوی غرض کی بنا، پر ہو۔

۵ : سستی کی بنا، پر ہو

یہ سب اصول دین کے خلاف ہیں ، پھر کتمانِ علم کی وعید کا مستحق ہونے کے لیے چند شرائط ہیں۔ اگر ان میں کوئی شرط مفقود ہو تو کتمانِ علم کا گناہ نہیں ہوگا۔

۱: جس بات کو چھپا رہا ہے اس کی پوری تحقیق ہو اگر مسئلہ میں تردُّد ہونے کی وجہ سے چھپایا ہے تو کوئی گناہ نہیں ہوگا۔

۲: پوچھنے والا واقعی طالب علم ہو، اگر قرائن سے واضح ہو جائے کہ سائل طالب صادق نہیں ہے تو مسئلہ نہ بتلانے میں کوئی حرج نہیں ۔ اگر بتائے گا تو واضع العلم عند غیر اھلہ لمقلد الخنازیر کے مثل ہوگا۔

۳: طالب کو اس مسئلہ کی ضرورت بھی ہو اور وہ اس کو سمجھنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو

۴: وہاں کوئی اور مسئلہ بتانے والا نہ ہو اور اگر وہاں کوئی اور عالم بھی موجود ہو تو پھر یہ وعید نہیں ۔ اِذَا فَاتَ الشرط فات المشروط۔

وَعَنْ كَعْبُ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ طَلَبَ الْعِلْمَ لِيُجَارِيَ بِهِ الْعُلَمَآءَ اَوْلِيُجَارِيَ

ترجمہ : روایت ہے حضرت کعب ابن مالکؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جو اس لیے علم طلب کرے تاکہ علماء کا مقابلہ کرے یا جہلاء

بِهِ السُّفَهَآءَ اَوْ يُصْرِفُ بِهِ وُجُوْهَ النَّاسِ اِلَيْهِ اَدْخَلَهُ اللّٰهُ النَّارَ	جھگڑے یا لوگوں کی توجّہ اپنی طرف کرے تو اسے اللہ آگ میں داخل کرے گا۔

قولہٗ لِيُجَارِيَ بِهِ : علّت اوّل ہے یہ جَرای سے مأخوذ ہے بمعنیٰ معارضہ ومقابلہ کرنا۔ اور بِہٖ کی بار سببیہ ہے یعنی جس نے اس غرض سے علم حاصل کیا کہ اس کے سبب یا اس کے ذریعہ علماءِ دین کے ساتھ مقابلہ کرے بعض حضرات نے جَری بمعنیٰ مفاخرہ کے بھی کیا ہے یعنی جعل نفسہ مثل غیرہ

قولہٗ يُمَارِيَ بِهِ : یہ علت ثانی ہے ای یجادل بعض حضرات کے نزدیک اگر مِرْيَة (شک) سے مأخوذ ہے تو مراد یہ ہے کہ ایک دوسرے کے قول میں شک کرتے ہوئے جھگڑا کرے۔

الغرض دینی علم دنیا کی جاہ ودولت حاصل کرنے کے لیے طلب کیا۔

قولہٗ السُّفَهَآءَ : جمع سفیہ وھو قلیل العقل مگر مراد جاہل ہے۔

قولہٗ اَوْيُصْرِفُ بِهِ : یہ علت ثالثہ ہے بمعنیٰ یمیل بالعلم

قولہٗ وُجُوْهَ النَّاسِ : ناس سے مراد عوام یا طالب العلم ہیں یعنی صرف علم کے حصول کا مقصد یہی ہے کہ لوگ میری تعظیم کریں۔

قولہٗ اَدْخَلَهُ اللّٰهُ النَّارَ : اس کی دو توجیہیں ہیں ۱ یہ کہ یہ جملہ خبریہ ہے خبر دی جا رہی ہے۔ ۲ یہ کلمہ بد دعائیہ ہے بد دعاء دی جا رہی ہے کہ اللہ پاک اس کو نار میں داخل کریں۔ اور یہ وعید اس شخص کے لیے ہے جس کا مقصد صرف اغراض فاسدہ ہوں۔ ہاں کسی علم دین کو لوجہ اللہ طلب کیا لیکن بعد میں بتقاضائے جبلّت اغراض فاسدہ کی کچھ آمیزش ہوگئی تو وہ اس وعید میں شامل نہیں۔

خُلَاصَةُ الْحَدِيْث

اگر کوئی شخص محض دنیوی منفعت اور ذاتی عزّت کی خاطر علم حاصل کرتا ہے یا اس لیے علم حاصل کرتا ہے کہ میں علماء کے ساتھ مقابلہ کروں یا جاہلوں سے جھگڑا وغیرہ کروں تو

آخرت میں اس کی نیت کے کھوٹ کی وجہ سے سخت باز پرس ہوگی۔ جس کا انجام دخول نار ہوگا۔

سوال ۔ اس میں کیا حکمت ہے کہ علم کے حصول پر نیت کی تبدیلی سے اتنی بڑی سزا دی جارہی ہے۔

جواب : علم نورِ الٰہی ہونے کی وجہ سے غرور، تکبر، ریاکاری کو برداشت نہیں کرسکتا۔ جب علم دین کی اوّلین روشنی ہی ہوتی ہے کہ وہ انسان کے دل و دماغ سے ظلم و جہل کی تاریکی کو دور کرے تو یہ کیسے برداشت کرسکتا ہے کہ جس عالم کے دماغ میں علم کی مقدس روشنی ہو اور غیر اسلامی اخلاق کا مظاہرہ کرے۔ اسی وجہ سے دخولِ نار کی سزا دی جارہی ہے۔

وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَعَلَّمَ عِلْمًا يُبْتَغٰى بِهٖ وَجْهُ اللّٰهِ لَا يَتَعَلَّمُهٗ اِلَّا لِيُصِيْبَ بِهٖ عَرَضًا مِّنَ الدُّنْيَا لَمْ يَجِدْ عَرْفَ الْجَنَّةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَعْنِیْ رِيْحَهَا

ترجمہ : روایت ہے حضرت ابو ہریرہؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کوئی وہ علم سیکھے جس سے اللہ تعالیٰ کی رضا ڈھونڈھی جاتی ہے صرف اس لیے کہ اس سے دنیوی سامان حاصل کرے۔ وہ قیامت کے دن جنت کی خوشبو نہ پائے گا۔

اسمائے رجال

حالات حضرت کعبؓ بن مالک

آپ انصاری خزرجی ہیں عقبہ ثانیہ کی بیعت میں شریک تھے۔ اسلام کے نامور شعراء میں سے ہیں آپ غزوۂ تبوک میں رہ گئے تھے اسی پر آپ سے بائیکاٹ کیا گیا۔ پھر کچھ عرصہ بعد آپ کی اور آپ کے دو ساتھیوں بلالؓ ابن امیہ اور مرارہ ابن ربیعہ) کی توبہ قبول ہوئی۔ رب فرماتے ہیں وَعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا (پ۱۱ توبہ) آخر عمر میں نابینا ہوگئے تھے ۷۷ سال عمر مبارک ہوئی ۵۰ھ میں راہیٔ ملکِ بقا ہوئے۔!

قولہٗ مِمَّا يُبْتَغٰى : مِمَّا کا مِنْ اصلاً بیان ہے عِلْمًا کا۔

قولہٗ لَا يَتَعَلَّمُهٗ : اس میں ترکیبًا تین احتمال ہیں۔ (۱) حال ہے من فاعل تعلّم یعنی ضمیر تعلُّم سے کیونکہ عِلْمًا مِمَّا يُبْتَغٰى سے تخصیص آگئی لہذا بلا تقدیم حال واقع ہونے میں کوئی اشکال نہیں۔ (۲) یا مفعول ہے تعلّم کی ضمیر سے (۳) یا علمًا کی صفت ثانیہ ہے یعنی علومِ دینیہ (کالصّلوٰۃ والصّوم) سیکھنے کا مقصد رضائے مولیٰ کے علاوہ کچھ نہیں۔

قولہٗ اِلَّا لِيُصِيْبَ بِهٖ ۔ ای لینال و یحصل بذی العلو حضرت حسن بصریؒ ایک بازی گر کو رسی پر تماشا کرتے ہوئے دیکھ کر فرمایا " اِنَّ هٰذَا خَيْرٌ مِّنْ اَصْحَابِنَا لِاَنَّهٗ يَأْكُلُ الدُّنْيَا بِالدُّنْيَا وَاَصْحَابُنَا يَأْكُلُوْنَ الدُّنْيَا بِالدِّيْنِ ۔

قولہٗ عَرَضًا : ای حظًّا مالًا اَوْجَاهًا ۔

قولہٗ رِيْحَهَا : عرف کی تفسیر ریح سے کی ہے یہ راوی کی طرف سے ہے اس خوشبو سے مراد جنّت کی خوشبو ہے جو پانچ سو سال کی مسافت سے سونگھی جائے گی۔ کذا فی الحدیث۔

سوال : اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ طالب دنیا عالم جنّت میں داخل نہیں ہوگا اور یہ معتزلہ کا عقیدہ ہے کہ مرتکب کبیرہ دائمی جہنمی ہے۔

جواب اوّل : یہ مستحل پر محمول ہے جو دنیا کے لیے طلب علم کو حلال سمجھے۔

جواب دوّم : یہ حدیث زجر و توبیخ پر محمول ہے۔

جواب سوّم : عدم وجدانِ ریح مقید ہے یوم القیامۃ کے ساتھ جو نام ہے حشر سے لے کر جنّت و نار میں دخول تک کا تو مطلب یہ ہوا کہ کامل ایمان و عمل صالح والے علماء تو ابتداء ہی سے جنّت کی خوشبو سے حصہ پائیں گے لیکن یہ ریاکار طالب دنیا عالِم، فاسد مزاج مریض کی طرح ابتداءً جنّت کی خوشبو سے محرُوم رہے گا اور اس کے بعد جنّت میں داخل ہوگا۔

یقول ابو الاسعاد : بعض محدثینؒ نے یوں بھی جواب دیا ہے کہ ایسا بدبخت آدمی اس کا مستحق ہے لیکن اللہ پاک اپنے فضل و رحمت سے جنّت میں داخل فرمادیں تو

اور بات ہے۔

وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَضَّرَ اللّٰہُ عَبْدًا سَمِعَ مَقَالَتِیْ فَحَفِظَھَا وَوَعَاھَا وَاَدَّاھَا فَرُبَّ حَامِلِ فِقْہٍ غَیْرُ فَقِیْہٍ وَرُبَّ حَامِلِ فِقْہٍ اِلٰی مَنْ ھُوَ اَفْقَہُ

ترجمہ: روایت ہے حضرت ابن مسعودؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اللہ اس بندے کو ہرا بھرا رکھے جو میرا کلام سنے اور اسے یاد رکھے، خیال رکھے اور پہنچا دے کیونکہ بہت سے فقہ اٹھانے والے خود غیر فقیہ ہیں اور بہت لوگ اپنے سے بڑے فقیہ تک فقہ اٹھاتے ہیں۔

یقول ابوالاسعاد : اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو باتوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے:۔

اوّل: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی احادیث مبارکہ یاد کرکے آگے پہنچانے کی ترغیب دے رہے ہیں۔

دوّم: روایتِ حدیث کی فضیلت کی طرف اشارہ فرمایا کہ جو شخص حضور صلعم کی مستجاب دعا میں شامل ہونا چاہے تو وہ روایتِ حدیث کو اپنی زندگی بنالے۔

قال ابواسحٰق ابراھیم عبد القادر الریاحی التنوسیؒ ؎

اھل الحدیث طویلة اعمارھم	ووجوھم بدعا النبیؐ منضرہ
وسمعت من بعض المشائخ انھم	ارزاقھم ایضًا بہ متکثرہ

قیل لامام احمد بن حنبلؒ "ھل للّٰہِ فی الارض ابدال، قال نعم قیل من ھم قال ان لم یکن اصحاب الحدیث ھم الابدال فما اعرف للّٰہِ ابدالًا"

وکان الشافعیؒ یقول اذا رأیت اصحاب الحدیث فکانی رأیت

رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔

قولہٗ نَضَّرَ اللّٰہُ : لفظ نَضَّرَ تخفیف وتشدید دونوں طرح سے ہے اور ماضی کا صیغہ ہے اور ماضی کی اصل وضع اخبار کے لیے ہے لیکن یہاں کس معنیٰ میں ہے اس میں دوؔ احتمال ہیں۔

اوّل ماضی اپنے اصل معنیٰ میں ہے یعنی اخبار کے لیے ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث سن کر یاد کر کے آگے پہنچانے والے کے لیے تروتازہ اور خوش وخرم ہونے کی خبر دے رہے ہیں۔ یہ بات اگرچہ مستقبل کی ہے لیکن کبھی کبھی مستقبل کی بات کو ماضی سے تعبیر کر دیتے ہیں تحقق وقوع کے لیے یعنی جتنی ماضی کی بات یقینی ہوتی ہے یہ بھی اتنی یقینی ہے۔ حاصل یہ ہوا کہ ایسے شخص کو حق تعالیٰ ضرور بالضرور تروتازہ وخوش وخرم رکھیگا۔

دوؔم : دوسرا احتمال یہ ہے کہ ماضی اپنے معنیٰ میں نہ ہو بلکہ یہاں دعاء کے لیے ہو۔ ماضی کا صیغہ عربی زبان میں دعاء کے لیے بکثرت استعمال ہوتا رہتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایسے شخص کے لیے خوش وخرم رہنے کی دعاء فرمارہے ہیں۔

قولہٗ سَمِعَ مَقَالَتِیْ : مَقَالَتِیْ سے مراد حدیث ہے بالواسطہ ہو یا بلا واسطہ۔

قولہٗ فَحَفِظَھَا۔ حفظ مقابل ہے ناظرہ کے بعض دفعہ مقابل نسیان بھی ہوتا ہے اس جگہ مقابل نسیان ہے یعنی دل میں یاد ہو یا کتابۃً محفوظ ہو۔ عند البعض حفظ عمل کے معنیٰ میں ہے یعنی حفظھا ای عمل بموجبھا فانّ الحفظ قد یستعار للعمل قال تعالیٰ « وَالْحَافِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰہِ » ای العاملون بفرائضہ

قولہٗ وَوَعَاھَا : بعض حضرات کے نزدیک وَعَاھَا، حَفِظَھَا کی تاکید ہے مگر صحیح قول کے مطابق حِفظ سے مراد ہے ابتداءً یاد کرنا۔ اور وَعَاھَا سے مراد ہے یاد کرنے کے بعد تکرار و مذاکرہ کے ذریعہ محفوظ رکھنا جس کو تعلّم وتعلیم، درس وتدریس بھی کہ سکتے ہیں۔ قولہٗ وَاَدَّاھَا : ای اعطاء النّاس علوم الدینیۃ من غیر تحریف و تفسیر : کیونکہ اربعین میں جو روایت ہے اس کے الفاظ ہیں « سَمِعَ مَقَالَتِیْ فَوَعَاھَا فَاَدَّاھَا کَمَا سَمِعَھَا » یا آگے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت

میں ہے " فَبَلَّغَہ کَمَا سَمِعَہ "

قولہٗ فَرُبَّ حَامِلِ فِقْہٍ غَیْرُ فَقِیْہٍ : فَرُبَّ میں فا تعلیلیہ ہے۔ پہلے جملہ نضّر اللہُ میں حدیث یاد کرکے آگے پہنچانے کی ترغیب دی اور اس جملہ میں اس کی علت بیان فرمائی ہے اور رُبَّ تکثیر کے معنیٰ میں مستعار ہے بمعنیٰ بہت۔ حَامِل بمعنیٰ داعی، طالب، تلمیذ تینوں مراد ہو سکتے ہیں۔

قولہٗ فِقْہٍ : فقہ سے علمِ حدیث یا علمِ دین مراد ہے۔ اس تعلیل کا حاصل یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کلام انتہائی جامعیت کی حامل ہوتی ہے اس کا ایک ایک جملہ بہت سے فقہی مسائل کا مجموعہ ہوتا ہے۔ بہت سے لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو الفاظ حدیث تو یاد آتے ہیں لیکن ان کی گہرائی میں پہنچ کر اور مسائل نکال کر امت کے سامنے پیش کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی ہے ایسے شخص کو حامل فقہ کہا گیا ہے گویا اس نے فقہی جواہر کا صندوق اٹھایا ہوا ہے لیکن اس کو کھول کر ان قیمتی جواہر سے استفادہ نہیں کر سکتا اگر یہ شخص یہ صندوق اپنے پاس رکھے گا تو اس قیمتی خزانہ کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے لہٰذا اس کو چاہیے کہ یہ خزانہ کسی ایسے شخص کے سپرد کر دے جو اس میں سے جواہر نکال کر خود بھی مستفید ہو اور لوگوں کو بھی فائدہ پہنچائے۔

قولہٗ وَرُبَّ حَامِلِ فِقْہٍ اِلٰی مَنْ ھُوَ اَفْقَہُ : اس جملہ کا حاصل یہ ہے کہ نقل وروایت بھی حدیث میں مفید ہے۔ بعض اوقات حامل فقہ اتنا فقہی مسائل کا ماہر نہیں ہوتا جتنا آگے والا جس کو مسائل پہنچائے جا رہے ہیں یعنی بعض اوقات شاگرد استاذ سے فہم معانی میں فائق ہوتا ہے۔ تو اپنے سے کم یا محض الفاظ کے ناقل سے بھی علم حاصل کرنے میں عار نہ کرنی چاہیے۔ چونکہ روایتِ حدیث دین کی تجدید ورونق کا سبب ہے اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے راوی کے لیے تازگی کی دعاء کی ہے اس سے دو باتیں واضح ہوئیں۔

اوّل، خدّام علوم دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک حاملینِ فقہ جو الفاظِ حدیث کو یاد کرکے امت کی آئندہ نسلوں تک پہنچاتے ہیں یہ بھی بہت بڑی خدمت ہے۔ دوسرے فقہاء صرف الفاظ یاد کر لینے پر اکتفاء نہیں کرتے بلکہ علومِ نبوت کے بحر بے کنار میں غوّاصی

کرکے اس کی تہ سے قیمتی جواہر نکال کر اُمت کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

دوم : اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حفظ حدیث کے لیے فہم حدیث میں فائق ہونا ضروری نہیں حامل فقہ کو چاہیے کہ فقیہ سے پوچھ کر عمل کرے۔

قولہٗ ثَلٰثٌ ۔ ثلث میں تنوین عوض ہے مضاف الیہ محذوف کے اصل میں ثَلَاثُ خِصَالٍ تھا۔

قولہٗ لَا یَغِلُّ ۔ غِلّ کے دو معنیٰ بیان کیے گئے ہیں :۔

اوّل یَغِلُّ : بفتح الیاء وکسر الغین بمعنیٰ کینہ پرور ہونا۔

دوم یُغَلُّ : بضم الیاء و فتح الغین اِغلال سے ماخوذ ہے بمعنیٰ خیانت کرنا مطلب یہ ہے کہ جس مؤمن کا دل ان صفات ثلاثہ پر قائم ہو تو ان کی برکت سے اس کا دل کینہ وخیانت سے پاک وصاف ہوجاتا ہے۔

قولہٗ عَلَیْهِنَّ : ای ثلاث خصال۔

سوال ۔ اس جملہ کا ماقبل سے ربط کیا ہے ؟

جواب : اس کے دو ربط ہیں بہ ۱ یہ کہ پہلے تبلیغ حدیث کی ترغیب دی اور پھر اس جملہ سے اس کی تائید فرمادی کہ تبلیغ حدیث باب اخلاص عمل اور باب نصیحت مسلمین اور باب الحقوق الواجبۃ لجماعۃ المسلمین میں سے ہے۔ ۲ یہ کہ پہلے تبلیغ حدیث کی ترغیب دی اور پھر ایک جامع حدیث ارشاد فرمادی۔

قولہٗ اِخْلَاصُ الْعَمَلِ لِلّٰہِ : اخلاص عمل یہ ہے کہ عمل ریا اور تحصیل مال و جاہ کے لیے نہ ہو۔ پھر اس میں بھی دو درجہ ہیں۔ ایک عوام کا اخلاص کہ ان کا عمل حصولِ جنت کے لیے ہوتا ہے۔ دوسرا خواص لوگوں کا کہ ان کا عمل حصول جنت کے لیے نہیں بلکہ محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہے۔

قولہٗ وَالنَّصِیْحَةُ لِلْمُسْلِمِیْنَ : اَلنَّصِیْحَةُ بمعنیٰ خیر خواہی مسلمانوں کی خیر خواہی کی تفسیر خود حدیث پاک میں ہے " اَنْ تُحِبَّ لِاَخِیْكَ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِكَ وَتَکْرَہُ لَھُمْ مَا تَکْرَہُ لِنَفْسِكَ "

قولہٗ وَلُزُوْمُ جَمَاعَتِھِمْ : مُسلمانوں کی جماعت کو لازم پکڑنے کے معنیٰ

یہ ہیں کہ زندگی کے ہر مرحلہ پر اجتماعیّت کے اصول پر کاربند رہے۔ اور اپنے آپ کو کبھی انفرادیّت کی راہ پر نہ ڈالے۔ علماءِ دین اور علماءِ امت کے متفقہ عقائد صحیحہ اور اعمال صالحہ کی موافقت کرتا رہے مثلاً نماز جمعہ اور عیدین وغیرہ۔

قولہٗ فَاِنَّ دَعوتهم تحِيطُ : اَی تَدُوْرُ مِنْ وَرَآئِهِمْ : مشکوٰۃ شریف کے بعض نسخوں میں میم کے زیر کے ساتھ اور بعض میں زبر کے ساتھ ہے۔ مطلب اس جملہ کا یہ ہے کہ شیطان کے مکروفریب سے بچنے کے لیے جماعت کو مسلمانوں کی دعا، گھیرے ہوئے ہے جس کی بنا پر وہ شیطان کی گمراہی سے بچے ہوئے ہیں۔ نیز اس میں اس بات پر تنبیہ بھی مقصود ہے کہ جو کوئی علمائے دین اور صلحاءِ امت کی جماعت سے اپنے آپ کو الگ کر لیتا ہے تو اس کو نہ جماعت کی برکت میسّر ہوتی ہے اور نہ مسلمانوں کی دعا اسے حاصل ہوتی ہے۔

وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ نَضَّرَ اللّٰهُ امْرَءً سَمِعَ مِنَّا شَيْئًا فَبَلَّغَهٗ كَمَا سَمِعَهٗ :

ترجمہ : روایت ہے حضرت ابن مسعودؓ سے فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ اللہ اسے ہرا بھرا رکھے جو ہم سے کچھ سُنے۔ اور پھر اسی طرح اسے آگے پہنچائے

قولہٗ سَمِعَ : سماع سے مراد علم ہے کیونکہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو بات نقل کی جاتی ہے علم کی ہوتی ہے مگر تعبیر سماع کی کیوں اختیار کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علم کا بڑا ذریعہ سماع ہی ہے اس لیے اس سے تعبیر فرمایا۔

قولہٗ مِنَّا : کلمہ مِنَّا جس طرح حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریر کو شامل ہے اسی طرح صحابہ کرامؓ کو بھی شامل ہے۔

قولہٗ شَيْئًا ۔ کلمہ شَیْئًا اقوال و افعال و احوال سب کو شامل ہے اس لیے مِنَّا جمع اور شَیْئًا نکرہ ارشاد ہوا۔

فائدہ : محدثین حضرات نے لکھا ہے کہ شَیْئًا کے بعد عنہ نہیں کہا اس

کی وجہ التباس اضمار ہے کہ ضمیر حضرت ابن مسعودؓ کی طرف لوٹ جاتی ۔

قولہٗ مُبَلَّغ : بفتح اللام المشددۃ یعنی منقول الیہ وموصول لدیہ ۔

قولہ اَوعیٰ لہٗ : ای احفظ وافھم واتقن ۔

روایت بالمعنیٰ نقل کرنا جائز ہے یا نہیں ؟

یقول ابوالاسعاد : اختلف فی نقل الحدیث بالمعنیٰ والی جوازہ حضرت ابن عمرؓ، مالک بن انسؒ، ابن سیرینؒ وغیرہم کے نزدیک حدیث کی روایت بالمعنیٰ حرام ہے ۔ کیونکہ حدیث پاک میں ہے " کما سمعہ " ثانیاً بعض اوقات لفظ کے بدلنے سے معنیٰ بدل جاتا ہے اور راوی کو خبر نہیں ہوتی ۔ جمہور حضرات کے نزدیک روایت بالمعنیٰ جائز ہے کہ راوی حدیث کے الفاظ اس طرح بدل دے کہ معنیٰ نہ بدلیں اور روایت بالمعنیٰ نقل کرنے والے کے لیئے لازم ہے کہ وہ عربی زبان کا ماہر ہو ۔ اور کما سمعہ بھی اسی پر محمول ہے ۔ پہلے قول میں احتیاط ہے دوسرے میں گنجائش بہتر یہی ہے کہ الفاظ بھی نہ بدلیں ۔

مثال : حضرت وائلؓ بن حجر نے نماز کی آمین کے بارے میں فرمایا مَدَّ بِھَا صَوْتَہٗ بعض راویوں نے اسے رَفَعَ بِھَا صَوْتَہٗ سے روایت کیا وہ سمجھے کہ دونوں کے معنیٰ ایک ہی ہیں ۔ مگر بعد والوں کو کم علمی کی وجہ سے دھوکا لگا شاید اس کے معنیٰ ہیں بلند آواز سے آمین کہی حالانکہ اس کا ترجمہ تھا کہ آمین کھینچ کر الف کے مد کے ساتھ کہی روایت بالمعنیٰ میں یہ خطرے ہیں اس لیے فرمایا جیسی سنے ویسی پہنچائے ۔

وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِتَّقُوا الْحَدِیْثَ عَنِّیْ اِلَّا مَا عَلِمْتُمْ ۔

ترجمہ : روایت ہے حضرت ابن عباسؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ میری حدیث روایت کرنے سے بچو سواء ان کے جنہیں تم جانتے ہو

قولہٗ اِتَّقُوا الْحَدِیْثَ : اس سے پہلے مضاف مقدر ہے تقدیرِ عبارت یوں ہے "ای احذروا روایۃ الحدیث - بعض حضرات کے نزدیک فعیل (حدیث) بمعنی مفعول عَنِّیْ بِہٖ کے متعلق ہے اور اِلَّا مَا عَلِمْتُمْ کی استثناء منقطع ہے حاصل عبارت یوں ہے "احذروا مِمَّا لَا تعلمونہ من التحدیث عَنِّی لا تحذروا مما تعلمونہ" اس حدیث کی روایت کرنے سے اجتناب کرو جس کے بارہ میں علم نہ ہو علم کے ہوتے ہوئے اجتناب نہیں کرنا چاہیے۔

خُلَاصَۃُ الْحَدِیْث

مقصد یہ ہے کہ حدیث کے بیان کرنے میں احتیاط سے کام لینا چاہیے اور جس حدیث کے بارہ میں یقین کے ساتھ یہ معلوم نہ ہو کہ واقعی یہ حدیث آپ ہی کی ہے اسے لوگوں کے سامنے بیان نہیں کرنا چاہیے ان احادیث کو بیان کرنا چاہیے جن کے بارہ میں یقین یا ظن غالب کے ساتھ یہ معلوم ہو کہ وہ آپؐ ہی کی حدیث ہے۔ تاکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذاتِ اقدس کی طرف غلط حدیث کی نسبت نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر محدثینؒ عظام کثرت حدیث بیان کرنے سے اجتناب کرتے تھے۔ بلکہ امام ابن ماجہؒ نے اپنی سنن میں کثرت کے ساتھ حدیث بیان نہ کرنے کا باب باندھا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کثرت سے روایات بیان کرتے تھے ان پر بھی اعتراض ہوا اور انہوں نے جواب دیا۔ ملاحظہ کریں مشکوٰۃ شریف ص۵۳۵ ج ۲ باب فی المعجزات فصل اول : باقی آگے والے جملہ (مَنْ کَذَبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّدًا) اس کی مکمل بحث مشکوٰۃ شریف ص۳۲ ج ۱ کتاب العلم فصل اوّل میں ہو چکی ہے فلَا فَائِدَۃَ فِی بَیَانِہٖ۔

وَعَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ قَالَ فِی الْقُرْاٰنِ بِرَاْیِہٖ فَلْیَتَبَوَّءْ مَقْعَدَہٗ مِنَ النَّارِ :

ترجمہ : روایت ہے انہی سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جو قرآن میں اپنی رائے سے کچھ کہے وہ اپنا ٹھکانا آگ میں بنائے۔

قولہٗ قَالَ ۔ قَالَ بمعنیٰ تَکَلَّمَ ہے اور قَالَ میں دو احتمال ہیں ۔ ۱ لفظ القرآن یعنی قرأت ۲ معنی القرآن ۔

قولہٗ بِرَأْیِہٖ ۔ رأی کے معانی متعدد ہیں لیکن سب سے بہترین معنیٰ ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے فرماتے ہیں :۔

" ای من تلقآء نفسہٖ من غیر تتبّع اقوال الائمۃ من اھل اللّغۃ والعربیۃ المُطابقۃ للقواعد الشرعیۃ بل بحسب مایقتضیہ عقلہ (مرقات ص ۲۹۱ ج ۱)

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ تفسیر بالرأی وہ ہے جس کی بنیاد حدیثِ نبویؐ اور صحابہ کرامؓ و تابعینؒ کے اقوال و افعال اور ائمہ مفسرینؒ کی نقل پر نہ ہو اور نہ ہی وہ قواعد عربیہ مشہورہ کے مُوافق ہو اور نہ ہی سیاق و سباق کے مُوافق ہو یہ حرام ہے مثلاً " وَوَرِثَ سُلَیْمَانُ دَاوٗدَ (پ ۱۹) کے یہ معنیٰ کہ اس سے حضرت علیؓ کی علمی وراثت مراد ہے یا جنابت سے راز کا افشاء اور غسل سے عہد و پیمان کی تجدید مراد ہے اور اس قسم کے دوسرے خُرافات ہیں ۔

قولہٗ بِغَیْرِ عِلْمٍ : مُحدّثینؒ نے بحث کی ہے کہ رأی ہوتی بغیر علم کے ہے جس کے پاس کم علم ہوتا ہے وہی عقل لڑاتا ہے دین میں ۔ ولھٰذا بِغَیْرِ عِلْمٍ کیوں کہا ؟ اس لیے یہاں عبارت مُقدّر ہے " بغیر علمٍ ای دلیل یقینی او ظنی اَوْ عَقْلی مُطابق للشرعی ۔ محدثینؒ نے اس کی مثال یوں بیان کی ہے کہ جس کے اندر تفسیر کی اہلیت نہ ہو اُس کا تفسیر کرنے کی جرأت کرنا ہی غلط ہے ۔ خواہ اس کی بیان کردہ تفسیر صحیح ہی کیوں نہ ہو ۔ یہ ایسے ہے جیسے اگر کوئی غیر مستند طبیب کسی کا علاج کرے اور مریض صحّت یاب بھی ہو جائے تب بھی اُس کے خلاف قانونی کارروائی کی جا سکتی ہے یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ اس کے علاج سے کتنے مریض شفایاب ہو چکے ہیں کیونکہ یہ غیر مستند ہوتے ہوئے کسی کا علاج کر کے ایسا راستہ اختیار کیا ہے کہ جس میں ہلاکت کا خطرہ زیادہ ہے ایسے ہی جس شخص کو علمائے وقت تفسیر کا اہل نہ سمجھتے ہوں اگر یہ قرآن کی تفسیر کرتا ہے تو اس کا یہ اقدام ہی غلط ہے ۔ اس نے تفسیر کی جرأت کر کے انتہائی خطرناک

راستہ اختیار کیا ہے۔

وَعَنْ جُنْدُبٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ قَالَ فِی الْقُرْاٰنِ بِرَأْیِہٖ فَاَصَابَ فَقَدْ اَخْطَأَ

ترجمہ: روایت ہے حضرت جُندبؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جو قرآن میں اپنی رائے سے کہے پھر ٹھیک بھی کہدے تب بھی خطاء کر گیا۔

قولہٗ فَاَصَابَ: ای وافق۔

خُلاصَۃُ الحَدِیْث

یعنی یہ تفسیر کا طریقہ شریعت کے خلاف ہے اور آئندہ چل کر تفسیر کے غلط ہونے کا احتمال ہے لہذا ع خطا اگر راست آید تاہم خطا است۔ تو لیسے آدمی کو مصیب ہونے کے باوجود شرعًا مخطی ہی کہیں گے۔ اور اس کے برعکس مجتہد کو باوجود خطاء کے مأجور کہیں گے کیونکہ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے اپنی رائے سے نہیں بلکہ شریعت کی ہدایت کے مطابق کرتا ہے یعنی اصَابَ اور خطاء کا محل علیحدہ علیحدہ ہے اصَابَ کا محل حکم و نتیجہ اور خطاء کا محل طریقہ ہے مطلب یہ ہوگا کہ نتیجہ میں صواب کو پہنچ گیا لیکن راہ غلط ہے کہ قوانین شرعیہ کو چھوڑ کر اپنی طرف سے تفسیر کی ہے۔

ثانیًا: اس جیسی احادیث کا یہ مطلب نہیں کہ بدوں حدیث کے روشنی کے مُطلقًا قرآن کی تفسیر کر ہی نہیں سکتے بلکہ ایسی تفسیر جو سیاق و سباق کے خلاف نہ ہو قواعد عربیّت پر مبنی ہو تو ہر زمانہ کے علماء کا اس کے جواز پر اتفاق رہا ہے۔ کما فی قولہٖ تعالیٰ "لَعَلِمَہُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْبِطُوْنَہٗ مِنْھُمْ" (پ٥)

اسمائے رجال

حالات حضرت جُندبؓ — یہ جُندب عبداللہ کے بیٹے سُفیان بجلی عَلَقی کے پوتے ہیں

وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رضؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْمِرَاءُ فِى الْقُرْاٰنِ كُفْرٌ:

ترجمہ: روایت ہے حضرت ابوہریرہؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ قرآن میں جھگڑنا کفر ہے۔

قولہٗ اَلْمِرَآءُ: مِرَآء سے کیا مراد ہے؟ اس میں مختلف قول ہیں۔

قول اوّل: مِرَاء سے مراد متشابہات میں بحث کرنا ہے جب کہ شریعت متشابہات میں بحث کرنے سے روکتی ہے یہ فتنہ پرداز لوگوں کا کام ہے۔

قول دوم: قرآن مقدس کے مضامین میں شک کرنا ہے "قَالَ اللّٰهُ تعالیٰ فَلَا تَكُ فِىْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ" (پ۱۲)

قول سوم: شرح السنۃ میں ہے کہ مِرَاء سے مراد قرأت صحیحہ کا انکار کرنا ہے، حالانکہ سب قرأت مُنَزَّل من اللہ ہیں ان پر ایمان لانا واجب ہے۔

قول چہارم: علامہ قاضی بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ مِرَآء سے مراد تدار ہے یعنی مختلف آیات سے کر بعض کا بعض سے رد کرے جس سے مقصود تکذیب القرآن بالقرآن ہو۔ لہذا قرآن مقدس کا مطالعہ کرنے والے کو چاہیے کہ بظاہر متعارض آیات میں تطبیق دے اگر کہیں اشکال پیش آئے تو اپنی سوءِ فہم کا قصور سمجھے۔

یقول ابوالاسعاد خلاصۃً: قرآن مقدس میں ایسا بحث مباحثہ کیا جائے کہ جس سے قرآن مقدس کا انکار لازم آتا ہو وہ کفر ہے۔ مگر حدیث مذکور میں مطلقاً بحث کرنے کو کفر کہا گیا ہے یہ بطور انجام ومآل کے ہے کہ فضول بحث انسان کو کفر تک پہنچا دیتی ہے اسی کو کہا گیا ہے اَلْمِرَآءُ فِى الْقُرْاٰنِ كُفْرٌ۔

علقمہ قبیلہ بجیلہ کی ایک شاخ ہے اور بجیلہ میں کچھ لوگ ہیں جنکو قسر کہا جاتا ہے قاف کے زبر اور سین کی جزم کے ساتھ یہ لوگ خالد بن عبداللہ القسری کا خاندان ہے۔ فتنہ حضرت عبداللہ بن زبیر میں اس سے چار سال کے بعد وفات پائی ان سے ایک جماعت نے روایت کی ہے۔ جُندب میم کے ضمہ اور نون کے جزم کے ساتھ ہے دال کا پیش اور زبر دونوں صحیح ہیں۔

وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِیْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ سَمِعَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَوْمًا یَتَدَارَؤُنَ فِی الْقُرْاٰنِ فَقَالَ اِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِهٰذَا

ترجمہ : روایت ہے حضرت عمرو بن شعیبؓ سے وہ اپنے والد سے وہ اپنے دادا سے راوی فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جماعت کو قرآن پاک میں جھگڑا کرتے سنا تو فرمایا کہ اس حرکت سے تم سے پہلے لوگ ہلاک ہو گئے۔

قولہ یَتَدَارَؤُنَ : ای یختلفون فیہ ۔ عند البعض یتدافعون کے معنی میں بھی ہے یعنی ایک دوسرے پر دفع کرنا۔

قولہ مَنْ : اس سے یہود و نصاریٰ مراد ہیں۔

قولہ بِھٰذَا : اسم اشارہ ہے اس سے تحقیر و تعظیم دونوں مراد ہیں یعنی ضرر حقیر و عظیم۔

قولہ ضَرَبُوْا : ضرب سے مراد رد کرنا اور تناقض پیدا کرنا ہے یا ضرب سے مراد خلط ملط کرنا ہے کہ محکم و متشابہ ناسخ و منسوخ میں امتیاز نہ کرے۔

قولہ کِتَابُ اللّٰہِ : اس سے جنس کتاب مراد ہے کوئی خاص کتاب نہیں۔ جو بھی مُنزل من اللہ ہو۔

قولہ وَمَا جَھِلْتُمْ : جہل سے مُراد عدم علم و تحقیق بھی ہے یا جہالت کا تعلق مُتشابہات سے ہے لَا یَعْلَمُهٗ اِلَّا اللّٰهُ ۔

قولہ فَکِلُوْہُ : ای فَوِّضُوْہُ بمعنی سونپ دینا۔

قولہ اِلٰی عَالِمِہٖ : عالم سے مراد رب ذوالجلال کی ذات بابرکات بھی ہے اور اہلِ علم بھی مراد ہیں جو ان سے فائق و لائق ہوں۔

يَتَدَارَءُوْنَ فِي الْقُرْاٰنِ ۔ ضَرَبُوا كِتَابَ اللّٰهِ بَعْضَهٗ بِبَعْضٍ کی تشریح

ان جملوں کے مطلب وتشریح میں دو قول ہیں۔

قول اوّل : علامہ قاضی بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ تکذیب کے ارادہ سے بعض آیات کو بعض آیات سے ٹکرایا جائے اور تعارض وتناقض ثابت کیا جائے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ جن آیات میں بظاہر تناقض معلوم ہو ان میں تطبیق دینے کی کوشش کرے۔ چنانچہ حضرت ابن عباسؓ سے بظاہر متعارض آیات کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے تطبیق دی۔ مثلاً قیامت میں مشرکین کا اپنا حال چھپانا۔ کما قال اللہ تعالیٰ " وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَاكُنَّا مُشْرِكِيْنَ (پ۷) اور ان کا اپنے حال کو ظاہر کرنا" کما قال اللّٰہُ تعالیٰ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا (پ۵) تو حضرت ابن عباسؓ نے جواب دیا کہ کتمان زبان سے ہوگا اور اظہار دوسرے اعضاء سے ہوگا فلا تعارض۔

قول دوم : حضرت شاہ ولی اللہ دھلویؒ حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں کہ ایک شخص اپنے مذہب کی تائید میں ایک آیت پیش کرے اور دوسرا شخص اس کے خلاف دوسری آیت پیش کرے اور پہلی آیت کی تکذیب وتردید کرے تطبیق اور اظہار حق مقصود نہ ہو بلکہ محض اپنے مسلک کی تائید مقصود ہو یہ طریقہ موجبِ ہلاکت اور باطل وغلط ہے۔

وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُنْزِلَ الْقُرْاٰنُ عَلٰى سَبْعَةِ اَحْرُفٍ :

ترجمہ : روایت ہے حضرت ابن مسعودؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ قرآن سات طریقوں پر اترا۔

یقول ابوالاسعاد : حدیث پاک کے دو جزو ہیں :-

اوّل : اُنْزِلَ الْقُرْاٰنُ عَلٰی سَبْعَةِ اَحْرُفٍ۔

دوم : لِكُلِّ اٰيَةٍ مِّنْهَا ظَهْرٌ وَّبَطْنٌ وَلِكُلِّ حَدٍّ مُّطَّلَعٌ۔

اوّلاً جزء اوّل کی بحث ہوگی، ثانیاً جزء ثانی کی یہاں تین مباحث ہیں۔

۱ تشریح سبعہ احرف ۲ حکمت سبعہ احرف ۳ حیثیتِ حدیث سبعہ احرف۔

اَلْبَحْثُ الْاَوَّل ــ حیثیت حدیث سبعہ اَحرف

حدیث مذکورہ (سبعة اَحرف) معنیٰ کے اعتبار سے متواتر ہے چنانچہ مشہور محدّث امام ابوعبید قاسم بن سلام نے اس کے تواتر کی تصریح کی ہے اور حدیث وقرأت کے مشہور امام علّامہ ابن الجزریؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک مستقل کتاب (جزء) میں اس حدیث کے تمام طُرق جمع کیے ہیں اور ان کے مطابق یہ حدیث حضرت عمر[1] بن الخطاب، ہشام[2] بن حکیم بن حزام عبد[3] الرحمٰن بن عوف، اُبی[4] ابن کعب، عبد[5] اللہ بن مسعود، معاذ[6] بن جبل، ابوہریرہ[7] عبد[8] اللہ بن عباس، ابوسعید[9] خدری، حذیفہ[10] بن یمان، ابوبکرہ[11]، عمرو[12] بن عاص، زید[13] بن ارقم انس[14] بن مالک، سمرہ[15] بن جندب، عمر[16] بن ابی سلمہؓ۔ ابوجہم[17]، ابوطلحہ[18] اور اُمّ[19] ایوب انصاریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مروی ہے (النشر فی القرآت العشر ص۲۱ ج۱)

ان کے علاوہ متعدد محدثینؒ نے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عثمانؓ بن عفان نے منبر پر یہ اعلان فرمایا کہ وہ تمام حضرات کھڑے ہوجائیں جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سُنی ہو کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل کیا گیا ہے۔ چنانچہ صحابہ کرامؓ کی اتنی بڑی جماعت کھڑی ہوگئی جسے شمار نہیں کیا جا سکتا تھا۔

(البرہان فی علوم القرآن للزرکشی ص۲۱۲ ج۱)

اَلْبَحْثُ الثَّانِی ــ حروف سبعہ کا مفہوم

یہ بڑی معرکۃ الآراء اور طویل الذیل بحث ہے۔ محدثین حضراتؒ نے حدیث سبعہ احرف کو مشکل الآثار میں شمار کیا ہے۔ اور مشکل الآثار ایسی حدیث کو کہا جاتا ہے جس کے معانی

کی تعیین میں بہت احتمالات ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے اپنی تفسیر الاتقان فی علوم القرآن ص۴۵ ج۱ میں چالیس کے قریب اقوال نقل کیے ہیں۔ جب کہ علامہ محمود آلوسیؒ نے روح المعانی میں سات قول نقل کیے ہیں۔

یقول ابوالاسعاد : اصالتاً اختلاف کی وجہ خود لفظ اَحرُف ہے کیونکہ لغت کے اندر اس کے بہت معانی آتے ہیں مثلاً کبھی لفظ احرف طرف وکنارہ کے معنیٰ میں مستعمل ہوتا ہے، کبھی اسم وفعل کے مقابلہ میں آتا ہے کبھی اس سے حروف تہجی مراد ہوتے ہیں لیکن علامہ منذریؒ فرماتے ہیں کہ اکثر اقوال ضعیف وغیر مختار ہیں۔ یہاں پورے اقوال نقل کرنا مشکل ہے البتہ قابل اعتبار چند اقوال کے نقل کرنے پر اکتفار کر رہا ہوں :-

(مَنْ شَآءَ فَلْيَاخُذْ وَمَنْ شَآءَ فَلْيَتْرُكْ)

قول اوّل : بعض حضرات کے نزدیک سَبعَۃ اَحرُف سے مراد سات قاریوں کی قرأتیں ہیں لیکن یہ خیال تو بالکل غلط اور باطل ہے کیونکہ قرآن کریم کی متواتر قرأتیں ان سات قرأتوں میں منحصر نہیں ہیں بلکہ اور بھی متعدد قرأتیں تواتر کے ساتھ ثابت ہیں سات قرأتیں تو محض اس لیے مشہور ہوگئیں کہ علامہ ابن مجاہدؒ نے ایک کتاب میں ان سات مشہور قراء کی قرأتیں جمع کردی تھیں نہ ان کا مقصد تھا کہ قرأتیں کل سات میں منحصر ہیں۔

قول دوّم : بعض حضرات کے نزدیک حروف سے مراد تمام قرأتیں ہیں سات کے لفظ سے سات کا مخصوص عدد مراد نہیں ہے بلکہ اس سے مراد کثرت ہے اور عربی زبان میں سات کا لفظ محض کسی چیز کی کثرت بیان کرنے کے لیے اکثر استعمال ہوتا ہے ۲ دو مثالیں ملاحظہ فرمائیں :-

مثال اوّل : جیساکہ حدیث اَلْاِیْمَانُ بِضْعٌ وَّسَبْعُوْنَ شُعْبَۃً میں لفظ سبعہ سے عدد کامل ہونا مراد ہے بالتفصیل مسئلہ گزر چکا ہے۔

مثال دوّم : کَمَا فِی قَولِہٖ تعالیٰ « مِنْ بَعْدِہٖ سَبْعَۃُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ کَلِمٰتُ اللّٰہِ (پ۲۱)

تو یہاں پر سات بحر کی تخصیص نہیں بلکہ تکثیر مراد ہے تو یہاں بھی حدیث کا مقصد یہ نہیں ہے کہ قرآن کریم جن حروف پر نازل ہوا وہ مخصوص طور پر سات ہی ہیں۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ قرآن کریم

بہت سے طریقوں پر نازل ہوا ہے۔ علماء متقدمین میں قاضی عیاضؒ کا یہی مسلک ہے اور آخری دور میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ نے بھی یہی قول اختیار کیا ہے۔ (مصفیٰ شرح مؤطا صـ۱۸۷ ج ۱)

قول سوم : حافظ ابن جریر طبریؒ فرماتے ہیں کہ حدیث میں سات حروف سے مراد قبائلِ عرب کی سات لغات ہیں چونکہ اہلِ عرب مختلف قبائل سے تعلق رکھتے تھے اور ہر قبیلہ کی زبان عربی ہونے کے باوجود دوسرے قبیلہ سے تھوڑی تھوڑی مختلف تھی۔ اور یہ اختلاف ایسا ہی تھا جیسے ایک بڑی زبان میں علاقائی طور پر تھوڑے تھوڑے اختلافات پیدا ہوجاتے ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان مختلف قبائل کی آسانی کے لیے قرآن کریم سات لغات پر نازل فرمایا تاکہ ہر قبیلہ اسے اپنی لغت کے مطابق پڑھ سکے۔ امام ابوحاتم سجستانیؒ نے ان کے نام بھی متعین کر دیے ہیں :۔

قریش[۱] ۔ ھذیل[۲] ۔ بنوتمیم[۳] ۔ طی[۴] ۔ ہوازن[۵] ۔ ثقیف[۶] ۔ ربیعہ[۷] ۔

قول چہارم : بعض حضرات فرماتے ہیں کہ سبعہ احرف سے مراد سات اقالیم ہیں یعنی قرآن پاک پوری دنیا کے لیے نازل کیا گیا تاکہ اقالیم سبعہ پر قرآن پاک کا حکم جاری ہوسکے اور پوری دنیا کی تقسیم سات اقالیم پر کی گئی ہے۔

قول پنجم : سبعہ احرُف سے مراد قرآن کریم کے سات مضامین ہیں۔ امر۔ نہی۔ قصص امثال۔ وعید۔ وعدہ۔ وعظ۔ بعض نے سات مضامین کی تفسیر یوں کی ہے :۔

عقائد۔ احکام۔ اخلاق۔ قصص۔ امثال۔ وعد۔ وعید۔

قول ششم : سبعہ اَحرُف کی راجح ترین تشریح

سب سے پہلے تشریح اور تعبیر یہ ہے کہ حدیث میں حروف کے اختلاف سے مراد قرأتوں کا اختلاف ہے اور سات حروف سے مراد اختلاف قراءات کی سات نوعتیں ہیں چنانچہ قرائتیں تو اگرچہ سات سے زائد ہیں لیکن ان قرأتوں میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں وہ سات اقسام میں منحصر ہیں چنانچہ مشہور مفسرِ قرآن علامہ نظام الدین قمی نیشاپوری اپنی تفسیر

غرائب القرآن میں لکھتے ہیں کہ سبعہ احرف کے بارے میں امام مالکؒ کا یہ مذہب منقول ہے کہ اس سے مراد قراءات میں مندرجہ ذیل سات قسم کے اختلافات ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

اوّل[1]: مفرد اور جمع کا اختلاف: کہ ایک قرأت میں لفظ مفرد آیا ہو اور دوسری میں صیغہ جمع مثلاً "وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ اور كَلِمَاتُ رَبِّكَ"۔

دوم[2]: تذکیر و تانیث کا اختلاف جیسے لَا يُقْبَلُ لَا تُقْبَلُ۔

سوم[3]: وجوہِ اعراب کا اختلاف: کہ زیر و زبر وغیرہ بدل جائیں مثلاً هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ اور غَيْرِ اللّٰهِ

چہارم[4]: صرفی ہیئت کا اختلاف: جیسے "يَعْرِشُوْنَ يَعْرُشُوْنَ"۔

پنجم[5]: ادوات (حروف نحویہ) کا اختلاف: جیسے لٰكِنَّ الشَّيَاطِيْنَ اور لٰكِنِ الشَّيٰطِيْنُ۔

ششم[6]: لفظ کا ایسا اختلاف جس سے حروف بدل جائیں: جیسے نُنْشِزُهَا اور نُنْشِرُهَا۔

ہفتم[7]: لہجوں کا اختلاف: جیسے تخفیف، تفخیم، امالہ، مد، قصر، اظہار، ادغام وغیرہ۔ پھر یہی قول علامہ ابن قتیبہؒ امام ابو الفضل رازیؒ اور محقق ابن الجزریؒ نے اختیار فرمایا ہے۔ محقق ابن الجزریؒ جو قرأت کے مشہور امام ہیں اپنا یہ قول بیان کرنے سے قبل تحریر فرماتے ہیں۔

"میں اس حدیث کے بارے میں اشکالات میں مبتلا رہا اور اس پر تیس[30] سال سے زیادہ غور و فکر کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر اس کی ایسی تشریح کھول دی جو ان شاء اللہ صحیح ہوئی۔ (النشر فی القراءات العشر ص۲۶ ج ۱)

البحث الثالث[3] ۔ حکمت سبعہ احرف

علامہ فضل اللہ بن حسین تورپشتیؒ فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کی بعثت کافۃ الناس کی طرف ہوئی مگر اوّلین مخاطب اہل عرب کو بنایا گیا اور پورے عالم کی اصلاح کے لیے

عرب کا انتخاب کیا گیا کہ اگر ان کو ہدایت مل گئی تو پورے عالَم کی ہدایت ہوجائے گی اور ان کو منتخب کرتے کی کئی وجوہات ہیں۔

اوّلؔ : بعض حضرات کے نزدیک نظر انتخاب ان کا اس لیے ہوا کہ ان میں برائی زیادہ تھی۔

دوّمؔ : بعض حضرات کے نزدیک جیسے ان کے اندر بُرائیاں زیادہ تھیں اسی طرح محاسنِ اخلاق بھی ان میں بہت زیادہ تھے، دوسروں میں ایسا نہیں تھا۔

سوئمؔ : ساری دنیا محکوم یعنی ایران وروم کے ماتحت تھی۔ جب کہ اہل عرب بالکل آزاد تھے۔ اس لیے ان میں اصلی فطرت باقی تھی۔ دین کا اثر ان کے دلوں میں پہنچانا آسان تھا بہ نسبت دوسروں کے۔

چہارمؔ : عربی زبان میں جو لطافت ومزہ ہے دوسری زبانوں میں نہیں ہے۔

ان وجوہات کی بناء پر اہلِ عرب کو حاملِ قرآن ودین بنایا اور ان کی اصلاح پہلے کی جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں "

اِنَّ اللّٰہَ اَرَادَ اِصْلَاحَ الْعَالَمِ بِاِصْلَاحِ الْعَرَبِ"

اس کے بعد عرب میں دو قسم کے لوگ تھے ۱ شہری ۲ جنگلی وبدوی۔ ان دونوں کی زبان الگ الگ تھی انہی سے سات قبائل مشہور ہو گئے اور ہر ایک کی زبان الگ تھی۔ اگرچہ معانی مختلف نہیں ہوتے تھے۔ ادھر ہر ایک اپنی زبان کے عادی تھے دوسروں کی زبان ادا نہیں کرسکتے تھے تو ابتداء میں قرآن کریم لغت قریش میں نازل کیا گیا پھر موسم حج میں لوگ اطراف واکناف سے آتے تھے تو عرب جس لفظ کو اچھا سمجھتے اپنی زبان میں داخل کرلیتے جس کی وجہ سے قرآن مقدس کو ایک لغت میں پڑھنا مشکل ہو گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاء پر اللہ تعالیٰ نے مشہور سات لغات میں پڑھنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ طحاوی شریف میں حضرت ابیؓ بن کعب سے روایت ہے کہ ایک دفعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قبیلہ بنی غفار میں تشریف فرما تھے اتنے میں حضرت جبرائیل علیہ السلام تشریف لائے۔ فرمایا اللہ تعالیٰ حکم کرتا ہے ایک لغت میں قرآن پڑھنے کا تو آپؐ نے فرمایا کہ میری امت مختلف اللغات ہیں ایک لغت میں مشکل ہوگا تو

دو کی اجازت دی گئی۔ اس پر بھی آپؐ نے مشکل کا اظہار فرماتے ہوئے سات لغت کی اجازت دی گئی۔ اور فرمایا أُنْزِلَ الْقُرْآنُ عَلٰى سَبْعَةِ أَحْرُفٍ اور یہ سلسلہ حضرت عثمان غنیؓ کے دورِ خلافت تک جاری رہا۔ آپ کی خلافت میں اسلامی حکومت کا دائرہ وسیع ہو چکا تھا اور کثرت سے عجمی لوگ مسلمان ہو گئے تھے تو پھر دور دراز کے علاقوں میں اختلاف لغات کی بناء پر جھگڑے ہونے لگے۔ اس لیے حضرت عثمان غنیؓ نے پچاس ہزار صحابہ کرامؓ کے اجماع سے قرآن مقدس کی حفاظت کے لیے اس عارضی اجازت کو ختم کر دیا اور محض لغت قریش کے موافق چند نسخے لکھوا کر تمام ممالک اسلامیہ میں بھیج دیے۔ اور باقی لغات میں غیر فصیح لغات کو ختم کر دیا جو قریش کے نزدیک معتبر نہ تھے۔

قولہٗ لِكُلِّ اٰيَةٍ مِنْهَا ظَهْرٌ وَ بَطْنٌ۔ اس کے مختلف مطلب بیان کیے گئے ہیں:۔

اوّل: ظَهَرَ سے مراد لفظ اور بطن سے مراد معنٰی ہے یعنی قرآن مقدس کے جو الفاظ ہیں ان کے معانی بھی ہیں کوئی ایسا لفظ نہیں جس کا معنٰی نہ ہو۔

دوم: ظَهَرَ سے مراد وہ معانی ہیں جو مفسرینؒ بیان کرتے ہیں اور بطن سے مراد وہ احکام ہیں جو ائمہ مجتہدینؒ مستنبط کرتے ہیں۔

سوم: ظَهَرَ سے مراد ظاہری احکام اور معانی ہیں اور بطن سے مراد وہ اسرار و دقائق ہیں جو اصحابِ معرفت بیان کرتے ہیں۔

چہارم: ظَهَرَ سے تلاوت مراد ہے اور بطن سے اس میں تفکر و تدبر کرنا مراد ہے اور بھی بہت احتمالات ذکر کیے گئے ہیں "مَنْ شَاءَ فَلْيُطَالِعْ إِلَى كُتُبِ الْمُطَوَّلِ"۔

قولہٗ وَلِكُلِّ حَدٍّ مُطَّلَعٌ۔ بِتَشْدِيدِ الطَّاءِ وَفَتْحِ اللَّامِ۔ اطلاع پانے کی جگہ مراد ہے۔

حاصل یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے جو احکام بیان کیے ہیں ان تک پہنچنے کے راستے اور جگہیں قرآن حکیم میں موجود ہیں جو کسی حکم کی جگہ پر پہنچ جاتے

وہ اس حکم کو سمجھ بھی جاتا ہے چنانچہ علماء حضرات نے لکھا ہے کہ ظھر کی جائے اطلاع علم عربیت ہے اور علم شانِ نزول و ناسخ و منسوخ۔ اور وہ تمام علوم ہیں جن سے قرآن کریم کے ظاہری معنیٰ تعلق رکھتے ہیں اور بَطن کی جائے اطلاع ریاضت و مجاہدہ و تزکیہ نفس ہے۔

وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْعِلْمُ ثَلَاثَةٌ اٰيَةٌ مُحْكَمَةٌ اَوْ سُنَّةٌ قَائِمَةٌ اَوْ فَرِيْضَةٌ عَادِلَةٌ وَمَا كَانَ سِوٰى ذٰلِكَ فَهُوَ فَضْلٌ۔

ترجمہ: روایت ہے حضرت عبداللہ بن عمرو سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ علم تین ہیں۔ ظاہر آیتیں ثابت و مضبوط سنت ان کے برابر فریضہ جو ان کے سوا ہیں وہ زیاتی ہے۔

قولہٗ اَلْعِلْمُ: اَلْعِلْمُ میں الف لام عہد خارجی کا ہے مراد وہ علم ہے جو علومِ دینیہ میں اصل ہے۔

قولہٗ اٰيَةٌ مُحْكَمَةٌ: خبر ہے مبتدا محذوف کی ای احدھما مُحْكَمَةٌ اس سے مراد قرآن مقدس کی وہ آیات ہیں جن کا حکم منسوخ نہ ہوا ہو اور اس کی مراد بھی واضح ہو۔

قولہٗ اَوْ سُنَّةٌ قَائِمَةٌ: اس سے مُراد وہ احادیث ہیں جن کا ثبوت صحیح طریقہ سے ہو چکا ہو۔ صحابیؓ کا قول بھی سُنَّةٌ قَائِمَةٌ میں داخل ہے۔

قولہٗ اَوْ فَرِيْضَةٌ عَادِلَةٌ: اس کی تشریح میں مُتعدد اقوال ہیں:۔

اوّل: عند البعض اس سے مُراد ورثاء کے حصص ہیں۔

دوم: حضرت عبداللہ بن عروہ سے منقول ہے کہ فریضہ عادلہ سے مراد اجماع ہے۔

سوم: عند الجمہور فریضہ عادلہ سے مراد اجماع و قیاس دونوں ہیں۔

سوال : ان کو فریضہ سے کیوں تعبیر کیا اس کی وجہ کیا ہے ؟

جواب : فریضہ اس لیے کہا گیا ہے کہ کتاب وسُنّت کی طرح یہ بھی دونوں واجبُ العمل ہیں۔

سوال : عادلہ کیوں کہا ؟

جواب : عادلہ بمعنیٰ مساویہ ہے یہ دونوں واجب العمل ہونے میں کتاب و سُنّت کے مساوی ہیں اور یہ مساوات نفس وجوب عمل میں ہے مرتبہ وجوب میں نہیں۔

قولہٗ وَمَا كَانَ سِوَىٰ ذَالِكَ : ای المذکور الثلاثۃ۔

قولہٗ فَهُوَ فَضْلٌ ۔ فَضْلٌ بمعنیٰ زائد، اور زائد ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ دلیل شرعی نہیں بنے گا۔ اس سے مَاعَدَا ذَالِكَ کا ناجائز ہونا لازم نہیں آتا۔

خُلاصَۃُ الحَدِیث

یہ ہے کہ حدیث باب میں جن علوم کا ذکر ہے ان کا جاننا ضروری ہے اور ان کو حاصل کرنا فرض کفایہ ہے اور کوئی شہر ان علوم کے حامل عالم سے خالی نہیں ہونا چاہیے کیونکہ یہ علومِ دین کے لیے موقوف علیہ ہیں اس کے علاوہ باقی علوم دینیہ فضیلت ومستحب کے زمرہ میں آتے ہیں ؎

علم دین فقہ است تفسیر وحدیث ہر کہ جوید غیر ازیں باشد خبیث

وَعَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ الْاَشْجَعِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَقُصُّ اِلَّا اَمِيْرٌ اَوْ مَاْمُوْرٌ اَوْ مُخْتَالٌ :

ترجمہ : روایت ہے حضرت عوفؓ بن مالک اشجعی سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم نے کہ قصہ گوئی نہیں کرتے مگر حاکم یا محکوم یا متکبر۔

قولہٗ لَا يَقُصُّ : قَصَّ يَقُصُّ بمعنیٰ وعظ کہنا۔ اس لیے واعظ کو قاص کہتے ہیں اور لَا يَقُصُّ میں لانفی کے لیے ہے نہی کے لیے نہیں کیونکہ نہی والا معنیٰ درست

نہیں نہی میں مطلب ہوگا کہ وعظ کی اجازت کسی کو نہیں۔ مگر امیر، مأمور و مختال یعنی مُدّعی یعنی شریعت مُتکبّر کو بھی وعظ کی اجازت دیتی ہے۔ جب کہ مُتکبّر کو شریعت اجازت نہیں دیتی۔ تشریح کما سیأتی۔

قولہٗ اَمیرٌ : ای حاکمٌ۔

قولہٗ مأمورٌ : ای مأذونٌ۔ اور مأذون عام ہے حاکم کی طرف سے ہو یا عند اللہ جیسے علماء والاولیاء :

قولہٗ مُختالٌ : مُفتخر و مُنکر جو حکومت و ریاست کا طالب ہو۔

خُلاصۃُ الحدیث

یہ ہے کہ وعظ تین آدمیوں کو کرنا چاہیے۔ امیر وقت کا حاکم کیونکہ وہ رعیّت پر سب سے زیادہ مہربان ہوتا ہے۔ اور رعایا کی اصلاح کے لیے مأمور بخوبی جانتا ہے۔ اگر حاکم خود وعظ نہ کہے (کما فی زمننا) تو وہ جس شخص کی صلاحیّت کو دیکھ کر اس کام کے لیے مُقرّر کرے جس کو مأمور سے تعبیر کیا گیا ہے اور وہ بھی علماء سے ان دو کے علاوہ جو شخص بھی وعظ کہے گا وہ مُتکبّر ہوگا۔ دوسری روایت میں مختال کے بجائے مُراءٍ ہے یعنی ریاکار۔

یقول ابوالاسعاد : آج کل خلافتِ صحیحہ نہیں ہے اور نہ ہی حکومتوں کی طرف سے عمومًا ایسے امور کا اہتمام کیا جاتا ہے اس لیے آج کل سمجھ میں یہ آتا ہے کہ وقت کے مشائخ اور علماء بمنزلہ امیر کے ہیں (اس حکم میں) اور جن کو مشائخ اور محققین وقت وعظ کا اہل سمجھیں وہ بمنزلہ مأمورین کے ہیں۔ ان کے علاوہ باقی مختال اور مرائی ہیں۔

وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اُفْتِیَ بِغَیْرِ عِلْمٍ کَانَ اِثْمُهٗ عَلٰی مَنْ اَفْتَاهُ وَمَنْ اَشَارَ عَلٰی اَخِیْهِ بِاَمْرٍ یَعْلَمُ اَنَّ الرُّشْدَ فِیْ غَیْرِهٖ

ترجمہ : روایت ہے حضرت ابوہریرہؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جو بے علم فتوٰی دے اس کا گناہ فتوٰی دینے والے پر ہے اور جو اپنے بھائی کو کسی چیز کا مشورہ یہ جانتے ہوئے دے کہ درستی اس کے علاوہ میں ہے تو

فَقَدْ خَانَهُ :	اس نے اس کی خیانت کی۔

قولہٗ مَنْ اُفْتِیَ : اس کے دو مطلب ہیں :۔

اوّل : جو شخص علماء کو چھوڑ کر جاہلوں سے مسئلہ پوچھے اور وہ غلط مسئلہ بتائیں تو پوچھنے والا بھی گنہ گار ہوگا کہ یہ علماء کو چھوڑ کر جہلاء کے پاس کیوں گیا نہ یہ پوچھتا نہ وہ غلط بتاتا اس صورت میں اَفْتِیَ بمعنیٰ اِسْتَفْتٰی ہے۔

دوم : جس شخص کو غلط فتویٰ دیا گیا تو اس کا گناہ فتویٰ دینے والے پر ہے اس صورت میں اُفْتِیَ مجہول ہوگا۔

خلاصہ : یہ ہے کہ اگر کوئی مفتی کسی مستفتی کو غلط مسئلہ بتا دیتا ہے اور وہ غلط عمل کرتا ہے تو اس کا گناہ مستفتی کو نہیں ہوگا بلکہ صرف مفتی کو ہوگا یہ اس وقت ہے جب کہ مستفتی مستند مفتی سے مسئلہ پوچھے اور لاپرواہی کی وجہ سے غیر تحقیقی جواب دیدے اگر مستفتی نے مسئلہ ہی کسی غیر مستند سے پوچھا ہے تو اب مستفتی کو بھی گناہ ہوگا۔

شرائطِ مستند مفتی

اس سند مبارک کے لیے محدثین حضرات نے مختلف شرائط لکھی ہیں لیکن علامہ فضل اللہ بن حسین تورپشتیؒ فرماتے ہیں کہ چار شرائط کا ہونا مفتی کے لیے واجب ہے۔ ورنہ وہ مفتی نہیں بلکہ مضلّی اور ذئب الامت ہے۔

اوّل : مستند مفتی وہ ہے جس کو وقت کے مشائخ اور محققینِ امت افتاء کا اہل سمجھیں

دوم : علم الفرائض میں مہارت تامہ رکھتا ہو۔

سوم : جس پر خوفِ خدا غالب ہو۔

چہارم : اخلاقِ حمیدہ کا مالک ہو کہ خلقِ خدا اگر سائل بن کر آئے تو خندہ پیشانی سے پیش آئے۔

اسی طرح مفتی کے گنہگار ہونے کی بھی دو شرطیں ہیں :۔

اوّل : وہ عالم نہیں۔ یعنی مفتی کا مادہ اشتقاق (مفت) سے ہے مفت چہ باید گفت۔

دوم : عالم ہے مگر اچھی طرح تحقیق کیے بغیر فتویٰ دیتا ہے۔

قولہٗ وَمَنْ اَشَارَ : ای طَلَبَ الْمَشْوَرَۃَ ۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ جب لفظ اَشَارَ مُتعدی بعلیٰ ہو تو وہ مشورہ کے معنیٰ میں آتا ہے یعنی کَیْفَ افعل ھٰذَا الامْرَ

قولہٗ فِیْ غَیْرِہٖ : اَیْ غَیْرِ مَا اَشَارَ اِلَیْہِ یعنی جو مشورہ وہ دے رہا ہے اس میں خیر نہیں۔ اس کے غیر میں خیر ہے۔

قولہٗ خَانَہٗ ۔ ای خَانَ الْمُسْتَشَارُ الْمُسْتَشِیْرَ : یعنی مشورہ دینے والے (مُسْتَشَار) نے مشورہ لینے والے (مُسْتَشِیْر) سے خیانت کی ہے کیونکہ حدیث پاک میں ہے "اِنَّ الْمُسْتَشَارَ مُؤْتَمَنٌ" مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے اپنے کسی بھائی کی بدخواہی اس طرح چاہی کہ اسے اس چیز کا مشورہ دیا جس کے بارہ میں اسے معلوم ہے کہ اس کی بھلائی اس میں نہیں ہے بلکہ دوسرے امر میں ہے تو یہ اس کی خیانت ہے خیانت بایں وجہ کہ اس نے غیر اخلاقی و غیر شرعی عمل کیا ہے۔

ترجمہ : روایت ہے حضرت معاویہؓ سے فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مُغالطہ دینے سے منع فرمایا ہے	وَعَنْ مُعَاوِیَۃَؓ قَالَ اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَھٰی عَنِ الْاُغْلُوْطَاتِ :

قولہٗ اُغْلُوْطَاتِ : جمع اغلوطہ اور اغلوطہ ایسے مسائل کو کہا جاتا ہے جو بظاہر پیچیدہ ہوتے ہیں اور جس کے جواب سے علماء پریشان ہو جائیں۔ ایسے سوالات کرنے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے کیونکہ اس میں اپنی بڑائی اور دوسرے کی ذلت اور شرمندگی ہوتی ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ یہ ابتداءً حرام ہے لیکن اگر کوئی آدمی علماء حقہ کو ایسے لئے سوالات کرکے الجھانا چاہتا ہے تو جواباً "جَزَآءُ سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ بِمِثْلِھَا" کے موجب اغلوطہ سے سوال کرنا جائز ہے۔

یقول ابو الاسعاد : اگر کوئی شیخ و استاذ طلبہ کی علمی استعداد معلوم کرنے کے لیے ایسے سوالات کرتا ہے تو جائز ہے۔

مثال: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ صحابہ کرامؓ سے پوچھا کہ ایک درخت ایسا ہے جو مؤمن کے ساتھ خاص مشابہت رکھتا ہے بتاؤ وہ کونسا درخت ہے۔ سب صحابہؓ جنگل کے درختوں کے متعلق سوچنے لگے کہ کونسا ایسا درخت ہو سکتا ہے۔ حضرت نے خود ارشاد فرمایا کہ وہ درخت کھجور کا درخت ہے۔ یا جیسے یہ پوچھنا کہ وہ کونسا سفر ہے جس میں قصر نہیں یا وہ کونسی صورت ہے کہ نمازی اپنے گھر میں وقتی نماز قصر پڑھے۔ یا وہ کونسی صورت ہے کہ نماز پڑھی تو نہ جائے لیکن بعد میں خود بخود ادا ہو جائے۔ یا وہ کون بزرگ ہیں جن کی اپنی عمر چالیس سال، بیٹے کی ایک سو بیس سال اور پوتے کی نوّے سال اور تینوں بیک وقت زندہ ہیں۔ اس قسم کے معمّے علّامہ شامی وغیرہ نے ارشاد فرمائے اس سے ذہن تیز کرنا مقصود ہے نہ کہ کسی کو ذلیل کرنا۔

وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَعَلَّمُوا الْفَرَائِضَ وَالْقُرْاٰنَ وَعَلِّمُوا النَّاسَ فَاِنِّیْ مَقْبُوْضٌ

ترجمہ: روایت ہے حضرت ابوہریرہؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ علم میراث اور قرآن سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ کہ میری وفات ہونے والی ہے۔

قولہ فَرَائِضَ ۔ محدثین حضرات نے فرائض کے معنیٰ کی تعیین میں دو قول نقل کیے ہیں: اوّل فرائض سے مراد عام فرائض اسلام اور احکامِ شریعت ہیں جیسے صوم صلوٰۃ وغیرہ دوم اس سے مراد علم الفرائض یعنی میراث کا علم مراد ہے پھر علم الفرائض کے دو معنیٰ ہیں ایک خاص ایک عام۔ معنیٰ خاص یہ ہے کہ ترکہ اور مستحقین ترکہ کی بحث کی جائے عام معنیٰ یہ ہے کہ مطلقًا اموال متروکہ کی تقسیم پر بحث کی جائے۔

قولہ فَاِنِّیْ مَقْبُوْضٌ : اَیْ سَاُقْبَضُ میں عنقریب فوت کیے جانے والا ہوں۔

سوال ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصیت کے ساتھ علم الفرائض کی تعلیم کی تاکید کیوں فرمائی ہے؟

جواب : تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ باقی تمام علوم کا تعلق زندگی کے ساتھ ہے جب کہ اس کا تعلق موت کے ساتھ یا اس بناء پر کہ قرب قیامت میں یہ علم دنیا سے اٹھ جائے گا۔ اس لیے خصوصیت سے اس کے سیکھنے کی تاکید فرمائی۔

وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَآءِؓ قَالَ كُنَّا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَشَخَصَ بِبَصَرِهٖ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ قَالَ هٰذَا اَوَانُ يُخْتَلَسُ فِيْهِ الْعِلْمُ مِنَ النَّاسِ حَتّٰى لَا يَقْدِرُوْا مِنْهُ عَلٰى شَيْءٍ ؛

ترجمہ : روایت ہے حضرت ابو الدرداءؓ سے فرماتے ہیں کہ ہم حضور صلعم کے ساتھ تھے کہ سرکارِ دو عالم نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی پھر فرمایا کہ یہ وہ وقت ہے جب علم لوگوں سے اٹھا لیا جائے گا حتیٰ کہ کسی چیز پر قادر نہ ہوں گے۔

قولہٗ فَشَخَصَ : ای رفع۔

قولہٗ اَوَانُ : ای وقتٌ۔

قولہٗ يُخْتَلَسُ : یہ صفت ہے اوان کی اور اختلاس کا معنیٰ ہے یختطف و یسلب بسرعۃٍ یعنی جلدی سے کسی چیز کا اٹھایا جانا۔ اس حدیث کے دو مطلب ہیں:

اوّل : پہلا مطلب یہ ہے کہ عنقریب علم اس دنیا سے اٹھنا شروع ہو جائے گا اور یہ قیامت کے قریب ہوگا۔

دوّم : علم سے مراد علمِ وحی ہے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب آسمان کی طرف دیکھا اور آپؐ کو قربِ اجل کا انکشاف ہوا تو آپ نے امت کو فرمایا کہ میں عنقریب دنیا سے رخصت ہونے والا ہوں۔ اور میرے ساتھ ہی علوم نبوّت اور معارف کتاب و سنّت کے دروازے بند ہو جائیں گے لہٰذا زیادہ سے زیادہ حاصل کر لو۔ (کما ھو المقصود من الحدیث الذی قبلہ عن ابی ھریرۃؓ)

وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ رِوَایَةً یُوْشِكُ اَنْ یَضْرِبَ النَّاسُ اَكْبَادَ الْاِبِلِ یَطْلُبُوْنَ الْعِلْمَ فَلَا یَجِدُوْنَ اَحَدًا اَعْلَمَ مِنْ عَالِمِ الْمَدِیْنَةِ

ترجمہ: روایت ہے حضرت ابوہریرہؓ سے کہ لوگ تلاشِ علم کرتے ہوئے اونٹوں کی سینہ کوبی کریں گے تو مدینہ کے ایک عالم سے بڑا کوئی عالم نہ پائیں گے۔

قولہٗ رِوَایَةً: رِوَایَةً کا مطلب یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے یہ حدیث مرفوعًا بیان کی ہے۔ رفع کی کئی صورتیں ہیں مثلاً یوں کہہ دینا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ چنانچہ رفع کی صورتوں میں سے ایک رِوَایَةً کہنا بھی ہے۔ لہٰذا رفع کی طرف اشارہ کیا۔

سوال: رفع بیان کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

جواب: حضرت ابوہریرہؓ نے حدیث مرفوع بیان کی مگر ان کے شاگرد کو حضرت ابوہریرہؓ کے الفاظ یاد نہ رہے اس لیے انہوں نے یوں نقل کیا۔

قولہٗ یُوْشِكُ: بکسر الشین لیکن فتحہ کے ساتھ پڑھنا لغت ردئیہ ہے بمعنی یَقْرُبُ

قولہٗ اَكْبَادَ الْاِبِلِ: اَکبَاد کبد کی جمع ہے بمعنی جگر اس کی مراد میں دو قول ہیں

اوّل: عند البعض اکباد الابل کنایہ ہے سیر سریع سے کہ اونٹ تیزی سے سفر کریں گے اتنی تیزی کہ اسی تیزی میں ان کے جگر پھٹ جائیں گے۔

دوّم: اکباد الابل کنایہ ہے شدّت عطش (پیاس) سے اس کا مطلب یہ ہے کہ جب لوگوں میں علم کا چرچا عام ہوگا تو حصولِ علم کے شوق میں لوگ اونٹوں پر اتنا لمبا لمبا سفر کریں گے کہ اونٹوں کے شدت پیاس سے جگر پھٹ جائیں گے اور اونٹ تھک ہار کر مر جائیں گے لیکن نتیجۃً دونوں قول برابر ہیں کہ یہ کنایہ ہے تیز دوڑنے اور طویل مسافت ومحنت اور مشقّت سے۔ معلوم ہوا کہ طالب علم کو علم پر حریص ہونا چاہیے۔

قولہٗ مِنْ عَالِمِ الْمَدِیْنَةِ: اس حدیث میں جس عالِم مدینہ کا ذکر ہے اس کا مصداق کون ہے اس میں مختلف آراء ہیں:۔

ؑ۱ اس سے مُراد العُمری الزّاہد ہیں جیسا کہ حضرت ابن عُیینہؒ کے ایک شاگرد حضرت اسحٰقؒ بن موسیٰ فرماتے ہیں جن کا نام صاحبِ مشکوٰۃ نے عبدُالعزیز بن عبداللہ ذکر کیا ہے یہ اونچے درجہ کے عالم اور اللہ کے ولی تھے۔ چونکہ یہ حضرت عمر فاروقؓ کی اولاد سے ہیں۔ اس لیے عُمری کہا جاتا ہے۔ اور زاہد ان کی صفت ہے جلیلُ القدر عالم ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے مُتّقی اور زاہد تھے۔

ؑ۲ : عند الجمہُور اس کا مصداق امام مالکؒ بن انسؓ ہیں واقعی ایک وقت ایسا آیا ہے کہ دارالہجرت مدینہ مُنوّرہ میں ان سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں تھا لوگ دور دراز کا سفر کر کے ان کے پاس تحصیل علم کے لیے حاضر ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت سفیان بن عیینہؒ جو حضرت امام مالکؒ کے اصحاب اور حضرت امام شافعیؒ کے شیوخ میں سے ہیں: فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے مراد حضرت امام مالکؒ کی ذات مُحترم ہے۔ اسی طرح حضرت عبدُالرزّاقؒ جو حدیث کے جلیلُ القدر اور مشہُور امام ہیں فرماتے ہیں کہ حدیث میں جس عالمِ مدینہ کا ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد حضرت امام مالکؒ ہی ہیں۔

فائدہ یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ سرکارِ دوعالم صلّی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد صحابہؓ اور تابعینؒ کے دور کے اعتبار سے ہے ان کے زمانوں میں مدینہ کے عالم سے زیادہ بڑا عالم کسی دُوسری جگہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کے بعد جب علم کی مُقدّس روشنی مدینہ سے نکل کر اطرافِ عالم میں پھیلی تو اس کے نتیجہ میں دیگر مُمالک اور شہروں میں ایسے ایسے عالم و فاضل پیدا ہوئے جو اپنی فراست و علم کے اعتبار سے مدینہ منورہ کے عالموں سے مقام و مرتبہ میں بڑھے ہوئے تھے۔

نیز اس حدیث کے ظاہری معنیٰ جو ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ قریب اور انسب ہیں یہ ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد اس ارشاد سے اس بات کی خبر دینا ہے کہ آخر زمانہ میں علم اپنی وُسعت و فراخی کے باوجود صرف مدینہ مُنوّرہ میں مُنحصر ہو جائے گا۔ جیسا کہ دیگر احادیث سے یہ بات بصراحت معلوم ہوتی ہے۔

وَعَنْهُ فِيْمَا اَعْلَمُ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ يَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْاُمَّةِ عَلٰى رَاْسِ كُلِّ مِأَةِ سَنَةٍ مَنْ يُّجَدِّدُ لَهَا دِيْنَهَا :

ترجمہ : روایت ہے انہی سے میری دانست میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں فرمایا یقیناً اللہ تعالیٰ اس اُمّت کے لیے ہر سو برس پر ایک مُجدّد بھیجتا رہے گا جو ان کا دین تازہ کرے گا۔

قَوْلُهٗ فِيْمَا اَعْلَمُ : بِضَمِّ الْمِيْمِ یہ کلام کسی نیچے کے راوی کا ہے وہ فرماتے ہیں کہ میرا غالب گمان یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے یہ حدیث حضورؐ سے روایت کی ان کا اپنا قول نہیں۔

قولہ اَلْاُمَّةُ : عندالجمہور اُمّتِ اجابت مُراد ہے عند البعض یحتمل امۃ المدعوۃ۔

قولہ رَاْسِ كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ - ای انتہائِہ وابتدائِہ لیکن جمہور حضرات کے نزدیک مأۃ سنۃ سے صدی کا آخر مراد ہے۔

قولہ مَنْ يُّجَدِّدُ لَهَا : تجدید دین کا معنی ہے "احیاء ما اندرس من العمل بالکتاب والسُّنۃ والامر بمُقتضاھما" یعنی علومِ نبوّت اور شریعت مُقدّس پر جو بدعات اور رسومات کی گرد وغبار پڑ گئی ہے اس کو دور کیا جائے۔ افراط وتفریط ختم کرکے صحیح معتدل دین امت پر پیش کیا جائے۔

فائدہ

حدیث کے لفظ "مَنْ يُّجَدِّدُ لَهَا" کے مَنْ میں دو احتمال ہیں۔

اوّل : مَنْ سے مراد ایک جماعت ہے یعنی ہر صدی میں اللہ تعالیٰ ایسی جماعت پیدا کرتے رہیں گے جو دین کو نکھار کر پیش کرے گی۔

دوم مَنْ سے مراد شخص واحد ہے یعنی ہر صدی میں ایسی شخصیت پیدا ہو گی جو تجدیدی کارنامے انجام دے گی اسی کو صدی کا مُجدّد کہتے ہیں۔

سوال ؛ ماقبل میں گذرا کہ جو عمل خیرُ القرون سے ثابت نہ ہو وہ بدعت ہے تو جب مُجدّدِ دین تجدید دین کرے گا تو وہ بھی بدعت شمار ہو گی !

جواب : تجدیدِ دین سے مراد کسی نئی بات وطریقہ کا ایجاد نہیں بلکہ دین کے اندر بدعات ورسومات اور غلط تاویلات کی وجہ سے سچے دین پر جو گرد وغبار ہو گا ان کو صاف کرکے امت کے سامنے پیش کرنا مراد ہے اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے يُجَدِّدُ لَهَا دِيْنَهَا فرمایا نہ کہ يُجَدِّدُ فِي دِيْنِهَا فرمایا۔

مُجدّد کی شرائط

علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے اپنے رسالہ "خلاصۃ الاثر فی اعیان قرن الحادی عشر" میں بحث کی ہے کہ کون کس صدی کا مجدد ہے اور مجدد کی شرائط کیا ہیں ؟ طوالت سے بچتے ہوئے مختصرًا عرض کر رہا ہوں۔ مجدد کی شرائط مندرجہ ذیل ہیں :۔

اوّل : ظاہری وباطنی علوم کا جامع ہو۔

دوّم : اس کی تدریس تالیف اور تذکیر سے عام فائدہ ہو۔

سوّم : بدعات کو مٹانے اور سنتوں کے زندہ کرنے میں کوشاں ہو۔

چہارم : ایک صدی کے آخر میں، دوسری کے شروع میں اس کے علم کی عام شہرت ہوئی ہو۔ لہٰذا اگر ایسی شخصیّت نے صدی کے آخر کو نہ پایا ہو یا پایا ہو مگر اشاعت شریعت میں کوشش نہ کر سکا ہو تو وہ اصطلاحی مجدّد نہیں کہلائے گا۔ اور مجدّد کی تعیین اس کے معاصرین کرتے ہیں۔ لیکن بسا اوقات صدی کے وسط میں ایسی شخصیّتیں پیدا ہو جاتی ہیں جو اپنی دینی جدّ وجہد میں مجدّدین کے ہم پلہ ہو جاتی ہیں بلکہ مرتبہ میں ان سے بھی بڑھ جاتی ہیں گو انہیں اصطلاحی مجدّد نہیں کہا جائے گا۔

وَعَنْ اِبْرَاهِيْمَ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ الْعُذْرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَحْمِلُ هٰذَا

ترجمہ : روایت ہے حضرت ابراہیمؓ بن عبدالرحمان عذری سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اس علم کو ہر پچھلی جماعت

اَلْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ عُدُوْلُهٗ يَنْفُوْنَ عَنْهُ تَحْرِيْفَ الْغَالِيْنَ وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِيْنَ وَتَاْوِيْلَ الْجَاهِلِيْنَ ؛	ہیں سے پرہیزگار لوگ اٹھاتے رہیں گے جو غلو والوں کی تبدیلیاں اور جھوٹوں کی دروغ بیانیاں اور جاہلوں کی ہیرا پھیریاں اس سے دور کرتے رہیں گے۔

قولہٗ يَحْمِلُ : ای يحفظ ويأخذ یعنی حفاظت کرتے رہیں گے۔

قولہٗ هٰذَا الْعِلْمَ : ای علم الکتاب والسنۃ۔ بعض حضرات نے علم فقہ کو بھی داخل کیا ہے لیکن ھو غیر صحیح لانہ ماخوذ منھما :

قولہٗ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ : خلف بمعنیٰ پیچھے آنے والا لیکن اس سے مراد وہ مرد صالح ہے جو کسی کے بعد آئے۔ یا خلف سے مراد جماعت ماضیہ بھی ہے۔

قولہٗ عُدُوْلُهٗ : عدول سے مراد عادل، ثقہ اور صاحب تقویٰ لوگ مراد ہیں۔

قولہٗ يَنْفُوْنَ : ای طاردین عن هٰذا العلم بمعنیٰ دور کرنا، ہٹانا یعنی یہ لوگ دور کریں گے، ہٹائیں گے۔

قولہٗ غَالِيْنَ - ای المبتدعین الذین یتجاوزون فی کتاب اللہ وسنۃ رسولہ۔ چنانچہ غلو بھی حد سے تجاوز کرنے کو کہتے ہیں مثل اقوال القدریۃ والجبریۃ والمشبھۃ۔

قولہٗ وانتحال : انتحال بمعنیٰ ادعاء الشیئ باطل۔ مُبطلین بمعنیٰ مُکَذِّبِیْنَ اور یہ جھوٹ سے کنایہ ہے یعنی باطلوں کی افتراء پردازی تو کنایہ ہوگا دروغ گوئی سے۔

خُلَاصَةُ الْحَدِيْث

یہ حدیث سابقہ حدیث مجدد کی توثیق کر رہی ہے کہ ایک جماعت علم دین کے ذریعہ جھوٹ بہتان، غلط تاویلات کو دور کرتی رہے گی۔ عند البعض جماعت مراد نہیں بلکہ فرد واحد یعنی مجدد مگر ترجیح جماعت کو ہے جیسے اور مقام پر فرمایا لَا يَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِي ظَاهِرِيْنَ عَلَى الْحَقِّ لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَالَفَهُمْ (الخ)

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ ــــ یہ تیسری فصل ہے ۔

عَنِ الْحَسَنِ مُرْسَلًا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ جَاءَہُ الْمَوْتُ وَھُوَ یَطْلُبُ الْعِلْمَ لِیُحْیِیَ بِہِ الْاِسْلَامَ فَبَیْنَہٗ وَبَیْنَ النَّبِیِّیْنَ دَرَجَۃٌ وَّاحِدَۃٌ فِی الْجَنَّۃِ ؛

ترجمہ : روایت ہے حضرت حسنؓ سے مُرسلاً فرماتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جسے موت اس حال میں آئے کہ وہ اسلام زندہ کرنے کے لیے علم سیکھ رہا ہو تو جنّت میں اس کے اور نبیّوں کے درمیان ایک درجہ ہوگا۔

قولہٗ دَرَجَۃٌ وَّاحِدَۃٌ : اس حدیث میں درجہ واحدہ سے مُراد نبوّت کا درجہ ہے کیونکہ صحیح علماء وارث انبیاء ہیں مطلب یہ ہے کہ جو علماء صحیح معنیٰ میں انبیاء کے وارث ہیں۔ ان میں اور انبیاء میں جنّت کے اندر صرف وحی اور درجہ نبوّت کا فرق ہوگا اگرچہ یہ فرق بذاتہٖ بہت بڑا ہے مگر بہرحال دوسرے اہلِ جنّت کی بہ نسبت ایسے علماء کا درجہ بہت بلند ہوگا۔

ثانیاً : حدیثِ باب کے اندر نبی کریم علیہم السّلام نے تحصیل علمِ دین کی اہمیّت بیان کی ہے اور ساتھ ساتھ تحصیل علم کا مقصد بھی واضح کیا ہے لِیُحْیِیَ بِہِ الْاِسْلَامَ مزید اس کی مکمّل تشریح مشکوٰۃ شریف ص۲۴ ج ا فصل ثانی بابُ العلم حدیث ابی ہریرہؓ میں ہوچکی ہے۔

اسمائے رجال

حالات حضرت حسن بصریؒ

فنِ حدیث میں جب حسن مطلق بولا جائے تو اس سے خواجہ حسن بصریؒ مراد ہوتے ہیں یہ حسن بصریؒ ابوالحسن کے بیٹے ہیں ان کی کنیت ابوسعید ہے یہ زیدؓ ابن ثابت کے آزاد کردہ غلام ہیں۔ ان کے باپ کا نام لیسار ہے

وَعَنْهُ مُرْسَلاً قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ رَجُلَيْنِ كَانَا فِي بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ أَحَدُهُمَا كَانَ عَالِمًا يُصَلِّي الْمَكْتُوْبَةَ ثُمَّ يَجْلِسُ فَيُعَلِّمُ النَّاسَ الْخَيْرَ وَالْآخَرُ يَصُوْمُ النَّهَارَ وَيَقُوْمُ اللَّيْلَ أَيُّهُمَا أَفْضَلُ :

ترجمہ : روایت ہے انہی سے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان دو شخصوں کے بارے میں پوچھا گیا جو بنی اسرائیل میں تھے ایک تو عالم تھا جو صرف فرائض پڑھتا تھا، پھر بیٹھ جاتا تھا لوگوں کو علم سکھاتا تھا اور دوسرا دن کو روزے رکھتا، رات بھر عبادت میں کھڑا رہتا۔ ان دونوں میں بہتر کون ہے

قولہٗ وَعَنْهُ مُرْسَلاً : حدیث مرسل وہ ہے جس میں صحابیؓ کا ذکر ترک کر دیا جائے۔ خواجہ حسن بصریؒ صحابیؓ کا ذکر یا تو اس لیے چھوڑتے ہیں کہ حدیث کے راوی بہت صحابہؓ ہوتے ہیں کس کس کا نام لیں۔ یا اس لیے کہ انہیں حدیث کی صحت پر یقین ہوتا ہے غرضیکہ ان جیسے بزرگوں کا ارسال معتبر ہے اور ان کی مُرسل روایتیں مقبول ہیں جیسا کہ قانون ہے مراسیل الثقات حُجَّةٌ عِنْدَنَا۔

قولہٗ سُئِلَ عَنْ رَجُلَيْنِ۔ ای عن شانهما وحکمهما۔

قولہٗ : كَانَ عَالِمًا : یعنی اس کا علم عبادت پر غالب تھا زیادہ اوقات علمی خدمات میں گزارتا تھا۔

قولہٗ يُصَلِّى الْمَكْتُوْبَةَ ۔ ای یکتفی بالعبادۃ المفروضۃ : یعنی مکتوبہ کی قید اس لیے لگائی کہ صرف فرائض پر مامور تھا نوافل پر عامل نہیں تھا۔

قولہٗ كَفَضْلِىْ عَلٰى اَدْنَاكُمْ : جواب میں اطناب فرمانا یعنی اتنی دراز عبارت کا فرمانا عالم کی شان لوگوں کے ذہن نشین کرانے کے لیے ہے ورنہ اتنا کافی تھا کہ پہلا دوسرے سے افضل ہے۔ ثانیاً : سابق میں یہ گذر چکا ہے کہ یہ مثال نوعیّت کے بیان کے لیے ہے۔ یعنی جس قسم کی بزرگی مجھ کو تم پر حاصل ہے۔ اس قسم کی بزرگی عالم کو عابد پر ہے جیسے ربّ ذوالجلال نے فرمایا " مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ الخ لہٰذا اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ عالم نبی کے برابر ہو جائے۔

خُلَاصَةُ الْحَدِيْث

بنی اسرائیل کے مذکورہ دونوں عالم یوں تو اپنے علم وفضل کے اعتبار سے ہم رتبہ تھے مگر فرق یہ تھا کہ ایک عالم نے تو اپنی زندگی کا مقصد صرف عبادت خداوندی بنا لیا تھا۔ چنانچہ ہمہ وقت عبادت میں مصروف رہا کرتا تھا۔ بندگانِ خدا کی اصلاح وتعلیم سے اسے غرض نہیں تھی مگر دوسرا عالم فرض عبادت بھی پوری کرتا تھا۔ اور اپنے اوقات کا بقیہ حصّہ لوگوں کی اصلاح وتعلیم میں بھی صرف کیا کرتا تھا لہٰذا دونوں میں افضل اس شخص کو قرار دیا گیا ہے جو خود بھی اپنے علم پر عمل کرتا ہے دوسروں کو بھی علم سکھلا کر انہیں راہِ ہدایت پر لگاتا تھا۔

وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نِعْمَ الرَّجُلُ الْفَقِيْهُ فِى الدِّيْنِ اِنِ احْتِيْجَ اِلَيْهِ نَفَعَ وَاِنِ اسْتُغْنِىَ عَنْهُ اَغْنٰى نَفْسَهٗ ؛

ترجمہ : روایت ہے حضرت علیؓ فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ عالم دین بہت اچھا ہے کہ اگر اس کی ضرورت پڑے تو نفع پہنچا دے۔ اگر اس سے بے پرواہی ہو تو اپنے کو بے نیاز رکھے۔

قولہٗ نِعْمَ الرَّجُلُ : ای کامل فی اوصاف المدحۃ۔

قولہٗ اِنِ احْتِیْجَ : بکسر النون وضمها ای ان احتاج الناس۔

خُلاصَۃُ الحَدیث : اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ایک عالم کی یہ شان ہونی چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو لوگوں کا محتاج کر کے اپنی حیثیت کو کمتر نہ کرے۔ نیز غلط اغراض ومقاصد کی خاطر عوام کی طرف میلان نہ رکھے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اپنے آپ کو عوام سے لاتعلق کر کے علم کے نفع سے محروم کردے۔ بلکہ ان کے اسلامی ضروریات کو پورا کرے ہاں اگر عوام خود لاپرواہی کریں۔ نفع نہ اٹھائیں تو اپنے آپ کو مستغنی کردے یعنی تلاوت قرآن ذکر اذکار تالیف وتصنیف میں مشغول رکھے اسی کو اَغنیٰ نفسہ کہا گیا ہے۔

یقول شیخ جاجروی رحمہ القوی : عام طور پر اس کا کا یہ مطلب مراد لیا جاتا ہے کہ کوئی دین پڑھنے آئے تو پڑھا دو۔ ورنہ مستغنی بن کر بیٹھ جاؤ۔ جبکہ یہ مطلب قرآن پاک کے مفہوم کے خلاف ہے۔ کیونکہ حضرت نوح علیہ السلام قوم کے پاس جاتے قوم اگر نہ سنتی تو بھی ضرور سناتے۔ اسی طرح ہر نبی کا یہی طریق تبلیغ رہا ہے۔ لہٰذا صحیح مطلب اس اثر کا یہ ہے کہ اچھا عالم وہ ہے کہ جب تدریس کا موقع ملے تدریس کے ذریعہ لوگوں کو نفع پہنچائے اگر نفع کا موقع نہیں ملتا تو خالق کی عبادت میں مشغول رہے یہ حدیث بعینہٖ مصداق ہے اس آیت مقدسہ کا۔ فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ، (پ۳۰)

وَعَنْ عِكْرِمَةَ اَنَّ ابْنَ عَبَّاسٍؓ قَالَ حَدِّثِ النَّاسَ كُلَّ جُمُعَةٍ مَرَّةً فَاِنْ اَبَيْتَ فَمَرَّتَيْنِ فَاِنْ اَكْثَرْتَ فَثَلَاثَ مَرَّاتٍ وَلَا تُمِلَّ النَّاسَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ :

ترجمہ : روایت ہے حضرت عکرمہؒ سے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ لوگوں کو ہفتہ میں ایک دفعہ وعظ سناؤ اگر نہ مانو تو دو دفعہ اگر بہت ہی کرو تو تین بار اس قرآن سے لوگوں کو اکتا نہ دو

قولہٗ كُلَّ جُمُعَةٍ : اس سے مراد اسبوع ہے یعنی ہفتہ۔

قولہٗ فَاِنْ اَبَیْتَ : ای اَنْکَرَ اب انکار کا تعلّق سماع سے نہیں بلکہ تحدیث مَرَّةً سے ہے یعنی ان کا خیال ہے کہ ایک دفعہ سے زیادہ وعظ کرو۔ ملا علی قاریؒ نے اَبَیْتَ کا معنیٰ کیا ہے وَاردت الزیادة حِرْصًا علٰی افادة العلم ونفع الناس

قولہٗ ولَا تُمِلَّ النَّاسَ : یقال مللتہ ومللتُ بمعنیٰ اکتاجانا۔ کیونکہ بعض دفعہ اکثار املال کا ذریعہ ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کا مقصد تھا کہ روزانہ وعظ نہ سناؤ ہفتہ میں ایک یا دو تین بار سناؤ پھر بھی اتنی دیر وعظ نہ کہو کہ لوگ سیر ہوجائیں بلکہ ان کا شوق باقی ہو کہ ختم کردو۔

یقول ابوالاسعاد : یہ ارشاد وہاں ہے جہاں لوگ اکتاتے ہوں لیکن دینی جذبہ کے تحت سائق ہیں تو نہ روز وعظ کرنا برا نہ دیر تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار فجر سے مغرب تک وعظ فرمایا۔ عالم کو چاہیے کہ لوگوں کے شوق کا اندازہ رکھے۔

قولہٗ وَلَا اُلْفِیَنَّكَ : ای لَا اجد تك یہاں سے نصیحت ثانیہ شروع ہے۔

قولہٗ فَاِذَا اَمَرُوْكَ : ای طلبوا منك التحدیث

قولہٗ فَاِذَا اَمَرُوْكَ ۔ ای طلبوا منك التحدیث یعنی جہاں لوگ کسی بات چیت اور آپس کی گفت گو میں مشغول ہوں تو ایسے موقعہ پر پہنچ کر وعظ ونصیحت شروع نہیں کردینی چاہیے۔ اگرچہ ان کی بات چیت دنیوی امور سے متعلق ہو یا دینی باتوں پر مشتمل ہو اس سے علم اور عالم کی اہانت بھی ہوتی ہے۔

ثانیًا : اگر وہ بتقاضائے بشریّت اس وعظ ونصیحت کو گوارہ نہ کریں تو وہ گناہ میں مبتلا ہونگے۔ بلکہ ان کے قلوب پر دین کی عظمت اور اہمیت کا نقش بھی قائم نہ ہوگا۔ ہاں اگر مصلحت کا تقاضا ہی یہ ہو کہ انہیں اس گفت گو سے باز رکھا جائے تو پھر ایسا انداز وطریقہ اختیار کرنا چاہیئے جس سے انہیں ناگواری بھی نہ ہو اور وہ اس کلام وگفتگو سے رک جائیں۔

قولہٗ وانظرالسجع : ای صَرَفَ نَظَرًا مِنَ السَّجْعِ یعنی دعا میں سجع بندی اور وزن شاعری سے بچو۔ یعنی دعاء تاثیر کے اعتبار سے وہی بہتر ہوتی ہے جو تصنّع وبناوٹ سے پاک ہو۔ اور جس میں شعر وشاعری کا دخل نہ ہو یعنی قافیہ بندی نہ ہو۔

سوال : حضرت ابن عباسؓ سجع فی الدُّعاء سے منع فرما رہے ہیں جب کہ اکثر ماثورہ دعاؤں میں سجع بندی ہے مثلاً " اَللّٰهُمَّ اهْدِنَا فِيْمَنْ هَدَيْتَ وَعَافِنَا فِيْمَنْ عَافَيْتَ الخ۔

جواب : یہاں مراد وہ سجع ہے جو بالتکلف اور بالذات اختیار کیا جائے۔ کیونکہ اس سے دعا میں خشوع وخضوع وخلوص وحضور قلب نہیں رہتا باقی فصیح کلام میں جو سجع بلا تکلف اور بالتبع آجائے وہ ممنوع نہیں ہے۔

یقول ابوالاسعاد : مطلق مسجّع بلا تکلف عبارتیں بذات خود مذموم نہیں ہیں بلکہ انسان کے کلام کی فصاحت وبلاغت اور قابلیت کا پرتو ہوتی ہیں۔ چنانچہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اندازِ بیان اور آپ کا کلام مسجّع ومقفّی عبارتوں سے مزین ہوتا تھا۔ بطور خاص آپ سے جو دعائیں منقول ہیں ان کے الفاظ کی جامعیت مسجّع ومقفّی عبارتوں کی بہترین مثال ہیں جیسے یہ دعا ہے " اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ عِلْمٍ لَا يَنْفَعُ وَمِنْ قَلْبٍ لَا يَخْشَعُ "، حاصل یہ کہ وہ مسجّع عبارت مذموم ہے جو بہ تکلف زبان وقلم سے ادا ہو۔

وَعَنْ وَاثِلَةَ بْنِ الْاَسْقَعِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ طَلَبَ الْعِلْمَ فَاَدْرَكَهٗ كَانَ لَهٗ كِفْلَانِ مِنَ الْاَجْرِ فَاِنْ لَّمْ يُدْرِكْهُ كَانَ لَهٗ كِفْلٌ مِّنَ الْاَجْرِ :

ترجمہ : روایت ہے حضرت واثلہؓ بن اسقع سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جو علم طلب کرے پھر پا بھی لے تو اسے ثواب کا دوہرا حصہ ہے لیکن اگر نہ پاسکے تو اسے ثواب کا ایک حصہ ہے۔

قولہٗ فَاَدْرَكَهٗ ۔ ای حصلہٗ لیکن شارع علیہ السلام نے ادرکہٗ فرمایا ہے نہ کہ حصلہٗ وجہ یہ ہے کہ ادراک میں مبالغہ زیادہ ہے بہ نسبت حصل کے کیونکہ ادراک کہتے ہیں کسی شئی کی انتہا تک پہنچنا۔ یعنی بلوغ اقصٰی شئی یعنی اس طالبعلم

نے علم کے تمامی درجات حاصل کیے۔

قولہٗ کِفْلَانِ : ای نَصِیْبَانِ : دو ثواب اس طرح ملیں گے کہ ایک ثواب تو طالب علم اور اس کی مشقت و محنت کا ہوگا جو اس نے حصولِ علم کے سلسلہ میں اٹھائی ہیں۔ اور دوسرا ثواب علم کے حاصل ہونے کا اور پھر دوسروں کو علم سکھلانے کا ہوگا۔ یا دوسرا ثواب عمل کا ہوگا جو اس نے علم پر کیا ہے ہاں اس شخص کو جیسے اس کی طلب و کوشش کے بعد علم حاصل نہیں ہوا۔ صرف ایک ثواب اس کی محنت و مشقت کا ہوگا۔

قولہٗ کَانَ لَہٗ کِفْلٌ مِّنَ الْاَجْرِ : اس کی صورت یہ ہے کہ یا تو زمانہ طالب علمی میں مر جائے تکمیل کا موقعہ نہ ملے، یا اس کا ذہن کام نہ کرے مگر وہ لگا رہے تب بھی ثواب پائے گا جیسے مجتہد اگر صحیح اجتہاد کرے تو دوہرا ثواب اور اگر غلطی کرے تو ایک اجر۔

وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِمَّا یَلْحَقُ الْمُؤْمِنَ مِنْ عَمَلِہٖ وَحَسَنَاتِہٖ بَعْدَ مَوْتِہٖ عِلْمًا عَلَّمَہٗ وَ نَشَرَہٗ وَوَلَدًا صَالِحًا تَرَکَہٗ اَوْ مُصْحَفًا وَرَّثَہٗ :

ترجمہ : حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جو اعمال و نیکیاں مؤمن کو بعد موت بھی پہنچتی رہتی ہیں ان میں سے وہ علم ہے جسے سیکھا گیا اور پھیلایا گیا۔ اور نیک اولاد جو چھوڑ گیا اور قرآن شریف جس کا وارث بنا گیا۔

قولہٗ مِمَّا : مِمَّا اصل میں مِنْ مَا تھا یہ جار مجرور متعلّق ہے کائنٌ مقدر کے اور یہ خبر مُقدم ہوگی اِنَّ کی عِلْمًا عَلَّمَہٗ اس کا اسم ہے

قولہٗ مِنْ عَمَلِہٖ : مِمَّا کے مَا کا بیان ہے۔

قولہٗ حَسَنَاتِہٖ : اس کا عطف عَمَلِہٖ پر عطف تفسیری ہے۔

قولہٗ بَعْدَ مَوْتِہٖ : مُتعلّق ہے یَلْحَقُ کے اور بَعْدَ مَوْتِہٖ کا مفہوم

مخالف جائز نہیں کیونکہ حیاتی کے اندر بھی ثواب ملتا رہتا ہے۔

قولهٗ نَشَرَهٗ عام ہے تعلیمًا تالیفًا ووقف الکتب

قولهٗ صَالِحًا : اس قید احترازی سے بدکار ونافرمان اولاد نکل گئی۔

قوله ترکهٗ : اس سے فرط (فوت شدہ بچے) نکل گئے کیونکہ وہ والد کی زندگی میں فوت ہوگئے تھے۔

قولهٗ مُصْحَفًا : قرآن کے حکم میں شرعی کتابیں بھی داخل ہیں اسی طرح مسجد کے حکم میں علماء کے قائم کردہ مدرسے اور خانقاہیں جو ذکر اللہ وتزکیہ نفس کے لیے ہوں شامل ہیں یعنی ان کا ثواب بھی مرنے کے بعد برابر پہنچتا رہتا ہے۔

قولهٗ فِيْ صِحَّتِهٖ وَحَيَاتِهٖ : محدثین حضرات نے وَحَیَاتِہٖ کی واؤ کو جمع کی بنایا ہے مطلب یہ ہے کہ صدقہ کرتے وقت تندرستی بھی ہو اور زندگی میں دے بیماری کی حالت والا صدقہ قبول نہیں ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صدقہ کے متعلق پوچھا گیا کہ کونسا صدقہ افضل ہے تو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ "اِنْ تَصَدَّقَ وَاَنْتَ صَحِيْحٌ شَحِيْحٌ تَخْشَى الْفُقَرَآءَ" الخ مرقات) کیونکہ مرض کی حالت میں خود اپنے کو مال کی حاجت نہیں رہتی جب کہ دوسرے حضرات فرماتے ہیں کہ واؤ عاطفہ ہے اس جگہ عطف ہے اور عطف مغایرت کو تقاضا کرتا ہے یعنی تندرستی کی حالت میں نکالے یا مرض کی حالت میں بہرحال صدقہ جاریہ مراد ہے۔

سوال : مشکوٰۃ شریف صہ ۳۲ ج افصل اوّل میں ہے کہ جن اعمال کا ثواب موت کے بعد جاری رہتا ہے وہ تین ہیں علم، ولد صالح، صدقہ جاریہ اور یہاں سات چیزوں کا ذکر ہے تو یہ تعارض ہوا۔

جواب : علم اور ولد صالح کے علاوہ باقی پانچ چیزیں مصحف، مسجد بیت ابن السبیل، نہر، خیرات یہ سب صدقہ جاریہ کی تفصیل ہیں۔ فلا تعارض

وَعَنْ عَائِشَةَ رضی اللہ عنہا اَنَّهَا قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ اَوْحٰى اِلَيَّ اَنَّهُ مَنْ سَلَكَ مَسْلَكًا فِيْ طَلَبِ الْعِلْمِ سَهَّلْتُ لَهُ طَرِيْقَ الْجَنَّةِ :

ترجمہ : روایت ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ اللہ عزوجل نے مجھے وحی فرمائی کہ جو تلاش علم میں ایک راہ چلا تو میں اس پر جنت کا ایک راہ آسان کر دوں گا۔

قولہٗ اَوْحٰى اِلَيَّ : بطریق الہام یا بذریعہ حضرت جبریل علیہ السلام کہ مضمون رب کی طرف سے الفاظ حضور ﷺ کے اس کو وحی غیر متلو کہتے ہیں۔ حدیث قدسی اور قرآن میں یہی فرق ہے کہ قرآن کی عبارت اور مضمون سب رب کی طرف سے ہے۔

قولہٗ سَلَكَ - اى ذَهَبَ وَمَشٰى چلتا ہے یا جاتا ہے۔

قولہٗ مَسْلَكًا : اى طَرِيْقًا :

قولہٗ طَرِيْقَ الْجَنَّةِ : جنت کے راستے آسان کرنا۔ ایک مطلب یہ بھی ہے کہ دنیا میں معرفت وحقیقت کی دولت سے نوازا جائے گا۔ اور عبادت خداوندی کی توفیق عنایت فرمائی جائے گی تاکہ وہ اس کے سبب جنت میں داخل ہو سکے۔

دوسرا یہ کہ جنت میں جو محل اہل علم کے لیے مخصوص ہے اس کی راہ آسان کر دی جائے گی۔

قولہٗ سَلَبْتُ : اى اَخَذْتُ

قولہٗ كَرِيْمَتَهُ - اى عَيْنَيْهِ : یعنی دو آنکھیں۔ آنکھوں پر کریمت کا اطلاق اس لیے فرمایا کہ عالم دنیا کے نور کی مدار اسی آنکھوں پر ہے یا كُلُّ شَيْئٍ يَكْرُمُ فَهُوَ كَرِيْمَتُكَ۔

قولہٗ اَثَبْتُهُ : اى جَزَيْتُهُ عَلَيْهَا۔ قَالَ اللهُ تَعَالٰى « فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ » پ عند البعض بمعنٰى اَعْطَاهُ الْجَنَّةَ تواکمہ یعنی

مادرزاد اندھا) بدرجہ اولیٰ اس میں داخل ہے بشرطیکہ صبر کرے۔

قولہٗ عَلَيْهِمَا : ای عَلٰی سَلْبِهَا

قولہٗ فَضْلٌ فِی الْعِلْمِ : ای زِیَادَۃٌ فِی الْعِلْمِ۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ مناسب یہ ہے کہ پہلے فضلٌ کی تنوین تقلیل کے لیے ہے اور دوسرے فضلٌ کی تنوین تکثیر کے لیے سمجھی جائے اس سے معنیٰ میں مبالغہ آجاتا ہے اور عبادت سے نفلی عبادت مراد ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ فرائض چھوڑ کر علم سیکھے۔

قولہٗ مِلَاکُ : ای اصلہٗ وصلاحہ : یعنی اصل اور جڑ۔

قولہٗ اَلْوَرَعُ : بمعنیٰ تقویٰ ای اجتناب عَنِ الحرام والمشتبھات کیونکہ یہی تقویٰ ہی ہے جو انسان کو محرمات سے بچاتا ہے۔

وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ تَدَارُسُ الْعِلْمِ سَاعَةً مِّنَ اللَّيْلِ خَيْرٌ مِّنْ اَحْيَائِهَا ؛

ترجمہ : حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے فرمایا کہ رات میں ایک گھڑی کا علم کا درس تمام رات بیداری سے افضل ہے۔

قولہٗ تَدَارُسُ الْعِلْمِ : یہ تدریس سے ماخوذ ہے بمعنیٰ تعلیم و تعلّم تکرار وغیرہ کرنا۔

قولہٗ سَاعَةً : ساعت دو قسم ہے ۱ لغوی جو ایک لحظہ کو کہتے ہیں۔ ۲ عرفی جس کا اطلاق گھنٹوں پر ہوتا ہے۔ یعنی معیّن اوقات۔ مقام ہذا پر ساعۃ لغوی مراد ہے۔

خُلَاصَةُ الْحَدِيْث : یعنی تمام رات عبادت کرتے رہنے سے یہ زیادہ بہتر ہے کہ تھوڑی دیر تک آپس میں تعلیم و تعلّم اور درس و تدریس کا مشغلہ رکھا جائے۔ اسی حکم میں دینی علم کا لکھنا یعنی

تصنیف و تألیف اور دینی کتب کا مطالعہ کرنا بھی داخل ہے۔

سوال: لَیل کی تخصیص کیوں فرمائی ؟

جواب: لَیل کی تخصیص اس بناء پر ہے کہ لَیل بہ نسبت دن کے زیادہ محل افکار و سکون ہے۔ کما فی قولہٖ تعالیٰ « هِيَ أَشَدُّ وَطْاءً وَّأَقْوَمُ قِيلًا » (پ۲۹)

وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ عَمْرٍو اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ بِمَجْلِسَيْنِ فِيْ مَسْجِدِهٖ فَقَالَ كِلَاهُمَا عَلٰى خَيْرٍ وَاَحَدُهُمَا اَفْضَلُ مِنْ صَاحِبِهٖ :

ترجمہ: روایت ہے حضرت عبد اللہ رضؓ بن عمرو سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مسجد میں دو مجلسوں پر گزرے تو فرمایا کہ یہ دونوں بھلائی پر ہیں۔

قولہٗ مَجْلِسَيْنِ : ای حَلْقَتَيْنِ ۔ یعنی دو حلقے بنے ہوئے تھے۔

قولہٗ فِيْ مَسْجِدِهٖ : اس سے مراد مسجد نبوی زَادَهُمَا اللّٰهُ شَرَفًا ہے۔

قولہٗ كِلَاهُمَا عَلٰى خَيْرٍ : یعنی دونوں حلقے خیر پر ہیں۔

سوال: خیر کا تعلق دونوں حلقوں کے ساتھ ہے جب کہ حلقوں کے بجائے اہل حلقہ کے ساتھ خیر ہوتی ہے یعنی خیر مجلس کی صفت نہیں بلکہ اہل مجلس کی صفت ہوتی ہے جب کہ مقام ہذا پر تو خیر مجلس کی صفت ہے۔

جواب: یہ حمل مبالغۃً ہے یا یہاں مضاف مُقدّر ہے ای صاحبھما علی الخیر۔

قولہٗ اَحَدُهُمَا اَفْضَلُ ۔ یعنی مجلسِ علم مجلسِ عبادت سے افضل ہے اس کی وجہ آگے آرہی ہے۔

قولہٗ اِنْ شَاءَ اَعْطَاهُمْ ۔ یعنی عابدوں کی محنت اپنی ذات کے لیے ہے۔ جس کی قبولیّت اور ثواب یقینی نہیں کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے کرم پر موقوف ہے اس نے ان چیزوں کا وعدہ نہیں فرمایا اس حدیث میں مُعتزلہ کا کھلا ہوا رد ہے۔

کہ وہ عبادت کا ثواب واجب اور ضروری جانتے ہیں۔

قولہٗ اَوِ الْعِلْمَ : اَوْ شکیہ ہے۔ راوی کو شک ہے کہ فقہ کہا یا علم کہا جب شک کی صورت ہو تو درمیان میں قَالَ پڑھا جاتا ہے۔ اب عبارت یوں ہے :- فَیَتَعَلَّمُوْنَ الْفِقْهَ اَوْقَالَ الْعِلْمَ۔

قولہٗ اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا : یہ اس آیت مبارک کی تفسیر ہے وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔

قولہٗ ثُمَّ جَلَسَ فِيْهِمْ : حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہم نے زبان ہی سے علماء کی مجلس کی فضیلت کا اظہار ہی نہیں فرمایا بلکہ اس مجلس میں بیٹھ کر مزید عزّت وشرف کی دولت بخشی۔

یَقُوْلُ اَبُوالْاِسْعَاد : علم اور عالموں کی اس سے زیادہ اور کیا فضیلت ہو سکتی ہے۔ سرور وسردار انبیاء احمد المجتبیٰ سیّدنا مُحمّد مُصطفےٰ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے عابدوں کی مجلس کو چھوڑ کر عالموں کی ہی ہم نشینی اختیار فرمائی ہے اور اپنے آپ کو ان ہی میں سے شمار کیا ؎

گدایان را ازیں معنیٰ خبر نیست	کہ سلطانِ جہاں با ماست امروز

وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ رضی قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا حَدُّ الْعِلْمِ الَّذِىْ اِذَا بَلَغَهُ الرَّجُلُ كَانَ فَقِيْهًا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ حَفِظَ عَلٰى اُمَّتِىْ اَرْبَعِيْنَ حَدِيْثًا فِىْ اَمْرِ دِيْنِهَا بَعَثَهُ اللّٰهُ فَقِيْهًا وَكُنْتُ لَهٗ يَوْمَ

ترجمہ : روایت ہے حضرت ابوالدرداءؓ سے فرماتے ہیں کہ نبی صلعم سے پوچھا گیا کہ اس علم کی حد کیا ہے جہاں انسان پہنچے تو عالم ہو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو میری امت میں سے چالیس احکام دین کی حدیثیں حفظ کرے اسے اللہ فقیہ اٹھائے گا۔ اور قیامت کے دن میں اس کا شفیع اور گواہ ہوں گا۔

الْقِيَامَةِ شَافِعًا وَّشَهِيدًا

قولهٗ مَا حَدُّ الْعِلْمِ : اِنَّ الْمُرَادَ بِالْحَدِّ الْمِقْدَارُ یعنی علم کی کونسی مقدار مراد ہے۔

قولهٗ كَانَ فَقِيهًا ۔ اس سے مراد اصطلاحی فقیہ نہیں بلکہ وہ عالم مراد ہے جو عالمِ آخرت میں زُمرۂ علمار میں اٹھایا جائے۔

قولهٗ حَفِظَ عَلٰى اُمَّتِيْ ۔ علامہ نووی ؒ نے لکھا ہے کہ حفظ سے مراد نقل حدیث ہے اگرچہ یاد نہ ہوں یعنی چالیس حدیثیں جمع کرکے لوگوں تک پہنچائے۔ ضروری نہیں کہ یاد بھی ہوں۔

قولهٗ فِي اَمْرِ دِينِهَا : یہ قید لگاکر ان احادیث کا اخراج کرنا مقصود ہے جن کا تعلق اخبارِ غیب سے ہے کیونکہ ان کا دین کے ساتھ اعتقاداً وعملاً تعلق نہیں ہے۔

قولهٗ بَعَثَهُ اللّٰهُ فَقِيهًا ۔ یعنی قیامت کے دن علمار وفقہار کے زمرہ میں اٹھایا جائے گا۔

یقول ابوالاسعاد : حدیث مذکورہ کے بہت پہلو ہیں۔ چالیس حدیثیں یاد کرکے مسلمانوں کو سنانا، چھاپ کران میں تقسیم کرنا، ترجمہ یا شرح کرکے لوگوں کو سمجھانا۔ راویوں سے سنکر کتابی شکل میں جمع کرنا سب ہی اس میں داخل ہیں یعنی جو کسی طرح دینی مسائل کی چالیس حدیثیں میری امت تک پہنچادے تو قیامت میں اس کا حشر علمائے دین کے زمرہ میں ہوگا اور میں اس کی خصوصی شفاعت اور اس کے ایمان وتقوٰی کی خصوصی گواہی دوں گا۔ ورنہ عمومی شفاعت اور گواہی تو ہر مسلمان کو نصیب ہوگی۔

اسی حدیث کی بنار پر قریبًا تمام محدثین ؒ نے جہاں حدیثوں کے دفتر لکھے وہاں علیحدہ چہل حدیثیں جنہیں اربعینات کہتے ہیں جمع کیں۔ امام نووی ؒ اور شیخ محدث عبدالحق دہلوی ؒ کی اربعینات مشہور ہیں۔

وَعَنْ اَنَسٍؓ ابْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلْ تَدْرُوْنَ مَنْ اَجْوَدُ جُوْدًا قَالُوا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى اَجْوَدُ جُوْدًا۔

ترجمہ: روایت ہے حضرت انسؓ بن مالکؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تم جانتے ہو کہ بڑا سخی کون ہے؟ عرض کیا کہ اللہ اور رسول بہتر جانتے ہیں فرمایا اللہ تعالیٰ بڑا اجود ہے۔

قولہٗ هَلْ تَدْرُوْنَ : بمعنی هَلْ تَعْلَمُوْنَ کیا تم جانتے ہو۔

قولہٗ اَجْوَدُ جُوْدًا : عند البعض اجود بمعنی اکثر جود بمعنی کرمًا ای اکثر کرمًا۔ مگر جمہور حضرات کے نزدیک اجود بمعنی اکبر اور جود بمعنی سخی یعنی تم میں سے بڑا سخی کون ہے۔

قولہٗ اَعْلَمُ : اَعْلَمُ اسم تفضیل کا صیغہ ہے اس کا تعلق لفظ اَللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ کے ساتھ ہے لیکن نسبت کا فرق ہے۔ اللہ پاک کی عالمیّت کلی ہے یعنی تمامی مخلوق سے۔ لیکن رسول اللہ کی طرف نسبت عالمیّت اضافی ہے یعنی ہم سے زیادہ عالم وجاننے والے ہیں۔

قولہٗ اللّٰهُ تَعَالٰى اَجْوَدُ جُوْدًا۔ محاورہ عرب میں عمومًا سخی اسے کہتے ہیں جو خود بھی کھائے اوروں کو بھی کھلائے۔ جوّاد وہ جو خود نہ کھائے اوروں کو کھلائے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ کو سخی نہیں کہا جاتا۔ سخی کے مقابل بخیل ہے جو خود کھائے اوروں کو نہ کھلائے۔ جوّاد کا مقابل ممسک ہے جو نہ کھائے نہ کھانے دے اللہ تعالیٰ کی تمام دنیوی اخروی نعمتیں دنیا کے لیے ہیں اس کے لیے نہیں۔

قولہٗ ثُمَّ اَنَا اَجْوَدُ بَنِيْ اٰدَمَ۔ یہ ارشاد فخرًا نہیں بلکہ شکرًا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ساری خلقت سے بڑے سخی ہیں۔ اس کا ظہور خاص طور پر رمضان المبارک میں ہوتا تھا۔ چنانچہ حدیث پاک میں آتا ہے کہ رمضان المبارک میں جو آدمی بھی جس چیز کو مانگتا آپ ضرور عنایت فرماتے چونکہ انسان اشرف الخلق ہے اس لیے اس کا ذکر فرمایا۔

سوال ۔ آدمؑ کو اجود والا حکم شامل نہیں ہوگا کیونکہ وہ بنی آدم میں داخل نہیں۔
جواب اوّل : جب بنی آدم مطلق بولا جائے تو آدمؑ اور اولادِ آدم سب کو شامل ہوتا ہے۔

جواب ثانی : حدیث پاک میں آتا ہے آدمُ مِنۡ دُوۡنِهٖ تَحۡتَ لِوَائِیۡ تو جیسے تحت لواء والے حکم میں آدمؑ و اولادِ آدم شامل ہیں تو اَجۡوَد والے حکم میں بھی شامل ہوں گے۔

قولہٗ رَجُلٌ عَلِمَ عِلۡمًا : یہاں رتبہ کی بُعدیت مُراد ہے نہ کہ زمانہ کی لہٰذا اس میں صحابہ کرامؓ اور تا قیامت علماء داخل ہیں یعنی میری سخاوت کے بعد عالم دین کا درجہ ہے کہ مال کی سخاوت سے علم کی سخاوت افضل ہے۔

قولہٗ اَمِیۡرًا وَحۡدَهٗ : اس کے دو مطلب ہیں۔ اوّل یعنی عزّت وعظمت کے لحاظ سے اس جماعت کی طرح ہوگا۔ جس میں باقاعدہ امیر و مامور ہوتے ہیں۔
دوم : یہ معنی ہیں کہ وہ خود مستقل امیر ہوگا کسی کے تابع نہ ہوگا۔

قولہٗ اَوۡ اُمَّةً وَحۡدَهٗ ۔ امۃ بمعنی گروہ وجماعت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ شخص ایک گروہ وجماعت کی مانند ہوگا یعنی مخلوقِ خدا کے درمیان معزز و مکرم ہوگا۔ کما فی قولہٖ تعالیٰ " اِنَّ اِبۡرَاهِیۡمَ كَانَ اُمَّةً وَّاحِدَةً" پ اُمَّةً وَّاحِدَةً کے بجائے اَوۡ اُمَّةٍ وَّاحِدٍ فرمایا۔ اشارہ کیا کہ راوی کو شک ہوگیا ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اَمِیۡرًا وَحۡدَهٗ فرمایا اُمَّةً وَّاحِدَةً نہیں فرمایا۔

وَعَنۡهُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنۡهُوۡمَانِ لَا يَشۡبَعَانِ مَنۡهُوۡمٌ فِى الۡعِلۡمِ لَا يَشۡبَعُ مِنۡهُ وَمَنۡهُوۡمٌ فِى الدُّنۡيَا لَا يَشۡبَعُ مِنۡهَا۔

ترجمہ : روایت ہے انہی سے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دو حریص سیر نہیں ہوتے ایک علم کا حریص جو اس سے سیر نہیں ہوتا اور دنیا کا حریص اس سے سیر نہیں ہوتا۔

قولهٗ مَنْهُوْمَانِ : ای حَرِيْصَانِ - یعنی دو حریص ہیں۔
قولهٗ لَا يَشْبَعَانِ : ای لَا يَقْنَعَانِ - یعنی تھوڑے پر قناعت نہیں کرتے زیادتی کی تمنا ہر وقت رہتی ہے۔
قولهٗ مَنْهُوْمٌ فِي الْعِلْمِ : ای حَرِيْصٌ فِي الْعِلْمِ اور جو حریص فی العلم ہوتا ہے وہ کبھی سیراب نہیں ہوتا۔ کما فی قوله تعالیٰ " قُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا فَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ "۔
قولهٗ مَنْهُوْمٌ فِي الدُّنْيَا : اس کی مثال مستسقی کی طرح ہے جس کو پیاس کی تکلیف ہو وہ کبھی سیراب نہیں ہوتا۔
قولهٗ مَتْنٌ مَشْهُوْرٌ فِيْمَا بَيْنَ النَّاسِ وَلَيْسَ لَهٗ اِسْنَادٌ صَحِيْحٌ
حضرت امام احمدؒ نے حضرت امام ابو داؤدؒ کی حدیث کے بارہ میں فرمایا ہے کہ اس کا متن لوگوں میں مشہور ہے مگر اس کی اسناد صحیح نہیں ہے۔ اس لیے امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے لیکن اس کے طرق متعدد ہیں جن میں بعض کو دوسرے بعض کی بناء پر تقویت ملی ہے لیکن ویسے بھی یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ فضائل اعمال کے سلسلہ میں ضعیف حدیث پر عمل کرنا جائز ہے۔

وَعَنْ عَوْنٍؒ قَالَ قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مَسْعُوْدٍؓ مَنْهُوْمَانِ لَا يَشْبَعَانِ - الخ۔

ترجمہ : روایت ہے حضرت عونؒ سے فرماتے ہیں فرمایا حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے کہ دو حریص ہیں کہ سیر نہیں ہوتے۔

قولهٗ لَا يَسْتَوِيَانِ - اَیْ فِي الْمَآلِ وَالْعَاقِبَةِ : انجام اور نتیجہ کے اعتبار سے برابر نہیں۔
قولهٗ فَيَتَمَادٰى - ای يَزْدَادُ وَيَتَوَسَّعُ : حب دنیا کے غلبہ کی وجہ سے رحمان سے دوری اور دنیا میں زیادتی یہ طغیان ہے اور طغیان بھی یہی ہوتا ہے کہ رحمت

خداوندی سے انسان دور ہو ای یَبْعُدُ عَنْ رَحْمَةِ الرَّحْمٰن

قولهٗ ثُمَّ قَرَأَ : پھر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے بطور استشہاد کے آیت مبارک تلاوت فرمائی۔

قولهٗ قَالَ قَالَ ۔ پہلے قَالَ کے قائل حضرت عون ہیں۔ دوسرے قَالَ کے قائل حضرت ابن مسعودؓ ہیں یعنی بَعْدَ قِرَأتِهٖ مَا سبق وهو قولهٗ " اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰى "، الخ۔

خُلَاصَةُ الْحَدِيث

یہ حدیث سابقہ حدیث کی تشریح ہے جس کو تفسیر الحدیث بالقرآن کہہ سکتے ہیں کہ دو بھوکے ہیں ایک کی بھوک بہتر ہے کہ اس سے رضائے باری تعالیٰ زیادہ ہوتی ہے کمَا فی قولهٖ تعالیٰ " اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا پ۲۲) جب خوفِ خدا ہوگا تو تقویٰ بھی ہوگا اور یہ ساری چیزیں علمِ دین کی وجہ سے آتی ہیں۔ دوسرا دنیا کا حریص اس میں طمع، لالچ، نافرمانی ہے جس کی وجہ سے عبادتِ خداوندی یا رضائے خداوندی سے دوری ہے یعنی مال کی محبت نے اس کو خدا سے دور کر دیا ہے علم دین ہو تو اس کو دنیا کی حقیقت واضح ہو۔ کما فی قولهٖ تعالیٰ " كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰى پ۳۰ اور یہ سرکشی اس وقت آتی ہے جب مال ہو" اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى "

وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اُنَاسًا مِّنْ اُمَّتِیْ سَيَتَفَقَّهُوْنَ فِی الدِّيْنِ وَيَقْرَءُوْنَ الْقُرْاٰنَ يَقُوْلُوْنَ نَاْتِی الْاُمَرَاءَ فَنُصِيْبُ مِنْ دُنْيَاهُمْ وَنَعْتَزِلُهُمْ بِدِيْنِنَا وَلَا يَكُوْنُ ذٰلِكَ

ترجمہ: روایت ہے حضرت ابن عباسؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ میری امت کے کچھ لوگ علم دین سیکھیں گے اور قرآن پڑھیں گے کہیں گے کہ ہم امیروں کے پاس جائیں ان کی دنیا لے آئیں اپنا دین بچائیں لیکن ایسا نہیں ہوگا۔

قولهٗ يَقْرَؤُنَ الْقُرْاٰنَ : قرآن مقدس کی تخصیص اہتمام شان کے لئے ہے
قولهٗ نَأْتِي الْاُمَرَاءَ : لَا لِحَاجَةٍ ضَرُوْرِيَّةٍ اِلَيْهِمْ بَلْ لِاِظْهَارِ الْفَضِيْلَةِ وَالطَّمَعِ۔
قولهٗ فَنُصِيْبُ۔ اي نَاْخُذُ وَ نَحْصِلُ۔
قولهٗ وَ نَعْتَزِلُهُمْ۔ اي نَبْعُدُ عَنْهُمْ بِدِيْنِنَا یعنی دنیا کا حصہ ان سے لے لیں اور اپنا دین بچا لائیں۔
قولهٗ وَلَا يَكُوْنُ ذَالِكَ۔ اى لا يصح ما ذكر من الجمع بين الضدين : یعنی دنیا کا حصول اور دین کا بچانا یہ ضدین کو جمع کرنا ہے جو غیر صحیح ہونے کے ساتھ ممکن بھی ہے۔
قولهٗ كَمَا لَا يُجْتَنٰى : اى لا يُؤْخَذُ۔
قولهٗ مِنَ الْقَتَادِ : بِفَتْحِ الْقَافِ اِسْمُ شَجَرَةٍ كُلُّهٗ شَوْكٌ؟ قتاد اس درخت کو کہتے ہیں جو غیر مثمر اور کانٹے دار ہو۔
قولهٗ الشوك : کانٹے کو کہتے ہیں کہ غیر مثمر درخت سے زخم اور کانٹے ہی مل سکتے ہیں اور کچھ نہیں ملتا۔ یہی حال مجلس امراء کا ہے لہذا نہ جانا ہی بہتر ہے۔
قولهٗ اِلَّا قَالَ مُحَمَّدُ بنُ الصَّبَّاحِ كَاَنَّهٗ يَعْنِي الْخَطَايَا۔ اس عبارت کا مقصد یہ ہے کہ آنحضرت ؐ نے اِلَّا کے بعد کسی لفظ کا تکلم نہیں فرمایا چنانچہ محمد بن الصباحؒ جو ایک جلیل القدر محدث اور امام بخاریؒ و امام مسلمؒ ائمہ حدیث کے استاذ ہیں اس کی وضاحت فرما دی کہ آپ کی مراد لفظ اِلَّا کے بعد خطایا ہے۔ مگر آپ نے اسے حذف فرمایا اور اس کا تکلم نہیں کیا۔ اب حدیث پاک کے الفاظ یوں ہوں گے "لَا يُجْتَنٰى مِنْ قُرْبِهِمْ اِلَّا الْخَطَايَا" یعنی امراء کی صحبت سے حاصل نہیں ہوتے مگر گناہ۔

سوال : آپ ؐ نے لفظ خطایا کو حذف کیوں فرمایا؟

جواب : ایک نکتہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے وہ نکتہ یہ ہے کہ اس میں اس طرف اشارہ مقصود ہے کہ امراء کی صحبت کا نقصان اتنا زیادہ ہے کہ اسے زبان سے

بیان نہیں کیا جا سکتا۔

خُلَاصَۃُ الحَدِیث

یہ ہے کہ اس امت میں ایسے عالم پیدا ہوں گے جن کا مقصد حصولِ علم سے محض یہ ہوگا کہ وہ علم حاصل کر کے اور قرآن پڑھ کر امراء کے پاس جائیں اور ان کے سامنے اپنی بزرگی و فضیلت کا اظہار کر کے ان سے مال و دولت حاصل کریں اور علم کا جو حقیقی منشاء ہوگا یعنی مخلوق خدا کی ہدایت اور عوام الناس کی بغیر کسی لالچ اور طمع کے دینی راہبری اس سے انہیں قطعًا کوئی مطلب نہ ہوگا۔ اور جب ان سے کہا جائے گا کہ کس طرح ممکن ہے کہ بیک وقت تفقہ فی الدین اور امراء کی قربت و صحبت جمع ہو جائے تو وہ جواب میں یہ کہیں گے کہ ہم ان سے مال و دولت تو حاصل کریں گے مگر اپنے دین کو ان سے بچائیں گے۔ اور اس کی حفاظت کریں گے حالانکہ یہ امر محال ہے۔

وَعَنْ عَبْدِ اللّٰہِؓ بْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ لَوْ اَنَّ اَھْلَ الْعِلْمِ صَانُوا الْعِلْمَ وَوَضَعُوْہُ عِنْدَ اَھْلِہٖ لَسَادُوْا بِہٖ اَھْلَ زَمَانِھِمْ وَلٰکِنَّھُمْ بَذَلُوْہُ لِاَھْلِ الدُّنْیَا لِیَنَالُوْا بِہٖ مِنْ دُنْیَاھُمْ فَھَانُوْا عَلَیْھِمْ

ترجمہ: روایت ہے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے فرماتے ہیں کہ اگر علماء علم محفوظ رکھتے اور اسے اہل پر ہی پیش کرتے تو اس کی برکت سے اپنے زمانہ والوں کے سردار ہوتے مگر انہوں نے علم دنیا داروں کے لیے خرچ کیا تاکہ اس سے ان کی دنیا کمائیں اس سے وہ ان پر ہلکے ہو گئے۔

قولہٗ : صَانُوْہُ۔ ای حفظوہ اس کی حفاظت کرتے۔

قولہٗ عِنْدَ اَھْلِہٖ : اَہل سے مراد کون ہیں عند البعض اہل سے مراد قدردان علم ہیں یعنی جن لوگوں کے دلوں میں علم دین کی قدر ہے اگرچہ جاہل بھی کیوں نہیں لیکن اکثر محدّثینؒ حضرات کے نزدیک اَہل سے مُراد اھلُ العلم یعنی عُلماء حضرات ہیں۔

قولہٗ لَسَادُوا : یہ سیادت سے ہے بمعنی سرداری یعنی علم کی حفاظت کے سبب ان کو سرداری ملتی ۔ کما فی قولہٖ تعالیٰ " یَرۡفَعِ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ وَالَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ دَرَجٰتٍ " پ۲۸ المُجادلہ)

قولہٗ فَھَانُوۡا : ای ذَلُّوۡا اَھۡلَ الۡعِلۡمِ :

قولہٗ نَبِیُّکُمۡ : یہ خطاب توبیخ مخاطبین کے طور پر ہے ورنہ ہر مسلم و مؤمن کیلئے نبی ہیں ۔

قولہٗ ھُمُوۡمٌ : ای الحُزن یعنی سارے غموں کو چھوڑ کر ایک غم بنا لیتا ہے تو اللہ پاک اس کے بدلہ میں اس کے دنیا کے تمام غموں کے لیے کافی ہو جاتے ہیں ۔

قولہٗ تَشَعَّبَتۡ : ای تفرقت الھموم یعنی پراگندہ کرتا ہے اپنے غموں کو کبھی اس غم پر پریشان ہوتا ہے تو کبھی دوسرے غم پر ۔

قولہٗ ھَلَکَ : ای لَا یَکۡفِیۡہِ ھَمٌّ دُنۡیَاہُ وَلَا ھَمُّ اٰخِرَاہُ یہ اس انسان کے مثل ہے جس کے متعلق عزّ وجلّ علا فرماتے ہیں " خَسِرَ الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَۃَ ذٰلِکَ ھُوَ الۡخُسۡرَانُ الۡمُبِیۡنُ " پ۱۷ س الحجّ)

وَعَنِ الۡاَعۡمَشِؓ قَالَ قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ اٰفَۃُ الۡعِلۡمِ النِّسۡیَانُ وَاِضَاعَتُہٗ اَنۡ تُحَدِّثَ بِہٖ غَیۡرَ اَھۡلِہٖ :

ترجمہ : روایت ہے حضرت اعمشؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے کہ علم کی آفت بھول جانا ہے اور اس کی بربادی یہ ہے کہ نا اہل پر بیان کرو ۔

قولہٗ اٰفَۃُ الۡعِلۡمِ : آفت دو قسم ہے ۱۔ قبلی علم حاصل کرنے سے پہلے جو آفات پیش آتی ہیں مثلاً زادِ راہ کی کمی یا ازدواجی حقوق وغیرہ ۔ ۲۔ بعدی جو حصولِ علم کے بعد پیش آئیں ۔ محدثینؒ حضرات کے نزدیک آفت بعدی مراد ہے کیونکہ نسیان حصولِ علم کے بعد ہی آتا ہے ۔

یقول ابوالاسعاد : علم حاصل ہونے سے پہلے تو بہت سی آفات اور مصیبتیں ہوتی ہیں "لِکُلِّ شَیْئٍ اٰفَۃٌ وَلِلْعِلْمِ اٰفَاتٌ" یعنی ہر چیز کی ایک ہی آفت ہوتی ہے مگر علم کے لیے بہت سی آفات ہیں کیونکہ جس چیز کا شان اونچا ہوتا ہے اس کی رکاوٹیں بھی بہت اونچی ہوتی ہیں لیکن حصولِ علم کے بعد ایک ہی آفت ہے اور وہ ہے نسیان یعنی بھولنا ہے اور یقیناً کسی چیز کے حاصل ہوجانے کے بعد زائل ہو جانا اور ذہن میں آکر پھر محو ہوجانا زبردست رُوحانی اذیت ہے۔

سوال ۔ جب علم کی آفت نسیان ہے تو نسیان شریعت مُقدسہ میں غیر اختیاری چیز ہے پھر اس سے انسان کیسے بچ سکتا ہے۔

جواب : حدیث پاک کا مقصد یہ ہے کہ نسیان کے اسباب سے بچے اور اسباب نسیان اختیاری ہیں۔ دراصل حدیثِ باب سے اس بات پر تنبیہ مقصود ہے کہ طالبِ علم اور اہلِ علم کو چاہیے کہ وہ ایسی باتوں سے اجتناب کریں جو نسیان کا سبب ہیں یعنی گناہ ومعصیت سے بچیں اور ان چیزوں سے دل نہ لگائیں جو ذہن و فکر کو غافل کردیتی ہیں جیسے دنیا کی چمک دمک اور خواہشاتِ نفسانی میں دلچسپی لینا چنانچہ امام شافعیؒ نے اسی مضمون کو اس شعر میں ادا کیا ہے ؎

شَکَوْتُ اِلٰی وَکِیْعٍ سُوْءَ حِفْظِیْ فَاَوْصَانِیْ اِلٰی تَرْکِ الْمَعَاصِیْ

ترجمہ : میں نے اپنے استاذ وکیع سے اپنے حافظہ کی کمزوری کی شکایت کی تو انہوں نے نے مجھے ترکِ معصیت کی نصیحت کی۔

فَاِنَّ الْعِلْمَ فَضْلٌ مِّنَ الٰہٖ وَ فَضْلُ اللّٰہِ لَا یُعْطٰی لِعَاصِیْ

ترجمہ: کیونکہ علم تو خدا کا ایک فضل ہے۔ اور خدا کا فضل گنہ گار کے حصہ میں نہیں آتا

(اشعۃ اللمعات ص۱۷۵ ج۱)

قولہٗ وَاِضَاعَتُہٗ : ای جَعْلُ الْعِلْمِ ضَائِعًا۔

قولہٗ اَنْ تُحَدِّثَ غَیْرَ اَھْلِہٖ : بِاَنْ لَا یَفْھَمَہٗ اَوْ لَا یَعْمَلُ بِہٖ مِنْ اَرْبَابِ الدُّنْیَا۔ اس جملہ کا مقصد یہ ہے کہ علم اس کے نااہل اور ناقدردان کے سامنے پیش کرنا دراصل علم کو ضائع کرنا ہے اور نااہل وہ شخص ہے جو نہ تو علم کو

سمجھتا ہے اور نہ علم کی قدر جانتا ہے۔ لہٰذا جب اس کے سامنے علم پیش کیا جائے گا تو علم ضائع ہوگا۔ اس لیے علم انہی کو سکھانا چاہیے جو اس کے اہل اور قدر دان ہوں یعنی وہ علم سمجھنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں اور اس پر عمل کرنے کا جذبہ بھی ان کے اندر موجود ہو۔ بقول عارف ؎

بے ادب را علم وفن آموختن ‌ ‌ ‌ دادن تیغے بدست راہزن

وَعَنْ سُفْيَانَ اَنَّ عُمَرَ رض بْنَ الْخَطَّابِ قَالَ لِكَعْبٍ رض مَنْ اَرْبَابُ الْعِلْمِ قَالَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ بِمَا يَعْلَمُوْنَ..... قَالَ فَمَا اَخْرَجَ الْعِلْمَ مِنْ قُلُوْبِ الْعُلَمَاءِ قَالَ الطَّمَعُ

ترجمہ: روایت ہے حضرت سفیان رض سے کہ حضرت عمر رض ابن الخطاب نے حضرت کعب رض سے فرمایا کہ اہل علم کون لوگ ہیں فرمایا جو اپنے علم پر عمل کرتے ہیں فرمایا کہ علماء کے دل سے علم کس چیز نے نکال دیا فرمایا لالچ نے۔

قولہٗ لِكَعْبٍ رض : سوال کو ان کے ساتھ کیوں خاص کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تورات کے حافظ تھے۔ اور تورات کے جمیع علوم سے واقفیت رکھتے تھے یعنی مولوی تھے اس لیے سوال بھی کیا اور مَنْ اَرْبَابِ الْعِلْمِ بھی فرمایا اور ارباب العلم سے اصحاب العلم مُراد ہیں۔

خُلاصَةُ الحَدِيث

حضرت عمر رض کے سوال کا مطلب یہ تھا کہ علماء کے دلوں سے نور علم اور علم کی عظمت وبرکت کو نکالنے والی کون سی چیز ہے اور وہ کیا شئی ہے جس کی موجودگی علم کے منافی ہے۔ حضرت کعب رض نے فرمایا کہ لالچ۔ اور لالچ وہ بری خصلت ہے جو علم کے نور کو عالم کے دل سے ضائع کر دیتی ہے کیونکہ جب کسی عالم کے اندر جاہ وجلال کی محبت اور لالچ اور دنیاوی اسباب عیش وعشرت کی طمع پیدا ہوجائے گی تو پھر علم کا نور اور علم کی برکت اپنی جگہ چھوڑ دیں گے اور عالم کے دل ودماغ علم کی تحقیقی روشنی

سے منور نہ رہ سکیں گے۔

وَعَنِ الْاَحْوَصِ ابْنِ حَكِيْمٍ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ سَأَلَ رَجُلٌ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الشَّرِّ فَقَالَ لَا تَسْئَلُوْنِيْ عَنِ الشَّرِّ وَسَلُوْنِيْ عَنِ الْخَيْرِ يَقُوْلُهَا ثَلَاثًا ثُمَّ قَالَ اِنَّ شَرَّ الشَّرِّ شِرَارُ الْعُلَمَاءِ وَاِنَّ خَيْرَ الْخَيْرِ خِيَارُ الْعُلَمَاءِ:

ترجمہ: روایت ہے حضرت احوص ابن حکیم سے وہ اپنے والد سے راوی فرماتے ہیں کہ کسی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے برائی کی بابت پوچھا تو فرمایا کہ مجھ سے برائی کی بابت نہ پوچھو بھلائی کے متعلق پوچھو تین بار فرمایا، پھر فرمایا آگاہ رہو کہ بدترین شریر برے علماء ہیں اور اچھوں سے اچھے بہترین علماء ہیں۔

قولہ سَأَلَ رَجُلٌ النَّبِيَّ عَنِ الشَّرِّ۔ رَجُلٌ سے مراد صحابی رسول ہیں۔ صحابیؓ کے سوال کا مقصد یا تو نفس برائی کے بارہ میں دریافت کرنا تھا جیساکہ ترجمہ سے معلوم ہوا یا وہ یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ بدترین آدمی کون ہے۔ اب جواب کو دیکھتے ہوئے یہی مقصد ثانیہ زیادہ واضح ہے۔

قولہٗ لَا تَسْأَلُوْنِيْ عَنِ الشَّرِّ: یعنی صرف شر کا سوال نہ کرو بلکہ شر مع الخیر کیونکہ اَلْاَشْيَاءُ تُعْرَفُ بِاَضْدَادِهَا:

سوال: آپؐ نے اس طرح کے سوال سے کیوں منع فرمایا؟

جواب: چونکہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سراپا رحمت اور سراپا خیر ہے اس لیے یہ بات مناسب نہیں ہے کہ آپؐ سے محض بدی اور برائی ہی کا سوال کیا جاتا۔ یعنی میں جمال وجلال دونوں کا مظہر ہوں بلکہ جمال ورحمت کا زیادہ مظہر ہوں "کما قال تعالیٰ" وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (پ۱۷) بہر حال یہ نہی اس وجہ سے ہے کہ آنحضرتؐ کی ذات بابرکات کو فقط جلال کا غالب

منظر سمجھ لیا جائے۔

قولہٗ یَقُوْلُھَا ۔ اس کے مرجع میں دو قول ہیں ۱ اس کا مرجع وَسَلُوْنِیْ عَنِ الْخَیْرِ ہے ۲ اس کا مرجع دونوں ہیں وَسَلُوْنِیْ عَنِ الْخَیْرِ وَسَلُوْنِیْ عَنِ الشَّرِ

قولہٗ اِنَّ شَرَّ الشَّرِّ شِرَارُ الْعُلَمَآءِ : شر تین معنوں میں مستعمل ہے بُدْ، بدترین، بُرے ۔ اسی طرح خیر بھی تین معنوں میں مستعمل ہے۔ نیک ۔ نیک ترین بہترین ۔ اور یہاں آخری معنیٰ مراد ہیں ۔ اور ہمزہ کے ساتھ اَشَرُّ کا استعمال ضعیف ہے ۔حدیث کا مطلب یہ ہے کہ آخرت میں بدترین عذاب و مقام علماءِ سوء کا ہوگا اور بہترین ثواب و مقام علماء خیار کا ہوگا۔

سوال : علماء کی تخصیص کیوں فرمائی ؟

جواب : تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ علماء کی ذات چونکہ عوام کے اندر ایک معیار اور نمونہ ہوتی ہے اور لوگ ان کے تابع و معتقد ہوتے ہیں ۔ لہذا عالم کی ہر صفت اس کی اپنی ذات تک محدود نہیں رہتی بلکہ اس کے اثرات دوسروں تک بھی پہنچتے ہیں ۔ عالم اگر نیک اخلاق و عادات کا مالک ہوتا ہے تو اس کے ماننے والے اور اتباع کرنے والے بھی نیک اخلاق و عادات کے مالک ہوتے ہیں ۔ اور اگر خدا نخواستہ عالم بداخلاق ، بدکردار ہوجائے تو پھر اس کے جراثیم دوسرے تک پہنچتے ہیں اور اس کے ماننے والے بھی اسی رنگ میں رنگ جاتے ہیں ۔

وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَآءِ رض قَالَ اِنَّ مِنْ اَشَرِّ النَّاسِ عِنْدَ اللّٰہِ مَنْزِلَۃً یَوْمَ الْقِیَامَۃِ عَالِمٌ لَا یَنْتَفِعُ بِعِلْمِہٖ :

ترجمہ : روایت ہے حضرت ابو الدرداء رض سے فرماتے ہیں قیامت کے دن اللہ کے نزدیک بدتر درجہ والا وہ عالم ہے جس نے اپنے علم سے نفع حاصل نہیں کیا۔

قولہٗ عَالِمٌ لَا یَنْتَفِعُ : عالم سے مراد کون سا عالم ہے اس میں دو قول ہیں

اوّل : وہ عالم مراد ہے جس نے ایسا علم سیکھا جو فائدہ پہنچانے والا نہیں یعنی غیر شرعی علوم حاصل کیے جو نفع بخش نہیں ہیں۔
دوئم : یا پھر وہ عالِم مراد ہے جس نے علم تو شرعی یا دینی حاصل کیا مگر اس پر عمل نہیں کیا۔

خُلاصَۃُ الحَدِیث

ایسے عالِم کے بارہ میں کہا جا رہا ہے جو قیامت کے دن مرتبہ کے لحاظ سے وہ خدا کے نزدیک سب سے بدتر ہوگا یعنی یہ جاہل سے بھی زیادہ برا ہوگا یہی وجہ ہے کہ اس پر جو عذاب ہوگا وہ جاہل کے عذاب سے سخت ہوگا جیسا کہ منقول ہے ؎

وَیْلٌ لِلْجَاھِلِ مَرَّۃً وَوَیْلٌ لِلْعَالِمِ سَبْعُ مَرَّاتٍ

ترجمہ : جاہل کے لیے ایک مرتبہ بربادی ہے۔ اور عالِم کے لیے سات مرتبہ بربادی ہے۔

وَعَنْ زِیَادِ بْنِ جَرِیْرٍ رض قَالَ قَالَ لِیْ عُمَرُ ھَلْ تَعْرِفُ مَا یَھْدِمُ الْاِسْلَامَ قَالَ قُلْتُ لَا قَالَ یَھْدِمُہٗ زَلَّۃُ الْعَالِمِ وَجِدَالُ الْمُنَافِقِ بِالْکِتَابِ وَحُکْمُ الْاَئِمَّۃِ الْمُضِلِّیْنَ ؛

ترجمہ : روایت ہے حضرت زیاد بن جریر رض سے فرماتے ہیں کہ مجھ سے حضرت عمر رض نے فرمایا کہ کیا جانتے ہو کہ اسلام کو کیا چیز ڈھاتی ہے میں نے کہا نہیں فرمایا اسلام کو عالم کی لغزش اور منافق کا قرآن میں جھگڑنا اور گمراہ کن سرداروں کی حکومت تباہ کرے گی۔

قولہٗ مَا یَھْدِمُ الْاِسْلَامَ : یَھْدِمُ الْاِسْلَامَ کے دو معنیٰ ہیں :۔
اوّل یَھْدِمُ ای یزیل عِزَّۃَ الْاِسْلَامِ کہ وہ کون سی چیز ہے جو اسلام کی عزت کو منہدم کردے۔
دوئم : یَھْدِمُ کا اصل معنیٰ ہے اسقاط البناء تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسلام کی عمارت اسلام کے پانچ بنیادی اصول کلمہ توحید۔ نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ۔ حج

متروک ہوجائیں ان پر عمل کرنا چھوڑ دیں۔

قولہٗ قُلْتُ لَا : ای لا اعرف۔

قولہٗ زَلَّۃُ الْعَالِمِ : زَلّۃ کا معنیٰ ہے ای اعرض عن طریق الصحیح صحیح راستہ سے ہٹنا۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ جب عالم اپنے حقیقی فرائض امر بالمعروف نہی عن المنکر کی ادائیگی کو اپنی خواہشات پر قربان کر دے تو دین میں فساد آجاتا ہے کیونکہ مشہور ہے زلّۃ العالِم زلّۃ العالَم۔

قولہٗ جِدَالُ الْمُنَافِقِ بِالْکِتَابِ : جدال کی تفسیر ہو چکی ہے مگر اس مقام پر جدال سے مراد تاویلات فاسدہ ہیں جس کے ذریعہ اقامت بدعات میں غلو کرنا۔ اور منافق سے مراد بدعتی ہے یعنی منافق جو بظاہر تو اسلام کا دم بھرتا ہے مگر اندرونی طور پر کفر و بدعات کا پورا ہمنوا ہے۔ قرآن پاک کے ساتھ جھگڑتا ہے اور غلط تاویلات کر کے احکام شرعیہ کو رد کرتا ہے اور دین میں فساد پیدا کرتا ہے

قولہٗ وَحُکْمُ الْاَئِمَّۃِ الْمُضِلِّیْنَ : ای ظہور ظلم الائمۃ المضلین۔ ضالین کے بجائے مضلین فرمایا ازدیاد قباحت کے لیے کہ خود بھی گمراہ دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔

وَعَنِ الْحَسَنِؒ قَالَ الْعِلْمُ عِلْمَانِ فَعِلْمٌ فِی الْقَلْبِ فَذَاکَ الْعِلْمُ النَّافِعُ وَعِلْمٌ عَلَی اللِّسَانِ فَذَاکَ حُجَّۃُ اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ عَلٰی ابْنِ اٰدَمَؑ :

ترجمہ : روایت ہے حضرت حسنؒ سے فرماتے ہیں کہ علم دو طرح کے ہیں۔ ایک علم دل میں یہ علم فائدہ مند ہے۔ دوسرا علم صرف زبان پر۔ یہ انسان پر اللہ تعالیٰ کی حجت ہے۔

قولہٗ فَذَاکَ الْعِلْمُ النَّافِعُ : علم باطن کو نافع اس لیے کہا کہ اصلاً علم باطنی ہوتا ہے جب تک باطن پاک نہ ہوگا علم کسی کام کا نہ ہوگا۔ علم نافع

کی دو قسمیں ہیں ۱ ایک تو علم معاملہ جو عمل کا باعث ہوتا ہے ۲ علم مکاشفہ جو عمل کا اثر ہوتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں اس کے دل میں یہ نورِ علم ڈال دیتے ہیں۔ اور حضرت حسن بصریؒ نے جس علم کو نافع قرار دیا ہے وہ یہی علم ہے اور جو علم زبان کے اوپر ہوتا ہے یہ وہ علم ہوتا ہے تاثیر رکھتا ہے اور نہ دل میں نورانیت پیدا کرتا ہے ؎

علم چوں بر دل زند یارے شود   علم چوں بر تن زند مارے شود

قولہٗ حُجَّۃُ اللّٰہِ : خدا کی حجت اور دلیل یہ ہے کہ خدا بندوں کو الزام دیتے ہوئے فرمائے گا کہ میں نے جو تمہیں علم دیا تھا تم نے اس پر عمل کیوں نہیں کیا۔ یَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ۔

وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ حَفِظْتُ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وِعَائَیْنِ فَاَمَّا اَحَدُهُمَا فَبَثَثْتُهٗ فِیْکُمْ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَلَوْ بَثَثْتُهٗ قُطِعَ هٰذَا الْبُلْعُوْمُ یَعْنِیْ مَجْرَی الطَّعَامِ۔

ترجمہ : روایت ہے حضرت ابوہریرہؓ سے فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے علم کے دو برتن محفوظ کیے ایک تو تم میں پھیلا دیا۔ اور دوسرا اگر اسے پھیلاؤں تو یہ کاٹ ڈالا جائے یعنی گلا۔

قولہٗ وِعَائَیْنِ : وِعَائَیْن کا اصل معنیٰ تو ہے ظرف یعنی برتن مگر یہاں وِعَائَین ظرف والے معنیٰ میں نہیں بلکہ مظروف یعنی نوعین کے معنیٰ میں ہے معنیٰ ہوگا کہ میں نے دو طرح کے علم حاصل کیے یعنی ذکر محل کا ہے ارادہ حال کا ہے کیونکہ برتن تو یاد نہیں کیے جاتے۔

قولہٗ فَبَثَثْتُهٗ : ای اظهرتُهٗ بِالنَّقْلِ۔ اس علم کو میں نے نقل کے ذریعہ ظاہر و بیان کر دیا ہے۔

قولهٗ بَلعُوْمُ : بَلعُوْمُ کی تفسیر خود راوی نے کردی ہے یعنی مجری الطّعام، طعام کے جاری ہونے کی جگہ جس کو گلا یا حُلقُوم کہتے ہیں۔

خُلَاصَۃُ الحَدِیْث

حضرت ابوہریرۃؓ فرماتے ہیں کہ میں نے دو قسم کے علوم حاصل کیے۔ ایک کی میں نے نشر و اشاعت کردی ہے اور اس سے مراد وہ احادیث ہیں جن کا تعلّق شریعت کے اوامر نواہی سے ہے جن میں عقائد اعمال اور اخلاق کے مُتعلق ہدایات دی گئی ہیں۔ رہا قسم ثانی وہ اگر میں بیان کروں تو میرا گلا کاٹ دیں۔

مُحدّثین حضرات نے بحث کی ہے کہ وہ علوم کون سے ہیں جن کے مُتعلّق فرما رہے ہیں قُطِعَ ھٰذَا البَلعُوْمُ اس میں دو قول ہیں :۔

قول اوّل : اوّل علم سے مُراد علم ظاہر ہے اور علم ثانی سے مُراد علم باطن ہے یعنی تصوّف کے وہ اسرار و معارف جو عامّۃ النّاس کے فہم سے بالاتر ہیں اور ان کے بیان کرنے میں بسا اوقات جان کا خطرہ ہوتا ہے بلکہ اس کے اظہار میں عوام کی گمراہی کا بھی خطرہ ہوتا ہے مثلاً فنا فی اللہ کا مقام وحدۃُ الوجود، وحدۃُ الشّہود۔ امکان کذب وغیرہ۔ قول دوئم : علّامہ ابہریؒ فرماتے ہیں کہ علم ثانی سے مراد وہ احادیث ہیں جن میں امراءِ جُور کا تذکرہ اور ان کے حالات، ان کی مذمت، ان کے دورِ حکومت کا ذکر ہے۔ حضرت ابوہریرۃؓ کبھی کبھی کسی آدھ کا ذکر بھی فرما دیا کرتے تھے۔

سوال : حضرت ابوہریرۃؓ کا علوم کو چھپانا یہ تو کتمان علم کی وعید کے تحت ہے لہٰذا کیسے بیان نہیں فرمایا؟

جواب : یہ کہ وعید اس علم کے چھپانے پر ہے جس کا تعلّق اصلاح عقائد و اعمال و اخلاق سے ہے اور ان کے چھپانے پر لوگوں کا دینی نقصان ہوتا ایسے علوم جن کے چھپانے پر رخنہ پڑتا ہو تو ان کو چھپانے کی اجازت ہے۔ نیز یہ علوم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے بطور راز بتائے تھے ان کو راز میں رکھنا ضروری تھا۔

وَعَنْ عَبْدِ اللّٰہِؓ قَالَ | ترجمہ : روایت ہے حضرت

اَيُّهَا النَّاسُ مَنْ عَلِمَ شَيْئًا فَلْيَقُلْ بِهٖ وَمَنْ لَّمْ يَعْلَمْ فَلْيَقُلْ اَللّٰهُ اَعْلَمُ فَاِنَّ مِنَ الْعِلْمِ اَنْ تَقُوْلَ لِمَا لَا تَعْلَمُ اَللّٰهُ اَعْلَمُ ؛

عبداللہؓ سے فرمایا اے لوگو جو کوئی کچھ جانتا ہو تو بیان کر دے اور جو نہ جانتا ہو وہ کہدے اللہ جانے کیونکہ علم یہی ہے جسے تم نہ جانو تو کہدے اللہ جانے۔

قولہٗ اَلنَّاسُ : خطاب عمومی ہے مگر علماء کو خاص طور پر شامل ہے۔

قولہٗ شَيْئًا : علوم دینیہ مُراد ہیں۔

قولہٗ وَمَنْ لَّمْ يَعْلَمْ فَلْيَقُلْ : اى فى الجواب ؛

قولہٗ اَللّٰهُ اَعْلَمُ : كما قالت الملائكة (لا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا)

ذكر الزمخشرىؒ فى "ربيع الابرار" اِنَّ عَلِيًّا كرّم الله وجهه سُئِلَ عَنْ شَيْئٍ وَهُوَ عَلَى المنبر فقال لا ادرى فقيل كيف تقول لا ادرى و انت طلعت فوق المنبر فقال علىؓ انّما طلعت بقدر علمى ولو طلعتُ بمقدار جهلى لبلغت السمآء۔

خُلاصَةُ الحَديث

اس حدیث میں تصنع علمی سے روکا جارہا ہے ثانیاً اپنی کم علمی کا اقرار کرنا سکھایا جارہا ہے۔

"وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا" پھر حضرتؓ نے بطور استشہاد کے آیت مُبارک پڑھی اس میں بھی تکلّف سے منع کردیا گیا ہے۔ مزید تکلّف کی وضاحت مشکوٰۃ شریف صہ۳۲ ج ۱ بابُ الاعتصام فصلِ ثالث میں گذر چکی ہے۔

وَعَنِ ابْنِ سِيْرِيْنَؒ قَالَ اِنَّ هٰذَا الْعِلْمَ دِيْنٌ فَانْظُرُوْا عَمَّنْ تَاْخُذُوْنَ دِيْنَكُمْ ؛

ترجمہ : روایت ہے حضرت ابن سیرینؒ سے فرماتے ہیں کہ علم دین ہے۔ لہذا غور کرو کہ اپنا دین کس سے حاصل کرتے ہو۔

قولہٗ اِبْنِ سِیْرِیْنَ ؒ : ان کا نام محمدؒ ہے مشہور تابعی اور معتبر ہیں ۔ سیرین عَلَمیت اور یاء و نُون زائدتین کی وجہ سے غیر منصرف ہے کیونکہ ابو علی نحوی کے مذہب کے مطابق مُطلقاً حروف زائدتین غیر منصرف کا سبب ہیں ۔

خُلاصَۃُ الحَدِیْث

اس ارشاد سے دراصل اس بات پر تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ جب علم دین حاصل کرنے کا ارادہ کرو تو اس بات کو خوب اچھے طریقہ پر جانچ لو کہ تم جس سے علم دین حاصل کر رہے ہو وہ کس قسم کا آدمی ہے آیا وہ قابلِ اعتماد ہے یا نہیں ؟ جب تمہیں اس عالم یا راوی کے حالات کا پوری طرح علم ہو جائے تو سمجھ لو کہ وہ واقعی دیندار پرہیزگار اور قوی الحافظہ ہے تو اس سے علم دین حاصل کرو ۔

ثانیاً: اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہر کس و ناکس کو اپنا اُستاذ نہ بناؤ اور نہ ہر شخص سے حدیث کی روایت کرو ۔ خصوصًا اہل بدعت و اہلِ ہوا ، حضرات وغیرہ کیونکہ ان سے عقائد و اعمال پر غلط اثرات مُرتب ہوتے ہیں ۔

وَعَنْ حُذَیْفَۃَ رضؓ قَالَ یَا مَعْشَرَ الْقُرَّاءِ اسْتَقِیْمُوْا فَقَدْ سَبَقْتُمْ سَبْقًا بَعِیْدًا وَاِنْ اَخَذْتُمْ یَمِیْنًا وَ شِمَالًا لَقَدْ ضَلَلْتُمْ ضَلَالًا بَعِیْدًا

ترجمہ : روایت ہے حضرت حُذیفہؓ سے آپؓ نے فرمایا اے قاریوں کے گروہ سیدھے رہو کیونکہ تم بہت پہلے ہی ہو ۔ اگر تم ہی الٹے سیدھے ہو گئے تو تم بڑی گمراہی میں پڑ جاؤ گے ۔

قولہٗ یَا مَعْشَرَ الْقُرَّاءِ : معشر بمعنیٰ جماعت قراء کی تعیین میں متعدد اقوال ہیں ۔ اوّل : حُفاظِ قرآن مراد ہیں ۔ دوّم وہ علماء مراد ہیں جو اعمال میں کوتاہی کرتے ہیں ۔ سوّم : جمہور حضرات کے نزدیک وہ صحابہ کرامؓ مراد ہیں جو ابتداء ہی میں اسلام کی دولت سے مشرّف ہو گئے تھے ۔ اور قراء کا اطلاق صحابہ کرامؓ پر بایں معنیٰ ہے کہ صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں قرأت کو علم معنیٰ لازم تھا ۔

قولہٗ اِسْتَقِیْمُوْا ۔ وَھِیَ الثَّبَاتُ عَلَی الْعَقِیْدَۃِ الصَّحِیْحَۃِ

کیونکہ فَاِنَّ الْاِسْتِقَامَۃَ خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ کَرَامَۃٍ اور استقامت دالامر البقائی ہے۔

یقول ابوالاسعاد ؛ مُحدّثین حضرات نے لکھا ہے کہ استقامت کے معنیٰ یہ ہیں کہ صحیح عقیدہ پر مضبوطی سے قائم رہا جائے نفع دینے والے علوم اور عمل صالح پر مداومت اختیار کی جائے۔ اخلاص خالص رکھے اور اللہ تعالیٰ کے سوا تمام چیزوں سے دھیان ہٹا کر حق تعالیٰ کے ساتھ لو لگائے رکھے۔

قولہٗ قَدْ سَبَقْتُمْ ۔ اس میں معروف و مجہول دونوں روایتیں ہیں اگر معروف پڑھو تو مطلب یہ ہوگا کہ تم نے ابتداءِ اسلام کو پایا ہے تو عمل و استقامت کے ذریعہ تم آنے والی نسلوں سے بڑھ جاؤ گے کیونکہ متبوع کا درجہ تابع سے زیادہ ہوتا ہے۔ اور اگر مجہول پڑھو تو مطلب یہ ہوگا کہ تم سے پہلے ارباب استقامت گزرے ہیں تم بھی استقامت اختیار کرو اور ان سے پیچھے نہ رہو پہلی روایت صحیح اور دوسری روایت مشہور ہے۔

قولہٗ یَمِیْنًا وَّشِمَالًا ۔ یہ متقابل طریق مُستقیم ہے اور اس سے مراد راہِ مُستقیم سے ہٹ کر صراط متفرقہ کو اختیار کرنا ہے۔ کما فی قولہٖ تعالیٰ "وَاِنَّ ھٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْہُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِکُمْ عَنْ سَبِیْلِہٖ" (پ)

اسمائے رجال

حضرت حُذیفہؓ کے حالات

آپ کا نام حُذیفہ بن الیمان ہے۔ اور یمان کا نام حُسَیل تصغیر کے ساتھ ہے اور یمان ان کا لقب ہے حضرت حذیفہؓ کی کنیت ابوعبداللہ العَبْسی ہے۔ عین کے فتح اور یاء کے سکون کے ساتھ آنحضور صلعم کے راز دار ہیں اسی وجہ سے آپ کا لقب صاحبِ اسرار بھی ہے اس لیے کہ آپ کو منافقین اور قیامت کے قریب اہم واقعہ کی خبر دی گئی تھی ان سے حضرت علیؓ، حضرت عمر بن الخطابؓ، حضرت ابوالدرداءؓ وغیرہ صحابہؓ اور تابعینؒ نے حدیث کو روایت کیا ہے۔ شہر مدائن میں ان کی وفات واقعہ ہوئی اور وہیں ان کی قبر شریف ہے ان کی وفات کا واقعہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے چالیس رات کے بعد ۳۵ھ یا ۳۶ھ میں پیش آیا۔

وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ تَعَوَّذُوْا بِاللّٰهِ مِنْ جُبِّ الْحُزْنِ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا جُبُّ الْحُزْنِ قَالَ وَادٍ فِیْ جَهَنَّمَ یَتَعَوَّذُ مِنْهُ جَهَنَّمُ کُلَّ یَوْمٍ اَرْبَعَ مِائَةِ مَرَّةٍ ؛

ترجمہ : روایت ہے حضرت ابو ہریرہؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کے غم کے کنوئیں سے اللہ کی پناہ مانگو۔ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ غم کا کنواں کیا ہے فرمایا دوزخ میں ایک وادی ہے جس سے خود دوزخ روزانہ چار سو مرتبہ پناہ مانگتی ہے ۔

قولہٗ مِنْ جُبِّ الْحُزْنِ ۔ بضم الحاء وسکون الزاء ای من بئرٍ فیھا الحزن : یعنی ایسا کنواں جس میں حزن ہی حزن ہے ۔ جُب کی اضافت حزن کی طرف ایسے ہے جیسے دار السلام میں دار کی اضافت سلام کی طرف ہے ۔

سوال : حُزن کو جبّ کے ساتھ تشبیہ دی اس میں کیا حکمت ہے ؟

جواب : وجہ تشبیہ عمق یعنی گہرائی ہے کہ جس طرح کنوئیں میں گہرائی ہوتی ہے اس میں بھی گہرائی ہوگی ۔ یعنی جبّ الحزن دوزخ کی ایک وادی کا نام ہے جو بہت گہری ہے اور کنوئیں کے مشابہ ہے ۔

قولہٗ یَتَعَوَّذُ مِنْهُ جَهَنَّمُ : اس جملہ کا مقصد یہ ہے کہ یہ اتنی ہیبت ناک اور وحشت ناک ہے کہ دوزخی تو الگ رہے بلکہ خود دوزخ دن میں چار سو مرتبہ اس سے پناہ مانگتی ہے ۔

سوال ۔ جہنم کی طرف تعوّذ کی نسبت کی گئی ہے ۔ حالانکہ تعوُّذ یعنی پناہ پکڑنا تو ذی روح کا کام ہے ۔

جواب : کنائی معنیٰ مُراد ہے یعنی شدّت کی طرف اشارہ ہے ۔

جوابِ دوّم : حقیقت پر محمول ہے کہ واقعی بقیّہ جہنّم جُبّ الحُزن سے دن میں چار سو مرتبہ پناہ پکڑتی ہے ۔

جواب سوّم۔ بعض حضرات کے نزدیک جہنّم سے مُراد اہلِ جہنّم اور جہنّم پر مُتعین فرشتے ہیں یعنی فرشتوں کا تعوّذ مراد ہے جو جہنم پر مُقرّر ہیں جن کو زبانیہ کہا جاتا ہے۔

قولہٗ اَلْقُرّاءُ : اَلَّذِیْنَ یَحْفَظُوْنَ الْقُرْاٰنَ بِاَلْسِنَتِہِمْ فَقَط : بعض مُحدّثینؒ کے نزدیک قُرّاء سے مُراد العلماء بالکتاب وَالسُّنّۃِ المقصّرون فِی الْعَمَلِ۔ **قولہٗ المُراءُوْنَ بِاَعْمَالِہِمْ** : ای السماعون باقوالِہِمْ کیونکہ قرأت کا تعلق اقوال کے ساتھ ہے نہ کہ اعمال کے ساتھ۔

قولہٗ اَلَّذِیْنَ یَزُوْرُوْنَ الْاُمَرَاءَ ۔ امراء سے مراد سردار ہیں سرداروں سے ملاقات کا مطلب یہ ہے کہ جو قاری سرداروں سے محض حبّ جاہ و مال اور دنیوی طمع و لالچ کی خاطر ملتا ہے وہ خدا کے نزدیک مبغوض ترین ہے۔ ہاں اگر سرداروں سے ملنا امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے ہو یا بطریق جبر اوران کے شر کے دفعیہ کے لیے ہو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

قولہ قال المحاربی : یہ رواۃ حدیث ہیں۔

قولہٗ الجورۃ ۔ محاربی فرماتے ہیں کہ امراء سے مراد ظالم امراء ہیں تو عادل امراء کے پاس جانا مضر نہیں۔ بلکہ ان کی زیارت ثواب و عبادت ہے بشرطیکہ دنیوی طمع نہ ہو۔

یقول ابوالاسعاد : مُحدّثینؒ حضرات نے لکھا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث مذکور میں قاریوں کی تخصیص کی ہے۔ مگر اس حکم میں ریاکار عالم اور عابد بھی داخل ہیں کیونکہ علم کی اصل بنیاد تو قرآن ہی ہے اسی طرح عبادت بھی قرآنی احکام ہی کے مطابق ہوتی ہے۔ اس لیے ایسے عالم اور عابد جو ریاکار ہیں وہ بھی انہیں قاریوں کے ہمراہ اسی کنوئیں کا لقمہ بنیں گے۔

وَعَنْ عَلِیٍّؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُوْشِکُ اَنْ یَّاْتِیَ عَلَی النَّاسِ

ترجمہ : روایت ہے حضرت علیؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عنقریب لوگوں پر

زَمَانٌ لَا یَبْقٰی مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اِسْمُہٗ وَلَا یَبْقٰی مِنَ الْقُرْاٰنِ اِلَّا رَسْمُہٗ مَسَاجِدُھُمْ عَامِرَۃٌ وَھِیَ خَرَابٌ مِّنَ الْھُدٰی۔

وہ وقت آئے گا جب اسلام کا صرف نام اور قرآن کا صرف رواج ہی رہ جائیگا ان کی مساجد آباد ہونگی مگر ہدایت سے خالی۔

قولہٗ یُوْشِكُ ۔ ای یَقْرُبُ ۔

قولہٗ اِلَّا اِسْمُہٗ : ہر شئی کے لیے دو جہتیں ہوتی ہیں۔ ایک اسم اس کو صورت کہتے ہیں۔ دوسرا مُسمّٰی : اس کو حقیقت بھی کہتے ہیں مثلاً اللہ پاک کو اِلٰہ بھی کہتے ہیں یہ اسم بھی ہے اور مسمّٰی بھی کہتے ہیں۔ لیکن معبودانِ باطلہ کو بزعم مشرکین اِلٰہ کہ سکتے ہیں کیونکہ یہ اسم تو ہے مسمّٰی نہیں ہے تو حدیث کا مطلب یہ ہے کہ صرف اسلام کا اسم رہے گا مسمّٰی نہیں ہوگا۔ یا دوسرے لفظوں میں نام باقی رہے گا عمل ختم ہوجائے گا جیسے زکوٰۃ، حج نام کے ہونگے عمل ختم ہوجائے گا۔ عند البعض " لَا یَبْقٰی مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اِسْمُہٗ " کا معنٰی یہ ہے کہ ریاکاری عام ہوجائیگی ظاہری طور پر تو نماز پڑھیں گے اسلام کی وجہ سے مگر ہوگا ریاء جس کا ثواب نہیں بلکہ الٹا عذاب ہوگا۔

قولہٗ اِلَّا رَسْمُہٗ : ای اَثَرُ ظَاھِرٍ مِّنَ الْقِرَاۃِ اس کا مطلب یہ ہے کہ تجوید وقرآت سے قرآن پاک پڑھا جائے گا۔ مگر اس کے معنٰی ومفہوم سے ذہن قطعًا ناآشنا ہونگے یا اس کے اوامر ونواہی پر عمل ہوگا مگر قلوب اخلاص کی دولت سے محروم ہوں گے۔

قولہٗ عَامِرَۃٌ : مُلّا علی قاری رحمہ اللہ نے اس کا معنٰی کیا ہے :۔

" ای بالابنیۃ المرتفعۃ والجدران المُنَقَّشَۃِ والقنادیل المسرجۃ والبسط المفروشۃ "

بُلند وبالا عمارت مُنقّش دیواریں، روشنی کا خوب انتظام اور قالین وغیرہ بچھی ہوئی ہونگی۔

مقصد ظاہری آبادی ہے۔ مُحدّثین حضرات رحمہم اللہ نے مَسَاجِدُھُمْ عَامِرَۃٌ کے

دو مطلب بیان فرمائے ہیں :-

اوّل : یعنی مسجدیں لوگوں سے تو آباد ہونگی مگر ان میں ہدایت والے یا ہدایت دینے والے نہیں ہونگے۔ ان کے نہ ہونے سے ویران ہونگی۔ کما قال الدکتور محمد اقبالؒ

ع مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے　　یعنی وہ صاحب اوصاف حجازی نہ رہے۔

دوّم : دوسرا معنیٰ یہ ہے کہ مسجدیں بظاہر بڑی خوب صورت ہوں گی آرائش و زیبائش میں محلات شاہی سے کم نہ ہوں گی، بلیش قیمت قالین بچھے ہوں گے۔ مگر ان مساجد میں جو راہنما ہوں گے وہ ان مساجد کی روحانی ویرانی کا سبب ہونگے کیونکہ وہ لوگوں کو بدعات کی طرف دعوت دیں گے اور اہل حق کی مخالفت ان کا شعار ہوگا قوم کو نظری مسائل میں الجھائے رکھیں گے۔ ہر مسجد سے لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ درس کی آوازیں آئیں گی مگر وہ درس زہر قاتل ہوں گے جن میں قرآن کے نام پر کفر و طغیان پھیلایا جائیگا۔ کما قال الدکتور محمد اقبالؒ ع دین مُلّا فی سبیل اللہ فساد

قولہٗ خَرَابٌ مِّنَ الْهُدٰى - یہ جملہ بظاہر معارض ہے سابقہ جملہ مَسَاجِدُهُمْ عَامِرَةٌ کے کیونکہ جب عامرۃ ہیں تو پھر خراب کیسے؟ لہٰذا توافق ظاہری یوں ہے کہ آبادی سے حسّی آبادی تو ہے معنوی نہیں۔ بعینہٖ اسی طرح خرابی بھی معنوی ہوگی نہ کہ حسّی فَلَا تَعَارُضَ۔

قولہٗ علمآءُ ھُمْ شَرٌّ - یہ دفعیہ سوال مقدر ہے سوال ہوتا تھا کہ جب لوگوں کی یہ حالت ہوگی تو علماء کہاں جائیں گے؟ تو جواب میں ارشاد ہوا کہ ان کی حالت تو یہ ہوگی کہ ھُمْ اَشَرُّ النَّاسِ تَحْتَ اَدِیْمِ السَّمَآءِ۔

قولہٗ اَدِیْمَ - ای وَجْھُھَا اور اسی سے آدم بھی مشتق ہے لِاَنَّ جَسَدَہٗ مِنْ اَدِیْمِ الْاَرْضِ۔

قولہٗ مِنْ عِنْدِھِمْ تَخْرُجُ الْفِتْنَۃُ : کیونکہ اِنَّ فَسَادَ الْعَالِمِ فَسَادُ الْعَالَمِ۔

وَعَنْ زِیَادِ بْنِ لَبِیْدٍ قَالَ	ترجمہ : روایت ہے زیاد بن لبیدؓ

ذَكَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْئًا فَقَالَ ذَاكَ عِنْدَ اَوَانِ ذِهَابِ الْعِلْمِ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ كَيْفَ يَذْهَبُ الْعِلْمُ وَنَحْنُ نَقْرَءُ الْقُرْاٰنَ وَنُقْرِئُهُ اَبْنَاءَ نَا وَيُقْرِئُهُ اَبْنَاءُ نَا اَبْنَاءَ هُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ

سے فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی چیز کا تذکرہ فرمایا اور فرمایا کہ یہ علم جاتے رہنے کے وقت ہوگا۔ میں نے عرض کیا یارسول اللہ علم کیسے جا سکتا ہے ہم قرآن پڑھتے ہیں اور اپنے بچوں کو پڑھاتے رہیں گے اور تا قیامت ہماری اولاد اپنی اولاد کو۔

قولہٗ شَیْئًا ۔ شیئًا سے مُراد یا توشیٔ ھائِلاً ہے یعنی خوف والی بات یا شَیْئًا سے مراد خصلت ہے لیکن نسیانِ راوی کی وجہ سے بیان نہ ہوسکی۔

قولہٗ ذَاکَ : بعض نسخوں میں ذَالِکَ کے لفظ بھی ہیں مراد اس سے شیٔ المخوف ہے جس کا خوف دیا گیا ہے۔

قولہٗ اَوَانِ ۔ ای وقت اوان بمعنیٰ وقت ہے اصل عبارت یوں ہے :۔ " ای عِنْدَ وَقْتِ ذِهَابِ الْعِلْمِ : یعنی اس شیٔ متخوف کا وقوع علم کے ختم ہوجانے کے بعد ہوگا۔

قولہٗ وَیُقْرِئُهُ اَبْنَاءُ نَا ۔ یعنی اَنَّ الْقُرْاٰنَ مُسْتَمِرٌّ بَیْنَ النَّاسِ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ کَمَا یَدُلُّ علیہ قولہٗ تعالیٰ " اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ " یہاں قرآن پڑھنے پڑھانے سے مراد پورا علم سیکھنا اور سکھانا ہے یعنی جب تعلیم و تعلّم کا مشغلہ قائم رہے گا تو علم کیونکر اٹھ جائے گا۔ مصدر کے ہوتے ہوئے حامل مصدر کہاں جا سکتا ہے۔

قولہٗ ثَکِلَتْکَ اُمُّکَ : ای فقدتک اُمّک واصلہ الدعاء بالموت ثم یستعمل فی التعجّب۔

قولہٗ لَاَرَاکَ ۔ ای لَاَظُنُّکَ نَفِیْهًا فِی الْمَدِیْنَةِ ۔ اس سے معلوم ہوا کہ استاذ اپنے شاگرد کو غیر مناسب سوال کرنے پر عتاب کرسکتا ہے مثلاً یہ الفاظ

"کہ ہم تمہیں ایسا جانتے تھے تم ایسے نکلے" یہ اظہار عتاب کے لیے ہوتے ہیں۔

قولہٗ اَوَلَیْسَ هٰذِهِ الْیَهُوْدُ وَالنَّصَارٰی ۔ یعنی علم سے ہماری مراد نتیجہ علم ہے یعنی علم ہوگا عمل نہ ہوگا۔ اور ساتھ ساتھ حضرت زیادؓ کو تنبیہ فرمائی کہ تم نے میرے کلام کا منشاء جانے بغیر یہ خیال کر لیا کہ صرف قرآن کا پڑھنا اور اس کا حاصل کر لینا ہی کافی ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے جس طرح یہود و نصاریٰ کرتے کہ وہ بھی اپنی اپنی کتابوں یعنی تورات و انجیل کو پڑھتے ہیں اور اس کا علم بھی حاصل کرتے ہیں لیکن ان کے احکام پر ذرہ برابر بھی عمل نہیں کرتے۔

وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَعَلَّمُوا الْعِلْمَ وَعَلِّمُوْهُ النَّاسَ تَعَلَّمُوا الْفَرَائِضَ وَعَلِّمُوْهَا النَّاسَ تَعَلَّمُوا الْقُرْاٰنَ وَعَلِّمُوْهُ النَّاسَ فَاِنِّيْ امْرَءٌ مَقْبُوْضٌ وَالْعِلْمُ سَيُنْتَقَصُ وَيَظْهَرُ الْفِتَنُ حَتّٰى يَخْتَلِفَ اِثْنَانِ فِيْ فَرِيْضَةٍ لَا يَجِدَانِ اَحَدًا يَفْصِلُ بَيْنَهُمَا۔

ترجمہ: روایت ہے حضرت ابن مسعودؓ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ علم سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ، فرائض سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ، قرآن سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ۔ میں وفات پانے والا ہوں علم عنقریب اٹھ جائے گا، فتنے ظاہر ہوں گے حتّٰی کہ دو شخص ایک فریضہ میں جھگڑا کریں گے ایسا کوئی نہ پائیں گے جو ان میں فیصلہ کردے۔

قولہٗ ۔ اَلْعِلْمَ : وَالْمُرَادُ بِالْعِلْمِ الشَّرِيْعَةُ بِاَنْوَاعِهَا۔

قولہٗ اَلْفَرَائِضَ : فرائض کی تعیین میں دو قول ہیں۔ اوّل: اسلامی فرائض نماز روزہ وغیرہ۔ دوم: خاص علم میراث مراد ہے۔ قول دوم زیادہ راجح ہے جیسا کہ اگلے مضمون سے معلوم ہو رہا ہے۔ اگرچہ علم اور قرآن میں یہ بھی آگیا تھا مگر زیادتی اہتمام کے لیے اس کو علیحدہ ذکر کیا۔

قولہٗ اِنِّیْ اِمْرَءٌ مَقْبُوْضٌ ۔ مقبوض قبض سے ہے بمعنیٰ رفع لیکن مراد اس سے موت ہے "ای اِنْسَانٌ یَمُوْتُ لَا اَعِیْشُ اَبَدًا"، کما فی قولہٖ تعالیٰ "وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ اَفَائِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخَالِدُوْنَ ہ (پ۱۷ الانبیاء)

قولہٗ یَظْهَرُ الْفِتَنُ ۔ قبض علم کے بعد ظہور فتن کو بیان فرمایا یہ اشارہ ہے کہ قبض علم سببُ الفتنۃ :

قولہٗ لَا یَجِدَانِ اَحَدًا ۔ قلتِ علم کثرتِ فتنہ کی وجہ سے کوئی عالم نہیں ملے گا۔ یعنی اب تو تمہیں آسانی ہے کہ ہر مسئلہ مجھ سے پوچھ سکتے ہو۔ میرے بعد ایک وقت آئے گا کہ علماء اٹھ جائیں گے یہاں تک کہ اگر ایک میت کی میراث بانٹنی ہوگی تو مفتی نہ ملے گا۔ ظاہر یہ ہے کہ دو سے مراد میت کے دو وارث ہیں۔ اور فریضہ سے مراد مسئلہ میراث ہے یا فریضہ سے مراد کوئی شرعی مسئلہ ہو۔ کما مرّ :

وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَثَلُ عِلْمٍ لَا یُنْتَفَعُ بِهٖ كَمَثَلِ كَنْزٍ لَا یُنْفَقُ مِنْهُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ

ترجمہ : روایت ہے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اس علم کی مثال جس سے نفع نہ اٹھایا جائے اس خزانہ کی سی ہے جس سے اللہ کی راہ میں خرچ نہ کیا جائے۔

قولہٗ لَا یُنْتَفَعُ بِهٖ ۔ عدمِ انتفاع کا تعلق عمل اور تعلیم دونوں سے ہے ورنہ علم تو فی نفسہٖ نافع ہے۔

سوال : علم کو کنز کے ساتھ تشبیہ دی ہے ان میں وجہ تشبیہ کیا ہے ؟

جواب : وجہ تشبیہ ما بین العلم والکنز زیادتی (یعنی بڑھنا) ہے جیسے علم کی جتنی زیادہ تدریس ہوگی اتنا ہی وہ بڑھے گا، یہی حال کنز کا ہے کہ جائز طریقہ پر اس کو خرچ کروگے یہ اتنا ہی بڑھے گا۔ کما فی قولہٖ تعالیٰ :-

" وَمَآ اٰتَيۡتُمۡ مِّنۡ زَكٰوةٍ تُرِيۡدُوۡنَ وَجۡهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُضۡعِفُوۡنَ (پ۲۱ الرّوم ع ۴)

نیز مشہور ہے :۔

" وَالۡعِلۡمُ يَزِيۡدُ بِالۡاِنۡفَاقِ وَالۡكَنۡزُ يَنۡقُصُ وَالۡعِلۡمُ بَاقٍ وَالۡكَنۡزُ فَانٍ ۔ وَاللّٰهُ اَعۡلَمُ :

قَدۡ تَمَّ كِتَابُ الۡعِلۡمِ بِحَوۡلِ اللّٰهِ وَقُوَّتِهٖ
وَحُسۡنِ تَوۡفِيۡقِهٖ فَالۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ
وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى
سَيِّدِ الۡاَنۡبِيَآءِ وَالۡمُرۡسَلِيۡنَ
وَعَلٰٓى اٰلِهٖ
وَاَصۡحَابِهٖ
اَجۡمَعِيۡنَ :

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ قَدِ انۡتَهٰى بِحَوۡلِ اللّٰهِ وَقُوَّتِهٖ الۡجُزۡءُ الۡاَوَّل مِنۡ "اَسۡعَدُ الۡمَفَاتِيۡحِ عَلٰى مِشۡكٰوةِ الۡمَصَابِيۡحِ" وَيَتۡلُوۡهُ الۡجُزۡءُ الثَّانِىۡ بِاِذۡنِ اللّٰهِ وَاَوَّلُهٗ كِتَابُ الطَّهَارَةِ ۔

وَلِلّٰهِ الۡحَمۡدُ وَالۡمِنَّةُ

بماہ ۱۰ ربیع الاوّل سنہ ۱۴۲۳ھ
مطابق ماہ ۲۳ مئی سنہ ۲۰۰۲ء

ادارہ تحقیقاتِ علمیہ کی عظیم پیشکش

فلاحین (شرح اردو) تفسیر اغراض جلالین

(جلد اول) (پارہ اول مکمل)

فلاحین (شرح اردو) تفسیر اغراض جلالین

(جلد دوم) (سورۃ البقرہ مکمل)

فلاحین (شرح اردو) تفسیر اغراض جلالین

(جلد سوم) (سورہ آلِ عمران مکمل) (زیر طبع)

از افادات

استاذ العلماء، رہبر صلحاء شیخ التفسیر والحدیث حضرت مولانا ابو محمد عبد الغنی جاجروی رحمہ اللہ القوی

ترتیب

ابوالاسعاد یوسف جاجروی

رفیق شعبۂ تصنیف وتالیف ادارہ تحقیقات علمیہ واستاذ حدیث جامعہ اسلامیہ بدر العلوم حمادیہ، رحیم یار خان

ناشر

ادارہ تحقیقاتِ علمیہ جامعہ اسلامیہ بدر العلوم حمادیہ رحیم یار خان، فون: 0731-72432

ادارہ تحقیقات علمیہ رحیم یار خان کے علمی جواہر پارے

(۱) اَسعد المفاتیح فی حل مشکوٰۃ المصابیح ابتداز خطبہ کتاب تا آخر کتاب العلم۔ — از افادات علامہ ابومحمد عبدالغنی جاجروی رحمہ القوی۔

(۲) اَسعد المفاتیح جلد دوم از کتاب الطہارت تا آخر کتاب الصلوٰۃ — از افادات علامہ ابومحمد عبدالغنی جاجروی رحمہ القوی۔

(۳) فلاحین شرح اردو اغراض تفسیر جلالین شریف جلد اول پارہ اول (مکمل) — از افادات علامہ ابومحمد عبدالغنی جاجروی رحمہ القوی۔

(۴) فلاحین شرح اردو اغراض تفسیر جلالین شریف جلد دوم مکمل سورۃ البقرۃ — از افادات علامہ ابومحمد عبدالغنی جاجروی رحمہ القوی۔

(۵) فلاحین شرح اردو اغراض تفسیر جلالین شریف جلد سوم مکمل سورۃ آلِ عمران — از افادات علامہ ابومحمد عبدالغنی جاجروی رحمہ القوی۔ (زیر طبع)

(۶) الفتح السماوی شرح اردو تفسیر بیضاوی — از افادات علامہ ابومحمد عبدالغنی جاجروی رحمہ القوی۔ (زیر طبع)

(۷) فتح البیان فی حل مشکلات القرآن — از افادات علامہ ابومحمد عبدالغنی جاجروی رحمہ القوی۔ (زیر طبع)

(۸) فتح الودود فی حل قال ابوداؤد — ابوالاسعاد یوسف جاجروی رفیق ادارہ تحقیقات علمیہ

ناشر:

ادارہ تحقیقات علمیہ جامعہ اسلامیہ بدر العلوم حمادیہ رحیم یار خان پاکستان

فون:72432 - 0731

مدرسین درس نظامی وطلباء حدیث کے لئے نادر علمی تحفہ

اسعد المفاتیح

(شرح اردو)

مشکوٰۃ المصابیح

(جلد دوم)

(عنقریب چھپ کر منظر عام پر آرہی ہے۔ انشاء اللہ)

از افادات

استاذ العلماء رہبر صلحاء شیخ التفسیر والحدیث حضرت مولانا ابو محمد عبد الغنی جاجروی رحمہ اللہ القوی

فتح الودود

فی حل

قال ابوداؤد

مع مقدمۃ الکتاب

تالیف

ابوالاسعاد یوسف جاجروی

ناشر

ادارہ تحقیقاتِ علمیہ جامعہ اسلامیہ بدر العلوم حمادیہ رحیم یار خان، فون: 0731-72432